زیرِ ادارت نور الحسن ہاشمی ایم۔ اے

جلد ۳۸، نمبرا | بابتہ ماہ جنوری سنہ ۱۹۴۳ء | چندہ سالانہ صہ فی پرچہ آٹھ آنہ

فہرست مضامین

(دیونٹر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع دہلی)

اُردو اکادمی

"جامعہ ملیہ دہلی کی اردو اکادمی" نے علمی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ عام ضرورتوں کی طرف زیادہ توجہ کی ہے اور علاوہ علمی کتابوں کے عام دلچسپی کی کتابیں اور بچوں کے کام کی کتابیں اچھی تعداد میں سلیقے سے شایع کی ہیں اور اس طرح اردو کے ادبی خزانے میں مفید اضافہ کیا ہے۔"

(ماخوذ از خطبۂ صدارت آل انڈیا اورنٹیل کانفرنس شعبۂ اُردو سنہ ۱۹۴۱ء)

ادب اور ادیب کا مقصد

(یہ مضمون عربک کالج دہلی کے اردو ہفتہ کے سلسلے میں ۵ر نومبر ۱۹۴۲ء کو پڑھا گیا)

ہمارے زمانے کے عجائبات میں سے ایک بہت ہی عجیب چیز ہے یہ مقصد کی بحث۔ جس وقت سے ہمیں کچھ شعور ہوتا ہے ہم ہر چیز کا، ہر کام کا، ہر خیال کا مقصد پوچھنے لگتے ہیں۔ جب تک ہم میں غور کرنے کی صلاحیت رہتی ہے ہم مقصد کی جستجو میں رہتے ہیں اور جب خود مایوس ہو جاتے ہیں تو دوسروں کے پیچھے پڑتے ہیں کہ وہ کچھ معلوم کریں اور ہمیں بتائیں۔ کسی مقصد کے ہاتھ نہ لگنے سے ہمارے بڑے بوڑھے چڑچڑے اور بدگمان ہو جاتے ہیں، ہمارے نوجوان درخواستیں لکھتے اور سفارشیں کراتے پھرتے ہیں اور ہماری جماعت میں ایک ایسا انتشار پیدا ہو گیا ہے جسے شاید اب مقصد کا صحیح علم بھی دور نہ کر سکے گا۔ لطف تو یہ ہے کہ وہی چند لوگ جنھوں نے اپنے نزدیک زندگی کا ایک مقصد معلوم کر لیا ہے پریشانی میں اور زیادہ پریشان کرتے ہیں۔ ان مقصد کا علم رکھنے والوں میں ایک گروہ وہ ہے جو زندگی کے اسلامی طریقہ کو صحیح طریقہ مانتا ہے اور معاشرت، تہذیب اور سیاست کو اس ایک رنگ میں رنگ دینا چاہتا ہے۔ اسلامی طریقے کو برتنے سے کسی مسلمان کو انکار نہ کرنا چاہیے لیکن ابھی تک اس کے مبلغوں میں ایسے نمونے نظر نہیں آئے جن کی تقلید کی جا سکے۔ گویا رنگ موجود ہیں، رنگنے کو سطح موجود ہے، رنگریز تیار کھڑے ہیں۔ بس اس کی دیر ہے کہ وہ آپس میں طے کر لیں کہ کونسا رنگ اسلامی ہوگا، کونسا نہ ہوگا۔ ان کی بحث ہمیں اس دُبدھے میں ڈال دیتی ہے کہ اسلامی رنگ استعارہ ہے یا واقعی کوئی رنگ، اور اس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ہم پھر مقصد کے پھیر میں پڑ جاتے ہیں۔ دوسرا گروہ جو مقصد کے صحیح علم رکھنے کا دعویٰ کرتا ہے وہ ہے جس کے نزدیک ہر مشکل کا حل انقلاب ہے۔ بعض لوگ تو انقلاب کے ایسے گرویدہ ہیں کہ وہ اسی کو ایک مقصد سمجھ بیٹھے ہیں اور اس لفظ میں کچھ ایسی شان ہے کہ لغت میں اس کے معنی دیکھنا بھی زندگی کی توہین معلوم ہوتی ہے۔ انقلاب کی صدا لگانے والے بہت ہیں اور ان میں ان چند لوگوں کی آواز گم ہو جاتی ہے جو جانتے ہیں کہ انقلاب محض ایک ذریعہ ہے اور وہ اسی وقت توجہ کے قابل ہوا ہے جبکہ وہ اشتراکی نظام کا پیش خیمہ ہو۔ اشتراکی نظام کا تصور اصطلاحوں اور سیاسی فرقہ بندیوں میں اُلجھ گیا ہے

تو وہ ایک مقصد بن سکتا تھا فی الحال وہ بحث سے نجات ملنے کی صورت نہیں ہو کہ اسے تسلیم کرنے کے بعد بھی صحیح مقصد اور صحیح طریقہ کی جستجو کا فرض باقی رہتا ہو۔

لیکن ہم ہیں کہ مقصد کی فکر میں سرگردانی پر مجبور ہیں معلوم نہیں یہ بیداری کی علامت ہو یا غفلت کی ترقی کی یا انحطاط کی۔ بظاہر تو مقصد کے آرزومندوں کی کیفیت ان لوگوں سے ملتی ہو جو طبیبوں سے لمبے مشورے کرتے ہیں، گھنٹوں نبض پر ہاتھ رکھ کر اور معدے اور جگر کے فعل پر دھیان جا کر بیٹھتے ہیں کہ تندرست ہونے کا مقصد حاصل کرلیں وہ لوگ جو زندگی کے مقصد کو زندگی سے ایک الگ چیز سمجھتے ہیں، اپنے آپ سے اور دوسروں سے پوچھتے ہیں کہ ان کی زندگی کا مقصد کیا ہونا چاہیے یا اس پر غور کرتے ہیں کہ وہ کسی بڑے مقصد کو پورا کر رہے ہیں یا نہیں دراصل ایک قدرتاً مکمل چیز کو توڑ کر پھر بنانا چاہتے ہیں اور ان کے منتشر افکار کا مسالہ زندگی کے اجزا کو جوڑ نہیں سکتا زندگی کا تجزیہ کرنے والوں کو اعصاب کے مریضوں کی طرح اپنی ذات، اپنی دشواریاں، اپنے مسائل بالکل ہی نرالے معلوم ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے وہ اپنی زندگی کے لیے ایک مقصد چاہتے ہیں جو خاص ان کا مقصد ٹھہرایا جاسکے ان میں ایسی انفرادیت پیدا ہو جاتی ہو جو صرف اپنی ذات کو حقیقی سمجھتی ہو جو بنتے بنتے کائنات کا مرکز بن جاتی ہے اس کے لیے یہ سوال محض ضمنی ہو جاتا ہو کہ دنیا کو کس نے بنایا، وہ خدا سے پوچھنا چاہتی ہو کہ وہ کس طرح وجود میں آیا۔ اس کے نزدیک یہ کوئی نامناسب بات نہیں کہ کائنات کے سارے کام بند تصور کیے جائیں جب تک کہ یہ طے ہو جائے کہ اس کاروبار میں اس کا کتنا حصہ ہو کتنے کام اس کے بنانے سے بن جائیں گے اور بگاڑنے سے بگڑ جائیں گے۔ ایسی انفرادیت کسی مقصد، کسی فن، میراجی چاہتا ہو کیوں کہ کسی خوبی کی بھی حامل نہیں ہو سکتی اور اس پر ازل سے یہ لعنت بھیجی گئی ہو کہ اپنے اوپر غور کرتی رہے۔ اپنے لائق مقصد اور کام کو تلاش کرتی رہے اور اسے کچھ نصیب نہ ہو۔

افسوس ہو کہ یہ انفرادیت ہمارے ملک میں ایک وبا کی طرح پھیلی ہو اور مقاصد کی کوئی بحث اس کی نحوست سے پاک نہیں رکھی جا سکتی۔ ہم کسی ایسے مسئلے پر گفتگو ہی نہیں کرسکتے جس میں فیصلہ کرنا اور ایک راہ اختیار کرنا ہمارے بس میں ہو، اس لیے کہ یہ انفرادیت کسی بنیادی بات کو قبول نہیں کرتی۔ ہم اپنی محنت کے پھلوں سے محروم رہتے ہیں اس لیے کہ جو درخت بھی لگایا جاتا ہو اس کی جڑوں کو یہ انفرادیت کھود کھود کر دیکھتی ہو کہ وہ زمین میں ٹھیک طرح

سے کھیلی ہیں یا نہیں۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ادب کا مقصد جی بہلانا ہے۔ اس ڈر سے کہ وہ تمام لوگ جن کا قلم دنیا کی تقدیر لکھ رہا ہے چلا اٹھیں گے کہ ان کی توہین کی گئی ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ادب کا مقصد شخصیت کا اظہار کرنا ہے کیونکہ پھر ہماری دنیا ان بے شمار شخصیتوں کی نمایش گاہ بن جائے گی جو اس انتظار میں بیٹھی ہیں کہ انھیں ان کا حق دیا جائے۔ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ادب کا مقصد انسان کو حسن کامل کا جلوہ دکھانا ہے اس لیے کہ ادب میں حسن کا جلوہ آج کل عام ہے اور اسے دیکھنا کوئی بات ہی نہیں۔ آپ دل میں سمجھتے ہوں تب بھی خدا کے لیے زبان سے نہ کہیے کہ ادب کا مقصد جماعت کی اصلاح اور رہنمائی ہے۔ اب تو نہ جانے کتنے ادیب ہیں جو قلم کو یہ سمجھ کر اٹھاتے ہیں کہ زندگی کا صحیح نقشہ بنانا ان کا خاص منصب ہے، اور ہم نے یہ تسلیم کر لیا کہ ادیب کو رہنما ہونا چاہیے تو رہنماؤں کے ہجوم میں رستہ چلنا دشوار ہو جائیگا اس سے تو یہی کہہ دینا بہتر ہے کہ ادب آپ اپنا مقصد ہے۔ ادیب ہر قید سے آزاد ہے اور کسی کو حق نہیں کہ اس سے باز پرس یا حجت کرے، سوائے دوسرے ادیبوں کے، اور خدا انھیں بھی ان کی آزادی مبارک کرے۔

آپ میرے اس بیان سے یہ نہ سمجھیں کہ میرے دل میں ادب یا ادیبوں کی قدر نہیں۔ مجھے شکایت ہے تو یہ کہ ہم ادب کا اور ادیب اپنے فن کا جیسا کہ چاہیے احترام نہیں کرتے۔ میرے خیال میں ادب اور ادیب کے مقصد کی بحث چھڑنے اور جاری رہنے کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو ادب کا خادم نہیں سمجھتے، ادب کو اپنا خادم بنانا چاہتے ہیں اور اس ظاہری اختیار سے جو ہمیں حاصل ہے کہ جو چاہیں لکھیں اور جس طرح چاہیں لکھیں دھوکا کھا کر فرض کر لیتے ہیں کہ ہم میں سے ہر ایک ادب کو ایک نئی شکل دے سکتا ہے۔ ہمارے ادیب اس صلاحیت کو جو انھیں قدرت کی طرف سے ملی ہے کافی سمجھ کر مشق اور محنت اور کام کی جانچ کو غیر ضروری قرار دیتے ہیں اور انھیں دو چار ہم مذاق مل جائیں تو انھیں عام رائے کی کوئی پروا نہیں رہتی۔ لیکن زبان اور ادب جماعت کی ملک ہے افراد کی نہیں، افراد کو ان کے حسب مقدور اس کا ایک حصہ امانت کے طور پر ملتا ہے اور اسے وہ چاہیں تو ضایع بھی کر سکتے ہیں۔ اگر وہ اسے ضایع نہیں کرنا چاہتے اور اسے اپنا خاص حق ٹھیرا کر جماعت کے عام خزانے سے الگ رکھنا نہیں چاہتے تو انھیں وہ تمام شرطیں اور پابندیاں قبول کرنا ہوں گی جو جماعت کے کاموں کو جاری رکھنے اور ترقی دینے کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ انھیں زبان کو اسی طرح سیکھنا ہوگا جیسے کسی فن کو سیکھتے ہیں۔ غلط اور صحیح میں اسی طرح فرق کرنا اور غلطی سے بچنے کی فکر اسی طرح کرنا ہوگا جیسے [illegible] نازک آلات بنانے والے کرتے ہیں۔ انھیں ان نمونوں کو

جنھیں زبان جاننے والے معیاری مانتے ہیں اسی طرح ذہن نشیں کرنا ہوگا جیسے کہ کسی علم یا فن کے بنیادی اصول ذہن نشین کیے جاتے ہیں اور اپنے ہر کام کو اس سختی سے جانچنا ہوگا جو بے مروت ممتحن کا حصہ مانی جاتی ہے۔ ریاضت کا یہ سلسلہ تکمیل کو پہنچ جائے تب سمجھنا چاہیے کہ شخصیت ظاہر کرنے کا موقع آتا ہے لیکن یہ شخصیت جو اب ظاہر ہوگی فن کو مٹا کر نہیں اپنے آپ کو مٹا کر بنی ہوگی۔ اسے اپنی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ ہوگا۔ وہ ایسے ہی کام اٹھائے گی جنھیں انجام دے کر وہ فن کی عزت بڑھا سکے، اسے ناکام اور گمنام رہنا گوارا ہوگا مگر وہ اپنی کسی گستاخی سے فن کو بے آبرو نہ کرے گی۔ ایسی شخصیت اپنے مقصد کے بارے میں سوال نہیں کرتی۔ اور دوسرے اس کا مقصد معلوم کرنا چاہیں تو وہ جواب نہیں دیتی۔ اسے اپنے کام سے مطلب ہوتا ہے اور اس کو بہتر سے بہتر انجام دینے سے۔ اس کا مقصد تھا کہ اپنی خاص استعداد کا پتہ چلا لے اور استعداد کے مناسب کام کو سیکھ لے۔ یہ حسب منشا ہو گیا تو پھر مقصد کا سوال نہیں رہتا بس استعداد دکھانے اور فن کی خدمت کرنے کی آرزو ہوتی ہے۔

ہمارے ادیبوں کی تربیت اس نہج پر ہو تو بہت سی پیچیدگیاں جو اس وجہ سے پیدا ہوتی ہیں کہ ادیب اپنے آپ کو فن سے برتر سمجھتے ہیں اور اپنا ہر کام دل میں یہ ٹھان کر کرتے ہیں کہ وہ جماعت اور فن پر ایک احسان کر رہے ہیں دور ہو جائیں گی۔ یہ مقصد کی بحث بھی جو فطرت اور تہذیب کے خلاف باتیں کرایا کرتی ہے ختم ہو جائے گی اور ادیب صحیح معنوں میں آزاد ہو جائے گا۔ مگر ٹھہریے ہم کو ایک اوچھے فلسفے نے اس غلط فہمی میں ڈال دیا ہے کہ آزادی ایک اثباتی چیز نہیں ہے۔ رکاوٹوں کے موجود نہ ہونے کا دوسرا نام ہے۔ اس کا تعلق سیاست اور قانون سے ہے۔ انسانیت اور تہذیب سے نہیں۔ اب میں آپ سے یہ کیسے کہوں کہ آزاد وہی شخص ہو سکتا ہے جس نے تعلیم کی ساری پابندیاں قبول کی ہوں، اپنی خاص استعداد کا صحیح اندازہ کر لیا ہو۔ جسے ایسی تربیت دی گئی ہو کہ وہ اپنی استعداد سے پورا کام لے سکے جس کی جماعت اس کی قدر کرے اور جو فن کو ترقی دینا، جماعت کی خدمت کرنا اپنا منصب جانے میرے ذہن میں آزاد ادیب کا جو تصور ہے وہ ایسے شخص کا ہے جسے اپنی زبان میں پورا ملکہ ہو، جو اپنے فن کے امکانات سے واقف ہو اور اس سے ایسے کام لینے کا خیال ہی نہ کرے جس کے لیے وہ موزوں نہیں۔ ایسا ادیب کبھی کبھی اپنا اور دوسروں کا جی بہلائے گا، اگر اسے جی بہلانا آتا ہے۔ اپنے کام میں اپنی شخصیت کو ظاہر کرے گا اور جتنا نمایاں اس کا کام ہوگا اتنی ہی نمایاں اس کی شخصیت ہوگی، وہ کمال حسن کے دیدار کے لیے تڑپتا رہے گا اور یہ دیدار اسے نصیب

ہوئی تو وہ اس کے کام کو کامل حسن کا نمونہ بنا دے گی۔ ایسے ادیب کو حقیقت کی تلاش ہوگی اور وہ چاہے گا کہ اس کا ہر کام حق کی جستجو میں اسے ایک قدم آگے لے جائے۔ وہ یہ کبھی تصور ہی نہ کر سکے گا کہ انسانی زندگی معنی اور مقصد سے خالی ہو سکتی ہے۔ وہ ظاہری باتوں سے دھوکا نہ کھائے گا، حقیقت نگاری کے بہانے سے حالات کی لاحاصل عکاسی نہ کرے گا، اور روحانیت کو اپنا مسلک بتا کر جذبات کو آوارہ نہ چھوڑ دے گا۔ اسے اپنی خامیوں کا، اپنے علم کی کمی کا ایسا احساس ہوگا کہ وہ رہنما بننے کا حوصلہ نہ کرے گا، مگر اسے اپنے اوپر اتنا قابو ہوگا کہ خامی اور کمی کا احساس فاسد مادہ بنکر اس کی طبیعت میں بگاڑ نہ پیدا کر سکے۔ اس کے دل میں فن کی عزت ہوگی اور اس جماعت سے محبت ہوگی جس کی گود میں اس فن نے پرورش پائی ہے۔ جماعت کی دنیا اس کی دنیا ہوگی اور وہ جانتا ہوگا کہ اس دنیا سے الگ اور باہر اس کا وجود محض فرضی ہے۔ جماعت کا دین اس کا دین ہوگا، اور وہ جانتا ہوگا کہ جس نے اس دین کو چھوڑا وہ اگر پیغمبر نہ ہوا تو شیطان بن جائے گا۔

ادیب کو حقیقت کا علم دنیا دیکھ کر نہیں ہو سکتا اور اس کی نظر دنیا ہی پر نہ ہونا چاہیے۔ اس کے لیے خلوص، سچائی، دیانت، ہمت ضروری ہیں مگر کافی نہیں۔ انسانی سیرت کا علم بھی، خواہ وہ کتنا ہی گہرا اور مکمل کیوں نہ ہو، ادیب کے لیے کافی نہیں، اس لیے کہ انسان کی قدر معین اور معلوم نہیں، اس کی شخصیت ایک حالت پر قائم نہیں رہتی، اور ادیب کی نظر میں صرف کسی ایک وقت کی کیفیت ہوئی تو اس کے تصورات اور اس کے سارے کام ناقص رہیں گے۔ اوپر کی تسلی اس کے فن اور اس کی شخصیت کی تکمیل کے لیے لازمی ہے کہ جس طرح اس نے اپنی جماعت کی زبان کو اور اس کے ادب کو قبول کیا ہے اسی طرح وہ اپنی جماعت کے عقاید کو قبول کرے اور اسے یقین ہو کہ ان عقاید پر جیسا کہ چاہیے عمل کیا گیا تو انسانی زندگی کے ابدی مقاصد حاصل ہو جائیں گے۔ ادیب کی طبیعت جو انسانی فطرت کو سمجھنے اور پرکھنے کی خاص صلاحیت رکھتی ہے، جھوٹ اور ریاکاری کو دور سے پہچان لیتی ہے، جذبات کی کشمکش جو بے شمار کیفیتیں پیدا کرتی ہے انھیں محسوس کرتی ہے اور بیان کر سکتی ہے، کبھی اسے گوارا نہ کرے گی کہ وہ ایسے عقاید کو زبان سے صحیح کہے جنھیں وہ دل میں غلط سمجھتا ہو۔ اس لیے وہ اپنی جماعت کے اور اپنے عقاید کی اس طریقے پر جانچ کرے گا جو اسے آتا ہے اور جماعت پر یہ واضح کرے گا کہ وہ اپنے اصل نمونے سے کس قدر مختلف ہو گئی ہے، لیکن آدھی بات کہنے سے بہتر ہے کہ کچھ نہ کہا جائے، آدھے رستے تک لے جا کر چھوڑ دینے سے بہتر ہے کہ رہنمائی کا دعویٰ نہ کیا جائے۔ ایسا ادیب اچھا ہو سکتا

جو زندگی کا دلچسپ پہلو دیکھے اور دکھائے، مایوسی اور رنج کو ہنسا کر یا جی بہلا کر دور کرے لیکن اسے سمجھ لینا چاہیے کہ ان میں بس اسی کی صلاحیت ہے۔ ایسا ادیب بھی اچھا ہو سکتا ہے جو زندگی کے طریقے کا مانے ہوئے اخلاقی اصولوں سے مقابلہ کرے اور اپنی جماعت کے افراد کو اخلاقی نمونوں کی حیثیت سے پیش کرے اور جانچے، اس طرح وہ نفس انسانی کا علم عام کر کے طبیعتوں میں گہرائی، تخیل میں وسعت اور برتاؤ میں رواداری پیدا کر سکتا ہے۔ مگر یہیں سے اس کی دشواریاں بھی شروع ہو جاتی ہیں۔ اس کے لیے خالی اصول معیار کا کام نہیں دے سکتے۔ وہ منطقی یا فلسفی نہیں ہوتا جیسے مصور رنگوں اور سنگتراش پتھر کے بغیر معذور ہو جاتا ہے، ادیب بھی عقیدے اور اصول کو سمجھ نہیں سکتا جب تک کہ وہ ان جیتی جاگتی ہستیوں میں متشکل نہ ہو جو اس کی نظر اور دل میں سمائی رہتی ہیں۔ سچا ادیب اس منزل پر پہنچ کر بیٹھ نہیں جاتا اور واپسی کا ارادہ نہیں کرتا۔ جیسے زبان کو سیکھتے وقت اس نے ان صفات کو جم کر مان لیا تھا جو خود اس میں موجود نہ تھیں اور پھر آہستہ آہستہ انھیں اپنے اندر پیدا کیا تھا ویسے ہی اس مقام پر وہ اس تعلیم کو جو وجدانی یا الہامی علم کی بنا پر دی جاتی ہے صحیح مان کر اپنے فن کو اس کا رازداں اور حامل بناتا ہے۔ رہنمائی وہ اب بھی نہیں کرتا، یہ اس کا منصب نہیں لیکن وہ انسان اور اس کی دنیا کو لاوارث نہیں سمجھتا۔ وہ جانتا ہے کہ جیسا رشتہ اس نے اپنے معبود سے قائم کیا ہے ویسا ہی رشتہ ہر انسان قائم کر سکتا ہے، اور انسان اور اس کی زندگی کی تکمیل یقینی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ انسان اس حقیقت پر دل سے بھروسا کرے اور اس کے جذبات کا سارا کھیل، کائنات کا سارا کاروبار ایک پر اسرار عبادت بن جائے۔

پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے (آکسن)

روحِ اقبال

(ایک تبصرہ)

اقبال کے لیے عام طور پر کہا جاتا ہے کہ وہ اردو کا سب سے بڑا شاعر اور مفکر ہے اس سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن غور و فکر کے بعد یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ وہ اُردو شاعری کا سب سے بڑا معمہ ہے جسے سمجھنے اور حل کرنے کے لیے بڑی جرأت درکار ہے۔ اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں تھا پھر تنقید نگار کا کام تو اور مشکل ہو جاتا ہے۔ اقبال نے ساری عمر افراد کی زندگی اور اس کے امکانات کے سمجھنے پر صرف کی۔ کوئی اسی کی طرح ہو تو یہ سمجھے کہ اقبال کیا چاہتا تھا؛ وہ عمل کا پیامبر تھا، وہ خودی کو اتنا بلند دیکھنا چاہتا تھا کہ خدا خود بندے سے اس کی رضا پوچھے، وہ جوانوں کو شاہین بننے کی تاکید کرتا تھا جو اپنے افرنگی صوفے اور ایرانی قالین چھوڑ کر چٹانوں پر بسیرا کریں۔ وہ جوانوں کو پیروں کا استاد بنانا چاہتا تھا تاکہ خرد غلامی سے آزاد ہو، وہ اپنے سینے کی آگ جوانوں کے سینے میں بھر دینا چاہتا تھا وہ سب کے لیے اور خاص کر مسلمانوں کے لیے اقتدار چاہتا تھا۔ وہ قرطبہ کی مسجد میں کھڑے ہو کر اپنی تیز نگاہیں وقت کے پیکر میں گاڑ دیتا تھا۔ اُسے ماضی اپنی تابناکی کے ساتھ دکھائی دیتی تھی اور مستقبل میں وہ آبِ رواں کبیر کے کنارے کسی اور تہذیب (اسلامی تہذیب) کا خواب دیکھنے لگتا تھا۔ وہ فلسفی تھا اسے کہیں مغرب سے اختلاف تھا اور کہیں مشرق سے، وہ عصرِ حاضر کے خلاف اعلان جنگ کرتا تھا اسے خدا سے کچھ شکایتیں تھیں۔ وہ دین کے بغیر زندگی کا تصور نہیں کر سکتا تھا مختصر یہ کہ زندگی کا غالباً کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں اقبال نے کچھ کہا نہ ہو اور کوئی بات ایسی نہیں کہی ہے جس میں فلسفیانہ شان، شاعری اور خلوص نہ ہو۔ پھر نقاد کا کام کیونکر آسان ہو سکتا ہے!

اقبال اُن خوش قسمت انسانوں میں ہے جس کی قدر اس کی زندگی میں ہوئی اور جس کے مرنے کے بعد پرستش کا جذبہ اور قوی ہو گیا اس کے ساتھ یہ والہانہ شیفتگی اگر ایک جانب ہندوستان کی ادبی اور سیاسی زندگی میں ایک طرح کی چہل پہل پیدا کرنے میں کامیاب ہوئی تو دوسری طرف اس سے یہ نقصان بھی ہوا کہ لوگوں

روحِ اقبال از ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن قیمت عہ

نے اقبال کے مطالعہ میں وہ جرأت اور ناقدانہ بصیرت سے کام نہیں لیا جس کی ضرورت تھی۔ اس کی عظیم الشان شخصیت ایک فلسفی اور شاعر کی حیثیت سے، ایک مفکر اور مسلمان کی حیثیت سے اس طرح لوگوں پر چھا گئی کہ لوگوں نے اس سے اختلاف کی ہمت اپنے اندر نہ پائی چند کو چھوڑ کر۔ اگر کسی نے کچھ کہا بھی تو اس پوچ اور لچر طریقہ پر جو چاند پر خاک ڈالنے کے مصداق ہی بن سکتا ہو تنقید میں اس کے لیے جگہ نہیں نکل سکتی۔ اقبال کے یہاں ادب اور قواعد، زبان اور محاورہ کی غلطی نکالنا اقبال کی کمزوری یا توہین نہیں ہو بلکہ اس زبان اور نسل کی توہین ہو جو اقبال کی دنیا میں صرف یہی تلاش کر کے مطمئن ہو اور جس میں اس بڑے مفکر کے خیالات پوری طرح نہ سما سکے۔

اردو ادب میں تنقید نگاری ابھی کسی بلند مرتبہ تک نہیں پہنچی ہو لیکن اب لوگ اس کی طرف متوجہ ہیں اقبال پر کئی کتابیں ایسی نکلی ہیں جو دقت نظر اور فکر کا پتہ دیتی ہیں۔ ان میں قابل توجہ سید نذیر نیازی کا "اقبال کا مطالعہ" ہو خواجہ غلام السیدین کی انگریزی تصنیف "اقبال کا تعلیمی فلسفہ" ہو۔ کچھ مختصر مضامین ہیں اور تصنیف زیر نظر ہو جس کے مصنف عثمانیہ یونیورسٹی کے استاذ سیاست ڈاکٹر یوسف حسین خاں ہیں۔ اب تک اقبال پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں "روح اقبال" سب سے بہتر ہو۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں نظری سیاسیات کے ایک باخبر عالم ہیں۔ اُن کا یہ ادبی ذوق ایک ایسے اجتماع کا پتہ دیتا ہو جو کم لوگوں میں پایا جاتا ہو۔ "روح اقبال" میں جا بجا اقبال کے اشعار کے متوازی رومی اور غالب کے اشعار بھی اس ذوق کا پتہ دیتے ہیں جس کے بغیر نقد کی منزل میں گام فرسائی مشکل ہو۔

اقبال پر جتنی کتابیں تصنیف ہوئی ہیں اور اکثر مضامین جو اس وقت تک لکھے گئے ہیں وہ لکھنے والے کی انفرادیت کا کچھ حصہ چھوڑنے کے بعد ایک ہی طرح کی کمزوری کا شکار ہیں اور "روح اقبال" بھی اس دائرے سے باہر نہیں نکل سکی ہو۔ ہر کتاب اقبال کے نظریہ حیات، فلسفہ تمدن، فلسفہ مذہب، مابعد الطبیعیات کو بالکل صحیح مان کر لکھی گئی ہو۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اب تک لکھنے والے صرف اقبال کی تشریح و تفسیر کرتے رہے ہیں اور کسی نے نقد کی جانب قدم نہیں اٹھایا ہو۔ یہ اتنی بڑی کمزوری ہو جو اپنے ساتھ بہت سی کمزوریاں لاتی ہو اور طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا کرتی ہو۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی تصنیف بھی اسی تشریح و تفسیر کی نظر سے دیکھی جاتی اگر موصوف نے اپنے دیباچہ میں نقد و نظر کے متعلق اپنے نظریہ کی وضاحت نہ کر دی ہوتی کیونکہ وہیں سے اختلاف اور نقطہ نظر کے فرق

کی جڑیں پھوٹتی ہیں اور پوری کتاب کا مجموعی اثر بدل جاتا ہے۔

موصوف دیباچہ میں لکھتے ہیں :-

"شعر جیسی لطیف چیز جس کی پرورش آغوش وجدان میں ہوتی ہے منطقی تنقید و تجزیہ کی گرانباری کی متحمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ نقد و نظر کرنے والا اپنی فکر کو شعر کی طرح تخلیقی نہ بنالے وہ اپنے فرض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ ضرور ہے کہ اس پر بھی کم و بیش اسی قسم کی قلبی واردات گزر چکی ہو جس سے شاعر کو شعر کہتے وقت واسطہ پڑا تھا ورنہ اس کی تنقید خلوص سے عاری رہے گی جس کے بغیر ادب عالیہ کی تخلیق ممکن نہیں۔ اور اس ضمن میں شعر کہنے والے اور شعر سمجھنے والے دونوں کو شامل سمجھتا ہوں۔ تنقید تخلیقی ہونی چاہیے اس واسطے کہ اس کا مقصد و منتہا ان کیفیات کی باز آفرینی ہے جو شاعر پر گزری تھیں۔ تجزیہ میں جب تک تخلیقی عنصر شامل نہ ہو نقد و نظر کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔"

الفاظ بہت شاندار ہیں، صاف اور واضح مفہوم رکھتے ہیں اور ہمیں اسپنگارن کے "تخلیقی نقد" کی یاد دلاتے ہیں جو اسی نقطۂ نظر کو سراہتا ہے۔ وہ جس شاخ پر کھڑا ہوتا ہے اسی کو کاٹ بھی دینا چاہتا ہے۔ اپنے طرز تنقید کی اہمیت نمایاں کر لے کے بعد وہ تنقید ہی کی اہمیت کا منکر ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے جو تنقید صرف ان تصورات، محسوسات اور تخیلات کی باز آفرینی ہی کو اپنا منتہائے نظر جانتی ہے جن سے شاعر کو واسطہ پڑا تھا اس تنقید کا مقصد تشریح و تفسیر کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے اور تشریح و تفسیر کا شمار ادب عالیہ میں کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ اُن کیفیات کی باز آفرینی جو شاعر پر گزری تھیں تخلیق نہیں ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین کا نقطۂ نظر تنقید کے بارے میں یہی ہے اور یہ ایک ایسی بنیادی غلطی ہے جو تصنیف کی اہمیت کو بہت کم کر دیتی ہے۔ جو شخص انھیں کیفیات سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے جو اقبال پر گزری تھیں وہ خود اقبال کے ہی دروازے پر کیوں نہ جائے وہ ایسی کتابیں کیوں پڑھے جو انھیں کیفیات کی باز آفرینی ہیں۔ ایسی کتابوں اور ایسے مضامین کی اہمیت اس کے سوا اور کچھ نہیں رہ جاتی کہ کسی خاص موضوع پر اقبال کے خیالات ایک جگہ مل سکتے ہیں مسلسل مل سکتے ہیں اور ایسے لوگ جو اقبال کو سمجھنے میں سہارے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں انھیں سہارا مل جائے۔ یہ کام شارح کا ہے نقاد کا نہیں ہے۔ نقاد کا منصب اس سے بہت بلند ہے اس کا مقصود فقط صرف ان کیفیات کی باز آفرینی نہیں ہے جو شاعر پر گزر چکی ہیں [illegible]

حد بندی نقاد کی تخلیقی صلاحیتوں کو سلب کر لیتی ہے اور نقد و نظر بے معنی فعل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ نقاد کا ایک اپنا ضمیر اس کی اپنی خودی، اس کا اپنا وجود ہوتا ہے جو مفسر اور شارح کی طرح کچھ دور چل کر شاعر اور تصنیف کے سایے میں پناہ نہیں لیتا بلکہ شاعر کا سینہ اور ادیب کا دل چیر کر اندر جا نکلتا ہے اور دیکھتا ہے کہ اس نے زندگی سے کہاں تک آنکھیں چار کرنے کی جرأت کی تھی غزل گوئی کی شاعری، رسمی اور روایتی شاعری کے روایتی نقاد کا ذکر نہیں کہ وہ تو لفظوں کے الٹ پھیر سے اپنی پیاس بجھا سکتا ہے لیکن وہ نقاد جسے اقبالؔ سے معمہ کو حل کرنا پڑے صرف تشریح کر کے نقد کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ اقبالؔ وہ ہے جس کے اعترافات اور شکوک ہی الجھن میں ڈالنے والے ہیں پھر اس کے نقاد کے یہاں یہ الجھن کیوں نہیں پیدا ہوتی۔

گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود گاہ الجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں

مقامِ عقل سے آساں گزر گیا اقبالؔ مقامِ شوق میں کھویا گیا وہ فرزانہ

مکانی ہوں کہ آزادِ مکاں ہوں؟ جہاں میں ہوں کہ خود سارا جہاں ہوں؟

وہ اپنی لامکانی میں رہیں مست مجھے اتنا بتا دیں میں کہاں ہوں؟

یہ شکوک اور حیات و موت کے بارے میں ہزاروں سوالات جو اقبالؔ کے دائرۂ فکر میں آتے رہتے تھے نقاد سے کیا مطالبہ کرتے ہیں؛ کیا شاعر کی کیفیات کی بازآفرینی؛ اس کی تشریح و تفسیر؛ یہ کوئی بڑا کام نہیں ہے اگرچہ مشکل بہت ہے کیونکہ یہ بالکل ضروری نہیں ہے کہ شاعر کے تجربات کا پورا شعور نقاد کو بھی ہو سکے تاہم یہ ممکن ہے کہ وہ شاعر کے فلسفۂ حیات کا مطالعہ کر کے اس کے تجربات کی اہمیت، اس کے نقطۂ نظر کی افادیت یا غیر افادیت کو اچھی طرح سمجھ سکے۔ نقاد کسی طرح بھی آنکھ بند کر کے کیفیات، اور محسوسات کا مطالعہ نہیں کر سکتا۔ یہ ممکن ہے کہ اقبالؔ کا نقاد اقبال کے لفظ لفظ سے متفق ہو، اقبالؔ کے آرٹ کو اصل آرٹ، اقبالؔ کے فلسفۂ تمدن کو صحیح فلسفۂ تمدن اور اقبالؔ کے مذہبی اور مابعد الطبیعیاتی تصورات کو حقیقی تصورات جانتا اور مانتا ہو لیکن جب وہ یہ کہہ دیتا ہے کہ تنقید کا مقصد اور منتہا انھیں تصورات اور کیفیات کی بازآفرینی ہے تو وہ نقادوں کی صف سے نکل کر شارحین کی صف میں آجاتا ہے اور وہ شارح کی حیثیت سے چاہے جتنا بھی کامیاب ہو نقاد کی حیثیت سے کامیاب نہیں کہا جا سکتا۔ نقاد کی اپنی نظر اس کی اپنی بصیرت ہی اس کے نقد کو تخلیقی بنا سکتی ہے۔ اقبالؔ ہی کا شعر یاد آتا ہے ؎

دیکھے تو زمانے کو اگر اپنی نظر سے　　افلاک منور ہوں ترے نور سحر سے

یہ اپنی نظر ہی نقاد کا حربہ ہے جسے وہ کسی طرح الگ نہیں رکھ سکتا۔

اس اصولی بات کو اتنی اہمیت دے کر لکھنا شاید بعض حضرات کو نامناسب معلوم ہو لیکن اب زمانہ دیکھنے اور خاموش رہ جانے کا نہیں ہے۔ اقبال پر درجنوں کتابیں اور مقالے لکھے جا چکے ہیں، روزانہ لکھے جا رہے ہیں، صدیوں تک لکھے جائیں گے کیونکہ اقبال اردو ادب کے سرمایہ کا سب سے بیش قیمت موتی ہے۔ ضرورت ہے کہ لکھنے والے قدم آگے بڑھائیں اور ذہنی ایمانداری کے ساتھ اقبال کے فلسفۂ شعر و فلسفۂ حیات کا جائزہ لیں اور جرأت کے ساتھ وہاں انگلی رکھ دیں جہاں اقبال کی رہنمائی غلط ہے۔ اس کا اعتراف ہر شخص کو ہے کہ اقبال صرف شاعر نہیں ہے وہ حکیم اور فلسفی بھی ہے، زمانے کا نبض شناس بھی ہے، وہ محقق بھی ہے اور ناقد بھی، وہ کوہ و بیاباں سے ہم آغوش ہے لیکن ہاتھوں سے "دامن افلاک" بھی نہیں چھوڑتا، وہ "اندیشۂ افلاکی" بھی رکھتا ہے اور اس نظر پر طعنہ زن بھی ہے "جو شی کی حقیقت کو نہ دیکھے" اس اقبال کے نقاد کی ذمہ داری بہت زیادہ ہے۔ جو اپنی نظر سے دیکھنے کا مطالبہ کرتا ہے۔

نقاد کا فریضہ کیا ہے اور خاص کر اقبال کے نقاد کا فریضہ کیا ہے یہ بحث کوئی اور وقت تلاش کرے گی اس وقت تو اتنا ہی سمجھنا کافی ہوگا کہ نقاد کے لیے فن کا اور اہل ہنر کے خیالات کی درستی و نادرستی پر نظر رکھنا بھی ضروری ہے زندگی کے بدلتے رہنے کا احساس اقبال سے زیادہ کس کو ہوگا لیکن اگر نقاد اس تصور کو نظرانداز کر دے تو وہ اقبال کے بارے میں کیا لکھے گا۔ نقاد کو تو یہ دیکھنا ہوگا کہ کسی ادیب، شاعر یا فنکار میں زندگی کے نقش کیسے ملتے ہیں، حقیقتوں پر اس کی کتنی نظر ہے، اس کا فن انسانی زندگی کی رہنمائی کس طرف کرتا ہے۔ اقبال حقایق کا متلاشی تھا اور حقایق متحرک ہیں۔

جب تک نہ زندگی کے حقایق پہ ہو نظر　　تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریف سنگ

اقبال رضامند ہے اس کی شاعری کو حریف سنگ بنا کر پرکھا جائے۔ کیوں کہ اس کی نظر حقایق پر تھی۔

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن　　جو شی کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

بنزوران ہند کی شکایت کرتا ہے:

موت کی نقش گری ان کے صنم خانوں میں　　زندگی سے ہنر ان برہمنوں کا بیزار

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ جاوداں پیہم رواں ہردم جواں ہے زندگی

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

دما دم رواں ہے یمِ زندگی ہر اک شے سے پیدا رمِ زندگی

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود کہ ہر لحظہ تازہ ہے شانِ وجود

اقبال کا فن زندگی کی ترجمانی ہے جس میں زندگی کا سوز نہیں اقبال اس فن کو "سودائے خام" سے کم نہیں سمجھتا۔ وہ شاعر کے سونے کو زندگی کی بھٹی میں تپانا ضروری سمجھتا ہے ورنہ شعر شعر نہ رہے گا۔

اے میانِ کیسہ اتش نقدِ سخن بر عیارِ زندگی او را بزن

ان اشعار کی موجودگی میں اقبال کی تصوریت ایک مشکل مسئلہ کی حیثیت اختیار کرلیتی ہے نقاد کا فرض ہے کہ وہ یہ بتائے کہ اقبال انسانوں کو کس منزل تک لے جانا چاہتا تھا۔ عمل کی زندگی میں اس کی تصوریت افلاطون اور برکلے کی تصوریت سے کسی قدر مختلف ہے۔ ایک مستقبل کی جانب اشارہ کرنے والے شاعر کی حیثیت سے اقبال نے ترقی اور عمل کی اصلی راہ کو دیکھا یا نہیں دیکھا۔ فلسفہ اور سیاست، اخلاق اور عمل میں جو نظریاتی اور عملی کشمکش مختلف تمدنوں میں جو تصادم ہو رہا ہے اقبال اس سے پوری طرح واقف تھا پھر اس نے صرف تصوریت سے کام لیا یا جاندار اور ترقی پسند اجزار کو اپنے فلسفہ خیال میں جگہ دی۔ کوئی مصنف یا شاعر جو پیامبر ہونے کا بھی دعویٰ کرتا ہے اپنی اس سماجی ذمہ داری سے عہدہ برا نہیں ہوسکتا کہ زیادہ سے زیادہ انسانوں کی مسرت کا سامان مہیا کرنے کی سعی کرے اقبال کے نقاد کو یہ سب کچھ دیکھنا ہے۔ اقبال صرف مسلمانوں کا شاعر تھا یا کائنات کا۔ اس نے اسلامی اشارے اور علامتیں برابر استعمال کی ہیں۔ کیا اس سے اس کی شاعری محدود نہیں ہوتی جب وہ صرف علامتوں کی حیثیت سے نہیں جذباتی وحدتوں کی حیثیت سے بھی استعمال ہوئی ہیں، اگر وہ صرف اسلام کا شاعر تھا تو کھل کر یہی کہنے کی ضرورت ہے۔ اقبال نے وہ کون سا خاص پیام دنیا کو دیا جو قابل عمل بھی ہو اور عہد حاضر کی کشمکش کو دیکھتے ہوئے سائنس کی ترقی اور زندگی کی نئی قدروں پر نظر رکھتے ہوئے مستحسن بھی ہو۔ ان چیزوں کو ناقدانہ بصیرت کے ساتھ بیان کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔ اقبال نے بے یقینی کی مذمت کی ہے کیونکہ ایک مشکک خودی کے بلند مرتبہ پر پہنچ ہی نہیں سکتا۔

یقیں مثلِ خلیل آتش نشینی یقیں اللہ مستی خود گزینی

عشق اِتے تہذیبِ حاضر کے گرفتار　　غلامی سے بہتر ہے بے یقینی

لیکن عصرِ حاضر اپنی تمام تر تنا بناکیوں کے ہوتے ہوئے بہت بڑے شک میں مبتلا ہی، اقبال بھی اپنے ایقان و ایمان کے باوجود شک میں مبتلا ہو جاتا تھا۔

نگہ اُلجھی ہوئی ہے رنگ و بو میں　　خرد کھوئی گئی ہے چار سو میں

نہ چھوڑ اے دل فغانِ صبحگاہی　　اماں شاید ملے اللہ ہو میں!

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید　　کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کن فیکون

یہ چند نمونے ہیں اُن اُلجھنوں کے جو اقبال کے طالب علم کے یہاں پیدا ہوتی ہیں، نقاد اگر ان مشکلوں کو حل نہ کر سکے تو وہ کیونکر کامیاب کہا جا سکتا ہے!

ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے اقبال کے فلسفۂ حیات اور شعر کو پوری طرح واضح کرنے کے لیے تین حصوں میں تقسیم کر لیا ہے۔ پہلا حصہ "اقبال اور آرٹ" کے نام سے موسوم ہے یہ کم و بیش وہی مضمون ہے جو اردو کے اقبال نمبر میں شایع ہو چکا ہے۔ اقبال کے آرٹ کا تجزیہ بڑی خوبی سے کیا گیا ہے اگرچہ بعض جگہ "سخن گسترانہ" باتوں کے بے موقع نکلتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ جب کسی نقطۂ نظر کے ماتحت نقاد اپنے ذمہ رائے زنی بھی رکھتا ہے تو وہ تاویلات کے دام میں گرفتار نہیں ہوتا، اس کی گفتگو صاف اور اس کا نقطۂ نظر واضح ہوتا ہے، وہ جہاں مطمئن نہ ہو سکے وہاں اپنی بے اطمینانی ظاہر کر سکتا ہے لیکن جب وہ صرف تشریح کرتا ہے تو مصنف کی ذہنی پیچیدگیوں کا شکار ہو جاتا ہے اور بغیر تاویل کے کام نہیں چلتا۔ عشق اور عقل، علم اور جنون مختلف شکلوں میں اقبال کی شاعری کا خاص موضوع ہیں، اسے تمنا بھی تھی کہ خدا نے اسے عقل دی ہے تو جنون و عشق بھی نصیب کرے۔ خدا سے مناجات کرتا ہے۔

عقل دادی ہم جنونے دہ مرا　　رہ بہ جذب اندرونے دہ مرا

علم در اندیشہ می گیرد مقام　　عشق را کاشانہ قلبِ لا ینام

[illegible] شاعرانہ انداز میں مختلف سطروں پر ہے کہیں یہ [illegible]

بہتر ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل　　لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

کہیں یہ [illegible]

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

کہیں عشق سراپا حضور" اور عقل سراپا حجاب" ہے کہیں عشق تمام مصطفےٰ" ہے اور عقل تمام بولہب"۔ لیکن روح اقبال کے مصنف کا یہ کہنا کہ" اقبال عشق کو عقل کے مقابلہ میں فضیلت دیتا ہے اس واسطے کہ اس کے ذریعے حقایق اشیاء کا مکمل علم اور بصیرت حاصل ہوتی ہے" ایسی تصوریت ہے جو اقبال کے نقطۂ نظر کو واضح کرتی ہے لیکن اسے بالکل نظر انداز کر جاتی ہے کہ حقایق اشیا کا یقینی علم صرف مادی تجربوں سے ممکن ہے اور مادی تجربے علم میں شامل ہیں! عشق اور عقل کی جنگ نظریہ اور عمل کے افتراق سے پیدا ہوتی ہے۔ دونوں کی تفریق کا اصل سبب تصوریت اور مادیت میں ایک ایسا تناسب قایم کرنے کی کوشش ہے جس میں تصوریت کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اور یہ ماننے سے انکار کیا جاتا ہے کہ شعور اور ذہن کے مخفی پہلو بھی خارجی اثرات اور مادی روابط کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فلسفۂ عینیت بھی تاریخ افکار میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی موافقت میں بھی بہت سی باتیں کہی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ اقبال نے اپنی تصوریت میں حقایق کی آمیزش بھی کی تھی، اپنے فلسفہ کو افلاطون اور برکلے سے الگ بھی کیا تھا لیکن اس کے سلسلۂ افکار کا مجموعی اثر تصوریت ہی رہ جاتا ہے جو عام طور پر داخلی ہے، صرف کبھی کبھی خارجی اور معروضی۔

کتاب کا دوسرا حصہ جو اقبال کے فلسفۂ تمدن سے بحث کرتا ہے سب سے زیادہ طویل اور سب سے زیادہ اہم ہے کیونکہ اسی میں فلسفیانہ حیثیت سے فرد اور جماعت، خودی، عمل اور اخلاق، انسان کامل وغیرہ کی بحثیں آئی ہیں۔ علم کی بحث ذرا عشق کی بحث سے الگ ہو کر پھر آئی ہے اور پیچیدگیوں کے نئے زاویے پیدا کرتی ہے ڈاکٹر یوسف حسین خاں لکھتے ہیں:-

"علم ہی انسانی خودی کا وہ کرشمہ ہے جس کی بدولت اس کی قوتوں اور تصرفات کی کوئی انتہا نہیں رہتی"

اور یہی وہ علم ہے جو خودی کے فلسفی اقبال کے یہاں "تخیل بے رطب"، "زناری کفر"، اور "بولہب" کا خطاب پاتا ہے۔ اور خدا قرآن مجید میں نہ جانے کتنی جگہ اپنی فضیلت کے اظہار کے لیے علم ہی کو پسند کرتا ہے اور انسانوں کو تحصیل علم ہی کے ذریعہ تسخیر فطرت کی دعوت دیتا ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ علم اور عشق کا امتزاج ہی صحیح نقطۂ نظر پیدا کر سکتا ہے۔

اقبال کے یہاں خودی زندگی کا مرکز ہو اگر وہ واضح نہیں تو کچھ بھی واضح نہیں۔ روح اقبال میں یہی ملتا ہو" کہ زندگی ایک مسلسل حرکت ہو جو نت نئی خواہشات کی تخلیق کرتی اور اسی طرح اپنی توسیع و بقا کا سامان مہیا کرتی ہو۔ وہ پیہم عمل اور کشمکش سے لازوال ہو جاتی ہو" یہ پیہم عمل اور کشمکش کس کے خلاف ہو، اقبال تو ہیگل کے صدف کو گہر سے خالی کہتا ہو اس کی کشمکش خلا میں نہیں ہونی چاہیے کشمکش اور عمل سماجی رشتہ میں زندگی کی قدریں پیدا کرتے ہیں، ترقی کے راستے دکھاتے ہیں، اپنی ہی ذات سے، اپنے ہی اندر کی کشمکش تصوف کی راہ پر ڈال دیتی ہو، اقبال کے اشارے انسانوں کی مدد کم کرسکتے ہیں" پانی کا قطرہ جب حرف خودی ازبر کرلیتا ہو تو اپنی ہستی بے مایہ کو گوہر بنا دیتا ہو، سبزہ جب اپنی ذات میں اُگنے کی قوت پیدا کرلیتا ہو تو سینۂ گلشن کو چاک کر ڈالتا ہو" کوئلہ ہیرا بنتا ہو اور نہ جانے کیا کیا ہوجاتا ہو۔ یہ مثالیں انسانوں کی رہنمائی نہیں کرسکتیں کیونکہ اُن کے تجربوں کی زبان بالکل دوسری ہو ان کی کشمکش اور ان کا عمل پانی کے قطرہ، کوئلہ اور سبزے کی کشمکش سے بالکل جداگانہ ہو اور خالص منطقی حیثیت سے بھی یہ مثالیں صرف شاعرانہ تشبیہیں ہوکر رہ جاتی ہیں۔ اقبال اس مسئلہ میں بھی تصوریت محض سے کام لیتا ہو اور اس کشمکش کو شعور کی کشمکش اور اپنے وجود کی کشمکش میں محدود کرتا ہو۔

عمرہا برخویش می پیچد وجود　　تا یکے بے تاب جاں آید فرود

فرد اور جماعت کے تعلق پر بھی جو بحث کی گئی ہو وہ زیادہ واضح نہیں غالباً اس کی وجہ یہ ہو کہ اس مسئلہ پر اقبال کے یہاں بھی کافی اُلجھن تھی، فرد نے جو اہمیت خودی حاصل کرنے کے سلسلہ میں اختیار کرلی ہو اس کے بعد جماعت کی اہمیت بہت کم رہ جاتی ہو تاہم اقبال نے دونوں میں ربط قایم کرنے کی کوشش کی ہو اور وہ ربط انسان کامل کو اقتدار سونپ دینے سے قایم ہوتا ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہو کہ اقبال کو عوام پر اعتماد نہیں ہو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مصنف روح اقبال بھی یہ طے نہیں کرسکا کہ عوام پر کتنا بھروسہ کیا جائے اور کتنا نہ کیا جائے۔ ڈاکٹر یوسف حسین لکھتے ہیں:-

"انسانیت کے تمام اہم فیصلوں کو جو زندگی کے رخ کو بدلنے والے ہوں محض تعداد کے تابع کردینا انسانیت کے لیے باعث ننگ ہو"

اور پھر صرف چند صفحوں کے بعد یہ عبارت ملتی ہو

"اقبال کے نزدیک وہی سیاست حقیقی ہو جو مصالح کلی کی نگہبان ہو نہ کہ جزوی مفاد کی جسے افادی نقطۂ نظر

کے مطابق اکثریت کے ذریعے متعین کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔"

اہم فیصلے محض تعداد کے تابع بھی نہ ہوں اور مصالح کلی اکثریت کے ذریعے متعین بھی کیے جائیں ان میں کس طرح توازن قایم ہو۔ اس الجھن کا سبب یہی ہے کہ ڈاکٹر یوسف حسین کے یہاں بھی فرد و جماعت کے رشتہ کو عملی زندگی میں سمجھنے کی کوشش نہیں ہے اس لیے نہ تو اس تضاد کو سلجھاتے ہیں اور نہ اس پر نقد کرتے ہیں۔ اسی طرح ہمیں یہ عبارتیں ملتی ہیں۔

(۱) "اہل مغرب کا غلبہ و استیلا محض اتفاقی نہیں ہے بلکہ اس کی تہ میں وہی بنیادی اسباب کارفرما ہیں جن کی بدولت دوسرے تمدنوں کو دنیا میں فضیلت حاصل ہوئی۔ کیونکہ جدید یورپی تہذیب بڑی حد تک اس پیغام کی تکمیل ہے جو اسلام نے دیا تھا اس لیے اقبال اس میں کوئی ہرج نہیں سمجھتا کہ عالم اسلامی اس وقت تیزی سے یورپ کی طرف جھک رہا ہے۔"

(۲) "یہ کبھی نہیں ہوا کہ کسی غیر مستحق جماعت کو غلبۂ استیلا حاصل ہوا اور اس کو تمکن ارضی کی ذمہ داری سپرد کر دی گئی ہو۔"

کیا ان عبارتوں سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ یورپی تہذیب پیغام اسلام کی تکمیل کرتی ہے، اسلامی پیغام مکمل نہ تھا۔ یورپی تہذیب کا پیغام مکمل ہے اور کیا اس لیے ہمیں یورپ کی تہذیب کے سامنے سر جھکا دینا چاہیے کہ اگر وہ مستحق نہ ہوتے تو خدا انھیں غلبہ و استیلا کا یہ موقع کبھی نہ دیتا۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اقبال نے اس مسئلہ کو بہت پیچیدہ بنا دیا ہے۔ وہ عمل کا قائل ہے، عمل جس میں بھی ملے لیکن وہ فلسفۂ افرنگ سے بچنے کی تلقین بھی قدم قدم پر کرتا ہے تاکہ مشرق کی خودی مغرب کی خودی کی غلامانہ نقالی ہو کر نہ رہ جائے لیکن وہ کہیں بھی کھل کر صاف لفظوں میں عرب یا ہندوستان سے یہ نہیں کہنا چاہتا کہ انگریزوں کی غلامی کا جوا اتار پھینکو اپنے لیے ایک نیا نظام حیات بناؤ اس کا یہ کہنا کہ یورپ کو ہم پر غلبہ کا حق ہے، جیسا کہ "روح اقبال" کے مصنف نے ظاہر کیا ہے ہم سے چھٹکارا حاصل کرنے کا حوصلہ چھین لیتا ہے۔ اگر اقبال کا نقاد اس پر رائے زنی نہ کرے تو کون کرے گا؟

اقبال کو زندگی کے ہر لحہ بدلتے رہنے کا احساس تھا اور جو بھی تاریخی طور پر اس کا قائل ہوگا وہ مطلق قدروں کو کبھی اپنے خیال میں جگہ نہیں دے سکتا کیونکہ مطلق قدریں زندگی کے بدلتے ہوئے نظام میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی ہیں یہی وجہ ہے کہ اقبال منزل کا تعین نہیں کر سکتا۔

تو رہ نورد شوق ہے منزل نہ کر قبول　　لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول
اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز　　ساحل بھی گر عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی　　　فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

ایک طرف تو اس سے ایک بے معنی تصوریت پیدا ہوتی ہے۔ دوسری جانب اس بات کا پتہ چل جاتا ہے کہ اقبال مطلق قدروں کا قائل نہ تھا اگرچہ ایسا ہمیشہ نہ ہوتا تھا

زمانے کے انداز بدلے گئے　　　نیا راگ ہو ساز بدلے گئے

یہ ساز کے ساتھ راگ کا بھی بدل جانا قدروں کے بدل جانے کا پتہ دیتا ہے۔ تمام کائنات جس میں ہر لمحہ صدائے کن فیکون آرہا ہو جامد اور مطلق قدروں کی کائنات کیسے ہو سکتی ہے۔ اقدار وں کی تخلیق انسانی اعمال سے ہوتی ہے لیکن ڈاکٹر یوسف حسین کا خیال ہے کہ "زندگی اور مادہ تغیر پذیر ہیں لیکن اقدار مستقل اور ناقابلِ تغیر ہیں" اقدار علاوہ انسانی رشتے کے اور کس طرح پیدا ہوتی ہیں کس کسوٹی پر پرکھی جا سکتی ہیں یہ ہر شخص جاننا چاہے گا۔ قدریں زندگی سے باہر کہاں ہیں اور اگر قدریں زندگی سے متعلق ہیں تو جب زندگی تبدیل ہوگی تو قدریں کیوں تبدیل نہ ہوں گی؟ پھر بھی اقبال کی تصوریت میں قدروں کے بدل جانے کا احساس گم ہو جاتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ انسانی فطرت تبدیل ہوتے ہوئے حالات میں بھی وہی رہیگی۔

زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا　　　طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

جب طبقات کے تعلقات، پیداوار اور تقسیم کے رستے بدل جائیں گے خیال ہے کہ طبقہ کا وجود ہی نہ رہے گا ایسی حالت میں پرویزی حیلوں کی کیا ضرورت باقی رہ جائے گی؟ خارجی حالت کی تبدیلی داخلی کیفیات کو بدل دیتی ہے۔ صرف اپنی تخئیل کی مدد سے داخلی کیفیات کو بدل لینا کافی نہیں، یہ خود فریبی ہوگی۔ اقبال کو خود بھی کبھی اس کا احساس ہوتا تھا مگر بہت کم۔

نفس کے زور سے وہ غنچہ وا ہوا بھی تو کیا　　　جسے نصیب نہیں آفتاب کا پرتو

نقاد جب تک اس نقطۂ نظر کو اچھی طرح نہ سمجھ لے اور اپنے پڑھنے والوں کو نہ سمجھائے وہ کوئی بات بالکل صاف نہیں کہہ سکتا۔ اس طرح ڈاکٹر یوسف حسین اس لحاظ سے تو کافی کامیاب ہیں کہ وہ اقبال کے ہر شعر کی توضیح کر سکتے ہیں اُن میں ایک طرح کا تسلسل تلاش کر سکتے ہیں لیکن اقبال کو ایک انسانوں کے رہبر کی حیثیت سے نہیں پیش کر سکے کیونکہ وہ اقبال کے اشعار اور خیالات کی تاویلیں کرتے اور انھیں کو دہراتے رہے یہ کہیں نہ بتا سکے کہ ان خیالات اور تصورات کا عملی زندگی میں کیا مرتبہ ہے اور ان کے حصول کی عملی صورتیں کیا ہوں گی۔

کتاب کا تیسرا حصہ اقبال کے مذہبی اور مابعد الطبیعی تصورات کا ذکر کرتا ہے۔ مذہب ہی اقبال کی شاعری کا بنیادی پتھر ہے وہ اس کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا اور بقول مصنف "روحِ اقبال" انسانیت کا ہزاروں سال

کا تجربہ ہو کہ اندرونی تبدیلی مذہب و اخلاق کی مدد کے بغیر ممکن نہیں ہو اگرچہ دبی زبان سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جن ہزاروں سال کا ذکر ہو وہ انسانی تاریخ میں طبقاتی کشمکش کے سال رہے ہیں ان میں بننے والی قدروں اور عملی مساوات کی زندگی (جس کا عملی تصور بعض فلسفی کرتے ہیں اور جس کا تجربہ ہو رہا ہو) سے پیدا ہونے والی قدروں میں زمین آسمان کا فرق ہوگا مگر خیر! اقبال کا زندگی کا تصور فلسفۂ مذہب کا تصور رہا ہو اور اس کے مابعد الطبیعیاتی تصورات خودی کے گرد چلتے ہیں۔ اقبال نے جس طرح اسلام کو سمجھا ویسے کم لوگوں نے سمجھا ہو، وقت گزر رہا تھا اور اقبال کو "ہوائے دشت سے بوئے رفاقت" آتی معلوم ہوتی تھی، اس کا نقطۂ نظر پسند کیا جانے لگا تھا۔ بہت سے لوگ اسی ترجمانی کو اسلام کی صحیح ترجمانی سمجھتے تھے جو اقبال نے کی تھی۔ اس کا مذہب کا تصور مغرب اور مشرق کے مختلف فلسفوں، سائنس اور دوسرے عمرانی علوم سے بہت ہی اعلیٰ واقفیت کا نتیجہ ہو اس لیے وہ ایک تنگ نظر مولوی اور متعصب یا جنبہ دار مسلمان کی حیثیت سے مذہب کو نہیں پیش کرتا بلکہ ایک فلسفہ کی حیثیت سے۔ کوئی اس سے اتفاق کرے یا نہ کرے وہ اپنے مقدمہ کو بڑی قوت اور زور کے ساتھ پیش کرتا ہو۔

الٰہیات کا تعلق چونکہ ماورائی تجربات اور باطنی علم سے ہو اس لیے اس میں بھی کافی بحث و مباحثہ کی گنجائش نکل سکتی ہو لیکن اس تبصرہ میں نہ تو اس کا موقعہ ہو اور نہ ضرورت۔ جہاں تک اس خشک اور دقیق مبحث کو سہل اور جاندار بنا کر لکھنے کا تعلق ہو ڈاکٹر یوسف حسین نے بڑی کاوش سے کام لیا ہو لیکن وہی باتیں جو کمزوری کی حیثیت سے دوسرے ابواب میں پیش کی جا چکی ہیں یہاں بھی آتی ہیں بعض مباحث دہرائے گئے ہیں اور اگرچہ دہرانا کوئی عیب نہیں ہو اگر وہ وضاحت میں مدد دے لیکن انھیں ایک ہی جگہ رکھا جاتا تو بہتر ہوتا۔

جبر اور اختیار ایک مذہبی مسئلہ کی حیثیت سے علم کلام کا پسندیدہ موضوع رہا ہو اب اسے سائنس کی دنیا میں وہی فروغ حاصل ہو کیونکہ جب تک انسانی افعال اور اعمال سے اخذ ہونے والے نتائج اور پیدا ہونے والے اثرات کو نہ جانا جائے کوئی اصول مرتب نہیں ہو سکتا۔ سرسری نظر سے دیکھا جائے تو اس میں کوئی اہمیت نہیں رہتی اور نہ بہت پیچیدہ معلوم ہوتا ہو لیکن مابعد الطبیعیات اور طبیعیات کا ایک مہتم بالشان مسئلہ ہونے کی حیثیت سے جبر و اختیار کی پیچیدگیاں ہر وقت ایک مشکل گتھی کی شکل میں سامنے آتی ہیں۔ اقبال نے تقدیر اور زمانے کا جو تصور پیش کیا ہو اس سے انسان بہت کچھ آزاد اور خود مختار معلوم ہوتا ہو اگرچہ اس کی آزادی محدود اور مشروط ہو۔ ڈاکٹر یوسف حسین لکھتے ہیں:-

"انسانی آزادی محدود اور مشروط ہو اس کے اختیار کا مطلب یہ ہو کہ اس کی اندرونی زندگی میکانکی جبر

سے آزاد ہو لیکن اس کی خارجی زندگی پر طبعی اثرات اسی طرح مترتب ہوتے ہیں جس طرح فطری مظاہر پر"

پھر آگے بڑھ کر لکھتے ہیں:-

"آزادی بے روک قوت ہو جس کا سرچشمہ شعور ہو اس لیے یہ خاص موضوعی چیز ہوئی جس پر فطرت کے جبر و لزوم کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔ انسان گناہ پر متاسف اس لیے ہوتا ہو کہ اس کے ارادہ میں آزادی کی اندرونی صفت موجود تھی لیکن پھر بھی اس نے صحیح راہ عمل نہ اختیار کی"

وہی داخلی اور موضوعی زندگی کی بحث پھر ہو۔ آزاد اور بے روک داخلیت بے مقصد خیال آرائی کے سوا اور کیا ہو جبر و اختیار کا پتہ صرف عمل کی زندگی میں چلتا ہو اس کے باہر اُس کے سوچنے کی ضرورت بھی نہیں معلوم ہوتی۔ حرکت سے رشتے اور روابط بدل جاتے ہیں۔ گناہ کے مقررہ تصور نے متاسف ہونے کی عادت ڈالی ہو جو شراب کو گناہ سمجھ کر نہیں پیتا اس کے یہاں تاسف کہاں؟ اس لیے اختیار اور آزادی کا مفہوم عمل ہی کی کسوٹی پر پرکھا جا سکتا ہو۔

جبر کا ایک تصور تو تاریخی اور سائنٹفک ہو جس کا تعلق انسانی افعال و اعمال سے ہو۔ دوسرا تصور میکانکی ہو جو صوفیوں نے کبھی کبھی پیش کیا ہو یعنی یہ کہ انسان مجبور محض ہو اس لیے وہ اپنے افعال کا ذمہ دار نہیں ہو اس میں اور کوئی نقصان ہو یا نہ ہو یہ بات ضرور پیدا ہو جاتی ہو کہ انسان کی ترقی کے امکانات محدود دکھائی دینے لگتے ہیں اور خدا ایک ظالم و جابر، قہار و جبار ہی کی حیثیت سے نظر آتا ہو۔ کبھی کبھی اقبال بھی "روز حساب" اپنے "دفتر عمل" میں کمزوریوں کا خیال کر کے کچھ اپنے ذمہ لینا چاہتا ہو اور کچھ خدا کے ذمہ کر دینا چاہتا ہو۔

روز حساب پیش ہو جب مرا دفتر عمل　　　آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

بہرحال یہ ایک مختصر تبصرہ ہو کوئی مضمون نہیں ہو۔ میں نے صرف یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہو کہ اقبال کے نقاد کو ان پیچیدگیوں کا خیال رکھے بغیر چارہ نہیں۔ اس کا کام صرف یہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ اُن کیفیات کی تحلیل کرے جو شاعر پر گزری تھیں اور ان کی تشریح کر دے۔ ڈاکٹر یوسف حسین نے رائے زنی سے پرہیز کیا ہو جیسے دوسرے لکھنے والے پرہیز کرتے رہے ہیں لیکن وقت کا تقاضا ہو کہ اقبال کو زیادہ گہری نظر سے دیکھا جائے اور اس کی تصوریت ہی کے اندر جو حقیقتیں ہمارے لیے کام کی ہیں انھیں تلاش کیا جائے۔ اقبال کی قدر یہ نہیں ہو کہ اس لات و منات کے توڑنے والے کی پرستش کی جائے اس کی قدر یہ ہو کہ اس کے خلوص، سوز اور علم سے دوسروں کے سینے بھی منور کیے جائیں۔

روح اقبال جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہو محدود و یک طرفہ تبصرہ ہونے کے باوجود اب تک اقبال پر سب سے اچھی کتاب ہے۔

سید احتشام حسین

کارل مارکس

کارل مارکس ۵ مئی ۱۸۱۸ء کو پیدا ہوا ابھی بچہ ہی تھا کہ اس کے متعلق باپ نے یہ رائے قایم کی کہ "بڑا شیطان نکلے گا" لیکن ممتا کی ماری ماں یہ کہتی تھی کہ امیر کبیر اور صاحب اقبال ہوگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مارکس ذہین تھا اور ابھی ۱۷ سال ہی کا تھا کہ بون یونیورسٹی میں داخل ہوگیا۔ اس نے اپنے اسکول یا یونیورسٹی کے حالات نہیں چھوڑے اور نہ کسی دوسرے ہی وسیلے سے دنیا کو معلوم ہوئے جن سے اس کے ابتدائی رجحانات کا اندازہ ہوتا البتہ اتنا معلوم ہے کہ اسکول کے زمانہ میں اس نے ایک مضمون بعنوان "نوجوانوں کو کونسا پیشہ اختیار کرنا چاہیے" لکھا تھا۔ جس میں ایک جملہ ہے "ہم سماج میں اپنی مرضی کے مطابق پیشہ اختیار نہیں کرسکتے کیونکہ گرد وپیش کے حالات ہماری پیشہ کی پسندیدگی سے قبل ہی اتنے سخت ہوجاتے ہیں کہ ان حالات کو قبول ہی کرتے بن پڑتی ہے" یہ جملہ اس فلسفہ کا پتہ دیتا ہے جس کی مارکس نے آیندہ زندگی میں تبلیغ کی۔ کالج کی زندگی کی بابتہ مارکس کے والد کے چند خطوط موجود ہیں جو مارکس کی طالب علمی کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان خطوط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مارکس نے کالج کا زمانہ بے فکری اور بے پروائی میں گزارا۔ خرچ زیادہ کیا اور جو خاص مضمون یعنی قانون منتخب کیا تھا اس کی طرف کم توجہ کی۔ کالج کی لاابالی زندگی میں عشق کی سوجھی چنانچہ ۱۸ ہی کا سن ہوگا کہ اپنی بہن کی ہم جولی سے دل لگا لیا۔ جینی ویسے تو شکل وصورت کی بہت اچھی اور ذہین تھی لیکن مارکس سے چار سال بڑی تھی۔ اس نے بھی یہ غضب کیا کہ بلا والدین کی مرضی معلوم کیے مارکس سے شادی کا وعدہ کرلیا۔ بچپن ہی سے مارکس اپنی سسرال سے آشنا تھا اور اپنے خسر کی بہت عزت کرتا تھا۔ اگرچہ جینی کے والدین کی رضامندی حاصل کرلی گئی تھی اور باقاعدہ منگنی بھی ہوگئی تھی لیکن مارکس کے والد نے یہ شرط لگادی کہ جب تک تعلیم پوری نہ ہوجائے یہ دونوں نہ آپس میں ملیں اور نہ خط وکتابت کریں۔ مارکس جب خود باپ بنا تو بچوں سے کہا کرتا تھا "اگرچہ میں نے یہ وعدہ کرلیا تھا کہ جب تک تعلیم کی تکمیل نہ ہوجائے گی جینی سے کسی طور پر اظہار الفت نہ کروں گا لیکن ابتدائی زمانہ میں جینی کی محبت نے اتنا ستایا کہ خوشامد درآمد کرکے جینی سے خط وکتابت کرنے کی والد سے اجازت لے ہی لی" کالج کا پہلا سال عشق کے

اثر میں شعر و شاعری میں گزرا تین کاپیوں میں اشعار لکھے گئے جو جینی کے نام سے منسوب کیے گئے اور ان کو ہدیہ محبت کے طور پر جینی کی خدمت میں روانہ کر دیا گیا۔ مارکس کی بہن صوفیا نے جب اطلاع دی جینی نے تمھاری غزلوں کا خوشی اور تاسف کے آنسوؤں سے خیر مقدم کیا تو مارکس بہت مسرور ہوا۔

اگرچہ مارکس نے کالج میں خاص مضمون قانون منتخب کیا تھا لیکن ذوقِ علمی اس کو ہر لکچر میں لے جاتا تھا طبیعت کتابوں سے نکل کر حقیقت کی جستجو کی طرف مائل ہو رہی تھی۔ جتنا حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کرتا اتنا ہی الجھن میں پڑتا اس ذہنی اور روحانی کشمکش کا یہ نتیجہ ہوا کہ صحت خراب ہوگئی اور ایک دارالشفا میں جانا پڑا۔ وہاں سے واپسی پر بھی روحانی کشمکش کم نہ ہوئی تو والد کو لکھا ذہنی انقلاب پیدا ہو رہا ہے اس انقلاب کا ذکر حاضر خدمت ہو کر ہی عرض کر سکتا ہوں اجازت عنایت ہو تاکہ اپنی روح کا بوجھ ہلکا کر سکوں" اگرچہ مارکس کے والد مرنجان و مرنج انسان تھے لیکن صاحبزادے کی بے پروائیوں سے پریشان ہو رہے تھے۔ اس التجا کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں "خدا ہمارے حال پر رحم کرے۔ تم ترتیب و نظام سے کام نہیں کرتے بلکہ علم کے مختلف شعبوں میں علمی آوارہ گردی کرتے پھرتے ہو بے ربط غور و فکر نے نتیجہ رہتا ہے بے ربط علمی مشاغل سے بھی وقت اسی طرح ذبح ہوتا ہے جیسا کہ بادہ و ساغر سے حسن اخلاق اور اپنے والدین کی خوشنودی کا خیال تمھارے نزدیک مہمل مسائل ہیں۔ تمھارے حسن اخلاق کا یہ عالم ہے کہ شاید جینی کے محبت بھرے اور ایک نیک نیت باپ کے خطوط جو خون کے آنسوؤں سے لکھے جاتے ہیں تم ان سے پائپ روشن کرتے ہوگے۔ خیر یہ بھی برا نہیں ہے کیونکہ اس طرح وہ خطوط غیر متعلق لوگوں کے ہاتھوں میں پڑنے سے تو بچ جاتے ہیں کیونکہ تمھارے بھوہڑپن سے تو یہی امید ہے کہ اگر وہ سوختہ نہ ہوں گے تو دوسروں کے ہاتھوں میں پڑیں گے۔ اگرچہ امیر سے امیر لڑکا بھی صرف ۵۰۰ تھیلر (ایک تھیلر ۳ شلنگ کے برابر ہوتا ہے) خرچ کرتا ہے لیکن تم ایسے ہو کہ ۷۰۰ تھیلر خرچ کرتے ہو شاید تمھارا یہ خیال ہے کہ میں سونے کا بنا ہوا ہوں گھر آنا فضول ہے اگرچہ مجھے معلوم ہے کہ تم اپنے لکچروں کو کچھ اہمیت نہیں دیتے لیکن جماعت میں جو رسمی طور پر چلے جاتے ہو وہی جاری رہے تو غنیمت ہے۔" اس خط کا یہ اثر ہوا کہ مارکس نے گھر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ ایسٹر کی تعطیلات میں بھی کالج ہی میں رہا۔ ماں کو تو رنج ہوا لیکن باپ کو خوشی ہوئی۔ مارکس کی بدقسمتی کہ قلیل عرصے بعد اس کے والد بیمار پڑے اور ۱۸۳۸ء میں گزر گئے اور یہ اچھا ہی ہوا ورنہ مارکس کی آئندہ زندگی کے مصائب ان کا دل

توڑ ڈالیے۔ مارکس کو اپنے والد سے جس درجہ محبت تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ تمام عمر اپنے باپ کی ایک چھوٹی سی تصویر دل کے قریب پہنے رہا اور جب مرا تو وہ تصویر اس سے جدا نہیں کی گئی بلکہ اس کے ساتھ دفن کر دی گئی۔

والد کی وفات کے بعد یونیورسٹی کی تعلیم بصد خرابی جاری رہی آخر کار ایک فلسفیانہ مقالہ پر جینا کی یونیورسٹی سے مارکس کو حکیم الفلسفہ (پی۔ ایچ۔ ڈی) کی سند مل گئی۔ اس مقالہ کے دیباچہ میں مارکس نے جہاں تک خدا کا تعلق تھا اپنے آپ کو اپیقورس کا ہم خیال بتایا ہے اور اپنے عقیدہ کو اس فلسفی کے ایک جملہ میں اس طرح بیان کیا ہے "خدا سے وہ انسان منکر نہیں جو عوام کے خدا سے منحرف ہو بلکہ وہ انسان منکر ہے جو خدا کے متعلق عوام کے خیالات قبول کرتا ہے" چونکہ مارکس کے تخیل کے بموجب علم و عمل ایک ہی شے کے دو رخ ہیں۔ اس نے تعلیم ختم کرتے ہی فوراً سیاسی میدان میں جد و جہد شروع کر دی۔ رینانک اخبار کا مدیر بنا تو حکومت کی پالیسی پر اتنا سخت تنقید کی کہ حکومت نے اخبار بند کر دیا اور مارکس کو ادارت سے استعفٰی ہی دینا پڑا۔ جب اخبار بند ہو گیا تو سنسر کے افسر نے لکھا "میں خوش ہوں کہ مارکس کے دست بردار ہو جانے کا یہ اثر ہوا ہے کہ آج میں نے اپنا تمام کام ایک چوتھائی وقت میں ختم کر لیا۔ حکومت کے اس رویہ پر مارکس نے اپنے ایک دوست روگی کو لکھا "حکومت کے حکم پر مجھے تعجب نہیں ہوا...... حکومت کا رینانک کو بند کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ عوام میں سیاسی بیداری بڑھ رہی ہے۔ میں ادارت سے استعفٰی دے رہا ہوں کیونکہ اس ماحول میں میرا دم گھٹتا ہے غلامی کے قید و بند میں رہ کر کام کرنا اور آزادی کے لیے بجائے تلوار کے سوئیوں سے لڑنا مجھے پسند نہیں میں حکومتی طبقہ کی بے رحمی اور بیوقوفی اور اپنے ہم عصروں کی جی حضوری، بہانہ سازی اور غیر مفید بحث و مباحثہ سے تنگ آ گیا ہوں میں جرمنی میں رہ کر کچھ نہیں کر سکتا۔ یہاں رہنا اپنے آپ کو ذلیل کرنا ہے" اس سیاسی جد و جہد کے ساتھ خانگی جد و جہد بھی جاری تھی۔ ۹ جولائی ۱۸۴۲ء کو روگی کو لکھتا ہے "اخبار انکڈوٹا کو مضمون روانہ نہ کرنے کی معافی چاہتا ہوں آج کل پریشانی اور خواہ مخواہ کے بحث مباحثہ میں وقت گزر رہا ہے۔ اگرچہ اچھا ہوں لیکن میرے کنبہ والے میری شادی کے راستہ میں رکاوٹ پیدا کر رہے ہیں ان کی تفصیل سے تو تمہاری دماغ سوزی کیا کروں۔ یہ اچھا ہے کہ ملکی سیاست اس درجہ جاذب توجہ ہے کہ کسی حق پسند کو اتنی فرصت نہیں کہ افسوسناک خانگی قصوں میں وقت ضائع کرے۔ عشقیہ جذبات برطرف

میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ مجھے اپنی ہونے والی بیوی سے محبت ہے۔ آج منگنی کو سات برس ہونے آئے کہ جینی اپنے اور میرے عزیزوں کو اس شادی پر راضی کرنے کی جد وجہد کر رہی ہے لیکن وہ راضی نہیں ہوتے جینی کے عزیز تو شادی کے اس لیے خلاف ہیں کہ وہ برلن کی حکومت کی بھی اسی قدر عزت کرتے ہیں جتنی کہ اپنے آسمانی باپ کی اور میں حکومت کے خلاف ہوں۔ رہے میرے عزیز تو وہ بھی اپنے انفرادی مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے اس شادی کے خلاف ہیں۔ اس جد وجہد نے جینی کی صحت پر بُرا اثر ڈالا ہے۔ سالہا سال سے میں اور جینی اس شادی کے معاملہ میں اپنے سے تگنی عمر والوں سے بحث و مباحثہ کر رہے ہیں لیکن بزرگوں کی اس دلیل کا کیا کیا جائے کہ وہ ہر بات میں یہ کہہ دیتے ہیں "یہ ہماری زندگی کا تجربہ ہے۔ جب تم ہماری عمر کو پہنچو گے اس وقت اس کو سمجھو گے ابھی تم ان امور کو نہیں سمجھ سکتے"۔

اس زمانہ میں رُوگی کو ایک جریدہ نکالنے کا خیال پیدا ہوا اور ۵۰۰ تھیلر پر مارکس کو اس کا اڈیٹر مقرر کر دیا۔ معاش سے بے فکری ہوئی تو ۱۹ جولائی ۱۸۴۳ء کو مارکس نے جینی سے شادی کر لی۔ شادی کے بعد چند ماہ تو مارکس نے اپنی ساس کے یہاں گزارے پھر جینی کو لے کر پیرس چلا گیا۔ وہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ ماں کا دل مسرور ہوا تو نئے مہمان کو اپنے عزیزوں کو دکھانے کے لیے جرمنی چلی آئی۔ مارکس پیرس میں وارورٹس اخبار کے ادارے میں کام کرتا رہا۔ پیرس کے دوران قیام میں یورپ کے مشہور شاعر ہائینے سے دوستی ہو گئی۔ جرمن استبداد کے خلاف ہائینے نے جو نظمیں نشر کیں ان میں مارکس نے بھی مدد کی۔ مارکس کو چونکہ خود شاعری کا ذوق رہ چکا تھا اس لیے شاعروں سے محبت کرتا تھا اور کہا کرتا تھا "شاعر عجیب مخلوق ہوتے ہیں ان کو عام انسان کے اخلاقی معیار سے نہیں جانچنا چاہیے۔ اگر ان سے شاعری کرانی ہے تو ان کی تعریف ہی کرتے رہنا چاہیے شاعر پر تنقید کرنا غلط ہے"۔ ہمارے پرانے ادب میں حریت کے جو جذبات تھے وہ آج ہمارے شاعروں، عالموں اور راہبوں کے بجائے عوام مزدوروں اور مستریوں میں پائے جاتے ہیں۔ دس برس بعد ہائینے نے لکھا "موجودہ سیاسی جد وجہد میں پرولتاری طبقہ انسانی ترقی کا علمبردار ہے اور پرانے فلاسفہ کی شاہراہ پر گامزن ہے" ہائینے اگرچہ جرمن تھا لیکن فرانسیسی اس کو اپنا قومی شاعر خیال کرتے تھے اور تمام یورپ اس کی شاعری کا دلدادہ تھا۔ جب شاعر نے پروشا کی حکومت کے تشدد کے خلاف متاثر کیا وہ نظمیں نشر کرائیں تو پروشا کا حکومتی طبقہ بہت چراغ پا ہوا۔ حکومت پروشا نے ہائینے

کا تو کچھ نہ بگاڑ سکی البتہ اس کا نزلہ وارواز ث اور اس کے مدیروں پر گرا۔ حکومت پروشا نے حکومت فرانس پر اثر ڈال کر اخبار کے مدیروں کے خلاف جن میں مارکس بھی تھا جلا وطنی کا حکم جاری کرا دیا۔ اب مارکس بروسلز آ گیا۔

پیشتر اس کے کہ مارکس کی زندگی کے مزید حالات بیان کیے جائیں یہاں مارکس کے مخلص دوست فریڈرک اینجلز کی زندگی پر بھی ایک نظر ڈالنا ضروری ہے کیونکہ اینجلز اور مارکس کی زندگیاں ایک دوسرے سے اس درجہ وابستہ تھیں کہ ایک کی زندگی بلا دوسرے کی زندگی کا مطالعہ کیے بالکل نامکمل رہتی ہے۔ اینجلز ۲۸ نومبر سنہ ۱۸۲۰ء کو بمقام بارمن پیدا ہوا۔ اس کے والدین اچھے کھاتے پیتے کارخانہ دار تھے اور بڑے مذہبی تھے اینجلز نے مذہبی ماحول میں پرورش پائی لیکن جب سن بلوغ کو پہنچا اور نظر میں گہرائی پیدا ہوئی تو رسمی مذہب سے بے اطمینانی ہونی شروع ہو گئی۔ اس قلبی بے اطمینانی اور روحانی جد و جہد کا حال خود اینجلز کے الفاظ میں سنیے۔ ایک دوست کو لکھتا ہے:۔

"میں ہر روز دعا کرتا ہوں اور تمام دن یہی دعا کرتا رہتا ہوں کہ مجھ پر حقیقت آشکارہ ہو جائے۔ جب سے میرے دل میں شکوک پیدا ہوئے ہیں یہی دعا کرنا میرا ورد ہے۔ میں تمہارے عقیدہ کو لبیک نہیں کہہ سکتا میں یہ سطور لکھ رہا ہوں اور میرا دل آنسوؤں سے اُمڈا چلا آ رہا ہے۔ میرا دل اور آنکھیں رو رہی ہیں لیکن مجھے یہ احساس ہو رہا ہے کہ میں راندۂ درگاہ نہیں ہوں مجھے امید ہے کہ میں خدا تک پہنچ جاؤں گا جس کے دیدار کا میں دل و جان سے متقاضی ہوں اور مجھے اپنی جان کی قسم! یہ میری جستجو اور عشق کیا ہے یہ روح القدس کی جھلک ہے۔ اگر انجیل مقدس دس ہزار مرتبہ بھی اس کی تردید کرے تو میں نہیں مان سکتا"

اینجلز کے مروجہ مذہب سے بے اطمینانی سیاسی جد و جہد میں نمودار ہوئی۔ اگرچہ فوجی اسکول میں تعلیم پاتا رہا لیکن ساتھ ہی ساتھ اوسولڈ کے مصنوعی نام سے حکومت کے خلاف مضمون بھی لکھتا رہا۔ ایک مرتبہ کسی مصنف کے مضمون پر اینجلز نے سخت تنقید کی تو مصنف نے اڈیٹر کو شکایت لکھ بھیجی اس پر اڈیٹر نے جو جواب دیا ہے اس سے اینجلز کی زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ اڈیٹر صاحب لکھتے ہیں:۔

"میں مجرم ہوں کہ اوسولڈ کو میں نے ادبی دنیا میں روشناس کرایا۔ عرصہ کی بات ہے کہ ایک نوعمر سوداگر اینجلز مجھے برامن سے دیپرٹل کے حالات کے متعلق مختصر خطوط لکھا کرتا تھا اور میں ترمیم کرنے کے بعد ان کو نشر کر دیتا تھا۔ ایک مرتبہ اس کا ایک خط میرے نام آیا جس میں

> یہ درخواست درج تھی کہ میں اس کے مضامین میں ترمیم و تنسیخ نہ کیا کروں۔ اب وہ ہیگل کے فلسفہ کا مطالعہ کرنے لگا ہے اور دوسرے اخباروں میں بھی اس کے مضامین نشر ہونے لگے ہیں جب تمھارے مضمون پر تنقید نکلی اس سے قبل ہی اینجلز کو ۵ اتھالر برلن روانہ کرچکا تھا۔ ان نوجوانوں کو ہم ہی تو فکر کرنا اور مضمون نگاری سکھاتے ہیں اور جب ان کو کچھ شد بد ہو جاتی ہے تو یہ ادب اور تہذیب کے خلاف بغاوت کرنی شروع کر دیتے ہیں۔ دراصل یہ طاعون مارکس کے اخبار زرٹیانگ اور دگی کے اخبار نے پھیلایا ہے

جب ستمبر ۱۸۴۲ء میں فوجی اسکول کی تعلیم ختم ہوئی تو انگلستان آکر اینجلز اپنے باپ کی فرم ایرمن میں کلرک ہوگیا۔ انگلستان آتے ہوئے اینجلز کولون سے گزرا تو اس نے اخبار زیٹانگ کے دفتر میں مارکس سے بھی ملاقات کی لیکن پہلی ملاقات میں کوئی بھی ایک دوسرے سے متاثر نہیں ہوا۔ انگلستان پہنچ کر اینجلز نے اقتصادی حالات کا بغور مطالعہ کیا اور ایک کتاب لکھی جس کی مارکس نے تعریف کی۔ اس طرح سے دونوں میں دوستی بڑھ گئی۔ اقتصادی میدان میں اینجلز کی نظر بہت وسیع تھی لیکن وہ ہمیشہ یہی کہتا رہتا "مارکس نے میری تصانیف کو آخری شکل دی" اور کبھی کہا کرتا "اقتصادی میدان میں مارکس میری نسبت دور دیکھتا ہے، گہرا دیکھتا ہے اور جلدی دیکھتا ہے" اور کبھی کہا کرتا "اگر میں اقتصادی حقیقت آشکارا نہ کرتا تو مارکس بلا میری مدد کے خود ہی اس کو پالیتا" لیکن باوجود اینجلز کی اس کسر نفسی کے یہ کہنا پڑتا ہے کہ ابتدائی زمانہ میں اقتصادی میدان میں اینجلز نے دیا اور مارکس نے لیا۔ اس وقت یہ بحث فضول ہے کہ کون کس کا مرہون منت ہے کیونکہ یہ دونوں شخصیتیں ایک دوسرے سے اس درجہ وابستہ رہی ہیں کہ ان کی تصانیف کو الگ الگ کرنا اور ان میں خیالات کی ملکیت ثابت کرنا مشکل ہے۔ یہ امر وثوق کے ساتھ معلوم نہیں کہ اینجلز کا مارکس کے فلسفہ میں کتنا حصہ ہے لیکن اینجلز اور مارکس ایک جان اور دو قالب تھے اور اگر اینجلز تصانیف کی اشاعت میں عجلت کی تاکید نہ کرتا رہتا تو مارکس کی بہت سی تصانیف دن کی روشنی نہ دیکھتیں۔ اینجلز اشاعت میں عجلت کی تاکید کرتا ہوا مارکس کو لکھتا ہے۔

> "اقتصادیات پر اپنا کام ختم کرو، اگر تم تصنیف سے مطمئن بھی نہیں تو پروا نہیں۔ اس وقت عوام کے دماغ میں پختگی اور گرمی آگئی ہے۔ اور اسی وقت کی ضرب کارگر ہوتی ہے جبکہ لوہا سرخ ہو۔ وقت نکلا جا رہا ہے۔

اپریل تک ضرور ختم کردو۔ تصنیف کے معاملہ میں میرا طریق کار اختیار کرو میں یہ کرتا ہوں کہ تصنیف کو ختم کرنے کے لیے ایک تاریخ مقرر کرلیتا ہوں پھر کچھ ہی کیوں نہ ہو اس کو ختم ہی کردیتا ہوں اور اشاعت کے لیے روانہ کردیتا ہوں۔ تم بھی یہی کرو۔ اگر وہاں فوری اشاعت کا انتظام نہیں ہو سکتا تو کہیں اور کوشش کرو لیکن اشاعت فوراً ہونی چاہیے۔ اس طرح سے تو شاید تصانیف شائع ہوسکیں ورنہ الماری ہی میں بند پڑی رہیں گی۔"

جب انقلابی جدوجہد کی بنا پر مارکس کی پیرس سے جلاوطنی کی خبر آئی تو اینجلز نے مارکس کے لیے فوراً چندہ جمع کرکے روانہ کردیا اور مارکس کو لکھا۔

"مجھے معلوم نہیں کہ یہ رقم تمھیں بروسیلز میں گزارے کے لیے کافی ہوگی لیکن فکر نہ کرو میری انگریزی کی تصنیف کا جو کچھ معاوضہ ملنے والا ہے وہ بخوشی تمھاری نذر ہے۔ مجھے خرچ کی مطلق ضرورت نہیں۔ اور اگر ہوئی بھی تو مجھے یہاں مل جائے گا۔ میری خواہش ہو کہ ظالموں کو یہ خوشی نہیں ہونی چاہیے کہ مالی تنگی سے تمھیں پریشانی ہوئی۔"

بروسلز اس زمانہ میں بین الاقوامی برجوازی رجحانات کا مرکز تھا۔ اور اس لیے کمیونزم کی تبلیغ کے لیے بہترین جگہ تھی۔ یہاں مارکس کی ملاقات ایک شخص ولیم ولف نامی سے ہوئی۔ ولف غریب طبقہ سے تھا اور بڑی مشکل سے اس نے یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کا دماغ تخلیقی تو نہ تھا لیکن عام انداز میں خوب لکھتا تھا۔ وہ وفادار و باہمت دوست تھا۔ مارکس نے اپنی مشہور تصنیف "سرمایہ" کو اسی ولیم ولف کے نام سے منسوب کیا ہے۔

۲۴ فروری ۱۸۴۸ء کو فرانس میں انقلاب ہوگیا۔ بادشاہ فرانس کو جو حادثات پیش آئے انھوں نے یورپ کے دوسرے ممالک کے بادشاہوں کو بھی ڈرا دیا۔ وہ بھی جمہوری رجحانات کو سختی سے روکنے لگے۔ چنانچہ بلجیم کے بادشاہ لیوپولڈ کے حکم سے مارکس اور اس کی بیوی کو گرفتار کرلیا گیا۔ ایک رات معمولی قیدیوں کے ساتھ رہے دوسرے دن رہائی ملی تو جلاوطنی کا حکم صادر ہوگیا۔ مارکس پھر پیرس آگیا۔ اور اس نے انقلاب کے زمانے میں دوستوں کی مدد سے کمیونزم کی تبلیغ کے لیے ایک اخبار نکالا جس کا فرانس میں کافی اثر ہوگیا۔ اب مارکس کی شہرت بھی عام ہوگئی اور وہ اشتراکیوں میں سب سے بڑا دماغ مانا جانے لگا۔ اس زمانے میں جو لوگ مارکس سے ملے ان میں سے

چند نے پہلی ملاقات کے تاثرات چھوڑے ہیں جو دلچسپی سے خالی نہیں۔ ان میں سے ایک صاحب لکھتے ہیں :-

"مارکس کوئی تیس سال کا ہو کر وہ اشتراکی دنیا کا دماغ مانا جانے لگا۔ گٹھا ہوا بدن، کشادہ پیشانی، کالی چمکدار آنکھیں، بھری ہوئی کالی داڑھی جاذب توجہ ہیں۔ جہاں تک اشتراکیت کا تعلق ہے اس کی نظر گہری ہے اور واقعی وہ وزنی خیالات کا اظہار کرتا ہے لیکن میں نے اپنی عمر میں اس درجہ مدمغ اور خود پسند نہیں دیکھا۔"

دوسرے صاحب فرماتے ہیں :-

"مارکس کے اعلیٰ دماغ ہی نے نہیں بلکہ اس کی شخصیت نے بھی مجھے متاثر کیا۔ اگر اس کا دل اتنا بڑا ہوتا جتنا اس کا دماغ ہے تو واللہ میں اس کے لیے اپنی جان تک قربان کرنے کے لیے حاضر تھا۔ اگرچہ وہ مجھ کو کمترین انسان خیال کرتا ہے جس کا وہ صاف طور پر اظہار بھی کر چکا ہے لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس میں لیڈر ہونے کی اہلیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ وہ ذرا معاملہ کی تہہ تک پہنچ کر حالات پر قابو پالیتا ہے۔"

تیسرے صاحب کا بیان ہے :-

"اشتراکی تحریک کے قاید سے ملا۔ اس زمانہ میں اس کا ستارا عروج پر ہے۔ عمر قریب تیس سال ہوگی گٹھا ہوا بدن، جاذب چہرہ اور گھنے کالے بال ہیں۔ اس کے چہرہ سے تیزی اور قوت عمل ٹپکتی ہے اور اس کے چہرے کی ذہانت اور سنجیدگی میں اس کی ہمت اور جرات کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔"

بھلا اس طوفانی زمانہ میں اشتراکی اخبار کیسے چل سکتا تھا۔ کچھ دن کے بعد اخبار کے خلاف حکومت کا تشدد شروع ہو گیا۔ بہت سے مدیر قید کے خوف سے دوسرے ممالک کو بھاگ گئے۔ اخبار کے حصہ داروں نے بھی مالی امداد دینی بند کر دی۔ ان حالات میں لازمی تھا کہ اخبار کی حالت خراب ہو جاتی لیکن مارکس نے اخبار بند نہ کیا۔ بلکہ باپ سے جو ... ترکہ میں ملے تھے وہ تمام پونجی اخبار کو زندہ رکھنے میں لگا دی۔ اگرچہ اس وقت بھی اخبار کے ... کا پیاں فروخت ہوتی تھیں اور خیال تھا کہ جب ایک ماہ بعد خریداروں سے رقم وصول ہوگی تو تمام مشکلات میں کمی ہو جائے گی لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ دو چار دن بعد ہی اخراج کا حکم آگیا۔ یہ زبردست چوٹ تھی چنانچہ ... کو مارکس نے آخری اشاعت ... نکال کر اخبار بند کر دیا۔ اس آخری نمبر میں اداریہ مضمون لکھتے ہوئے کہتا ہے :-

"ہمیں ستانے کے بہانے تراشنے کے لیے حکومت کیوں جھوٹ اور افترا کے پل باندھ رہی ہے۔ ہم تو خود جلا دہیں اس لیے دوسروں سے مراحم خسروانہ کی امید نہیں رکھتے جب ہمارے دن پھریں گے تو ہم اپنے تشدد کے لیے بہانے نہیں تراشیں گے"

اخبار بند ہونا تو اہم امر نہ تھا لیکن مزدوروں، کلرکوں وغیرہ کی تنخواہ دینے اور قرض خواہوں کے قرضے چکانے میں مارکس کی کل پونجی ختم ہوگئی اور اس کے پاس بیوی کے زیور کے سوا کچھ نہ رہا۔ بیوی کا زیور گروی رکھا تب گھر کا گزارا چلا۔ جب غربت حد سے تجاوز کرگئی تو مارکس نے دوستوں کو مالی امداد کے لیے لکھا۔ ایک دوست نے کیا کیا کہ عوام سے چندہ کرنا شروع کر دیا جب مارکس کو اس کا علم ہوا تو دوست کو لکھا۔

" میں ہر عسرت برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن عوام سے بھیک مانگنا گوارا نہیں کرسکتا چندہ کا علم ہوکر مجھے بڑا رنج ہوا"

۲۴ راگست کو فرانس کو الوداع کہکر لندن آگیا جہاں اس کے لڑکا پیدا ہوا۔ اس کے لڑکے کی بابت فراؤ مارکس اپنی یاداشت میں لکھتی ہے۔

"معصوم فرشتے کو اتنے مصائب کا سامنا کرنا پڑا ہے کہ جب سے پیدا ہوا ہے بیمار چلا آرہا ہے جب سے دنیا میں آیا ہے شاید ہی کسی رات آرام سے سویا ہوگا اور ایک وقت میں کبھی دو تین گھنٹے سے زیادہ نہیں سویا۔ یہ بچہ کوئی سال بھر بعد انتقال کرگیا"

مثل مشہور ہے کہ مصیبت تنہا نہیں آتی بلکہ مصائب کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ مارکس کو بھی مصائب سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ مارکس نے چلسیا پر ایک کرایہ دار سے دو کمرے کرایہ پر لیے۔ اس کو کرایہ بھی دیدیا لیکن اس نے مکان دار کو کرایہ نہیں دیا۔ مکان دار نے کرایہ دار کے ساتھ مارکس کو بھی کمروں سے نکال دیا۔ بڑی مشکل سے ۲۸ ڈین سٹریٹ میں جگہ ملی۔ افلاس بڑھا تو مارکس نے ایک دوست کو لکھا۔

"چاندی کے چمچے تو جتنی بیچنی تھے بیچ کے ہیں۔ ان کے علاوہ جو کچھ سامان گروی رکھا ہوا ہے۔ اس کو فروخت کر دو۔ اور جو کچھ قیمت وصول ہو وہ روانہ کر دو۔ اس وقت مفلسی کا یہ عالم ہے کہ بار روپیے کام نہیں چل سکتا"

انھی زمانہ میں فراؤ مارکس ایک دوست ویڈیمر کو لکھتی ہے۔

"جو بات مجھے مارے ڈالتی ہے اور جس پر میرا دل روتا ہے وہ یہ ہے کہ معمولی معمولی باتیں مارکس کے کام میں ہارج ہو رہی ہیں۔ اگر ذرا سا بھی سہارا ہو جائے تو گزر کر لیں۔ جو انسان ہمیشہ دوسروں کی خدمت کرتا رہا۔ وہ اس طرح بے یار و مددگار چھوڑ دیا جائے۔ افسوس لیکن واللہ یہ نہ خیال کرنا کہ ہم کسی سے کچھ مانگ رہے ہیں۔ مارکس کو یہ حق تو ہے کہ جن لوگوں نے مارکس کے خیالات اور اس کی صحبت سے فایدہ اٹھایا ہے وہ اس کے اخبار کو تو چلانے کی کوشش کریں۔ اتنی مدد تو اُن کا فرض ہے مجھے تو دوستوں کی بے اعتنائی سے دکھ ہوتا ہے لیکن مارکس کا زاویۂ نگاہ دوسرا ہے وہ مستقبل سے ناامید کبھی نہیں ہوتے اور کتنی ہی مصیبت کیوں نہ ہو وہ خود خوش رہتے ہیں اور گھر والوں کو خوش رکھتے ہیں اور جب بچے مجھے پریشان کرتے ہیں تو خود بیٹھے ہنستے رہتے ہیں۔"

دراصل مارکس کی یہ خوشی ظاہراتھی دل مرجھایا جا رہا تھا لیکن گھر والوں کی خاطر دوسرے دل سے ہنستا رہتا تھا۔ اگست ۱۸۵۱ء میں مارکس وڈمیر کو لکھتا ہے۔

"تم خود خیال کر سکتے ہو کہ موجودہ حالات تاریک ہیں۔ اگر یہی حالت رہی تو شاید میری بیوی تہ خاک سو جائے گی۔ مصائب کا تسلسل اور ہر روز نان شبینہ سے ناامیدی اس کو اندر ہی اندر کھائے جاتی ہے۔ اور اس پر میرے مخالفوں کو دیکھو کہ مجھ پر اتہام پر اتہام لگا رہے ہیں اور کوئی بری بات ایسی نہیں جو وہ میری بابت مشہور نہ کرتے ہوں۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں ان کے تیروں سے بے پروا ہوں اور اپنے کام میں مشغول ہوں لیکن میری بیوی کی یہ حالت نہیں۔ وہ پریشان خاطر رہتی ہے اس کی صحت خراب ہوتی جا رہی ہے اور اس پر بھی کچھ بیوقوف لوگ ہیں کہ میرے مخالف جو کچھ میری بابت مشہور کرتے ہیں وہ سب میری بیوی کو سناتے رہتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو یہ تمیز بھی نہیں ہوتی کہ کس وقت خاموش رہنا چاہیے۔"

اس غربت میں بھی مارکس کے علمی مشاغل جاری رہے۔ وہ صبح ۹ بجے لندن کے کتب خانے چلا جاتا اور ۷ بجے شام کو واپس آتا۔ اس زمانہ میں وہ اپنی مشہور کتاب "اقتصادیات پر تنقید" لکھ رہا تھا۔ قدرت کچھ مسکرائی تو ایک دوست کی مہربانی سے امریکہ کے ایک اخبار کا نمایندہ مقرر ہو گیا اور اس خدمت کا کچھ معاوضہ بھی ملنے لگا کیونکہ ان

ابتدائی زمانہ میں مارکس انگریزی نہیں لکھ سکتا تھا۔ اس لیے اینجلز کے تحریر کردہ مضامین مارکس کے نام سے اخبار کو روانہ کیے جاتے تھے۔ اس تعلق سے یہ فائدہ ہوا کہ امریکہ میں مارکس کی ایک کتاب جرمن زبان میں شایع ہوگئی لیکن مصیبت پھر سامنے آکھڑی ہوئی۔ مارکس بہت سخت بیمار ہوا۔ اپنے ایک دوست کو علالت کے بارے میں لکھتا ہے:۔

"کسی بیماری نے مجھے اتنا کمزور نہیں کیا تھا جتنا کہ اس بیماری نے کردیا ہے"

پھر ۲۰ رفروری کو لکھتا ہے:۔

"میرے حالات اب اس تسلی بخش منزل پر پہنچ گئے ہیں کہ نہ باہر جاسکتا ہوں کیونکہ سب کپڑے گروی پڑے ہیں اور نہ گوشت کھا سکتا ہوں کیونکہ ساکھ ختم ہوگئی"

افلاس کا اندازہ فرانز مارکس کے مندرجہ ذیل اندراج سے بخوبی ہوسکتا ہے:۔

"۱۸۵۲ء کی ایسٹر میں غریب فرنزیکا (مارکس کی چھوٹی لڑکی) کھانسی بخار میں مبتلا ہوئی تین روز تک وہ موت سے لڑتی رہی۔ آخر کار اس نے داعی اجل کو لبیک کہدیا۔ پچھلے چھوٹے کمرے میں ہم نے اس معصوم کی ننھی سی میت رکھدی اور خود اگلے کمرے میں زمین پر بستر کرکے ہم سب لیٹ گئے۔ تینوں بچے ہمارے پاس تھے اور ہم دونوں ننھی سی حور کی موت پر رورہے تھے جو برابر کے کمرے میں ٹھنڈی اور ساکت لیٹی ہوئی تھی جس زمانہ میں بچی گزری ہمارے پاس کچھ نہ تھا۔ ایک جلاوطن فرانسیسی ہمسایہ ہمارے پاس رہتا تھا اور ہمارے ہاں بھی آیا کرتا تھا میں اس کے پاس گئی اور ضرورت کا اظہار کیا وہ خوش اخلاقی سے پیش آیا اور اس نے مجھے دو پونڈ دیے تب کہیں جاکر تابوت بنوایا جس میں میری بچی سوئی جب یہ بے چاری پیدا ہوئی تھی اس وقت بھی اس کو کوئی گہوارہ نصیب نہیں ہوا اور جب رخصت ہوئی تو بھی بہت دیر بعد اس کو تابوت نصیب ہوا جب جنازہ اٹھا تو کچھ نہ پوچھو ہمارے دل کا کیا حال تھا"

۸ رستمبر کو مارکس نے اینجلز کو لکھا:۔

"میری بیوی بیمار، جینی بیٹی بیمار، لڑکے کو بخار لیکن ڈاکٹر نہیں بلا سکتا کیونکہ روپیہ نہیں۔ ہفتہ بھر سے صرف روٹی اور آلو پر گزارا کررہا ہوں شاید اب یہ بھی نہ ملے اور فاقہ ہی کرنا پڑے کیونکہ کاغذ خریدنے

کے لیے پیسے نہ تھے اس لیے اخبار کو مضمون بھی روانہ نہ کر سکا۔ اب صرف یہ ہونا باقی ہے کہ مکان کی
مالکہ گھر سے نکال دے کیونکہ اس کے ۲۲ پونڈ بقایا ہیں۔ اگر وہ نکال دے تو بہت اچھا ہو، پھر ان ۲۲ پونڈ
کا بار تو دل سے ہٹے لیکن وہ مالکہ مجھ پر یہ عنایت کیوں کرنے لگی۔ روٹی والے، دودھ والے، سبزی والے
قصاب، پرچون والے ان سب کا قرضہ الگ رہا۔ کس طرح ان مصائب سے چھٹکارا ہوگا۔ چند ہفتوں
سے مزدوروں سے پیسے قرض مانگ کر گزارا کر رہا ہوں۔ مانگتے ہوئے بڑی شرم آتی ہے لیکن کیا کروں۔ نہ
مانگوں تو بھوکا مر جاؤں۔"

یہ مفلسی کا عالم لیکن مقصد حیات سے ذرا بھی نگاہ ہٹے تو بہ۔ توبہ! گھر پر فاقہ، بیماری، موت گزر رہی ہے لیکن مارکس
ایک بندۂ مومن کی طرح اعلان حق میں لگا ہوا ہے اور لکھتا ہے۔

"میں ہر مصیبت میں اپنا کام کرتا رہونگا۔ بورژوازی طبقہ مجھے میرے مقصد سے ہٹا کر سونا کمانے کی ترغیب دینا
چاہتا ہے۔ میں ان کو سنا دینا چاہتا ہوں کہ وہ کبھی بھی مجھے سکہ بنانے کی مشین میں تبدیل نہ کر سکیں گے۔"

ایک اور جگہ لکھتا ہے۔

"ہمیں روپیہ تو کمانا چاہیے تاکہ ہم زندہ رہیں اور کچھ لکھ سکیں لیکن روپیہ کمانے کے لیے ہمیں زندہ رہنا اور لکھنا نہ چاہیے۔"

مارکس حقیقت آشنا تھا اور حقیقت کو بے نقاب کرنا چاہتا تھا۔ اب اس کا دل وقتی سیاسی ہنگاموں سے
اکتا گیا تھا اور وہ اپنے اقتصادی نظریات ایک کتاب کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا۔ ۱۸۵۰ء میں
اینجلز کو لکھتا ہے:۔

"سکون نصیب نہیں ہوتا کہ کوئی علمی مقالہ تحریر کروں۔ یہ اخبار کی نمائندگی مجھے مطلق نہیں بھاتی۔ اس کام میں
تم بظاہر تو آزاد ہو لیکن در اصل اخبار کی پالیسی اور خریداروں کے تخیلات سے جکڑے ہوئے ہو خاص کر
میرے جیسا انسان جس کو اخبار سے نقد روپیہ ملتا ہو اسے تو ضرور اخبار کی پالیسی کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔"

جب مارکس کی پچاس سالہ سالگرہ منائی گئی تو اس نے لکھا۔

"آدھی صدی سے زندہ ہوں اور اب تک نادار ہوں۔"

انگلستان کے دوران قیام میں اس نے تمام احباب سے ملنا جلنا ترک کر دیا اور جرمن کلب میں شامل میں

مصروف ہوگیا۔ دن میں ایک دو گھنٹے بچوں سے تو تفریح کرنا ہی ہے۔ مارکس کہا کرتا تھا کہ بچوں کو والدین کو راہ راست دکھانی چاہیے اور واقعی بچے ہی اس کو راہ راست پر لاتے تھے اتوار کے دن مارکس کو کوئی دماغی کام نہ کرنے دیتے تھے۔ وہ تفریح کا دن ہوتا تھا۔ بچے حلیہ کی مطابقت سے مارکس کو مور کہا کرتے تھے کسی اتوار کو مور اور اس کے بچے قریب کے گاؤں میں چلے جاتے جہاں ذرا سی مے نوشی بھی ہو جاتی۔ لندن کے قیام میں کچھ سکون پیدا ہونا شروع ہوا تھا کہ قدرت نے ایک اور داغ دیا۔ مارکس کا اکلوتا لڑکا فوت ہوگیا یہ لڑکا بڑا ہونہار تھا اور گھر بھر کی آنکھوں کا تارا تھا اس کا داغ مفارقت دے جانا قیامت تھا۔ اس لڑکے کی بیماری اور موت کی بابت مارکس نے جو خطوط مختلف دوستوں کو لکھے ہیں آنکھیں ان کو بالا ڈبڈبائے نہیں پڑھ سکتیں۔ مارکس ۳۰ مارچ کو انجلز کو لکھتا ہے۔

"بچہ کی بیماری کے فکر سے میں اور میری بیوی ہفتہ بھر سے خود بیمار ہیں۔ میری بیوی کی اتنی خستہ حالت کبھی نہیں ہوئی جتنی اس بچہ کی فکر سے ہوگئی ہے۔ میں خود متاثر ہوں۔ میرا دل بھاری اور میرا سر چکرا رہا ہے لیکن کیا کروں کہ گھر والوں کی خاطر مجھے خوش اور مطمئن انسان کا سا چہرہ بنانا پڑتا ہے۔ بیماری کے زمانہ میں بھی لڑکا بہت خوش مزاج ہے۔"

پھر ۲ اپریل کو لکھتا ہے۔

"معصوم ننھی سی جان رخصت ہوگئی ۶ اور ۷ کے درمیان میرے آغوش میں تھا کہ سوگیا۔ میں اس امر کو نہیں بھول سکتا کہ تمہاری محبت کا ہم گھر والوں کو ان مصیبت کے ایام میں کتنا سہارا رہا ہے۔ تم ہی میرے بچہ کی موت پر میرے رنج کا اندازہ کرسکتے ہو۔"

پھر ۱۲ اپریل کو لکھتا ہے۔

"جب سے لڑکا رخصت ہوا ہے گھر سونا سونا سا معلوم ہوتا ہے وہ اس گھر کی رونق تھا تمھیں کیا بتاؤں کہ ہم اس کی عدم موجودگی کو کتنا محسوس کرتے ہیں۔ میں نے بہت سے مصائب برداشت کیے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجھے اب تک علم نہ تھا کہ مصیبت کیا ہوتی ہے۔ اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ مصیبت اس کو کہتے ہیں۔ اس مصیبت میں مجھے اگر کوئی شے زندہ رکھے ہوئے ہے تو وہ تمہاری اور دوستوں کی عنایت اور یہ خیال کہ مجھے اور تمھیں مل کر اس دنیا میں کچھ اور بھی کرنا ہے۔"

جب مارکس کے دوست لیسیلے نے تعزیت کا خط لکھا تو مارکس نے جواب دیا کہ:-

"بیکن کہتا ہے کہ دنیا میں جو واقعی بڑے انسان ہوتے ہیں وہ حقیقت کی جستجو میں اس درجہ منہمک ہو جاتے ہیں کہ کوئی ذاتی نقصان یا صدمہ ان کو مغلوب نہیں کرتا مجھے ڈر ہے کہ میں اس قسم کا بڑا انسان نہیں ہوں لڑکے کی موت نے میرے جسم و روح کو ہلا دیا ہے آج تک یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ سانحہ کل ہی ہوا ہے رہی میری بیوی تو اس کو تو صدمہ نے بالکل ہی بٹھا دیا"

فراؤ مارکس کے لیے لڑکے کا رونا تو تھا ہی کہ موسم گرما میں اس کی ماں کا انتقال ہو گیا چوٹ پر چوٹ پڑی۔ مشیت الٰہی میں کسے دخل ہو سکتا ہے ماں کی موت پر فراؤ مارکس کو کچھ ترکہ ملا جس سے ۱۸۵۶ء نسبتاً بہتر طور پر گزر گیا اس زمانہ میں فراؤ مارکس ایک دوست کو لکھتی ہے:-

"۳۶ پونڈ سالانہ کرایہ پر مکان لے لیا جن غاروں میں آج تک بسر کرتے آئے ہیں ان کی نسبت تو یہ محل معلوم ہوتا ہے کچھ سامان خرید لیا ہے جس پر ۴۰ پونڈ خرچ ہو گئے ہیں اگرچہ سامان استعمال شدہ ہے تاہم میں اس برجوازی گھر میں اپنے آپ کو ملکہ محسوس کرتی ہوں"

اس زمانہ میں پہلے کی نسبت اچھی گزرنے لگی تو سب خوش نظر آتے ہیں۔ فراؤ مارکس ایک دوست کو لکھتی ہیں:-

"امریکہ کے اقتصادی آشوب کا ہماری جیب پر برا اثر پڑا ہے کیونکہ پہلے مارکس امریکہ کے اخبار ٹریبیون کو دو مضمون لکھتے تھے اب وہ اخبار صرف ایک مضمون خریدتا ہے لیکن اب تحریر میں کام کرنے کی اہلیت عود کر آئی ہے جب سے ہمارے لڑکے کا انتقال ہوا ہے وہ کبھی اتنے خوش نظر نہیں آئے، دن میں تو روزی کمانے کے لیے کام کرتے ہیں اور رات کو ایک کتاب اقتصادیات پر تنقید لکھنے میں گزرتی ہے آج کل ایسی کتاب کی بہت ضرورت ہے اور گمان غالب یہ ہے کہ اس کتاب کو ذرا کوئی طبع کر ہی دے گا"

مہینے کی متواتر محنت کے بعد جب کتاب مکمل ہوئی تو ترکہ ختم ہو چکا تھا اور مفلسی پھر دروازہ پر کھڑی ہوئی تھی۔ جنوری ۱۸۵۹ء کو مسودہ بالکل تیار ہوا مگر گھر میں اتنے پیسے نہیں تھے کہ یہ مسودہ پریس کو بذریعہ ڈاک روانہ کر دیا جاتا۔ مارکس نے مذاق کیا:-

"شاید ہی کسی مصنف کو ایسا ہوا ہو جس نے دولت پر کتاب لکھی ہو اور وہ خود دولت سے اتنا محروم رہا ہو"

جتنا کہ میں ہوں...... ٹکٹوں کے لیے رقم روانہ کردو"

اس زمانہ میں غربت یہاں تک پہنچی کہ مارکس نے اطلاعاً اینجلز کو لکھا۔

"میں انگریزی ریلوے کمپنی میں ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں"

اسی زمانہ میں مارکس کو یہ خیال ہوا کہ اپنے آپ کو دیوالیہ اعلان کردے۔ دونوں بڑی لڑکیوں کو کسی امیر کے بچوں پر ملازم کرادے اور خود معہ فراؤ مارکس اس عمارت میں چلا جائے جہاں نادار طبقہ رہتا ہو لیکن اس کی نوبت نہیں آئی کیونکہ سنہ ۱۸۶۰ء کے موسم بہار میں اینجلز کے والد کا انتقال ہوگیا۔ اس واقعہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ اینجلز کی فرم میں مالکانہ حیثیت ہوگئی اور وہ مارکس کو مالی امداد زیادہ آزادی اور فراخی سے دینے لگا۔

اگرچہ اینجلز کی زندگی مالی اعتبار سے آفات سے بری تھی لیکن سنہ ۱۸۶۳ء میں اس کے دل کو بھی صدمہ پہنچا یعنی اس کی شریک حیات جو مذہبی رسوم کے مطابق تو اس کی بیوی نہ تھی لیکن دس سال سے اس کی شریک حیات تھی وہ داغ مفارقت دے گئی جس سے اینجلز کو بہت صدمہ ہوا۔ اینجلز اس حادثہ کی بابت مارکس کو اطلاع دیتا ہوا لکھتا ہے

"میری کی موت ایک سانحہ سا ہوگئی ہے میرے دل و دماغ کی جو کیفیت ہے میں اس کو بیان بھی تو نہیں کرسکتا۔ غریب لڑکی مجھ سے دل و جان سے محبت کرتی تھی"

اس خط کے جواب میں مارکس نے چند الفاظ میں اینجلز کے اس نقصان پر اظہار افسوس کیا اور باقی خط میں اپنی مصیبت کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا۔

"برا تو معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنی پریشانیوں سے دوستوں کو پریشان کرتا رہتا ہوں اور ان کے سامنے ہر وقت ہاتھ پھیلائے رہتا ہوں لیکن آخر میں کروں بھی تو کیا کروں۔ لندن میں کوئی بھی تو ایسا متنفس نہیں جس کے سامنے میں اپنا دل کھول کر رکھ دوں"

یہ خط پہنچا تو اینجلز کو یہ امر ناگوار گزرا کہ خط میں تعزیت کے الفاظ کم اور عرض مدعا زیادہ۔ اینجلز نے معمول کے خلاف اس خط کا چند روز کے بعد جواب دیا جس میں مارکس کی سنگدلی اور بے اعتنائی کی شکایت کی کہ میری کے انتقال پر فراؤ مارکس نے ایک تعزیتی خط بھی روانہ نہ کیا۔ جب یہ خط موصول ہوا تو مارکس نے یکے بعد دیگرے دو خط لکھے جس میں اینجلز کی شکایت رفع کرنے کی کوشش کی۔ دوسرے خط میں لکھتا ہے:۔

"عورتیں خواہ وہ کتنی ہی سمجھدار کیوں نہ ہوں عجیب ہوتی ہیں صبح میری بیوی میری کو یاد کر کے اتنی روئی کہ اسی روز ہمارے سامان کی جو ترقی ہوئی تھی اس کو بھی بھول گئی۔"

اس کے جواب میں اینجلز نے لکھا:

"ظاہر ہے کہ جس انسان کے ساتھ مدت تک بسر ہو اس کی موت پر بلا آنسو بہائے نہیں رہا جاتا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میری کے ساتھ میری جوانی بھی دفن ہو گئی۔ جب تمہارا خط آیا تو اس وقت تک اس کو دفن نہیں کیا گیا تھا۔ صفائی سے کہدوں کہ تمہارے خط سے جو بے اعتنائی ظاہر ہوئی اس کا میرے قلب پر کوئی ایک ہفتہ اثر رہا۔ خیر کچھ مضائقہ نہیں تمہارے دو خطوں نے شکایت دور کر دی اور مجھے یہ خوشی ہے کہ میری کے ساتھ ساتھ میں نے اپنے دیرینہ اور مخلص دوست کو نہیں کھویا۔"

یہ مارکس اور اینجلز کی زندگی میں پہلی اور آخری بدمزگی تھی۔

اینجلز نے سو پونڈ روانہ کیے۔ مارکس کی ماں کا انتقال ہوا انھوں نے کچھ ترکہ چھوڑا۔ ولیم ولف مرتے وقت مارکس کے لیے کچھ ترکہ چھوڑ گیا۔ غرضکہ پھر کچھ سہارا ہو گیا۔ اگر ولیم ولف مارکس کے لیے ترکہ نہ چھوڑتا تو شاید مارکس کی مشہور تصنیف (سرمایہ) وجود میں نہ آتی۔ اب فارغ البالی ہوئی تو سنہ ۱۸۶۴ء میں انٹرنیشنل کی بنیاد ڈالی۔ تمام دنیا کے مزدور طبقہ کی تنظیم کا کام آسان نہ تھا۔ جو دردسری اس کام میں اٹھانی پڑی اس کا تو ذکر ہی کیا لیکن سب سے بڑی قباحت یہ ہوئی کہ اس کام میں پڑ کر وہ کوئی ایسا کام نہ کر سکا جس سے کچھ آمدنی ہو جاتی۔ چنانچہ جب ترکہ کا پیسہ ختم ہو گیا تو مفلسی اور بیماری پھر دروازے پر آ کھڑی ہوئی۔ مارکس ازسرِنو دوستوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور ہو گیا۔ اینجلز کو اسی زمانے میں لکھتا ہے:

"یقین جانو اگر از حد ضرورت نہ ہوتی تو اس خط لکھنے سے بہتر یہ سمجھتا ہوں کہ وہ انگلیاں قلم کر دوں جو یہ حروف لکھ رہی ہیں۔ یہ ناقابلِ برداشت معلوم ہوتا ہے کہ دوسروں کو تکلیف دے کر زندگی بسر ہوتی ہے لیکن جو خیال مجھے زندہ رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ تم اور میں شریک ہیں اور میرا صرف یہ کام ہے کہ پارٹی کے لیے علمی کام کرتا ہوں۔ اس گھر کو قائم رکھنا ہماری استطاعت سے زیادہ تھا اور اگر چہ اس سال زندگی زیادہ بہتر طور پر گزر سکتی لیکن لڑکیوں کے مستقبل کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم کچھ [illegible]

تم خود میری رائے سے اتفاق کروگے کہ بالکل مزدوروں کی سی طرز رہائش ہمارے موجودہ حالات میں مصلحت کے خلاف ہے۔ اگر لڑکیاں لڑکے ہوتے تو میں اور میری بیوی کو مزدوروں کی سی رہائش اختیار کرنے میں کچھ اعتراض نہ تھا۔"

جب مارکس کی صحت زیادہ خراب ہوگئی تو ۱۰ فروری ۱۸۶۶ء کو انجلز نے لکھا۔

"تم اس پھوڑے کا علاج کرو کچھ دن کے لیے رات کو کام کرنا بند کردو اور زندگی میں تنظیم پیدا کرو۔"

۱۳ فروری کو مارکس کا جواب آیا۔

"کل پھنسی کی تکلیف میں تمام دن پڑا رہا۔ اگر روپیہ ہوتا اور میں اپنے گھر والوں کی بسر اوقات کا کچھ انتظام کرسکتا اور کتاب کی طباعت ہوچکتی تو پھر بھی خواہش کرتا کہ مرجاؤں۔"

ایک ہفتہ بعد انجلز کو لکھتا ہے۔

"اس دفعہ بیماری کی وجہ سے میری حالت نازک ہوگئی ہے گھر والوں کو یہ احساس نہیں ہے کہ میں کس قدر بیمار ہوں اگر اس طرح دو چار مرتبہ تکلیف عود کر آئی تو بچنے کی کوئی امید نہیں صحت بہت خراب ہوگئی ہے سر میں تو نہیں مگر ٹانگوں میں بہت کمزوری محسوس ہوتی ہے ڈاکٹر کہتے ہیں کہ زیادہ کام کرنے سے بیماری عود کر آئے گی ان کا کہنا درست ہے لیکن میں ان سے یہ کس طرح کہوں کہ میں متواتر کام کرنے پر مجبور ہوں اگر کام نہ کروں تو کہاں سے کھاؤں۔"

بیماری سے نجات ملی تو ۱۸۶۷ء میں مارکس خود اپنی مشہور تصنیف سرمایہ کا مسودہ لے کر ہمبرگ گیا۔ اس کی اشاعت کا انتظام کرنے کے بعد ہنوور سے ملنے گیا وہاں سے انجلز کو لکھتا ہے۔

"کیا تم جانتے ہو کہ یہاں بورژوازی طبقہ میں ہم دونوں اچھی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔"

اس کے خط کا جواب دیتے ہوئے انجلز نے لکھا۔

"میرا ہمیشہ سے یہ خیال تھا کہ کمبخت کتاب سرمایہ تمھاری تمام آفات کا موجب ہوئی ہے اور جب تک تم اس سے نپٹے رہوگے یہی حالت رہے گی اب جبکہ تم نے اسے ختم کردیا ہے تو امید ہے کہ حالات بہتر ہوجائیں گے اور تم اس دنیا کو خوشگوار پاؤگے۔"

جواب میں مارکس نے لکھا۔

"مجھے قوی امید ہے کہ اس سال کے آخر تک میں آسودہ حال ہو جاؤں گا۔ مالی حالات رو بہ اصلاح آجائیں گے اور میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاؤں گا۔ تمہاری مدد کے بغیر یہ کتاب سرمایہ تصنیف نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے تمہیں کاروباری زندگی میں مستعدی سے کام کرنا پڑا اور تم نے صرف میری وجہ سے اپنی اہلیتوں کو زنگ آلود ہونے دیا اور یہی نہیں بلکہ میری مصیبتوں نے تمہیں بے چین رکھا۔"

سرمایہ کی تصنیف میں مارکس نے جتنی قربانیاں کیں ان کا حال اس کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے جو اس نے اپنے ایک انجینیر دوست کو لکھا۔ وہ لکھتا ہے:۔

"تم مجھے برا انسان خیال کر رہے ہوگے۔ تمہارے خطوط اس تاریک زمانہ میں جبکہ چاروں طرف سے مصائب ہجوم کر رہے تھے میرے لیے وجہ مسرت تھے۔ یہ علم کہ ایک ایماندار انسان ہماری پارٹی میں آگیا از خود مسرت بخش واقعہ ہے۔ دوسرے تمہارے خطوط سے اتنی محبت اور میری ذات سے اتنا خلوص ٹپکتا تھا کہ وہ انسان جس کی تمام عمر مخالفوں سے جد و جہد میں گزری ہو ان کو پڑھ کر خوش ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ تم شاید دریافت کروگے کہ جب ایسا تھا تو میں نے کبھی جواب کیوں نہیں دیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ میں لب گور تھا اور اپنی زندگی کا ہر لمحہ اپنی تصنیف سرمایہ کے لکھنے میں صرف کر رہا تھا جس کتاب کے لیے میں نے اپنی صحت۔ اپنی مسرت اور اپنے بیوی بچوں کو قربان کر دیا۔ یہ سن لینے کے بعد میں امید کرتا ہوں کہ تم میرے جواب نہ دینے کی مزید وجہ دریافت نہ کروگے۔ میں ان عملی لوگوں اور ان کے تخیلات پر ہنستا ہوں جو میری علمی مشغولیت کو بیکار خیال کرتے ہیں۔ اگر کسی کی بیل کی کھال ہو تب تو وہ غریب انسانوں کے مصائب سے بے پروا رہ سکتا ہے اور اپنی ہی کھال کی فکر میں زندگی بسر کر سکتا ہے لیکن میرے جیسے حساس انسان کے لیے یہ ناممکن تھا کہ انسانیت کی چیخ سنتا اور خاموش بیٹھا رہتا۔ اگر میں سرمایہ کو مرتب کیے بغیر مر جاتا تو اپنے آپ کو بے عمل انسانوں کے زمرے میں شریک کرتا۔"

۱۶ اگست کو سرمایہ کی پہلی جلد کی تصحیح ختم ہوئی تو مارکس نے خوش ہو کر اینگلز کو لکھا۔

[illegible] تمہاری عنایت [illegible] سے [illegible] ہو کہ میں سرمایہ کی

تین جلدیں سپرد قلم کرسکا میں ممنونیت کے ساتھ تمھیں بغلگیر کرتا ہوں۔ والسلام! میرے حبیب دوست"

پہلی جلد تو نکل آئی لیکن دوسری اور تیسری جلد میں ترمیم و تنسیخ ہی ہوتی رہی پہلی جلد نکلی تو اس کا پڑھنا، سمجھنا اور تنقید کرنا کوئی آسان کام نہ تھا چنانچہ کئی سال بعد سرمایہ کے تراجم یورپ کی مختلف زبانوں میں نکلے۔ سب سے پہلے روسی زبان میں پھر اس کے بعد دوسری زبانوں میں۔ کارل مارکس کے ہاتھوں قدرت کو جو کام کرانا تھا وہ ختم ہوگیا تھا لہذا اب اس کی اس دنیا میں ضرورت نہیں رہی تھی۔ پہلے فراؤ مارکس کو شکایت ہوئی اور چند سال ہی میں آخر بڑھی کہ ڈاکٹروں نے جواب دیدیا۔ فراؤ مارکس نے چاہا کہ موت سے پہلے اپنے بچوں سے مل لے۔ مارکس نے اپنی آمد کی خبر اپنی لڑکی کو پیرس میں دی اور لکھا۔

جلدی لکھو کہ لندن سے کیا سوغات چاہتی ہو کیونکہ تم جانتی ہو کہ جب تک تمھاری اماں جان کو تمھاری فرمایش نہ معلوم ہو جائے گی وہ لندن سے روانہ نہ ہوں گی۔"

موت کا مقابلہ کرکے فراؤ مارکس اور مارکس دونوں پیرس گئے کچھ دن قیام کے بعد لندن واپس آگئے۔ اب چونکہ قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا اس لیے واپسی پر مارکس کو بھی نمونیہ ہوگیا۔ دونوں میاں بیوی بیمار اور لڑکی خدمت میں سرگرم۔ اس زمانہ میں مارکس کی چھوٹی لڑکی اپنی بڑی بہن کو پیرس لکھتی ہے۔

اماں جان سامنے کے بڑے کمرے میں اور مور برابر کے چھوٹے کمرے میں لیٹے ہیں، دونوں جن کی زندگیاں ایک دوسرے سے اس درجہ وابستہ رہی ہوں وہ دونوں اب ایک کمرے میں بھی نہیں رہ سکتے۔ مور کی حالت بہتر ہے میں وہ صبح کبھی نہیں بھولوں گی جب مور نے کچھ طاقت محسوس کی اور وہ اماں جان کے کمرے میں گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دونوں از سر نو جوان ہوگئے ہیں۔ ایک محبت بھری لڑکی ہے اور دوسرا امنگ بھرا لڑکا ہے جو زندگی میں داخل ہو رہے ہیں۔ اس وقت ایسا ہرگز محسوس نہیں ہوا تھا کہ ایک ضعیف شوہر ہمیشہ کے لیے جدا ہونے والی ضعیفہ بیوی سے آخری بار مل رہا ہے"

جب ۲ر دسمبر کو فراؤ مارکس کا انتقال ہوا تو مارکس اس وقت بھی بیمار تھا اور ڈاکٹر کی رائے سے مجبور ہوکر جنازہ کے ساتھ بھی نہیں گیا۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے اپنی بیٹی کو پیرس لکھتا ہے:-

" ڈاکٹر نے منع کیا اور میں جنازہ کے ساتھ نہیں گیا اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ انتقال سے چند روز قبل

تمھاری ماں نے مجھ سے کہا تھا کہ ان کے جنازہ پر رسمی باتیں نہ ہوں ہم ظاہری باتوں کو اہمیت نہیں دیتے اچھا ہوا کہ ان کی زندگی جلد ختم ہوگئی۔ ڈاکٹر نے تو پہلے ہی کہدیا تھا کہ طاقت بہت جلد زائل ہو جائے گی۔ آخری لمحوں میں بھی انھوں نے موت کے ساتھ کوئی جد وجہد نہیں کی اس وقت ان کی آنکھیں پہلے سے زیادہ بڑی، بارونق اور حسین تھیں۔ خاموشی سے سوگئیں؛

اینجلز جنازہ کے ساتھ گیا اور اس نے رسم کے مطابق قبر پر تقریر کی اور دوران تقریر میں فراؤ مارکس کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے کہا۔

"اگر کوئی ایسی عورت ہوسکتی ہے جو دوسروں کی خوشی میں خوش ہو تو وہ یہ عورت تھی"

بھلا مارکس اپنی شریک حیات کی جدائی کا صدمہ کب برداشت کرسکتا تھا چنانچہ اس کی حالت بھی روز بروز گرتی ہی چلی گئی۔ ۱۴ مارچ ۱۸۸۳ء بوقت سہ پہر آرام کرسی پر بیٹھے بیٹھے جان دیدی۔ اینجلز نے فراؤ مارکس کی قبر پر تقریر کرتے ہوئے یہ پیشین گوئی کر دی تھی اس کے ساتھ مقرر کا دوست بھی مرگیا" ۱۷ مارچ کو مارکس کو دفن کیا گیا۔ اینجلز نے قبر پر تقریر کرتے ہوئے کہا:۔

"۱۴ مارچ سہ پہر کو پونے تین بجے دنیا کا سب سے بڑا دماغ اٹھ گیا۔ شاید دو منٹ کے لیے ہی ہم کمرہ سے باہر آئے ہوں گے کہ واپسی پر دیکھا تو آرام کرسی پر وہ دوامی نیند سو رہا ہے اس کی موت سے پرولتاری کی جد وجہد اور تاریخ کے نظریہ واقعیت کو جو صدمہ پہنچا اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ ڈارون نے قدرت اور مارکس نے سماجی ارتقا کا قانون دریافت کیا۔ اس نے موجودہ سرمایہ دارانہ دور اور بورژوائی سماج کے محرکات بتائے۔ اس کے قدر زاید کے نظریہ نے علم المعیشت کی گتھیوں کو سلجھایا۔ مارکس نے ہم کو یہ سمجھایا کہ انسان کو سیاست، علوم وفنون اور مذہب کی طرف اپنی توجہ مبذول کرنے سے پیشتر کھانے، پینے، پہننے اور رہنے کی ضرورت ہوتی ہے اور کسی ملک کے دستور، اصول قانون، علوم وفنون اور ایک حد تک ملک کے باشندوں کی شریعت کے بنیادی اصول کسی سماج کے اقتصادی حالات میں پنہاں ہوتے ہیں اور اگر کسی ملک کے آئینی، قانونی اور مذہبی تخیلات کی بابت یہ معلوم کرنا ہو کہ وہ کیوں اور کس طرح پیدا ہوئے تو اس ملک کی اقتصادی تاریخ پر نظر ڈالنی چاہیے کیونکہ کسی زمانہ کے

اقتصادی حالات ہی ان خیالات کا سرچشمہ ہوتے ہیں"

مارکس کی سب سے اہم خصوصیت یہ تھی کہ وہ انقلابی تھا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام اور اس کے پیدا کردہ تمام اداروں کو فنا کر دے۔ اس نے تمام عمر پرولتاری طبقہ میں تنظیم اور بیداری پیدا کرنے میں گزاری یہی وہ ہتھیار تھے جن سے سرمایہ داری فنا ہو سکتی تھی پرولتاری میں تنظیم اور بیداری پیدا کرنے کے لیے مارکس نے سنہ ۱۸۴۲ء میں راہن زیتانگ اخبار نکالا۔ حکومت کے تشدد سے وہ بند ہوا تو سنہ ۱۸۴۴ء میں پیرس سے وارورٹس اخبار نکالا۔ برجوازی حکومت نے اس کو بند کیا تو سنہ ۱۸۴۸ء سے سنہ ۱۸۴۹ء تک نیو راہن زیتانگ نکالا یہ بند ہوا تو سنہ ۱۸۵۲ء سے سنہ ۱۸۶۱ء تک نیویارک ٹریبیون کو مضامین دیے اور پیرس، لندن اور برسلز میں تحریر و تقریر سے پرولتاری کی خدمت کرتا رہا۔ سب سے اہم یہ کام انجام دیا کہ بین الاقوامی مزدور سبھا کی بنیاد ڈالی۔ انصاف یہ چاہتا ہے کہ وہ انسان جو اتنا کام کر جائے وہ تحسین و آفریں کا مستحق ہے۔ مارکس چونکہ پرولتاری طبقہ کا حامی تھا اس لیے اپنے زمانہ کی سب سے زیادہ مطعون ہستی تھی۔ استبدادی اور جمہوری حکومتوں نے اس کو نکالا برجوازی طبقہ نے اس پر ہر قسم کے اتہام لگائے لیکن اس نے ان کو مکڑی کے جالوں کی طرح جھاڑ دیا۔ اس کی موت پر سائبیریا سے کیلیفورنیا تک سب مزدور طبقہ آنسو بہا رہا ہے۔ اور میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگرچہ اس کی تعلیم کے بہت سے مخالف تھے لیکن کسی کو اس کی ذات سے عناد نہیں ہوا۔ اس کا نام اور کام صدیوں تک زندہ رہے گا۔

ایم ایم جوہر میرٹھی

اسکولوں میں تعطیلات

ہمارے اسکولوں میں چھٹی کا رویہ کسی تعلیمی یا نفسیاتی نظریہ سے نہیں قایم کیا گیا بلکہ روایات اور مذہبی رسومات پر منحصر ہو چھٹیاں چاند سورج کی چال اور ستاروں کی گردش، موسموں کی تبدیلی، اخلاقی و تاریخی واقعات یا تہواروں پر مبنی ہیں۔ اس وجہ سے باوجود اس کے کہ اسکول میں چھٹیوں کی تعداد کم نہیں پھر بھی اسکول کے پروگرام اور تعلیم کے اصول کے مطابق نہیں ہوتیں۔ گو کہ تعطیل کی ترتیب اور ان کا تعلیمی نقطۂ نظر سے معین کرنا اسکول کے لیے اتنی ہی اہمیت رکھتا ہو جتنا کہ روزمرہ کے سبق کی ترتیب اور کام کی تقسیم لیکن اس مسئلہ پر ہمارے ماہرین تعلیم نے زیادہ غور نہیں کیا ہو۔ اب صرف دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔

۱۔ یہ کہ اسکول کا کام ایسے طریقے سے ترتیب دیا جائے کہ ہر سال چھٹیوں کے مطابق اسکول کا پروگرام بدلتا ہے لیکن اس طریقہ پر عمل کرنے میں بہت سی دقتیں ہیں مثلاً ملک کے ہر صوبہ میں اور صوبہ کے اندر مختلف شہروں میں چھٹیوں کے اوقات مختلف ہوتے ہیں گرمی، سردی اور بارش وغیرہ مختلف اوقات پر آتی ہیں۔ اس لیے اسکول کے اوقات بھی مختلف ہوں گے اور پھر اُن میں تعلیمی یکسانیت نہ ہونے کی وجہ سے ان کی دیکھ بھال اور انتظام میں دقت ہوگی۔ اس لیے چھٹیوں کے حساب سے اسکول کے کام کی ترتیب مناسب نہیں۔

۲۔ پھر دوسری صورت یہ ہو سکتی ہو کہ اسکول کے پروگرام کے اعتبار سے چھٹیاں ترتیب دی جائیں۔ یہ تجویز تعلیمی اور نفسیاتی نقطۂ نظر دونوں اعتبار سے زیادہ کامیاب ہو سکتی ہو۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ چھٹیوں کی تعداد اور اُن کا وقفہ کام کی زیادتی یا کمی اور دماغ کی تازگی یا تکان کے اوپر رکھا جائے۔ جب جیسی ضرورت ہو ویسی تعطیل دی جائے، اور یہ جبکہ اسکول کے کام کا ٹائم ٹیبل بنتا ہو اسی وقت اور اسی طرح یہ بھی پہلے سے طے کر دیا جائے یعنی تعطیل کتنے دن کی ہوگی اور کب ہوگی۔ یہ مسئلہ اسکول کے معلمین اور منتظمین کو محکمۂ تعلیم کی مدد سے طے کرنا چاہیے۔ اس بنا پر یہ ضروری نہیں کہ مذہبی اور اخلاقی مواقعوں کی تمام چھٹیاں منسوخ کر دی جائیں

کیونکہ چھٹیوں کی فہرست بناتے وقت اس کا لحاظ کیا جا سکتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ کسی مذہبی یا اخلاقی موقعہ کی اہمیت چھٹی کی لمبائی اور وسعت سے کی جائے۔ مثلاً یہ ضروری نہیں کہ دسہرہ، محرم اور بڑے دن کی چھٹیاں دو یا تین ہفتہ کی ضرور ہوں۔ ان مذہبی موقعوں کی اہمیت محض چھٹی کی لمبائی سے نہ جانچی جائے۔ اگر ان موقعوں پر اسکول کے کام کی وجہ سے لمبی چھٹی کی ضرورت ہو تو نہایت اچھا ہے کیونکہ تب تو مذہبی اور تعلیمی دونوں فرائض ادا ہو جاتے ہیں۔

آخر چھٹی کا مقصد کیا ہے؟ کم از کم چار مقصد ہو سکتے ہیں۔

۱۔ ظاہر ہے چھٹی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہو سکتا ہے کہ طالب علموں کو روزمرہ کے دستورالعمل سے سکون مل سکے تاکہ وہ آرام کر کے جسمانی اور دماغی تازگی حاصل کر سکیں لیکن اس سے پیشتر یہ معلوم کرنا چاہیے کہ چھٹی سے قبل کتنے دن مسلسل کام کی ضرورت ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ایک ماہ مسلسل کام کرنے کے بعد ایک دو دن کا وقفہ ضروری ہو۔ ایسی صورت میں مہینہ کا آخری دن چھٹی کا ہونا چاہیے۔ یہ معاملہ ایسا ہے جس میں اسی وقت رائے قائم کی جا سکتی ہے جبکہ نفسیاتی جانچ ہو جائے اور اس کا نتیجہ معلوم ہو۔

۲۔ یہ کہ جو کچھ طالب علم نے پڑھا اور سیکھا ہو اس کے ذہن نشین کرنے کا موقع ملے اور اس کی دماغ میں باقاعدہ ترتیب ہو جائے لیکن یہ جانچ کے بعد ہی معلوم ہو سکتا ہے کہ دماغ کو کسی مسئلہ کے ذہن نشین کرنے کے لیے کتنے وقفہ کی ضرورت ہے۔ اور اس معاملہ پر بھی بلا جانچ کیے رائے قائم کرنا مناسب نہ ہوگا۔

۳۔ یہ کہ طلبا کی شخصیت کے وہ پہلو جو کہ اسکولی گرد و نواح میں نہیں ظاہر ہوتے ان کو ظاہر ہونے اور نشو و نما پانے کا موقع ملے۔ مثلاً اپنے دوستوں اور عزیزوں سے مل کر وہ اپنی اخلاقی دنیا کی ترتیب دے سکیں۔

۴۔ چھٹیوں میں نئی جگہ جانے اور نئی چیزوں کے دیکھنے اور سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔

برخلاف ان فوائد کے چھٹیوں سے نقصان بھی ہو سکتا ہے خصوصاً جب چھٹیاں لمبی ہوں۔ کیونکہ تجربہ یہ بتلاتا ہے کہ بڑی چھٹیوں میں جو کچھ کہ طلبا نے سیکھا ہے اسے بھول جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اور اگر اس قسم کی لمبی چھٹیاں زیادہ ہوں تو تعلیم کی بنیاد کو دھچکا پہنچتا ہے اور طلبا کو دوبارہ پھر وہی چیزیں سکھانی پڑتی ہیں جو کہ وہ ایک دفعہ سیکھ چکے ہیں۔ اس وجہ سے زیادہ لمبی چھٹی نہیں ہونی چاہیے۔

دوسری بات یہ ہے کہ لمبی چھٹی کی وجہ سے جو کچھ طلبا نے روزمرہ کے کام میں مہارت حاصل کی ہو اور جن کی عادت پڑ چکی ہو وہ بگڑ جاتی ہے اور ان کو از سرِ نو کوشش کرنی پڑتی ہے۔ مثلاً وقت کی پابندی صبح اٹھنا۔ وقت سے کھانا کھانا، سونا اور کام کرنا لمبی چھٹیوں سے ان عادتوں میں خلل آتا ہے۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ چھٹی کے بعد طلبا کچھ دنوں تک اسکول دیر کر کے پہنچتے ہیں اور کام میں مستعدی اور تیزی کم ہو جاتی ہے

پھر اسکول سے زیادہ دنوں تک غیر حاضر ہونے سے کچھ اور بھی نقص پیدا ہو جاتے ہیں۔ جب تک لڑکا اسکول میں ہوتا ہے وہ اپنے ساتھیوں میں اٹھنے بیٹھنے، کھیلنے کودنے کا عادی ہوتا ہے۔ اس کا رویہ ایک قسم کا ہوتا ہے وہ اپنی جمعیت کی زندگی میں ایک رکن ہو کر بڑھتا اور نشو ونما پاتا ہے۔ وہ جمعیتی اخلاق کا پیرو کار اور نمائندہ ہوتا ہے وہ مجموعی جذبات اور جماعت بندی کی اسپرٹ کو خود اختیار کرتا ہے اور اس کے زیرِ اثر اس کی اخلاقی اور جذباتی زندگی تکمیل پاتی ہے چھٹیوں میں اس کی جماعتی زندگی ختم ہو جاتی ہے اور وہ گھر کے محدود دائرہ میں واپس آتا ہے یہاں اس کو ایک دوسرے قسم کی اجتماعی زندگی جس کا طرزِ معاشرت مختلف ہوتا ہے برتنا پڑتا ہے۔ اکثر اس محدود ماحول کی معاشرت کا معیار اجتماعی اخلاق سے پست ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کو اپنا طرزِ عمل بدلنا پڑتا ہے اور اس کشمکش میں اخلاقی صلاحیت یا مطابقت کی قوت زائل ہو جاتی ہے اور جتنی زیادہ چھٹیاں ہوتی ہیں اتنی ہی یہ دشواریاں بڑھتی ہیں۔ یہاں تک کہ کچھ عرصہ بعد انفرادی زندگی اور اس کے دستور العمل اجتماعی زندگی پر حاوی ہو کر اخلاقی مطابقت کی صلاحیت کو قطعی غیر ممکن بنا دیتے ہیں اور انسان سماج میں نکما ثابت ہوتا ہے غالباً یہی وجہ تھی کہ گزشتہ زمانے میں طلبا استاد کے گھر مجموعی طور پر رہ کر تعلیم حاصل کرتے تھے اور آج کل بھی ہوسٹل اور اقامت گاہوں میں رہنے کا یہی مقصد ہے۔ اس کی بابت بعض معلموں کا تجربہ ہے کہ لڑکے چھٹیوں کے بعد دو طریقے اختیار کرتے ہیں یا تو وہ غیر معمولی طور سے جوشیلے، بشاش یا تنی اور اظہار پسند ہو جاتے ہیں یا خاموش، تنک مزاج اور جھگڑالو ہو جاتے ہیں۔ ان دونوں صورتوں میں یہ ظاہر ہے کہ گھر کی محدود زندگی ان کے موافق نہیں آتی۔

اس بحث سے ہم ان نتائج پر پہنچتے ہیں

۱۔ تعطیل کی ترتیب اسکول کی تعلیم کی طرح نفسیاتی نقطۂ نظر سے ہونا چاہیے۔

۲۔ اس کی ترتیب ہر اسکول میں ایک ماہرِ نفسیات کے سپرد کرنا چاہیے۔

۳۔ اجتماعی زندگی قایم رکھنے کے لیے چھٹیوں میں بھی طلبا کو قطعاً انفرادی ماحول میں نہ واپس جانے دینا چاہیئے بلکہ اسکاوٹ کیمپ یا سیاحت، تفریحی سفر چھوٹے چھوٹے جتھے بناکر کرنا چاہیئے تاکہ اجتماعی زندگی کے فواید کے علاوہ معلومات بڑھیں جس طرح اسکول میں روزانہ سبق جماعت کے ساتھ پڑھنے سے زیادہ ذہن نشین ہوتا ہے اسی طرح چھٹیوں کا جماعتی استعمال بھی طالب علم کی اخلاقی زندگی کی بنیاد پختہ کرتا ہے اور اس کی ذمہ داری بھی اسکول پر ہے۔

اب ہم اسکول کے اوقات کے بارے میں دو چار باتیں کہیں گے۔ عام خیال ہے کہ اسکول کا ٹائم ٹیبل اسکول کے انتظامی صیغہ سے تعلق رکھتا ہے اور اس کی ترتیب منتظموں کے ہاتھ ہونی چاہیے اور اس خیال کے بموجب ایسا ہی یعنی ٹائم ٹیبل بنانے میں صرف دو باتوں کا لحاظ کیا جاتا ہے کہ کتنے کمرے ہیں اور کتنے گھنٹے اور طلبا کی کتنی تعداد ہے اور استاد کتنے ہیں۔ اگرچہ یہ طریقہ ایک حد تک ٹھیک ہے لیکن کچھ اور باتیں بھی ہیں جن کا لحاظ کرنا نہایت ضروری ہے اور جو عام طور پر نظر انداز کر دی جاتی ہیں۔

ایک مشہور فلسفی برگساں کا بیان ہے کہ وقت دو قسم کا ہوتا ہے ایک اصل وقت اور دوسرا مادی یا فطری وقت۔ اصل وقت وہ ہے جو کہ ہم روزمرہ کے تجربہ میں برتتے ہیں اور جو کہ نفسیاتی حیثیت رکھتا ہے جس کا اتار چڑھاؤ کم یا زیادہ ہونا ہماری نفسی زندگی سے تعلق رکھتا ہے اور جو ہماری عمر کا پیمانہ ہے۔ برگساں کے اس اصل وقت کے مطابق ہمیں ایک مدرسی یا جماعتی وقت بھی ماننا چاہیے۔ اصلی وقت کی طرح یہ وقت مدرسہ اور طلبا کی زندگی سے وابستہ ہے اس کے چار پہلو ہو سکتے ہیں۔ (۱) اس کی رفتار یکساں نہیں ہوتی جیسا کہ ہر استاد اور طالب علم کا تجربہ ہے۔ یہ وقت اسکول کے دوران میں بدلتا رہتا ہے۔ پہلے دو تین گھنٹے جلد گزرتے ہیں پھر اس کی رفتار سست اور تیسرے پہر کم ہو جاتی ہے۔ گرمی، سردی اور برسات میں اس کی چال الگ الگ ہوتی ہے اسی طرح جس روز صبح اچھی اور خوشگوار باتوں میں گزری ہو تو اس کی رفتار دن بھر اچھی اور اگر تکلیف دہ اور دردناک واقعات کے نذر ہو چکی ہو تو اس کی رفتار نہایت سست اور تکلیف دہ ہوتی ہے۔ مثلاً جبکہ سبق یاد ہو تو گھنٹہ اچھا اور جلد گزرتا ہے اور اگر نہ یاد ہو تو اس کا کٹنا دشوار ہو جاتا ہے۔ (۲) وقت کی رفتار کے مطابق سبق کی مقدار گھٹتی بڑھتی رہتی ہے کسی گھنٹہ میں زیادہ کسی میں کم (۳) کسی گھنٹہ میں طالب علم زیادہ توجہ پذیر اور تاثر پذیر ہوتا ہے اور کسی میں قطعی نہیں، اور (۴) کسی گھنٹہ میں وہ نرم اور حلیم اور کسی میں چڑچڑا، تنک مزاج اور غصہ میں رہتا ہے یعنی جب جذبات کی شدت ایک طوفان برپا کر رہی ہو اس وقت ایک گھنٹہ کچھ اور ہی معنی رکھتا ہے۔

اب یہ ظاہر ہوگیا کہ مدرسی وقت کی کتنی اہمیت ہے کیونکہ اگر اس پر توجہ نہ دی جائے تو ٹایم ٹیبل ایک بے جان ڈھانچہ بن جاتا ہے جس کے شکنجہ میں نوجوان طالب علم کی شخصیت اور اس کے نفس کو ترقی کرنے اور نشوونما کی گنجایش نہیں رہتی لیکن اس کے قبل کہ ہم ایسا ٹایم ٹیبل بناسکیں جس میں مدرسی وقت کا بھی لحاظ رکھا جائے بعض باتوں کو ہمیں سمجھ لینا چاہیے (۱) ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ کام کے ساتھ دماغی اور طبعی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ایک حد پر پہنچنے کے بعد ان کی وجہ سے کام کی مقدار میں کمی ہونے لگتی ہے۔ اب نفسیاتی نقطۂ نظر سے جو ٹایم ٹیبل بنے گا اس میں اس کا لحاظ کرنا ہوگا کہ یہ تبدیلیاں اُس حد تک نہ پہنچنے پائیں مثلاً یہ سب جانتے ہیں کہ کسی چیز کی طرف زیادہ دیر تک توجہ نہیں دی جاسکتی اس لیے اگر ایک مضمون ضرورت سے زیادہ دیر تک پڑھایا گیا تو بیکار ہوتا ہے کیونکہ اس پر دھیان نہیں رہتا اور گراں گزرتا ہے اس لیے ۵ یا ۱۰ منٹ کا دفعہ ہر گھنٹہ کے بعد رکھنا اچھا ہوگا۔

۲۔ ٹایم ٹیبل میں کل کتنے گھنٹے شامل ہونے چاہئیں یہ بھی جانچ کرنے پر معلوم ہوسکتا ہے۔ ہر اسکول میں ۵ یا ۶ گھنٹہ وقت مقرر کیا جاتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ وقت سب لڑکوں کے لیے یکساں ٹھیک ہو۔ ہمارے اسکولوں میں اس کا لحاظ نہیں کیا جاتا کہ طالب علم کی عمر کے مطابق اس کا ٹایم ٹیبل بنایا جائے۔ یہ ظاہر ہے کہ ۱۲ یا ۱۷ برس کے لڑکے کے لیے جو اوقات مناسب ہوں گے وہ ۷ یا ۸ برس کے لڑکے کے لیے تکلیف کا باعث ہوسکتے ہیں عمر کے لحاظ سے وقت کی تقسیم ضروری ہے۔ اس طرح دو تین جماعتیں ہوں گی جن کے پڑھنے کے اوقات مختلف ہوں گے۔

۳۔ اس کے علاوہ طلبا کی ذہنی جانچ کرکے یہ معلوم کرنا چاہیے کہ کس کو کتنا وقت دینا ضروری ہے۔ اس اعتبار سے اگر چھوٹے چھوٹے گروپ بنائے جائیں تو تعلیم کا اثر کامل اور دیرپا ہوسکتا ہے کیونکہ وہ طلبا جن کی ذہنی حیثیت کم ہے اور جن کی زیادہ دونوں کو علیحدہ وقت دینے سے دونوں کی تعلیم مناسب ہوتی ہے۔

لیکن یہ کہا جائے گا کہ ان تمام باتوں پر عمل کرنا ناممکن ہے کیونکہ ہمارے ملک کی حالت ایسی نہیں کہ اس کا خرچ برداشت کرسکے اور مدرسیاں ایسے استاد کہاں ہیں جو ماہر نفسیات بھی ہوں۔ یہ ایک حد تک درست بھی ہے لیکن آج جبکہ تمام انسانی دنیا میں تبدیلیاں ہورہی ہیں ہم کو تعلیم کی طرف بھی ایک نئی روشنی ڈالنی چاہیے تاکہ ہم آیندہ کے لیے تیار رہیں۔ (بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ)

کالی پرشاد ایم اے

عالمگیر امن

(مسئلۂ زر کا حل)

یہ نہایت مختصر مضمون سر ولیم بیورج نے ہیلے اسٹوارٹ کے عام اجلاس میں پڑھا جہاں تک دنیا اور اس کے امن کا تعلق ہے ہمیں یہ کہنے میں باک نہیں کہ اس کا انحصار بیشتر حصہ اقتصادی بحالی پر ہے اقتصادی بحالی ایسی ریاست کا قیام چاہتی ہے جس میں تقسیم زر اور تحصیل زر کے ذرائع ان اغراض اور اس معیار کے ہوں کہ افراد کے قوائے عمل توانا رہیں۔ معاشرے کے تمام طبقے اپنی اپنی جگہ مطمئن ہوں۔ ہر طبقہ کا معیار حیات جداگانہ سہی لیکن نسبتی پستی اور باہمی منافرت پایا جائے۔ طبقہ وار اونچ نیچ اس حد تک نہ بڑھ سکے کہ احساس فروتری کا جذبہ نشو و نما پا جائے۔ اگر یہ ہو تو امن ہی امن ہے جس کی موجودگی میں زندگی انقلاب انگیز سرعت سے نشو و نما پا سکتی ہے اور ارتقائے ذہنی و بدنی کے لیے صحیح مواقع میسر آسکتے ہیں۔

اس مضمون میں ولیم بیورج نے مسئلہ زر کے بعض پہلوؤں پر صاف بیانہ انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ موصوف عہد جدید کے صف اول کے معاشیین میں سے ہیں۔ آپ شروع شروع میں مارننگ پوسٹ کے مقالہ نگار خصوصی تھے ۱۹۱۹ء سے مدرسۂ معاشیات و سیاسیات (لندن) کے ناظم ہو گئے۔ آپ مبادلات کارندگی کے پہلے صدر اور دوران جنگ میں تجارتی بورڈ کے تحت مبادلات عمل کے ناظم تھے۔ بعدہٗ بارودی کابینہ کے معاون معتمد عمومی ہو گئے۔ پھر خوراک کی وزارت کے مستقل معتمد۔ آپ نے ۱۹۲۵ء میں کوئلہ انڈسٹری سے متعلق شاہی کمیشن کے ایک رکن کی حیثیت سے کام کیا۔

یہ لکچر مذکورہ بالا ٹرسٹ کے زیر اہتمام پڑھا گیا۔ اس کا قیام سماجی زندگی میں مسیحی مثالیت کے تجسس کی غرض سے ہوا۔ اس مرتبہ صدارت کے فرائض سر تھیلے نے ادا کیے۔

سر ولیم بیورج سے پہلے پانچ دیگر افراد نے اس سلسلے میں مقالے پڑھے۔ ان کا حوالہ اثناً آئے گا۔ پانچوں افراد یہ ہیں: مجلس اقوام کے اقتصادی شعبے کے ناظم سر آرتھر سالٹر، انگلستان کے زرگر کے ایک ناظم سر جوزیا اسٹیمپ، معاشی مشاورتی مجلس کے رکن جے۔ ایم کینز، بینک آف انگلینڈ کے ایک ناظم سر بیسل بلیکٹ اور کفالتی انتظامیہ وقف کے مشیر اقتصاد ہنری کلے، رحمٰن مرتب۔

مسٹر کلے:- آپ کی مجوزہ تقاریر کا سلسلہ قریب الاختتام ہے۔ اگر آپ ایک بار پھر مجھ سے یہی استفسار کریں کہ بہتری کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے تو میں اس کا جواب دوسرے سوال کے ذریعہ دیتا ہوں: "آپ کیا گمان کرتے ہیں کہ آپ کس سے مخاطب ہیں؟" کسی مکتبی متعلم کی طرح میں تند جواب نہیں دینا چاہتا۔ بات یہ ہے کہ جب تک آپ یہ نہ بتائیں کہ مجھے کن اختیارات کا مالک ہونا تصور کیا جائے گا میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ درحقیقت ایک عامی اقتصاد داں کی حیثیت سے میں خاک نہیں کر سکتا جبکہ مجھے کسی سرکار سے تعلق نہ ہو اور میں سرکار کے ارباب حل و عقد میں شامل نہ ہو جاؤں۔ ایسی صورت میں فقط اپنے خیالات کا تذکرہ کر سکتا ہوں، لوگ تقریر کی فرمایش کریں تو تقریر کر سکتا ہوں۔ وقتاً فوقتاً قلم گھسیٹ سکتا ہوں، ہر پانچویں سال یا ایسے ہی کسی موقع پر عام انتخابات میں رائے دے سکتا ہوں۔ اگر میں وزیر مالیہ ہو جاؤں تو بہتیرے امور ایسے ہیں جنھیں میں سرانجام دے سکتا ہوں مجھے ان کے لیے سرگرم عمل ہونا چاہیے۔ بہتیرے امور ایسے ہیں جنھیں میں سرانجام دینے سے معذور رہوں بدیں وجہ مجھے ان کے لیے کوشش نہ کرنی چاہیے۔ لیکن اگر میں سر جوزیا اسٹیمپ ہوتا، یا جمہوریہ فرانس کے زرگر کا عامل یا دولت افرنگ کا وزیر اعظم یا ریاستہائے متحدہ امریکہ کا صدر تو میرے اختیارات کچھ اور ہی ہوتے اور مجھے کچھ اور ہی کرنا پڑتا۔ پھر اگر میں [illegible] اعظم ہوتا تو مجھے اپنے خیالات کسی دوسری جانب منتقل کرنے کی ضرورت پڑتی۔ آپ کے مفروضہ استفسار کے مفروضہ افراد میں میں کون مفروضہ فرد ہوں یہ مجھے جو کچھ کرنا ہوگا اس کا انحصار جواب پر ہے۔

میں اپنے تئیں خود ہی جواب تجویز کیے لیتا ہوں اور قیاساً مان لیتا ہوں کہ میں آمر عالم ہوں یعنی ایک آمر [illegible] ہوتا انگلستان کا وزیر اعظم بن جاتا اور ایسا ہی جیسے جمہوریہ امریکہ کا صدر بن جاتا [illegible] کے مابین اختلافات اور جھگڑوں کے [illegible] بین الملی اتحاد کی کمی کے باعث عالمگیر بہتری [illegible]

خلاصی پانے کی راہ مسدود او ردوگونہ مسدود ہے۔ صرف آمر ہی اپنا راستہ نکال سکتا ہے لیکن محض سیاسی آمر ہونے سے زیادہ کی ضرورت ہے مجھے جادو کے چراغ کا الہ دین ہونا چاہیے اور آپ کو غالباً جن ہونا چاہیے تاکہ میری خاطر کرشمات کرسکیں اور بطور اعجاز دنیا کی حکومتوں کو ایک دم یکساں شعور مند کرسکیں۔ لاریب میرا یہ منشا نہیں کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے شعور مند رہیں بلکہ جب تک کہ ہم از سرِ نو اپنے امور بالصواب کر پائیں۔ نیز میرا یہ مطلب بھی نہیں کہ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آمر رہوں۔ یہ ایک ہولناک منظر ہوگا۔ بہرحال ہمیں ایک ایسی دنیا تعمیر کرنا ہے جو اپنے آپ آزادی اور توازن سے متحرک رہے۔ اس وقت ایسا نظام معاشی بروئے کار لانے کے لیے کن اعجاز افروز تغیرات کی ضرورت ہے جو مافوق الفطرت مخلوق سے نہیں بلکہ عام افراد سے غیر معمولی حکومتوں سے نہیں بلکہ اس نوع کی حکومتوں سے چل سکے جن کے دستیاب ہونے کی ہمیں توقع ہے؟

مسٹر میلے ایسے میں کہ آپ بیٹھے ہماری صدارت کر رہے ہیں میں آپ سے کہنے کو ہوں کہ آپ براہ کرم خود کو کرشمہ ساز جن تصور کرلیں جو ان تمام امور کو کرنے یا کروا سکنے پر قادر ہو جن کا دنیا میں ہونا میرے خیال سے معاشی زندگی کی پائیداری کے لیے واجبی ہے میں آپ کے سپرد کون سے امور کس ترتیب سے کروں؟

پہلے دو امور کی نسبت مجھے کسی قسم کا شبہ نہیں۔ اول آپ جاکر تمام حکومتوں سے ابھی اور فوراً جنگی تاوانوں اور قرضوں کا معاملہ منسوخ کرنے کے لیے کہیں! یہ بین الملی پابندیاں جو جنگ کا نتیجہ ہیں جنگ کے بڑھانے کا ذریعہ ہیں۔ یہ بین الاقوامی تعاون کا راستہ روک لیتی ہیں اور ہمارے معاشی نظام کی بدترین حالات ہیں۔ انھیں کسی طرح کی اخلاقی سفارش حاصل نہیں۔ یہ دیگر حالات کے مثل نہیں نفسیاتی اور معاشی اعتبار سے یہ مضر ہیں۔

دوم آپ جاکر میری جانب سے حکومتوں سے کہہ دیں کہ انھیں درآمد اور برآمد کے محصولات ترک کرنا ہوں گے۔ ایک دم نہیں اس لیے کہ بڑھے ہوئے محصولی ممالک میں ان سے تباہی پھیل جائے گی۔ البتہ ایک ایسے قاعدے کے تحت جس کی رو سے از خود سال بسال دنیا بھر کی تمام محصولی دیواریں آہستہ آہستہ پیوستِ زمین ہو جائیں گی۔ ان کے دوش بدوش برآمد کے لیے سرکاری امدادی رقوم اور فاضل ٹیکسوں کے سلسلے بھی معدوم ہو جائیں گے جن کے ذریعہ ایک ریاست دوسری ریاستوں کی گردن اکر بالمار

ہونے کی سعی کرتی ہے۔ ایک آدمی کو بیس سالہ منصوبے کی احتیاج ہے تاکہ ہر ملک کی صنعت کو متوازن کرنے ہو بنی آدم کو اس درجے پر پہنچانے کی مہلت مل سکے کہ وہ قدرت کے عطیات کا عالمگیر طور پر بہترین تصرف کر سکے

یہ آپ کے پہلے دو امور ہیں۔ اگر تخیل کے روایتی انداز کو ملحوظ رکھوں تو یہ بس کا ہے کے دو دن ہوئے تیسرے دن میں آپ کو جملہ حکومتوں سے بیکاری کے خلاف ضمانت لینے کی غرض سے روانہ کروں گا اس باب میں سب نے ایک دم گڑبڑ مچا دی ہے اور وہ مخالف سمتوں کو چلے گئے ہیں بعض نے امریکہ کی طرح کچھ نہیں کیا۔ انھوں نے یہ ذمہ داری اس وقت تک اپنے سر نہیں لی جب تک کہ ان کا گھر شعلوں کی نذر نہ ہو گیا۔ اوروں نے ہماری طرح عمدہ اسکیم جاری کی لیکن بے ڈھنگے پن سے اسے ستیاناس کر دیا انھوں نے لوگوں کو صحیح معنی میں بیکار نہ ہونے کی حالت میں بیکاری کا معاوضہ پانے کی مہلت دی اور اپنی اسکیم کو ایسا کر لیا کہ اس سے کاردہندوں اور مزدوربھاؤں کو ضرورت سے زیادہ کارکردگی کو بے ضابطہ اور بے قاعدہ کرنے کا مفید موقع ہاتھ لگا۔ ایک اعتبار سے یہ حماقت ہے اور دوسرے اعتبار سے امریکی نظریہ حقہ اور بد دلانہ ہے۔ ہر ملک کو ایسے تعمیر یے کی ضرورت ہے جس کی رو سے ہر فرد کو کسی نہ کسی قسم کی آمدنی ہو بدیں حالت کہ اس ملک کا صنعتی نظام خواہ وہ کسی ہی نوعیت کا ہو اُسے برسرکار نہ رکھ سکے کسی ملک میں ایسا منصوبہ ہرگز زیر عمل نہ ہو جس سے بیروزگاری کو ترقی اور شہ ملے۔ تیسرے کام سے آپ کو پتہ چلے گا کہ نئی دنیا میں سے بیکاری کا گمان ہے۔ میں ایسا اس لیے کرتا ہوں کہ ہر ارتقا کے معنی تغیر ہیں اور ہر تغیر کے معنی بعض اوقات افراد کو ان کے منتخب پیشوں سے دست بردار کرنا ہوا کرتا ہے۔ جماعتوں کے فائدے کے مدنظر اس کے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ افراد کو کچھ وقت کے لیے کاہل کر دیا جائے یہاں تک کہ وہ تازہ کام پالیں۔ گزشتہ جنگ کے بعد سے جتنی بیکاری ہمارے یہاں ہے اتنی کہیں نہیں لیکن اس کا انتظام اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ بیماری آزاری اور ضعیف العمری کا۔

بحر آمر عالم کے حضور میں بکرشمہ ساز جن کی حیثیت سے آپ کی سہ روزہ مشغولیت یہ ہو گی قرضوں اور استادوں کی تنخواہوں سمولات ذریعے کی حد تک۔ بیروزگاری کے خلاف مطلق ضمانت سب سے پہلے منصوبہ سن میں سالہا سال بھی شاید جو مزدور خوش ہو ضرورت ہو تیسرا کام قدرے غور طلب ہو لیکن ایسا

زیادہ نہیں۔ ان سب میں سے کسی میں حقیقی دقت نہیں بدیں حالت کہ کرنے کی نیت ہو۔

لیکن جب چوتھے روز کی فجر کو آپ بے تکان اور سرگرم لوٹ آئیں گے تاکہ آپ کو دوسرا کام دیا جائے تو آپ محسوس کریں گے کہ اب بالانجام ہمیں حقیقی مسئلے کا سامنا کرنا ہے۔ ہمیں ایک بہت بڑی مشکل طے کرنا ہے ہمیں عالمگیر نظام کے قیام کے الگ الگ طریقوں میں فیصلہ کرنا ہے۔ جن دو طریقوں سے ہم آشنا ہیں وہ ٹھیک طرح کام نہیں کرتے۔ میں چوتھے روز آپ کو یہ بتانے کے لیے تیار نہ ہوں گا کہ آگے کیا کیا جائے مجھے دریافت کے سلسلے میں انتظامات کرنا ہوں گے۔ میں ایسے چار یا پانچ آدمیوں پر مشتمل ایک کمیشن مقرر کردوں گا جو انصاف پسند اور فہیم ہوں اور مجھے مشورہ دینے کے لیے معاشیات میں خوب طاق ہوں۔ اگر یہ قومی معاملہ ہوتا تو میں اس پلیٹ فارم پر اپنے پانچوں ممتاز سابقین کو منتخب کرنے کی جانب رجوع کرتا۔ لیکن ان میں سے ایک دو سے میں ذرا خائف ہوں۔ بہر نوع ہمیں دنیا بھر کے بہترین اقتصاد دانوں کو شامل کرلینا چاہیے۔ یہ ایک ہی جزیرے کے نہ ہوں۔ اس ساختہ کمیشن کو میں دوہرا دوہرا کام دوں گا: اول، مجھے کہنا ہوگا "قیمتوں کے ذریعہ ساختہ اشیا کے مروجہ تخمینی قاعدوں کے مطابق، سرمایہ دارانہ طریقے پر دنیا کی پیداوار کا معیار قائم کرنے کی غرض سے میرے لیے ایک تعمیر یہ مرتب کرو۔" اس سے یہ مراد ہے "قدر خرید کی نراجی ختم کرنے کا مجوزہ تیار کرو لیکن پیداوار اور مبادلہ کی سہولتیں رہنے دی جائیں۔ بتاؤ یہ کیونکر کیا جا سکے گا۔ جو کچھ اب ہم کرتے ہیں اس میں اس کا مفہوم کس تغیر سے ہے؟ مجھے بتاؤ آیا اس کا مطلب یہ ہے کہ زرگھروں سے کرادیت کا اجرا بند کیا جائے۔ کرادیت کے فاضل ڈھانچے کے بغیر نقدیات کی سمت رخ کیا جائے یا یہ مطلب ہے کہ کرنسی کو کامل طور پر عالمگیر بنایا جائے اور ہر ریاست کے مرکزی زرگھر کو کسی بڑے عالمگیر ادارے کی شاخ قرار دیا جائے؟"

یہ کمیشن کے کام کا نصف اول ہے۔ نصف آخر یہ ہے کہ ساختہ اشیا کو براہ راست افادے اور استعمال کے اعتبار سے چلانے کے طریقے پر اشتراکی آئین و دستور کے مطابق پیداوار کو برقرار رکھنے کا مجوزہ مجھے پیش کیا جائے۔ یہ سلسلہ قیمتوں کے ذریعہ نہ جاری رکھا جائے۔ "ممکن ہو تو مجھے ایسا مجوزہ لاکر دو،" میں کہوں گا "جس کا مطلب یہ ہوگا کہ انفرادی دولت کا خاتمہ کردیا جائے اور اسی کے ساتھ انفرادی ناداری کا لیکن یہ ضرور ہے کہ تم مجھ پر واضح کرسکو کہ یہ نظام ثانی ارتقا اور آزادی کے موافق ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ارکان کمیشن کو

روس جا پڑے گا اور آپ کو اس اعجاز آفرین یقین حاصل کرنے کی غرض سے ہمراہ رہنا ہوگا کہ آیا وہ اصلیت کو پہنچ لیے ہیں، خدشہ یہ ہو کہ ایسی سرزمین پر جہاں کبھی زہریلے اندھیاؤں کی طرح دہشت پھیلی ہو صداقت بآسانی پروان نہیں چڑھتی۔

جب ارکانِ کمیشن لوٹ آئیں گے تب صاف طور سے پانچویں روز کا اختتام ہوگا۔ انھیں دو کاموں کے لیے کامل دو روز چاہییں۔ انھیں نہایت غور و خوض سے کام لینا ہوگا کیونکہ ہماری اقتصادی زندگی کے لیے انھیں مالیات کی جدید بنیاد ڈالنا ہوگی۔ جب وہ لوٹ آئیں تو مجھے ان کے مجوزوں کا فیصلہ کرنا ہوگا — یہ کم از کم اس صورت میں ہوگا کہ وہ دو مجوزے لیے چلے آئے اور ان میں سے ہر ایک لائقِ عمل ہوا۔ اگر ارکانِ کمیشن نے یہ آکر کہا کہ ان مجوزوں میں فقط ایک ہی ایسا ہے جو سہولت، آزادی اور ترقی پسندی سے بروئے عمل لایا جاسکے گا تو پھر مجھے بالیقین اسی ایک کو منتخب کرنا ہوگا اب وہ خواہ کوئی سا بھی ہو۔ اگر دونوں مجوزے یکساں لائقِ عمل ہوئے یا دونوں یکساں مشکوک پائے گئے تو میں آزمایش کے لیے سرمایہ دارانہ مجوزہ کو منتخب کروں گا۔ اس لیے کہ اگر سرمایہ دارانہ طریقہ کامیاب نہ ہوسکا تو زیادہ سے یہی ہو کہ ہمیں موجودہ ابتری کی طرح ایک دوسری ابتری سے پالا پڑے گا لیکن اگر اشتراکی مجوزہ ناکام رہا تو ہم اقتصادی فلاح و بہبود سے زیادہ ضروری چیزیں تباہ کرلیں گے۔

بہر نوع چھٹے روز کی دوپہر کو میں طے کرچکوں گا اور بعد از دوپہر آپ کو میرے احکام کی تعمیل کرنا ہوگی۔ مگر پہلے: بعدہٗ ہم خوشی خوشی آمریت سے دست بردار ہوجائیں گے، اپنے سحر کارانہ ملبوسات سے نکل آئیں گے اور اپنے آپ میں آجائیں گے۔ ہم میں کرشمہ سازی کی قوت نہ رہے گی اور کرشمہ سازی کی ضرورت بھی نہ ہوگی ساتواں روز نئی دنیا کو بروئے کار لائے گا، یہ اقتصادی نظریے سے نوساختہ ہوگی ورنہ دوسرے اعتبار سے یہ ایسی دنیا ہوگی جہاں آدمی گھر کی طرح رہے گا۔

یہ دنیا کام اور آرام، ذاتی جد و جہد، ذاتی کامیابی اور ناکامی، خوش نصیبی اور بدنصیبی کی دنیا ہوگی — ہم ہی سے دیگر ہم جنسوں کی دنیا ہوگی جس میں سب کے لیے طبع آزمائی کا موقع ہوگا۔

رحمٰن مذنب

فضلی نامہ

گو نگاہوں سے نہاں ہو فضلی — تو جہاں بھی ہو وہاں ہو فضلی

بعد مرنے کے بھی اے دوست تجھے — روح بن کر نگراں ہو فضلی

ہم نے کوئی نہیں پایا اپنا — یوں تو کہنے کو جہاں ہو فضلی

مفت کیوں حسن کو کیجے بدنام — عشق خود آفت جاں ہو فضلی

عشق میں دوست کی ہلکی سی بھی بات — طبع نازک پہ گراں ہو فضلی

کیا ہوا کس سے خفا ہو اتنا — کیوں چڑھی آج کماں ہو فضلی

بعد میرے وہ کسی کا کہنا
کوئی بتلائے کہاں ہو فضلی

مرکزِ حسنِ جہاں ہے فضلی — للہ الحمد جواں ہو فضلی

سنتے ہیں تیری زبانی فضلی — اہلِ دل اپنی کہانی فضلی

تیرے شعروں میں روانی وہ ہے — جیسے بہتا ہوا پانی فضلی

ہم نے خود کہنے کی جب کی کوشش — قدر تب کچھ تری جانی فضلی

اک بت ہمہ داں کے آگے — [illegible] تری ہیچمدانی فضلی

ہائے فضلی سے کسی کا کہنا
پھر سنیں تیری کہانی فضلی

فضل احمد کریم فضلی

تجلیات

پھولوں میں، ستاروں میں تبسم ہو تمھارا
اے دوست! تمھیں ہو چمن آرا، فلک آرا

کچھ رنگ بھرے میری نگاہوں نے بھی تجھ میں
آئینۂ دل نے بھی ہے کچھ تجھ کو سنوارا

مسحور ہے اب دیکھ کے تو اپنے ہی جلوے
آنکھوں نے کچھ اس طرح تجھے دل میں اُتارا

اک انجمن حسن ہے یہ انجمن دھر
تو انجمن حسن میں ہے انجمن آرا

زہر آب ہو، شمشیر ہو یا دار و رسن ہو
سب کچھ ہے ہمیں تیری محبت میں گوارا

میں آتش نمرود میں ہوں مثل براہیمؑ
میرے لیے اک پھول ہے ہر ایک شرارا

یہ کشتیِ دل کب کی فنا ہو گئی ہوتی
ہوتا نہ اگر تیری محبت کا سہارا

[illegible] کہیں سے بھی کوئی میری صدا پر
اس دشت میں ہر سمت بہت میں نے پکارا

[illegible]
[illegible]

[illegible]

دو غزلیں

(۱)

میں تجھ کو دیکھنے کی تمنا میں چُور تھا — تو میرے آس پاس خراماں ضرور تھا

سوئے عدم تلاش میں جانا ضرور تھا — تو میری زندگی کی رسائی سے دُور تھا

یہ پچھلی رات خواب میں وہ مسکرائے تھے — یا میرے آنسوؤں کے ستاروں کا نُور تھا

مو قوف کچھ مجھی پہ نہ تھیں یہ بلندیاں — جو ذرہ تیری بزم میں پہنچا، وہ طور تھا

ناگاہ برق میرے نشیمن پہ آ گری — میں سوچتا رہا کہ مرا کیا قصور تھا

دوشیزۂ سحر کا گریباں تھا تار تار — جانے یہ کس نرالے حسیں کا ظہور تھا

خیرہ ہوئی نگاہ مرا دل سمٹ گیا — تو جس قدر قریب ہوا اتنا دور تھا

آنکھیں پکارتی ہیں کہ تھا واہمہ کوئی — اور روح کہہ رہی ہے یہی تیرا نور تھا

لو! بجھ گیا کسی کی تمنا لیے ہوئے

وہ دل کہ جس پہ کون و مکاں کو غرور تھا

(۲)

گھبرا کے شبِ ہجر کی بے کیف سحر میں — تارے اُتر آتے ہیں مرے دیدۂ تر میں

وہ آڑ میں پردے کے تری نیم نگاہی — ٹوٹے ہوئے اک تیر کا ٹکڑا ہے جگر میں

اب وقت کے قدموں میں تحیر کی ہے زنجیر — میں تیری نظر میں ہوں جہاں میری نظر میں

اُس پھول سے چہرے سے جب اٹھ جاتے ہیں پردے — کانٹے سے اُلجھ جاتے ہیں دامانِ نظر میں

اللہ! مرے کفر سے تو قطع نظر کر

میں تیری جھلک دیکھتا ہوں نورِ بشر میں

احمد ندیم قاسمی

سلسلہ اول نمبر ۱۸۹۲

ہم کیسے پڑھائیں

مکتبہ جامعہ دہلی

ٹریننگ اور نارمل اسکول کے استادوں کے لئے بہترین

قیمت ایک روپیہ

کے بدل کیمیاوی طریقے پر تیار کئے گئے۔ لیکن حکومت قوم کی کفایت شعاری اور اپنی دولت پر ہی بھروسا نہیں کر سکتی تھی۔ آسٹریا اور چیکوسلوواکیا پر فوجی مصلحت کے علاوہ اس نیت سے بھی قبضہ کیا گیا کہ وہاں کا غلہ، خام مال کے ذخیرے اور کارخانے جرمنی کو مستقل طور پر مل جائیں۔ ہنگری، یوگوسلاویہ، رومانیہ اور بلغاریہ کی قدرتی دولت پر بھی جرمنی کی نظر تھی، اور یہ طے کر لیا گیا تھا کہ جنگ شروع ہوتے ہی جلد سے جلد انھیں نئی تنظیم میں شامل کر لیا جائے گا۔ اسی نئی تنظیم کے منصوبوں میں پورے یورپ کی معاشی زندگی کو ایک مکمل خود مختار نظام کی شکل دینے کی تجویزیں بھی تھیں، اور جیسے جیسے ملک فتح ہوتے گئے یہ نظام پھیلتا اور مستحکم ہوتا گیا۔ جنگ کی تیاری کے سلسلے میں تمام معلومات حاصل کر لی گئیں کہ عین وقت پر سوچنے کی ضرورت نہ ہو۔ نہ جنگ کا کام رکے نہ آدمی بھوکوں مریں۔

ناروے، ڈنمارک، ہالینڈ اور بلجیم کو فتح کرنے میں ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ برطانیہ کے لئے محاصرے کا کام زیادہ سے زیادہ مشکل کر دیا جائے، اور اگر امریکہ غیر جانب دار رہے تو وہاں سے سامان لانے کا راستہ کھلا رہے۔ اگر امریکہ کی تمام ریاستیں جرمنی کے خلاف ہو جائیں تب بھی شمال مغربی یورپ کے پورے ساحل پر ہوائی مرکز بنا کر برطانوی بیڑے کو شمال مغربی یورپ کی بندرگاہوں سے دور رہنے پر مجبور کیا جا سکتا تھا اور اس کی بھی کوشش کی جا سکتی تھی کہ خود برطانیہ کو گھیر لیا جائے۔ جرمنی کو امید تھی کہ اس مرتبہ فرانس کو جلد شکست دی جا سکے گی، اور یہ بھی سوچا گیا تھا کہ یورپ کے شمال مغربی ساحل کی مورچہ بندی کر کے مغربی یورپ میں دوسرے محاذ کا نئے سرے سے قائم کرنا ناممکن کر دیا جائے گا۔

دو طرفہ جنگ

پچھلی جنگ عظیم کے تلخ تجربوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ جرمنی کو ایک ہی وقت میں روس اور فرانس میں یعنی دو محاذوں پر لڑنا پڑا۔ اس مرتبہ ہر ہٹلر نے جرمن سپہ سالاروں سے وعدہ کیا کہ وہ ایسا کچھ کریں گے کہ دو محاذوں پر جنگ نہ ہو۔ دنیا ہر ہٹلر کے اس طرح قائل [illegible]

ہے کہ وہ جسے چاہیں جرمنی سے لڑنے کی اجازت دیں اور جسے چاہیں جنگ ملتوی رکھنے پر مجبور کریں
پر قوجیں ہے سالار بھی جانتے ہوں گے۔ اگر ہرشلر نے ایسا کوئی دعوی کیا تو ان کا مطلب یہ
ہوگا کہ جرمن فوج کو ایک وقت میں روس، برطانیہ اور فرانس کے خلاف پوری طاقت کے ساتھ
نہ لڑنا ہوگا۔ ایسا ہو جاتا تو جرمنی کی ساری تیاری کچھ کام نہ آتی، اور وہ بہت جلد تھک کر ہار جاتا
اس لئے جرمن سیاست برسوں تک اس کوشش میں لگی رہی کہ یا تو برطانیہ اور فرانس کو دھوکے
میں ڈال کر اتنے عرصے تک جنگ موقوف کرنے پر آمادہ کرے کہ روس کو بے ضرر کیا جا سکے یا پھر روس
کو غیر جانب دار رکھ کر پہلے فرانس کو زیر کر لیا جائے۔ ہرشلر نے شروع میں جو دعوی کیا کہ جرمنی یورپی
تہذیب کا علم بردار ہے اور یورپ کو کمیونزم کے سیلاب سے بچانے ہوئے ہے اس کا خاص اثر ہوا
اور اس کی بدولت جرمنی ان تمام پابندیوں کو دور کر سکا جو صلح نامہ ورسائی میں اس کی فوجی، بحری
اور ہوائی قوت پر لگائی گئی تھیں۔ لیکن جب جرمنی نے آسٹریا اور چکوسلوواکیہ کو ہضم کر لیا اور برطانیہ
اور فرانس کو یقین ہو گیا کہ وہ پورے یورپ پر حکومت کرنے کی فکر میں ہے تو وہ بھی مقابلے پر آگئے
اور جرمنی کو مجبوراً دوسری چال چلنا پڑی۔ اس نے روس سے معاہدہ کر لیا (۲۳ اگست [illegible])
روسی جانتے تھے کہ جرمنی کے کیا ارادے ہیں، یہ بھی جانتے تھے کہ فرانس سے نمٹنے کے بعد وہ ان سے لڑے
گا لیکن انھیں برطانیہ اور فرانس کی سیاسی چالوں سے اندازہ ہو گیا کہ یہ آپس میں فی الحال کوئی معاملہ
نہ کریں گے، جنگ کی بلا ٹالنے کی جو ایک تدبیر ہے اس پر عمل نہ کیا جائے گا۔ پھر بھی اگر انھیں جرمنی
کی طاقت اور فرانس کی کمزوری کا صحیح اندازہ ہوتا تو وہ غالباً جرمنی سے معاہدہ کر کے اسے فرانس
پر حملہ کرنے کی دعوت نہ دیتے۔ وہ سمجھتے تھے کہ فرانسیسی جم کر لڑیں گے، لڑائی دو تین سال چلے
گی، اس عرصے میں وہ جنگ کی ایسی تیاری کر لیں گے کہ جرمنی فرانس سے جیت گیا تب بھی اس کا
مقابلہ کرنے کی جرأت نہ کر سکے گا۔ اگر جرمنی ہار گیا تو اور بھی اچھا ہوگا، کیونکہ پھر روس ہی
طاقت کی وجہ سے مشرقی یورپ پر بالکل حاوی ہو جائے گا، اور برطانیہ اور فرانس کی اس سے
[illegible]

چاہتے تھے۔ روس سے معاہدہ ہو گیا تو انھوں نے سمجھا کہ پہلے فرانس سے لڑنا چاہیے اور اس
کے بعد روس سے اور انھیں فرانس کو شکست دے کر اس محاذ سے فارغ ہو جانا چاہیے قبل
اس کے کہ روس جنگ کے لئے تیار ہو سکے۔

آدمیوں کی کمی

جرمن سپہ سالاروں کو یقین ہو نا کہ دو محاذوں پر جنگ نہ ہو گی تب بھی یہ ظاہر تھا کہ برطانیہ
جنگ کو ایک عرصے تک جاری رکھے گا، یہ بھی معلوم تھا کہ متحدہ ریاستیں کبھی نہ کبھی اپنے تمام وسائل کے
ساتھ برطانیہ کی مدد کو پہنچ جائیں گی۔ اس لئے اس خطرے کی پیش بندی بھی ضروری تھی کہ جرمنی میں
آدمیوں کی کمی ہو جائے، دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے میدان میں سپاہی کافی نہ رہیں، ان کارخانوں کے
لئے مزدور نہ ملیں جو جنگ کا سامان تیار کرتے ہوں، زمین کی کاشت کرنے کو کسان نہ ہوں۔ نازی
حکومت نے جنگ کی تیاری کو ایک قومی منصوبہ مان کر سارے ملک اور الگ بستیوں کی آبادی
کی پیشے اور صلاحیت کے اعتبار سے مکمل فہرستیں تیار کرائیں جن سے یہ معلوم ہو سکتا تھا کہ مختلف
کام جاننے والوں کی تعداد کتنی ہے اور یہ کہاں کہاں رہتے ہیں۔ ان سب کی خدمات حاصل کرنا ریاست
نے اپنے اختیار میں سمجھ لیا اور اس اختیار سے فائدہ اٹھانے لگی۔ اس طرح سے اپنے تمام وسائل کا
علم رہا، فوج میں وہ بہترین آدمیوں کو بھرتی کر سکی اور دوسری طرف ان تمام لوگوں کو جو فوجی خدمت
کے لائق نہ تھے صنعت، زراعت یا انتظامی کاروباری اور دفتری کاموں کے لئے مقرر کر سکی۔ جو
ہنر سیکھے، مزدور فوج میں شامل کئے گئے تو اس کا لحاظ رکھا گیا کہ اگر کارخانوں میں کمی ہو جائے تو یہ
فوج سے منتقل کر کے اپنے کاموں پر مناسب مدت کے لئے بھیجے جا سکیں۔ یہ بھی سوچ لیا گیا تھا کہ
قیدیوں سے ان کی استعداد کے مطابق کام لیا جائے گا اور جو ملک فتح ہوں گے ان کے کارخانوں میں
بھی جنگ کا سامان تیار کرایا جائے گا۔ آسٹریا اور چیکوسلوواکیہ کی آبادی اور پیداوار کے ذخیرے پہلے
ہی سے جرمنی کے قابو میں آ گئے تھے، جنگ شروع ہوئی تو قیدی اور پھر ان تمام ملکوں کی آبادی
جن پر جرمنی کا قبضہ ہوا صنعت اور زراعت کے کاموں میں لگا دی گئی۔

سپاہیوں کی کمی پڑ جانے کا اندیشہ بھی رہا، اس سے بچنے کی جو تدبیریں کی گئیں ان کا جرمنی کے لئے طریق جنگ سے گہرا تعلق ہے، اور اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے پچھلی جنگ عظیم کے بعد ہی جرمن سپہ سالار اس سوچ میں پڑ گئے کہ فرانس میں انھیں ناکامیابی کیوں ہوئی اور ان کی سر مغزی کا نتیجہ لشکر کشی کا وہ پروگرام تھا جس پر ۱۹۴۰ء میں عمل کیا گیا۔ روس میں بھی جرمن فوجوں کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا تھا، اور جرمن سپہ سالاروں کے لئے ایک مستقل مسئلہ یہ بھی تھا کہ روس میں جنگ کس طریقے پر کرنا چاہیے۔ صنعتی ترقی نے نئے آلات اور آمد و رفت کے نئے ذریعے فراہم کئے تھے۔ اس لئے یہ معلوم کرنا تھا کہ ان کے استعمال کرنے کے سب سے مؤثر طریقے کیا ہوں گے۔ صنعتی تنظیم نے سہولت اور تیزی سے کام کرنے کے بہت سے طریقے نکالے تھے اور کوئی وجہ نہ تھی کہ ان کو فوج کے انتظامات میں بھی نہ برتا جاتا۔ یہ جرمن سپہ سالاروں کی بیدار مغزی کی دلیل ہے کہ انھوں نے موجودہ علم اور عمل کے ہر شعبے سے جو سبق سیکھا جا سکتا تھا اُسے سیکھا، اور کسی جدت کو اس بنا پر نظر انداز نہیں کیا کہ وہ ایک جدت تھی اور حقیقی جنگ کے میدان میں اس کا تجربہ نہیں کیا جا چکا تھا۔ انھوں نے ہوائی جہاز، ٹینک، مسلح موٹر اور مشین گن کو آلاتِ جنگ میں مرکزی حیثیت دی، موٹر کی رفتار کو فوج کی نقل و حرکت کے لئے معیار مانا اور کارخانے کے انتظام کا نمونہ۔ موجودہ زمانے میں صرف یہ نہیں کہ تعلیم عام ہے بلکہ لوگوں کی معلومات اور کام کرنے کی صلاحیت بہت بڑھ گئی ہے، اس لئے یہ بات عقل کے خلاف معلوم ہوتی ہے کہ جنگ میں سپاہی کو احکامات کا پابند کیا جائے اور اس کے علم اور سوجھ بوجھ سے فائدہ نہ اُٹھایا جائے۔ جرمن سپہ سالاروں نے نئے طریق جنگ میں اس کی کوشش کی کہ سپاہیوں اور خصوصاً چھوٹے افسروں کو زیادہ سے زیادہ آزاد اور خودمختار کردیں، اور ان کے کام کو ان کا ذاتی منصوبہ بنا کر اسے کامیابی کے ساتھ انجام دینے کی ذمے داری ان پر ڈال دیں۔ پہلے یہ آزادی دینا خطرے سے خالی نہیں تھا، لیکن اب ریڈیو کے ذریعے ہر قسم کی اطلاعات اور ہدایتیں دی جا سکتی ہیں اور فوج کا ہر افسر جب چاہے سپہ سالار تک براہ راست خبریں پہنچا سکتا ہے اور احکامات حاصل کر سکتا ہے، اس لئے سپاہیوں اور

چھوٹے افسروں کو آزادی دینا ممکن ہی نہیں بلکہ مناسب بھی ہے۔ اس معاملے کا دوسرا پہلو انتظامی ہے نئے طریق جنگ میں اکثر ٹینکوں کے سپرد یہ کام کیا گیا کہ وہ دشمن کے محاذ کو توڑ کر اس پار نکل جائیں اور جس طرح ہوسکے دشمن کے انتظامات کو درہم برہم کرتے رہیں۔ لیکن ان ٹینکوں کو پٹرول اور گولہ بارود کہاں سے ملتا، اس کے چلانے والے کھاتے کیا؟ اسی طرح وہ سپاہی جو موٹروں پر دشمن کا پیچھا کرتے یا جلد سے جلد کہیں پر محاذ قائم کرنے کو بھیجے جاتے یا دشمن کی توجہ کو اس کے اصل مقصد سے ہٹانے یا اس کی پیش قدمی کو روکنے کے لئے الگ کر دئے جاتے وہ اپنا کام نہ کرسکتے اگر انھیں جنگ کا اور کھانے پینے کا سامان نہ ملتا رہتا۔ یہ مسائل بھی نئے طریقے پر حل کئے گئے۔ ضروریات فراہم کرنے کی پوری ذمہ داری فوج کے انتظامی محکمے نے لے لی اور سپاہی کو لڑنے کے سوا ہر فکر سے آزاد کر دیا گیا۔

جنگ کے نئے طریقے

برابر کے مقابلے میں برابر کا نقصان ہوتا ہے اس لئے لڑائی میں جو فریق نقصان سے بچنا اور جلد کامیابی حاصل کرنا چاہتا ہو تو اس کی طاقت اتنی ہونا چاہیے کہ دشمن پورا مقابلہ نہ کرسکے اور جلد ہمت ہار جائے۔ یہی بلٹزکریگ[۵۱] کا اصول ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اسی موقع پر برتا جاسکتا ہے۔ جب دشمن کم زور ہو یا تیار نہ ہو۔ پولینڈ کم زور تھا اس لئے اُسے بلٹزکریگ کے ذریعے پچھاڑا گیا۔ فرانسیسی نئے جنگ کے آلات نہیں بنا سکتے تھے اور اس سے بھی واقف نہ تھے کہ ان آلات سے کس طرح کام لیا جاسکتا ہے، فرانس میں بھی بلٹزکریگ بہت کارآمد ہوئی۔ لیکن جنگ کا یہی ایک نیا طریقہ نہیں ہے، اگرچہ شہرت سب سے زیادہ اسی کو ہوئی ہے۔ جہاں بلٹزکریگ ممکن نہیں تھی وہاں دیکھا گیا ہے کہ جرمن فوجیں دشمن کی ٹکر نہیں لیتی ہیں، بلکہ ادھر ادھر پھیل کر دشمن کے بازو مارتے اور اسے گھیرنے کی کوشش کرتی ہیں یہ چال کامیاب ہو تو اس میں بھی آدمیوں کی بہت بچت ہوتی ہے، کیونکہ دشمن کو بغیر لڑے ہوئے پیچھے ہٹنے یا اگر وہ گھر جائے تو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے جنگ کے اس

---

۵۱ بلٹز کے معنی ہیں بجلی اور کریک کے معنی جنگ۔ یعنی بلٹزکریگ سے مراد جنگ کا وہ طریقہ ہے جس میں دشمن سمجھے کہ اس پر بجلی گری ہے یا آسمان پھٹ پڑا ہے۔

طریقے میں پہلے ہوائی جہاز دشمن کے محاذ پر شدید بمباری کرتے ہیں، پھر ٹینک انھیں ہوائی جہازوں کی حفاظت میں آگے بڑھتے ہیں اور محاذ کو ٹٹول کر معلوم کرتے ہیں کہ وہ کہاں پر کم زور ہے، جہاں انھیں موقع ملتا ہے وہ بڑی تعداد میں اس کے اندر گھس جاتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ اس کے پیچھے پہنچ جائیں۔ ٹینکوں اور ہوائی جہازوں کی تکمیل پیادہ فوج کرتی ہے، جو کہنے کو تو پیادہ ہوتی ہے مگر چلتی ہے موٹروں پر، اور جیسے جیسے ٹینک دشمن کے محاذ کو توڑتے یا اس کو پیچھے ہٹاتے ہیں یہ اپنا محاذ قائم کرتی جاتی ہے۔ جنگ کے اس نئے طریقے کی جان ہوائی جہاز، ٹینک اور پیادہ فوج کے درمیان کام کی تقسیم اور ان کا اتحادِ عمل ہے۔ اگر یہ طریقہ کامیاب ہو تو دشمن کو جم کر لڑنا نصیب نہیں ہوتا۔ جنگ کا فیصلہ جلد ہو جاتا ہے اور جانیں بہت کم ضائع ہوتی ہیں۔

پچھلی جنگ عظیم میں محاذ کے معنی خندق، توپ خانے اور مورچے تھے، لیکن اب ٹینکوں اور ہوائی جہازوں کے سبب سے خندق کھود کر بیٹھنا بالکل بے فائدہ ہو گیا ہے اور توپ خانہ بھی اسی حالت میں کارآمد ہو سکتا ہے جب وہ ہوائی جہاز اور ٹینک کے پہلو بہ پہلو چل سکے۔ جرمن فوج نے محاذ قائم کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا ہے اس میں زیادہ بھروسہ سپاہیوں کی مہارت اور آلات کے انتخاب پر کیا گیا ہے۔ اور پرانی رائفلوں اور سنگینوں کے بجائے اب سپاہیوں کو ٹومی گن، مشین گن اور ٹینک توڑ توپیں دی جاتی ہیں۔ ٹومی گن ایک طرح کی مشین گن ہے جو بہت ہلکی ہوتی ہے اور جسے ایک مرتبہ بھرنے کے بعد کئی فیر کئے جا سکتے ہیں۔ تجربے سے یہ معلوم کیا گیا ہے کہ سپاہیوں کو کافی مشق کرا دی جائے تو مشین گنوں اور ٹینک توڑ توپوں کے بل پر خاص مضبوط محاذ قائم کیا جا سکتا ہے اور اس میں یہ آسانی بھی ہوتی کہ اسے قائم کرنے یا ہٹانے میں دیر نہیں لگتی۔ دشمن کو روکنے کے لئے پہلے خاردار تار لگائے جاتے تھے، اب گولے زمین میں دفن کر دئے جاتے ہیں، اور ان کا پتہ چلانے اور ہٹانے میں اس سے کہیں زیادہ وقت صرف ہوتا ہے جتنا کہ خاردار تاروں کو کاٹنے میں لگتا تھا۔ جرمن فوج نے نئے طریقے کچھ اس لئے اختیار کئے ہیں کہ وہ ٹینک اور ہوائی جہاز جیسے تیز رفتار آلات جنگ سے خاص مناسبت رکھتے ہیں اور کچھ اس لئے کہ انھیں برتنے میں زیادہ آدمیوں کی ضرورت نہیں ہوتی

کیونکہ آلات کے سہارے سے اب ایک تجربہ کار سپاہی وہ سب کچھ کرسکتا ہے جو پہلے پانچ آدمیوں سے بھی نہ کیا جاتا۔

متحدہ ریاستوں کی شرکت

جرمنی کی آبادی اتنی ہے اور اس کی صنعت ایسی ترقی یافتہ کہ اگر جنگ یورپی قوموں تک محدود رہے تو طاقت کا توازن قائم رہ سکتا ہی، لیکن پچھلی جنگ میں متحدہ ریاستوں نے برطانیہ اور فرانس سے مل کر ان کا پلہ بھاری کردیا تھا۔ اس جنگ میں بھی جرمن سمجھتے ہوں گے کہ متحدہ ریاستیں برطانیہ کا ساتھ دیں گی، اس لئے اُنھوں نے جاپان سے تعلقات بڑھائے۔ چونکہ جاپانی اپنی طرف جنگ کی تیاری کررہے تھے اور انھیں معلوم تھا کہ ان کو متحدہ ریاستوں اور برطانیہ سے مقابلہ کرنا ہوگا، جرمنی اور جاپان کے اتحاد سے جنگ کے عالمگیر ہونے کا سامان ہوگیا۔ قومیں ایک دوسرے پر احسان نہیں کرتی ہیں، جرمنی جاپان سے یہ توقع نہیں کرسکتا تھا کہ وہ اس کے کام کو آسان کرنے کے لئے برطانیہ یا متحدہ ریاستوں کے خلاف جنگ کرے گا۔ لیکن اس کا امکان پیدا ہوگیا تھا کہ جاپان کی ان دونوں سے لڑائی ہو، اور برطانیہ اور متحدہ ریاستوں کی طاقت مغربی اور مشرقی دنیا کے محاذوں پر اس طرح تقسیم ہوجائے کہ وہ یورپ کے کسی محاذ پر جرمنی سے بہت زیادہ آدمی اور سامان جمع نہ کرسکیں۔ اٹلی سے جرمنی کا سیاسی اتحاد پہلے سے تھا، اور چونکہ مسولینی کو معلوم تھا کہ برطانیہ اور فرانس اٹلی کو کچھ دینے پر راضی نہیں ہیں اور بحر روم پر حکومت کرنے کا حوصلہ ان سے لڑکر ہی پورا کیا جاسکے گا، اس لئے جرمنی کو یقین تھا کہ اٹلی جب کبھی جنگ میں شریک ہوا وہ اس کا ہی ساتھ دے گا۔ جنوب مشرقی یورپ کی ریاستیں اپنے غلّہ اور خام مال کو جرمنی کے سوا کسی کے ہاتھ بیچ نہیں سکتی تھیں، اور یہ بھی ظاہر تھا کہ جنگ شروع ہوتے ہی وہ جرمنی کی اور بھی دست نگر ہوجائیں گی۔ ان کی باہمی عداوتیں ایسی تھیں جس سے فائدہ اُٹھانا نہایت آسان تھا، جرمنی نے چکوسلواکیا پر قبضہ کرتے وقت ہنگری کو اس کی اجازت دیدی تھی کہ وہ سلواکیہ کے اس جنوبی حصّہ کو حاصل کرے جس کی آبادی ہنگری والوں کی طرح ماگیار نسل کی ہے اور جو پچھلی جنگ عظیم کے بعد قومیت کے اصول کے خلاف چکوسلواکیہ کی نئی ریاست میں شامل کردیا گیا تھا۔ ہنگری کا مشرقی حصّہ ٹرینسلوینیا

اسی طرح رومانیہ کو دیدیا گیا تھا، اور ہنگری کو اسے دوبارہ حاصل کرنے کی اتنی شدید خواہش تھی کہ وہ ہر اُس ریاست سے مل جانے پر تیار تھا جو اُسے واپس دلانے کا وعدہ کرتی۔ ہم ابھی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ جرمنی نے ہنگری سے ایسا کوئی وعدہ کیا تھا یا نہیں، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ برطانیہ اور فرانس ہنگری کے ٹکڑے کاٹ کر چکوسلوواکیہ اور رومانیہ کو دینے کے ذمے دار تھے اور اُن سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ اب رومانیہ پر ایسی ہی جراحی کی مشق کریں گے۔ جرمنی البتہ صلح نامہ ورسائی کے بنائے ہوئے نقشے کو بگاڑنے اور یورپ کی نئی تنظیم کرنے کا ارادہ ظاہر کر رہا تھا، اور اس ارادے کی بدولت ہنگری کو اس کا ایک حصہ جو چھین کر چکوسلواکیہ کو دیدیا گیا تھا واپس مل گیا تھا۔ اس لئے ہنگری جرمنی کی طرف مائل تھا۔ بلغاریہ بھی کوئی ایسی نئی تنظیم چاہتا تھا جس میں اس کو شمال اور جنوب کے وہ علاقے جو زبردستی اُس سے لے کر رومانیہ اور یونان کو دیدئے گئے تھے پھر مل جائیں۔ رومانیہ، یونان اور یوگوسلاویہ نئی تنظیم کے خلاف تھے، اور انھیں چاہیے تھا کہ برطانیہ اور فرانس سے اپنا اتحاد قائم رکھیں۔ برطانیہ نے ان کو سلامت رکھنے کی ذمے داری بھی اپنے اوپر لے لی۔ لیکن ان تینوں ملکوں میں صرف یونان ایسا تھا جس کی برطانیہ اور فرانس فوجی امداد کر سکتے تھے اس لئے رومانیہ اور یوگوسلاویہ طے نہ کر سکے کہ وہ برطانیہ اور فرانس کے وعدے پر بھروسا کریں یا نہ کریں۔ بہر حال وہ اپنے بل پر جرمنی کی مخالفت نہیں کر سکتے تھے، اور اگر جرمنی مغربی محاذ پر جلد کامیاب ہوجاتا تو وہ بہت آسانی سے جنوب مشرقی یورپ کی ایسی نئی تنظیم کر سکتا تھا کہ یہاں کے سارے ملک اس کے قابو میں آجائیں۔ اس کے لئے ضروری صرف یہ تھا کہ جنگ کا ہر منصوبہ اس وقت اٹھایا جائے جو اس کے لئے مقرر کیا گیا ہو اور اس کی تکمیل مقررہ وقت کے اندر ہو جائے۔

برطانیہ اور فرانس کی تیاری

برطانیہ اور فرانس جنگ سے حتی الامکان بچنا چاہتے تھے، لیکن اٹلی اور جرمنی کا انداز کچھ ایسا تھا کہ انھیں بھی مجبور ہو کر جنگ کی تیاری کے لیے اپنے بجٹ میں اضافہ کرنا پڑا۔ سنہ ۱۹۳۹ء کے شروع میں برطانیہ اور فرانس کے سپہ سالاروں کی گفتگوئیں بھی ہوئیں، اور جیسے جیسے جنگ کا خطرہ

قریب آ گیا یہ گفتگوئیں اس موضوع کے قریب تر ہوتی گئیں کہ جرمنی کے حملے کا مقابلہ کس صورت سے کیا جائے گا۔ بلجیم اور ہالینڈ کے نمائندے ان گفتگوؤں میں شریک ہوتے تو اس پر بھی غور کیا جا سکتا تھا کہ پیش قدمی کی سب سے کامیاب تدبیر کیا ہوگی، لیکن چونکہ یہ دونوں مل کر غیر جانب دار رہنے پر مُصر تھے، برطانوی فرانسیسی سپہ سالار صرف مختلف امکانی صورتوں پر غور کر کے جنگ کے نقشے تیار کر سکتے تھے۔ ان کے ذہن پر پچھلی جنگ عظیم کے حالات حاوی تھے۔ سب سمجھتے تھے کہ جنگ اسی محاذ پر اور اسی طریقے سے ہوگی جیسے کہ پچھلی مرتبہ۔ جنگ کے نقشے اُسی مفروضے پر بنے تھے۔ مگر یہ مفروضہ غلط ثابت ہوا، اس لیے جنگ کے متعلق جو مشورے ہوئے تھے وہ بھی بے کار رہے۔ فرانسیسی اور برطانوی فوج اور محکمۂ جنگ کے تمام ممتاز آدمی وہ تھے جنھوں نے پچھلی جنگ عظیم میں تجربہ اور ترقی حاصل کی تھی، یہ اُن نئے طریقوں کو جن کا چند کتابوں اور ایک دو چھوٹے پیمانے کی لڑائیوں کی بدولت چرچا ہوا تھا شاہدے اور آزمائش کے قابل کیسے مان سکتے تھے۔ ان میں سے اکثر کی عمر ایسی تھی کہ اُنھیں نئی معلومات حاصل ہوتیں تب بھی وہ فوج کی نئی تنظیم کرنے سے گریز کرتے۔ پھر ان لوگوں کو اطمینان بھی غضب کا تھا۔ انھوں نے اسے کافی سمجھ لیا کہ فرانسیسی جرمن سرحد پر ماژی نو لائن کے مورچے بن گئے ہیں، لڑائی شروع ہونے سے پہلے پرانے اتحادیوں میں اشتراکِ عمل کے بارے میں مشورے ہو گئے ہیں اور یہ بھی طے ہو گیا ہے اتحادی فوج کا سپہ سالار ایک ہوگا، دو نہ ہوں گے۔

حقیقت میں یہ سب بہلاوے تھے۔ جنگ کی تیاری کی ہی نہیں جا سکتی جب تک کہ جنگ کا طریقہ پیش نظر نہ ہو اور یہ طے نہ کر لیا گیا ہو کہ کن آلات سے کام لیا جائے گا اور جن سپاہیوں کو یہ آلات دیے جائیں گے ان کو انھیں استعمال کرنے کی مشق کس طرح کرائی جائے گی۔ جرمنوں نے ہوائی جہاز ٹینک اور پیادہ فوج کے اشتراکِ عمل کا ایک مؤثر طریقہ سوچ لیا تھا، اور اس اشتراکِ عمل میں بدیہت اور لوچ پیدا کرنے کے لیے لازمی کر دیا گیا تھا کہ تمام فوجی افسر جہازرانی اور بحری جنگ کے اصول، ہوائی جہاز اور ٹینک چلانا اور توپ خانے کا کام سیکھ لیں اور جن مشینوں سے انھیں سابقہ ہو اُن سے اچھی طرح واقف ہوں گویا جرمن فوج کا ہر افسر اور بیڑے کے ہر شعبے کی حیثیت اور مصرف سے واقف تھا

اور جانتا تھا کہ مقصد حاصل کرنے کے لئے وہ ایک دوسرے کی کمی کس طرح پوری کر سکتے تھے۔ اس کے برخلاف برطانیہ اور فرانس میں فوج اور بیڑے کے افسر ایک دوسرے سے الگ اور بے تعلق تھے، اور بجائے اس کے کہ جنگ کو ایک مشترک منصوبہ قرار دے کر دونوں ایک دوسرے کی مدد کرتے، ان کے درمیان ایک رقابت تھی جسے قائم رکھنا وہ اپنا فرض تصور کرتے تھے۔ ہوائی قوت کی ضرورت سے فوج اور بیڑے کے اعلیٰ افسر ناواقف تھے۔ اس لئے اس کے انتظام کو وہ اپنے ذمے لینا نہیں چاہتے تھے۔ یہ اہم شعبہ بڑی حد تک لاوارث رہا اور اس کی قدر اسی وقت ہوئی جب جرمن ہوائی جہازوں نے میدان پر میدان جیت کر دکھایا۔ برطانیہ میں بیڑے کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے، وہ برطانیہ کا محافظ، اس کی عظمت کا نمونہ، اور اس کی سیاست کا سب سے نمایاں آلۂ کار مانا جاتا ہے۔ اس کا ایک الگ محکمہ ہے جسے اپنی خودمختاری پر ناز ہے اور وہ فوج کے ساتھ اتحادِ عمل کو ایک رعایت سمجھتا ہے۔ برطانیہ نے جنگ کی تیاری کا ارادہ کیا اور حکومت نے بجٹ میں اس کے لئے رقم منظور کرائی تو بحری محکمہ اس کے سب سے بڑے حصے کا دعویدار ہوا۔ فوج کے محکمے نے جنگ کے نئے طریقوں پر غور نہیں کیا تھا اور یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ روپیہ ملے گا تو کن آلات پر کس نسبت سے صرف کیا جائے گا، ہوائی جہاز بنانے کی صنعت نے بہت ترقی کر لی تھی، لیکن سپہ سالاروں اور ماہروں میں اس مسئلے پر بہت اختلاف تھا کہ جنگ میں ہوائی جہازوں کا صحیح منصب کیا ہے۔ اس تذبذب کا نتیجہ یہ ہوا کہ بحری محکمے کے بیشتر مطالبے پورے کئے گئے، فوج کو بھی کچھ مل گیا اور ہوائی قوت بڑھانے کی بہت کم کوشش کی گئی۔ ہوائی حملے کا خوف سب کو تھا، جنگ کے مسائل پر غور کرنے والوں نے ان سے بچنے کی بھی کچھ تدبیریں سوچیں، لیکن بیڑے کے افسرانِ اعلیٰ اس خطرے کو خاطر ہی میں نہ لائے۔ جنگ شروع ہونے کے بعد جب ہوائی جہازوں کی کارکردگی کے عملی ثبوت فراہم ہوگئے تب بحری محکمے نے اپنی غلطی محسوس کی۔ مگر اپنی خودمختاری میں اس نے فرق نہیں آنے دیا۔ بحری محکمے کا ہوائی بیڑا اب تک بالکل الگ ہے اور بحری محکمے کے ماتحت ہی کام کرتا ہے۔ فوج کا بھی اپنا ہوائی بیڑا ہے۔ ان دونوں کے علاوہ ہوائی قوت کا ایک الگ محکمہ ہے۔ اور ابھی یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ ان تینوں میں کام کس طرح تقسیم کیا جائے۔

فرانسیسیوں نے بھی انگریزوں کے ساتھ جنگ کی تیاری شروع کی۔ ان کے یہاں سب سے بڑی خرابی ناواقفیت اور غفلت تھی۔ سپہ سالار فن جنگ کی جدتوں سے بے خبر تھے بلکہ اپنی فوج کی اصل حالت کا انھیں پتہ نہ تھا۔ سپاہیوں کی تعداد انھیں کم وبیش معلوم تھی۔ لیکن یہ انھیں معلوم نہیں تھا کہ ان کے پاس سامان کافی ہے یا نہیں۔ جنگ کی تیاری کے لئے جو روپیہ فرانسیسی پارلیمنٹ نے منظور کیا اس میں سے بہت کچھ بیچ میں غائب ہوگیا اور سامان پر بہت کم صرف کیا گیا۔ سپہ سالاروں کی غفلت کا یہ عالم تھا کہ فوج کے اعلیٰ افسروں میں کوئی ایسا واقف کار نہ تھا جو بتا سکتا کہ کتنے ہوائی جہاز، کتنے ٹینک، کتنی اور قسم کی توپیں درکار ہوں گی اور اس وجہ سے ضروری سامان مہیا بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ فرانس کی زندگی میں کئی برس سے بہت انتشار تھا اور خودداری کا وہ جذبہ جو خطرے کے وقت قوموں کو متحد اور عام مقاصد حاصل کرنے پر آمادہ کرتا ہے اس قدر کمیاب تھا کہ شکست کے بعد بھی نمایاں نہ ہو سکا۔ مزدور سرمایہ داروں سے، سرمایہ دار سیاسی رہنماؤں سے، سیاسی رہنما فرقہ بندیوں سے بیزار تھے، فوج میں کوئی جوش، کوئی ولولہ نہ تھا۔ عام لوگوں کو اُمید تھی کہ مورچوں کا وہ سلسلہ جو ماژی نولائن کہلاتا تھا جرمن فوجوں کو روکنے کے لئے کافی ہوگا، یہ بات ان پر ظاہر نہیں کی گئی کہ ماژی نولائن صرف فرانسیسی جرمن سرحد پر بنی ہے، اور اگر جرمنی نے پچھلی مرتبہ کی طرح اس بار بھی بلجیم کی طرف سے حملہ کیا تو ماژی نولائن کچھ کام نہ آئے گی سپہ سالاروں کو تو یہ بہت موٹی سی بات معلوم ہی ہوگی، لیکن انھوں نے کوئی تدبیر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ یہ اُن کی غفلت اور بے پروائی کا ایک اور ثبوت ہے۔ غالباً اگر جنگ بالکل پرانے طریقے پر ہوتی تب بھی اُنھیں اس غفلت شعاری کی سزا بھگتنا پڑتی۔

پچھلی جنگ عظیم میں برطانیہ اور فرانس دونوں نے اس سبب سے بہت نقصان اُٹھایا کہ تین سال تک ان دونوں کی فوجیں اپنے سپہ سالاروں کے ماتحت الگ الگ لڑیں، فرانس اور برطانیہ کہلاتے تھے اتحادی مگر ان دونوں میں اتحاد عمل بہت کم تھا۔ اس مرتبہ بظاہر یہ دشواری دور کردی گئی۔ لیکن یہ دوسری شکل میں بدستور موجود رہی۔ اتحادیوں کا ایک سپہ سالار مقرر ہونے کے معنی یہ نہیں تھے کہ جو برطانوی فوج فرانس بھیجی جائے گی وہ بالکل فرانسیسیوں کے حوالے کردی جائے گی اور برطانیہ

کے مطابق بدل جائے، اور جنگ کے کاموں کو اور تمام کاموں پر فضیلت دی جائے۔ برطانیہ اور فرانس نے [illegible] کے وسط میں جنگ کی تیاری اور اس کے لئے خام مال کی فراہمی کا ایک مشترکہ پروگرام بنایا لیکن تجارتی اور صنعتی نظام میں تبدیلیاں کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا، اور برطانیہ میں وہ اختیارات جو معاشی زندگی کو جنگ کی ضروریات کے مطابق بدلنے کے لئے حکومت کو حاصل ہونا چاہئیں وہ شروع مئی [illegible] میں دئے گئے۔ حکومت ان اختیارات کا پہلے مطالبہ کرتی تو بھی یہ اسے مل جاتے لیکن اسے مطلق اندازہ نہیں تھا کہ جنگ کی صورت اور اس کا پیمانہ کیا ہوگا۔ اس کے علاوہ یہ خیال بھی تھا کہ کھانے پینے کے سامان اور صنعتی خام مال کی برطانیہ اور فرانس میں افراط ہے، اور جرمنی کے پاس یہ سب اس قدر کم ہے کہ وہ جنگ کو جلد ختم کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ یہ غلط فہمی نتیجے کے اعتبار سے اس مغالطے سے کچھ کم نہ تھی جو ماژی نو لائن نے فرانس میں پیدا کیا تھا۔ پھر برطانیہ اور فرانس یہ بھی سمجھتے تھے کہ ان کے یہاں جس چیز کی کمی ہوئی خواہ وہ خام مال ہو یا جنگ کے آلات، سب متحدہ ریاستوں سے آسانی کے ساتھ اور وقت پر مل جائیں گے۔ اس لحاظ سے تو یہ خیال صحیح تھا کہ متحدہ ریاستوں کے کارخانے بڑے پیمانے کی جنگ کا بار اٹھا سکتے ہیں، لیکن کارخانوں کے مالک اور آلات جنگ بنانے کے ماہر فن جنگ سے واقف نہیں ہوتے، وہ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ ان سے جو کچھ بنانے کو کہا جائے اسے ڈیزائن کے [illegible] کے اندر تیار کر دیں۔ جب خود آلات جنگ کا آرڈر دینے والے ٹھیک ٹھیک نہ جانتے ہوں کہ انہیں کس سامان کی کس مقدار میں ضرورت ہے تو اچھے اچھے کارخانے بھی کیا کر سکتے ہیں۔ برطانیہ اور فرانس میں خام مال کی بھی کمی نازک موقعوں پر محسوس کی گئی۔ جنگ شروع ہونے کے آٹھ نو مہینے بعد جب بڑی تعداد میں ہوائی جہاز بنائے جانے لگے تو برطانوی حکومت کو پتہ چلا کہ ملک میں [illegible] کافی نہیں ہے اس لئے تمام شہریوں سے کہا گیا کہ اپنے المونیم کے برتن حکومت کو دے دیں۔ [illegible] ضرورت پوری ہو گئی۔ لیکن انتظام کی خرابی بہرحال ثابت نہیں ہوتی[1]

پروفیسر محمد مجیب۔ جامعہ ملیہ

---

[1] بقیہ مضمون کتابی صورت میں جلد ہی مکتبہ سے شائع ہوگا۔

جنگ کا نیا طریقہ

ہمارا ملک ایک خاص قسم کے امن کا ایسا خوگر ہو گیا ہے اور اس پر خود اپنے تحفظ کی ذمہ داری اتنی کم ہے کہ اس نے پچھلی جنگ اور موجودہ جنگ جیسے جہاں سوز اور تہذیب کش عالمی حوادث کو بہت کچھ ایک غیر متعلق تماشائی ہی کی حیثیت سے دیکھا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ متقابل گروہوں میں سے کسی سے کچھ ہمدردی کا اظہار کسی سے کچھ ناخوشی یا بیزاری، جب جنگ ختم ہو جائے تو اس کے عواقب و نتائج پر کچھ بعد از وقت [illegible] ہو گیا اسے تقدیر سمجھنا، جو ہونے والا ہے اس سے بے اعتنائی۔ اس بڑے برّاعظم میں گنتی کے لوگ ہوں گے جو سوچتے ہوں کہ اگر ہمارا ملک براہ راست جنگ کی مصیبت میں مبتلا ہو گیا تو کیا کرنا ہوگا، اس کے لیے کس قسم کی تیاری ضروری ہے، کیا ساز و سامان چاہیے، کیسی فوجی تربیت ضروری ہے، کیسی قیادت کی تعلیم دینی چاہیے۔ تحفظ کے لیے مدافعت کی فوجی تیاری کافی ہے یا حملہ آور ہونے کی بھی؟ لیکن اگر اس دنیا میں رہنا ہے اور ایک باعزت اور آزاد انسانی جماعت کی حیثیت سے رہنا ہے، نباتات اور جمادات کی طرح بس وجود کی گھڑیاں کاٹنی نہیں ہیں تو ہمارے مفکروں کو، مدبروں کو، سیاسی رہنماؤں کو، فوجی افسروں کو ان مسائل کے سوچنے سمجھنے میں نیندیں حرام کرنی ہوں گی۔ آج جب کہ امن کے زمانہ میں علمی کام کرنے والوں کی ذہین کی ذہین دن پر دن انکشافات اور ایجادات کے ذریعہ نئی نئی قوتوں پر انسانی دسترس بڑھانے میں لگی رہتی ہیں پھر دوسرے فن کی طرح جنگ کا فن بھی ایک حالت پر ٹھہرا نہیں رہ سکتا۔ بدلتی دنیا میں یہ بھی بدلتا ہے جو اس تبدیلی پر نظر نہیں رکھے گا وہ [illegible] آزادی کی قیمت [illegible]

[illegible]

دراصل ۱۹۱۸ء کی پرانی نسل اور ۱۹۳۹ء کی نئی پود کا معرکہ تھا، وہ پرانی کامیابیوں سے سرمست تھے اور انھیں کے سہارے جی رہے تھے' ان کے مقابلہ میں ایک دوسرا گروہ تھا جس نے پچھلی جنگ کی شکست سے سبق لیا تھا اور اب ان سے بچنے کے لیے نئی راہوں کے نکالنے میں لگے ہوئے تھے۔

یوں تو ہر فوج اور ماہر فن حرب اپنے پیشرووں سے کچھ نہ کچھ سیکھتا ہے لیکن مشہور جرمن جنرل کلاوزے وتس (   ) کے بقول جس کی تصنیف جرمن فوج کا دستور العمل ہے تاریخ جنگ میں اپنے زمانہ سے جس قدر دور ہوتے جائیے تفصیلات میں اتنی ہی کم مدد ملے گی۔ نئے حالات نئی ایجادات کی وجہ سے تفصیلات کو برابر بدلنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ پچھلی جنگ کے بعد سے جرمنوں نے برابر ان تفصیلات کی از سر نو ترتیب میں محنت کی جن میں اپنی شکست کے تجربہ سے تبدیلی ضروری اور مفید نظر آتی تھی اور نئے اس طریقہ جنگ کو مرتب کیا جسے پہلی مرتبہ ان کے مشہور جنرل لوڈن ڈارف نے اپنی کتاب "جنگ کلی" میں بیان کیا تھا۔ اس کتاب کو دراصل کلاوزے وتس کی مذکورہ بالا کتاب کا جدید ایڈیشن سمجھنا چاہیے۔ جرمنوں نے ان دونوں کے نظریات اور تعلیمات کو عملی نظم میں اور بھی مکمل کرنے کی کوشش کی اور اس طریقہ کو جنگ ہی میں نہیں سیاست اور معیشت کے میدانوں میں بھی خاص کامیابی کے ساتھ برتا ہے۔

اس نئے طریقہ کا مرکزی خیال یہ ہے کہ دشمن کے محاذ میں کمزور نقطے تلاش کرو، وہاں رخنہ پیدا کرو اور اس دروازے سے اندر گھسو اور گھس کر ادھر ادھر پھیلو۔ اس طریقہ کو پہلے معیشت اور سیاست میں کام میں لایا گیا ہے اور یوں دشمن کی قومی قوت کو کمزور کرنے کے بعد جنگ میں کہیں بھی کمزوری پائی اور وہاں رخنہ پیدا کر اس جگہ کو آگے بڑھنے کا مرکز بنایا۔ مثلاً سیاست میں دیکھیے۔ جنگ سے بچنے کا معاملہ سب ملکوں کے باہمی اشتراک عمل کا طالب تھا۔ ان میں ایکا ہوتا تو ہٹلر کچھ نہ کر پاتا۔ لیکن اس نے اس محاذ میں کمزوری ڈھونڈ کر متحدہ قوتوں میں پھوٹ ڈالی' اور ہر ایک سے الگ الگ نمٹنے کی کوشش کی۔ [illegible] مبارک کام شروع کیا وہ دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کا عہد تھا، بڑی بڑی صنعتی اور تجارتی [illegible] الاقوامی بھی، دنیا کو آپس میں بانٹ رہی تھیں منڈیاں اور خام اجناس کے [illegible] معاشی جنگ میں ہٹلر نے اس کمزوری سے فائدہ اٹھایا۔ اس کے [illegible]

[illegible] کے [illegible] تھا، اور جنگ پر ان کے اثرات سے یہ نہیں کہ فرانسیسی بالکل ناآشنا تھے [illegible] جنرل
[illegible] کو انھیں اس طرف برابر توجہ دلا ہی رہا تھا لیکن فرانس کا جنرل اسٹاف گزشتہ جنگ کی کامیابی کو،
کہ ان کے لیے وجہ صد افتخار تھی اور اس کامیابی کے اسباب کو کیسے آسانی سے بھول جاتا۔ چنانچہ اس نے
ان نئی خیال آرائیوں کو پنپنے کا موقع نہیں دیا۔ انھوں نے پچھلی جنگ میں دیکھ لیا تھا کہ مدافعت کرنے والے
کی جیت ہوتی ہے، وہی فایدہ میں رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فیر کی قوت میں بڑی غیر معمولی ترقی ہوئی تھی۔ گزشتہ
میں یے نا (JENA) کے معرکہ میں فرانسیسی پلٹن کا ایک پورا بٹالین ایک منٹ میں دو ہزار فیر نشانہ لے کر
کرسکتا تھا تو ۱۹۱۸ء میں یہ کام صرف تین مشین گنیں انجام دینے لگی تھیں۔ چنانچہ مدافعت کرنے والی فوج کو
بڑی تقویت پہنچی تھی۔ اور اسی لیے فرانسیسی جنرل اسٹاف کا عقیدہ تھا کہ پچھلی جنگ کا سب سے قیمتی سبق
یہی ہے کہ جنگ وسیع محاذ پر کی جائے اور مدافعت کی تدبیروں کو مرکزی حیثیت دی جائے۔ اسی عقیدہ نے
مضبوط قلعوں کی وہ لائن بنوائی جو ماجینو لائن (MAGINOT LINE) کے نام سے مشہور ہے۔ فرانسیسی برابر ایک
خط پر قدم جما کر لڑنے کے منصوبے بناتے رہے۔ انھیں پچھلی جنگ کی خندقوں والی لڑائی یاد تھی، بڑے بڑے
محاذوں پر فوجوں کے بڑھنے کی کوششیں یاد تھیں اور انھیں یقین تھا کہ یہی اس مرتبہ بھی ہوگا۔ اسی کو سامنے
رکھ کر انھوں نے اپنی فوج کی تربیت کی تھی۔ اُدھر جرمن جنرل اسٹاف کو یاد تھا کہ ان خندقوں والی جنگ نے
ہی ان کا کام بگاڑا تھا۔ وہ اسے دوبارہ آزمانا نہ چاہتے تھے۔ انھوں نے پھر اپنے امام فن کلاوزے وتس
کی طرف رجوع کیا اور اس کی تعلیم کو پھر اپنایا کہ "حملہ کرنا مدافعت سے بہتر ہے، اس میں مدافعت کرنے والے کو
ناموافق حالات میں لڑنا ہوتا ہے۔ فن جنگ کا کوئی حقیقی استاد اپنے کو حتی الامکان، مدافعت پر مجبور نہیں ہونے
دیتا، اگر کبھی مدافعت کرتا ہے تو صرف وقت گزار لے، سامان جمع کرلے اور حملہ کا موقع نکالنے کے لیے۔" اس
جارحانہ مسلک میں کامیابی کے تین راز ہیں۔ (۱) غیر متوقع تدبیر (۲) رفتار کی تیزی (۳) سامان اور [illegible]
کی طاقت میں تفوق۔

غیر متوقع تدبیر ایک تو چڑھائی کے معاملہ میں ہوسکتی ہے کہ جتنی فوج دشمن سمجھ رہا تھا اس سے بہت زیادہ
فوج سے کسی ایسی جگہ جہاں وہ اس کا منتظر نہ ہو حملہ کر دیا جائے یعنی فوج متوقع تعداد سے زیادہ ہو یا [illegible]

یا متوقع وقت کے علاوہ اور کہیں اور کسی اور وقت پہنچ جائے۔ مثلاً موجودہ جنگ میں مئی ۱۹۴۰ء میں جرمن فوج کا سیدان پر حملہ اسی قسم کا غیر متوقع واقعہ تھا۔ غیر متوقع اسلحہ یا ساماں کے استعمال کی مثالیں پہلی جنگ میں ٹینکوں اور زہریلی گیسوں کے استعمال کی صورت میں سامنے آئی تھیں۔ اس جنگ میں اوپر سے غباروں میں فوجوں کا اتارنا اور نئے قسم کے ٹینک اسی قسم کی غیر متوقع چیزیں ہیں۔

ایسی غیر متوقع تدابیر سے جو فائدہ ہوتا ہے وہ قائم اسی وقت رہ سکتا ہے جب تیز رفتاری کی وجہ سے اسے فیصلہ کن بنایا جا سکے۔ ورنہ تھوڑی دیر ششدر رہ کر دشمن بھی اپنی قوت مجتمع کر لیتا ہے اور یہ ابتدائی کامیابی بے نتیجہ ہو جاتی ہے۔ رفتار کے لیے پہلے سے تمام تفصیلات کا ایک ایک جزو منظم و مرتب کرنا بھی بہت کارآمد ہوتا ہے۔ ہر ممکن صورت کے لیے پہلے سے منصوبے تیار ہوں تو بڑا وقت بچتا ہے۔ جرمن حملہ کا یہ اصول ہے کہ حملہ آور کا یہ اختیار کہ کہاں اور کیسے حملہ کرے برابر باقی رہنا چاہیے تاکہ دشمن کو مدافعت میں زیادہ سے زیادہ پریشانی ہو اور بروقت مناسب تدبیر نہ کر پائے۔

تیسری چیز یعنی ساز و سامان اور فیر کی طاقت میں تفوق کے سلسلے میں جرمنوں کا مسلک یہ ہے کہ ان میں جو فوقیت کافی نہیں فوقیت اتنی ہونی چاہیے کہ دشمن کو مطلق بے بسی کا احساس دلایا جا سکے۔

پہلے دو عناصر یعنی غیر متوقع تدبیر اور رفتار کی تیزی کی وجہ سے جنگ متحرک رہتی ہے اور اس حرکت کو قوت اور توانائی حاصل ہوتی ہے فیر کی طاقت سے۔ پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ پہلی چال ہمیشہ حملہ آور کی ہوتی ہے اور مدافعت کرنے والے کو بہت سی امکانی صورتوں کے لیے تیار رہنا پڑتا ہے۔ وہ ایک جگہ مدافعت کا انتظام کرتا ہے تو حملہ آور اپنے حملہ کا رخ پلٹ سکتا ہے۔

کوئی یہ نہ سمجھے کہ ان ابتدائی باتوں سے اور کوئی واقف نہیں صرف جرمن ہی انھیں جانتے ہیں۔ فرانس اور برطانیہ والے بھی ان سب باتوں کو جانتے تھے۔ بس فرق یہ تھا کہ انھوں نے ان اصولوں کو [illegible] کا زمانہ ہو گیا اور جرمنوں نے ان پر غیر معمولی تندہی [illegible] [illegible]

کریں انہیں واضح تفوق حاصل ہو سکے اور ہر جگہ اور ہر موقع پر ایسا ہی ہو۔ بڑی فوج کو بھی تفوق حاصل ہو ... کی حملہ آور ٹولی کو بھی مقامی تفوق حاصل ہو۔ اس کی وجہ سے وہ غیر متوقع حملہ کر سکتے ہیں، رفتار ... اور معرکہ کو متحرک رکھ سکتے ہیں۔ فرانسیسی جس بات کو نہ سمجھ سکے وہ یہ تھی کہ نئی نئی تدبیروں نے اس حرکت و چلتی پھرتی جنگ کے طریقہ کو پچھلی جنگ کے مقابلہ میں زیادہ موقع دے دیا ہے۔

پچھلی جنگ میں فیر کے جس طریقہ نے جنگ میں حرکت کو بہت کم کر دیا تھا وہ مشین گن کی ... بے چارہ اس بے پناہ مار کے آگے بس خندق ہی کھود سکتا تھا چنانچہ پچھلی جنگ میں تین سال تک ... مشین گن نے متحرک جنگ کا سدباب کر دیا تھا۔ اس جمود میں حرکت پیدا کرنے کے لیے حملہ آور فوج کو بھاری توپ خانہ کا استعمال کرنا ہوتا تھا لیکن پلٹن کے آگے توپوں کے گولے جوان کا راستہ صاف کرنے کے لیے گرائے جاتے تھے زمین کو اتنا کھود ڈالتے تھے کہ پلٹن کا آگے بڑھنا دشوار ہو جاتا تھا پھر بھاری توپ خانہ اس تیزی سے آگے نہیں بڑھ سکتا تھا جتنا کہ فوج کا حملہ آور حصہ۔ اور خبر پہنچانے کے لیے پیدل فوج کا استعمال اس توپ خانہ کی مدد سے آگے بڑھنے والی فوج کی رفتار پر اور بھی پابندیاں عاید کرتا تھا جب ... مدافعت کرنے والے کی مشین گن ان حملوں کو روک لیتی تھی۔

مشین گن کی اس فوقیت کا خاتمہ ۲۰ نومبر ۱۹۱۷ء کو کیمبرے (CAMBRAI) کے معرکہ میں ٹینک سے ہوا لیکن اس وقت ٹینک تھوڑی سی تعداد میں استعمال ہوئے تھے، اور ان کی حیثیت ... کی تھی فیصلہ کن طاقت کے طور پر ضرورت تھی کہ ان کا استعمال زیادہ تعداد میں کیا جائے۔ اور ... یعنی پلٹن کے موٹر لاریوں کے ذریعہ تیزی سے بڑھنے کا انتظام کیا جائے اور خبر رسانی کے لیے ... کی جگہ ہوائی جہازوں اور لاسلکی سے کام لیا جائے۔ چنانچہ جرمنوں نے انہیں تین چیزوں کو ... کی خصوصیت بنایا، فوج کو لے جانے اور بار برداری کے لیے موٹر، محاذ توڑنے کے لیے ... ٹینک، خبر رسانی اور فوج کی کمک اور تحفظ کے لیے ہوائی جہاز۔ سچ یہ ہے کہ کیمبرے کا معرکہ ... ایک عہد آفریں واقعہ تھا لیکن کسی نے اسے سمجھا کسی نے نہ سمجھا۔ ۱۹۱۸ء کے بعد ... بھی ترقی ہوئی لیکن اس کا مقابلہ کرنے کے اسلحہ میں بھی ترقی ہوئی اور ...

ٹینک کو محاذ توڑنے کے کام میں کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جا سکے گا یا نہیں جرمن جنرل اسٹاف بھی
اور انگریزی مفکروں کی طرح متردد تھا لیکن اس نے اپنے تردد کو محض نظری بحثوں سے دور نہیں کرنا چاہا بلکہ
نے عملی تجربہ کر کے دیکھا۔ اسپین کی خانہ جنگی جرمنی کی حربی تجربہ گاہ بنی جرمنی کا ایک لائق جنرل فان [illegible]
اسپین اسی لیے بھیجا گیا تھا کہ وہاں اس نئے طریقے کو ہر طرح آزمائے۔ اور اس تجربہ کی روشنی میں اسلحہ میں اور
حملے کے طریقہ میں مناسب ترمیمیں تجویز کرے تاکہ آنے والی بڑی جنگ میں ان سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ ان
نئے طریقوں کی آزمائش اطالویوں نے بھی اسپین میں کی اور ناکام ہوئے۔ ان کی ناکامی میں فرانسیسی جنرل
اسٹاف نے اپنی رائے کی تصدیق ڈھونڈی اور پائی۔ جرمنوں نے کہا یہ اطالوی اسے نہیں کر سکے لیکن یہ
ہو سکتا ہے اور ہم اسے کریں گے۔ اور انھیں نے ہر اسلوب سے تجربہ کر کے اس طریقہ کو مکمل کیا۔

اسپین کے مقابلۃً چھوٹے چھوٹے معرکوں کے بعد اس طریقہ کی آزمائش بڑے پیمانہ پر ۱۹۳۹ء میں
پولینڈ میں ہوئی۔ رفتار کی تیزی کا اندازہ یوں کیجیے کہ کل قصہ ۲۵ دن میں ختم ہو گیا اور سچ یہ ہے کہ پہلے ہی ہفتہ
میں پولینڈ کی مدافعت کی کمر ٹوٹ ہی گئی تھی۔ چال شروع سے جرمنوں کے ہاتھ میں تھی اور آخر تک رہی
پولینڈ کا جنرل اسٹاف فرانسیسی جنرل ویگان کا شاگرد تھا۔ وہ جنگ میں فرانسیسی مسلک ہی کا پابند تھا اور
اس کے خیالات بھی پچھلی جنگ کی کامیابیوں سے متاثر تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ دشمن بڑے محاذ پر حملہ کرے گا
جرمن فوجوں کی رفتار وہی ہو گی جو پچھلی جنگ میں تھی۔ اور ایسی صورت میں ہم کم سے کم چھ مہینے تک صورت
رکھیں گے اور چھ مہینے میں دوسرے محاذ پر بہت کچھ ہو سکے گا لیکن جرمنوں نے نیا طریقہ استعمال کیا اور مہینوں
کا کام ہفتوں میں ہو گیا۔

[illegible] بڑے پیمانہ پر اس کی آزمائش ۱۹۴۰ء کے مئی [illegible]
[illegible]

آرڈن کے پہاڑی علاقہ میں سے جلد نہیں گزر سکتی، وہ پچھلی جنگ کے تجربہ کی بنا پر یہ خیال درست ہی تھی
اس لیے کہ کوئی بڑی فوج لمبے محاذ پر اس علاقہ میں بس پیدل ہی بڑھ سکتی ہے۔ سڑکیں کم ہیں لیکن نئے طریقے کے
لیے اس کی موٹروں اور ٹینکوں کے لیے چند سڑکیں کافی تھیں۔ ان پر تیزی سے بڑھ کر جرمن دریائے میوز پر
فرانسیسی توقع سے بہت پہلے پہنچ گئے اور پھر ساحل کا رخ کر دیا اور دس دن میں ساحل تک پہنچ گئے۔ اس
جنگ کا دوسرا باب "ویگاں لائن" پر حملہ تھا۔ جنرل ویگاں نے اپنی فوج کو پلٹن اور ٹینک [illegible] کو ایک لمبے
محاذ پر پھیلا دیا تھا۔ خندقیں کھود لی تھیں اور بجائے اس کے کہ ان کی تیاری کے زمانہ میں جرمنوں پر حملہ کرتا
ان کے حملہ کا منتظر تھا۔ حملہ ہوا بھی مگر پورے محاذ پر نہیں۔ تین جگہ جرمنوں نے اپنے ٹینکوں سے تین چھوٹے چھوٹے
دریچے بنا لیے، جن کی کوئی حیثیت پچھلی جنگ میں نہ ہوتی اور ان کے سامنے پھر آسانی سے نئی خندقیں بن جاتیں
مگر ان دریچوں میں سے جرمنوں نے سات پانسرڈ ڈویژن داخل کر دیے جو ۳۰ میل یومیہ کی رفتار سے ۴۸ گھنٹہ
میں رواں پہنچ گئے اور معاملہ ختم ہوا۔ اس کے بعد بلقان میں لڑائی ہوئی۔ لوگ بولے یہاں اس برق رفتاری
کا موقع جرمنوں کو نہ ملے گا۔ اس پہاڑی علاقہ میں وہ کیسے اس تیزی سے بڑھ سکیں گے۔ مگر یہ بھی دھوکا تھا۔ اس لیے
کہ جیسا کہ یہ لوگ سمجھ رہے تھے جرمنوں کو بڑے محاذ پر بڑھنا ہی نہ تھا۔ انھیں تو بس دریائے استروما اور استرومتزا
کے درے بہت تھے۔ ان میں سے انھوں نے ٹینکوں کے ڈویژن پہنچا دیے۔

پولینڈ میں وارسا کی جانب جرمنوں کی رفتار کوئی ۱۲ میل روزانہ رہی۔ [illegible] ڈنکرک کی طرف ۲۲ میل یومیہ [illegible]
ساحل تک ۴۰ میل روزانہ بڑھے اور روآن پر حملہ میں ۳۰ میل روزانہ۔ بلقان میں ایتھنز کی چڑھائی کے لیے ۵۰ میل [illegible]
غرض اس طریقہ کی آزمائش کافی ہو چکی ہے اور سمجھنا چاہیے کہ آئندہ جنگ میں اس سے چشم پوشی کرنا [illegible]
میں اس کا لحاظ نہ رکھنا ناکامی کو خود بلانا ہے۔

اس نئے طریقہ کی نظری بنیاد فان شلیفن کا یہ قول ہے کہ دشمن سے فیصلہ ہمیشہ اس کے [illegible]
عقب میں چاہیے۔ یہ خیال جرمن حربی ادب میں ہر ڈھب سے دہرایا جاتا ہے۔ اب جنگ کے [illegible]
فوجوں کی حیرت میں ڈالنے والی تعداد نے جن سے سارا عرصہ [illegible]
کہ اس کے بازوؤں کو گھیرا جائے یا جگہ دے کر اس کے عقب میں پہنچا جائے چنانچہ [illegible]

اب اوج تین نقطے ہیں جہاں دشمن کمزور ہو۔ پہلے یہ تین مرکز بنا گئے ہوئے سیاہ خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مرکز کس طرح آگے بڑھتا ہے اور کس طرح اپنے دباؤ کی سمت بدلتا رہتا ہے ① ② ③ بعد کے مرکزوں میں مرکز سے آگے بڑھنے کے بعد جو ادھر ادھر کا پھیلاؤ ہے وہ ایسے تیروں سے ظاہر کیا گیا ہے ← - - - -

یعنی گھسنے کے بعد پھیلنے، پھر نئے مرکز سے گھسنے اور پھر ادھر ادھر پھیلنے کے لیے ضروری ہے کہ حملہ آور ٹولی کے پاس ہر قسم کا سامان ہو اور وہ خود اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکے اور اس کے قائدوں کے لیے اپنی ذمہ داری پر کام کر سکنے کی قابلیت از بس ضروری ہے جرمن فوج کے تربیت دینے والے چونکہ اس نئے طرز پر لڑنے کی تیاری کر رہے تھے اس لیے انھوں نے اس نئی قیادت کی تعلیم و تربیت اور اس کے لیے حملہ آور ٹولیوں ANGRIFFSGRUPPEN کو اپنے آنے والے کام کی مشق بھی بہم پہنچائی تھی۔ اور ان کی کامیابی میں اس کو بہت کچھ دخل ہے۔

اس جنگ میں مدافعت پر حملہ کو قابل ترجیح پٹرول انجن نے بنایا ہے پہلے فوجیں محاذ جنگ کی طرف ۱۵ سے ۲۵ میل روزانہ کے حساب سے جاتی تھیں اب ۱۰۰ سے ۱۵۰ میل کے حساب سے جا سکتی ہیں۔ رفتار کے ان عددوں میں جو نسبت ہے اسی نسبت نے حملے نے مدافعت پر فوقیت حاصل کر لی ہے۔ پٹرول انجن نے غیر متوقع حملہ کرنا ممکن کیا۔ اس نے تیز رفتاری ممکن بنائی پچھلی جنگ میں توپ خانوں کو حرکت دینے کی دشواریاں اور مشین گن کی موثر مار نے حملے سے جو کچھ چھینا تھا پٹرول انجن نے اسے پھر واپس دلا دیا۔ اس کی وجہ سے یہ بھی ممکن ہوا کہ جس نقطہ پر چاہو جس وقت چاہو ایک چشم زدن میں قوت مجتمع کر دو۔ لڑتے لڑتے کہیں مخالف کی کمزوری کا پتہ چلے حملہ آور فوج کا جنرل اپنی ساری قوت ادھر ڈال کر نتیجہ نکال سکتا ہے پچھلی جنگ میں ریل کا دور دورہ تھا اس جنگ میں پٹرول انجن کا ہے پچھلی جنگ میں لاکھوں ٹن سامان لے جانے کی ضرورت ہوتی تھی اور ریل سے یہ کام لینا ہوتا تھا۔ غیر متوقع طور پر حملہ کرنے کا موقع کہاں آسانی سے مل سکتا تھا کسی ریلوے کے سلسلے میں بڑی پابندی اس سے ہے کہ مال چڑھانے اور مال اتارنے کے اسٹیشنوں پر کتنی گنجائش ہے۔ ایک وقت میں کتنے پلیٹ فارم کام میں لائے جا سکتے ہیں اس لیے اگر بہت سامان لے جانا ہو تو اسٹیشنوں کا رقبہ نہایت وسیع ہو جاتا ہے اوسط تخمینہ یہ ہے کہ ایک لائن ہو تو اس پر دن میں پندرہ گاڑیاں چل سکتی ہیں [illegible]

تو جہاں ایک لائن پر ہی ضرورتوں کے لیے کوئی ۵۰۰ ٹن اور دوہری لائن پر کوئی ۱۰۰۰ ٹن مال پہنچایا جا سکتا ہو پچھلی جنگ کے زیادہ کو پیش نظر رکھیں تو ایک پیادہ ڈویژن کے محاذ پر ہونے کے لیے کوئی دس ہزار ٹن سامان کی ضرورت ہوتی تھی۔ اور ۱۹۱۸ء میں بعض بڑے حملے ہوئے تھے ان میں تقریباً ۱۰ لاکھ ٹن سامان صرف ہوتا تھا اکہری لائن پر اس سامان کو پہنچانے میں دو مہینے لگتے، دوہری لائن پر بھی کوئی ۲۰ دن۔ پھر غیر متوقع حملے کیسے آسانی سے ہوتا۔ ریل کی وجہ سے یہ ضروری ہوتا تھا کہ سامان اور آدمیوں کو حملہ کی جگہ سے جس قدر قریب پہنچایا جا سکے پہنچایا جائے۔ پٹرول والی جنگ میں انھیں آسانی سے خاصے فاصلہ پر رکھا جا سکتا ہے۔ ریل کی وجہ سے حملہ کا محاذ پہلے سے متعین سا ہوتا تھا، پٹرول انجن کی وجہ سے نہایت آسانی سے آخری وقت میں بھی اسے بدلا جا سکتا ہے اس لیے کہ قوت کسی نقطہ پر بھی آسانی سے جمع کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ آدمیوں اور سامان کو ۱۰۰-۱۵۰ میل پیچھے رکھتے ہیں جہاں سے دشمن کے محاذ کے کئی حصوں اور متعدد نقطوں پر دھاوا بولا جا سکتا ہے پٹرول انجن نے وہ بات پھر ممکن کر دی ہے جو نپولین کہا کرتا تھا اور جس کی تلقین بعد کو جنرل کلازوٹس نے بھی کی ہے کہ بڑھو جدا جدا، ضرب لگاؤ مل کر۔

یہ تو ہوا آگے بڑھنے اور حملہ کرنے کا حال لیکن پچھلی جنگ کے تجربہ کی بنا پر یہ خیال ہو سکتا ہے کہ اگر حملہ اسی تیزی سے آگے بڑھایا جائے اور دشمن کے محاذ کو چیر کر جس تنگ رخنہ میں سے حملہ آور قوت کے لیے راستہ نکالا جائیگا اس سے رسد پہنچانے کا مسئلہ بہت مشکل بن سکتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کے برق رفتار حملوں میں اول تو اتنی رسد درکار نہیں ہوتی خصوصاً سامان جنگ جتنا کہ پچھلی جنگ کے حملوں میں ہوتا تھا۔ فوج کا بڑا حصہ موٹروں پر جاتا ہے اور جسے سب سے زیادہ تیزی سے زیادہ آگے بڑھنا ہوتا ہے وہ اپنے ساتھ معمولی مقدار میں چند سامان جنگ رکھتا ہے موٹروں والی فوج کے پیچھے پیچھے ہی [illegible] میں [illegible] یا دو [illegible] کے لیے سامان جنگ موقع کارزار سے کافی فاصلہ پیچھے [illegible] ریل سے سامان [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

پٹرول چاہیے۔ اوسط درجہ کے کروزر ٹینک کو ۱۰۰ گیلن، اور ہلکے ٹینک کو ۵۰ گیلن۔ ۳ ٹن کی مال سے بھری لاری
کو اسی فاصلہ کے لیے کوئی ۲۰ گیلن اور ۳ ٹن کی لاری کو ۱۲ گیلن اور ہلکی لاری کو ۶ گیلن چاہییں۔ اگر جس
نسبت سے جرمن فوج میں ٹینک اور گاڑیاں استعمال ہوتی ہیں اسے سامنے رکھیں اور ٹینکوں اور لاریوں
کی مجموعی تعداد ۵ ہزار فرض کریں تو ان میں سو میل بڑھنے کے لیے کوئی ۵ لاکھ گیلن یا ڈیڑھ یا ۲ ہزار ٹن
پٹرول درکار ہوگا۔ اگر یہ سمجھیں کہ ایک تیل کی ٹنکی والی لاری اپنی ضرورت کے علاوہ کوئی [illegible] پٹرول لے جا سکتی
ہو تو سو میل کے سفر پر اسے ۱۵۰۰ کے قافلہ کے تیل لے جانے کے لیے ۶۰۰ لاریاں ہونی چاہییں۔

چنانچہ پٹرول کی رسد کے لیے یہ انتظام کیا جاتا ہے کہ خود ٹینکوں اور فوجی لاریوں کی ٹنکیوں میں کافی
پٹرول رہے، جرمنوں نے ان سب میں کوئی ۲۰۰ میل کے لیے پٹرول رکھنے کا انتظام کیا ہے۔ بعض میں ایک فالتو
ٹنکی بھی ہوتی ہے جو باہر لگی ہوتی ہے اور خالی ہونے کے بعد ہٹا دی جاتی ہے۔ پھر ٹینکوں اور فوجی لاریوں کے بیڑے
کے ساتھ پٹرول کی لاریاں بھی چلتی ہیں جو انھیں سو میل کے لیے اور پٹرول دے سکتی ہیں۔ ان کے علاوہ پٹرول
لاریوں کے مستقل دستے بھی برابر آگے بڑھتے رہتے ہیں اور سڑک پر بھی جگہ جگہ پٹرول کے ذخیرے موجود ہوتے
ہیں جن سے واپس ہونے والی لاریاں پٹرول لیتی ہیں۔ ہوائی جہازوں کے ذریعہ بھی پٹرول پہنچانے کا تجربہ
لیبیا کی جنگ میں جرمنوں نے کیا ہے۔

ہم نے نہایت اختصار کے ساتھ چند چیزوں کا ذکر اس مضمون میں کیا ہے جنھوں نے جنگ کے اسلوب
کو بدل دیا ہے۔ حملہ کی قوت کو بڑھایا ہے اور مدافعت کرنے والے کے لیے دشواریاں پیدا کی ہیں لیکن کئی اور
چیزوں کے متعلق معلومات اس تغیر کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ مثلاً ہوائی جہازوں کی اہمیت اور خود پیادہ فوج
کے آگے بڑھنے کے طریقے۔ اس کے علاوہ یہ بھی نہ سمجھنا چاہیے کہ حملہ کے اس طریقہ کے مقابلہ میں مدافعت کا
کوئی امکان ہی نہیں ہے لیکن اس طرز کے ساتھ ساتھ مدافعت کا بھی ایک نیا طرز نکلا ہے جس سے روسی ہر
جگہ فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اگر موقع ملا تو کسی آیندہ اشاعت میں ان چیزوں کے متعلق بھی کچھ معلومات پیش
کریں گے۔

میں حکومت کا کام یہ ہے کہ وہ قیمتوں میں اضافے کو روکنے کے ذرائع اختیار کرے۔ اس خیال میں بڑی حد تک اصلیت پائی جاتی ہے لیکن بعض خاص خاص حالات میں جنگ کی وجہ سے قیمتیں گرتی ہیں اور ان کو استحکام دینے کی ذمے داری بھی حکومت ہی پر عاید ہوتی ہے۔ یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جنگ کے دوران میں شرح مبادلہ ملک کے خلاف ہو جاتی ہے ایسی صورت میں اگر حکومت شرح مبادلہ کو استحکام دینے کے ذرائع اختیار نہ کرے تو اس کا مساعیِ جنگ پر برا اثر پڑتا ہے۔ بیرونی ممالک سے جنگی ضروریات اور عام ضروریات کی جو چیزیں خریدی جائیں گی۔ ان کی قیمت زیادہ ادا کرنی پڑے گی۔ اسی طرح سے بعض ایسی چیزوں کی قیمتیں کم ہو جاتی ہیں جو بیرونی بازار کے لئے تیار کی جاتی تھیں۔ اور جن کی برآمد میں یا تو اب بہت کمی ہو گئی ہے یا پھر برآمد بالکل ہی رک گئی ہے۔ اس کی بہترین مثال ہمارے ملک میں روغنی تخم جوٹ اور روئی کی قیمتوں کی کمی ہے یعنی یورپ بیرونی بازاروں کے ہاتھ سے نکل جانے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ان چیزوں کی قیمتیں گر رہی ہیں اور حکومت کے سامنے یہ مسئلہ درپیش ہے کہ کون سے ایسے ذرائع اختیار کئے جا سکتے ہیں جن کی وجہ سے ان کی قیمتوں میں بہت زیادہ کمی نہ ہونے پائے اور کاشتکاروں کی حالت کو سنبھالا جا سکے۔

گرانیِ قیمت کے سلسلے میں سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر جنگ کے دوران میں قیمتیں بڑھتی کیوں ہیں؟ قیمتوں میں اضافے کا کوئی ایک سبب نہیں بلکہ بہت سے اسباب ہوتے ہیں۔ عموماً پیشتر جنگ شروع ہونے کا فوری اثر یہ پڑتا ہے کہ اکثر چیزوں کی قیمتیں چڑھ جاتی ہیں مگر یہ وقتی اضافہ زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہتا۔ تاجر زیادہ نفع کمانے کی غرض سے اپنے پاس اشیاء کے ذخیرے روک لیتے ہیں چونکہ جنگ کے شروع ہوتے ہی ایک قسم کی بحرانی کیفیت شروع ہو جاتی ہے عام لوگوں کی یہ بھی کوشش ہوتی ہے کہ جہاں تک ہو سکے ضروریاتِ زندگی کی کافی مقداریں اپنے پاس رکھیں۔ تاجروں کا نفع اندوزی اور سٹے کی غرض سے اشیاء کے ذخیرے رکھنا اور صارفوں کا حفظِ ماتقدم کی خاطر زیادہ مقدار میں چیزیں خریدنا قیمتوں میں اضافے کے معاشی اسباب نہیں کہے جا سکتے۔ لیکن ان کا نتیجہ ضرور یہ ہوتا ہے کہ قیمتیں چڑھ جاتی ہیں۔ کلکتہ کے اشاری عدد (انڈکس نمبر) سے اس واقعے کی تشریح ہو جاتی ہے۔ اگست ۱۹۳۹ء میں یہ اشاریہ ۱۰۰ تھا۔ دسمبر ۱۹۳۹ء میں ۱۴۰ تک پہنچ گیا۔

قیمتوں میں اضافے کے معاشی اور دیرپا اسباب میں پہلا سبب یہ ہے کہ جنگی حالات کی وجہ سے بیرونی ممالک سے درآمد کی ہوئی چیزوں کی مقداروں میں کمی ہو جاتی ہے۔ جنگ چھڑتے ہی دشمن کے ممالک سے تجارت کرنا خلاف قانون قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ ان ملکوں سے اشیاء کی درآمد بالکل بند ہو جاتی ہے۔ غیر جانب دار ممالک کے ذریعے بشرطیکہ عالمی کشمکش میں کچھ غیر جانب دار ممالک باقی رہے ہوں اس ذریعے سے چیزیں حاصل کی جا سکتی ہیں۔ ایسے غیر محارب ممالک سے بھی جن سے دوستانہ تعلقات قائم رہیں اشیا منگانے میں بہت سی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ حکومتی تسلط کے تحت ان ممالک کی مختلف صنعتیں جنگی ضروریات پوری کرنے میں لگ جاتی ہیں بہت سے عاملین پیدائش امن کی صنعتوں سے منتقل ہو کر جنگی صنعتوں میں مصروف ہو جاتے ہیں اور سول آبادی کی ضروریات کی چیزیں بہت کم تیار کی جاتی ہیں۔ غیر جانب دار ممالک سے بھی جہازوں کی کمی بیمے کی زیادتی اور دشمن آبدوزوں کے خطرے کی وجہ سے اشیاء کم مقدار میں حاصل کی جا سکتی ہیں۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ درآمد گھٹ جاتی ہے۔

جنگ کے حالات بیرونی ممالک سے درآمد کرنے میں مختلف رکاوٹیں پیدا کر دیتے ہیں۔ درآمد میں کمی ہو جاتی ہے اس کمی کو دور کرنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ اس قسم کی چیزیں خود ملک کے اندر تیار کی جائیں لیکن پیداوار بڑھانے میں بھی مختلف قسم کی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ نئی نئی صنعتیں قائم کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ خود اپنے ملک کی مثال لیجئے۔ ہمارے یہاں مشینیں تیار نہیں کی جاتی ہیں۔ بھاری صنعت کی بھی یہی حالت ہے۔ جنگ سے پہلے مشینیں دوسرے ممالک سے منگائی جاتی تھیں۔ ان کی درآمد میں بھی وہی دقتیں ہیں جو اشیاء کی درآمد میں۔ بعض صنعتیں ایسی بھی ہیں جن کو قائم کرنے اور کامیابی سے چلانے کے لئے خام اشیاء دوسرے ملکوں سے حاصل کرنی پڑیں گی۔ ان تمام دقتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ یا تو بعض صنعتیں بالکل قائم نہیں کی جا سکتیں اور اگر بعض قائم بھی کی جا سکیں [illegible] کی بناء پر [illegible] کے مقدار پیدا [illegible] ہے۔ [illegible] کی صورت میں [illegible] بات ہے۔

[illegible]

کیا [illegible]

خام اشیار کی طلب ان کی رسد کے مقابلے میں بڑھ گئی ہے جنگ کے دوران میں عام لوگوں کی قوت خرید میں اضافہ ہو جاتا ہے اور ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ زائد آمدنی کو مختلف ضروریات پورا کرنے پر صرف کریں بعض صوبجاتی اور ریاستی حکومتیں احتیاطاً اہم چیزوں کے ذخیرے جمع کر رہی ہیں۔ حکومت ہند محکمہ رسد کے ذریعے سے خود اپنی مختلف قسم کی جنگی ضروریات کو پورا کرنے اور حکومت برطانیہ کے لئے بہت بڑی مقدار میں اشیار خرید رہی ہے۔ نہ صرف جنگی ضروریات کے لئے حکومت کی طرف سے چیزیں خریدی جا رہی ہیں بلکہ بعض دوسرے ممالک مثلاً ایران، مصر، عراق، شام اور لنکا کی سول آبادی کے لئے بھی بہت سی خوراک کی بڑی مقداریں خرید کی گئی ہیں۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۴۲ء تک محکمہ رسد ۴۰۰ کروڑ روپے کا مال خرید چکا تھا۔ یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ بازار میں کسی چیز کی قیمت کا انحصار بڑی حد تک اس پر ہے کہ وہ خریدار جو رسد کا بڑا حصہ خرید رہا ہے کیا قیمت ادا کرنے کے لئے تیار ہے۔ محکمہ رسد کی طرف سے مختلف چیزوں کی جو قیمتیں دی جا رہی ہیں ان کے متعلق عام طور پر یہ شکایت ہے کہ وہ بہت زیادہ ہیں۔ ریزرو بنک کے گورنر نے اپنی سالانہ رپورٹ پیش کرتے ہوئے بیان کیا کہ قیمتوں میں اضافے کا سب سے اہم سبب محکمہ رسد کی مقرر کردہ قیمتیں ہیں۔

قیمتوں میں اضافے کا ایک اور سبب نقل وحمل کی دقتیں بھی ہیں۔ جنگ کی وجہ سے ہمارے [illegible] کے ذرائع آمد و رفت پر بہت زیادہ بار پڑ رہا ہے۔ فوجوں کی نقل وحرکت اور جنگی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اشیار کی منتقلی اتنی زیادہ ہو رہی ہے کہ سول آبادی کی ضروریات کی چیزیں [illegible] وقت سے منتقل کی جا سکتی ہیں۔

امریکی فنی مشن نے اپنی رپورٹ میں ذرائع آمد و رفت میں جو کچھ نقائص پائے جاتے ہیں [illegible] ریلوں پر ضرورت سے زیادہ جو بار پڑ رہا ہے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ریلوں کے [illegible] کی خاصی تعداد دوسرے ممالک کو بھیجی جا چکی ہے۔ نئے ڈبے [illegible] کے انجنوں کی درآمد دوسرے ممالک سے کی جاتی تھی۔ [illegible] تیار کرنے کے لئے لوہا اور فولاد حاصل نہیں کیا جا سکتا [illegible]

اب دیکھنا یہ ہے کہ جنگ شروع ہونے کے بعد سے ہمارے یہاں نوٹوں کی تعداد میں کس قدر اضافہ ہوا ہے۔ ریزرو بنک کے چٹھے کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ مروجہ زر کاغذی کی مقدار جو جنگ شروع ہونے کے وقت ۱۷۲،۳۶ کروڑ روپے تھی ۱۸ دسمبر ۱۹۴۲ء کو [illegible] کروڑ روپے تک پہنچ گئی یعنی زر کی تعداد تین گنا ہو گئی ہے۔ ہمارے یہاں کی حکومت کے روزانہ اخراجات ۱½ کروڑ روپے یا اس سے کچھ زیادہ ہو رہے ہیں۔ اس کے مقابلے میں انگلستان کی حکومت ۲۰ کروڑ روپے روزانہ خرچ کر رہی ہے۔ لیکن اس کے باوجود زر کاغذی کی مقدار میں بہت کم اضافہ ہوا ہے۔ نومبر کے آخر میں زر کی مقدار صرف ۶۰ فیصدی بڑھی تھی۔

ہمارے ملک میں اب تک زر کی تعداد میں جو کچھ اضافہ ہوا ہے اُسے افراطِ زر سے تعبیر کیا جا سکتا ہے یا نہیں، اس مسئلہ پر ماہرین میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ کچھ دن پہلے تک حکومت کے نمائندے اس بات پر زور دیتے رہے تھے کہ افراطِ زر کے حالات تو پیدا نہیں ہوئے ہیں البتہ اس کے نمودار ہونے کے خطرات ضرور موجود ہیں۔ انھوں نے یہ بھی بتلایا تھا کہ حکومت حالات پر سخت قسم کی نگرانی رکھ رہی ہے۔ ریزرو بنک کے گورنر نے جون ۱۹۴۲ء میں کہا تھا کہ زر کی مقدار میں اضافہ کاروباری ضروریات کے پیشِ نظر عمل میں آیا ہے۔ زر کی مقدار میں اضافہ قیمتوں کے بڑھنے کا سبب نہیں بلکہ نتیجہ ہے۔ یہ اسی قسم کی دلیل ہے جیسی کہ پچھلی جنگ کے دوران میں اور اس کے بعد جرمن حکومت نے اپنی افراطِ زر کی پالیسی کو صحیح بتلاتے ہوئے بیان کی تھی۔ بعض اعداد و شمار کو پیش کر کے یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ واقعی افراطِ زر کے سب اثرات نہیں تو اہم اثرات ضرور نمودار ہو گئے ہیں۔ ایک ماہر تجارتیات نے اپنے مضمون میں بتلایا ہے کہ اکتوبر کے آخر تک زر کی مقدار ۱۹۹ فی صد بڑھی تھی اس کے مقابلے میں صنعتی اور زرعی اجناس کی پیدائش میں مجموعی طور پر اضافہ ۲۰ فی صد ہوا تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ زر کی مقدار اشیاء کے مقابلے میں کہیں زیادہ بڑھی۔ اس عرصے میں قیمتوں کی سطح ۱۰۶ فی صد بڑھی۔ قیمتیں اسی نسبت سے نہیں بڑھیں جس نسبت سے کہ زر کی مقدار۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب تک لوگوں کا زر کے متعلق اعتبار ختم نہیں ہوا۔ جس روز یہ اعتبار ختم ہوا لوگ زر سے پرہیز کریں گے اور اپنے پاس زر رکھنا پسند نہیں کریں گے

یہی حال دوسرے اشاری عددوں کا بھی ہے۔ بمبئی کا انڈکس نمبر اگست [illegible]
بڑھ کر ۲۲۵ تک پہنچ گیا ہے یعنی ۱۲۵ فی صد اضافہ ہوا۔

ہندوستان کے مختلف صنعتی مرکزوں کے جو اشاری عدد تیار کئے جاتے ہیں ان کے مطالعہ سے یہ
بھی واضح ہو جاتی ہے کہ قیمتوں میں اضافہ کی وجہ سے مصارف زندگی بہت بڑھ گئے ہیں۔ بمبئی کے
مصارف زندگی کے اشاری عدد میں جنگ کے شروع ہونے کے بعد سے اب تک ۵۰ فی صد اضافہ
ہو چکا ہے۔

جب اس طرح سے قیمتوں میں اضافہ تیزی سے ہو تو معاشرہ کے لئے بہت سی [illegible]
پیدا ہو جاتی ہیں۔ خود حکومت کے نقطۂ نظر سے بھی قیمتوں کا اضافہ مضر ثابت ہوتا ہے۔ یہ کہنا صحیح
ہے کہ قیمتوں میں تھوڑا بہت اضافہ حکومت کے مفاد کے عین مطابق ہے۔ لیکن قیمتوں کے بہت زیادہ
بڑھنے کی وجہ سے حکومت کے اخراجات زر کی شکل میں بڑھ جاتے ہیں جنہیں پورا کرنے کے لئے حکومت
کو محاصل میں اضافہ کرنا پڑتا ہے۔ افراد اور اداروں سے زیادہ مقدار میں قرضے لینے پڑتے ہیں۔ اگر ان
ذرائع سے اخراجات پورے نہ ہوں اور یہ یقینی بات ہے کہ ایسا ناممکن ہے تو پھر حکومت افراط زر کی
پالیسی پر اور زیادہ عمل کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ قیمتوں میں مزید اضافہ ہوتا ہے اور اس
طرح معاشرہ میں افراط زر کا بڑا چکر شروع ہو جاتا ہے۔

قیمتوں میں اضافہ کی وجہ سے عام لوگوں کے مصارف زندگی بڑھ جاتے ہیں۔ خاص طور پر
متوسط الحال طبقے کے افراد کو جن کی آمدنیاں مقرر ہوتی ہیں سخت قسم کی تکالیف [illegible]
کی پس انداز کی ہوئی دولت کی قدر بہت گھٹ جاتی ہے اور معیار زندگی پست ہو جاتا ہے۔ [illegible]
طبقہ کا بھی ہے۔ ان کی اجرتوں میں اضافہ گرانی بھتہ کی صورت میں ضرور کیا جاتا ہے لیکن [illegible]
ہوتا کہ قیمتوں میں اضافہ کا ساتھ دے سکے اس کے علاوہ سب مزدوروں کو [illegible]
عام بے چینی پھیل جاتی ہے۔ اس لئے حکومت اپنے مفاد کی خاطر اور عوام کے [illegible]
جنگ میں قیمتوں پر نگرانی قائم کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

[illegible] سکتی تھی۔ یہی وہ زمانہ ہے جبکہ گیہوں کی قیمت میں خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔ حکومت نے پہلے تو گیہوں کے تاجروں کو تنبیہ کی کہ وہ چار روپے چھ آنے فی من سے زیادہ پر فروخت نہ کریں۔ لیکن جب اس تنبیہ کا کوئی اثر نہ ہوا تو حکومت نے گیہوں پر نگرانی قائم کرنے کے لئے ایک افسر اعلیٰ کا تقرر کیا اور گیہوں کی قیمت بڑھا کر پانچ روپے من کر دی گئی۔ نہ صرف گیہوں کی ابتدائی قیمت کا تعین کیا گیا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ مختلف صوبجات میں اس کی تقسیم پر بھی سخت قسم کی نگرانی قائم کی گئی۔ ایک صوبے سے دوسرے صوبے کو گیہوں منتقل کرنے کے لئے افسر اعلیٰ کا اجازت نامہ حاصل کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح شکر کے لئے بھی ایک افسر مقرر کیا گیا اور اس کی قیمت اور تقسیم پر بھی کنٹرول قائم ہے۔

FOOD GRAINS CONTROL ORDERS (جو مئی ۱۹۴۲ء میں جاری کئے گئے) کی رو سے اناج کے تمام تاجروں کے لئے لائسنس لینا لازمی قرار دیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے کاروبار اور حسابات پر حکومت نگرانی رکھتی ہے۔

حکومت سرکار عالی نے بھی جنگ شروع ہونے کے دو روز بعد ہی نگرانی قیمت کی ایک مرکزی کمیٹی کی تشکیل کا اعلان کیا۔ کچھ دنوں بعد ضلاع میں بھی اسی قسم کی مقامی کمیٹیاں قائم کی گئیں۔ کل ریاست کے لئے نگرانی قیمت کے ایک افسر اعلیٰ کا بھی تقرر کیا گیا۔ حکومت کی طرف سے جوار، گیہوں، شکر، کاغذ، دیا سلائی اور گھاس کے تیل کی انتہائی قیمتیں مقرر کی گئی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ چاول، گیہوں، جوار، مختلف قسم کی دالیں اور دوسری بہت سی چیزوں کی برآمد بیرون ملک سرکار عالی بلا اجازت نامہ ممنوع قرار دی جاچکی ہے۔ بلدہ حیدرآباد کے مختلف مقامات پر حکومت نے سرکاری دوکانیں بھی کھولی ہیں۔ جہاں حکومت کی مقرر کردہ قیمتوں پر چیزیں فروخت کی جاتی ہیں۔ حیدرآباد میں گیہوں کے لئے راتب بندی کا طریقہ بھی اختیار کیا گیا ہے۔ حکومت کے زیر غور قیمتوں کے مرکزی بورڈ کے قیام کا بھی مسئلہ ہے۔

مرکزی حکومت نے دوسرا کام یہ کیا کہ وقتاً فوقتاً مختلف صوبجات اور ریاستوں کی [illegible] قیمت کی کانفرنس طلب کی جن میں مشترک مسائل پر بحثیں ہوئیں اور نمائندے ایک دوسرے کے [illegible] مستفید ہوئے۔ ان کانفرنسوں کے منعقد کرنے کا اصل مقصد یہ تھا کہ نگرانی [illegible]

میں مختلف صوبجات اور ریاستوں میں جو کچھ کام ہو رہا ہو اس کا جائزہ لیا جائے اور حکومتوں کی پالیسی میں
ہم آہنگی پیدا کی جا سکے۔ اب تک حکومت ہند اس قسم کی چھ کانفرنسیں طلب کر چکی ہے۔ آخری کانفرنس
ستمبر ۱۹۴۲ء کے پہلے ہفتہ میں منعقد ہوئی تھی۔

نگرانی قیمت کی پہلی کانفرنس اکتوبر ۱۹۳۹ء میں ہوئی تھی جس میں یہ طے کیا گیا کہ قواعد تحفظ ہند
کی رو سے مرکزی اور صوبجاتی حکومتوں کو قیمتوں پر نگرانی رکھنے کے کافی اختیارات حاصل ہیں۔ کانفرنس
کے نمائندوں کی یہ رائے تھی کہ اس وقت قیمتوں میں اضافہ اتنا زیادہ نہیں ہوا کہ اسے نگرانی قائم کر کے
روکنے کی ضرورت ہو۔ خاص طور پر جبکہ زرعی اجناس کی قیمتیں جنگ سے پہلے بہت زیادہ گری ہوئی تھیں۔

پہلی کانفرنس کے بعد سے قیمتیں زیادہ تیزی سے بڑھنا شروع ہوئیں۔ حکومت ہند نے
جنوری ۱۹۴۰ء میں دوسری کانفرنس شروع کی۔ اس کانفرنس میں بھی نمائندے مختلف مباحث کے
بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ اس وقت تک قیمتوں میں جو کچھ اضافہ ہوا تھا اس کو دیکھ کر یہ نہیں کہا جا سکتا
کہ قیمتوں پر نگرانی کرنے کی ضرورت تھی۔ قیمتوں میں خاصا اضافہ زرعی خوشحالی کی لازمی شرط قرار
دی گئی۔ اس کانفرنس میں یہ بھی طے پایا کہ وقتِ ضرورت تھوک فروشی کی قیمتوں پر مرکزی حکومت
نگرانی رکھے گی اور خردہ فروشی کی قیمتوں پر نگرانی قایم کرنا صوبجاتی اور ریاستی حکومتوں کا فرض ہوگا۔

تیسری کانفرنس اکتوبر ۱۹۴۰ء میں منعقد کی گئی۔ اس کانفرنس میں جن مسائل پر بحثیں ہوئیں
ان میں معیاری کپڑے کی اسکیم سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اس وقت تک کئی چیزوں کی قیمتوں
میں کافی اضافہ ہو چکا تھا۔ خاص طور پر سوتی کپڑے اور گیہوں کی قیمت میں۔ چنانچہ یہ مناسب سمجھا
گیا کہ غریبوں کے لئے معیاری کپڑے کی تیاری کا ایک لائحہ عمل بنایا جائے۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا
ہے کہ [illegible] کیا گیا ہے۔ البتہ وزیر تجارت مسٹر سرکار نے
[illegible]
[illegible]
[illegible]

تیسری کانفرنس کے بعد گیہوں کی قیمت کا مسئلہ اور زیادہ پیچیدہ ہو گیا گیہوں [illegible]
کمی کرنے سے بھی نتائج خیر خواہ حاصل نہیں ہوئے۔ فروری ۱۹۴۱ء میں نگرانی قیمت کی چوتھی کانفرنس ہوئی
اس وقت تک حالات اور بھی خراب ہو چکے تھے۔ نئے حالات کے اسباب معلوم کرنے کے بعد نمائندے اس
نتیجے پر پہنچے کہ قیمتوں پر نگرانی سے کہیں زیادہ اشیاء کی علاقہ واری تقسیم ضروری ہے۔ اشیاء کی تقسیم
کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے REGIONAL TRANSPORT BOARS سے مدد لینا طے پایا۔

اپریل ۱۹۴۱ء میں پانچویں کانفرنس منعقد کی گئی تھی اس کانفرنس میں مختلف مسائل پر غور کرنے کے بعد
نمائندوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ قیمتوں پر نگرانی اور اشیاء کی تقسیم دونوں قیمتوں کے مسئلے کو حل کرنے کے
لئے ضروری ہے۔ اس کے تھوک فروش تاجروں کے لئے اجازت نامے حاصل کرنے کی سفارش کی گئی تاکہ
صوبجاتی اور ریاستی حکومتیں اشیاء کے ذخیروں پر نگرانی رکھ سکیں اور ذخیرہ کرنے کی عادت پر تسلط
قائم کیا جا سکے۔

آخری کانفرنس ستمبر ۱۹۴۱ء کے پہلے ہفتہ میں ہوئی تھی۔ اس کانفرنس میں مسٹر سرکار حکومت
[illegible] کے نئے وزیر تجارت نے اپنی طویل تقریر میں اس بات کو مان لیا ہے کہ اس وقت تک قیمتوں پر نگرانی رکھنے
کے لئے جو کچھ ذرائع اختیار کئے گئے تھے ان کی وجہ سے کامیابی بالکل حاصل نہیں ہوئی۔ اس کے ساتھ
ساتھ انھوں نے یہ بھی بیان کیا کہ ہندوستان کے حالات کچھ اس قسم کے ہیں کہ یہاں نگرانی قیمت کے
مسئلے میں سو فیصد کامیابی کے امکانات بالکل نہیں۔ انھوں نے اعلان کیا کہ اس کے باوجود حکومت
نگرانی قیمت کی پالیسی کو ترک کرنے والی نہیں ہے۔ حکومت اس پر سختی سے قائم رہے گی۔ [illegible]
کی کوشش کی جائے گی کہ جو کچھ خامیاں ہوں ان کو دور کیا جائے اور ایسے [illegible]
جائیں جن کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ کامیابی کے امکانات پیدا ہوں۔ انھوں نے [illegible]
توجہ چیزوں کی رسد خاص طور پر اشیاء خوراک کی رسد بڑھانے کی طرف [illegible]
کانفرنس میں قیمتوں اور رسد کے مرکزی بورڈز قائم کرنے کی بھی سفارش کی گئی [illegible]
قبل اس کے کہ حکومت کی نگرانی قیمت کی پالیسی پر کوئی [illegible]

جائے تو مارچ ۱۹۴۲ء میں یہ اشاری عدد صرف ۱۰۸ ہوتے ہیں یعنی ۱۹۳۹ء کے مقابلے میں ۸ فی صدی کا اضافہ ہوا۔ اس کے باوجود بعض اہم زرعی اجناس کی قیمتیں پھر بھی کم تھیں پچھلے سات آٹھ مہینوں میں اضافہ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے زیادہ تیزی سے ہو رہا ہے۔ اور اکتوبر ۱۹۴۲ء میں نیا اشاری عدد ۱۴۷ تک پہنچ گیا تھا۔ یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ واقعی اس اضافے سے کاشتکار مستفید بھی ہوا ہے یا نہیں۔ ممکن ہے کہ کاشتکار نے پچھلے چند مہینوں میں فائدہ اٹھایا ہو، لیکن یقین کے ساتھ اب بھی نہیں کہا جا سکتا۔ صحیح حالات کا اندازہ لگانے کے لئے ہمیں یہ معلوم کرنا پڑے گا کہ آیا کاشتکار نے اپنی پیداوار پچھلے پانچ چھ مہینوں میں فروخت کی یا اس سے پہلے جب کہ قیمتیں کم تھیں فروخت کر چکا تھا۔ ہمارے کاشتکار میں اتنی سکت نہیں کہ وہ زیادہ قیمت کی امید میں اپنی پیداوار کو کچھ مدت کے لئے روک سکے۔ اس لئے یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس سال بھی کاشتکار کچھ زیادہ فائدے میں رہا۔ اس کے علاوہ صرف قیمتوں کی سطح پر نظر ڈالنا کافی نہیں ہے۔ ہمیں کاشتکار کے مصارف پیدائش اور مصارف آمد و رفت کی کیفیت کو بھی دیکھنا چاہیے تب ہی اس کے منافع کا صحیح اندازہ لگایا جا سکے گا۔ ذرائع نقل و حمل کی دقتوں کی وجہ سے مصارف آمد و رفت بہت زیادہ بڑھ گئے ہیں۔ بہت سے اسباب کی بنا پر مصارف پیداوار میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ مزید براں عام گرانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے مصارف زندگی زیادہ ہو رہے ہیں۔ قیمتوں کا تعین کرتے وقت ان تمام باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔

نگرانی قیمت اور اجرتوں میں اضافے کے طریقوں کو اختیار کر کے حکومت نے صنعتی مزدوروں کی مشکلات دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کاشتکاروں کا مطمئن اور خوش حال رہنا بھی جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ دوسرے طبقات کا۔

مسٹر سرکار نے جس کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے بعض [illegible] کی تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ حکومت کاشتکاروں کو کسی قسم کا نقصان [illegible]

گیا کیونکہ اجناس کی قیمتیں اتنی گری ہوئی تھیں کہ [illegible] حالت [illegible] تھا۔ اب
حالات پہلے کے مقابلے میں بہت بہتر ہو چکے ہیں۔ اور صنعت پیدائش بڑھنے کے باعث کاشتکاروں
کو اچھا خاصا منافع مل رہا ہے۔ ان حالات میں جماعتی مفاد کی خاطر قیمتوں کا تعین ایک لازمی امر
ہے بہرحال دوران جنگ میں قیمتوں پر نگرانی رکھنے سے (بشرطیکہ اس میں کامیابی ہو) انکار
نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن تعین قیمت کے وقت حکومت کو جماعت کے مختلف طبقات کے مفاد کا
خیال رکھنا چاہیے اور اس قسم کی پالیسی اختیار کرنی چاہیے جس کی وجہ سے جماعت کا کوئی ایک
طبقہ ضرورت سے زیادہ متاثر نہ ہونے پائے۔

اب تک مرکزی اور صوبہ جاتی حکومتوں نے قیمتوں پر نگرانی رکھنے کے لیے جو کچھ ذرائع
اختیار کئے ہیں ان کا مقصد یہ ہے کہ چند اشیاء کی انتہائی قیمتیں مقرر کر دی جائیں، اناج
کے تھوک فروش تاجروں کے لئے اجازت نامے حاصل کرنا لازمی قرار دے دیا گیا اور اس کے ساتھ
ساتھ یہ بھی کوشش کی گئی ہے کہ کنٹرول کی ہوئی چیزوں کی تقسیم صوبجات اور ریاستوں کے
درمیان ان کی ضروریات کے مطابق کی جائے۔ افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ مرکزی اور
صوبجاتی حکومتوں کی یہ پالیسی بالکل ناکام رہی ہے۔ وزیر تجارت حکومت ہند اپنی تقریر
میں اس کا اعتراف کر چکے ہیں۔ گیہوں کی انتہائی قیمت مقرر کر دی گئی ہے لیکن دوسرے اناج
مثلاً جوار اور باجرہ پر کسی قسم کا کنٹرول قائم نہیں کیا گیا ہے جس سے ان کی قیمتیں گیہوں کی قیمت
کے مقابلے میں زیادہ بڑھ رہی ہیں۔

قیمتوں پر نگرانی رکھنے کی پالیسی میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے لازمی شرط یہ ہے کہ
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

میں چاریں حاصل کر سکتے ہیں اِن حالات میں غریب اور متوسط الحال طبقہ اپنی ضروریات کی تکمیل کو بڑی حد تک محروم رہتا ہے۔ لہذا نقد قیمت کی پہلی شرط مقدار پیدا وار یا رسد پر قابو حاصل کرنا ہے۔ انگلستان میں قیمتوں پر نگرانی میں کامیابی کا اہم سبب یہ ہے کہ حکومت کا اشیاء کی رسد پر پورا پورا تسلط قائم ہے۔ اس کو ماننا پڑے گا کہ انگلستان کے حالات ہمارے یہاں کے حالات سے بالکل مختلف ہیں۔ وہاں اشیاء خوراک اور خام اشیاء کا تقریباً [illegible] حصہ دوسرے ممالک سے درآمد کیا جاتا ہے۔ حکومت درآمد پر تسلط قائم کر کے رسد پر قابو پا سکتی ہے [illegible] ہونے کے بعد سے وزارت غذا اشیاء خوراک خود خریدتی ہے۔ اور اس کو تھوک فروشوں [illegible] میں خود ہی تقسیم کرتی ہے۔ تاجروں کی مختلف انجمنوں اور فروخت پیداوار کے بورڈز کے قیام نے بھی نگرانی قائم کرنے میں بڑی مدد دی ہے۔ ہندوستان میں رسد پر اقتدار قائم کرنا بالکل [illegible] ہے۔ پیدا کرنے والوں کی تعداد کروڑوں تک پہنچتی ہے۔ پیدائش دولت کی شماری میں [illegible] سے بعض ممالک میں کی جاتی ہے نہیں کی جاتی۔ جو کچھ اعداد و شمار ملتے ہیں وہ بہت ہی ناقص اور ناکافی ہیں۔ فصلوں کے متعلق جو کچھ اندازے لگائے جاتے ہیں وہ بالکل غلط ہوتے ہیں۔ ہمارے یہاں تاجروں کی انجمنوں کا بھی رواج نہیں ہے۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ رسد اور تقسیم پر پورا پورا قابو حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

حکومت نے چور بازاروں پر قابو پانے کے لئے اب تک موثر طریقہ اختیار نہیں کیا ہے [illegible] خلاف قانون کارروائی کرنے والوں کو بہت ہی معمولی قسم کی سزائیں دی جاتی ہیں [illegible] میں چور بازار دریافت کرنے کے لئے (SCOTLAND YARD) [illegible] ہے۔ اس کے مقابلے میں ہندوستان کی مثال لیجئے۔ وزیر تجارت مسٹر [illegible] صنعتی کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا "حکومت اس پوزیشن میں نہیں [illegible] روکنے کے لئے کوئی انتہائی طریقہ کار اختیار کرے۔ اور سیاسی [illegible] حکومتیں کوئی سخت قدم اٹھاتے ہوئے ہچکچاتی ہیں" اس [illegible]

[illegible] کی حالت میں [illegible] ملک [illegible] کے [illegible] سے [illegible]
پر [illegible] کا [illegible] صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کو اس کی ضروریات کی چیزیں کم
قیمت پر [illegible] مہیا ہو سکیں۔

اشیاء کی صرف انتہائی قیمت مقرر کر دینے سے مختلف طبقات کے درمیان مساوات قائم
نہیں کی جا سکتی۔ اور یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ ہر شخص کو اس کی ضروریات پوری
کرنے کے لئے مناسب مقدار حاصل ہو سکے گی۔ اشیاء کی محدود مقداروں کو لوگوں کے درمیان
مساوی طور پر تقسیم کرنے کے لئے راشن بندی (RATIONING) کو اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اس
طریقے میں ہر شخص کے ساتھ ایک سا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ قیمتوں پر نگرانی قائم کرنے میں کامیابی
اس وقت تک حاصل نہیں کی جا سکتی جب تک کہ راشن بندی کے طریقے کو بھی اختیار نہ کیا
جائے۔ ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ راشن بندی کے طریقے اختیار کرنے میں بہت سی دقتیں ہیں۔
ہمارے ملک کی حیثیت ایک ذیلی بر اعظم کی سی ہے۔ ۳۰ کروڑ انسانوں کے لئے راشننگ
کے کارڈ جاری کرنا ناممکن ہے۔ لوگوں کی اکثریت ان پڑھ ہے ان حالات کی وجہ سے تمام
ملک کے لئے راشن بندی کو اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اگر اس طریقے کو شہروں تک
محدود رکھا جائے تو کامیابی کے کافی امکانات ہیں۔ شہروں کی آبادی کی اکثریت پڑھی لکھی
ہوتی ہے۔ رقبہ زیادہ وسیع نہیں ہوتا اور لوگ عموماً حکومتی قوانین کے عادی ہو چکے ہیں۔
راشن بندی کے طریقے کو اختیار کرنے سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ غذا کی [illegible]
[illegible] ہو جاتا ہے [illegible] ہو جائے گی۔ غذا کے مسئلے کو حل کرنے [illegible]
[illegible] حکومت نے غذا کے مسئلے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

کچھ زیادہ کامیابی بھی حاصل نہیں ہوئی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ پہلے سے ایک منظم اور باقاعدہ لائحہ عمل تیار کیا جائے۔ امریکہ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ صدر روزویلٹ نے اپریل ۱۹۴۲ء میں اپنے سات دفعات والے پروگرام کا اعلان کیا جس پر پوری طرح سے عمل اکتوبر ۱۹۴۲ء سے شروع ہوا ہے۔ ہمارے یہاں بھی اس قسم کا کوئی لائحہ عمل بہت جلد تیار ہو کر اس پر عمل شروع ہونا چاہیے۔ وقت کو ہاتھ سے کھونے کا موقعہ اب نہیں رہا۔ آج کل ہمارے روپیہ کی قدر جنگ سے پہلے کے، یا زیادہ سے زیادہ [illegible] آنے کے برابر رہ گئی ہے۔ افراطِ زر کے اثرات پیدا ہو چلے ہیں۔ ان پر قابو پانا حکومت کا فرض ہے۔

امتیاز حسین خاں
لکچرار جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن

قابل مطالعہ کتابیں

اقبال کا مطالعہ:۔ از سید نذیر نیازی۔ اس مجموعہ میں اقبال کی شاعری، فلسفہ اور آخری ایام زندگی پر چار مضمون شامل ہیں جن سے علامہ کی عظمت کا بخوبی علم ہو جاتا ہے
قیمت عہ مجلد ۶ عہ

محشر خیال:۔ سجاد علی انصاری مرحوم کے مجموعہ مضامین کا دوسرا ایڈیشن۔ اس مرتبہ مرحوم کا ڈراما "روز جزا" بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ کاغذ طباعت عمدہ۔ قیمت مجلد تلے، عہ غیر مجلد ۶ عہ

خلافت و سلطنت:۔ از ڈاکٹر امیر حسن۔ بغداد کی خلافت عباسیہ سے لے کر تاتاریوں کے ہاتھوں خوارزم شاہ اور بغداد کی تباہی تک کے مفصل حالات و نتائج۔ قیمت عہ

حیات اجمل:۔ حکیم محمد اجمل خاں مرحوم کی سوانح حیات۔ اس میں مرحوم کے اخلاق و عادات علمی و طبی حالات، مطب اور سفروں کے واقعات درج ہیں۔ قیمت ۶ عہ

مصطفیٰ کمال اور تاریخ ترکی:۔ از محمد اظہر علی علوی۔ ایم۔ ایل اے۔ یہ کتاب آپ کو بتائیگی کہ کس طرح قوم مرکز زندہ ہوتی ہے۔ ترکوں کی دستوری طریقہ کی سلطنت کا با تفصیل تذکرہ ہے۔ کہیں کہیں ان ممالک و مقامات اور غیر قوموں کا حال بھی آگیا ہے جن سے ترکوں کو سابقہ پڑا۔ قیمت غیر مجلد عہ

متاع اقبال:۔ مصنفہ ابو ظفر عبدالواحد ایم اے۔ موصوف نے اقبال کی شاعری اور اسکے پس منظر، ان کے ذہنی ارتقا اور شاعرانہ فلسفے پر ایک اجمالی بحث کی ہے۔ قیمت عہ

رجسٹرڈ ایل نمبر ۱۸۹۲

جگ بیتی حصہ اول

پنڈت جواہر لال نہرو کی کتاب Glimpses of World History کا سلیس ترجمہ مصنف نے دنیا کے تمام ممالک اور اقوام کی تاریخ سنین و سلاطین کی فہرست اور مختلف حکمراں خاندانوں کے عروج و زوال سے قطع نظر کرکے افراد کے ذہنی اور سماجی ارتقار جماعتی نظام کی تنظیم، تہذیب و تمدن کی تدوین اور علوم و فنون کی ترویج کی مختلف زمانوں کے لحاظ سے یکجائی تصویر کھینچی ہے۔ قیمت مجلد ۳؎

سیر کائنات

یہ کتاب نامور سائنس داں، سر جیمس جینس کی مشہور و معروف کتاب Through Space & Time کا ترجمہ ہے جس میں زمین ہوا، آسمان، ماہتاب، آفتاب، سیاروں اور ستاروں وغیرہ پر نہایت بسط و تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ طرز تحریر نہایت دلچسپ اور سادہ ہے اور ترجمہ میں اصطلاحات سے حتی الوسع اجتناب کیا گیا ہے اس لئے خواص کے علاوہ عوام بھی بغیر کسی دقت کے اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ لتیھو کے متعدد نقشوں اور تصویروں کے علاوہ ہاف ٹون کی ۲۷ تصویریں بھی شامل ہیں۔ قیمت عہ

مکتبہ جامعہ
دہلی، نئی دہلی، لکھنؤ، بمبئی

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع پریس دہلی

جامعہ

مکتبہ جامعہ دہلی

جامعہ

زیر ادارت: ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ایم۔ اے

جلد ۳۸، نمبر ۳ | بابتہ ماہ مارچ ۱۹۴۳ء | چندہ سالانہ للعہ فی پرچہ آٹھ آنہ

فہرست مضامین

(پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) محبوب المطابع دہلی)

اُردو اکادمی

"جامعہ ملیہ دہلی کی اردو اکادمی نے علمی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ عام ضرورتوں کی طرف زیادہ توجہ کی ہو اور علاوہ علمی کتابوں کے عام دلچسپی کی کتابیں اور بچوں کے کام کی کتابیں اچھی تعداد میں سلیقے سے شایع کی ہیں اور اس طرح اُردو کے ادبی خزانے میں مفید اضافہ کیا ہو۔"

(ماخوذ از خطبۂ صدارت آل انڈیا اورینٹیل کانفرنس شعبۂ اردو ۱۹۴۱ء)

آپ بھی اس اکادمی کے ممبر ہو کر اس کی مطبوعات سے فائدہ اُٹھائیے قواعد و ضوابط ایک کارڈ لکھ کر طلب کیجیے۔

ہمارے یہاں سے ہندوستان کے دیگر اداروں کی کتابیں بھی اپنی اصلی قیمت پر ملتی ہیں۔

ایک گمنام شاعر

شیخ سعدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں :-

نام نکو رفتگاں ضائع مکن		تا بماند نام نیکت برقرار

مری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس شعر میں "رفتگاں" کی تخصیص کیوں کی گئی۔ ہاں! شاید اس وجہ سے ہو کہ ہم مشرقی لوگ "مردہ پرست" ہیں۔ زندوں کی قدر نہیں کرتے۔ مردوں کو بانس پر چڑھا دیتے ہیں۔ غالب کو بھی یہی شکوہ تھا۔ شعر کہتے تھے۔ کوئی سنتا نہ تھا۔ سر پیٹ کر فرماتے ہیں۔

تو اے کہ محو سخن گستران پیشینی		مباش منکر غالب کہ در زمانہ تست

کچھ یہی سبب ہو کہ علی شبیر صاحب شبیر اپنی قلم سے دریا بہاتے تھے لیکن وہ سارے کا سارا پانی ساحل میں جذب ہو کر رہ جاتا تھا۔ دریائے فکر میں غوطے لگا کر دُر شاہوار نکال لاتے تھے لیکن وہ سب کے سب یا تو سیپیوں کے ساتھ کوڑے کرکٹ میں پھینک دیے جاتے تھے یا پس کر سرمہ بنا لیے جاتے تھے۔ اپنے گلستانِ خیال سے گل فردوس چن کر لاتے تھے لیکن وہ یا تو یونہی پڑے پڑے مرجھا جاتے تھے یا کسی قبر پر چڑھانے کے کام آتے تھے۔

آج کل ایسے شاعروں کا کلام جو خوش مذاقی کے رنگ میں کچھ لکھتے ہیں بڑی دھوم دھام سے شائع ہوتا اور بڑے شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ میں نے خود اس قسم کے کئی تذکرے پڑھے مگر مجھے دیکھ کر تعجب ہوا کہ شبیر جیسے خوش کلام شاعر کا اس میں ذکر تک نہیں اور لطف یہ ہے کہ ان کا کلام چھپ چکا اور ہزاروں کی تعداد میں بک چکا ہے۔ ہے یہ کہ بڑا ہونا ایک چیز ہے اور بڑا بن جانا یا بنا دیا جانا دوسری چیز۔ پہلی صورت خدا کی دین ہے اور دوسری شکل دوستوں اور یاروں کا پروپیگنڈا۔ آزاد نہ ہوتے تو ہندوستان میں انشا کا نام تک کوئی نہ جانتا۔ لیجیے میں آپ لوگوں سے علی شبیر صاحب کا تعارف کراتا ہوں۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ میں کیسا اور میری سفارش کیا۔ اگر کلام آپ کو پسند آئے تو آپ بھی میری ہاں میں ہاں ملائیے نہیں تو مجھ کو اوران کو

دونوں کو بھول جائیے اور سمجھ لیجیے کہ مضمون لکھ کر خواہ مخواہ اپنا اور ہمارا وقت ضائع کیا۔

تو خیر۔ ان کا نام علی شبیر تھا تخلص شبیر کرتے تھے۔ آگرہ کے رہنے والے تھے۔ گھربار چھوڑ حیدر آباد میں آ بسے تھے کہیں بھاگی تھے۔ ایک تو آگرہ کی زمین کے نذر ہوئے۔ دوسرے کو حیدر آباد کی مٹی کھا گئی۔ اور انھوں نے بھی آخری گھر یہیں بسایا۔

سیدوں کے خاندان سے تھے۔ بلحاظ اپنی سسرال کے شیعہ تھے۔ بلحاظ اپنے عقاید کے سنی۔ بلحاظ اپنے خیالات کے صوفی۔ بلحاظ اپنی تحریر کے وہابی اور بلحاظ اپنی تقریر کے کچھ بھی نہیں۔ جس طرح مذہب نہ ولی اللذی نہ اُن اللذی تھا۔ اسی طرح دنیاوی کاموں میں بھی طبیعت کو قرار نہ تھا۔ بہروپیہ بننے میں ان کو شرم نہیں تھی۔ ایکٹر بننے میں ان کو دریغ نہیں تھا۔ بذل گوئی میں ان کو باک نہیں تھا کسی کو بنانے میں یہ نہیں چوکتے تھے۔ ملاحیاں اڑانے میں یہ نہیں رُکتے تھے۔ غرض عجیب شگفتہ طبیعت لے کر آئے تھے۔ مگر آخر آخر میں بال بچوں کے جھگڑوں نے ذرا انجر پنجر ڈھیلے کر دیے تھے۔ مدتوں لنڈورے پھرا کیے۔ عمر سے اتر کر شادی کی، بال بچوں نے دماغ پریشان کر دیا۔ رفتہ رفتہ خودداری کو چھوڑنا، آزادی سے منھ موڑنا اور نوکری کی ذلتوں کو رونا پڑا۔ اپنی ہائی دوسروں پر گنوائی۔ یار کے پردے میں خود اپنی بپتا اس طرح سناتے ہیں۔

اک مرے دوست نہایت ہی تھے آزاد منش　　ناک پر بیٹھنے دیتے نہ تھے مکھی زنہار

سہہ نہ سکتے تھے ذرا بات کسی افسر کی　　مارنے مرنے پہ ہو جاتے تھے فوراً تیار

جس جگہ نوکری کرتے تھے وہاں سے آخر　　تھوڑے ہی دن میں نکل جاتے تھے کر کے تکرار

الغرض تفرقہ تقدیر نے ڈالا ایسا　　یہاں دکھن میں رہے ہم وہ گئے گنگا پار

دس برس بعد جو پھر ان سے ملاقات ہوئی　　اور ہی کچھ نظر آئے مجھے ان کے اطوار

میں نے پوچھا کہو کس طرح سے گزری اب تک　　اس قدر عرصہ میں کس کس سے کی جوتی بیزار

اتنی مدت میں کہو کتنے سررشتے دیکھے　　آخر اب کون سے دفتر میں لیا تم نے قرار

تم کسی شخص کو سرکار نہ کہتے تھے کبھی　　اب بھی کیا اس کو سمجھتے ہو وہی ذلت عار

بھر کے اک آہ کہا میری کہانی نہ سنو　　عرض کیا تم سے کروں اپنی میں اب حال زار

آئی شامت تو یہاں آن کے شادی کرلی
اس پہ طرہ یہ ہوا ہوگئے بچے دو چار

خانہ داری کے بکھیڑوں نے پھرایا گھبرا
رات دن پیچھا نہیں چھوڑتے گھر کے انکار

ڈاکٹر خانہ سے ملتی نہیں فرصت مجھکو
لڑکی بیمار تھی کل آج ہے لڑکا بیمار

جب تلک تھا تن تنہا مجھے کچھ فکر نہ تھی
پیٹ کا پالنا اپنے نہ تھا کچھ بھی دشوار

نوکری چھوڑنا ایک کھیل نظر آتا تھا
فکر ہوتی نہ تھی، رہتا تھا مہینوں بیکار

اب اگر نوکری چھوڑوں تو قیامت ہوجائے
پاس کوڑی نہیں، بیکار کو دے کون اُدھار

ایک سو بیس مجھے ملتے ہیں عدالت میں ہوں میں
نوکری اس کو کہوں یا کہ خدا کی پھٹکار

سخت افلاس سے بس اس میں بسر ہوتی ہے
بیس دن بعد سے کرتا ہوں میں پلی کا شمار

چھ برس گزرے کہ داتوں سے لے پکڑے ہوں
سنتا رہتا ہوں ہر اک چھوٹے بڑے کی پھٹکار

حیف صد حیف زمانہ نے مرا بل توڑا
نہ وہ صورت رہی باقی، نہ وہ سیرت نہ شعار

اب تو یہ حال ہے شبیر کہ چپراسی بھی
مجھ کو آواز اگر دے تو کہوں "جی سرکار"

خیر غنیمت ہے کہ دونوں لڑکے ایسے نکل آئے تھے کہ ذرا آنسو پونچھ گئے تھے۔ ورنہ شاید تو دیوانے ہوجاتے۔ انکی صورت دیکھ کر ہرگز کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ اس بلا کے آدمی ہیں۔ چہرہ پر بجائے تیزی کے نہایت ٹھوٹھ پنا برستا تھا۔ موٹا موٹا نقشہ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، پھلکی جیسی ناک۔ اس ناک پر عینک عجب بہار دیتی تھی۔ پڑھنے میں عینک کچھ کام دیتی ہو تو دیتی ہو لیکن ہم نے تو ہمیشہ اس کو ناک کے نکڑ پر ہی رکھا دیکھا۔ جب باتیں کرتے تھے تو عینک کے اوپر سے جھانکتے رہتے تھے۔ گھڑی گھڑی اوپر کو اٹھاتے تھے مگر وہ ناک کے ڈھلاؤ سے پھسل کر پھر پھننگ پر آجاتی تھی۔ جسم بھاری تھا اس لیے ذرا کھنے ہاتھی کی طرح جھول کر چلتے تھے۔ ایک شہ چھڑی یا موٹی بانس کی لکڑی ہاتھ میں رہتی تھی۔ کام پڑجائے تو شاید اس کے چلانے میں بھی نہ چوکتے۔ مگر خدا بچائے ان کی زبان کی مار لکڑی سے کہیں زیادہ تھی۔

یہ تو ان کی ظاہری حالت ہوئی۔ اب ان کی طبیعت کی تیزی اور براقی ملاحظہ ہو۔ شعر کہیں

نظم لکھیں، تاریخ میں ان کو دخل، مذہب میں ان کو دخل کبھی انگریزی نظموں کو اردو میں نظم کر رہے ہیں۔ اور وہ بھی اس طرح کہ ایک لفظ نہ چھوٹے اور محاورہ میں پوری اتریں کبھی برکہارٹ کے سفرنامہ کا ترجمہ کر رہے ہیں اور اس پر ایسے ایسے نوٹ لکھ رہے ہیں کہ دیکھ کر طبیعت لوٹ ہو جائے کبھی ابن سعود کا خلعت زیب تن کیے اور سلطان حجاز کی سند ہاتھ میں لیے وہابی سلطنت کی خوبیوں کا پرچار کر رہے ہیں لیکن سب سے مزیدار ان کی دو چیزیں تھیں۔ ایک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نعتیں اور مدینہ منورہ کی گلیوں میں پھرنے کا شوق، اور دوسرے زمانہ کی حالت کا خوش مذاقی میں نقشہ۔ میں پہلے ان کی خوش مذاقی کے کچھ اشعار لکھتا ہوں آپ خود دیکھیں گے کہ اکبر کے بعد اگر اس رنگ میں کوئی لکھنے والا ہی تو وہ صرف یہی حضرت ہیں۔ اب یہ دوسری بات ہی کہ ایک بڑھ کر اردو لٹریچر کا درخشاں ستارہ ہوگیا اور یہ اس طرح گوشۂ گمنامی میں پڑے رہے اور مر گئے۔ اکبر کی کتابیں چھپیں اور تمام ہندوستان میں پھیل گئیں۔ ان کی کتابیں چھپیں مگر یاروں کے حلقہ میں تھوڑے دن رہ کر ردی کی ٹوکری کی نذر ہوگئیں۔ سچ ہی۔

طالع شہرت رسوائی مجنوں بیش است درنہ طشت من و اُو ہر دو زیک بام افتاد

سرکاری ملازمت میں دو طرح کے آدمی ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو خوب کماتے اور خوب مزے اڑاتے ہیں دوسرے وہ جو ہائے مفلسی ہائے مفلسی ہی کرتے کرتے ختم ہو جاتے ہیں۔ پہلی شق میں پہلے زمانہ کے تحصیلدار سب سے اول نمبر تھے، اور دوسری فہرست میں مولوی علی شبیر صاحب۔ دیکھیے ان دونوں صورتوں کو کن خوبصورت الفاظ میں ادا کیا ہی ؎

یہ مانا ہاتھ میں خنجر لیے حکام بیٹھے ہیں مگر جیبیں بجاتے سیٹھ دولت رام بیٹھے ہیں

خدا کے واسطے راجہ ذرا ہم سے الگ بیٹھو کہ ہم تو پہلے ہی ہو کر بہت بدنام بیٹھے ہیں

عجب ایک کیمیا ہی خدمت تحصیلداری بھی مناتے خیر اس کی ہم تو صبح و شام بیٹھے ہیں

حساب اب کچھ نہ پوچھو تم مکان و باغ و موٹر کا کہ ان دو سو میں ہم بھی کر کے کیا کیا کام بیٹھے ہیں

تحصیل کی کچہری کا ایسا نقشہ کھینچا ہی کہ سبحان اللہ، جو ہی اپنا حق طلب کر رہا ہی۔ چپراسی اپنا حق مانگ رہے ہیں اہلکار اپنے حق کے طالب ہیں۔ غرض ساری کچہری حقداروں سے بھری پڑی ہی۔ لکھتے ہیں۔

میں نے سرِ راہ کل یہ دیکھا منظر
حق حق کی صدا سے گونجتا ہو ایک گھر
میں سمجھا فقیر کا ہو تکیہ شاید
پوچھا تو وہ تحصیل کا نکلا دفتر

تحصیل کا رنگ دیکھ چکے۔ اب رجسٹری کے محکمہ کو ملاحظہ کیجیے۔ کیا صحیح واقعات بیان کیے ہیں۔ دیکھتے سب ہیں مگر لکھتا کوئی نہیں۔

اس محکمے کے نوکر ہر ایک کے ہیں پڑوسی
بائع کا ہو جو کوئی تو کوئی مشتری کا
بن جائے گا تماشا سا آ گیا آنے جس کو دیدو
ہو شہر بھر سے واقف عملہ رجسٹری کا

کبھی کسی کاغذ کی رجسٹری کرانے جاؤ تو ان اشعار کا مزا آئے۔

اب عام دفتر والوں کی حالت دیکھیے

ہر طرح سے چونکہ اپنا دعویٰ حق ہو
ناحق کا بھی نام ہم نے رکھا حق ہو
ہم ہیں غرض اہلِ دفتر اصلی حقدار
حق پہنچے کسی کو سب میں اپنا حق ہو

واقعہ ہو یا نہیں۔ کوئی جیتے کوئی ہارے۔ دفتر والوں کے دونوں ہیٹے۔

عہدہ داروں کی جو حالت ہو وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ان کی ترقی کے زینے غرور کی سیڑھی ہوتے ہیں۔ جتنے اونچے ہوتے جاتے ہیں اتنا ہی ان کا سر پھرتا جاتا ہو۔ کوئی عالی ظرف ہوگا جو بلندی پر پہنچ کر اپنے پہلے ساتھیوں کو پہچان سکے نہیں تو ہوتا یہی ہو کہ ترقی پائی اور اپنی نئی دنیا بسائی۔

چڑھ گئے ہیں اک بڑے مینار پر قسمت سے ہم
کچھ نظر آتی نہیں نیچے کی حالت صاف صاف
ہم کو تم معذور سمجھو گر نہ پہچانیں تمھیں
اب نہیں دکھلائی دیتی ہم کو صورت صاف صاف

اس بلندی سے اگر لڑھکیں تو پھر سوجھے ہمیں
سب کی رنگت صاف اک اک ہیئت صاف صاف

اور صاف بات یہ ہو کہ ارماست کر براست ہم خود خوشامدیں کرکے ان لوگوں کے دماغ خراب کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میاں کیا کیا جائے نوکری ہو۔

پڑے پانی میں بھی آ جائیں گے بھاگے بھاگے
بے ضرورت بھی اگر ہم کو پکاریں سرکار

ہوں گے کل تک بھی پھر یرے نہ ہمارے کپڑے — زیب تن سوٹ کریں بال سنواریں سرکار
ہم بھی کیچڑ میں چلے جائیں گے گرتے پڑتے — گاڑی دروازے پہ حاضر ہو سدھاریں سرکار

اسی نوکری کا رونا ایک دوسری جگہ رویا ہے۔ مرے جاتے ہیں مگر نوکری چھوڑنے کا نام نہیں لیتے۔

اب امتحاں کیا دوں کہ حکومت کا نہیں شوق — خامی تو یہ ہو پر اس خامی ہی میں خوش ہوں
ہے منصفی ایک چیز مگر مجھ سے نہ ہوگی — میں دفتر خدام گرامی ہی میں خوش ہوں
آزاد نہ کیجیے مجھے اب دے کے وظیفہ — سرکار میں اس قید غلامی ہی میں خوش ہوں

سرکاری کام کے بعد یہ نہیں کہ دفتر گئے کام کیا چلے آئے۔ اس کے ساتھ بنگلہ کے جھگڑوں کی بھی قید لگی ہوئی ہے۔ دیکھنا کس خوبصورتی سے اس مضمون کو ادا کیا ہے۔

مانا کہ ہو تم کام میں اپنے بہت ہشیار — لیکن کبھی سرکار کو صورت بھی دکھاؤ
صورت سے وہ اندازہ سیرت بھی کرینگے — لایق ہو مگر اپنی لیاقت تو جتاؤ
وہ دن گئے جب ملتی تھی گھر بیٹھے ترقی — اب تم در حکام کے چکر بھی لگاؤ
اخلاق الٰہی کے مقلد نہیں حاکم — بنگلہ ہے یہ مسجد نہیں جاؤ کہ نہ جاؤ

مگر مشکل یہ ہو کہ جاؤ تو سرکار سے ملنا مشکل۔ سب سے پہلے چپراسی اور بیرا سے ٹکر ہوتی ہے۔

کیوں نہ اس مغرور جاہل کو کہیں شداد وقت — جس کے در پر ہوں معین ایسے دربان شدید
جو نہ پہنچائیں کسی کا اس کمینہ تک پیام — جو نہ لاکر دیں کسی کے رقعہ و خط کی رسید
آتی ہو صادق سگ دربان پہ جس کے یہ مثل — آستینش ایں گرفت و آں گریبانش درید

اگر خدا خدا کرکے ان دربانوں سے پیچھا چھوٹا اور اندر اطلاع ہوئی تو اس اطلاع کا جواب سنئیے۔

بعض حکام کی عادت ہو کہ جب ان سے کوئی — ملنے جاتا ہو تو فرماتے ہیں "ہم کام میں ہیں"
جمعہ کے جمعہ ہوا کرتی ہو ان کی اصلاح — اور دن جاؤ تو کہہ دیتے ہیں "حمام میں ہیں"
الغرض ان کو ملاقات کی فرصت ہی نہیں — وہ گرفتار عجب گردش ایام میں ہیں
مقبرے پر بھی جب ان کے کوئی دستک دیگا — تو یہ فرمائیں گے "سرکار ابھی آرام میں ہیں"

ہو یہ کہ غریبوں کی ہر طرح مشکل ہو واقعی سچ کہا ہو کہ

جن کے گھر دفتر کے پاس اور آتا جانا بانڈ میں — موٹریں ان کو عطا کیں دو پہ گاڑی باندھ دی
دور گھر، تنخواہ تھوڑی، حاضری کی قید سخت — مفلسوں کی یوں اگاڑی اور پچھاڑی باندھ دی

یہ تو ملازمت رنگ ہوا۔ اب امیروں کو دیکھیے تو ان کی عجب حالت ہو۔ جو بچارے غریب شومئی قسمت سے ان کے دست نگر ہو گئے ہیں ان کا خدا ہی مالک ہو۔ ایک قطعہ میں یہ رنگ بھی دکھا گئے ہیں فرماتے ہیں ؎

امیرو! تم کو برا ہم کہیں خدا نہ کرے — بگاڑ اپنے خدا سے کریں خدا نہ کرے
خطا ہماری ہمارا گنہ ہمارا قصور — تمھارے عدل پہ تہمت دھریں خدا نہ کرے
جو تم کہو گے ملا دیں گے ہاں میں ہاں ہم بھی — تمھاری بات کو ہم کاٹ دیں خدا نہ کرے
رہیں گے ظلِ ہمایوں میں ٹھوکریں کھاتے — تمھارے سایہ سے بچ کر چلیں خدا نہ کرے
تم ان کو آگ میں جھونکو غلام حاضر ہیں — تمھارے دھوپ میں دشمن پھریں خدا نہ کرے
ہماری ٹانگیں جو ٹوٹیں تو ٹوٹیں جوتی سے — تمھارے گھوڑوں کے پانو دکھیں خدا نہ کرے

ان عہدہ داروں اور امیروں کو خواہ کچھ بھی کہا جائے مگر یہ ماننا پڑے گا کہ غرض مند اُن کو اتنا دق کرتے ہیں کہ وہ بھی جان سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ یک انار صد بیمار کی کیفیت ہوتی ہو کسی کو یونہی ٹال دیتے ہیں کسی سے آئندہ کا وعدہ کرکے چھٹکارا پاتے ہیں کسی سے جھوٹ بول کر گلو خلاصی کرتے ہیں۔ اس واقعہ کو مذاقیہ پہلو میں اس طرح ادا کیا ہو۔

گھیرتے ہیں مجھ کو آکر رات دن اہلِ غرض — پھنس گیا ہوں میں خداوندا عجب جنجال میں
جھوٹ بن تسکین ان لوگوں کو ہوتی ہی نہیں — خوش یہ ہوتے ہیں بناوٹ ہو اگر اقوال میں
جب یہ دیکھا سچ سے کوئی مطمئن ہوتا نہیں — جھوٹ سے لینے لگا ہوں کام قیل و قال میں
مصلحت آمیز اب ہوتی ہو میری گفتگو — چکنی چپڑی باتوں سے دیتا ہوں سب کو ٹال میں
دھوکے میں رکھتا ہوں برسوں سچ اگر کہتا نہیں — ڈر ہو امیدوں کو ان کی کر نہ دوں پامال میں
چونکہ نیت میں مرے ہرگز نہیں کوئی فساد — بلکہ منظور ان کی دلجوئی ہو بس ہر حال میں

درگزر فرمائے گا تو اس سے مجھ کو ہے یقیں | فرق جو کچھ ہو مرے اقوال اور افعال میں
ان کی خاطر جس قدر دن رات میں بکتا ہوں جھوٹ | لکھیو یارب تو انھیں کے نامۂ اعمال میں

اس سلسلہ میں ایک پرانے گھاگ عہدہ دار کی نصیحت بھی سن لیجیے۔ کام آئے گی معلوم ہوتا ہو کہ یہ حضرت اہلکاری کی خدمت سے ترقی کر کے عہدہ داری کے درجہ پر پہنچے ہیں۔ اور اپنے تجربات کی بنا پر کسی اپنے چہیتے اہلکار کو ملازمت کے نشیب و فراز سمجھا رہے ہیں۔

کرتے ہیں نصیحت مجھے سرکار ہمیشہ | تنخواہ سے تم رکھو سروکار ہمیشہ
جھگڑے کبھی دفتر کے تو فیصل ہی نہ ہونگے | کیوں ڈالتے ہو اپنے پہ تم بار ہمیشہ
ہونے کا ہو جو کام وہ ہوتا ہی رہے گا | آپس میں عبث کرتے ہو تکرار ہمیشہ
ہو باپ بھی افسر تو بھروسہ نہ کرو تم | حربوں سے رہو اس کے خبردار ہمیشہ
شاگرد ہو حاکم تو نہ کہنا اسے شاگرد | ہو یار تو سمجھو نہ اسے یار ہمیشہ
جا جا کے امیروں کو دو اس طرح دعائیں | "قایم رہے یہ آپ کا دربار ہمیشہ"
سمجھا کریں حکام تمھیں تا کہ مقطع | لازم ہو کہ رکھا کرو دستار[1] ہمیشہ
جب سامنے جاؤ تو کبھی آپ نہ بولو | تقصیر ہمیشہ کہو، سرکار[2] ہمیشہ
دو گالیاں دلمیں یہ کہو منھ سے نہ اک حرف | سنتے رہو حکام کی دھتکار ہمیشہ
جب کبھی رخصت تو کرو عذر علالت | اپنے کو بنائے رہو بیمار ہمیشہ
روتے رہو اک ہی کہ کام کی کثرت | رہتا ہوں مصیبت میں گرفتار ہمیشہ
رکھا کرو پھیلائے ہوئے میز پہ کاغذ | مثلوں کا لگائے رہو انبار ہمیشہ
ہاں کا کرو دینگیں کہ میں ایسا ہوں میں ایسا | ظاہر کرو اپنے تئیں ہشیار ہمیشہ
پابند رہو وقت کے ان بیچ میں غائب | ہو سکتے ہو اک روز دو بار ہمیشہ

---

[1] حیدرآبادی پگڑی کو دستار کہتے ہیں اور اس کے لیے بجائے پہننے کے رکھنا آتا ہو۔

[2] یہ بہت پیارا حیدرآبادی لفظ ہو حضور اور سرکار کے معنوں میں بولا جاتا ہو۔

دفتر میں کبھی اہلِ غرض سے نہ ملو تم　　　گھر پہ کرو اس قسم کا بیوپار ہمیشہ
تحفہ کوئی دیدے تو اسے چپکے سے لیلو　　　اِں نقدی سے کرتے رہو انکار ہمیشہ
القصہ چلو میری نصیحت پہ جو شبیر　　　تم خوش رہو، خوش تم سے ہو سرکار ہمیشہ

اب میں اس سلسلہ وار مضمون کو چھوڑ کر متفرق مضامین پر علی شبیر صاحب کے اشعار پیش کرتا ہوں اور سب سے پہلے ان کے مذہبی خیالات لیتا ہوں۔ انھوں نے مذاق ہی مذاق میں یہ بیان کیا ہو کہ حضرت سید الشہدؑ کے واقعہ کو لوگوں نے کیا سے کیا کر دیا ہو۔ واقعہ کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہو۔ مگر راویوں اور مرثیہ نویسوں نے دماغ سے اتار اتار کر وہ باتیں بیان کی ہیں کہ واقعہ ایک قصہ ہو گیا ہو۔

کارنامہ تھا یزیدِ ردسیہ کا ناتمام　　　راویوں نے درج لیکن کل مراتب کر دیے
پھر بھی کچھ خانے معرّا رہ گئے تھے جابجا　　　مرثیے لکھ لکھ کے ہم نے وہ بھی آخر بھر دیے

یہاں یہ بتانے دیتا ہوں کہ حیدرآباد میں سروس بک کو کارنامہ کہتے ہیں اور ممالک متحدہ کی پولیس میں اس کا نام اعمالنامہ ہو

آج کل اردو زبان میں ناول جس طرح حشرات الارض کی طرح نکل رہے ہیں ان کا اس خوبی سے خاکہ اڑایا ہو کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ واقعہ بھی یہ ہو کہ ان لکھنے والوں کو اس سے غرض نہیں ہوتی کہ ہماری یہ غلط سلط تحریریں ہماری قوم کو کس طرح بدنام کریں گی اور اس سے ہماری قوم کے عادات و اطوار پر کیا اثر پڑے گا۔ فرماتے ہیں

ترقی علم نے کی یاں تک اس زمانے میں　　　کہ دیکھے جاتے ہیں ناول زنانخانے میں
برا نہ ماننا ناول نویس صاحب تم　　　جو فقرہ ہم کوئی کہہ بیٹھیں دوستانے میں
بنانا جانتے ہو بات کا بتنگڑ خوب　　　کمال رکھتے ہو تم حاشیہ چڑھانے میں
جو پڑھ کے اس کو نہ بہکے قصور ہو اس کا　　　بھرا جو تم نے تو جادو ہر اک فسانے میں
حرم سرا سے بہو بیٹیوں کو تا بازار　　　کیا نہ تم نے تامل گھسیٹ لانے میں
شریف زادیوں پر تم نے باندھے وہ طوفان　　　سنے نہ دیکھے جو اب تک کسی گھرانے میں
اٹھا کے لاتے تھے لوگ اگلے تاقت سے پریاں　　　نہ چوکے پردہ نشینوں کو تم اڑانے میں

تمھارے علم ولیاقت کے جایئے صدقے دکھایا خوب ہنرمال وزر کمانے میں
تمھاری قوم جو رسوا ہوئی تو جوتی سے تمھارا ایک گیا ناول تو چار آنے میں

آج کل کے فیشن کے دلدادہ لوگوں کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ ذرا قافیے اور ردیف ملاحظہ ہوں۔

آج کل تقلید انگریزی تو ہم پر فرض ہے گرچہ اس میں منزل اپنی ہوتی ہو کھوٹی ضرور
سختی کے مارے مسوڑے خواہ چھل ہی کیوں نہ جائیں کھائیں گے ہر روز ہم سوکھی ڈبل روٹی ضرور
شوربے کے چھینٹوں سے افشاں منہ پہ ہوتی ہو تو ہو ہم چھری کانٹے سے کاٹیں گے مگر بوٹی ضرور
اس کی ٹانگوں پر بلا سے مکھیاں بھنکا کریں کاٹ کر کر دینگے ہم گھوڑے کی دُم چھوٹی ضرور

ایک نظم میں راستہ چلنے والوں کا فوٹو کھینچا ہے اور اس میں اہلکاروں کے متعلق جو قطعہ لکھا ہے وہ لاجواب ہے اس نظم کو لے کر ذرا سڑک کے کنارے کھڑے ہو جایئے اور لوگوں کی حالت دیکھ دیکھ کر اس سے مقابلہ کیجئے اس وقت مزا آئے گا۔

اک گاڑی والے سے کسی منشی نے یہ کہا تم لوگوں کے ستم سے بہت دلفگار ہیں
تم ہانکتے ہو گاڑی سدا اس بری طرح جو زد پہ آگئے وہ تمھارے شکار ہیں
کی عرض گاڑی والے نے اس اعتراض سے ثابت ہوا کہ آپ بہت ہوشیار ہیں
حضرت ہیں صدہا قسم کے رہرو جہان میں کس کس کو ہم بچائیں کہ بے اختیار ہیں
کرتے ہیں باتیں بیچ سڑک میں کھڑے ہوئے اس قسم کے گدھے بھی کوئی دس ہزار ہیں
آواز دو تو کان پہ چلتی نہیں ہے جوں کہہ بیٹھو کچھ تو مستعد کارزار ہیں
فکر اپنے مرنے جینے کی ان کو نہیں ہے کچھ گویا کہ ان کی جان کے ہم ذمہ دار ہیں
بہرے بھی ہیں بہت سے بہت سے ہیں باولے کچھ کھاتے ہیں افیم تو کچھ بادہ خوار ہیں
معذور لنگڑے لولوں کا نمبر ہے ان کے بعد جو یہاں گھسٹتے پھرتے سر رہ گزار ہیں
بن دیکھے جو ادھر سے ادھر رستہ کاٹ کر مرتے ہیں آکے ایسے بہت نابکار ہیں
بچوں کو چھوڑ دیتے ہیں سڑکوں پہ کھیلنے ان شہریوں میں ایسے بھی بھلے گنوار ہیں

اس خوف سے کہ دیر پہنچنے میں نہ ہو جائے	ق	چلتے عجب ڈھنگ سے بعض اہلکار ہیں
بند آنکھیں، ہوش باختہ، سر جھاڑ منھ پہاڑ	دفتر کو جاتے جوں شتر بے مہار ہیں
رہتی ہو جن کی ناک پہ عینک چڑھی ہوئی	اس وضع کے بھی کوتہ نظر بے شمار ہیں
القصہ آپ ہانکیئے گاڑی تو ہو خبر	ہو سوجھتا جو ایک تو اندھے ہزار ہیں

انشا کا رنگ دیکھیے کس خوبی سے حلوائیوں کی زبان استعمال کی ہو اور کیا اچھی طرح تلازمہ برت گئے ہیں خود ہی اس نظم کے لکھنے کی وجہ بیان کی ہو واقعہ سمجھنے کے لیے میں بھی اس کو نقل کیے دیتا ہوں۔

"سنہ ۱۹۱۰ء میں نیاز مند نے بعض احباب کی فرمایش سے ایک مسجد کے خائن متولی کے واقعات زندگی مشمول ترجیع بند میں نظم کیے تھے یہ نظم اس کا ایک بند ہو متولی مذکور پر مسلمانوں نے حساب فہمی کا دعوےٰ دائر کیا تھا۔ اس کے متعلق مسجد کی دوکان کے کرایہ دار ہر پرشاد حلوائی کا خیال اس نظم میں ظاہر کیا گیا ہو اور خصوصیت کے ساتھ حلوائی کا تلازمہ و لہجہ برتا گیا ہو۔ بظاہر الفاظ و محاورات مستعملہ زبان بھاشا کے معلوم ہوتے ہیں مگر وہ اردو میں رائج ہیں۔ اس قسم کے بعض الفاظ کی تشریح یہ ہو۔

کھوب = خوب، جے = یہ، ساد = سواد (مزا)، جے ہی = یہ ہی، میٹھا = فائدہ، مہجد = مسجد، کھاتر = خاطر، پھساد = فساد، آجا بیگا = آجائیگا، سیکھ جی = شیخ جی، ریٹڑی = ریوڑی "

یہ خبر سن کر کہ یہ ابن زیاد	مال مسجد کھا گیا حد سے زیاد
بولا ہر پرشاد حلوائی کہ کھوب	پڑ گیا تھا جے میاں جی کو ساد
جے ہی تو میٹھا تھا مہجد کا انھیں	اسی کھاتر کرتے تھے دنگا پھساد
اب تلک تو ان کی پانچوں گھی میں تھیں	اب چھٹی کا دودھ آجا بیگا یاد
سیکھ جی آکر پھنسے ہیں دیر میں	اب پڑے ہیں ریٹڑی کے پھیر میں

اب ان کی دو غزلیں لکھ کر مضمون ختم کرتا ہوں۔ غزلیں بھی مذاقیہ لیتا ہوں تاکہ ان کی طبیعت کا کم از کم ایک رنگ تو اچھی طرح معلوم ہو جائے۔ اگر زمانہ نے فرصت اور دماغ نے کام دیا تو پھر دکھاؤں گا کہ ان کا متین رنگ بھی کچھ مزاحیہ رنگ سے کم نہیں ہو، ان کا قلم مذہبی مضامین پر بھی ایسا ہی چلتا ہو جیسا مذاقیہ مضامین

پر اور وہ نثر بھی ایسی ہی دلکش اور دلچسپ لکھتے ہیں جیسی نظم۔ اور اگر خدانخواستہ آپ میں سے کسی کا ان سے ملنا ہوا ہوگا تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ ان کی زبان بھی ایسی چلتی تھی جیسے ان کا قلم۔

ایک دم میں موت ہو اک میں حیات　　یہ ہے دنیا اور اس کی کائنات
جس پہ ہم پھولے تھے وہ موسم کہاں　　دن ہیں اگلے سے نہ ہی اگلی سی رات
السلام اے وقت جاہ و مال و زر　　الوداع اے دور اصل و نسل و ذات
کم نہ ہوگی رونق دنیا کبھی　　کیا کمی کوؤں کی گر باقی ہو بھات
شیخ کی جب دسترس سے دور ہو　　دولت دنیا پہ کیوں مارے نہ لات
نشۂ دولت سے اب تو مست ہو　ق　جانتے ہو فرض سارے رسمیات
پھر دکھانا تم بھی کچھ جوش و خروش　　اک ذرا بیٹی کی آ جائے برات
بڑھ گئی الحمد للہ اب خوشی　ق　کم نہیں شادی سے تقریب وفات
کون مرنے کا کسی کے غم کرے　　کھانے پہ ماریں گے سب بڑھ بڑھ کے ہات
ہو تمھیں شبیر خود واہی جب ہی　　کہتے ہو رسموں کو ناحق واہیات
کیوں نہ اس ظالم کی ساری سلطنت برباد ہو　　اہلکار ایک ایک جس کا غیرت شداد ہو
کوئی بھی اغوائے شیطانی سے بچ سکتا نہیں　　اور خصوصاً حضرت آدم کی جو اولاد ہو
دخل دینے سے پرائے کام میں حاصل ہو یہ　　جرم ناحق سر پڑے نیکی الگ برباد ہو
ہاتھ پاؤں جب تلک چلتے ہیں کچھ کر لیجیے　　پھر خدا معلوم کیا پیش آئے کیا افتاد ہو
عاصیوں پر تو بہت کچھ آپ لے دے کر چکے　　حضرت واعظ کچھ اپنے حق میں بھی ارشاد ہو
ہیچ سمجھے راز جوئی عالم اسباب کی　　جس کو اپنی ابتدا و انتہا کچھ یاد ہو
کنج تنہائی میں بھی شبیر کچھ راحت نہیں　　قید ہستی سے جو چھوٹے فکر سے آزاد ہو

میں نے اس مضمون میں بڑے بڑے قطعے جان کر ترک کر دیے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ وہ بے مزا تھے بلکہ اس لیے کہ مضمون بہت بڑھ جاتا اور آپ پڑھتے پڑھتے اکتا جاتے۔ خیر کیا ڈر ہے یار زندہ صحبت باقی پھر کبھی دیکھا جائے گا۔

مرزا فرحت اللہ بیگ

معیارِ فن

کسی تہذیب کی ترقی کا دار و مدار بڑی حد تک اس کے بنیادی تصورات پر ہوتا ہو۔ زمین، آسمان، سمندر، پہاڑ، دریا، انسان، جانور، درخت، حیات و موت، شعر و شاعری، حسن و عشق ان سب چیزوں کے متعلق کسی خاص زمانے اور ملک میں انسانوں کے جو خیالات ہوتے ہیں اُن سے اس زمانے اور ملک کی تہذیب کے متعلق کم و بیش صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہو۔ اگر یہ خیالات مبہم، غیر معقول اور موہوم ہوتے ہیں تو فوراً معلوم ہو جاتا ہو کہ جس زمانے اور ملک سے وہ تعلق رکھتے ہیں اُس کی تہذیب ابھی عالمِ طفولیت میں ہے۔ جوں جوں تہذیب ترقی کرتی جاتی ہو اس کے بنیادی تصورات واضح تر ہوتے جاتے ہیں۔ وجہ یہ ہو کہ انسان کو بہ حیثیت مجموعی جو تجربے حاصل ہوتے رہتے ہیں ان کی مدد سے وہ اپنے موجودہ خیالات کا متواتر جائزہ لیتا رہتا ہو اور یوں اس کا دماغ رفتہ رفتہ تصورات کو زیادہ صاف طریقے سے "دیکھنے" کا عادی ہو جاتا ہو یعنی اُس میں تصورات کی "تعریف" کرنے کی قابلیت ترقی کرتی جاتی ہو۔ تعریف کی بدولت تصورات کی حدیں مقرر اور مفہوم متیقن ہوتا جاتا ہو۔ یہاں تک کہ ایک ایسی منزل آتی ہو جہاں پہنچ کر تصورات اپنی نوعیت کے لحاظ سے مختلف گروہوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں مثلاً زمین، آسمان، پہاڑ، دریا وغیرہ کے متعلق ایک گروہ، جانوروں اور درختوں کے متعلق دوسرا گروہ، حیات و موت کے متعلق تیسرا گروہ، شعر و شاعری کے متعلق چوتھا گروہ علیٰ ہذا القیاس۔ ارتقائے تہذیب کی یہی منزل ابتدا ہو علوم و فنون کی بہ حیثیت علوم و فنون کے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اس ارتقائی منزل سے پہلے علوم و فنون کا سرے سے وجود ہی نہ تھا۔ ایک طرح سے ان کی ابتدا اسی وقت ہو گئی تھی جبکہ انسان نے پہلے پہل بات کرنی سیکھی۔ یہاں پر علوم و فنون کے موجودہ اور مسلمہ مفہوم سے غرض ہو۔

یہ ضروری نہیں کہ تمام علوم و فنون کی ابتدا ایک ساتھ ہی ہو جائے اور نہ یہ ضروری ہو کہ سب کی رفتارِ ترقی برابر ہو لیکن بہ حیثیت مجموعی یہ کہنا درست ہو کہ علوم کے بنیادی تصورات کی بہ نسبت فنون کے جلد اور زیادہ آسانی سے تعیین کی جا سکتی ہو اس لیے کہ علم کا ادراک دماغ کے ان حصوں میں ہوتا ہو جن کا

کام اخذ، تقابل، تجزیہ اور استنباط کرنا ہے۔ اور فن کا ادراک دماغ کے ان حصوں میں ہوتا ہے جو "محسوس کرتے ہیں" یہ ظاہر ہے کہ ایک ایسی شے اور اس کے متعلقات کی تعریف کرنی جن کا تعلق محسوس کرنے سے زیادہ اور سمجھنے سے کم ہے زیادہ مشکل کام ہے بہ نسبت ایسی شے کے جو صرف سمجھی جاسکتی ہے محسوس نہیں کی جاسکتی۔ مثلاً یہ بتانا کہ مٹھائی کیوں میٹھی ہوتی ہے آسان ہے کیونکہ ہمارے دماغ کا استنباطی حصہ اپنے تجربے کی بنا پر یہ بتاتا ہے کہ اس میں شکر پڑی ہے لیکن یہ بتانا کہ شکر کیوں میٹھی ہوتی ہے بے حد مشکل ہے۔ اس وجہ سے کہ اس معاملے میں دماغ کے استنباطی حصہ کا کام ہی نہیں۔ یہاں صرف اس حصہ کا کام ہے جو محسوس کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حساب، ہندسہ، جبر و مقابلہ، جغرافیہ، فلکیات وغیرہ کے بنیادی تصورات کم و بیش صحیح طریقے پر آج سے سینکڑوں سال پہلے متعین ہو گئے تھے۔ اور اس وقت سے لے کر آج تک ان میں جو کچھ ترقی ہوئی ہے وہ محض فروعی مسائل میں ہوئی ہے۔ برخلاف اس کے، فنون کے بعض تصورات کے متعلق مختلف اہل فن آج تک آپس میں متفق نہ ہوسکے اور بیشتر تصورات ابھی تک غیر متیقن ہیں۔ دراں حالیکہ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ فنون کی عمر علوم کی عمر سے کم ہے۔ بات یہ ہے کہ بنیادی تصورات کا واضح ہونا علوم کے لیے شرط لازمی ہے لیکن فنون کے لیے نہیں۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ فنون کے بنیادی تصورات کا واضح ہونا قطعاً غیر ضروری ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو مختلف اہل فن اپنے اپنے طریقے پر کام کرتے اور ان کی مخلوقات کی خوبیوں کو پرکھنے کا کوئی عام ذریعہ نہ ہوتا۔ ممکن ہے کہ ایک فن کار کا کمال دوسرے فن کاروں کی نگاہوں سے یا تمام فن کاروں کا کمال باقی دنیا کی نظروں سے پوشیدہ رہتا۔ جو لوگ خود اہل فن نہیں ہیں لیکن فن کو سمجھنا چاہتے ہیں وہ کیونکر اپنے مقصد میں کامیاب ہوسکتے ہیں؟ کیا محض فن کے مختلف نمونوں کو دیکھ کر وہ ان کی باریکیوں اور نزاکتوں کو سمجھ سکتے ہیں؟ فن کے اصول سیکھنے کی ضرورت کم و بیش اہل فن کو بھی ہوتی ہے لیکن ان کی رہنمائی زیادہ تر رجحان طبعی کرتا ہے۔ برخلاف فن کے "فن فہمی" آرٹ نہیں بلکہ سائنس ہے اور یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ سائنس کے لیے اصول و قواعد کا سیکھنا قطعی ناگزیر ہے۔ اہل فن کو فن فہموں کی کم از کم اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کہ فن فہموں کو اہل فن کی۔ ایلورا اور اجنٹا کے غاروں کا کمال مصوری صدیوں تک کس مپرسی کے عالم میں رہا۔ کیوں؟ اس لیے کہ ازمنۂ وسطیٰ میں اس کے سمجھنے والے کم تھے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ غالبؔ اپنے ہم عصروں سے

جھنجلا کر کہتے تھے کہ ع

گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

اور ایک وقت یہ ہو کہ بعض انتہا پسندوں کے نزدیک دیوان غالب ہندوستان کی الہامی کتابوں میں سے ہو. کیوں؟ اس لیے کہ غالب جیسے اہل فن کو مناسب فن فہم اپنی زندگی میں نہیں بلکہ مرنے کے بعد ملے. آجکل ایشیا کا کوئی اہل کمال خود ایشیا والوں کے نزدیک صف اول کا مستحق نہیں ہوتا جب تک کہ اہل یورپ نے اس کے کمال کی تصدیق نہ کر دی ہو. شاید بعض لوگوں کو سن کر تعجب ہو، مگر یہ واقعہ ہو کہ موجودہ زمانے کے ہندستانی اہل فن یعنی ٹیگور اور اقبال کو ہم نے یورپ کے جتانے سے ٹیگور اور اقبال سمجھا. ورنہ ہم انھیں بھی آنیس اور نظیر کی طرح بے جا طور پر ناقابل التفات سمجھتے رہتے. اور اگر ٹیگور اور اقبال کی بجائے انیس اور نظیر یورپ والوں سے روشناس ہو جاتے تو پھر ہم اول الذکر دونوں فنکاروں کو ناقابل التفات سمجھتے! آخر اس کی وجہ کیا ہو؟ یہی کہ یورپ والے فن فہمی میں مشاق ہیں اور ہم ان کی نقالی میں:

فن فہمی کا اصطلاحی نام تنقید ہو. اوپر عرض کیا جا چکا ہو کہ فن فہمی (یا تنقید) ایک سائنس ہو. ہر سائنس میں چند بنیادی اصول ہوتے ہیں جن کی حیثیت اس سائنس میں ویسی ہی ہوتی ہو جیسی کہ ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت کسی جاندار کے جسم میں یعنی سائنس کے باقی حصہ کی تعمیر انھیں اصولوں کی بنا پر ہوتی ہو. علم تنقید میں بھی ایسے چند اصول ہیں جن کا مقصد یہ ہو کہ فن کو سمجھنے کا کام ایک مقرر اور منضبط طریقے سے ہو، یعنی ہر اس شخص کو جس کے پاس عقل سلیم ہو اور جو فن کو سمجھنا چاہتا ہو یہ صاف صاف بتایا جا سکے کہ فن میں کم از کم کیا باتیں ہونی چاہئیں تاکہ وہ اچھا فن کہلا سکے. انھیں اصولوں کے مجموعے کا نام ہو "معیار فن".

اب دیکھنا یہ ہو کہ کسی خاص نمونۂ فن کی اچھائی یا برائی کا معیار کیا ہونا چاہیے. صرف فن ہی نہیں بلکہ ہر شے کی اچھائی یا برائی کا سب سے پہلا معیار یہ ہو کہ وہ اپنے مقصد کو پورا کرتی ہو یا نہیں. مثلاً بندوق کا مقصد ہلاک یا مجروح یا مرعوب کرنا ہو. اگر کوئی بندوق اس مقصد کو پورا نہیں کرتی تو وہ بندوق نہیں یا ہیچ و ناکارہ ہو. کپڑے کا مقصد سردی، گرمی، برسات سے بچانا اور ستر پوشی کرنا ہو گو ستر پوشی کے متعلق آجکل اختلافات بہت پیدا ہو گیا ہو خصوصاً صنف نازک کے معاملہ میں. اگر کوئی لباس اس مقصد کو پورا نہیں

کرتا تو برا ہو خواہ دیکھنے میں کتنا ہی اسمارٹ اور فیشن ایبل کیوں نہ ہو۔ حکومت کا مقصد لوگوں کی عام فلاح و بہبودی ہو۔ اگر کوئی گورنمنٹ اس مقصد کو پورا نہیں کرتی تو وہ بری ہو خواہ اس کے دفاتر کتنے ہی شاندار اور اس کے عہدہ داروں کی تنخواہیں کتنی ہی اونچی کیوں نہ ہوں۔ مقصد فن کے متعلق آج کل تین نظریے ہیں۔

۱۔ فن برائے مسرت۔

۲۔ فن برائے زندگی اور۔

۳۔ فن برائے فن۔

ان میں سے پہلے دو نظریے تو معقول معلوم ہوتے ہیں لیکن تیسرا نظریہ محض لفظی کرتب، معلوم ہوتا ہو۔ اگر آپ کسی چیز کے متعلق یہ کہیں کہ وہ خود اپنا مقصد ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یا تو اس کا کوئی مقصد ہی نہیں یا آپ اس مقصد کو نہیں سمجھے۔ یہ بات تو صحیح ہی نہیں کہ فن کا کچھ مقصد نہیں اس واسطے کہ انسان کا کوئی فعل حتیٰ کہ مجذوب کی بڑ یا دیوانے کا غیر فرمائشی قہقہہ بھی بلا مقصد نہیں ہوتا۔ لہذا تیسرے نظریے کے حامیوں کے متعلق یہی کہنا درست ہوگا کہ وہ فن کے مقصد کو سمجھے ہی نہیں۔ اب اگر فن کا کوئی نمونہ ہمارے سامنے آئے تو پہلے نظریے کے ماتحت ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ ہمارے شعور یا تحت الشعور میں کوئی انبساطی کیفیت پیدا کرتا ہو یا نہیں۔ مسرت یا انبساط کا مفہوم "خوشی" کے مفہوم سے زیادہ وسیع ہو۔ خوشی کا جذبہ دراصل جذبہ مسرت کا محض ایک حصہ ہو۔ ایک المیہ اسی قدر، بلکہ اُس سے زیادہ، باعثِ انبساط ہو سکتا ہو جتنا کہ ایک طربیہ۔ ہیملیٹ، میکبتھ، یا واقعہ کربلا کا فن کارانہ بیان باعث انبساط ہو سکتا ہو لیکن وجہ خوشی نہیں مسرت یا انبساط کی تعریف کرنی تو مشکل کام ہو لیکن اس کی ایک مابہ الامتیاز خصوصیت یہ ہو کہ وہ نفس میں غلش لذت آمیز اور لذتِ ناتمام کا احساس پیدا کر دیتی ہو۔ اس طرح مسرت گویا نفس کی ایک داخلی کیفیت کا نام ہو اور اس کا انحصار ہو دو چیزوں پر، اول خارجی تحریک کی نوعیت، دوم خود نفس کی ساخت اگر دو یا دو سے زیادہ نفسوں کی ساخت یکساں ہو تو ایک ہی خارجی تحریک کا اثر بھی ان سب پر یکساں ہوگا ورنہ نہیں۔ اس لیے ممکن ہو کہ ایک ہی چیز میرے لیے باعث انبساط ہو لیکن آپ کے نزدیک نہ ہو لہذا اعتراض کیا جا سکتا ہو کہ فن برائے مسرت کے معنی کیا ہوئے؟ یا دی النظر میں یہ اعتراض

خاصناً وقتی معلوم ہوتا ہو لیکن مسرت بلکہ ہر انسانی جذبہ اضافی ہوتا ہو اور اضافی چیزوں کا فیصلہ اوسط سے کیا جاتا ہو لہذا اگر نمونہ فن اوسطاً کسی خاص زمانے یا ملک کے لیے باعث مسرت ثابت ہوا ہو تو وہ اپنے مقصد کو اس حد تک پورا کرتا ہو

دوسرے نظریے کے ماتحت ہم کو یہ دیکھنا ہوتا ہو کہ آیا زیر نظر نمونہ فن زندگی کے لیے مفید ہے یا نہیں۔ اگر لفظ مفید کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کا اطلاق بھی اسی شے یا کیفیت پر ہوتا ہو جو بالآخر مسرت آمیز ہو خواہ اس وقت باعث کوفت ہی کیوں نہ ہو۔ مثلاً اگر مریض کے حق میں کڑوی اور بدذائقہ دوا مفید ہوتی ہو تو اس کے معنی یہی تو ہوتے ہیں کہ اس دوا کا نتیجہ اس مریض کے لیے بالآخر مسرت آمیز ہوتا ہو خواہ فی الوقت وہ دوا باعث مسرت ہونے کے بجائے سوہان روح ہی کیوں نہ ہو۔ لہذا پہلے اور دوسرے نظریے میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہو جو کچھ فرق ہو وہ محض تقدیم و تاخیر کا ہو۔ پہلے نظریے میں مسرت قریب مدنظر ہو اور دوسرے میں مسرت بعید۔ سہولت کے لیے مسرت قریب کو انبساط اور مسرت بعید کو افادیت کہہ سکتے ہیں

کوئی نمونہ فن اپنے مقصد میں (خواہ وہ انبساط ہو یا افادیت) کامیاب نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ اس میں تاثر نہ ہو۔ یہی وہ اصلی ذریعہ ہو جس سے فن کار کے احساسات ناظرین یا سامعین تک پہنچتے ہیں۔ بہترین آرٹ وہی ہو جو معاً اثر کرے۔ اس میں شک نہیں کہ اثر کا تعلق محض فن کار کی قابلیت سے نہیں بلکہ ناظرین یا سامعین کی صلاحیت اور مذاق سے بھی ہوتا ہو لیکن اگر ناظرین یا سامعین میں یہ دونوں باتیں معقول مقدار میں موجود ہوں اور پھر بھی انھیں کسی نمونہ فن میں اثر دریافت کرنے کی ضرورت ہو تو پھر وہ فن تو ہو نہیں ممکن ہو کوئی شطرنج کی چال یا ریاضی کا مسئلہ ہو۔ شطرنج کی چال سمجھنے یا ریاضی کا کوئی مسئلہ حل کرنے میں بھی ایک قسم کی مسرت ہوتی ہو لیکن اس میں اور آرٹ کی مسرت میں زمین آسمان کا فرق ہو جب غالب کا یہ شعر

نقش نازِ بتِ طناز بہ آغوشِ رقیب　　　پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے

حضرت باسط بسوانی کی اچھی خاصی جاں فشانی اور میری اچھی خاصی مرمت کے بعد میرے ذہن میں داخل ہوا تھا تو مجھے یاد ہو کہ باوجود جسمانی تکلیف کے مجھے اس سے کس قدر لطف حاصل ہوا تھا لیکن ایک لطف تو وہ تھا اور ایک لطف یہ جو مجھے فانی کے اس شعر سے بعد میں حاصل ہوا۔

دنیا کی بلاؤں کو جب جمع کیا میں نے — دھندلی سی مجھے دل کی تصویر نظر آئی

ان دونوں میں دور کا بھی تعلق نہیں۔

اور چیزوں کے اثر کا یہاں ذکر نہیں لیکن فن کا اثر ناظرین یا سامعین پر اس وقت ہو سکتا ہو جب کہ اس میں حسن ہو۔ میرے نزدیک کوئی نمونۂ فن حسین نہیں کہا جا سکتا تا وقتیکہ اس میں کم و بیش تین شرطیں نہ ہوں

۱۔ حُسن موضوع۔

۲۔ حُسن تخیل

۳۔ حسن ادا۔

اس بحث کا نتیجہ یہ نکلا کہ کسی نمونۂ فن کی خوبی کا معیار یہ ہو کہ اس میں کم و بیش یہ تینوں شرطیں پائی جائیں۔

پہلی شرط حسن موضوع ہو اس کے معنی یہ ہیں کہ فن کار جس شے یا کیفیت کا اظہار کرنا چاہتا ہو اس کی نوعیت کیا ہو۔ اس میں موضوع فن بننے کی صلاحیت بھی ہو یا نہیں؟ اس میں شک نہیں کہ موضوع کیسا ہی کیوں نہ ہو قابل فن کار اس کو اپنی قابلیت سے حسین بنا سکتا ہو جگنو کی کیا حقیقت ہو؟ لیکن جگنو کے متعلق اقبال کی نظم ملاحظہ فرمایئے! اس کے باوجود موضوع بالکل نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں ہو۔ اگر موضوع فی نفسہ اچھا ہو تو معمولی فن کار بھی فن کے اچھے نمونے پیش کر سکتا ہو اور درجہ اول کا صناع تو اچھے موضوع کو لے کر سحر کاری کر سکتا ہو لیکن اچھا موضوع کہتے کسے ہیں؟ کیا باغ و بہار کوثر و سلسبیل، حسن و عشق لازمی طور پر اچھے موضوع ہیں یا بھوک، افلاس، جرم اور غلاظت لازمی طور پر برے موضوع ہیں؟ میری رائے میں موجودہ زمانے میں اچھا موضوع وہ ہو جس میں افادیت کے امکانات مسرت کے امکانات سے زیادہ ہوں مثلاً گل و بلبل کا موضوع ہر چند کہ کثرت استعمال کے باعث فرسودہ اور بے اثر ہو چکا ہو اور اپنے روایتی امکانات مسرت کو کھو چکا ہو اگر اس طریقہ پر برتا جائے کہ امکانات افادیت ظاہر ہو جائیں تو اس کا شمار اچھے موضوعات میں ہو سکتا غلام بھیک صاحب نیرنگ گل و بلبل کے استعارے میں ہندوستان کی سیاسی حالت کا نقشہ جس دلفریب انداز میں کھینچتے ہیں وہ انھیں کا حصہ ہو۔ اسی طرح موضوعات حسن و عشق شمع و پروانہ، بادہ و ساغر، شیشہ و پیالہ ساقی و میخانہ، رندی سرمستی، زہد و ریاکاری وغیرہ باوجود نہایت فرسودہ ہونے کے اپنے اندر مسرت اور افادیت

دونوں قسم کے امکانات رکھتے ہیں۔ افادیت کے امکانات کو اُجاگر کرکے فن کار نئی راہیں نکال سکتے ہیں۔ مسرت کے امکانات کو شعرا نے پہلے ہی اس قدر اجاگر کر دیا ہو کہ اب زیادہ گنجائش نہیں رہی۔

اردو شاعری میں فرسودہ موضوعات سے ہٹ کر چلنے والے میری رائے میں چار مشہور شاعر گزرچکے ہیں (یہاں موجودہ شعرا کا ذکر نہیں) انیس، نظیر اکبرآبادی، حالی، اور اقبال۔ ان چاروں نے محض روایتی شاعری نہیں کی بلکہ جو کچھ کہا زیادہ تر اپنے ماحول سے براہ راست متاثر ہوکر کہا موضوع کی تازگی ان چاروں شعرا کی سب سے بڑی خوبی ہو اور اگر ان کے کلام میں باقی دو شرطیں یعنی حُسن تخئیل اور حسن ادا نہ بھی ہوتیں (نظیر اور حالی میں حسن ادا ہو بھی کم) تو بھی وہ اچھے شاعر کہلانے کے مستحق ہوتے لیکن کم از کم انیس اور اقبال کے کلام میں یہ تینوں شرطیں برابر پائی جاتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہو کہ ان کا شمار چوٹی کے شعرا میں ہو۔

ہندوں کے زمانہ کے سنگ تراشی کے نمونوں کو دیکھیے۔ باستثنائے معدودے چند یہ نمونے بھدّے اور بے ڈول نظر آئیں گے، سانچی کا اسٹوپا، ورنگل کی دیول ہزار ستون، رامیشورم کا مشہور مندر یہ سب میں نے خود دیکھے ہیں۔ میری دیانت دارانہ رائے یہ ہو کہ ان میں کوئی فنی خوبی نہیں۔ دور کیوں جائیے۔ نئی دلی کا ہنومان مندر جو موجودہ زمانے کی پیداوار ہو اسی کو دیکھ لیجئے۔ میں مانتا ہوں کہ یہ عمارت نہایت ہیبت ناک ہو (جسے الفاظ کا صحیح استعمال نہ جاننے والے لوگ شاندار بھی کہتے ہیں) لیکن اس کو دیکھ کر کم از کم مجھے تو آرٹ کا گمان بھی نہیں ہوتا پھر آخران نمونوں کے مشہور اور ہر دلعزیز ہونے کا سبب کیا ہو؟ یہی کہ ان کا موضوع مذہبی ہو اور ہندوستان میں جو شے مذہبی پہلو لیے ہو اس میں عوام الناس کو کیا آرٹ کیا سائنس سب ہی قسم کی خوبیاں نظر آتی ہیں!

دوسری شرط حسن تخئیل ہو۔ ہر فنی تخلیق کے دو وجود ہوتے ہیں، ایک ذہنی دوسرا خارجی۔ وجود ذہنی کا تعلق تخئیل سے ہو لہذا حسن تخئیل کے معنی یہ ہوئے کہ کسی نمونہ فن کے وجود ذہنی کی تخلیق اور نشو و نما حسین طریقے پر ہوئی ہو یا نہیں۔ موضوع کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو اگر فن کار نے اس کو خوبصورتی کے ساتھ محسوس نہیں کیا تو وجود خارجی تابیت کے اس کی کوشش کا نتیجہ کبھی حسین نہیں ہو سکتا۔ واقعات کربلا کا بیان ایک اچھا موضوع ہو لیکن غالب کو اس سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ اس لیے ان کا ایک دوست سے

مرثیہ لکھنے کے متعلق معذوری ظاہر کرنا کوئی تعجب کی بات نہیں ہو۔ تعجب تو جب ہوتا جب وہ باوجود عدم دلچسپی کے اچھا مرثیہ لکھ سکتے۔ کیا کوئی سنگ تراش زہرہ کا مجسمہ تیار کر سکتا ہو اگر اس میں ذوق حسن عریاں نہ ہو؟ کوئی عریاں مجسمہ یا تصویر آرٹ کہلانے کی مستحق نہیں ہو جب تک کہ آرٹسٹ کا تخئیل عریانیت اس مجسمے یا تصویر کے اعضا سے ظاہر نہ ہو لیکن اگر آرٹسٹ نے اپنے موضوع کو بغیر کسی تخئیلی پہلو کے بے لباس ظاہر کیا ہو تو اس کو سوائے بے حیائی کے اور کیا کہا جا سکتا ہو۔ اس خاص شعبۂ فن میں تخئیلی پہلو اسی وقت نمایاں ہو سکتا ہے جبکہ نمونۂ فن موضوع کے لمعات عریانی کا "سرسری نقش" ہو "مطالعہ" نہ ہو۔

حسن تخئیل کا دار و مدار بڑی حد تک ندرت تخئیل پر ہو۔ بلکہ دراصل خود لفظ تخئیل میں ندرت کا مفہوم شامل ہو کیونکہ تخئیل کے معنی محض سوچنے کے نہیں بلکہ نئے طریقے سے سوچنے کے ہیں۔ فن کی اصطلاح میں بھی صرف تخئیل کہہ کر ندرت تخئیل مراد لیتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی فن کار کے کام میں کوئی نئی بات نہیں ہوتی تو کہا جاتا ہو کہ اس کے پاس تخئیل کی کمی ہو۔ نئی بات کی خواہش انسان کی فطرت میں داخل ہو۔ فطرت انسانی یک رنگی اور یکسانیت سے متنفر ہو۔ کوئی شو کتنی ہی پسندیدہ اور لذیذ کیوں نہ ہو اس کی بہتات سے تھوڑے ہی عرصے میں طبیعت سیر ہو جاتی ہو۔ غالب آم پر جان دیتے تھے۔ لیکن اگر ان کا کوئی غیر شاعر دوست اُنھیں زیادہ نہیں دس پندرہ دن ہی محض آم کھلا کر رکھتا تو مجھے یقین ہو کہ "بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے" والی نظم وجود میں نہ آتی۔

نقاشی ایک فن لطیف ہو لیکن فوٹوگرافی نہیں ہو حالانکہ بہ نسبت ایک پینٹنگ کے ایک فوٹوگراف اصل سے کہیں زیادہ مطابقت رکھتا ہو۔ بات صرف یہ ہو کہ فوٹوگرافی میں ندرت تخئیل کی نہ اتنی گنجائش ہوتی ہو نہ ضرورت جتنی کہ پینٹنگ میں ہوتی ہو۔

تاج محل فن تعمیر کا ایک بہترین نمونہ تصور کیا جاتا ہو لیکن اگر کوئی فن کار بالکل اسی نمونہ کا دوسرا تاج محل تیار کرے تو کیا اس کی یہ نقل باوجود کامیاب نقل ہونے کے اتنی ہی قابل قدر ہو سکتی ہو جتنا کہ اصل تاج ہو؟ نہیں ہو سکتی اس وجہ سے کہ اصل میں ندرت تخئیل ہو اور نقل کو تخئیل یا ندرت تخئیل سے کیا واسطہ؟

غزل گوئی کے آخری دور کا (یعنی داغ دہلوی، امیر مینائی وغیرہ کے زمانے کا) کلام عام طور سے

معلوم ہوتا ہو. کیوں ؟ اس لیے کہ اس زمانے تک غزل کا پرانا رنگ یعنی سراپائے حسن معاملہ بندی سبزۂ خط گنگھی چوٹی، ہجر و وصال، بوس وکنار وغیرہ کا بیان اور طرزِ بیان بہت فرسودہ ہو چکا تھا اور اس میں ندرت تخئیل کی گنجایش بہت کم رہ گئی تھی اور نیا رنگ یعنی حسن وعشق یا دیگر مضامین کا "آفاقی" اندازِ بیان اور نفسیاتی موشگافیوں کا مذاق ابھی تک پیدا نہیں ہوا تھا۔ لہذا اس زمانے کا تقریباً سارا کلام بے اثری یا کم اثری کے باعث مقصدِ فن یعنی مسرت یا افادیت کو پورا نہیں کرتا۔

ندرتِ تخئیل فن کی محض ایک خوبی ہی نہیں بلکہ شرطِ لازمی ہو جس کے بغیر فن فن نہیں محض نقالی رہ جاتی ہو یوں تو ہر فن ایک حد تک فطرت کی نقل ہوا کرتا ہو مگر صرف ایک حد تک۔ اگر کسی نمونۂ فن میں فطرت کی مکمل نقل پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہو تو پھر وہ فن نہیں کہلائے گا۔ بچہ کا مجسمہ یا تصویر بنانا فن ہو لیکن سچ مچ کے بچے بنانا کوئی فن نہیں! خواجہ میر اثر کے معشوق کا سراپا یقیناً ایک عمدہ نمونۂ فن ہوتا اگر اس میں اس خیال سے عدد گنوانے کی کوشش نہ کی گئی ہوتی تاکہ کوئی چیز باقی نہ رہ جائے"! ایک قابل آرٹسٹ فطرت کی بے کار تفصیلات کو چھوڑ کر یا کم اہمیت دے کر اس کے ان پہلوؤں کو اک ذرا مبالغہ کے ساتھ پیش کرتا ہو جنھوں نے اس کے احساسات پر گہرا اثر کیا ہو. گویا فطرت کی واقعیت اور اپنی تصوریت کا امتزاج پیش کرتا ہو. یہی ذاتی تصوریت آرٹسٹ کی اصل قابلیت کی دلیل ہوتی ہو اور اسی کے تنوع سے فنون کے نمونوں میں تنوع اور حسن پیدا ہوتا ہو اگر آرٹسٹ کو موضوع کا "احساس" سیدھے سپاٹ یا فرسودہ طریقے سے ہوتا ہو تو اس کا کام کبھی قسم اول کا مستحق نہیں ہو سکتا خواہ موضوع فی نفسہٖ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو اور آرٹسٹ کی قوتِ ادا کتنی ہی زبردست کیوں نہ ہو مثلاً ایک سراپا تو اثر کا ہو جس کا ذکر اوپر کیا گیا اور دوسرا جگر کا جس کا ایک ایک شعر بقول میرے خود معشوق ہو. ذرا ان اشعار کو دیکھیے آپ خود سمجھ جائیں گے کہ موضوع کو "محسوس" کرنے سے میرا کیا مطلب ہو۔

دل بُرد از من دیروز شامے — فتنہ طرازے محشر خرامے

روئے چو بیش صبح تجلّے — لوحِ جبینش ماہ تمامے

عارض بہ عارض گیسو بہ گیسو — صبحے بہ صبحے شامے بہ شامے

گاہے بہ مستی طاؤس رقصاں — گاہے بہ شوخی آہو خرامے

یہ چند اشعار میں نے اپنی یاد سے لکھے ہیں ورنہ اگر پورے سراپا کا لطف اٹھانا ہو تو پوری نظم پڑھنی چاہئے ممکن ہو کہ نظیر اثر کی قوت ادا جگر سے زیادہ رہی ہو لیکن احساس حسن یا جمالیاتی احساس میں وہ جگر سے یقیناً پیچھے ہیں اسی لیے ان کے سراپا میں وہ لطف نہیں ہے جو جگر کے یہاں ہے جمالیاتی احساس جس قدر شدید ہوتا ہے اسی قدر اپنے اظہار کے لیے زیادہ سے زیادہ پُر اثر پیرایہ اختیار کرتا ہے اور موثر ترین پیرایہ وہی ہوتا ہے جو خوبصورت بھی ہو اور نیا بھی۔

اس بحث کا یہ نتیجہ نکلا کہ حسن تخئیل کا انحصار عام طور پر ندرت تخئیل پر ہوتا ہے اور ندرت تخئیل کا شدت احساس پر۔ چونکہ شدت احساس فن کے لیے شرط لازمی ہے لہذا معلوم ہوا کہ حسن تخئیل بھی شرط لازمی ہے۔

تیسری اور شاید اہم ترین شرط حسن ادا ہے۔ اہم ترین اس لیے کہ ناظرین یا سامعین سب سے پہلے آرٹ کی ظاہری شکل و صورت سے متاثر ہوتے ہیں اور سطحی ناظرین یا سامعین تو ظاہری شکل و صورت سے آگے بڑھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔ اگر کسی نمونہ فن میں حسن ادا نہیں ہوتا تو غور سے دیکھنے یا سننے والوں کے دل میں بھی اس کی طرف سے ایک قسم کا استکراہ پیدا ہو جاتا ہے جو اس نمونہ فن کی دوسری خوبیوں پر پردہ ڈال دیتا ہے۔ نظیر اور حالی کی مثال اوپر پیش کی جا چکی ہے۔ ان دونوں کے یہاں حسن موضوع اور حسن تخئیل کی کمی نہیں لیکن محض حسن ادا کی کمی نے ان کو درجہ اول کے شعرا میں شامل نہ ہونے دیا۔ نظیر کے یہاں اس کمی کی وجہ تعلیم کی کمی معلوم ہوتی ہے اور حالی کے کلام میں کم مشقی کے سوا اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ حالی کا شعر

تھا گھڑا حیراں سکندر یا درکتا تھا کہ بس   فتح ہند ایک خواب تھا اور اس کی تھی تعبیر یاس

حسن ادا کے فقدان کا صاف طور پر اعلان کر رہا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ حسن ادا کا تعلق پہلی دونوں شرطوں سے بھی ہے حسن موضوع سے کسی قدر اور حسن تخئیل سے زیادہ۔ یعنی اگر کسی فن کار کے کام میں حسن موضوع اور حسن تخئیل کا وجود ہی نہ ہو تو حسن ادا بھی غائب ہوگا لیکن اس تیسری شرط کے لیے زیادہ اہم چیز تربیت اور مشق ہے۔ ہمارے ذہن میں کسی عمارت کا کتنا ہی پیارا نقشہ کیوں نہ ہو لیکن اگر ہم کو پنسل، ربر اور کاغذ کا صحیح استعمال نہیں آتا تو ہمارا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ برسات میں کیسی زہد شکن ہوائیں کیوں نہ چل رہی ہوں، فضا کیسی ہی کفر آموز کیوں

نہ ہو لیکن اگر ہم نے اپنے گلے کو تربیت نہیں دی تو ہمارا گانا برساتی جھینگر کے گانے سے بہتر نہیں ہو سکتا
ممکن ہو کہ ہم کو فلسفہ میں اقبال سے زیادہ واقفیت ہو لیکن اگر ہم نے شاعری کی مشق نہیں کی تو اقبال کا
انداز بیان ہمیں کیوں کر نصیب ہو سکتا ہو؟ اردو زبان کے بیشتر شعرا محض کہنہ مشقی کی بدولت شاعر کہلاتے
ہیں۔ ناسخ اور ذوق کے کلام میں زبان کی چاشنی، روزمرہ، بندش مضمون، الغرض استادی کے سوا کیا ہو؟
پھر بھی یہ دونوں اپنے زمانے کے مشہور شعرا میں تھے اور آج بھی بعض اللہ کے بندے ان کی استادی کے
آگے غالب جیسے شعرا کو خاطر میں نہیں لاتے؛ مولانا احسن مارہری مرحوم داغ کے خاص شاگردوں میں تھے
ان کے کلام کی بہترین صفت یہ ہو کہ اس میں عروض کی کوئی غلطی نہیں، گویا عروض پر پورا اترنا ہی شعر کی
سب سے بڑی خوبی ہو؛ تاہم بہت سے لوگ "کلام الاحسن احسن الکلام" کہنے کو اب بھی تیار ہیں۔ یہ چند مثالیں
مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر ہیں ورنہ سیکڑوں بلکہ ہزاروں صرف اس لیے شاعر کہلاتے ہیں کہ ان کی

عمر گزری ہو اسی دشت کی سیاحی میں

جس طرح نکیلے پتھر دریا کے بہاؤ کے ساتھ لڑھکتے لڑھکتے بلا ارادہ سڈول اور خوبصورت ہو جاتے ہیں بالکل وہی
حیثیت شاعری کے ان پتھروں کی ہو جن کا ذکر اوپر کیا گیا۔ اس تشبیہ سے مذکورۂ بالا شعرا کی تنقیص مراد نہیں
بلکہ مدعا صرف یہ ظاہر کرنا ہو کہ فن میں قوت ادا کا کتنا زبردست حصہ ہوتا ہو۔

اب ان تینوں شرطوں یعنی حسن موضوع، حسن تخئیل اور حسن ادا کو سامنے رکھ کر کسی خاص نمونۂ فن کی
خوبیوں کے متعلق مختلف نقادانِ فن کی رائیں حاصل کیجیے۔ میرا خیال ہو کہ اگر یہ رائیں دیانتداری کے
ساتھ دی جائیں تو ان میں آپس میں بہت زیادہ اختلاف نہ ہوگا۔ یہاں پر بے اختیار جی چاہتا ہو کہ ان
شرائط کی روشنی میں اردو کے مشاہیر شعرا کے متعلق اپنی رائے پیش کروں لیکن یہ بحث اس مضمون کے
موضوع سے الگ ہو اور اس لیے اس موقع پر اس کا چھیڑنا مناسب نہیں کبھی پھر سہی۔

سید باقر حسین ایم۔ اے (علیگ)

سائنس کی تعلیم

سائنس کیا ہی؟ سائنس فرانسیسی زبان کا لفظ ہی جو لاطینی لفظ Scientia سے لیا گیا ہی جس کے لغوی معنی علم کے ہیں۔ مگر اس سے مراد وہ علم ہوتا ہی جس میں واقعات کا باقاعدہ مطالعہ یا مشاہدہ کر کے ان سے عام قاعدے اور اصول اخذ کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح کیمیا وہ علم ہی جس میں مادی اشیا اور ان کی تبدیلیوں کا مطالعہ کر کے ان سے قواعد اور کلیات بنائے جاتے ہیں۔ یہ اور اس قسم کے تمام علوم سائنس ہیں، مگر تاریخ اور فلسفہ بالکلیہ سائنس نہیں کہلائے جا سکتے کیونکہ تاریخ میں واقعات تو موجود رہتے ہیں مگر ان سے عام اصول حاصل نہیں کئے گئے اور فلسفہ میں اصول تو موجود ہیں مگر ان کی بنیاد لازمی طور پر مشاہدہ پر موقوف نہیں۔ ان علوم کے بعض شعبوں مثلاً سیاسیات اور نفسیات میں واقعات پر بحث کر کے اصول بنائے جاتے ہیں۔ اس لیے وہ شعبے سائنس کی تعریف میں آ جاتے ہیں۔

سائنٹفک علوم کا مطالعہ سائنٹفک طریقۂ تجربی اور نظری سے کیا جاتا ہی تاریخ اور فلسفہ کا مطالعہ بھی جب اس طریقہ سے کیا جاتا ہی تو وہ علوم بھی سائنس میں شمار کیے جاتے ہیں سائنٹفک علوم اور دیگر علوم میں جو فرق پایا جاتا ہی وہ طریق مطالعہ کا ہی۔

پس جن علوم کا مطالعہ سائنٹفک طریقہ سے کیا جاتا ہی وہ سائنس ہیں۔ مثلاً ایک کھردری تختی پر ایک گولی گھماتے ہیں تو وہ جلد رک جاتی ہی جب ایک صاف تختی پر گھماتے ہیں تو زیادہ دیر تک گھومتی ہی اس سے زیادہ صاف تختی پر گھماتے ہیں تو اور زیادہ دیر تک گھومتی ہی۔ گولی کی حرکت میں ممکنہ مزاحمت کم کی جا رہی ہی تو اس سے یہ نتیجہ اخذ ہو سکتا ہی کہ جب کسی شے کو متحرک کیا جائے تو ہمیشہ حرکت کرتی رہتی ہی بشرطیکہ اس کی حرکت میں کوئی مزاحمت نہ ہو۔ چونکہ مشاہدہ سے ایک عام نتیجہ حاصل کیا گیا اس لیے یہ طریقہ سائنٹفک طریقہ کہلاتا ہی اور یہ علم سائنس ہی اور چونکہ اس علم کا تعلق قوت سے ہے۔ اس کو طبعیات کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

سائنس کی ابتدا | صحیح طور پر یہ نہیں بتلایا جا سکتا کہ سائنس کی ابتدا کب سے ہوئی۔ البتہ ارشمیدس (۲۸۷ - ۲۱۲ ق م) کے تجربہ "کوئی جسم کسی مائع میں ڈبو دیا جائے تو اس کے وزن میں ہٹائے ہوئے مائع کے وزن کے برابر کمی ہوتی ہے" سے معلوم ہوتا ہے کہ سائنس کی ابتدا بہت ہی قدیم زمانے سے ہوئی۔ یونانی تمدن میں بھی بعض افراد ایسے نظر آتے ہیں جنھوں نے سائنٹفک علوم میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا ہے اور خاص خاص نظریے پیش کیے ہیں مگر ان کے سارے نظریوں اور دلچسپیوں کا تعلق قیاس سے تھا۔ چھٹی صدی عیسوی کے بعد مسلمان حکما مثلاً بوعلی سینا۔ امام غزالی اور امام رازی نے ان نظریوں کی تجرباتی تشریح کرکے ان کو غلط اور محض قیاسی ثابت کیا۔ مگر یورپ پر شخصیت پرستی کا ایسا بھوت سوار تھا کہ وہ اپنے قدیم نظریوں کو کسی طرح بدلنے یا ترمیم کرنے پر تیار نہیں تھے۔ آخر کار انھیں میں سے بعض افراد ایسے پیدا ہوئے جنھوں نے محض قیاسی نظریوں کو تجربہ کی روشنی میں غلط ثابت کیا۔ ارسطو بظاہر قیاس سے اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ اگر کوئی جسم دوسرے جسم سے چار گنا بھاری ہے تو ایک معینہ فاصلہ کو دوسرے کے مقابل چوتھائی وقت میں طے کرے گا۔ گیلیلو نے (۱۵۶۴ تا ۱۶۴۲ء) اس قیاسی نتیجہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اس نے اپسا یونیورسٹی کے پروفیسروں کے روبرو اس نظریہ کے خلاف عقلی دلائل پیش کیے مگر کسی نے نہیں مانا۔ آخر ایک دن اس نے عوام کو شہر اپسا کے مشہور ترچھے مینار کے قریب مدعو کرکے مینار پر سے مختلف وزن کے دو گولے گرا کر بتلایا کہ دونوں ایک وقت زمین پر گرتے ہیں۔ عوام نے بخوبی مشاہدہ کیا لیکن وہ یہ کہتے ہوئے واپس ہوئے کہ ارسطو کا نظریہ غلط نہیں ہو سکتا ممکن ہے کہ انسانی آنکھوں نے دھوکہ کھایا ہو۔ اسی طرح گیلیلو نے سنہ ۱۶۱۰ء میں اپنی دوربین کی مدد سے اور سیاروں کا مشاہدہ کیا لیکن لوگ اس کے تسلیم کرنے سے بھی انکار کر بیٹھے اور انھوں نے کہا کہ جس چیز کو ہم اپنی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتے وہ کیسے درست ہو سکتی ہے۔ بہرحال گیلیلو کی اس تجرباتی تردید سے نہ صرف علوم میں اجتہاد کا دروازہ کھلا بلکہ میرے خیال میں جدید سائنس کا سنگ بنیاد قایم ہوا جس پر آج ایسی عظیم الشان عمارتیں تعمیر ہو رہی ہیں۔

باوجود ان تجرباتی میلانات کے سائنسدانوں کی بے عملی ایک عرصہ تک دور نہیں ہوئی۔ چنانچہ آج سے دو سو برس قبل سائنسدانوں میں بحث چھڑ گئی کہ گھوڑے کے دانت کتنے ہوتے ہیں۔ ہر ایک سائنسداں اپنے اپنے دلائل اور تصورات سے مختلف تعداد بتلاتا تھا۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ

گھوڑے کے دانت گن لیے جائیں۔ دوسرے سائنسدانوں نے اس میں اپنی تذلیل تصور کی کہ باوجود عقل رکھتے ہوئے کیوں تجربہ کریں۔ اس بے عملی کا دور دور انیسویں صدی کے درمیان تک رہا اور آخر ڈارون ہکسلے اسپنسر وغیرہ کی بے انتہا کوششوں سے قدیم سائنس میں جان پڑگئی اور سائنسداں آرام کرسی چھوڑکر تجربہ خانہ کی راہ لینے لگے۔

سائنس کی تعلیم کی ابتدا مدارس میں یورپ میں بھی

سائنس کی ابتدا کے متعلق اجمالاً جو مواد پیش کیا گیا وہ سترہویں صدی عیسوی تک متعلق تھا۔ جوں جوں معلمان تعلیم طریقہ تعلیم میں اصلاح کرتے گئے۔ وہ سائنس کی اہمیت پر زیادہ زور دیتے رہے۔ ان کی پرزور کوششوں سے نصاب تعلیم میں سائنس کی سہولیت کے سوال پر توجہ ہونے لگی۔ اولاً سائنس کی تعلیم کیمبرج اور اکسفورڈ میں شروع ہوئی "آبکاری رقم" اور مقامی چندوں سے بے شمار امدادی اور نیم ثانوی مدارس قائم ہوئے۔ ان کے نصاب میں سائنس ایک اہم مضمون کی حیثیت سے شریک کی گئی۔ کچھ عرصہ بعد کاکسٹن کے مشہور فیصلہ کے بموجب یہ مدارس غیر قانونی تسلیم کیے گئے اور اس طرح سائنس کی تعلیم جو عام طور پر دی جارہی تھی مسدود ہوگئی اور صرف ان مدارس تک محدود رہی جن کو سررشتہ تعلیمات کی طرف سے امداد ملتی تھی۔ کچھ عرصہ بعد اسپنسر کی سرگرم تبلیغ اور ہکسلے کے خیبریں استدلال کی روشنی میں سائنس السنہ سے بہتر تہذیب کی بنیاد ثابت ہوئی اس لیے باضابطہ مدارس کے نصاب میں شریک کی جانے لگی۔ اس کے بعد جرمنی و فرانس اور امریکہ کے مدارس نے اس کی اہمیت قبول کرتے ہوئے فوراً اپنے اپنے نصابوں میں اس کو شریک کرلیا۔

سائنس کی تعلیم ہندوستان میں

ہندوستان کی تاریخ تعلیم کا جس قدر مواد ہمیں دستیاب ہوسکا ہے اس کا تجزیہ بلحاظ مضامین حسب ذیل ہے۔

ویدک زمانے کے مدارس:۔ علم صرف و نحو، علم مذہب، علم مدن

بڑہمنی دور:۔ نصاب ویدک زمانے کے مدارس کا۔

اسلامی دور:۔ مذہب، فلسفہ، قدرت، مابعد الطبیعیات، منطق، ریاضی، علم ہیئت وغیرہ

مغلوں کے زمانہ کی تعلیم:۔ مذہب، فلسفہ، قدرت، ریاضی، علم ہیئت، علم الادویہ وغیرہ۔

انگریزی حکومت میں تعلیم منجملہ مندرجہ بالا مضامین کے اور کئی سائنٹفک مضامین شریک نصاب کیے گئے جیسے

حیاتیات، طبعیات وغیرہ۔ انگریزی حکومت میں یورپ سے نئی نئی ایجادیں ہندوستان آئیں اور ہندوستانی عام طور سے سائنس سے گہری دلچسپی کا اظہار کرنے لگے۔ سائنس کانگریس کا انعقاد عمل میں آیا۔ وسیع تجربہ خانے تیار کیے گئے۔ غرض سائنس کی اہمیت اور ضرورت سب پر واضح ہوگئی ہندستان کی تعلیمی ترقی میں سائنٹفک علوم نہایت ہی تدریجی طور پر نصاب میں شریک ہوتے گئے اور موجودہ زمانہ میں تو ان کی تعلیم بالکل عام اور بہت اہم ہوگئی ہے ڈاکٹر مولوی عبدالحق جیسے زبردست ادیب نے بھی سائنس کی ضرورت محسوس کرلی ہے چنانچہ کہتے ہیں:۔

"ایشیائی اور خاص کر ہندی دماغوں کا علاج سائنس ہے"

ہمارے اس مطالعہ سے معلوم ہوا کہ سائنس پر پہلے جس قدر کم توجہ کی جاتی تھی۔ اب سائنس پر ہر جگہ اتنی ہی زیادہ توجہ ہو رہی ہے اور دیگر مضامین پر کم۔ اس سلسلہ میں ہربرٹ اسپنسر کی پیشین گوئی سائنس کے متعلق بڑی دلچسپی سے پڑھے جانے کے قابل ہے۔ وہ سائنس کو خاندان علوم کی ایسی لونڈی سے مثال دیتا ہے جس کو تمام علوم کی لگاتار خدمت کرنے کے باوجود سنڈریلا (پری) کی طرح گوشۂ گمنامی میں رکھا گیا تاکہ اس کی تنک مزاج بہنیں اپنے بناوٹی کپڑوں کی بہار دنیا کو دکھا سکیں۔ اس سلسلۂ بیان کو جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے "یہ تمثیل یہیں پر ختم نہیں ہوتی کیونکہ ہم ایک ایسے نقطہ نظر پر پہنچ رہے ہیں جبکہ حالات بالکل بدل جائیں گے اور یہ مغرور بہنیں قعر گمنامی میں ڈوب جائیں گی جس کی وہ مستحق ہیں۔ بلحاظ قدر و قیمت اور حسن کے سائنس کے اعلیٰ ترین ہونے کا اعلان ہوگا اور سب پر ان کی حکومت ہوگی۔ سائنس کی موجودہ ترقی کو دیکھتے ہوئے ہم بلاشبہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔

سائنس کی تعلیمی اہمیتیں | سائنس اپنی تعلیمی اہمیتوں کی وجہ سے مدعائے تعلیم کی تکمیل میں نمایاں حصہ لیتی ہے جو یہ ہے کہ تعلیم کی غرض و غایت ایسے حالات و مواقع پیدا کرنا ہے جن کے زیر اثر انفرادیت کی کامل طور پر ترقی ہوسکے اور طالب علم آگے چل کر اس لائق بن جائے کہ وہ اپنی فطری صلاحیت کے مطابق گوناگوں انسانی معلومات کے مجموعی ذخیرہ میں اپنی جودت طبع کے نتائج سے کچھ قابل قدر اضافہ کرسکے۔

تعارفی اہمیت :۔ سائنس کے مطالعہ سے عام دنیاوی ترقی اور اعلیٰ علوم کے سمجھنے کے لیے راستہ صاف ہوتا ہے

معاشرتی اہمیت :۔ سائنس کے مطالعہ سے فرد عوام کی بھلائی اور فلاح و بہبود کے کام کرتا ہو مثلاً وبائی امراض کی اشاعت کے موقع پر وہ لوگوں کو معقول دلائل کے ساتھ تخلیہ مکان کی ترغیب دے سکتا ہو۔ اس طرح بجلی کے استعمال کی اشاعت کرکے انھیں آسایش کی زندگی بسر کرنے کے قابل بنا سکتا ہو۔

عملی یا افادی اہمیت: سائنس کے تعلق سے روزمرہ کی ضروریات میں اس کے اصولوں پر عمل پیرا ہوکر استفادہ حاصل کرسکتا ہو ٹیلیفون کی مدد سے وہ بات چیت کرتا اور کاروبار چلا سکتا ہو۔ برق کی مدد سے مکانوں، دوکانوں اور سڑکوں پر روشنی کرتا ہو۔ علاوہ ازیں سائنس انسانی احساس کمتری کو رفع کرنے کا ایک موثر ذریعہ بھی ہو کیونکہ اس کے مطالعہ سے کائنات میں اپنے کو ایک کارکن کی حیثیت سے سمجھنے لگتا ہو۔

تہذیبی اہمیت :۔ سائنس کا مطالعہ ذخیرہ معلومات میں وسعت پیدا کرکے فرد کو فطرت کے ساتھ موافقت پیدا کرنیکے قابل بناتا ہو۔ عامیوں کی طرح فرد طرح طرح کے اوہام کا شکار نہیں ہوتا۔

اخلاقی اہمیت :۔ سائنس کے مطالعہ سے فرد اس قابل ہوتا ہو کہ وہ فطرت کی قوتوں سے جنگ کرکے اپنے واجبی حقوق و املاک کی بخوبی حفاظت کرے اور حد اعتدال سے متجاوز نہ ہو۔

وجدانی اہمیت :۔ سائنس کے اصولوں سے بخوبی واقف ہوکر مشینوں اور ملوں میں اس کی کارفرمائی کو بنظر غائر دیکھتا ہو یا فطرت کی نیرنگیوں کے مطالعہ سے اس کے عام اصولوں کی ہمہ گیری کا مشاہدہ کرکے اپنے تجسس و حیرت کی تسکین کرتا ہو۔ علم ہیئت کا مطالعہ کرنے والا ستاروں کے محل وقوع اور سیاروں کے منظم و باقاعدہ گردشوں کو دل سے سراہتا ہو۔

سائنس کی تعلیم کے مقاصد | نفسی خواص کی تربیت :۔ بعض منکرین سائنس کی تعلیم کا مقصد چند نفسی خواص کی تربیت بتلاتے ہیں۔

۱۔ افراد میں صحیح مشاہدہ کرنے کی عادت پیدا ہوتی ہو۔

۲۔ ان کے افعال اور اقوال صحت پر مبنی ہوتے ہیں۔

۳۔ سوچ بچار کی عادت پیدا ہوتی ہو۔

۴۔ تجربات کرنے کے رجحانات پیدا ہوتے ہیں۔

سائنس کی تعلیم کا یہ مقصد زیادہ تر طریقہ تدریس پر موقوف ہے۔

قدرت سے محبت | بعض ماہرین فن سائنس، سائنس کی تعلیم کا مقصد قدرت سے محبت کرنا اور اس کے راز معلوم کرنا بتلاتے ہیں ٹیلیگراف اور لاسلکی وغیرہ کی بدولت انسان نے قدرت کے کیسے کیسے گہرے راز معلوم کیے۔

"قدرت صرف اپنے چاہنے والوں کو ہی راز بتلاتی ہے"

اس سلسلہ میں سر جی۔ ڈی۔ رامسن کہتے ہیں سائنس کا صحیح نقطہ نظر یہ ہے کہ طبعی مظاہر کو سمجھا جائے اور ان کے ساتھ اپنے کو ہم آہنگ بنایا جائے۔

تھامسن کمیٹی | سائنس کی تعلیم کے صحیح مقصد کے تعین کے لیے ۱۹۱۶ء میں ایک کمیٹی پروفیسر جے جے تھامسن کی صدارت میں منعقد ہوئی تھی۔ اس نے حسب ذیل سفارشیں کیں۔

"سائنس کے مطالعہ سے طلبا میں مشاہدات کے متعلق استدلال کرنے کی تربیت ہوتی ہے"

سائنس کے اصولوں سے مانوس ہو کر طلبا روزمرہ کی زندگی میں ان کا استعمال کر سکتے ہیں۔

پروفیسر فن سائنس کی تعلیم کا حسب ذیل مقصد معین کرتے ہیں۔ ہمارا حقیقی مقصد یہ ہے کہ ہم طلبا کو ان کی استعداد کی حد تک یہ محسوس کرا دیں کہ ان کو سائنسداں کے قالب میں سما جانا چاہیے تاکہ وہ اسی کی آنکھوں سے دیکھے اسی کے اوزار استعمال کرے۔ اس کی محنت کا کچھ تجربہ حاصل کرے اور اس کی مسرت آگیں ذہنی مہمات کا احساس پیدا کرائے،، اس فقرہ کا مقصد جیسا کہ ظاہر ہے یہ ہے کہ سائنٹفک زندگی کا پیدا کرنا اور طلبا کو اس کا احساس کرانا ہے۔ ایک جگہ اور سر جی۔ ڈی رامسن سائنس کا مقصد معین کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں کہ ہر مصروفیت کی طرح سائنس کا صحیح مقصد تہذیب کی ترقی اور ذات انسانی کا نشو و نما ہونا چاہیے۔ سائنس کائنات کو سمجھنے کا ایک طریقہ ہے اس سے ذہنی، روحانی اور اخلاقی تسکین حاصل ہونی چاہیے۔

سائنٹفک طریقہ | بعض محققین کا یہ خیال ہے کہ سائنس کی تعلیم کا مقصد سائنٹفک طریقہ کی تربیت ہے اور اس کے معلومات بہم پہنچانا ہے تاکہ آئندہ چل کر زندگی کے عام مسائل کو حل کرنے میں یہ طریقہ استعمال کیا جا سکے اس کی تائید میں مسٹر آرم اسٹرانگ فرماتے ہیں "یہ سکھلانا چاہیے کہ وہ کیونکر محقق کی طرح مسائل کے حل کی طرف رجوع ہوں اور کیونکر اپنی ہی عقل کے ذریعہ قدرت سے اپنے سوالوں کے جواب حاصل کریں مسٹر آرم اسٹرانگ

کا مطلب یہی ہو کہ طالب علم واقعات کا باضابطہ مشاہدہ کرکے عام اصول اور نتائج اخذ کریں یہی سائنس کی روح ہو اور اسی کی تربیت کے لیے سائنس کی تعلیم ضروری ہو۔

سائنس کی تعلیم کے طریقے | سائنس کی تعلیم کے لیے مختلف طریقے تجویز کیے گئے ہیں۔ تدریس سائنس کی ایک طریقہ پر ہی منحصر نہیں ہونی چاہیے کیونکہ اس طرح کرنے میں دیگر طریقوں کی خوبیاں نظرانداز ہو جاتی ہیں۔ اس لیے مدرس سائنس کو چاہیے کہ سب طریقوں سے کماحقہٗ واقف ہو کر حسب موقع مناسب طریقے استعمال کرے۔

کارڈ کا طریقہ:۔ طالب علم کو ایک کارڈ دیا جاتا ہو جس میں ہر تجربہ کی تفصیلات درج رہتی ہیں طالب علم ان تفصیلات کی رہبری میں تجربہ شروع کرتا ہو۔ اس طریقہ میں طالب علم کو سوچنے اور بحث کرنے کا موقع نہیں ملتا اس لیے مدارس میں یہ طریقہ موزوں نہیں ہو سکتا ہو البتہ اعلیٰ تعلیم پانے والے طلبا کو اس طریقہ سے زیادہ نقصان نہیں پہنچتا۔

اہم مرکزی طریقہ:۔ مدرس یہ تصفیہ کر لیتا ہو کہ سائنس کا ایک نصاب جو علم میل، حرارت، برق اور کیمیا پر مشتمل ہو۔ چار سال میں ختم ہو۔ پہلے سال ہر چار مضامین میں وہ تھوڑا بہت کام لیتا ہو۔ دوسرے سال چاروں مضامین کو وسعت دیتا ہو اس طرح ایک سال کے مقابلہ میں آنے والے دوسرے سال کے دائرۂ معلومات میں وسعت دیتا رہتا ہو اور چاروں مضامین کی تدریس میں خاصہ اضافہ ہوتا رہتا ہو۔ اس طریقہ کو بعض مدرسین بہت پسند کرتے ہیں لیکن یہ طریقہ اسی وقت موزوں ہو سکتا ہو جبکہ ایک ہی مدرس چار سال تک تدریس کا کام انجام دے اگر مدرسین بدل جائیں جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہو تو یہ طریقہ موزوں نہیں ہو سکتا۔

تاریخی طریقہ:۔ سائنس کے کسی حصہ کو پڑھاتے وقت جب مدرس اس کی تاریخی ترقی ملحوظ رکھتا ہو تو اس کو تاریخی طریقہ کہتے ہیں۔ مدرس کو ان مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہو جس سے وہ اصول اور نظریے گزرے ہیں مثلاً ارشمیدس کا اصول بتلاتے وقت اس کی تاریخی رسائی بھی بتلانی پڑتی ہو جس کی وجہ سے طلبا عام طور پر دلچسپی محسوس کرتے ہیں اس طریقہ کو کامیاب بنانے کے لیے مدرس کو مضمون اور اس کی تاریخ دونوں میں کافی مہارت رکھنی پڑتی ہے۔

عنوانی طریقہ:۔ سائنس کا نصاب بجائے اس کے کہ طبعیات، کیمیا، نباتیات وغیرہ جیسے مضامین پر مشتمل ہو عنوانوں کا ایک سلسلہ ہوتا ہو جس سے متعلق سائنس کے اسباق ہوتے ہیں مثلاً پانی ایک ایسا عنوان ہو سکتا ہو جس پر کئی اسباق دیے جا سکتے ہیں اور ان میں پانی کی طبعیات، کیمیا اس کے روزمرہ کے استعمال اور قدرت کے کاموں میں اس کا حصہ بتلایا جا سکتا ہو اس سلسلہ میں تبخیر اور تکثیف کے اسباق اور شہر کی آب رسانی کا بیان بھی شامل ہو سکتا ہے۔

اس طریقہ پر عام طور سے ابتدائی اور بعض ثانوی مدارس میں تعلیم دی جاتی ہے۔ ممالک محروسہ سرکار عالی کے ادنیٰ ثانوی مدارس میں اسی طریقہ پر نصاب مرتب کیا گیا ہے۔

اکتشافی طریقہ:۔ اٹھارہویں صدی میں سائنس کی تعلیم کے طریقوں کی چھان بین کے لیے ایک کمیشن مقرر ہوا تھا اس نے اپنی رپورٹ میں بتلایا تھا کہ مدارس میں سائنس موثر طریقہ پر نہیں پڑھائی جاسکتی۔ انیسویں صدی میں بھی کوئی قابل اعتماد اور موثر طریقہ تجویز نہیں ہوسکا۔ بیسویں صدی میں آرم اسٹرانگ کی کوششوں سے اکتشافی طریقہ تجویز کیا گیا۔ اس طریقہ میں طالب علم مسئلہ خود نکالتا ہے حل خود دریافت کرتا ہے اور نتیجہ خود اخذ کرتا ہے۔ مدرس صرف سامان فراہم کردیتا ہے اور طالب علم کے کام میں صرف اس وقت دخیل ہوتا ہے جبکہ حادثہ کا اندیشہ ہو۔ اکتشافی طریقہ میں فطری طور پر سائنٹفک طریقہ کا تصور پنہاں ہے۔ آرم اسٹرانگ کی بھی یہی کوشش رہی کہ اس طریقہ سے طالب علم سائنٹفک طریقہ سیکھے اور وہ سائنٹفک طریقہ اس کی زندگی کے مسائل سمجھنے، ذہنی ضبط، حکمیاتی رجحان پیدا کرنے میں مددگار و معاون ہو۔

سائنس کی تعلیم کے لیے چند عملی تجاویز:۔ سائنس کے تمام نصاب میں طلبا کی دلچسپی فطری ذوق اور اشتیاق کو برقرار رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

۲۔ سائنس کی تدریس حتی الامکان وسیع اساس پر قایم کی جانی چاہیے۔

۳۔ سائنس کی تعلیم میں سائنس کا کتب خانہ ایک ضروری چیز ہونا چاہیے۔

۴۔ سائنس کے کمرہ میں تصاویر اور توضیحی نقشہ جات آویزاں رہیں۔

۵۔ مدرس سائنس کا ایک فرض یہ بھی ہو کہ حتی الوسع مشہور سائنسدانوں اور ان کے کارناموں کا ذکر کرتا رہے۔

۶۔ طلبا کو وقتاً فوقتاً تعلیمی و سائنٹفک دلچسپی کے مقامات کی سیر کرانی چاہیے۔ مثلاً برقی کی پیدائش کا مقام صابن کا کارخانہ۔

۷۔ سائنس کی انجمن مباحثہ قایم کی جائے جہاں مہینہ میں کم از کم دو بار سائنٹفک مسائل پر بحث و مباحثہ ہوا کرے۔

۸۔ تدریس سائنس میں اختصاصیت کو اختیار کرنا چاہیے۔

۹۔ دستی مشاغل نقش کشی اور سائنس میں ارتباط باہمی قایم کیا جائے۔ ان مندرجہ بالا تجاویز پر عمل کیا جائے تو سائنس کی تعلیم سے حقیقی فائدہ اور اس کے مقاصد کی تکمیل ہو کر طالب علم سائنٹفک زندگی گزارنے کے قابل ہوسکتا ہے اور یہی زندگی در اصل صحیح زندگی کہلائے جانے کی مستحق ہے۔

محمد مختار احمد بی اے بی سی مدد گار مدرس

(ڈاکٹر جے۔ بی۔ بیری انگلستان کے مشہور مورخ اور عالم ہیں۔ ذیل میں ان کی کتاب "تاریخ حریتِ فکر" کے ابتدائی باب کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ اردو میں درحقیقت اس موضوع پر تا حال کچھ بھی نہیں لکھا گیا امید ہے کہ یہ سطور دلچسپی سے پڑھی جائیں گی۔ ب۔ا)

کہا جاتا ہے کہ خیال آزاد ہوتا ہے۔ کسی شخص کو سوچنے سے باز نہیں رکھا جا سکتا تا وقتیکہ وہ اپنے خیالات کو دوسروں سے چھپائے رکھے۔ اس کے اس فعل پر اگر کوئی چیز پابندی عائد کرتی ہو تو وہ اس کا تجربہ اور تخیل کی سکت ہے۔ لیکن پوشیدہ سوچ بچار کی اس فطری آزادی کی کوئی وقعت نہیں۔ اگر اسے اپنے خیالات دوسروں تک پہنچانے کی آزادی نہ ہو تو یہ خود سوچنے والے کے لیے ناتسلی بخش بلکہ بسا اوقات تکلیف دہ ہو جاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس کے ہم جلیسوں کو تو کچھ فائدہ پہنچتا ہی نہیں۔ مزید براں جو خیالات ذہن پر حاوی ہوتے ہیں ان کو پوشیدہ رکھنا محال ہو جاتا ہے۔ اگر ایک شخص کا غور و فکر اسے اپنے ہم قوموں کے رسوم و رواج کا احتساب کرنے پر اکساتا ہو، ان کے عقائد قبول کرنے سے روکتا ہو اور زندگی کی بہتر و برتر راہیں تلاش کرنے کی دعوت دیتا ہو تو پھبتیوں، آوازوں اور مصائب کے خوف سے خاموشی اختیار کیے رہنا اس کے لیے تقریباً ناممکن ہے بشرطیکہ اپنے دلائل کی معقولیت کا اسے یقین ہو۔ بعض نے مثلاً سقراط[1] اپنے تصورات کو چھپانے اور دبانے کی نسبت موت کو ترجیح دی ہے اور اس سنت کا اتباع کرنے والے آج بھی نکل آئیں گے۔ مختصر یہ کہ آزادیٔ فکر اور آزادیٔ تقریر کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

آج کل بیشتر مہذب ممالک میں تقریر کی آزادی معمولاتِ زندگی میں سمجھی جاتی ہے۔ ہم اس کے ایسے عادی ہو چکے ہیں کہ اسے اپنا قدرتی حق سمجھتے ہیں لیکن یہ حق حاصل ہوئے کچھ ایسا بہت زمانہ نہیں گزرا اور اس کے حصول

[1] فرانس کے زوال (سنہ ۱۹۴۰ء) کے بعد متعدد فرانسیسی اہل فکر نے زبان بندی پر خودکشی کو ترجیح دی۔ بعض نے رضاکارانہ جلاوطنی اختیار کی اور اسی حالت میں وفات پائی۔ مترجم۔

کا راستہ خونیں وادیوں سے ہو کر گزرتا ہے۔ اہل اختیار کو یہ ذہن نشین کرانے میں صدیاں صرف ہوئی ہیں کہ اظہار رائے اور جملہ مسائل کو زیر بحث لانا اچھی بات ہے بری نہیں۔ بہ استثنائے چند انسانی سماج آزادی فکر ـــ یا دوسرے لفظوں میں نئے خیالات ـــ کا ہمیشہ مخالف رہا ہے اور اس کے اسباب معلوم کرنا کچھ ایسی مشکل بات نہیں ہے

ایک اوسط آدمی کا دماغ خلقتاً سست رفتار ہوتا ہے اور وہی طرز اختیار کرتا ہے جس میں مزاحمت کا کم سے کم احتمال ہوتا ہے۔ عام انسان کی ذہنی کائنات ایسے عقائد پر مشتمل ہوتی ہے جو اس نے بلا دلیل و حجت قبول کر لیے ہوں۔ وہ ان پر سختی سے قایم رہتا ہے۔ وہ جبلی طور پر ہر اس شے کا دشمن ہوتا ہے جو اس کی اس جانی بوجھی دنیا کے نظم کو درہم برہم کر دے۔ کسی نئے خیال کو قبول کرنے کا مطلب ہے ذہن کی از سر نو تدوین اور یہ کام خاصا وقت طلب ہے۔ کاوش اور دماغی ریاضت بھی چاہتا ہے۔ اکثریت کو نئے نظریات اور نئی آرا، ہوا دکھائی دیتی ہیں کیونکہ وہ عقائد اور را دارات کو مشکوک کرتی ہیں۔

یہ عدم مطابقت جو سراسر دماغی سہل انکاری کا نتیجہ ہوتی ہے خوف کے مثبت احساس کی بدولت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ قدامت پسندانہ جبلت اس دقیانوسی عقیدے سے کہ معاشری ڈھانچے میں چھوٹی سے چھوٹی تبدیلی بھی اس کی بنیادوں کو صدمہ پہنچاتی ہے قوی تر ہو جاتی ہے۔ حال ہی میں لوگوں نے اس خیال کو ترک کرنا شروع کیا ہے کہ ریاست کی بہبود کا انحصار دوامی استحکام اور روایات و ادارات کی بقا پر ہے جہاں کہیں یہ عقیدہ قایم ہے وہاں نئے نظریات کو خطرناک بلکہ دہشت انگیز سمجھا جاتا ہے اور جو شخص مسلمہ معتقدات کے بارے میں کیوں اور کیسے کے سوالات کرتا ہے اسے مفسد گردانا جاتا ہے۔

قدامت پسندانہ جبلت اور دقیانوسی نظریے (جو علت و معلول کا حکم رکھتے ہیں) کو واہمہ سے بھاری مدد ملتی ہے۔ اگر معاشری رسوم مذہبی عقائد کے ساتھ خلط ملط کر دی جائیں اور ان پر تقدس کا رنگ چڑھا دیا جائے تو ان پر نکتہ چینی ما فوق الفطرت کے خلاف بلا واسطہ چیلنج سمجھی جاتی ہے۔

جن طبقوں کا مفاد قایم شدہ اصول و معتقدات کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے وہ ان نفسیاتی محرکات کے ہتھیار کو استعمال کرتے ہیں جو نئے خیالات کے مقابلے میں دقیانوسی اسپرٹ کی تخلیق کے [illegible] اسی طرح مخالفت منظم شکل اختیار کر لیتی ہے۔

فرض کیجیے ایک قوم کا ایمان یہ ہے کہ چاند کی مختلف شکلیں خدائی اشارات ہیں۔ ان ہی کا ایک طباع بجائے اشکال قمری کی حقیقی وجہ معلوم کرلیتا ہے۔ اس کے ہم قوم اس کی دریافت کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں وجہ یہ ہے کہ اول تو وہ اسے اپنے بعض دوسرے نظریات سے ہم آہنگ نہیں پاتے۔ ثانیاً وہ ان کو مشوش کردیتی ہے کیونکہ اس سے عقاید کا ایک ایسا مسلک ٹوٹتا ہے جسے وہ اپنے لیے سودمند سمجھتے ہیں۔ ثالثاً وہ ان کو خوفزدہ کردیتی ہے کیونکہ وہ اس کو اپنے معبود کے خلاف اعلان جنگ کے مرادف خیال کرتے ہیں۔ مذہبی پیشوا جن کے فرائض میں آسمانی اشاروں کی تشریح و توضیح بھی شامل ہو ایسے نظریے سے بھڑک اٹھتے ہیں جس سے ان کے اقتدار کو دھکا لگنے کا خدشہ ہو۔

زمانۂ قبل از تاریخ میں ان محرکات نے اقوام کی رفتار ترقی کو یقیناً سست کردیا ہوگا اور بعض قوموں کو ترقی کی راہ میں بالکل ساکت کردیا ہوگا لیکن یہ محرکات تاریخ کے ہر دور میں کم و بیش برسرعمل رہے ہیں آج بھی ہم ان کو انتہائی ترقی یافتہ سماجوں میں بھی اپنا کام کرتے دیکھ سکتے ہیں اگرچہ انقلابی خیالات کو روکنے کی طاقت اب ان میں باقی نہیں رہی۔ آج بھی ایسے لوگ ملتے ہیں جن کو ہر نئے خیال سے وحشت ہونے لگتی ہے۔ وہ اسے مخدوش سمجھتے ہیں۔ اشتراکیت کے مخالفین میں کتنے ایسے ہیں جنھوں نے اس کے موافق اور مخالف دلائل کا خالی الذہن ہوکر مطالعہ کیا ہو؟ وہ اشتراکیت کا نام سن کر بھاگتے ہیں محض اس لیے کہ یہ فلسفہ ان کے ذہن کی پرسکون دنیا میں ہلچل مچا دیتا ہے اور جس نظام حیات کے وہ عادی ہیں اس کی کڑی تنقید کرتا ہے۔ اور ان کی تعداد کتنی ہے جو ہماری نامکمل ازدواجی رسوم میں رد و بدل کی تجاویز پر غور کرنے کے لیے تیار ہوں گے؟ سبب یہ کہ ایسا کرنے سے مذہبی جذبات و تعصبات کے مشتعل ہو جانے کا ڈر ہے۔ ممکن ہے وہ راستی پر ہوں۔ مگر بہر حال یہ ان کا قصور نہیں ہے۔ وہی محرکات ان کو بھی ترغیب دیتے ہیں جو عہد جاہلیت میں انسانی ترقی کے سد راہ ہوئے تھے۔ آزادی کی موجودہ فضا میں جب ہم اس ذہنیت کے حضرات کو ان لوگوں کے مقابلے میں کوسوں پچھڑا ہوا دیکھتے ہیں جو سدا علم کے پیاسے رہتے ہیں جن کی تشنگی بجھ کر بھی نہیں بجھتی تو لامحالہ ان دنوں کا خیال آجاتا ہے جبکہ اول الذکر کے ہاتھ میں معاشرے کی باگ تھی اور علم و فضل کے نخوداؤں کو سر بسر کرکے پہرے بٹھا دیے گئے تھے۔

اگرچہ اس زمانے میں ہر فرد کے خیالات کی تبلیغ کی کھلی اجازت ہے لیکن میری رائے میں اپنے خیالات کے بارے میں سرفروشانہ جذبات رکھنے والوں میں بھی ان حضرات کا شمار بہت ہی قلیل ہے جو اپنے اس حق کا چند

معقولیت کے ساتھ پیش کرسکیں۔ ہم بلا تکلف سمجھ لیتے ہیں کہ آزادی تقریر انسان کا پیدائشی حق ہے اور بات بدیہی یہی مخالفین کے اعتراضات کا مسکت جواب ہے لیکن یہ حق قایم کیسے ہوا یہ ثابت کرنا کارے دارد ہے۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ آدمی کو کوئی پیدائشی حقوق حاصل ہیں تو جان ومال کی حفاظت اور افزایش نسل لاریب ان حقوق میں شمار ہوں گے لیکن انسانی معاشرہ اپنے ارکان کو ان دونوں حقوق کے آزادانہ استعمال سے روکتا ہے۔ ایک بھوکے آدمی کو یہ مجاز نہیں کہ وہ کسی دوسرے کی روٹی اٹھالے۔ آزاد جنسی تعلقات بھی قانوناً یا رواجاً ممنوع ہیں۔ یہ امر مسلم ہے کہ سماج اس قسم کی تعزیرات عائد کرنے میں حق بجانب ہے۔ کیونکہ ان کے بغیر منظم معاشرہ وجود میں نہیں آسکتا۔ چنانچہ اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ آزادی رائے بھی اسی طرح کا حق ہے تو قانون رائج الوقت سے اس کی بے نیازی معلوم اور بہی مداخلت کی صورت میں معاشرے کو مورد الزام ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ مگر اس کے برعکس رعایت مناسب حد سے کچھ زیادہ ہے کیونکہ جہاں دیگر امور میں تحدید ہر شخص کے چلن پر اثر انداز ہوتی ہے وہاں آزادی رائے کے معاملے میں مقابلۃً تھوڑے سے دماغوں پر ۔۔۔ جن کی کوئی اپنی رائے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ پیدائشی حقوق کے تصور کو نیو ٹھہرا کر ٹھوس استدلال کی عمارت کھڑی نہیں کی جاسکتی کیونکہ اس طرح فرد اور جماعت سے متعلق مسائل کا ایک اُلجھا ہوا سلسلہ چھڑ جائے گا۔

برخلاف اس کے جن لوگوں پر سماج پر حکومت کرنے کی ذمہ داری ہے وہ کہہ سکتے ہیں کہ مضرت رساں خیالات کی اشاعت کو روکنا بھی ہمارے فرائض میں اسی طرح شامل ہے جیسے ناشائستہ حرکات کا امتناع۔ نیز یہ کہ ایک آدمی بہ نسبت اپنے پڑوسی کا گھوڑا چرالے یا اس کی بیوی سے اظہار عشق کرنے کے تمدن دشمن نظریوں کی تشہیر کرکے زیادہ مضر اثرات پیدا کرسکتا ہے۔ وہ یہ دلیل بھی دے سکتے ہیں کہ ریاست کی فلاح کی ذمہ داری ہم پر ہے اگر ہم کو یقین ہو جائے کہ فلاں نظریہ خطرناک ہے اور سماج کے سیاسی، مذہبی یا اخلاقی کلیات کو صدمہ پہنچا سکتا ہے تو یہ ہمارا فرض ہے کہ معاشرے کو اس کی زد سے باہر رکھیں

حریت فکر کی تحدید والی دلیل کا صحیح جواب حسب موقع آئندہ صفحات میں دیا جائے گا۔ یہ کوئی پیش پا افتادہ شے نہیں ہے اس تعبیر پر پہنچنے کے لیے مدت دراز درکار تھی کہ فکری آزادی کا گلا گھونٹنا مہلک غلطی ہے اور ابھی تک بھی انسانی آبادی کے صرف ایک حصے کو اس کا یقین دلایا جاسکا ہے جہاں تک میں اندازہ لگا سکا ہوں فیصلہ

انسانی ذہن کے افضل ترین نتائج میں سے ہے۔ صدیوں تک یہ سوال اہل اختیار اور ادراک کے درمیان استخوانِ نزاع بنا رہا۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لفظ اختیار ـــــ اقتدار، حکم ناطق کی صراحت کر دی جائے۔

اگر آپ کسی سے پوچھیں کہ فلاں بات تم کیونکر جانتے ہو؟ تو وہ جواب دے گا کہ میں نے فلاں ماخذ سے استنباط کیا ہے یا یہ کہ فلاں کتاب میں پڑھا ہے یا یہ ایک ایسی چیز ہے جس کا علم ہر شخص کو ہے وغیرہ۔ ان جوابات سے مترشح ہے کہ مجیب نے دوسروں سے کسب علم کیا ہے، دوسروں کا سہارا لیا ہے، ان کی معلومات پر بھروسہ کیا ہے۔ ان کے جوابات کا تجزیہ نہیں کیا۔ نہ خود ہی غور و فکر کی زحمت برداشت کی ہے۔ اکثریت کے علم کا بڑا حصہ اسی ذیل میں آتا ہے کہ بے سوچے سمجھے والدین استادوں، ملنے جلنے والوں، کتابوں اور اخبارات سے اخذ کیا گیا ہے۔ جب کوئی انگریز لڑکا فرانسیسی زبان سیکھنے لگتا ہے تو وہ الفاظ اور ان کے معانی یا تو اپنے استاد سے دریافت کرتا ہے یا کسی کتاب کی مدد سے سیکھتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ نقشہ عالم پر کلکتہ نام کا ایک خوبصورت اور گھنا آباد شہر ہے زیادہ تر لوگوں کے لیے شک و شبہ سے بالا ایک مانی ہوئی سچائی کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی کیفیت نپولین یا جولیس سیزر کے وجود کی ہے۔ فلکیات کے مشہور اصول بھی اسی طریق پر مانے اور سمجھے جاتے ہیں سوائے ان لوگوں کے جنھوں نے بطور خود اس علم کا مطالعہ کیا ہو ظاہر ہے کہ ہم دوسروں کی معلومات پر تکیہ نہ کرتے تو انسان کا علم بہت محدود رہتا۔

لیکن ہم اپنے اس فعل کو ایک شرط کے ساتھ ہی حق بجانب ثابت کر سکتے ہیں وہ یہ کہ جن باتوں کو ہم اپناتے ہیں مشاہدہ یا تزکیہ سے ان کی توثیق کی جا سکے۔ مندرجہ بالا مثالیں اسی امر میں شامل ہیں۔ لڑکا فرانس جا کر یا کسی فرانسیسی کتاب کے ذریعہ استاد کے قول کا جھوٹ سچ معلوم کر سکتا ہے۔ کلکتہ کی موجودگی کی جانچ بھی کلکتہ کا سفر کر کے کی جا سکتی ہے، لیکن نپولین کے وجود و عدم وجود کا پتہ اس طریقہ سے نہیں لگایا جا سکتا۔ تاہم تھوڑی سی کوشش سے ایسی متعدد براہین جمع کی جا سکتی ہیں جو اس کے عدم وجود کو پا در ہوا ثابت کر دیں گی بلاشبہ زمین سے سورج کا فاصلہ..... ۹۲ میل ہے کیونکہ تمام ماہرین فلکیات اس پر متفق ہیں اور عملاً اس کا ثبوت دیا جا چکا ہے۔ یہی ان کے مفروضہ کا واحد جواز ہے اور اگر مجھے ان کے بیان میں شک ہو تو خود کافی غسل لے کر اس کی پڑتال کر سکتا ہوں یقیناً میں بھی اسی نتیجہ پر پہنچوں گا۔

مگر ہمارے نفسی ڈھانچے کے سب کل پرزے ایک سے ہی نہیں ہیں۔ ایک اوسط آدمی کے خیالات

کے ڈانڈے ان حقیقتوں سے گزر کر جن کا ثبوت پیش کیا جاسکے اس قسم کے عقائد سے جا ملتے ہیں جو اس نے من وعن قبول کرلیے ہیں اور جن کی ماہیت کو وہ کسی طور سے ثابت نہیں کرسکتا۔ تثلیث پر ایمان لانا کلکتہ کے وجود پر یقین کرنے سے بہر کیف مختلف ہے۔ اس کی کھوج میں ہم کلیسا سے آگے نہیں بڑھ سکتے اور اگر ہم اسے قبول کرتے ہیں تو صرف اس لیے کہ کلیسا کے حکم ناطق پر ہمیں غیر متزلزل اعتماد ہے۔

دونوں قسم کے عقائد میں ایسا نمایاں فرق ہے کہ اس کا دوہرانا عبث معلوم ہوتا ہے تاہم ہر چھوٹے بڑے نکتے کو صاف کردینا لازمی ہے۔ قدیم انسان نے اپنے بزرگوں سے سن رکھا تھا کہ پہاڑوں میں ریچھوں اور ارواح خبیثہ کا مسکن ہے۔ اتفاقاً کسی ریچھ سے اس کی مڈبھیڑ ہوگئی چنانچہ اول الذکر کی تصدیق ہوئی لیکن اگر اسے کوئی سفلی روح نظر نہ آئی تو وہ (غیر معمولی فہم و ذکاوت کا حامل ہونے کی صورت میں) دونوں بیانات میں قطعی امتیاز نہ کرتا اور کوئی دلیل پیش کرتا تو یہی کہ چونکہ اس کے ہم قبیلہ لوگوں کا عندیہ ریچھ کے بارے میں درست ہے لہذا ناپاک ارواح کے بارے میں قطعاً صحیح ہے۔ قرون وسطیٰ کا انسان جو اس بات میں یقین رکھتا تھا کہ قسطنطنیہ نام کا شہر روئے زمین پر ہے اور یہ کہ دمدار تارا قہر خداوندی کا مظہر ہوتا ہے وہ ان دونوں بیانات میں تمیز کرنے کا اہل نہیں تھا۔ آج بھی آپ کو ایسی براہین سے دوچار ہونا پڑتا ہے: "اگر میں دوسروں کے اس قول کو درست سمجھ سکتا ہوں کہ کلکتہ کا وجود ہے تو کیا یہ یقین کرنے کا مجاز نہیں ہوں کہ شیطان بھی کوئی شے ہے"

مختصر یہ کہ ہر زمانے میں لوگ کسی نہ کسی حکم ناطق مثلاً رائے عامہ، کلیسا یا اذعانی عقائد کے زیر اثر رہے ہیں فطرت اور انسان سے متعلق بیشتر عقیدوں نے جو عقلی مشاہدے پر مبنی نہیں تھے بالواسطہ یا بلا واسطہ طور پر مذہبی اور معاشری مفادات کی معاونت کی اور اس کے صلے میں ان لوگوں کی دستبرد سے ان کی حفاظت کی جاتی رہی جو استدلال کی تکلیف دہ عادت میں مبتلا تھے۔ اگر زید کا ہمسایہ دن کو رات کہتا ہے تو اسے اس کی پروا نہیں۔ اگر ایک شک پرست نپولین کی ہستی سے انکار کرتا ہے یا کہتا ہے کہ پانی آکسیجن اور ہائڈروجن سے مرکب نہیں تو زیادہ سے زیادہ لوگوں کی تضحیک کا نشانہ بنتا ہے لیکن درحالیکہ وہ ان نظریات کے بارے میں شک وشبہ کا اظہار کرے جن کا ثبوت ممکن نہیں جیسے خدا کا ہونا یا روح کی ابدیت تو اس کی یہ حرکت سخت قابل اعتراض ہے حتی کہ اسے موت کی نیند سلانے کو کافی ہے۔ ہمارے عہد وسطیٰ والے دوست کو لوگ احمق خیال کرتے اگر وہ قسطنطنیہ کے وجود کا منکر ہوتا مگر

ہمارے ستارے کی اہمیت کو گھٹانے کی صورت میں بلا شبہ وہ مشکلات کے جال میں ضرور پھنس جاتا اگر اس کی حماقت اس حد تک پہنچ جاتی کہ وہ یروشلم کے وجود سے انکار کرتا تو سمجھ لیجیے کہ اسے گھر سے نکلنا دوبھر ہو جاتا کیونکہ یروشلم کی موجودگی پر انجیل شہادت دیتی ہو۔

قرون وسطیٰ میں ارباب اختیار کے ٹھونسے ہوئے عقائد ساری فضا پر چھائے ہوئے تھے اور عقلیت کو بیک بینی و دوگوش نکال باہر کر دیا گیا تھا لیکن استدلال کوئی استبدادی پابندی برداشت نہیں کر سکتا تجربہ کی دنیا کا بلا شرکت غیرے مالک ہو اور چونکہ اس کے اجزا باہم مربوط ہیں اور ایک دوسرے پر انحصار رکھتے ہیں چنانچہ وہ کسی ایسی سرزمین کو تسلیم نہیں کر سکتا جہاں اسے آزادخرامی کی اجازت نہ ہو نہ کسی ایسی طاقت کے آگے سر جھکا سکتا ہو جس کے احکام کو اس نے عقلیت کی کسوٹی پر پرکھ کر صادر نہ کیا ہو۔

خیال کی دنیا میں استدلال کی زعیمانہ حکومت کے کاروبار کو عقلیت کا نام دیا جاتا ہو۔ آج تک بھی اس اصطلاح کے گرد مغالطوں کا جو جال تنا ہوا ہو وہ یہ اندازہ لگانے کے لیے کافی ہو کہ ماضی میں عقل و اختیار کی جد وجہد کتنی تند رہی ہوگی۔ اس لفظ کا استعمال محض الٰہیات تک محدود ہو۔ سبب یہ کہ یہی وہ میدان ہو جہاں عقلیت کی سرتوڑ مخالفت کی جاتی تھی۔ اسی طرح حریت فکر کو بھی الٰہیات سے ایک مخصوص مناسبت پیدا ہوگئی ہو۔ اس آویزش میں شروع سے اخیر تک اختیار کو عظیم مراعات حاصل رہی ہیں۔ ہر دور میں حقیقی حامیان عقلیت کی تعداد بے حد قلیل رہی ہو اور غالباً مستقبل قریب میں بھی اس میں اضافہ کی کوئی امید نہیں عقلیت کا واحد آلۂ کار ہو دلائل و براہین۔ مگر اختیار نے جسمانی اور اخلاقی تشدد سے قانونی دباؤ اور مجلسی مقاطعہ تک ہر ہتھیار کا استعمال جائز رکھا ہو بعض اوقات عقلیت نے اپنے حریف کی تلوار استعمال کی لیکن اس کا نتیجہ اس کی اپنی جرأت کے سوا کچھ نہ نکلا لطف یہ کہ انسان ہونے کے باعث اختیار کے حامی آپس میں بحث و تکرار کیے بغیر نہ رہ سکتے تھے چنانچہ اکثر ان میں پھوٹ پڑ جاتی۔ استدلال کا موقع ہاتھ آجاتا اور اس طرح بیک وقت پوشیدہ اور کھلم کھلا مخالف کیمپ میں پہنچ کر اپنی فتح کا ناقوس پھونک دیتا۔

یہاں یہ اعتراض کیا جا سکتا ہو کہ اختیار کے حق میں اس قسم کے نظریات کا خاصہ ذخیرہ ہو جن کا ثبوت پہنچانا انسان کے دائرہ پرواز سے باہر ہو۔ اس کے ساتھ ہی ان کا بطلان بھی ناممکن ہو۔

بے شک ایسی کتنی ہی باتیں گھڑی جا سکتی ہیں جن کا بطلان ناممکن ہو اور جو شخص چاہے اپنی زود اعتقادی کو ان پر صرف کر سکتا ہو لیکن ہوشمند انسان اس کی تائید نہ کرے گا کہ ان کے حسن و قبح کو تولے بغیر ان پر ایمان لایا جائے اور اس کام کے لیے عقلیت کے علاوہ دوسری کونسی میزان کام میں لائی جا سکتی ہو؟ اگر اس استفسار کا جواب بے اختیار تو عرض ہو کہ ایسے بے شمار عقائد جن کو اختیار کی پشت پناہی حاصل تھی بالاخر غلط ثابت ہوگئے اور ہمہ گیر ترک احتراز کا شکار ہوئے۔ اس کے باوجود بعض لوگ کہتے ہیں کہ جب تک کسی مذہبی عقیدے کا بطلان پایۂ ثبوت کو نہ پہنچ جائے اس کو ٹھکرانا ناواجب ہو لیکن ثبوت کی ذمہ داری ٹھکرانے والے پر تو عائد نہیں ہوتی۔ یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہو۔ ایک گفتگو کے دوران میں کسی کے منھ سے دوزخ کے متعلق کوئی نازیبا لفظ نکل گیا۔ ایک دردمند نے جھٹ شان کے ساتھ کہا، "ممکن ہو دوزخ کا تصور آپ کو موہوم معلوم ہوتا ہو لیکن آپ اس کا عدم وجود ثابت نہیں کر سکتے" یہ تو بالکل وہی بات ہوئی جیسے کوئی آپ سے کہے کہ ایک خاص سیارے میں گدھوں کی آبادی ہو جو انگریزی زبان بولتے اور نسلیات سے بہت دلچسپی رکھتے ہیں۔ ظاہر ہو کہ اس بیان کا جھٹلانا آپ کے بس کا روگ نہیں لیکن کیا محض اسی وجہ سے آپ اس پر ایمان لے آئیں گے؟ عین ممکن ہو کہ اگر اس مفروضہ کو خطابت اور لفاظی کے سانچہ میں ڈھال کر بار بار پیش کیا جائے تو کئی اشخاص اسی کی صحت پر یقین کرلیں۔ خطابت اور چرب زبانی (جدید طریقۂ اشتہار بازی کی نظری اساس) کو مذہبی، معاشری عقائد کی تبلیغ میں بڑا دخل رہا ہو۔ خوش قسمتی سے استدلال کو بھی ان قوا سے استفادہ کرنے کا موقع ہو۔

حریت فکر ایک ایسا مضمون ہو جس کی بے پناہ وسعتوں میں مذہب و کلیسا اور بدعات و تعذیب کی تاریخ ہی نہیں بلکہ فلسفہ، مطالعۂ قدرت اور سیاسی نظریات کا عہد بہ عہد کا ارتقا بھی سمایا ہوا ہو۔ ان مذاکرات کو ایک لڑی میں پرونے کے لیے عمر خضر اور دفتر بے پایاں درکار ہو۔ ایک شخص زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہو کہ عقلیت کی جد و جہد کے عام رخ اور بہاؤ کو اجمالاً بیان کر دے۔

مترجمہ بلال احمد

سوویٹ روس کا اقتصادی نظام

پچھلے سالوں میں کئی ملکوں نے اپنے لیے اقتصادی نظام بنائے مگر صرف روس ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں اقتصادی نظام کو کسی اصول کے ماتحت مکمل طور پر ترتیب دیا گیا ہے۔ اس لیے یہاں کا اقتصادی نظام سب سے زیادہ قابل توجہ ہے لیکن اس پر کسی قسم کا نقد و تبصرہ کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ روس کا مسئلہ کن معاملات میں دوسرے ملکوں — خصوصاً مغربی یورپ اور شمالی امریکہ کے زیادہ صنعتی، زیادہ مالدار اور زیادہ ترقی یافتہ ملکوں — سے ملتا اور کن معاملات میں ان سے جدا تھا۔

ہمیں روس اور ان ممالک میں واضح اختلاف نظر آتے ہیں۔ یہاں کا اقتصادی نظام، جنگ، انقلاب، خانہ جنگی اور اقتصادی ناکہ بندی کا نتیجہ تھا۔ پرانے زارشاہی دستور میں ایک طرف تو بڑے بڑے کارخانے چل رہے تھے اور دوسری طرف کاشتکاری کی پیداوار حد سے زیادہ گر رہی تھی یہ تضاد جنگ کے دباؤ کی وجہ سے جلد ہی دھڑام سے آرہا۔ یہ سب کچھ زیادہ ترقی یافتہ محارب قوموں کی نسبت زیادہ تیزی سے اور زیادہ مکمل طور پر ہوا۔ یہ اقتصادی شکست، فوج کی ہار انقلاب کے لیے راستہ صاف کرنے کا اہم باعث بن گئی۔ انقلاب کے وقت اقتصادی عمارت کانپ رہی تھی یہ جنگ سے پہلے کے روسی نظام کے کھنڈروں پر کھڑی تھی۔ بالشویکوں نے ملک پر قبضہ کرلیا۔ جنگ نے روس کو ختم کرکے رکھ دیا تھا۔ روزمرہ کی ضرورتیں تک میسر نہ آتی تھیں اور نئی پیداوار کے لیے کوئی ذرائع باقی نہ رہے تھے۔

علاوہ ازیں ۱۹۱۷ء کے انقلابات کے بعد جو صورت کچھ عرصہ تک قایم رہی تھی۔ اس میں حالات کا بد سے بدتر ہو جانا ضروری تھا۔ لووف اور کرنیسکی کے زمانے میں اقتصادی انحطاط بڑھتا چلا گیا چنانچہ بالشویکوں کو اپنے اقتدار کے پہلے سالوں میں مسلسل خانہ جنگیوں کا سامنا کرنا پڑا اور غیرملکی مداخلت اور اقتصادی ناکہ بندی نے اور بھی پیچیدگیاں پیدا کردیں۔ اس ابتری کے دور کے بعد پیداوار کے کچھ آلات بچ تو رہے تھے مگر بالکل شکستہ حالت میں ان کی مرمت کے لیے ملک میں کافی وسائل موجود نہ تھے اور نہ ملک میں ایسا سامان تھا کہ نئے آلات بنائے جاسکتے۔ روس کا اشتراکی کارکن بیرونی دنیا سے بھی ضروری آلات نہ منگوا سکتا تھا۔ اب صرف یہی ہو سکتا تھا کہ جو

کارخانے، کانیں اور ریل گاڑیاں چل رہی تھیں انھیں جاری رکھا جائے۔ جو آلات بدلے نہ جاسکتے تھے۔ جیسے جیسے وہ گھستے یا ٹوٹتے گئے صنعتی پیداوار بھی کم ہوتی چلی گئی۔ کسانوں نے زمین پر قبضہ کرلیا تھا۔ باقی ضروریات زندگی کے لیے ان پر انحصار کرنا پڑتا تاکہ آبادی بھوکوں مرنے سے بچ جائے اور قحط نہ پھیلے۔

اب ایک اور مشکل کا بھی سامنا تھا۔ روس میں ذہین اور باخبر کاریگروں، فن دانوں، ہر قسم کے منتظموں اقتصادی اور حکومتی تنظیم کے ماہروں کی کمی تھی جب تک خانہ جنگیاں جاری رہیں جس قسم کے لوگ بھی میسر آسکتے تھے ان سے ضروری کام لیا جاتا رہا لیکن اقتصادی تعمیر نو کی تمام وسیع تجاویز کو ملتوی کرنا پڑا جب تک کشمکش ختم نہ ہوئی کوئی اقتصادی تنظیم نہ کی گئی اور نہ کی جاسکتی تھی۔ اس عرصہ میں اشتمالیوں کو موقعہ مل گیا کہ وہ تباہ شدہ اقتصادی مسائل کا جائزہ لے سکیں اور انھیں یقین بھی ہوگیا کہ ملک پر اب ان کا قبضہ ہو اور اسے ان کو اپنے ارادوں کے مطابق نئے سرے سے بنانا ہے۔

پھر بھی سب سے پہلا کام بڑھتی ہوئی بھوک کو دور کرنا تھا۔ تمام وسیع تجاویز کو کچھ عرصہ کے لیے پس پشت ڈالدیا گیا تاکہ تمام ذرائع اس فوری خطرہ کو روکنے کے لیے کارآمد ہوسکیں۔ جب جنگ کا دباؤ کم ہوا تو لینن نے کم از کم ایک میدان (برقانے کے کام) کے لیے ایک نقشہ بنانا شروع کردیا۔ با اصول اقتصادی نظام کے آغاز کے لیے بجلی کا انتخاب بالشویکوں کے دلی خیالات کی اچھی طرح ترجمانی کررہا تھا۔ تمام روس کی برقی ترقی کی تجویز۔ مرتبہ سنہ ۱۹۲۰ء پنجسالہ اسکیم کے لیے تیاری تھی۔ اگرچہ بجلی کے میدان میں فوراً ہی کام شروع کردیا گیا لیکن باقی تجاویز کو ملتوی کرنا پڑا تاکہ روزمرہ کی فوری ضروریات کے لیے جتنی پیداوار کی ضرورت تھی وہ مسمار شدہ اقتصادی نظام سے جہاں تک ہوسکے حاصل کی جاسکے۔

چنانچہ "حربی اشتمالیت" کی جانشین نئی اقتصادی پالیسی تھی یعنی کچھ عرصہ کے لیے بے نظم شخصی تجارت و پیداوار کی طرف رجوع کیا گیا لیکن اس کا مطلب سرمایہ داری کی طرف رجوع نہ تھا کیونکہ بڑی بڑی صنعتوں کو آہستہ آہستہ سرکاری قبضہ اور انتظام کے ماتحت کردیا گیا۔ بیرونی تجارت پر ریاست کا مکمل تسلط تھا۔ خردہ فروشی کا اکثر کاروبار سرکاری دوکانیں اور سرکار کے ماتحت امدادی جماعتیں کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ سوویٹ کا سیاسی قلعہ ایک لمحہ کے لیے بھی کمزور نہ ہوا۔ چنانچہ نئی اقتصادی پالیسی نے جو مراعات دی تھیں وہ ضروریات

زندگی مہیا کرنے کے لیے ہر وقت بدلی یا ختم کی جا سکتی تھیں اس نئی پالیسی نے شخصی تاجروں اور چھوٹے پیمانہ پر شخصی پیداوار کرنے والوں کو عارضی طور پر بڑی بڑی رعائتیں دی تھیں۔ اس طرح پیداوار کی افزایش کے لیے نفع کا لالچ عارضی طور پر جائز قرار دیا گیا۔ اجناس کی پیداوار اور تقسیم کی خاطر اس نے "منڈی" اور قیمت کا دستور کافی حد تک بحال کر دیا۔ لیکن یہ تمام سرمایہ دارانہ طریقے اشتمالی سیاسی طاقت کے ماتحت بروئے کار تھے یعنی جتنی سرمایہ داری دوبارہ قایم کی گئی وہ سوویٹ قوت کے ماتحت تھی اور اسے کوئی آزاد اقتصادی طاقت حاصل نہ تھی۔

نئی اقتصادی پالیسی نے روس کو فوری بحران سے بچا دیا اور حقیقی اقتصادی تنظیم کو ممکن کر دیا۔ جوں ہی یہ صورت پیدا ہوئی لینن کے جانشینوں نے تندہی سے کام شروع کر دیا۔ نئی اقتصادی پالیسی نے پہلی پنج سالہ اسکیم کے لیے راستہ صاف کر دیا۔

جو حالات روس میں موجود تھے اگر وہ مغرب کے کسی دوسرے ملک میں پائے جاتے تو کسی اقتصادی تنظیم کا نفاذ مشکل تھا۔ ان حالات کو رونا کرنے کے لیے سب سے پہلے نہ صرف جنگ کا بلکہ خانہ جنگی کا ہونا بھی ضروری تھا۔ علاوہ ازیں روس میں سوویٹ دور کے اوائل میں صنعتی طاقت جتنی ابتر ہو چکی تھی کسی دوسرے ترقی یافتہ ملک میں وہی صنعتی ابتری پیدا کرنے کے لیے ایک طول طویل تباہ کن جنگ ضروری تھی۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جنگ کے بعد برطانیہ، جرمنی اور امریکہ کی صنعتی پیداوار روس سے کہیں زیادہ تھی۔

زراعت کی حالت اس کے بالکل برعکس تھی۔ روس میں برطانیہ اور جرمنی حتیٰ کہ امریکہ سے بھی زیادہ خوراک موجود تھی۔ اگر روس میں مغربی معیار زندگی رائج ہوتا تو آبادی کو بھوک کا سامنا کرنا پڑتا۔ لیکن بھوکوں پھر بھی مرنا پڑتا۔ شہری آبادی کو خوراک مہیا کرنے کا مسئلہ اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ لیکن آبادی کا اتنا کثیر حصہ دیہاتوں میں رہتا تھا کہ خوراک کا مسئلہ وہ صورت ہی اختیار نہ کر سکا جس کا کسی بھی شہری اکثریت والے ملک میں اقتصادی انتشار کے بعد پیدا ہو جانا ضروری تھا۔ خوراک پیدا کرنے کے ذرائع ابھی تک موجود تھے۔ اگرچہ ہر قسم کے زراعتی آلات کی نمایاں کمی بہت نقصان کا باعث ہو رہی تھی۔ تاہم روس بدترین حالت میں بھی اپنے ملک ہی کی پیداوار سے اپنی ضروریات پوری کر سکتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ قحط پڑ رہے تھے اور مہیا زندگی ہر جگہ گر رہا تھا۔ اگر برطانیہ میں خوراک کی درآمد بند ہو جائے تو اس کی آبادی بھوکوں مر جائے۔

لیکن روس میں کبھی اس کا خطرہ بھی پیدا نہ ہوا۔

ان حالات میں روسی جد و جہد کی صورت ہی بدل گئی نئی اقتصادی پالیسی کے صنعتی جز کا مطلب زیادہ تر یہ تھا کہ کسانوں کو اناج کے عوض میں صنعتی اجناس دی جائیں۔ چنانچہ کارخانوں کی پیداوار بڑھانے کیلیے تمام وسائل اکٹھے کیے گئے اور انھیں بہتر بنایا گیا یعنی کچھ صنعتوں کو وسیع پیمانہ پر چلانے کی تجویز نئی اقتصادی پالیسی ہی کے ضمن میں تھی۔ جب اس نئی پالیسی کی وجہ سے خوراک کے قحط کا خطرہ دور ہو گیا تو یہ ممکن ہو گیا کہ اس کی ضمنی صنعتی تجویزوں کی بنیادوں پر تمام صنعت کے لیے بحیثیت مجموعی ایک جامع اسکیم بنائی جائے۔ کچھ عرصہ تک نظم صنعت کو بے نظم زراعت کا سامنا کرنا پڑا لیکن جوں ہی صنعتی تنظیم کی بنیادیں پختہ ہو گئیں۔ سٹالین نے نہایت عجلت۔ بلکہ غیر ضروری عجلت کے ساتھ زراعت میں بھی تنظیم کا کام شروع کر دیا۔ امریکی خیالات کے زیر اثر زراعتی پیداوار کو وسیع پیمانہ پر بڑھانے کی تجویز ممکن خیال نہ کی گئی۔ جو زمینیں پہلے بے کاشت پڑی رہتی تھیں ان میں بڑے بڑے سرکاری کھیت قایم کیے جا چکے تھے۔ زراعتی ترقی کی طرف اسے بہت بڑا قدم سمجھا گیا اور سٹالین نے اجتماعی کھیتوں تک اپنی تجویز محدود رکھی یعنی تعاونی کھیت قایم کیے گئے جن میں زیادہ تر مشترکہ طور پر پیداوار کی جاتی لیکن مویشیوں اور آلات کی شخصی ملکیت کا پرانا دستور بھی کچھ حد تک باقی تھا اور کہیں کہیں ان تعاونی کھیتوں میں شخصی کاشت بھی ہوتی تھی۔

یہ امر واضح ہو کہ روس کے اجتماعی کھیتوں کی قسم کا کوئی ادارہ کسی بھی مغربی ملک میں رائج نہیں کیا جا سکتا تھا جہاں کی زراعتی روایات روس سے بالکل جدا ہوں۔ روس میں یہ ادارہ دیرینہ کاشتکاری کے نظام کا نتیجہ تھا۔ اس نظام نے ابھی تک جاگیرداری کی اجتماعی خصوصیات مکمل طور پر ترک یا فراموش نہیں کی تھیں۔ انگلستان میں مزارعوں کا رواج ہے فرانس میں کاشتکار ہی زمین کے مالک ہیں اور امریکہ اور کینیڈا میں مکان کے ساتھ ہی کھیت ہوتا ہے۔ ان دستوروں کو اجتماعی کھیتوں کے اداروں میں بدلنا ناممکن ہے صنعت کے میدان میں روسی وسیع پیمانے پر کام کر سکتے تھے اور امریکی سرمایہ داری کی تو بالخصوص پیروی کر سکتے تھے کیونکہ زار شاہی روس میں جو صنعت موجود تھی وہ زیادہ تر جدید قسم کی تھی اور زیادہ ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک کی براہ راست مقلد تھی لیکن روسی زراعت بالکل پرانی قسم کی تھی اور اس میں دیہی دور کے کسانی نظام کی اجتماعی خصوصیات موجود تھیں۔ سٹالین نے یہ کوشش کی کہ اس قدیم اجتماعیت کو

کسانی اجتماعیت کی بنیاد بنائیں اور زرعی نظام میں ترقی یافتہ انفرادی نظام کا مجبوری دوررائج نہ کریں۔

روس کے شہروں میں طبقاتی امتیازات مغربی ممالک کی نسبت زیادہ واضح تھے۔ دیہاتوں میں زمیندار موجود تھے وہ عموماً کچھ لوگ ملازم رکھ لیتے تھے اور اپنی اور ان ملازموں کی پیداوار کا کاروبار کیا کرتے۔ یہ زمیندار ایک کثیر درمیانی طبقہ کی حیثیت رکھتے تھے اور بعض خصوصیات کے اعتبار سے وہ زیادہ ترقی یافتہ ممالک کے چھوٹے بورژوا طبقہ کے مشابہ تھے مگر شہروں کا درمیانی طبقہ تھوڑی تعداد میں تھا اور زیادہ تر سرکاری ملازمت کرتا تھا چنانچہ پرانے نظام کے زوال نے ان کے اقتدار کو ختم کر دیا۔ کارخانوں کے کاریگروں کی زیادہ تعداد غیر ملکی تھی۔ اور انقلابی جدوجہد کے دوران میں ان کی اکثریت اپنے وطنوں کو واپس چلی گئی تھی۔ پرولتاری طبقہ کی تعداد کسانوں سے کم تھی اور مغربی ممالک کے صنعتی مزدوروں کی نسبت ان میں یکسانیت بھی زیادہ تھی اور انھیں لوٹا کھسوٹا بھی زیادہ جاتا تھا۔ چونکہ روسی کارخانے بڑے بڑے تھے اس لیے ان مزدوروں میں زیادہ ربط موجود تھا جو ان ممالک میں نہیں پایا جاتا جہاں کے کارخانے زیادہ بکھرے ہوئے ہوں۔ کاریگروں کی کمی نے پیداواری قابلیت کی بحالی مشکل بنا دی لیکن اتنا اطمینان البتہ تھا کہ انقلابی جدوجہد کو مسخ کرنے والا درمیانی طبقہ بہت تھوڑی تعداد میں ہوا اور جب مظلوم پرولتاری طبقہ کو اپنے ہی وسائل پر گزارہ کرنا پڑا تو عوام میں ایک ہیجان سا پیدا ہو گیا جو نئے اقتصادی نظام کے بانیوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوا۔ اگر شہروں میں چھوٹے بورژوا طبقہ کی تعداد زیادہ ہوتی تو وہ یقیناً دیہاتوں کے زمینداروں کے ساتھ مل کر پرولتاری نظام کے اجرا کا مقابلہ کرتا اور اشتمالی بھی ان زمینداروں کے استیصال کے لیے اتنی بیدردی سے کام نہ لیتے۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو بہت اچھا ہوتا۔ کیونکہ جس بیدردی کے ساتھ زمینداروں کا استیصال کیا گیا وہ صرف انقلابی روس ہی کا نہیں بلکہ اشتمالی پالیسی کا بھی بھیانک باب ہے اور پہلی پنج سالہ اسکیم کے اجرا کے وقت ہی سے اس نے سوویٹ حکومت کو انہدام کے قریب ترین کر رکھا ہے۔ جبری اجتماعیت اور زمینداروں کے خاتمہ کا یہ نتیجہ نکلا کہ روسی زراعت کو نااہلوں کی زیادہ تعداد چھوڑ گئی اور سنہ ۱۹۳۰-۳۱ء میں مویشیوں کو تباہ کن حد پر موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ روس کو بعض اعتبارات سے ابھی تک ایک زرعی ملک ہی تسلیم کرنے سے، زمینداروں کے خلاف اس تحریک کی انسانیت کش شدت کے اندازہ کرنے میں مدد ملتی ہے

۳- مگر اشتمالی جماعت کے حقیقت پسند یہ کہیں گے کہ جبر و تشدد کی اس سختی کے بغیر نئے نظام کا چلانا ناممکن تھا اور کسانوں کے دلوں اور ذہنوں میں رواج کو اجتماعی بنانے کے لیے یہ ایک ناگزیر اقدام تھا۔

لیکن میں اس عذر کو تسلیم نہیں کرتا۔ زمینداروں کا بیدردانہ قلع قمع اخلاقی اور اقتصادی دونوں اعتبار سے جائز نہ تھا کیونکہ اس طرح مویشیوں کی ایک وسیع تعداد ہلاک کر دی گئی جس کی تلافی کے لیے کئی برس چاہئیں۔ دیگر امور کے علاوہ یہ واقعہ بھی ۱۹۳۲ء کے قحط کا باعث بنا۔ لیکن اس جگہ سٹالین کی زراعتی پالیسی کی مدح و ذم مقصود نہیں بلکہ مجھے تو اس جگہ یہ دکھانا ہے کہ ان ممالک میں زمین کا مسئلہ کتنا مختلف ہو جہاں روس کے برعکس زمینداروں کا طبقہ ایک غالب تعداد رکھتا ہے۔ یا جہاں کاشتکاروں کی زمینیں ان کے مکانوں سے ملحق ہیں یا کسان ان ہی زمینوں کے مالک ہیں۔ ایسے ممالک میں خواہ کوئی بھی پالیسی موزوں ہو یہ ایک حقیقت ہو کہ وہاں نہ روس کی طرح زمینداروں کا کلیۃً استیصال کیا جائے گا اور نہ اجتماعی کھیتوں کے نئے ادارے قائم کیے جائیں گے۔

جب روس میں پہلی پنج سالہ اسکیم شروع کی گئی تو وہاں جو صورت پیدا ہوئی وہ کسی دوسرے ترقی یافتہ ملک میں کسی بھی اقتصادی تنظیم کے آغاز پر نہ ہوتی بشرطیکہ ۱۹۲۸ء میں اشتمالی رہنماؤں کو نہ صرف صنعتی پیداوار کی تنظیم کرنی تھی بلکہ انھیں مجوزہ پیداوار حاصل کرنے کے لیے ایک صنعتی ڈھانچہ بھی تیار کرنا تھا۔ انھوں نے نہ صرف موجودہ صنعتی مشین کا استعمال اور اصلاح ہی شروع کی بلکہ ان کا ارادہ اپنے ملک کو چند ہی سالوں میں ایک ترقی یافتہ صنعتی ریاست بنا دینے کا تھا۔ بعض وجوہات کی بنا پر وہ اسے ناگزیر سمجھتے تھے۔ سرمایہ دار دنیا کی مخالفت کے اثرات سے بچنے کے لیے اشتمالی روس کے لیے ترقی یافتہ صنعتی عمارت ضروری تھی کیونکہ ترقی یافتہ صنعتیت ہی آج کل ہر موثر فوجی قوت کی بنیاد ہو۔ علاوہ ازیں اشتمالیت عمومی معیار زندگی کو بلند کرنے کی علمبردار تھی اور اس غرض کے لیے عوامی پیداوار کے ان طریقوں کا اپنانا ضروری تھا جنھوں نے بڑے بڑے سرمایہ دار ممالک کے معیار زندگی کی بلندی کو ممکن کر دیا تھا۔ نیز اشتمالی چاہتے تھے کہ پرولتاریہ کی تاریخی تربیت کی جائے اور وہ پرولتاریہ کو صنعت کے فنی انقلاب کا بچہ سمجھتے تھے۔ وہ پرولتاریہ کی تعداد کو زیادہ کرنا اور ان میں شعور کو بلند کرنا چاہتے تھے اور یہ مقصد بغیر بڑے پیمانے کی صنعتیت کے حاصل نہیں ہو سکتے

تھے۔ ان وجوہات کی بنا پر اشتمالی رہنما ہر ممکن طریقے سے وسیع پیمانے کی صنعتیت کے لیے سرگرم عمل ہو گئے۔

لیکن اس پالیسی پر فوری خرچ بہت زیادہ اٹھا۔ اٹھارھویں صدی میں برطانیہ سرمایہ دار صنعتیت کی ترقی میں تمام دنیا سے سبقت لے گیا تھا۔ اس کے بعد کسی ملک کی بھی صنعتی ترقی بغیر بدیشی سرمایہ کی مدد کے نہ ہوئی تھی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ خود برطانیہ کی سرمایہ دارانہ ترقی میں بھی ملکی ذرائع کو احتیاط کے ساتھ استعمال کرنے کے علاوہ ایک جامع غیر ملکی تجارت کے منافع اور تمام سلطنت کی لوٹ کی امداد شامل تھی

(باقی آیندہ)

مترجمہ، اکرام قمر ایم۔ اے

جلن سوزش اور خراش!

LETTERS OF IQBAL

A collection of letters by the sage, philosopher and national poet, the late Allama Sir Muhammad Iqbal during the period May, 1936 to November, 1937, a few months before his death. This period synchronises with a very eventful period in the history of Muslim India—between the establishment of the All-India Muslim League Central Parliamentary Board in June, 1936 and the great historic sessions at Lucknow in October, 1937.

After the Lucknow session, it was a great achievement for Muslim League that its lead came to be acknowledged by both the majority and minority Provinces. Sir Muhammad Iqbal played a very conspicuous part, though at the time not revealed to public, in bringing about this consummation. He had his own doubts about Sikandar-Jinnah Pact being carried out and he was anxious to see it translated into some tangible results without delay so as to dispel popular misapprehension about that

Price, ordinary edition, As. 8

Price, de luxe ,, *Re. 1/4*

MAKTABA JAMIA

JAMA MASJID & QAROLBAGH, DELHI
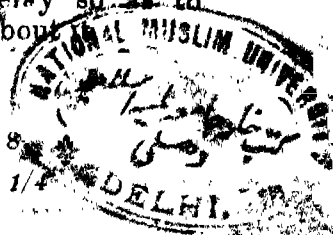
چند قابل قدر کتابیں

روح اقبال: یہ کتاب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب کے تین مضامین اقبال اور آرٹ، اقبال کا فلسفہ تمدن، اقبال کے مذہبی اور مابعد الطبیعی تصورات پر مشتمل ہے۔

قیمت غیر مجلد

تاریخ سلطنت خداداد: میسور کی نامور سلطنت کے بانی حیدر علی اور ان کے جانشین ٹیپو سلطان کی مکمل تاریخ۔ یہ ایک طرف مواد و دلائل اور دوسری طرف حدیث عقیدت کے ساتھ مرتب کی گئی ہے۔ مصنفہ محمود خاں صاحب محمود۔ قیمت

سویٹ روس کا نظام کار: مترجمہ مولانا مظہر علی اظہر روسی قوم کے حالات، ان کی سیاسی معاشرتی، تمدنی ضروریات، سرمایہ اور افلاس کی کش مکش کی داستان اس کتاب کے مطالعے سے ہر اہل نظر جدید روس کی حکومت اور موجودہ طریق کار سے واقفیت حاصل کر سکتا ہے۔ قیمت

امداد باہمی: مصنفہ ڈاکٹر ایم اظہر علی ایم۔ ایل۔ اے۔ انجمن ہائے امداد باہمی کی ابتدائی تاریخ اور ان کے بنیادی اصول و اعمال، دیگر ممالک میں ان کا تدریجی نشو و نما، امداد باہمی کے مختلف طریقوں کی تشریح اقتصادی فلاح کے لئے اس کی ضرورت و اہمیت اور انجمن ہائے امداد باہمی کے اساسی مسائل اور طریق کار کی نوعیت وغیرہ پر مفصل بحث ہے۔

قیمت

مکتبہ جامعہ

دہلی، نئی دہلی، لکھنؤ، بمبئی

جامعہ

زیرادارت۔ نورالحسن ہاشمی ایم۔ اے

چندہ سالانہ عہ / فی پرچہ آٹھ آنے	بابتہ ماہِ اپریل ۱۹۴۳ء	جلد ۳۸۔ نمبر ۴

فہرست مضامین

مکتبہ جامعہ ملیہ کے دیکھنے کا بارہا اتفاق ہوا اور اُس وقت سے جب اس کی بنیاد پڑی ہر دفعہ اس کی نئی ترقی اس کی پچھلی ترقی سے شاندار اور خوش آیند پائی۔ مکتبہ نے علمی ضرورتوں کے علاوہ سب سے زیادہ تعلیمی خدمت کی اہمیت کو پوری طرح سمجھا ہے اور خاص طور سے بچوں کی ضرورت، طبیعت اور ذہنیت کو سامنے رکھ کر اس نے جو کام انجام دیئے ہیں وہ مبارک باد کے لائق ہیں۔

یہ دیکھ کر بھی خوشی ہوتی ہے کہ اس سارے کاروبار کو زیادہ تر خود جامعہ کے نوجوان اور ہونہار پوری محنت، دیانت، ہمت اور کوشش سے انجام دے رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ مزید توفیق اور کامیابی عطا فرمائے۔

(دستخط) علامہ سید سلیمان ندوی

(گذشتہ سے پیوستہ)

سوویٹ روس کا اقتصادی نظام

عموماً یہ دیکھا گیا ہی کہ جب کسی "نئے" ملک میں صنعت ترقی کرے تو اس کے ابتدائی قدم بہت آہستہ آہستہ آگے کی طرف بڑھتے ہیں۔ اور چونکہ غیر ملکی سرمایہ کی درآمد جاری ہوتی ہی اس لئے یہ ضروری نہیں رہتا کہ دولت آفریں اشیاء (جو عام استعمال کی چیزوں کے بنانے کے کام آتی ہیں) کی پیداوار کے لئے مزدوروں کو دوسرے کاموں سے فارغ کرنے کے واسطے معیار زندگی کو گھٹایا جائے۔ جوں جوں ترقی زیادہ ہوتی جاتی ہے توں توں غیر ملکی راس المال بھی بڑھتا جاتا ہی۔ ملک کے روزانہ استعمال کی اشیاء کی پیداوار کے لئے بہت کم ذرائع رہ جاتے ہیں اور اس کے اثرات کو صنعتیت کے ابتدائی اقدامات سے حاصل شدہ زائد پیداوار فرو کر دیتی ہی۔ الغرض معیار زندگی کو گھٹائے بغیر ہی تغیر پیدا کر لیا جاتا ہی۔ اور بعض اوقات انقلابی ترقی بھی کر لی جاتی ہی۔ اُن ممالک میں یہ چیز اور بھی آسان ہی۔ جہاں آبادی منتشر ہو اور وسیع قدرتی ذرائع کی مالک ہو۔ چونکہ دنیا کی منڈی میں نئی پیداواروں کی مانگ بڑھتی جاتی ہی۔ اس لئے ایسے ممالک میں لوٹ کھسوٹ کے منافع بخش مواقع زیادہ حاصل ہوتے ہیں۔

اگر کسی ملک میں یہ تمام یا ان میں سے کچھ حالات موجود نہ ہوں تو صنعتیت صرف اسی وقت ممکن ہو سکتی ہی جبکہ موجودہ ذرائع کو نہایت احتیاط سے استعمال کیا جائے۔ یہ کلیہ اس ملک پر تو خاص طور سے عائد ہوتا ہی جس کی بہت زیادہ آبادی کا معیار زندگی پست ہو۔ کیونکہ اس صورت میں روزانہ ضروریات پوری کرنے کے بعد اصل مال کی پیداوار کو زیادہ کرنے کے لئے بہت کم ذرائع بچ رہتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ بھی سچ ہی کہ کسی ملک کے باشندے خواہ کتنا ہی کم خرچ کیوں نہ کریں، اگر وہ ملک کافی حد تک پہلے ہی صنعتی نہ ہوگا تو وہ اپنی صنعتی اغراض کے لئے ضروری آلات پیدا نہ کر سکے گا۔ اگر رفتار ترقی غیر معمولی طور پر آہستہ ہو اور طریقے غیر معمولی طور پر غیر اقتصادی ہوں، تو پھر تو کچھ نہیں کہا جا سکتا، ورنہ فرض شروع میں اسے دوسرے ترقی یافتہ ملکوں سے پیداوار کے پیچیدہ آلات اپنے کارخانوں میں لگانے کے لئے بہت کافی

منگوانے ہوں گے۔ اگر وہ اپنے لئے کلیں خود بھی بنانا چاہے گا تو بھی ابتدا کرنے کے لئے اسے دوسرے ملکوں سے کلیں بنانے والی مشینری منگوانی ہو گی۔ اگر ادھار پر یا غیر ملکی سرمایہ سے درآمد نہ ہو سکے گی تو اسے حساب چکانے کے لئے اپنی پیداوار کی برآمد کرنی ہو گی۔ یہ برآمد زیادہ تر کچی اجناس اور اناج کی ہو گی۔ صنعتی ترقی کی رفتار میں تیزی پیدا کرنے کے لئے یہ ضروری ہو گا کہ یا تو اناج باہر بھیجا جائے جس کی خود اندرون ملک میں بھی از حد ضرورت ہوتی ہے، یا مزدوروں کو اناج پیدا کرنے کے کام سے ہٹا کر برآمد کے لئے کچی اجناس پیدا کرنے کے کام پر لگایا جائے گا اور یا یہ دونوں طریقے ہی اکٹھے اختیار کئے جائیں گے۔

درآمد کی جانے والی صنعتی اشیاء کے بدلے میں جو اناج اور کچی اجناس برآمد کی جائیں گی، اگر ان کی قیمت دنیا کی منڈی میں اول الذکر کی نسبت زیادہ گر جائے تو صنعتیت کی رفتار کو آہستہ کر دیا جائے گا۔ یا ملک میں انتہائی طور پر کم خرچ کیا جائے گا تاکہ غیر ملکی تبادلہ میں کوئی دقت باقی نہ رہے۔ بالفاظ دیگر یا تو مستقبل میں پیداوار کی افزائش کی توقع کم کر دی جائے گی اور یا معیار زندگی اور گر جائے گا۔

انھیں مشکلات کا روس کو ۱۹۲۹ء سے سامنا تھا۔ عالمگیر کساد بازاری سے کچھ عرصہ پہلے ہی زراعتی اجناس کی قیمتیں گر گئی تھیں۔ محصول بڑھا دئے گئے، حصہ رسدی مقرر کر دی گئی۔ الغرض یہ اور دوسری پابندیاں بین الاقوامی تجارت کے راستے میں حائل ہو گئیں۔ چنانچہ ابھی تک پہلی پنجسالہ سکیم کا پوری طرح آغاز بھی نہ ہوا تھا کہ روس سے برآمد ہونے والی چیزوں کی قیمت بہت زیادہ گر گئی اور ان کی مانگ بھی بہت کم ہو گئی۔ لیکن صنعتیت کے لئے اشتمالی جو اولوالعزمانہ پروگرام بنا چکے تھے اس سے وہ پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھے۔ اس لئے انھیں دوسرے ملکوں پر اپنی پیداوار ٹھونسنی پڑی اور جو قیمت وہ وصول کرنے لگے وہ روس کے معیار زندگی کی بمشکل کفیل تھی۔ اگر حالات سازگار رہتے تو وہ کئی پیچیدہ دولت آفریں اشیاء دوسرے ملکوں سے خریدتے، لیکن اب انھیں یہ خود بنانی پڑے پہلی پنجسالہ سکیم کے لئے حوصلہ مندانہ رفتار تجویز کی گئی تھی، اگر جب عالمگیر سرد بازاری نے اس سکیم کے راستہ میں نئی مشکلات پیدا کر دیں تو بہت زیادہ حوصلہ کی ضرورت پیدا ہو گئی۔

ان حالات پر زیادہ دیر تک قائم نہیں رہا جا سکتا تھا جو منصوبہ باندھا گیا تھا اسے یا تو بالکل ترک کیا جا سکتا تھا یا اس پر آہستہ آہستہ عمل کیا جا سکتا تھا اور زراعتی پیداوار کو بڑھانے کے لئے نئی اقتصادی پالیسی کے کم از کم کچھ حصہ کو دوبارہ جاری کیا جا سکتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ صنعتی ترقی کے لئے دولت آفریں اشیاء پیدا کرنے کے واسطے جو صنعتی وسائل استعمال کئے جا رہے تھے وہ اب ایسی اشیاء پیدا کرنے کے لئے استعمال کئے جاتے جو کاشتکاروں کو ان کے اناج کے بدلے میں دی جا سکتی تھیں۔ اس کا مطلب معیار زندگی میں فوری ترقی ہوتا، لیکن اس سے سویت یونین کی فوجی طاقت کم ہو جاتی اور جدید صنعتیت کی ترقی ملتوی ہو جاتی۔ اسٹالین اور اس کے ساتھیوں نے اس تجویز کو بالکل ٹھکرا دیا اور اصلی تجویز کو پوری قوت کے ساتھ عملی صورت دینے پر زور دیا۔ مگر بدلے ہوئے حالات میں اس کا مطلب یہ تھا کہ مزدور اور کسان بہت زیادہ کم خوری کریں۔ اس اسکیم پر عمل شروع کرتے وقت یہ امید تھی کہ کسانوں کو اناج کے بدلے میں کافی صنعتی اشیاء دی جائیں گی، مگر اب ایسا ہونا ناممکن تھا۔ چنانچہ روس کی زراعتی معیشت کو اسٹالین نے یک قلم بدل کے رکھ دیا۔ اگر کسان انفرادی حیثیت میں پیداوار کرتے رہیں تو صنعتی اشیاء کی رسد کی قلت کا مقابلہ وہ زراعتی اشیاء کی پیداوار گھٹانے سے یقیناً کر سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انفرادی کاشت کے خاتمہ کو آئندہ پر ملتوی نہ کیا جائے اور اس کی جگہ اجتماعی نظام جلد قائم کر دیا جائے تاکہ اس منصوبہ کو پورا کرنے والے حکام کو زراعتی نظام پر زیادہ تسلط حاصل ہو جائے۔

اس اجتماعیت کے ذریعے زراعتی پیداوار کے بڑھنے کی اور شہروں اور درآمدکے لئے زیادہ سامانِ خوراک پیدا ہونے کی توقع تھی۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ زراعتی پیداوار کو بہت زیادہ نقصان پہنچا، اس کی وجہ زیادہ تر تو یہ تھی کہ بہت سے زمینداروں اور کاشتکاروں کے پاس مویشی پالنے کے وسائل باقی نہ رہے تھے اور وہ اپنے مویشی نئے اجتماعی کھیتوں کے بھی سپرد کرنے کو تیار نہ تھے۔ چنانچہ مویشی بہت بڑی تعداد میں ہلاک کر دئے گئے۔ روس کے ایک وسیع علاقہ میں فصل خراب ہوئی جس نے صورتِ حال کو اور بگاڑ دیا۔ بعض علاقوں میں تو قحط خوفناک صورت اختیار کر گیا اور منصوبہ بندی سے حاصل کی ہوئی ترقی ناکارہ ہو کر رہ گئی۔ مگر اسٹالین اپنے عزم پر ڈٹا رہا، تاہم اس نے اجتماعیت کے باقی طریقے کچھ

موت کے لئے ملتوی کر دیتے۔ آخر کار مصیبت ٹل گئی اور جانوں کے کثیر اتلاف کے بعد روسی کسانوں نے
اجتماعی یا تعاونی کاشت کے نظام کے ماتحت کام شروع کر دیا۔

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ سویت یونین کی ان بڑھتی ہوئی مشکلوں نے آمریت کو اور سخت کر دیا۔ اجتماعیت کے خلاف کسانوں کو زمیندار اکٹھا کر سکتے تھے، مگر ان کا بڑی بیدردی سے استیصال کیا جا چکا تھا حالانکہ ان میں بہت سے بہترین کاشتکار تھے۔ شہروں اور دیہاتوں میں خفیہ پولیس زیادہ سرگرم عمل ہو گئی۔ مخالفوں کی کھوج بڑی تندہی سے شروع کر دی گئی تاکہ ایک طرف تو کسی کو موجودہ آشوب کا ذمہ دار گردانا جا سکے اور دوسری طرف کارخانوں اور اشتمالی جماعت کے ضبط و نظم کو اور مضبوط کر دیا جائے اور اس طرح منصوبہ بندی کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایڑی چوٹی تک کا زور لگا دیا جائے۔ علاوہ ازیں سب کو ناکافی رسد ملتی تھی، اس لئے سب نے اپنی کوششیں بہت زیادہ تیز کر دیں۔ جن مزدوروں نے اسکیم کو کامیاب بنانے کے لئے تندہی اور جانفشانی سے کام کیا، ان کی تنخواہیں بھی بڑھا دی گئیں اور ان سے بہتر سلوک بھی ہونے لگا۔ صنعت کی اکثر شاخوں میں اس اسکیم پر پورا عمل نہ کیا گیا، لیکن پہاڑ سی مشکلات کے مقابلہ میں جو کامیابی حاصل کی گئی وہ کسی صورت میں معجزہ سے کم نہ تھی۔ اس کامیابی کے لئے روسی پرولتاریہ نے جو قربانیاں دیں وہ مغرب کے کسی بھی ملک میں ممکن نہ تھیں، کیونکہ وہاں کے مزدور روسیوں جیسے مستقل مزاج نہیں، نہ انھیں اتنا زیادہ لوٹا گھسوٹا گیا ہے اور ان کا معیار زندگی بھی روسیوں سے بلند ہوتا ہے۔

خوش قسمتی سے کسی بھی مغربی ملک میں ان قربانیوں کی ضرورت نہیں پڑی۔ ہر مغربی ملک کی صنعت تقریباً ہر پہلوؤں سے پہلے ہی اس قابل ہے کہ وہ اپنی پیداوار کو کافی بڑھا سکتی ہے۔ ماہر مزدوروں کی کوئی قلت نہیں اور بڑی بڑی صنعتی ترقیوں کی تجاویز پر عمل کرنے کے لئے عوام کو کم خوری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ کسی منصوبی معیشت کو نافذ کرتے وقت ان کے لئے سب سے پہلا سوال نئے دولت آفریں وسائل کی تخلیق کے بجائے موجودہ وسائل کا زیادہ مکمل استعمال ہوتا ہے۔
ان اختلافات کی بنا پر روسی منصوبہ بندی مغربی ممالک کے سے نتائج پیدا نہیں کر سکتی تاہم

روسی منصوبہ بندی کے بعض ایسے پہلوؤں پر روشنی دلچسپی کا باعث ہوگی جو یہاں کے مخصوص و ناساز گار حالات کے پیدا کردہ نہیں ـــــ ہر اشتراکی معیشت میں کچھ مسائل قدر مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں ان کے حل قابل توجہ ہیں۔ سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ ہر منصوبی معیشت میں ایک یا بہت سی ایسی ہیئت حاکمہ موجود ہوتی ہیں جو یہ فیصلے کرتی ہیں کہ کن اشیاء کی پیداوار کرنی چاہیئے۔ چنانچہ دستیاب وسائل کا سرمایہ کاری" (INVESTMENT) اور موجودہ صرفہ میں تعین کیا جاتا ہے، پھر اس تقسیم کے اور حصے کئے جاتے ہیں ـــــ یعنی اسے مختلف صنعتوں اور مختلف اداروں میں بانٹا جاتا ہے۔ روس کی پہلی پنجسالہ اسکیم میں دولت آفریں اشیاء کی پیداوار پر زور دیا گیا اور اس ضمن میں متعلقہ اشیائے صارف (CONSUMERS GOODS) کی پیداوار پر بھی زور دیا گیا ـــــ مثلاً صنعتی ترقی کے نئے اور بڑھتے ہوئے مرکزوں میں نئے مکانوں کی تعمیر یعنی صارف کو اس اسکیم میں ثانوی حیثیت حاصل تھی۔ اور جب نئی دولت آفریں اشیاء اسکے لئے ایک کثیر تعداد میں اشیاء پیدا کرنا شروع کردیں تو اس کے بھی فائدہ اٹھانے کا دن آجاتا۔

چنانچہ روسی تجاویز میں دستیاب وسائل کا ایک بہت بڑا حصہ سرمایہ کا اشیا کی پیداوار کے لئے مخصوص کردیا گیا تھا۔ پہلی پنجسالہ اسکیم پر ساڑھے چار سالوں میں ساٹھ ارب روبل لگائے گئے اور ان میں سے چھیالیس ارب صنعتی ترقی پر خرچ کئے گئے۔ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۲ء تک بیش میعادی صنعت کے چوالیس فیصدی سے بڑھتے بڑھتے بہتر فی صدی تک پیداآور وسائل پیدا کئے گئے۔

انھیں حکام نے وسائل کو سرمایہ کاری اور صرفہ میں تقسیم کیا اور یہ فیصلہ کیا کہ معیشت کے ان دو بڑے بڑے اجزا میں کون کون سی اشیا پیدا کرنی چاہئیں۔ منصوبہ بندی کے سرکاری کمیشن نے کچھ حد تک از خود یہ فیصلے کئے اور کچھ حد تک محض انفرادی صنعتوں، ریل و رسائل، اور زراعت وغیرہ کے کمشنریوں، اتحادات تجارت، بعض صنعتوں کے مکلفہ اداروں، اور روس کے مختلف جغرافیائی حصوں میں منصوبہ بندی کرنے والی جماعتوں کی تجاویز پر عمل کیا گیا۔ لیکن اس سرکاری کمیشن کو پلان کا کلی [illegible] اختیارات حاصل نہ تھے [illegible] تجاویز کے مجلس ناظرین عوام (کونسل آف پیپلز کمشنرز) [illegible] کے اقتصادی شعبہ ـــــ مزدوروں اور دہقانوں کی کونسل ـــــ کی

منظوری لازمی تھی۔ اور پھر ان تجاویز کا نفاذ تمام سوویت یونین، اس کی اجزائی جمہوریتوں، اور دوسرے جغرافیائی حصوں کے کمشنرات عمل میں لاتے۔ گسپلان (منصوبہ بندی کا سرکاری کمیشن) صرف منصوبہ بندی کر سکتی تھی، اسے کوئی قوت فیصلہ یا عاملانہ اختیارات حاصل نہ تھے۔

مختلف اداروں نے ان اہم فیصلوں کے لئے کیوں کہا اور کیوں ان پر عمل کیا؟ ایک بے نظم معیشت میں اگرچہ ایسے فیصلوں کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہوتی تاہم جن اقتصادی افعال کی ذمہ دار خود سرکار ہوتی ہے ان کے متعلق اخراجات کا فیصلہ وہ خود کرتی ہے اور جن اقتصادی امور کے لئے وہ امداد دیتی ہے ان پر کافی قابو بھی رکھتی ہے مثلاً بلدیات کے مدرسے، سرکاری عمارتیں، اور سرکاری دولت آفریں اشیا۔ مگر باقی پیداوار کے طریقوں کے متعلق تاجر (ENTERPRENEUR) خود فیصلے کرتے ہیں۔ جہاں ان تاجروں کے بڑے بڑے جتھے اور "اتحاد" موجود ہوتے ہیں وہیں ایسے "آزاد مزدور" بھی ہوا کرتے ہیں جو اکیلے ہی کام کیا کرتے ہیں۔ ان تاجروں کے فیصلے کثیر ترین منافع کے حصول پر مبنی ہوتے ہیں اور وہ پیداوار کی لاگت اور مانگ کی مختلف قسموں کی روشنی میں یہ فیصلے کیا کرتے ہیں۔ ان فیصلوں کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا آپس میں غیر متعلق ہونا ہے۔ وہ پیداوار کے دستیاب وسائل کو زیادہ تو نہیں کر سکتے، مگر کم کر سکتے ہیں۔ تاجروں کی پیداوار اور صارفوں کی مانگ میں کوئی ضروری ربط موجود نہیں ہوتا ——— اس میں صرف ایک استثنا ہے، یعنی تاجر دانشمندی سے کام لیتے ہوئے نفع کی غرض سے اپنی پیداوار کو کچھ حد تک صارفوں کی مانگ سے وابستہ کر دیتا ہے، مگر جب وہ صارفوں کو اشیا مہیا نہ کرنے میں زیادہ فائدہ دیکھتا ہے تو وہ اپنی پیداوار کا صارفوں کی مانگ سے قطع تعلق کر لیتا ہے۔

اشتراکی منصوبہ بندوں کی حالت اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ دستیاب پیداوار وسائل کا پورا استعمال کرنا چاہتے ہیں، اور وہ اس امر سے بھی آگاہ ہوتے ہیں کہ ایک چیز کو پیدا کرنے کا مطلب کسی دوسری چیز کی پیداوار روک دینا ہے۔ ان کے ذہن میں یہ بات نہیں ہوتی کہ کونسی چیز کس مقدار میں پیدا کرنے سے زیادہ نفع ہوگا، بلکہ وہ یہ دیکھا کرتے ہیں کہ کس چیز کی پیداوار میں بحیثیت مجموعی زیادہ

بھلائی ہو، اور کس شے کی پیداوار گھٹا کر دوسری شے کی پیداوار بڑھانے میں اچھائی ہو۔ ان کے لئے سکوں کی بہتات کچھ حقیقت نہیں رکھتی، ان کے مدنظر حقیقی فائدے ہوا کرتے ہیں۔ صرف اپنی سطح نظر کی خاطر وہ کسی چیز کو دوسری پر ترجیح دیا کرتے ہیں۔ ان کے سامنے صرف ایک مقصد ہوتا ہو کہ پیداوار کے محدود وسائل سے کس طرح بہترین نتیجے بحیثیت مجموعی حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

قدامت پسند اقتصادی یہ اعتراض کرتے ہیں کہ آخر یہ اشتراکی منصوبہ بند صارفوں کی خواہشات کو کس طرح نظر انداز کر سکتے ہیں؟ مگر ایک منصوبی معیشت میں صارفوں کی خواہشات کا یہ معیار دو وجوہات کی بنا پر ناکارہ ہو کے رہ جاتا ہی۔ میرا اشارہ اس امر کی طرف نہیں کہ ہر نظام معیشت میں ریاست اور سرکاری محکمے بعض چیزوں مثلاً مدرسوں، سڑکوں، اور سرکاری عمارتوں کی پیداوار کے متعلق براہ راست فیصلے کرتے ہیں اور اس طرح شخصی صارفوں کی ذاتی پسند کی جگہ ضرورت عامہ کا معیار پیش کرتے ہیں، اور بصورتِ دیگر شخصی صارفوں کی مانگ سرکاری رسد کے قطعاً مطابق نہیں ہوتی۔ صارفوں کی شخصی تشخیصِ قیمت اور اشیا وخدمات کی حقیقی رسد میں یہ اختلاف ہر نظام معیشت میں خواہ وہ منصوبی ہو یا غیر منصوبی ہمیشہ موجود رہا ہی۔ منصوبی معیشت تو صرف اجتماعی رسد کے دائرہ کو وسیع کر سکتی ہی۔ میں دو اور پہلوؤں سے بھی منصوبی معیشت کو انفرادی نظام سے مختلف قرار دیتا ہوں۔

سب سے پہلی چیز تو یہ ہو کہ صارفوں کی مانگ کا انحصار مختلف اشیا کی قیمتِ فروخت پر ہوتا ہو قیمتیں مقرر کرکے منصوبہ بندی کرنے والی ہیئت حاکمہ کافی حد تک ہر چیز کی مانگ کا معیار مقرر کر دیتی ہو۔ اگر یہ کہا جائے کہ ایک منصوبی معیشت میں قیمت لاگت کے مطابق ہوتی ہو، تو ایک دوسرا سوال پیدا ہوجاتا ہو، کیونکہ لاگت کا انحصار تین چیزوں پر ہوا کرتا ہو——— پیدائش کی مقدار کیا ہو عاملین پیدائش یعنی مزدوروں کی مطلوبہ اقسام کی قیمت کیا ہو، اور متعلقہ صنعت کی ترقی کے لئے کون کون سی دولت آفریں اشیا استعمال کی جاتی ہیں۔ یہ واضح رہو کہ دولت آفریں اشیا کی اصلاح وترقی بھی لاگت پر اہم ترین اثر ڈالتی ہو۔

ایک بے نظم معیشت میں ہر تاجر بذات خود فیصلہ کرتا ہو، اسے دوسروں سے کوئی سروکار نہیں

ہوتا۔ لاگتیں ——— یعنی اجرت، لگان اور سود کے مُروّجہ معیار ——— بہت حد تک ہر تاجر کے لئے ایک سی ہوتی ہیں۔ مگر ایک منصوبی اشتراکی معیشت میں ایسا نہیں ہوتا، وہاں تو یہ لاگتیں موجود ہی نہیں ہوتیں، اگر موجود بھی ہوں تو ان کی حیثیت خارجی عوامل کی نہیں ہوتی، اور نہ اجتماعی تاجر کے قابو سے باہر ہوتی ہیں۔ وہ اقتصادی نظام کے عناصر کی حیثیت رکھتی ہیں اور اجتماعی تاجر کے فیصلے کے ماتحت ہوتی ہیں۔ اجرتوں کا بقا شہریوں میں آمدنی تقسیم کرنے کے طریق پر منحصر ہوتا ہے۔ لگان کا مدار اس بات پر ہوتا ہے کہ اجتماعی تاجر زمین اور دوسری قابلِ لگان جائداد کے لئے کہاں تک معاوضہ وصول کرتا ہے۔ اور سود کا انحصار اس امر پر ہوتا ہے کہ اجتماعی تاجر سرمایہ ادھار دینے پر کچھ قیمت طلب کرتا ہے یا نہیں۔ ان لاگتوں کا ہونا اور نہ ہونا دونوں ہی ممکن ہیں۔ اگر یہ لاگتیں وصول کی جاتی ہوں تو ان کی شرحیں لازمی طور پر معزز ہوتی ہیں اور ان کا تعین اجتماعی تاجر اپنی ایک حیثیت سے کرتا ہے اور وہی اجتماعی تاجر اپنی دوسری حیثیت سے یہ لاگتیں ادا کرتا ہے۔ تشخیص قیمت کے لئے یہ لاگتیں ایک گراں قدر امداد دے سکتی ہیں۔ مگر ایک بے نظم سرمایہ دار معیشت میں تاجر جو خارجی لاگتیں ادا کرتا ہے ان سے یہ لاگتیں بالکل مختلف ہوتی ہیں۔

چنانچہ منصوبی اشتراکی معیشت میں لاگتوں کا کوئی خارجی نظام ہو ہی نہیں سکتا۔ لاگتیں جہاں تک چاہیں بڑھائی گھٹائی جا سکتی ہیں۔ لیکن یہ لاگتیں خارجی نہیں ہوتیں، بلکہ ریاست کی سرکاری پالیسی کے ماتحت ہوتی ہیں۔ سرکار اپنے متعلقہ شعبوں کے ذریعے یہ فیصلہ کرتی ہے کہ مختلف پیشوں کے لئے کیا اجرتیں ہونی چاہئیں، لگان کتنا لیا جائے، شرح سود کیا ہو، کس صنعت کو محصول کے ذریعے ریاست کے اخراجات میں حصہ دار بننا ہے ——— اور یا یہ تمام لاگتیں سرے سے اڑا ہی دی جائیں۔ جس حد تک سرکار ان لاگتوں کو قائم رکھتی ہے، ان کا معیار وہ اپنی مرضی کے مطابق مقرر کرتی ہے۔

لیکن اگر ریاست چاہے تو لاگتوں کا یہ تعین اس سے بھی آگے جا سکتا ہے۔ یعنی لاگتیں مقرر تو کر دی جائیں مگر وصول نہ کی جائیں۔ منصوبی معیشت کی ہر تجارت کے لئے اُجرتیں، لگان اور سود مقرر تو کئے جا سکتے ہیں، مگر یہ ہو سکتا ہے کہ زر کی صورت میں کوئی ادائیگی نہ ہو۔ ایسی لاگتوں کے تعین کے حق میں یہ دلیل دی جاتی ہے کہ اس طرح مختلف تجارتوں کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے، اور یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ ایک

ہی تجارت مختلف زمانوں میں کیا صورت اختیار کرلیتی ہے۔ اور اس طرح فضول خرچی اور سرو بازاری کو کافی حد تک روکا جاسکتا ہے۔

اقتصادی منصوبہ بندی کے ترقی یافتہ نظام میں کم از کم عبوری دور کے لئے یہ کلیہ ضرور درست ہے۔ مگر ان طریقوں کی خوبیوں سے اس حقیقت کو بدلا نہیں جاسکتا کہ مقررہ قیمتوں کا نظام لازمی طور پر من مانا اور بے اصول ہوتا ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک اشتراکی نظام میں ہر تجارت پر استعمال ہونے والے سرمایہ کی شرح سود مقرر کردی جائے۔ لیکن یہ شرح کسی اصول پر مبنی نہیں ہوتی، بلکہ اجتماعی ہیئت مالکہ بذات خود اپنی مرضی کے مطابق اس کا تعین کرتی ہے۔ یہی حالت لگان، اجرت اور دوسری لاگتوں کی ہے ——— یہ وصول بھی کی جاسکتی ہیں، اور ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ یہ مقرر تو کردی جائیں لیکن وصول نہ کی جائیں۔ مگر ان کی ادائیگی کی شرحیں "حسب الحکم" (FIAT) ہوتی ہیں۔

لیکن یہ چیز ان طریقوں کی خوبیوں کو زائل نہیں کردیتی۔ منصوبی معیشت ان طریقوں کو دستیاب پیداواری وسائل کی تقسیم کے لئے استعمال نہیں کرتی بلکہ یہ ان سے اشتراکی اقتصاد کو ضبط میں لاتی ہے۔ کسی تجارت پر لگائے ہوئے سرمائے اور قرضے کا اندازہ کرنے کے لئے شرح سود کا تعین بالکل عبث ہے۔ نہ اجرتوں کے تعین سے مزدوری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، اور نہ لگان کو دیکھ کر زمین کا تخمینہ کیا جاسکتا ہے۔ اشتراکی نظام میں وسائل کا تعین دستیاب حقیقی اشیاء کے مطابق کیا جاتا ہے اور ان وسائل کی قیمت ہائے زر کو مدِ نظر نہیں رکھا جاتا۔ اگر یہ قیمتیں مقرر ہوں تو انھیں وسائل کے تعین کے لئے استعمال نہیں کیا جاتا، بلکہ ان کے ذریعے وسائل کے استعمال کو ضبط میں لایا جاتا ہے۔

مگر قدامت پسند اقتصادی ایک اعتراض کیا کرتا ہے کہ جب تک تمام عاملین پیدائش ایک ہی معیار پر نہ ناپے جاسکیں ——— اور قیمتِ زر کے علاوہ اس مقصد کے لئے اور کونسا طریقہ اختیار بھی کیا جاسکتا ہے ——— اس وقت تک اقتصادی صحت کے ساتھ پیدائش کے مختلف طریقوں اور پیداوار کی مختلف قسموں کی فوقیت و برتری کا کس طرح فیصلہ کیا جاسکتا ہے؟ ایک ہی چیز یا تو زیادہ سرمائے اور کم محنت سے بن سکتی ہے اور یا کم سرمائے اور زیادہ محنت کے

ساتھ۔ اب ان دونوں طریقوں میں سے کسی ایک کو انتخاب کرنے کے لئے معیارِ زر کے علاوہ اور کونسا معیار اختیار کیا جا سکتا ہے؟ لیکن معیارِ زر کے بغیر بھی ہم کسی فیصلہ پر پہنچ سکتے ہیں۔ ہمیں دونوں طریقوں پر خرچ ہونے والی محنتوں کی مقداروں کا مقابلہ کرنا چاہیئے اور ان طریقوں میں جو دولت آفریں اشیا استعمال کی جاتی ہیں ان کی پیدائش پر محنتوں کی جو مقداریں خرچ ہوتی ہیں ان کا بھی آپس میں مقابلہ کرنا ہوگا لیکن اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ محنت کی مختلف قسمیں ایک ہی پیمانے سے ناپی جا سکتی ہیں حالانکہ محنت کو ناپنے کے لئے معیارِ زر کو مسترد کیا جا رہا ہے۔ لیکن ہم اُس معیارِ زر کو نہیں ٹھکرا رہے ہیں جس کے ذریعے محنت کی مختلف قسموں کی محدود پیدائشِ زر کو ناپا جاتا ہے۔ ہر منصوبی معیشت میں طریقِ پیدائش کا فیصلہ کرتے وقت اُجرت کے بجائے مختلف محنتوں کی قلت و کثرت کو اہمیت دی جاتی ہے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اگر اُجرتی نظام کو آمدنی کی تقسیم کے لئے باقی رکھا جائے تو بعض اوقات منصوبی اجرتوں سے ایک قسم کی محنت کی رسد تو بڑھ سکتی ہے اور دوسری قسم کی گھٹ سکتی ہے۔ لیکن مختلف ماہر محنتوں کی رسد کا بہت زیادہ انحصار درحقیقت منصوبی معیشت کی مہیا کردہ پیشہ وارانہ تربیت پر ہوتا ہے۔

ایک منصوبی معیشت میں کسی طریقِ پیدائش کو چننے کا فیصلہ بہت سے امور پر مبنی ہوا کرتا ہے۔ اور قیمتِ زر کو کچھ بھی اہمیت نہیں دی جاتی۔ مختلف ماہر صنعتوں کی قلت و کثرت، مختلف پیشوں کی سختی اور نرمی، مستقبل کی خاطر موجودہ صرفہ کا التوا ———— یہ وہ امور ہیں جو منصوبی معیشت کے فیصلوں پر بنیادی اثر ڈالتے ہیں۔ بعض حالات میں ایک نئے طریقِ پیدائش کو مُروجہ طریق پر یقیناً فوقیت حاصل ہوتی ہے اور اس صورت میں صرف ایک ہی سوال درپیش ہوتا ہے کہ پرانے طریقہ کی جگہ نیا طریقہ لانے پر کیا خرچ اُٹھے گا۔ بعض صورتوں میں نئے طریقہ کی فوقیت کے متعلق حقیقی شکوک موجود ہوتے ہیں، لیکن ان دونوں طریقوں کی اگر قیمت ہائے زر بھی معلوم ہو جائیں تو وہ ان طریقوں میں سے کسی ایک کے انتخاب پر فیصلہ کن اثر نہیں ڈال سکتیں۔ اس انتخاب کی بنیاد بہت سے امور پر ہوتی ہے اور ان میں سے بعض امور تو کمیت کو زیرِ غور ہی نہیں لاتے۔ منصوبہ بندی کرنے والی

ہیئتِ حاکمہ اپنی صوابدید کے مطابق فیصلہ کیا کرتی ہی اور کسی فیصلہ پر پہنچنے کے لئے قیمتِ زر کو صرف ایک امداد تصور کیا کرتی ہے اور خود اسے فیصلہ کن حیثیت نہیں دیا کرتی۔

اسی طرح پیداوار کے متعلق بھی فیصلہ قیمتِ زر کے بجائے ضروریات کی روشنی میں کیا جاتا ہی حقیقی لاگتوں یعنی کیاب عاملینِ پیدائش کو اس سلسلہ میں بہت اہمیت دی جاتی ہی۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ تمام حقیقی لاگتیں کسی کمیتی پیمانہ سے ناپی جاسکیں۔ اگر ایسا ہو سکے تو شاید یہ بہت بہتر ثابت ہو لیکن کسی بھی معیشت میں خواہ وہ منصوبی ہو یا غیر منصوبی، ایسا نہیں ہو سکتا۔ مگر یہ کہنا حقیقت کا منہ چڑانا ہی کہ قیمتِ زر اور حقیقی قیمت ایک ہی چیز ہی۔ قیمتِ زر صرف سرمایہ دار معیشت میں معلوم کی جا سکتی ہی ایک بے نظم معیشت میں تاجر اسی قیمتِ زر کی روشنی میں اپنے فیصلے کیا کرتے ہیں۔ مگر جب یہ فیصلے نفع اندوزی کے نقطۂ نظر سے بھی درست ہوں اور مقاصدِ پیدائش قلیل ترین حقیقی لاگت سے حاصل ہو سکتے ہیں، تو بھی قلیل ترین حقیقی لاگت والے طریقہ کا اختیار کیا جانا کوئی یقینی امر نہیں ہوتا۔ قیمت ہائے زر معلوم کرنے کا مطلب انھیں مخصوص معیشی حالات کے مطابق ناپنا ہوتا ہی۔ حقیقی لاگتیں اس طرح معلوم نہیں ہو سکتیں کیونکہ یہ تو کسی کمیتی معیار پر ناپی ہی نہیں جا سکتیں۔ ایک آدمی کی دو گھنٹوں کی مزدوری کی "حقیقی قیمت" اس کے ایک گھنٹے کے کام سے دگنی بھی جا سکتی ہی۔ بشرطیکہ اس سے اتنا طویل کام نہ لیا جائے کہ آخری گھنٹے کی حقیقی قیمت کام سے بڑھ جائے۔ لیکن دو مختلف آدمیوں کی محنتوں کی حقیقی قیمتیں قطعی طور پر ناپنے کے لئے کوئی خالص کیتی پیمانہ موجود نہیں ہی۔ اور پیدائش کے مختلف و پیچیدہ طریقوں کی قطعی حقیقی قیمتوں کے ہم عیار ہونے کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا۔

قیمتوں کا تعین ہمیشہ اضافی ہوتا ہی، قطعی کبھی نہیں ہوتا۔ وہ اپنے معیشی نظام کے معیار قیمت کے مطابق لگائی جاتی ہیں اور اس معیار کے بدلنے کے ساتھ ہی وہ بھی بدل جاتی ہیں۔ سرمایہ دار سماج میں قیمتِ زر ایک شخصی تاجر کے نقطۂ نظر سے خارجی ہوتی ہی چنانچہ اسے تمام سماج کے لئے ایک خارجی معیار سمجھا جاتا ہی۔ لیکن حقیقت میں یہ مخصوص معیاروں کی صرف قیمتِ زر ہوتی ہی۔

منصوبی معیشت میں صرف ایک تاجر ہوتا ہے۔ اگرچہ اسے انتظام کی سہولتوں کی خاطر مختلف حصّوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ تاہم وہاں کسی خارجی معیار کا کوئی امکان نہیں ہوتا، کیونکہ جہاں تک عاملین پیدائش کا تعلق ہے، ان کی قیمتیں تاجر لگاتا ہے۔ اور مکمل اشیا کی قیمتِ زرِ فروخت کے لئے خارجی معیار کا زیادہ امکان ہوتا ہے، کیونکہ خریدار اپنی پسند کے مطابق چیز خریدتا ہے، اور اس کی یہ پسند مختلف اشیار کی قیمتوں کے تابع ہوتی ہے۔ لیکن خریداروں کی یہ پسند سماج کے نظامِ آمدنی کی مظہر ہوتی ہے، اور یہ نظام اجتماعی ہوتا ہے۔ چنانچہ اس بظاہر خارجی معیار کے بھی اکثر عناصر اجتماعی ہیئتِ حاکمہ کی دانستہ تخلیق ہوتے ہیں۔ خریداروں کی یہ پسندیں حقیقی رہتی ہیں۔ اور اجتماعی تاجر مختلف اشیا کے لئے جو قیمتیں پیش کیا کرتا ہے، خریداروں کی یہ پسندیں اس کا صرف ردِّ عمل معلوم ہوا کرتی ہیں، اور یہ ردِّ عمل بھی اقتصادی حکمتِ عملی کی تخلیق ہوتے ہیں۔

ان حالات میں کسی چیز کی پیدائش کا فیصلہ کرتے وقت صرف یہ نہیں دیکھا جاتا کہ پیدائش کی لاگتِ زر کے عوض کیا قیمت زر ملتی ہے۔ یہ ایک معیار تو ہے، لیکن یہ صرف ایک معیار ہے، قطعی معیار نہیں۔ اجتماعی منصوبہ بندی کا بنیادی کام وسائلِ پیدائش کا ضروریات کے مطابق تعین کرنا ہے، اور اس طرح آمدنی کو ایسے پیرایہ میں متعین کرنا ہے کہ بہت اشد ضروریات بہترین طریقہ پر پوری ہوسکیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ منصوبہ بندی کرنے والی ہیئتِ حاکمہ غیر ضروری اشیا کو صارفوں پر ٹھونسیگی، بلکہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ یہ منصوبہ بندی زر کے بجائے حقیقی اشیا کے معیار سے کی جائے گی۔ وسائل کا تعین کرتے وقت یہ دیکھا جائے گا کہ صارف کیا کچھ خرید سکتے ہیں، اور صارفوں کی مانگوں کے مطابق اس تعین میں ہمیشہ تبدیلی ہوسکے گی۔ لیکن صارفوں کی مانگ کو خارجی معیار کی حیثیت حاصل نہیں ہوگی، کیونکہ یہ واضح ہے کہ قوم میں آمدنی کی تقسیم کو بدلنے سے مانگ بھی بدل جاتی ہے۔

روس میں تقریباً ہر چیز کی نمایاں قلت نے منصوبہ بندی کا کام ایک لحاظ سے آسان کر دیا۔ انسان کی بنیادی ضروریات جب پوری ہوجائیں تو باقی ضروریات کے متعلق اختلافات پیدا ہوسکتے ہیں۔ مگر بنیادی ضرورتوں کے بارے میں عموماً کبھی شکوک پیدا نہیں ہوئے۔ پہلی پنجسالہ اسکیم میں روس نے

اہم جگہ حاصل کی سب سے پہلی چیز تو یہ تھی کہ دولت آفریں اشیا کی افزائش کی خاطر صارفوں کی مانگوں کو کس حد تک ملتوی کیا جائے کہ قومی قوت میں بھی اضافہ ہو اور بعد ازیں اشیائے صارف کی بھی افزائش ہو۔ دولت آفریں اشیا کی پیدائش کے لئے بہت زیادہ وسائل مصول کر دئے گئے۔ اب سوویت منصوبہ بندی کرنے والوں کے پاس موجودہ صرف کے لئے اشیا پیدا کرنے کے واسطے بہت محدود وسائل رہ گئے۔ چونکہ زراعتی پیداوار ابھی بہت حد تک کاشتکاروں کے ہاتھ میں تھی، اس لئے اس منصوبہ بندی کے ماتحت اس پر براہ راست ہی کنٹرول حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اور کاشتکاروں کو زیادہ پیداوار کی ترغیب دلانے کے لئے صنعتی اشیا کی پیدائش میں اضافہ ضروری تھا تاکہ وہ تبادلہ میں کاشتکاروں کے پاس بیچی جا سکیں۔ شہری آبادی بھی صنعتی اشیا کی طالب تھی، چنانچہ شہریوں اور کاشتکاروں کی اس مانگ میں ہم آہنگی و توازن پیدا کرنا ضروری تھا۔

چنانچہ سوویت منصوبہ بندی کرنے والوں کو یہ امر مدنظر رکھنا پڑا کہ کون کونسی حقیقی اشیاء کی ضرورت ہے اور ان کے لئے کون کونسے حقیقی عاملین پیدائش چاہئیں۔ اور "لاگت" کے مسئلہ کو شروع شروع میں بہت معمولی حیثیت دی گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر کسی چیز کی قیمت گاہک کی جیب کے مطابق ہو تو وہ جلد ہی بک جاتی ہے۔ اگر چیزوں کی قیمت اور منافع میں توازن پیدا کر لیا جائے تو کوئی بھی چیز بغیر فروخت نہیں رہ سکتی، کیونکہ صارفوں کی ضروریات اتنی زیادہ ہوتی ہیں کہ کوئی بھی چیز باقی نہیں بچ سکتی۔ اندریں حالات مانگ کو وسیع کرنے کے لئے کسی بہت بڑے اقدام کی ضرورت نہ تھی۔ بازار میں آئی ہوئی چیزیں صارف خود بخود ہی خرید لیتے اور جہاں تک ان کی آمدنی اجازت دیتی وہ اور چیزوں کا مطالبہ کرتے رہتے، اور وہ مختلف چیزوں کا آپس میں مقابلہ بھی نہ کرتے۔ شہری صارفوں کو خوراک کی بہت ضرورت تھی اور اس ضرورت کی تکمیل صنعتی پیداوار گھٹانے سے ہی ہو سکتی تھی۔ کسان یہ جانتا تھا کہ اگر اسے زیادہ صنعتی پیداوار حاصل کرنی ہے تو اسے منڈی کے لئے اناج زیادہ پیدا کرنا چاہیے۔

روسی زراعت کو بہت حد تک اجتماعی کر دینے کے بعد بھی مسئلہ جوں کا توں رہا۔ دوسری

پنجسالہ اسکیم میں اگرچہ دولت آفریں اشیا کی پیدائش کچھ گھٹا دی گئی تھی، تاہم اس کے لئے بہت زیادہ عاملین پیدائش کی ضرورت تھی۔ اشیائے صارف کی پیدائش میں اضافہ کر دیا گیا۔ مگر یہ سچ ہے کہ آبادی کی بنیادی ضرورتیں ابھی تک پوری نہیں ہوتیں، کیونکہ یہ سوال ہمیشہ مختلف فیہ رہا ہے کہ کونسی اشیا کی پیداوار بڑھائی جائے، اور یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ صارف اپنی مانگوں میں کسی وضع کے پابند ہو جائیں گے۔ روس میں ابھی تک یہ پیچیدہ سوال پیدا نہیں ہوا کہ اشیائے صارف میں سے کون کونسی اشیا کی پیداوار میں اضافہ کر دیا جائے۔ اور جب تک ابتدائی ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں یہ سوال سنجیدہ شکل اختیار نہیں کر سکتا۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ منصوبہ بندی کرنے والے دستیاب وسائل کی غلط تقسیم نہیں کر سکتے۔ اگر سوویت روس کے باشندوں کو آزاد پسندیدگی کا حق دے دیا جائے تو یہ عین ممکن ہے کہ وہ دولت آفریں اشیا کے لئے تھوڑے وسائل مخصوص کریں اور یہ بھی ممکن ہے کہ اشیائے صارف کی پیدائش کے لئے اگر دستیاب وسائل زیادہ خرچ کئے جائیں تو لوگوں کی ضرورتیں زیادہ پوری ہو سکیں منصوبہ بندی کرنے والے خطا سے پاک نہیں۔ اس کے علاوہ آمدنی کی تقسیم کے منصوبی نظام کے ماتحت بھی ان کا معیار پسندیدگی انفرادی صارفوں سے مختلف ہو سکتا ہے۔ لیکن جب ہر چیز کی مانگ بہت زیادہ ہو تو دستیاب وسائل کا کافی حصہ بآسانی اشیائے صارف کی پیداوار پر خرچ کیا جا سکتا ہے اور اس تقسیم کے بارے میں اختلاف رائے تو ہو سکتا ہے، مگر کوئی دوررس غلطی نہیں ہو سکتی۔

پہلی پنجسالہ اسکیم کے ماتحت یہ طے پایا گیا تھا کہ جوتے، پوشاک، مختلف گھریلو برتن، اور مختلف اشیائے صارف کس کس مقدار میں بنائی جائیں گی۔ اور وسائل کی یہ تقسیم کرتے وقت لاگت زر کا سوال اٹھا ہی نہیں۔ یہی مسئلہ زیر غور رہا کہ ان اشیا کی پیدائش کے لئے مزدور اور کلیں حاصل کی جائیں تاہم سوویت منصوبہ بندی کرنے والوں نے شروع ہی سے اپنے فیصلوں کو زر اور اخلاق پر استوار کیا ہے ——— وہ لاگت زر بھی متعین کرتے رہے ہیں، اور حقیقی پیدائش بھی۔ لیکن لاگتوں کی اس تشخیص کا مقصد کسی چیز کی پیدائش کی مقدار مقرر کرنا نہ تھا بلکہ اس کا مقصد

صلاحیت پیدائش کو ضبط میں لانا تھا۔ اور یہ بات کم ازکم منصوبہ بندی کے اوّلین ادوار میں پیچ تھی۔

بعدازیں لاگتِ زر کی تشخیص نے زیادہ اہمیت حاصل کرلی۔ اس امر پر بہت زیادہ زور دیا جاتا تھا کہ چند واضح مستثنیات کے علاوہ سوویت معیشت کی ہراکائی ——— شخصی کارخانے مختلف کارخانوں کے "اتحاد" اور کل صنعتوں کے جتھے ——— پیدائش کا متوازن میزانیہ پیش کرے گی۔ اس کا مطلب اکثر یہ لیا جاتا ہے کہ قیمتِ فروخت اور لاگت میں توازن قائم کرکے سوویت معیشت سرمایہ داری کی طرف رجوع ہورہی ہے۔ لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ یہ امر فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ سوویت ادارے مقررہ قیمتوں پر چیزیں بیچتے ہیں اور یہ قیمتیں عموماً لاگتوں کے تخمینہ کے مطابق لگائی جاتی ہیں۔ چنانچہ سوویت تجارت کی آمدنی "بنیادی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ بنیادی سوال حقیقی لاگتوں کو تخمینہ کی لاگتوں کے مطابق کرنا ہے۔ کارخانے کے متوازن میزانیہ کے لئے یہ ضروری ہے کہ پیدائش کے منصوبی پروگرام پر پوری طرح عمل کیا جائے اور سرمایہ داری کی طرح نفع کو معیار نہ بنایا جائے۔ روس میں اگر کوئی کارخانہ بند کرکے نئے انتظام کے ساتھ دوبارہ جاری کیا جاتا ہے، تو اس کا سبب یہ نہیں ہوتا کہ پرانا انتظام نفع بخش نہیں تھا، بلکہ اس کی وجہ پرانے انتظام میں صلاحیت کا فقدان ہوتا ہے۔

میرا مطلب یہ نہیں کہ "نفع" کو معیار بنایا ہی نہیں جاتا۔ بلکہ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ اسے نمایاں حیثیت حاصل نہیں۔ "تعیشات" کی پیدائش کے سلسلہ میں نفع کا معیار اختیار کیا جاتا ہے، کیونکہ تعیشات کے صارفوں سے بھاری قیمتیں وصول کرنا عین جائز سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ جب تک بھاری منافع کی امید نہ ہو تعیشات پیدا نہیں کی جاتیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ نفع رساں تعیشات کو ضروریاتِ زندگی پر ترجیح دی جاتی ہے بلکہ اس کے معنی محض یہ ہیں کہ جب تعیشات کی مانگ پوری کی جاتی ہے تو نفع کو ضمنی پیداوار کی حیثیت دی جاتی ہے۔ جس طرح کہ بعض سرمایہ دار ممالک میں شراب اور دوسرے اسبابِ تعیش پر بھاری محصول عائد کئے جاتے ہیں۔

علاوہ ازیں سوویت منصوبہ بندی کرنے والے جب یہ سوچتے ہیں کہ کونسا طریق پیدائش نفع اور

پیداوار میں افزائش کا باعث ہوگا تو ان کے ذہن میں ایک وسیع پیداوار کی لاگت ہوتی ہے۔ جو اشیا بآسانی کثیر ترین تعداد میں پیدا کی جا سکتی ہیں، ان کی پیدائش کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اور اس سلسلہ میں لاگتِ زر کے بجائے حقیقی لاگت کو مدِ نظر رکھا جاتا ہے۔ کوشش یہ ہوتی ہے کہ اشیا کی فروخت سے زیادہ نفع حاصل کرنے کے بجائے پیداواری وسائل کو دوسری چیزوں کی پیدائش پر خرچ کرنا چاہیے۔ چنانچہ یہ اغلب معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ نفع بخش اشیا۔ مدّی قیمتوں پر بیچی جائیں گی تاکہ وہ زیادہ صرف کی جائیں۔ اور جن چیزوں کا صرفہ گھٹانا ہوتا ہے ان کی قیمتیں لاگتوں سے بہت زیادہ وصول کی جاتی ہیں تاکہ سوویت منصوبہ بندی کرنے والوں کو جو اشیا مرغوب ہیں ان کی فروخت سے بہت زیادہ فائدہ ہو۔

بحیثیت مجموعی سوویت معیشت میں قیمتِ فروخت پیدائش کی لاگت پر مبنی ہوتی ہے۔ مگر یہ لاگتیں سرکار کی طرف سے مقرر ہوتی ہیں، اور اس سلسلہ میں مختلف مزدوروں کی اجرتیں، سرمایہ اور قرضہ کے اخراجات، اور مختلف تجارتوں پر لگائے ہوئے ٹیکسوں کو مدِ نظر رکھا جاتا ہے۔ ان مقررہ لاگتوں میں مزدور کی اُجرت کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے، اس لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ سوویت معیشت میں اُجرتوں اور تنخواہوں کے لئے کیا اصول ہیں۔

سرمایہ داری اور اشتراکیت کے درمیانی دور کی اجرت کے مسئلہ پر مارکس نے اپنی کتاب "گاتھا پروگرام پر تنقید" میں تبصرہ کیا ہے۔ وہ ترقی یافتہ اشتمالی سماج کے لئے یہ اصول پیش کرتا ہے کہ "ہر شخص سے اس کی صلاحیت کے مطابق کام لیا جائے، اور ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق دیا جائے۔" لیکن وہ اس اصول کو عبوری دور پر قابل اطلاق نہیں سمجھتا۔ اس دور کے لئے وہ غیر مساوی اجرت کا قاعدہ پیش کرتا ہے یعنی ہر شخص کو اس کے کام کے مطابق دیا جائے۔ وہ کہتا ہے کہ سرمایہ دار نظام میں مزدور کی پیداوار کی قیمت سرمایہ دار غصب کر لیتا ہے ——— اسے وہ فاضل قیمت قرار دیتا ہے ——— اور مزدوروں کو اس کا صرف ایک حصہ ملتا ہے۔ ایک اشتراکی سماج اپنے عبوری دور میں بھی فاضل قیمت کو باقی نہ رکھے گا۔ اور تمام پیداوار سماج کی ملکیت ہوگی۔ اس مجموعی پیداوار سے سب سے پہلے سرمایہ میں تقلیل قیمت کی وجہ سے پیدا شدہ کمی پوری کی جائے گی۔

امداد ثابت کے لئے امدادی فنڈ قائم کیا جائے گا۔ اور زائد سرمایہ سے دولت آفریں اشیا کی پیدا کی جائیں گی۔ مارکس کا خیال ہے کہ اس تقسیم کے بعد پیداوار کا ایک حصہ حاضر صرفہ کے لئے بچ رہتا ہے، اسی میں سے انتظام اور مجلسی خدمات کے عمومی اخراجات پورے کئے جائیں گے اور اپاہجوں کے گذارہ کا بھی بندوبست کیا جائے گا۔ اس کے بعد جو کچھ باقی بچے گا وہ مزدوروں کو اجرت کے طور پر دے دیا جائے گا اس جموری دور میں ہر مزدور کو اپنے کام کے مطابق اجرت ملے گی۔

سوویٹ رہنما مارکس کے اس نظریہ پر کاربند ہیں۔ اور پیداکار کی اجرت کو اس کی انفرادی محنت کے مطابق کر دینا چاہتے ہیں۔ مگر ان محنتوں کو کس طرح ناپا جائے؟ صرف گھنٹے شمار کرنا کافی نہیں مارکسی اصول کی رو سے ایک ماہر مزدور بہت سے عامی مزدوروں کے برابر ہے اور ایک گھنٹہ میں سماج جس قدر محنت کا مطالبہ کرتی ہے، اگر ایک ماہر مزدور اپنے ساتھیوں سے زیادہ پیدا کرتا ہے، تو یقیناً وہ سماج کی مطلوبہ محنت سے زیادہ کام کرتا ہے۔ اگر پیداوار کا علیحدہ علیحدہ وزن کیا جا سکتا ہو تو ایک ہی پیشہ کے مختلف مزدوروں کی محنتوں کا اندازہ ان کی پیداوار سے کیا جا سکتا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ مختلف قسم کی محنتوں کے لئے کوئی موزوں پیمانہ معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اگر ماہر مزدور خاص تربیت کے بعد حاصل کئے جا سکتے ہوں تو ان مزدوروں کی اجرتیں اس تربیت کے اخراجات پر مبنی ہونی چاہئیں مگر یہ معیار ان قابلیتوں کے لئے نہیں کیا جا سکتا جو نہ تربیت سے پیدا ہوتی ہیں اور نہ چھنی جاتی ہیں۔ ایسی قابلیتوں کی مثال قدرتاً کمیاب اشیا کی سی ہے جن کی قیمت محنت پر منحصر نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں اگر تربیت کے اخراجات قوم برداشت کرے تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ فائدہ ایک فرد کو کیوں پہنچے جبکہ تمام قوم نے اس پر خرچ کیا ہے۔

مارکس گاتھا پروگرام پر تنقید" میں ان پیچیدگیوں کو نہیں سلجھاتا۔ وہ اسی بات کے کہنے پر اکتفا کرتا ہے کہ جموری معیشت میں "جیسا کام ویسا دام" کا اصول رائج ہوگا۔ اسے اس امر کا اچھی طرح احساس ہے کہ یہ اصول قطعی صداقت کا حامل نہیں۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ یہ درحقیقت سرمایہ دار عہد کی یادگار ہے، اور فاضل قیمت پر سرمایہ دار کا قبضہ نہ رہنے سے اس کی شکل وصورت بدل گئی ہے۔ اسے اس انتظام

کوئی اعتراض نہ تھا کہ مزدور کی محنت ناپی نہیں جاسکتی، اس لئے عبوری معیشت میں یہی ہوسکتا ہے کہ سرمایہ دار نظام میں مختلف محنتوں کی جو اجرتیں مروج ہیں وہ اپنالی جائیں، اور مذکورہ بالا اخراجات کے بعد جو فاضل قیمت بچے وہ اجرتوں میں بڑھادی جائے۔ اور پھر مصلحتِ وقت کے مطابق مختلف اجرتوں میں ترمیمیں کی جائیں تاکہ مختلف محنتوں کی رسد اور مانگ مساوی ہوسکے، اور بدلے ہوئے معاشری اور معیشی نظام کے مطابق پیشوں کی اُجرتیں کی نابرابری کو گھٹایا جائے۔

یہی کچھ سوویت حکام نے کیا ہے۔ انھوں نے انقلاب سے پہلے کی اجرتیں اپنالی ہیں، بڑی بڑی تنخواہوں میں کمی کردی ہے، چھوٹی چھوٹی تنخواہیں بڑھادی ہیں۔ اور اجرتوں کے نظام کو کچھ اس طرح بدلا ہے کہ جن پیشوں میں مزدوروں کی تعداد کم تھی وہاں اب ان کے لئے کشش پیدا ہوگئی ہے۔ اور سرمائے کی افزائش کے لئے دستیاب وسائل کو صرف کرکے جو کچھ باقی بچتا ہے وہ تمام اجرتیں بڑھانے کے کام آتا ہے۔ اب روس میں ایک ایسا معیشی نظام موجود ہے جس میں فاضل قیمت اور اجارہ داری کا خاتمہ کردیا گیا ہے اور اب آمدنیوں کا اختلاف سرمایہ دار سماجوں کی نسبت بہت کم ہے۔ لیکن جہاں کہیں مختلف محنتوں یا دستیاب پیداآور صلاحیتوں کے لئے عدم مساوات ضروری سمجھی گئی ہے وہاں اسے قائم رکھا گیا ہے۔ اجرتوں کے یہ طریقے خالص اشتمالی دور سے پہلے کے عبوری زمانے کے لئے مخصوص ہیں اور ان کے غیر معقول ہونے پر سوویت حکام کو کوئی اعتراض نہیں۔ کیا یہ طریقے سرمایہ دار نظام کی نامعقولیتوں اور تضادوں کی یادگار نہیں، تو پھر یہ غیر معقول اور متناقض بالذات کیوں نہ ہو؟

اس طریق پر اجرتوں کی تشخیص کرکے سوویت معیشت کو لاگتِ زر کی ایک ایسی اساس مل جاتی ہے، جس پر اشیا کی قیمت کچھ حد تک مبنی کی جاسکتی ہے۔ مگر یہ قیمتیں مصلحتِ وقت کیمطابق گھٹائی یا بڑھائی بھی جاسکتی ہیں، اور اس طرح لاگت اور قیمت فروخت کے تعلق میں جو فرق آتا ہے وہ مطلوبہ اشیا کی پیدائش پر کچھ اثر نہیں ڈالتا۔ قیمتوں کا تغیر کمیتِ پیدائش کے فیصلوں کا نتیجہ ہوتا ہے، سبب نہیں۔ اور اس کا پیداکاروں کی اجرتوں پر کوئی بنیادی ردِ عمل نہیں ہوتا کیونکہ

نظریہ کی رو سے عبوری دور میں اجزئیں پیداوار کی "قدر" ـــــــــ یعنی اس کی پیدائش کے لئے سماج جتنی محنت کا مطالبہ کرتی ہے ـــــــــ پر منحصر ہونی چاہئیں، قیمت پر نہیں جس کا "قدر" سے کوئی واضح تعلق نہیں۔

گویا کہ سودیت معیشت میں لاگت اور قیمت دونوں کا وجود ہے۔ مگر ان دونوں کا باہمی تعلق سرمایہ دار سماجوں سے مختلف ہے۔ اور یہ تعلق پیدائش پر کوئی خاص اثر نہیں ڈالتا۔ قیمت کا وجود صرف اس لئے ہے تاکہ صارفوں کی قوتِ خرید اور آمادگیٔ خرید کے مطابق اشیا کی رسد بندی ہو سکے۔ بالفاظ دیگر اس کا مطلب یہ ہے کہ مانگ کو رسد کے مطابق کر دیا جائے۔ مگر ابھی تک یہ صورت عموماً پیدا نہیں ہوئی۔ اور اگر اکثر چیزوں کی پیدائش بڑھ جائے تو موجودہ قیمت پر ان کی خریداری میں بھی اضافہ ہو جائے۔ رسد اور مانگ کو مساوی کرنے کی غرض سے قیمتیں بڑھائی نہیں گئیں۔ بلکہ بعض مواقع پر تو رسد بندی کی گئی ہے، اور بعض اشیا کے سلسلہ میں کچھ تقسیم کنندہ اداروں کو دوسری پر ترجیح دی گئی ہے تاکہ ان چیزوں کی محدود رسد مستحق لوگوں تک پہنچ سکے۔ مگر شروع سے ارادہ یہی رہا ہے کہ جونہی رسد معقول حد تک پہنچ جائے رسد بندی کا طریقہ ختم کر دیا جائے اور اکثر چیزوں کی قیمتیں ایسے معیار پر لے آئی جائیں جس سے مانگ اور رسد میں توازن پیدا ہو جائے رسد بندی کا طریق تو اب عملی طور پر ختم ہو چکا ہے۔

جہاں تک لاگت کا تعلق ہے، اس سے مقصد یہ نہیں کہ قیمتِ فروخت سے اس کا مقابلہ کرکے کسی چیز کی پیدائش کی کمیت کا فیصلہ کیا جائے، بلکہ اس سے منشا صرف یہ ہے کہ لاگت کے تخمینہ کا حقیقی لاگت سے مقابلہ کرکے صلاحیتِ پیدائش کو جانچا جا سکے۔ پیداوار کے متعلق منصوبہ بندی کرتے وقت لاگت کو پیش نظر رکھا جاتا ہے، مگر اس کے علاوہ دوسرے امور بھی زیر غور ہوتے ہیں اور وہ بعض اوقات زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ سرمایہ داری کے برعکس سودیت معیشت کثیر ترین منافع کی علمبردار نہیں بلکہ یہ اجتماعی خواہشات و ضروریات کی کثیر ترین تکمیل کی خواہاں ہے قیمت خرید کو دیکھ کر صارفوں کی مانگ کی کثرت و قلت کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ اور کسی طریق پیدائش

کو اپنانے کے فیصلہ میں یہ مانگ ایک عامل کی حیثیت رکھتی ہے، مگر یہ صرف ایک عامل ہوتی ہے، اور یہ ضروری نہیں کہ فیصلہ اسی پر مبنی ہو۔

دوسرے لفظوں میں، سوویت منصوبہ بندی کی اساس اجتماعی ضرورت پر استوار ہے۔ روس کے سے غریب ملک کی اکثر پیداوار کے متعلق یہ معیار اختیار کرنا مقابلتاً آسان ہے۔ اور اس کے راستے میں صرف ایک ہی بڑی مشکل ہے یعنی حاضر صرفہ اور دولت آفریں اشیا کی افزائش کے درمیان توازن پیدا کیا جائے۔ جوں جوں معیارِ زندگی بلند ہوتا جائے گا توں توں یہ مشکل بھی بڑھتی جائے گی۔ کیونکہ جب بنیادی ضروریات پوری ہو جائیں تو پیدآور مساعی ان اشیا و خدمات پر مرکوز ہونی چاہئیں جن کا صرفہ عمومی ضرورت کے بجائے شخصی پسندیدگی کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب یہ دور آجائے تو دور بین منصوبہ بندی کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ صارفوں کی خواہشات کا صحیح تخمینہ لگایا جائے، اور صارفوں کی خواہشات کا اندازہ اس بات سے کیا جاتا ہے کہ وہ کس چیز کو خریدنے پر آمادہ ہیں۔ اس میدان میں ریاست عمرانی وجوہات کی بنا پر ایک چیز کے صرفہ کی حوصلہ افزائی اور دوسری کی حوصلہ شکنی نہیں کر سکتی۔ صحیح طریقہ کار یہی ہے کہ قیمت لاگت پر مبنی ہو۔ اور اگر ایک چیز کی وسیع پیدائش سے لاگت گھٹ جائے تو اس کی خریداری بڑھانے کے لئے قیمت کم کر دینی چاہیئے، خواہ اس سے اُن اشیا کی مانگ گھٹ جاتے جن کی لاگتیں اٹل یا بڑھتی ہوئی ہوں۔

عام ضروریات کی اشیا کے بارے میں تو نہیں، مگر پسندیدہ صرفہ کی اشیا کے سلسلہ میں لاگت بہت اہمیت رکھتی ہے ——— اس پسندیدہ صرفہ میں عام ضروریات کی اشیا بھی شامل ہیں اگر وہ مقررہ مقدار سے زیادہ خرچ کی جائیں۔ سوویت معیشت میں لاگت کو کوئی خارجی قطعی اساس کی حیثیت حاصل نہیں ہوتی بلکہ خود اس کی بنیاد اس بات پر ہوتی ہے کہ مختلف محنتوں کی کیا اُجرت ادا کی جاتی ہے اور دوسرے عاملین پیدائش پر کیا خرچہ اُٹھتا ہے۔ یہ امور چونکہ لاگت پر اثر انداز ہوتے ہیں اس لئے مختلف اشیا کی کمیت کے متعلق منصوبہ بندی کرنے والوں کے فیصلوں پر بھی اثر ڈالتے ہیں۔ ایک عبوری معیشت میں محنت کی اُجرت ادا کرنے کا دستور باقی رہتا ہے، اس لئے

عام ضرورت کی اشیا کے علاوہ باقی پیداوار لاگت اور صارف کی قیمت خرید کے باہمی تعلق کے مطابق ہوتی ہی اور قیمت خرید تقسیم آمدنی سے متاثر ہوتی ہی۔ مگر جوں جوں اقتصادی نظام اشتمالی ہوتا جاتا ہی اور اُجرت کے بجائے مزدور کو اس کی ضرورت کے مطابق دیا جانے لگتا ہی اسی کے مطابق پیدائش کی لاگتوں کا وجود ختم ہوتا جاتا ہی، یعنی کسی ایک پیداکار کی اُجرت کی تشخیص نہیں ہو سکتی۔

جب یہ دور آجائے تو لاگتِ زر کے بجائے یہ دیکھا جاتا ہی کہ مختلف مخیتں سماج کے لئے کہاں تک پیدآور ہیں۔ مگر یہ زیادہ اغلب ہی کہ جب کوئی اہم پیداوار یہ حیثیت اختیار کرے گی تو ایک غیر سکہ جاتی معیار مقرر کیا جائے گا جس سے پیدائش کی مختلف شاخوں کی کارآمد لاگتوں کا اندازہ کیا جاسکے گا۔ یہ معیار زر کا نہیں ہوگا بلکہ حقیقی پیدآور قوت کا ہوگا۔ کسی چیز کی لاگت پیدائش سکوں کے بجائے پیدآور قوت کی صورت میں شمار کی جائے گی۔ اور کسی چیز کے کارآمد ہونے کا اندازہ اس بات سے کیا جائے گا کہ کتنی پیدآور قوت خرچ ہوئی ہی اور اس قوت سے جو جو چیزیں پیدا ہو سکتی ہیں ان کے لئے صارفوں کی مانگ کیسی ہی۔ مختلف پیشوں میں خرچ کی ہوئی پیدآور قوت کا اندازہ کرنے کا معیار اقتصادیوں کے بجائے ماہر نفسیات اور عضویات داں پیش کریںگے اور قیمت خرید کا مقابلہ اس بات سے نہیں کیا جائے گا کہ پیدائش پر کتنی لاگتِ زر اُٹھتی ہی بلکہ یہ دیکھا جائے گا کہ پیدآور قوت کس مقدار میں خرچ ہوئی ہے۔

بعض قارئین اس امر کو اختلاف کے بجائے امتیاز سمجھیں گے۔ مگر یہ ایک اہم اختلاف ہی۔ جس پیمانے سے صارفوں کی مانگوں کو ناپا جاتا ہی اُسی سے پیدائش کی حقیقی لاگتوں کو ناپنا ایک ٹیڑھا مسئلہ ہی۔ ان دونوں امور کے لئے علیحدہ علیحدہ پیمانے مقرر کرنے کے بعد پیداوار کی آسانی سے منصوبہ بندی کی جا سکتی ہی جس سے بہ آسانی ضروریات و خواہشات کی زیادہ سے زیادہ تسکین ہو سکتی ہی۔ کیونکہ یہ امر واضح ہو جاتا ہی کہ پیدآور قوت جو چیزیں پیدا کرتی ہی وہ کس حد کے مطابق خریدی جا سکتی ہیں۔ پیدآور قوت کی خرید و فروخت کے لئے وہی معیار اختیار نہیں

کیا جاسکتا۔ اصل مسئلہ یہی ہوتا ہے کہ دستیاب پیدآور قوت سے شخصی اور اجتماعی خواہشات وضروریات کی تکمیل حاصل کی جائے۔

اس طرح پیدآور قوت اور صارفوں کی مانگ میں توازن پیدا کرنے سے اگرچہ ایک مشترکہ معیار معیارِ زر تو حاصل نہیں ہوتا، تاہم اجتماعی معیشت ایک ایسا قابلِ عمل پیمانہ معلوم کرلیتی ہے جس سے دونوں چیزیں سکّوں میں ناپی جاسکتی ہیں اور انسانی قوت کو سکّوں میں تولنے سے جو غلطیاں پہلے رونما ہوجایا کرتی تھیں وہ اب رونما نہیں ہوتیں اور تقسیم آمدنی کا طریق اس پیمانے پر قطعاً اثر نہیں ڈالتا۔ اجرت کے خاتمے کا مطلب یہ نہیں کہ خواہشوں کی تکمیل اور لاگتوں کے مقابلے کے لئے کوئی کمیتی معیار باقی ہی نہیں رہتا، بلکہ نئے معیار سے تو سارا مسئلہ ہی حل ہوجاتا ہے اور مختلف چیزوں کو مختلف مگر قابلِ موازنہ پیمانوں سے ناپا جاسکتا ہے۔ یہ یاد رہے کہ دونوں کے لئے کوئی ایک موزوں مشترکہ معیار معلوم ہی نہیں کیا جاسکتا۔

سودیت معیشت ابھی تک سرمایہ داری اور مکمل اشتراکیت کے درمیانی دور میں ہے۔ اور اس میں سرمایہ دار نظام کا اُجرتی دستور تا حال رائج ہے۔ مگر نئی راہیں معلوم کی جارہی ہیں۔ اگرچہ پیدائش کی لاگتِ زر معلوم تو کی جاتی ہے تاہم کسی چیز کو پیدا کرنے کا فیصلہ اس کی روشنی میں نہیں کیا جاتا، بلکہ اس سے صرف یہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ کسی چیز کی پیدائش کے لئے کس قدر محنت درکار ہے۔ گویا اب ایک متبادل معیار معلوم کیا جارہا ہے، جو ابھی تک نہ پوری طرح نافذ ہوا ہے اور نہ ہوسکتا ہے۔

(ترجمہ) اکرام قمر ایم اے

اخلاق

ہماری زبان میں، خواہ عام بول چال ہو خواہ سنجیدہ تحریر، لفظ "اخلاق" کا استعمال جس مفہوم میں ہوتا ہے وہ بہت تنگ ہے۔ اگر آپ کو کسی نے مرغ پلاؤ کھلا دیا تو آپ کہتے ہیں کہ اُس شخص کا اخلاق بہت اچھا ہے۔ اگر ملک کے کسی حصّہ کے لوگ آپ کو ململ کا انگرکھا اور دو پلی ٹوپی پہنے دیکھ کر ہنستے ہیں تو آپ فرماتے ہیں کہ اس حصّہ کے لوگ اخلاق سے ناواقف ہیں۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ فلاں شخص کے میل ملاپ کا طریقہ بہت اچھا ہے یا فلاں مقام کے لوگ ملنے ملانے کے طریقوں سے ناواقف ہیں۔ حقیقت میں "اخلاق" کا مفہوم اس سے بہت زیادہ وسیع ہے۔ اس میں شک نہیں کہ میل ملاپ کا طریقہ، آداب نشست و برخاست وغیرہ بھی اخلاق کے مفہوم میں شامل ہیں۔ لیکن صرف جزوی حیثیت سے اور یہ جزوی حیثیت بھی کچھ زیادہ اہم نہیں۔ پھر ایک معمولی جز کو کل کی حیثیت دے دینا زیادتی نہیں تو اور کیا ہے؟

عام بول چال کی بات اور ہے۔ لیکن تحریروں اور خصوصاً سنجیدہ تحریروں میں اگر کسی لفظ کا صحیح مفہوم میں استعمال نہ ہو، یا کسی مفہوم کو ادا کرنے کے لئے صحیح لفظ نہ برتا جائے تو گویا لفظ اور مفہوم دونوں کی توہین کی گئی۔ زبان کا معیار مفاہیم کے تعین اور اشیاء اور تصورات کی جامع و مانع تعریفوں سے بنتا ہے۔ اپنا مطلب دوسروں پر مکمل طور پر واضح کر سکنا مشکل ضرور ہے لیکن اگر ہر لفظ کا ایک مقرر مفہوم اور محل استعمال ہو اور اس کے استعمال کرنے والے کو ان دونوں چیزوں سے آگاہی بھی ہو، تو اتنا مشکل نہیں۔ الفاظ میں بڑی قدرت ہے ہاں ان کے برتنے کا سلیقہ ہونا چاہیئے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ لفظ اخلاق کے مفہوم کا تعین اور پھر اس کی جامع و مانع تعریف کس طرح کی جائے۔

مجھے حکماء یونان یا فلاسفۂ ہندستان کی دماغی کاوشوں سے بحث نہیں۔ مدعا صرف یہ ہے کہ اخلاق کے مفہوم کو اس طرح سمجھ لیا جائے کہ پھر اس کی افادیت کے متعلق قابل فہم انداز میں بحث کی جاسکے

میرے نزدیک اخلاق کے معنے ہیں "انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا قانون" اس تعریف میں "انفرادی" اور "اجتماعی" کا مطلب تو واضح ہے مگر لفظ "قانون" ذرا تشریح طلب ہے۔ ہم کو اپنی زندگی میں اس لفظ سے یا اس کی عملی شکل سے جن حالات میں دوچار ہونا پڑتا ہے ان میں سے بعض تو ناگفتہ بہ ہیں اور بعض زیادہ سے زیادہ قابل برداشت لیکن خوشگوار وہ بھی نہیں۔ قانون ظاہر ہے کہ حدبندی، روک تھام اور اسی قسم کے مفاہیم کا حامل ہے۔

یہاں پر یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لئے بندش یا روک تھام کی ضرورت کیا ہے؟ پھر اگر ضرورت تسلیم بھی کر لی جائے تو اس قانون کی نوعیت کیا ہونی چاہیئے؟ اور اس کا نفاذ کس طرح ہونا چاہیئے۔ انھیں سوالات کا جواب دینا اس مضمون کا مقصد ہے۔

انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لئے قانون کی کیا ضرورت ہے؟

دوسرے الفاظ میں اخلاق کی کیا ضرورت ہے؟ سوال جس قدر چھوٹا معلوم ہوتا ہے اتنا ہی مشکل ہے۔ اس کا جواب مکمل طور پر دینے کے لئے ضخیم جلدوں کی ضرورت ہے۔ اس لئے ایسے جواب کی اس مختصر مضمون میں گنجائش نہیں۔ البتہ مختصر طور پر اخلاق کی ضرورت واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

قانون ارتقاء کا یہ ایک مسلّم اصول ہے کہ صنف حیوانی جس قدر ترقی کے مدارج طے کرتی جاتی ہے اُسی قدر اُس کی جبلتیں مقدار اور خوبی دونوں اعتبار سے کم ہوتی جاتی ہیں۔ لیکن دماغ دونوں لحاظ سے بہتر ہوتا جاتا ہے۔ انسان چونکہ حیات کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ شکل ہے، جبلّی صلاحیتوں کے اعتبار سے تمام جانداروں سے نیچے ہے لیکن دماغی حیثیت سے سب سے اونچا۔ یہ دماغی حیثیت بھی اُس کو فی الفور حاصل نہیں ہو جاتی۔ بلکہ پیدائش کے بعد آہستہ آہستہ ترقی کرتی ہوئی اٹھارہ سے لے کر پچیس سال تک کے سن میں کامل نشو و نما پاتی ہے۔ لہذا انسان کا بچہ سن بلوغ تک دوسری جانداروں کے مقابلے میں زیادہ کمزور، زیادہ بے بس اور زیادہ بیوقوف ہوتا ہے۔ یہ بات اتنی ظاہر ہے کہ مثالوں کے ذریعے واضح کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ کم ازکم اس وقت تک جب تک کہ

انسانی بچے کی عقل پختہ نہ ہو جائے اُس کو دوسرے جانداروں کے بچوں کے مقابلے میں زیادہ "تربیت" کی ضرورت ہے۔ لفظ "تربیت" توسین کے اندر عمداً رکھا گیا ہے۔ اس لئے کہ یہاں اس سے صرف اتنا ہی مفہوم مراد نہیں ہے جتنا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے بلکہ وہ تمام باتیں ذہن میں رکھی گئی ہیں جن کو کرنے سے بچہ اچھی صحت اور اچھے دماغ کے ساتھ انسان بننے کے قابل ہو سکتا ہے۔ اور جن کو نہ کرنے سے اوّل تو زندہ ہی نہیں رہ سکتا اور اگر جیا بھی تو جانوروں سے بدتر ہو کر۔

اب یہ تربیت بچے کو خود بخود تو حاصل ہو نہیں سکتی اور پھر انسانی بچے کو ضروری ہے کہ تربیت دینے والا کوئی اور ہو۔ والدین سے بہتر تربیت دینے والا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ اُن سے تربیت حاصل کرنا تو بچے کا پیدائشی حق ہے۔ لیکن والدین کی تربیت نہایت ضروری ہونے کے باوجود ناکمل ہوتی ہے۔ اس وجہ سے کہ ان کی تربیت یک طرفہ اور ضرورت سے زیادہ مشفقانہ ہوتی ہے۔ والدین سے الگ ہونے کے بعد دنیا اُسے نہ تو اتنی محدود نظر آئے گی اور نہ اس قدر مہربان جتنی کہ گھر کی دنیا نظر آتی تھی۔ اگر بچے کو ہمیشہ گھر کے خوشگوار ماحول میں زندگی بسر کرنی ہوتی، تب تو والدین کی تربیت یعنی "انفرادی تربیت" کافی ہوتی لیکن گھر کی مہربان فضا تھوڑے ہی دنوں بچے کا ساتھ دیتی ہے۔ جلد یا بدیر والدین کا سایہ بھی اس کے سر سے اُٹھ جاتا ہے۔ اُس وقت اُس کو معلوم ہوتا ہے کہ روئے زمین فرش مخملیں نہیں ہے۔ اس کو اپنے جیسے دوسرے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے اور دوسرے لوگوں کا طرزِ عمل والدین کے طرزِ عمل سے مختلف ہوتا ہے۔ اگر اُس کو یہ نہیں سکھایا گیا کہ والدین کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیئے اور دوسروں کے ساتھ کس طرح۔ یعنی اگر اس کو "اجتماعی تربیت" نہیں دی گئی تو پھر اس کا اللہ ہی حافظ ہے۔ اگر آپ کو انفرادی اور اجتماعی تربیت کے فرق کو اپنی آنکھ سے دیکھنا ہے تو دو ایسے طالب علموں کو لے لیجئے جن میں سے ایک نے پرائیویٹ تعلیم پائی ہے اور دوسرے نے بورڈنگ ہاؤس میں رہ کر کالج میں پڑھا ہے۔ سوا چند استثنائی صورتوں کے آپ کو بورڈنگ والا طالب علم زندگی کی دوڑ کے لئے زیادہ تیار نظر آئے گا۔

انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کی تربیت کی ضرورت بچے کے حق میں ثابت ہو گئی۔ اب سوال یہ ہے کہ

کیا ذی شعور ہوجانے کے بعد بھی انسان کو تربیت کی حاجت ہی۔ جواب یہ ہی کہ تربیت کی نہیں تو کم از کم "ہدایت" کی یقیناً حاجت ہی۔ اور ہدایت کی حاجت بھی انسان کی انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے ہوتی ہی۔ پہلے انفرادی حیثیت پر غور کیجئے۔ یہ بات تو ہر شخص جانتا ہی کہ انسان کے پاس عقل کے علاوہ جذبات بھی ہوتے ہیں۔ جذبات کو عقل کا تابع نہ سہی رفیق ہی بنالیا جائے تو انسان کی انفرادی زندگی صحت اور خوشی کے ساتھ بسر ہوسکتی ہی۔ لیکن اسے بدبختی سمجھ لیجئے یا کچھ اور، انسان کو صاحب شعور ہونے کے فوراً بعد یا بعض اوقات اُس سے بھی پہلے جذبات کا سیلاب گھیر لیتا ہی اور وہ

جا رہا ہوں جس طرف لے جا رہا ہی دل مجھے

پر عمل کرتا ہی یا کرنا چاہتا ہی۔ یہ ظاہر ہی کہ "دل" کو بالکل بے لگام چھوڑ دینے سے انسان کی زندگی صحت اور خوشی کے ساتھ بسر نہیں ہوسکتی۔ "دل" انسان کو آسان ترین راہ یعنی کم سے کم دشوار راہ پر لے جانا چاہتا ہی۔ اور ایسا راستہ ہمیشہ نشیب کی طرف جاتا ہی۔ ایسے حالات میں اگر انسان کی بچپن میں تربیت ہوئی بھی ہی تو اس زمانے میں کچھ زیادہ کام نہیں دیتی۔ اس لئے کہ اُس تربیت میں ان جذبات پر قابو رکھنے اور انھیں اپنے لئے مفید بنانے کے متعلق شاذ و نادر ہی کوئی بات بتائی جاتی ہی۔ اگر صاحب شعور ہونے کے بعد انسان بالکل آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہ اپنے جذبات کا ایسا غلام ہوجاتا ہے کہ اس کی دوسری فطری صلاحیتیں قطعی بے کار ہوکر رہ جائیں۔ پس معلوم ہوا کہ انسان کی انفرادی زندگی میں "ہدایت" کی ضرورت ہی۔

اب یہ ثابت کرنا ہی کہ اجتماعی زندگی میں بھی ہدایت ضروری ہی۔ آدمی کو دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لئے اپنے ہی جیسے اور آدمیوں کے ساتھ رہنا سہنا پڑتا ہی۔ اگر دو پاس پاس رہنے والے آدمی فقط اپنا ہی اپنا مفاد سامنے رکھیں تو وہ دو دن بھی پاس پاس نہیں رہ سکتے۔ اس لئے دونوں کو اپنے اپنے مفاد کا کچھ حصہ "پس انداز" کرنا پڑتا ہی۔ تاکہ دونوں کا ایک مجموعی مفاد وجود میں آجائے۔ یہ مجموعی مفاد بھی دونوں آدمیوں کے انفرادی مفاد کا جز ہوتا ہی۔ انفرادی مفاد کے ایک حصہ کو پس انداز کرکے مجموعی مفاد تربیت دینا اور پھر اُس سے بہرہ ور ہونا کوئی آسان

کام نہیں ہے۔ اس کے کچھ اُصول اور قاعدے ہیں جو ابتدائے آفرینش سے لے کر اس وقت تک کے انسانی تجربات کا نچوڑ ہیں۔ انھیں اصول کا حاصل کرنا "ہدایت لینا" ہے اور ان کی تعلیم دینا "ہدایت دینے" کے مترادف ہے۔

یہ تربیت اور ہدایت کیا چیزیں ہیں؟ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا قانون یعنی وہی "اخلاق" جو اس مضمون کا موضوع ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لئے قانونِ فطرت کافی نہ تھا جو ایک انسان کے بنائے ہوئے قانون کی ضرورت پڑ گئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قانونِ فطرت یقیناً کافی ہوتا اگر انسان ارتقاء کے انھیں منازل میں ہوتا جن میں دوسری جاندار ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ فطرت نے ہم کو ایک دماغ دے کر بہت سی ایسی صلاحیتوں سے محروم کر دیا ہے جو ہمارے جانور بھائیوں کے پاس کافی مقدار میں موجود ہیں۔ مثلاً پیٹ بھرنے کے معاملے کو لیجئے تو نہ ہمارے پاس بلی کے سے پنجے ہیں، نہ شیر کے سے ناخن، نہ عقاب کی سی آنکھ ہے نہ کتے کی سی ناک، نہ بھیڑیئے کے سے جبڑے نہ مگرمچھ کی سی قوت ہاضمہ، اور نہ اونٹ کی سی "سادہ روی اور بلند خیالی" کا ہم میں حوصلہ ہے۔ پھر ستم بالائے ستم یہ کہ ہمیں سور کی سی بدتمیزی اور گدھے کی سی بے حسی بھی عطا نہیں ہوئی۔ ہم مجبور ہیں کہ پیٹ بھرنے کے معاملے میں اپنے دماغ سے کام لیں۔ پنجے اور ناخن کے عوض چھری اور کانٹا بنائیں۔ دوربین بنا کر عقاب کی آنکھ کا کام لیں اور دعوتی رقعوں کی ٹوہ میں رہ کر کتے کی ناک کا۔ بھیڑیئے کے سے جبڑے نہیں ہیں تو نوالوں کو چھوٹا بنائیں اور قوت ہضم میں مگرمچھ کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو آگ کی مدد سے کھانے کی چیز کو نرم بنائیں۔ اگر ہم اپنی عقل کی مدد سے جانوروں کی قابلیتوں کا نعم البدل پیدا کرتے ہیں تو اس کے معنے یہ تو نہیں ہو سکتے کہ ہم قانونِ فطرت کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ ہم یقیناً اس کے مطابق کام کر رہے ہیں لیکن اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر۔

پھر تن ڈھکنے اور سر چھپانے کے مسائل پر غور کیجئے۔ کیا ہمارے پاس بھیڑوں کا سا قدرتی اور کٹ، بندروں کی سی نرم و گرم فرفل، ہاتھی کی سی شلواری کھال اور مچھلیوں کا سا ٹھنڈا خون ہے؟ کیا ہم گھونسلوں، بلوں اور غاروں میں اتنے ہی آرام سے زندگی بسر کر سکتے ہیں جتنے آرام

سے جانور کرتے ہیں؟ یقیناً نہیں۔ ہم کو (ستر کے خیال سے نہیں تو) کم ازکم سردی، گرمی، برسات سے بچنے کے لئے لباس کی حاجت ہی۔ اگر ہم اپنے ترقی یافتہ دماغ کی بدولت بھیڑوں کی کھال سے بہتر اور کوٹ، پرندوں کے پروں سے بہتر فرغل اور ہاتھی کی کھال سے بہتر شلوار اور رہنے کے عمدہ مکانات تیار کرسکتے ہیں تو کیا فطرت سے جنگ کرتے ہیں؟ یقیناً نہیں کرتے لیکن اس سے ایک قدم آگے ضرور ہیں۔

افزائش نسل کے سوال کو لیا جائے تو سب سے زیادہ مشکل پیش آتی ہی۔ اگر اس کے طریقوں کو دیکھا جائے تو ہم جانوروں کے مقابلے میں کچھ زیادہ مہذب ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتے۔ مگر سوال کے تمام پہلوؤں پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہم کو سب سے زیادہ اسی معاملے میں تہذیب کی ضرورت ہی۔ تقریباً تمام دوسرے جانوروں کو افزائش نسل کے دَورے پڑا کرتے ہیں جن کو عرف عام میں "پیلانے کا زمانہ" کہتے ہیں۔ جانور انھیں دوروں کے زمانے میں اپنا تمام سال کا حساب کتاب چکا لیتے ہیں۔ اور اس کے بعد فراغت اور یکسوئی کے ساتھ تلاش خورد ونوش یا دوسرے کاموں میں مصروف ہوجاتے ہیں۔ مگر انسان ایسا جانور ہی جس پر ایسے دورے کبھی نہیں پڑتے یا یوں کہئے کہ ہمیشہ پڑا کرتے ہیں۔ اس کا لین دین تمام سال جاری رہتا ہی۔ قدرتی عطیات کی ایک حد ہوتی ہی۔ اُس حد کے اندر رہا جائے تو زندگی متوازن اور حسب معمول رہتی ہی اور دل دماغ کی صلاحیتیں ایسی شانتی کے ساتھ مصروف کار رہتی ہیں جو صرف "آسودگی" سے حاصل ہوتی ہی۔ لیکن اگر اُس حد سے تجاوز کیا جائے، خواہ افراط کی طرف خواہ تفریط کی، تو پھر تمام جسم کا اور جسم کے ساتھ دل ودماغ کا میکانکی توازن بگڑ جاتا ہی۔ اس میں شک نہیں کہ اسی توازن کی خرابی سے کبھی کبھی قیس وفرہاد، کیٹس، شیلے اور ہندوستان میں .... (مگر میں ذاتیات سے دور رہنا چاہتا ہوں) پیدا ہوجاتے ہیں۔ لیکن زیادہ تر مدقوق مبروص، مجہول اور انھیں ناموں کے ہم وزن خدا جانے کتنے اور ناموں والے انسان پیدا ہوتے ہیں۔ لازم ہی کہ افزائش نسل کے بھی اصول اور قاعدے ہوں اور ان کی پابندی دوسرے اصول اور قاعدوں کی پابندی سے زیادہ ضروری قرار دی جائے۔ لہذا یہ بات صاف ہوگئی کہ محض قانون قدرت

کافی نہیں ہے۔ محض اس قانون پر بھروسہ کرکے جانور زندہ رہ سکیں تو رہ سکیں۔ انسان تو رہ نہیں سکتے انسانوں کو کچھ قوانین اپنے بھی وضع کرنے پڑتے ہیں۔ اگر یہ قانون فطرت کے مطابق ہوتے ہیں تو کامیابی کا امکان ہوتا ہے۔ ورنہ نہیں۔

لیکن ابھی تک قانون فطرت کا کافی یا ناکافی ہونا انسان کی انفرادی حیثیت سے بحث میں آیا ہے۔ اب اس سوال پر غور کرنا ہے کہ آیا قانونِ فطرت انسان کی اجتماعی ضروریات کے لئے بھی کافی ہے یا نہیں۔ اس کا جواب دینا نسبتاً زیادہ آسان ہے۔ ایک شخص جب تک اکیلا ہے ایک حد تک خود مختار ہے اور اگر چاہے تو محض قانونِ فطرت پر عمل کرکے خود کو بزعم خود ایک اچھا اور کامیاب انسان بنالے۔ لیکن اگر اس بات کا ذرا سا بھی امکان ہے کہ وہ دوسرے آدمیوں سے بھی کچھ واسطہ رکھے گا۔ اور اس بات کا امکان ہی نہیں یقین ہے تو پھر اس کی خود مختاری وہیں پر ختم ہو جاتی ہے جہاں سے دوسری ہستی کی حد شروع ہوتی ہے۔ اگر وہ تنہائی میں کوئی ایسا فعل کرتا ہے جس کا تعلق محض اُس کی ذات سے ہے تو اس فعل کی اچھائی یا بُرائی کی نسبت دوسروں کو کوئی حق نہیں کہ اُس شخص سے اپنی رائے منوائیں گو صلاح مشورہ دینے کا حق اس حالت میں بھی ہے۔ لیکن اگر اُس فعل سے دوسروں کے حقوق پر زد پہنچتی ہے تو دوسروں کو جائز ہی نہیں واجب ہے کہ اس شخص کو اس فعل سے باز رکھیں۔ خواہ وہ کتنا ہی مطابقِ فطرت کیوں نہ ہو۔ فرض کیجئے آپ میرے غریب خانے میں ایک صوفے پر تشریف فرما ہیں کہ اتنے میں تقاضائے بشریت آپ کو ایک نہایت ہی فطری کام کی انجام دہی کی طرف مائل کرتا ہے۔ اب اگر آپ فطرت کے اس ارشاد کی تعمیل جائے تشریف ہی پر شروع کردیں تو ظاہر ہے کہ اسی فطرت نے میرے سیدھے ہاتھ کو جو قوتِ جولانی بخشی ہے، مجھے اُس کے برمحل استعمال کی ضرورت پڑ جائے گی۔ آپ کو لازم ہے کہ ایسے اہم فعل کے ارتکاب سے قبل مجھ سے مشورہ کرلیں اور میرے مکان کا جغرافیہ بخوبی سمجھ لیں تاکہ آپ کا فعل مطابقِ فطرت بھی ہو اور مطابقِ تہذیب بھی۔ خواہش جنسی بھی ایک اہم تقاضائے فطرت ہے۔ چونکہ جنس کا وجود ہی کم از کم دو ذاتوں کا متقاضی ہوتا ہے، ایک مثبت اور دوسری منفی، اس لئے یہاں انفرادی حیثیت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ جنس ایک قطعی اجتماعی شئے ہے۔

لہٰذا اگر یہ ثابت ہو جائے کہ جنس کے بارے میں بھی قانون، بندش یا روک تھام کی ضرورت ہے تو ایک بڑا ثبوت اس امر کا مل جائے گا کہ اجتماعی حیثیت سے بھی محض قانونِ فطرت کی پابندی انسان کے لئے کافی نہیں ہے۔

تجزیۂ نفسی کے محققین کا یہ نظریہ ہے کہ جنس ہی وہ کیل ہے جس کے گرد کل نفسیات حیوانی چکر لگا رہی ہے۔ یہ نظریہ صحیح ہو یا نہ ہو، اس میں شبہ نہیں ہو سکتا کہ خواہش جنسی حیوانی خیالات و افعال کی ایک زبردست محرک ہے۔ یہ بات محتاج ثبوت نہیں کہ جو قوت جس قدر زبردست ہوتی ہے اُسی قدر مفید اور مضر دونوں امکانات کی حامل ہوتی ہے۔ اب اگر اس قوت کے استعمال کے لئے تحریکِ قدرت کے سوا اور کوئی قاعدہ یا قانون نہ ہو تو کیا ضمانت ہے اس بات کی کہ ہمیشہ مفید امکانات ہی ظاہر ہوں گے اور مُضر کبھی نہ ہوں گے؟ تجربہ تو یہ بتاتا ہے کہ قانون کی کمی یا عدم موجودگی سے مضر امکانات ہی کا ظہور زیادہ ہوتا ہے۔ جنس کی حد بندی نہ کرنے میں جن مضرتوں کا امکان ہے اُن میں سے چند یہ ہیں:- اوّل قوائے جنسی کا قبل از وقت اضمحلال، دوم مخصوص جنسی امراض کی ترویج اور زیادتی، سوم کثرت رقابت کے باعث تعدادِ جرائم میں اضافہ، چہارم شناخت و تصدیق ولدیت، پرورش اطفال اور پرداخت زچہ میں لاتعداد مشکلات کا پیدا ہو جانا، پنجم پرورش اطفال کی بے قاعدگی کا آئندہ نسلوں پر اثر۔ یہ مضرتیں "مشتے نمونہ از خروارے" کے طور پر ہیں۔ ان میں سے بھی ہر ایک کے لئے مستقل مضمون درکار ہے۔ یہ سب اور ان کے علاوہ بہت سی اور مضرتیں وہ ہیں جو مادی ترازو میں تولی جا سکتی ہیں لیکن ان سب سے بڑھ کر وہ مضرتیں ہیں جن کا تعلق ان لطیف، غیر مرئی اور غیر محسوس قدروں سے ہے جو انسان کے لاکھوں سال کے تجربوں کا نچوڑ ہیں اور جو انسان کو دوسرے جانداروں سے الگ کرتی ہیں۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ انسان کی اجتماعی حیثیت کے لئے بھی قانون قدرت کافی نہیں ہے۔ بلکہ انسان کے اپنے بنائے ہوئے قوانین کی بھی ضرورت ہے۔ انھیں قوانین کا نام فلسفے کی زبان میں "اخلاق" ہے۔

قانونِ اخلاق کی نوعیت کیا ہونی چاہیئے؟ یعنی انسان کو اخلاق کے نقطۂ نظر سے کیا کرنا چاہیئے اور کیا نہیں۔ اس سوال کا ذکر ضمناً اوپر کے پیراگرافوں میں آ چکا ہے۔ لیکن چونکہ معاملہ کسی قدر

تفصیل طلب ہے۔ اس لئے علیحدہ عنوان کے ماتحت اس پر بحث کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے جو کچھ سطورِ بالا میں عرض کیا گیا اس سے یہ تو واضح ہو گیا کہ قانونِ اخلاق کی ضرورت انسان کو انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ قانونِ اخلاق کی "دفعات" کیا ہیں۔ تقریباً ہر مذہب نے ان دفعات کی فہرست تیار کی ہے اور مقابلہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام دفعات کم و بیش یکساں ہیں۔ میں مذہب کی مابعد الطبیعات پر کچھ زیادہ اعتقاد نہیں رکھتا لیکن اخلاق کا، جو میرے نزدیک نفسِ مذہب ہے، پُرجوش مؤید ہوں۔ میرے خیال میں تمام بڑے اور مہذب "مذہبوں" نے اخلاق کی تعلیم خفیف رد و بدل کے ساتھ یکساں دی ہے۔ ان تعلیمات کو بانیانِ مذہب کی تصنیف نہیں سمجھنا چاہیئے۔ یہ دراصل انسان کے لاکھوں سال کے تجربوں کا نچوڑ ہیں۔ بانیانِ مذہب کا ہم پر یہ احسان ہے کہ انھوں نے ان تعلیمات کو یکجا کر کے، اوّل ہمارے دلوں کو مختلف طریقوں سے اکتسابِ تعلیم کے قابل بنایا اور پھر ہم کو ان تعلیمات پر عمل کرنے کے لئے آمادہ کیا۔ یہ احسان کچھ کم نہیں ہے اور اس کے واسطے ہمیں بانیانِ مذہب کا سپاس گزار ہونا چاہئے۔ اخلاقی تعلیمات کی مکمل فہرست درج کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے اور نہ استثنائی صورتوں کو پورے طور پر بحث میں لانے کی اس مضمون میں گنجائش ہے تاہم اگر ان تعلیمات کے موٹے موٹے اصولوں کو بہت وسیع الفاظ میں پیش کر دیا جائے اور مستثنیات کی طرف معمولی سا اشارہ کر دیا جائے تو غالباً بیجا نہ ہوگا۔ میرے نزدیک مذکورۂ بالا تعلیمات یہ ہیں:۔

(۱) صفائی

(۲) حق پرستی

(۳) "جیو اور جینے دو"

غالباً ان تین اصولوں کے اندر سارا اخلاق موجود ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ ان اصولوں کو شاہراہوں کی حیثیت نہیں دی جا سکتی جن پر انسان آنکھ بند کر کے چل سکے۔ بات یہ ہے کہ انسان کی داخلی حالت میں حرکت [illegible] کو بہت بڑا دخل ہے۔ اور یہ چیز [illegible] کی تعلیمات نہیں

رکھتیں۔ اختلاف آب و ہوا اور زمانے کے سرد و گرم سے ان کے مقررہ افعال میں تھوڑا بہت فرق ہوجانا لازمی ہے۔ اس لئے نہ تو ہر ملک کے لوگوں کا اخلاق بالکل ایک ہوسکتا ہے نہ ایک ہی ملک کے سب لوگوں کا۔ بلکہ ایک ہی آدمی کا اخلاق مختلف اوقات میں مختلف ہوسکتا ہے۔ انسان کو اصولوں کے سانچے میں ڈھالا نہیں جاسکتا۔ لیکن اس کے یہ معنے تو نہیں ہیں کہ انسان اصولوں کو اپنا رہنما بھی نہیں بنا سکتا۔ اگر ان تین اصولوں کو اپنا رہنما بھی بنا لیا جائے تو انسان کی زندگی خوبصورت بھی ہوسکتی ہے۔ اور مفید بھی۔ اور اس سے کس کو انکار ہوسکتا ہے کہ انسانی زندگی میں یہی دو صورتیں قابل ذکر ہیں۔ ویسے زندہ تو جانور بھی رہتے ہیں!

ان اصولوں کی ذرا وضاحت کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ اخلاق میں بہت سی چیزیں بھی شامل ہیں جو بظاہر ان اصولوں میں نہیں ہیں۔ یہ بات میں نے پہلے ہی عرض کردی ہے کہ میں ان اصولوں کے الفاظ بہت وسیع معنوں میں استعمال کر رہا ہوں۔ پہلے "صفائی" کو لیجئے۔ صفائی کی کسی نے کیا خوب تعریف کی ہے: "ہر شئے کا اپنی مناسب جگہ پر ہونا صفائی ہے اور ایسا نہ ہونا گندگی ہے"۔ ایک عمدہ سے عمدہ چیز اپنے ذہن میں فرض کیجئے۔ مثلاً گلاب کا عطر۔ اگر وہ عطر دان کے اندر ہے تو اپنی مناسب جگہ پر ہے اور جو شخص اُس عطر دان میں رکھتا ہے وہ "صاف" کہلائے گا۔ لیکن اگر وہی عطر آپ کے فرش پر گر پڑا ہو تو؟ ایک گندی سے گندی چیز کا خیال کیجئے مثلاً فضلہ (معاف کیجئے گا مثلاً عرض کر رہا ہوں)۔ اگر کوئی اس کو ایک مقررہ جگہ پر خارج کرتا ہے تو اس کو گندہ کون کہہ سکتا ہے؟ صفائی جس طرح مادی چیزوں کی ہوتی ہے اُسی طرح خیالات کی بھی ہوتی ہے۔ شاعرانہ خیالات بہت ہی نازک اور لطیف ہوتے ہیں لیکن اگر یہ کسی کے دماغ میں اس شدت کے ساتھ موجود ہوں کہ کسی اور خیال کی گنجائش ہی نہ ہو تو یقیناً اس کا دماغ گندہ ہوگا۔ شہوانی خیالات عام طور پر گندے تصور کئے جاتے ہیں لیکن اگر کسی کے دماغ میں ایسے خیالات کسی وقت نہ آئیں تو کیا وہ دماغ "صاف" کہلائے گا؟

صفائی اخلاق کا پہلا زینہ ہے۔ اور اگر کسی شخص میں ذوقِ پاکیزگی نہیں ہے تو اُس کا اخلاق بھی

درست نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ صفائی (جن معنوں میں اُس کو میں استعمال کر رہا ہوں) ایک عادت کا معاملہ نہیں ہی۔ بلکہ اُس کا تعلق نفس کی ایک خاص کیفیت سے ہی جو ایک حد تک جبلّی ہوتی ہی لیکن زیادہ تر عمدہ تربیت کا نتیجہ ہوتی ہی۔ اگر کسی شخص کو یہ تربیت نہیں ملی کہ کس چیز کے لئے کونسی جگہ مناسب ہی تو اس سے کیونکر اس بات کی توقع کی جاسکتی ہی کہ وہ انفرادی یا اجتماعی حیثیت سے ایک کامیاب انسان بن سکے گا۔

دوسرا اصول حق پرستی ہی۔ حق پرستی کے معنی صرف سچ بولنا نہیں ہیں بلکہ حقیقت کی جستجو اور حق کی طرفداری۔ ایک انسان ممکن ہی ہمیشہ سچ بولتا ہو لیکن پھر بھی حق پرست نہ ہو۔ وہ اس طرح کہ جس بات کو وہ حقیقت سمجھتا ہی وہ ممکن ہی دراصل حقیقت نہ ہو۔ مثلاً ایک آدمی اپنی ذاتی مشاہدے کی بنا پر یہ کہتا ہی کہ سورج زمین کے گرد گھومتا ہی۔ جہاں تک اس کے ذاتی مشاہدے کا تعلق ہی، اس کی یہ بات سچی ہی۔ لیکن دراصل حقیقت کے قطعی خلاف ہی۔ ایسا آدمی حق پرست نہیں کہلائے گا۔ حق پرستی کے لئے ضروری ہی کہ انسان ہر وقت حقیقت کی ٹوہ میں لگا رہی۔ کسی بات کو محض اس وجہ سے سچا نہ سمجھ لے کہ دنیا ایسا کہتی ہی۔

حق کی طرفداری بہت مشکل چیز ہی۔ بلکہ اس فرض سے کما حقہٗ عہدہ برآ ہونا تقریباً ناممکن ہی۔ دنیوی اغراض، دوستی، رشتہ داری اکثر اس راہ میں حائل ہوتی ہیں۔ اور بڑے بڑے لوگوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں۔ لیکن مشکلات کو دیکھ کر ہمت ہار جانا اور بہانے تلاش کرنا اپنے نفس کو کمزور کرنا ہی۔ حق پرستی کے لئے بھی "مشق" کی ضرورت ہی۔ اور اس مشق کا پہلا سبق یہ ہی کہ دل سے خوف "لا یاکم ازکم بے جا خوف" دور کیا جائے۔ دنیا میں حق کشی اکثر خوف ہی کی بدولت ہوا کرتی ہی۔ دوسرا سبق یہ ہی کہ طبیعت کو تعلیم و تربیت کے ذریعہ کسی قدر "فلسفیانہ" بنایا جائے یعنی بڑی باتوں پر زیادہ توجہ رہے اور معمولی باتیں جہاں تک ہو سکے نظر انداز کی جائیں۔ لیکن آخری اور سب سے اہم سبق میری رائے میں یہ ہی کہ مزاج میں کسی قدر "مہذب روکھا پن" پیدا کیا جائے۔ یعنی اگر آپ کسی کا کام کرنے کو حق پرستی کے منافی سمجھتے ہیں تو محض اُس کے اثر یا دباؤ یا مروّت سے وہ کام کرنے کو تیار نہ ہو جائیں بلکہ اُس کو

ایسا جواب دے سکیں کہ وہ بھی مطمئن ہو جائے اور آپ بھی حق کشی کے مرتکب نہ ہوں یعنی سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

اب آیئے حق پرستی کی مستثنیات کی طرف۔ بعض حالات میں حق پرستی نہ صرف غیر مناسب بلکہ لائق سرزنش اور قابل گردن زدنی بھی ہو سکتی ہے۔ شیخ سعدیؒ کہتے ہیں۔

دروغ مصلحت آمیز بہ زراستیٔ فتنہ انگیز

میں اتنی بڑی بات کو کہنے کو تیار نہیں ہوں۔ اس لئے کہ "دروغ مصلحت آمیز" میں اس بیسویں صدی میں بہت زیادہ گنجائش ہے۔ ان الفاظ کی آڑ لے کر تو بعض حکومتوں کی پروپاگنڈا وزارتوں کے سر بھی سچائی کی تہمت لگائی جا سکتی ہے۔ حالانکہ ان غریبوں نے ایسا گناہ شاید کبھی نہیں کیا۔ اور پولیس بھی قسم کھا کر کہہ سکتی ہے کہ اس کے کسی بیان میں دروغ مصلحت آمیز کے سوا ایک لفظ بھی جھوٹا نہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ بعض حالات میں دروغ مصلحت آمیز راستیٔ فتنہ انگیز سے بہتر ہو سکتا ہے۔ مثلاً ایک ظالم ایک بے گناہ شخص کو قتل کرنے کے درپے ہے۔ اور آپ کو اس کی بے گناہی کا علم بھی ہے۔ فرض کیجئے وہ شخص بھاگتا دوڑتا آپ کے پاس آکر پناہ لیتا ہے۔ اور اس کے تعاقب میں وہ ظالم شمشیر برہنہ لئے ہوئے آپ کے پاس آکر پوچھتا ہے "ابھی ایک شخص ادھر سے بھاگتا ہوا آیا ہے؟" اب بتایئے آپ کیا جواب دینگے؟ میں کہتا ہوں اگر آپ میں قوت اور ہمت ہے تو اس سے کہہ دیجئے۔ "مجھے معلوم ہے لیکن بتاؤں گا نہیں"۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو آپ کے لئے مناسب ہی نہیں فرض ہے کہ آپ اُس سے جھوٹ بولیں اور کہہ دیں کہ "مجھے نہیں معلوم!"

تیسرا اصول ہے "جیو اور جینے دو"۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان ایسی زندگی اختیار کرے جس میں اس کے حقوق کی حفاظت ہوتی ہو اور دوسروں کے حقوق پر زد نہ پڑتی ہو۔ انسان کے لئے اپنے حقوق سمجھنا نسبتاً آسان ہے۔ لیکن اپنے حقوق کے حدود سمجھنا مشکل ہے کیونکہ وہ فطرتاً خود غرض واقع ہوا ہے اور اکثر اُس کی یہی خواہش رہتی ہے کہ اُس کے حقوق لامحدود ہوں۔ جہاں پر ایک انسان کے حقوق کی حد ختم ہوتی ہے وہیں سے دوسرے انسانوں کے حقوق کی حدیں شروع ہو جاتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ

یہ حدیں اس درجہ باریک اور غیر نمایاں ہوتی ہیں کہ بغیر نیک نیتی اور کوشش کے ان میں تمیز کرنا دشوار ہوتا ہی۔ لیکن معاشرت میں ایسی ہی کونسی چیز جس میں نیک نیتی اور کوشش درکار نہ ہو؟

"جیو اور جینے دو" کی بھی استثنائی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ بعض حالات میں اس اصول پر عمل کرنا نہ صرف ناممکن بلکہ غلط ہوتا ہی۔ مثلاً بعض وقت مرجانا جینے سے بدرجہا بہتر ہوتا ہی۔ لیکن جب کبھی ایسا ہوتا ہی تو وہ اصول کے دوسرے ٹکڑے یعنی "جینے دو" کی خاطر ہوتا ہی یا ہونا چاہیئے۔ اس طرح بعض موقعوں میں "مارڈالو" "جینے دو" سے بہتر ہوتا ہی۔ لیکن وہ بھی اُسی وقت ہوتا ہی یا ہونا چاہیئے جبکہ اصول کے حصہ اول یعنی "جیو" پر عمل کرنا ناممکن یا دشوار ہوگیا ہو۔ ایسا بھی ہوسکتا ہی کہ "جیو اور جینے دو" کی بجائے بیک وقت "مارڈالو اور مرجاؤ" پر عمل کرنا ضروری ہوجائے۔ اور یہ اُسی وقت ہوتا ہی یا ہونا چاہیئے جبکہ "جیو" اور "جینے دو" دونوں میں سے کسی ایک کی بھی تعمیل نہ ہوسکتی ہو۔

یہ تھا قانونِ اخلاق کی نوعیت کا مختصر سا خاکہ جس کے خطوط وہ اصول ہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا۔ اگر محض ان خطوط پر نگاہ رکھی جائے تو خاکہ تو ذہن نشین ہوجائے گا لیکن ایک مکمل تصویر تصور میں نہیں آسکے گی۔ مکمل تصویر کا تصور جبھی ہوسکتا ہی جبکہ یہ خاکہ زندگی کے پس منظر کے ساتھ دیکھا جائے۔ جب مکمل تصویر ذہن نشین ہوجاتے تو (بشرط خلوص نیت اور کوشش) انسان ایک معقول لائحۂ عمل ایک منظم دستورِ حیات، ایک پاکیزہ طرزِ زندگی، اور ایک بلند نصب العین بنا سکتا ہی۔

قانونِ اخلاق کا نفاذ کس طرح ہونا چاہیئے؟

یہ تو ظاہر ہی کہ قانونِ اخلاق کسی پارلیمنٹ، اسمبلی، کاؤنسل یا مجلس میں وضع نہیں ہوا اور نہ ہوسکتا ہی۔ بلکہ معاشرت کی دوسری چیزوں کی طرح اگا ہی۔ مذہب کے نقطۂ نظر سے قانونِ اخلاق کا واضع یا تو خدا ہی یا زمانہ سلف کے رشی، منی اور دھرماتما ہیں۔ یہ نظریہ صحیح ہی یا غلط یہاں اس سے بحث نہیں۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ قانونِ اخلاق کے نفاذ میں مذہب کو بہت بڑا دخل ہی۔ بات یہ ہی کہ انسانی افعال میں "خوف" کا عنصر بہت قوی ہوتا ہی۔ اگر انسان کسی امر میں خائف نہیں ہوتا تو بے دھڑک کام کرتا ہی اس کے دل میں خفیف سا ارتعاش بھی نہیں پیدا ہوتا۔ لیکن جب انسان کسی بات میں ڈرتا ہی تو اول تو اُس کو کرتا ہی نہیں اور اگر کرتا بھی ہی تو تذبذب

کی حالت میں مذہب نے اسی "خوف" کا فائدہ اٹھایا۔ آدمی کے دونوں شانوں پر گواہ تعینات کئے۔ خدا کو حاضر و ناظر جج قرار دیا۔ یوم الدین کا ہائی کورٹ بنایا۔ اور سزا جھیلنے کے لئے دوزخ جیسا جیل تعمیر کیا۔ یہ سب کیوں؟ اسی لئے کہ انسان با اخلاق زندگی بسر کرے۔ یہی گواہ، یہی ہائی کورٹ، یہی جج اور یہی سزا دنیا کے بے شمار انسانوں کو وحشی اور درندہ ہونے سے بچاتی ہے۔ لاتعداد انسان ایسے ہیں جن کو کسی گناہ کے ارتکاب کے وقت یہی خوف پیچھے کھینچتا ہے۔ دل میں کپکپاہٹ ارادے میں لغزش اور دماغ میں واپسی کا خیال پیدا کرتا ہے۔ اسی کپکپاہٹ اسی لغزش کا نام مذہب کی زبان میں تائید غیبی اور اخلاقیات کی اصطلاح میں ضمیر ہے۔ اگر یہ خوف بالکل مٹ جائے تو میں سچ کہتا ہوں کہ ننانوے فیصدی لوگوں کی یہ حالت ہو کہ

چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند

میں یہ نہیں کہتا کہ اخلاقی تعلیم کا سب سے اچھا ذریعہ خوف ہی ہے۔ اگر اخلاقی اصول عقل کی مدد سے ذہن نشین ہو سکیں۔ اگر کوئی چیز محض اس لئے اچھی سمجھی جائے کہ وہ اچھی ہے اور بری بات صرف اس واسطے بری خیال کی جائے کہ وہ بری ہے۔ اگر ہمارے افعال کا محرک سزا کا خوف یا جزا کا لالچ نہ ہو بلکہ خود افعال کا عقلی حسن و قبح ہو تو بے شک یہ ہو سکتا ہے کہ

دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

لیکن ابھی تک ہماری تعلیم اور تربیت ناقص ہے۔ ہم ابھی اس "مقام محمود" سے بہت پیچھے ہیں جہاں پہنچ کر انسان کہتا ہے

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا

تاہم جوں جوں صحیح تعلیم کی روشنی قلوب کو روشن کرتی جائے گی خوف کم ہوتا جائے گا اور اس کی جگہ عقلیت لیتی جائے گی حتیٰ کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا جبکہ اخلاق کے اصول محض برتے ہی نہ جائینگے بلکہ سمجھے بھی جائیں گے۔ ابھی اس زمانے کے آنے میں دیر ہے۔ ابھی تک تو فلسفہ کی درسی تعلیم بھی لازمی نہیں۔

سید باقر حسین ایم اے (علیگ)

مستقبل

آج ہماری مشکل یہ ہی کہ جو آدمی یا جماعت بے لگام۔ وحشیانہ طاقت کو لے کر نکلتی ہی۔ دنیا کے امن امان کو تباہ کر کے رکھ دیتی ہی۔ اگر ہمیں اس مصیبت سے بچنا ہی تو آیئے بیٹھ کر سوچیں کہ انسان کس طرح اپنے آپ کو ہلاکت سے محفوظ رکھ سکتا ہی۔

اگر ارتقائی علم کو سامنے رکھ کر یہ دیکھنے کی کوشش کی جائے کہ جب کسی وقت بے لگام وحشیانہ طاقت تباہی پھیلاتی ہی تو اس کا کس طرح مقابلہ کیا جاتا ہی۔ اور اگر آج تک نہیں کیا گیا تو پھر کیسے ہو سکتا ہی۔ تو معلوم ہوگا کہ اس دنیا میں کوئی چیز یونہی فی الفور پیدا نہیں ہو جاتی۔ بلکہ قدرت کے خزانے سے جو کچھ ملتا ہی۔ ضرورت۔ محنت اور صلاحیت کے اعتبار سے ملتا ہی۔ اور وہ بھی بتدریج اور آہستگی کے ساتھ۔ رفتہ رفتہ ملتا ہی۔ لیکن اتنی بات ہی کہ ملتا ضرور ہے۔ مثلاً بعض سمندروں میں ایک قسم کی مچھلی پائی جاتی ہی جسے انگریزی میں ایل مچھلی کہتے ہیں۔ اس مچھلی کے بدن میں یہ خاصیت ہی کہ اس میں سے بجلی کی رَو نکلتی ہی۔ لیکن یہ یقین رکھنا چاہیئے کہ مچھلی کے بدن سے اس برقی رو کا نکلنا ایک عجیب چیز تو ضرور ہی۔ مگر ایک فوری شعبدہ نہیں۔ کہ جو کل نہیں تھا۔ اور آج تھوڑے عرصہ میں پیدا ہو کر اپنا اثر دکھانے لگا۔ بلکہ آہستہ آہستہ ضرورت کے مطابق اس کے خلیات نے ایک ایسا نظام پیدا کر لیا کہ اپنے دشمنوں کو شکست دینے اور غذا حاصل کرنے کے لئے برقی رَو کی یہ ہلاکت آفرینی پیدا کر لی۔ اور جو کچھ بھی ہوا ہی ارتقا۔ ضرورت اور اپنے آپ کو حالات اردگرد و پیش کے مطابق ڈھالنے کے اسلوب پر ہوا ہی۔

اسی چیز کو اگر ہم اپنے سامنے رکھ کر اپنی ترقی یافتہ عقل کو استعمال کریں۔ اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ ظالمانہ جسمانی قوت کا مقابلہ کس طرح کیا جا سکتا ہی تو یقیناً ہم آنے والی نسلوں پر بڑا احسان کریں گے۔

ایل مچھلی کے سامنے ایک مشکل تھی۔ تو اس نے اپنے بقائے حیات کے لئے برقی رَو اپنے جسم میں پیدا کرلی۔ ہمارے سامنے بھی مشکل ہے کہ ظالمانہ اور سفاکانہ قوت کا مقابلہ کس طرح کیا جائے۔ یقیناً ہم بھی اس مشکل کا حل تلاش کرلیں گے۔ کیونکہ قدرت کے پاس ہر دکھ کا دارو ہے۔ اور ہم خود کہتے ہیں کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ اگر ہمیں واقعیً اس بات کی ضرورت ہے کہ وحشیانہ طاقت سے بچا جائے تو ضرور ہے کہ ایک نہ ایک دن ہم اس سے چھٹکارا حاصل کرلیں گے۔ اس چھٹکارے کی صورت کیا ہوگی۔ اور یہ کب نصیب ہوگا۔ اس کے متعلق پیش گوئی نہیں کی جاسکتی۔ لیکن اتنا یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ایسا ہوجائے گا۔ کیونکہ کئی دفعہ انسان نے محدود پیمانے پر اس کا تجربہ بھی کیا ہے۔ اور بڑی کامیابی کے ساتھ تجربہ کیا ہے۔ اور اگر ہم اپنی یادداشت اور علم کو ٹٹول کر دیکھیں تو فوراً نظر آجائے گا کہ بڑی بڑی مذہبی تحریکیں انسان کی اندھی۔ بے لگام اور وحشیانہ قوتوں پر فتحیابی ہی کے لئے شروع کی گئی تھیں۔

یہاں ایک بات صاف کردینا ہے۔ آج کل جو مشکل ہے وہ محض وحشیانہ جسمانی طاقت کا غلط اور خود غرضانہ استعمال نہیں۔ آج یہ وحشیانہ طاقت اکیلی نہیں ہے۔ بلکہ اس کی سنگت میں وحشیانہ انسانی عقل بھی شامل ہوگئی ہے۔ ٹینک۔ توپ۔ زہریلی گیس کے استعمال میں زیادہ وحشیانہ طاقت کی ضرورت نہیں۔ بلکہ وحشیانہ عقل نے یہ ہلاکت کا دہانہ کھولا ہے۔ اب مشکل وحشیانہ طاقت کی نہیں بلکہ وحشیانہ عقل کی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب انسانی معاشرہ بڑا غیر متمدن تھا۔ یعنی اس کے اندر سمجھ۔ بوجھ اور عقل وبینش یہ روشنی نہ آئی تھی۔ اس وقت زندگی خطرات کے نرغے میں تھی۔ اور عقل کی کمی کی صورت میں سب کچھ جسمانی طاقت ہی کو کرنا پڑتا تھا۔ اس لئے جنگلی درندوں کو فتح کرنے اور ان سے اپنی خوراک اور جان ومال کی حفاظت حاصل کرنے کے لئے آدمی کو جسمانی طاقت ہی استعمال کرنی پڑی۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ انسان کی وحشیانہ طاقت جس میں تھوڑا بہت عقل اور حیلے کا شائبہ بھی تھا۔ جانوروں کی بے یار و مددگار کھری ہوئی وحشیانہ قوت اور محض جسمانی طاقت پر کامران ہوئی۔

انسان نے ان جانوروں اور خونخواروں کو مطیع کرلیا۔ یا ان سے الگ ہوگیا۔ تو آج ہمیں

محسوس کیا کہ اس کی فتح کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو اس کی اجتماعیت دوسرے اس کی حیلہ کاری۔ ایک طرف اس نے اکٹھے رہ کر گروہ بندی کے اصول سیکھے۔ اور دوسری جانب اس حیلہ کاری کو زیادہ مؤثر اور ترقی یافتہ شکل میں استعمال کرنے کا بیڑا اٹھایا۔

یہی حیلہ کاری موجودہ عقل اور دانشوری کی بنیاد تھی۔ پھر ایک وقت ایسا آگیا کہ انسان کی اجتماعی زندگی نے اتنی ترقی کر لی کہ جنگلی جانوروں سے بچنے کا مسئلہ اس کے لئے زیادہ مشکل نہ رہا۔ اس لئے اجتماعی زندگی کی بہت بڑی حاجت ان مخصوص معنوں میں کم ہوگئی کہ آدمی صرف اس لئے اکٹھا ہو کر رہے کہ اسے وحشی جانوروں سے بچنا ہے۔ لیکن حیلہ کاری سے جو پودا نکلا تھا اس کی ترقی یافتہ معاشرے میں اب بھی ضرورت تھی۔ اور آگے سے کہیں زیادہ ضرورت تھی۔ کیونکہ اب جو دشمن آدمی کے سامنے موجود تھے وہ وحشیانہ طاقت سے زیادہ عقلی کنہہ کی زیادہ طلب گاری کرتے تھے۔ اب وہ زیوڑ پالتے۔ غلہ بوتے۔ اور شکار کرتے تھے۔ انھیں موسم کے تغیر و تبدل اور جانوروں کی عادات۔ اور خوراک اور بیماریوں کے متعلق حال معلوم کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ اور یہ ضرورت صرف عقل پورا کر سکتی تھی۔ اس لئے بجائے اس کے کہ زبردست کا زور ہو۔ عقلمند کا زور بڑھنے لگا۔

اب لڑائی جنگلی دشمنوں سے نہ ہوتی۔ بلکہ انسان اور انسان میں قبیلوں اور جماعتوں کے درمیان ہوتی۔ یہ لڑائی ایسی تھی کہ اس میں بھی آخر کار اچھی رہنمائی کامیابی کی شاہراہ قرار دی جانے لگی۔

یہ رہنمائی سرداری اور شاہی کا پیش خیمہ ہوئی اور ایک آدمی سارے ملک پر راج کرنے لگا۔

اگر دیکھا جائے تو یہ جسمانی طاقت پر عقل کی فتح تھی پھر عقل نے سائنس کا شعبدہ پیدا کیا اور اس کی بنیادوں پر مختلف آلات حرب۔ توپیں اور دوسری چیزیں پیدا ہوئیں۔ اس لئے ہم اگر کہیں کہ آج ہماری مشکل وحشیانہ جسمانی طاقت نہیں۔ بلکہ وحشیانہ عقلی طاقت ہے۔ تو اس میں ہرگز کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔

انسان نے ہزارہا سالوں کی لگاتار محنت سے وحشیانہ جسمانی طاقت کو مطیع کر لیا ہے۔

انسان اور اس کے ارتقا کی ساری تاریخ یہ کہتی ہو کہ اس نے اپنی ہر مشکل کو سر کیا ہو۔ اس لئے ہم امید رکھ سکتے ہیں کہ یہ وحشیانہ عقل بھی ایک نہ ایک دن گرفتار ہو کر ہمارے سامنے آجائیگی۔

اب سوال یہ ہو کہ اسے گرفتار کرنے والا کون ہوگا۔ اور کیا ہم اس کے متعلق کچھ جانتے ہیں؟ ہاں ایک چیز ہے اور دنیا نے کئی دفعہ تھوڑے تھوڑے وقتوں کے لئے اس کا تجربہ بھی کیا ہی۔ یہ وحشیانہ جسمانی طاقت اور یہ باغیانہ عقلی طاقت بارہا ایک اعلیٰ درجے کی اخلاقی طاقت کے سامنے جھک چکی ہی۔

آج بھی جب دنیا لڑتی ہی تو یہی نعرہ لگاتی ہو کہ اخلاقی قوت کا خزانہ اُسی کے پاس ہی۔ عقل سے لڑنے کا حربہ ہمارے سامنے ہے۔ کئی دفعہ انسان نے اس کی آغوش میں آکر پناہ حاصل کی ہی۔ اس لئے ہمارا فرض ہو کہ اس اخلاقی قدر کی جزئیات کا تجزیہ کریں اور دیکھیں اسے کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہی۔ اور حاصل کر لینے کے بعد اس امر کی ضرورت ہی کہ پہلے کی طرح ایک دفعہ حاصل کر لینے کے بعد یہ ہمارے ہاتھوں سے نکل نہ سکے۔

اس مقصد کے لئے ہمیں انسان کی تاریخ اخلاق کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔ عام طور پر یوں ہوتا ہو کہ جب اخلاق، عقل پر اور وحشیانہ جسمانی طاقت پر غالب آجاتا ہو تو بعد میں اس میں چند ایسے عناصر ظاہر ہونے لگتے ہیں جو رفتہ رفتہ اس اخلاق کی جڑوں کو کھا جاتے ہیں اور اسے اتنا کمزور اور کھوکھلا کر دیتے ہیں کہ وہ ناتواں ہو کر ایک دفعہ پھر اسی عقل اور جسمانی وحشیانہ پن کا شکار ہو جاتا ہی۔

اخلاق کے یہ مضر اور جانگسل عناصر تین ہیں۔

پیسے کی محبت ——— ضرورت سے زیادہ

طاقت کی محبت ——— ضرورت سے زیادہ

ذات کی محبت ——— ضرورت سے زیادہ

دنیا کے امن کو دیرپا کرنے کے لئے اعتدال کا ایک ایسا میزانیہ قائم کرنا ہوگا کہ ذاتی محبت پیسے

اور طاقت کی تمنا آدمی کے اندر بے لگام نہ ہو سکے اور اس مدعا کو حاصل کرنے کے لئے ہمیں دیکھنا پڑے گا کہ لوگوں میں پیسے اور طاقت کی ہوس پیدا کیوں ہوتی ہے تاکہ جب وجہ معلوم کر لینے کے بعد اس کی جڑیں ہی کاٹ ڈالی جائیں گی۔ تو پھر نہ تو یہ آرزوئیں پیدا ہوں گی۔ اور نہ اخلاق کی عمارت بربادی کا منہ دیکھے گی۔

پیسہ اور طاقت آدمی اس لئے حاصل کرتا ہے کہ وہ زندہ رہنا چاہتا ہے اور عزت آرام کے ساتھ زندہ رہنا چاہتا ہے۔ پھر وہ اپنی نسل کو زندہ رکھنا چاہتا ہے۔

اگر ہم کوئی ایسا اقتصادی نظام پیدا کریں جس میں ہر ایک کو اطمینان ہو کہ وہ زندہ رہ سکے گا اور عزت و آرام کے ساتھ اور اس کی اولاد کو بھی یہ سہولتیں ہوں گی۔ تو پیسے اور طاقت کے پیچھے یہ اندھی بے قراری بڑی حد تک مٹ جائے گی۔

جب تک یہ راہ نہ اختیار کی جائے گی۔ دائمی امن حاصل نہ ہوگا۔ یہی ایک راستہ ہے اسی راستے پر چل کر نسل انسانی سکھ کا سانس لے گی اور مطمئن ہو کر اپنے اونچے مقاصد کے حصول میں کوشاں ہو جائیگی۔

فرد اور فرد کی جنگ۔ جماعت اور جماعت کی جنگ اور ملک اور ملک کی جنگ۔ دنیا یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ لگاتار ان ہولناکیوں کا مقابلہ کرتی رہے۔ یہ بربادی جو ہر تھوڑے وقفے کے بعد نوع انسان پر وارد ہو جاتی ہے۔ آدمی اس تباہی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اسے کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ اور یقین مانیئے کہ یہ ناممکن نہیں ایسا ہو سکتا ہے اور ہو کر رہے گا۔

لیکن یہ وقت کب آئے گا؟ یہ معلوم نہیں۔ ہمارا فرض تو صرف اتنا ہے کہ ہم اس وقت کو جلد از جلد قریب لانے کی کوشش کرتے رہیں۔ بہت ممکن ہے کہ میں اس زمانے کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکوں۔ لیکن میری اتنی آرزو ہے کہ الٰہی!

"نغمۂ نوبہار اگر میرے نصیب میں نہ ہو"
اس دم نیم سوز کو طائرک بہار کر!

عنایت کبریا

ہوم ورک کی اہمیت اور اُس کی تنظیم

ہوم ورک (طلبا کو گھر پر کرنے کے لئے جو کام ان کے معلّمین دیتے ہیں) سے مراد اوقات مدرسہ کے بعد کا کام ہی اور یہ مشتمل ہی گھر کے اسباق اور گھر کے مطالعہ پر۔ اس کی اہمیت اس حقیقت کے اظہار سے واضح ہوتی ہی کہ ۱۹۳۷ء میں لندن کی دارالعوام میں یہ بہ طور ایک خاص مسئلہ کے پیش ہوا۔ بورڈ آف ایجوکیشن لندن کی رپورٹ میں درج ہی کہ اراکین نے ہوم ورک کے متعلق حسب ذیل اعتراضات پیش کئے تھے۔

(۱) ہوم ورک غیر منضبط ہوتا ہی۔

(۲) مجموعی وقت بہت زیادہ ہوتا ہی

(۳) ہوم ورک کے متعلق عام انتظام میں خرابی پائی جاتی ہی۔

(۴) والدین کا تعاونِ عمل حاصل نہیں کیا جاتا ہی۔

(۵) خانگی ماحول کی خرابی کا لحاظ نہیں کیا جاتا ہی۔

ان اعتراضات کی روشنی میں ہوم ورک پر کافی بحث ہوئی اور اراکین اس نتیجہ پر پہنچے کہ بہر حال ہوم ورک ضروری ہی لیکن تنظیم کے سلسلہ میں حسب ذیل تجاویز منظور ہوئیں:۔

(۱) ہوم ورک ہفتہ میں پانچ دن سے زیادہ نہ ہو۔

(۲) چودہ برس کی عمر کے لئے ایک گھنٹہ سے زیادہ ہوم ورک نہ دیا جائے۔

(۳) ۱۴ تا ۱۶ سال تک ڈیڑھ گھنٹے کے لئے۔

کولمبیا یونیورسٹی کی رپورٹ میں درج ہی کہ اوسط درجہ کا طالب علم مدرسہ کا کام مدرسہ ہی میں کرلے۔

ہوم ورک کے مقاصد	۱۔ مدرسہ میں طالب علم جو کچھ کرتا ہی وہ مدرس کا کیا دھرا ہوتا ہی۔ ہوم ورک کے ذریعہ ہم طالب علم میں خود فعلیت کا شعور پیدا کرسکتے ہیں۔

۲۔ مدرسہ کی سرگرمیوں کی وسعت گھر تک ہوسکتی ہے اور گھر اور مدرسہ میں ایک ربط قائم رہ سکتا ہے

۳۔ ہوم ورک کے ذریعے والدین کی دلچسپی اور تعاون عمل حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ والدین طلباء کی ہوم ورک کی کاپیوں کے ذریعہ اساتذہ کی ہدایات اور مشوروں سے واقف وقتاً فوقتاً ہوتے رہتے ہیں۔

۴۔ طلبا کو دوسرے دن کے سبق کے لئے تیار کیا جا سکتا ہے جس کی وجہ سے سبق میں جان پیدا ہوتی ہے۔

۵۔ اوقاتِ فرصت کا صحیح استعمال ہوسکتا ہے۔ اور طالب علم کے عادات بگڑنے نہیں پاتے۔

ان مقاصد کو جب پیش نظر رکھا جاتا ہے تو ہوم ورک کی اہمیت میں غیر معمولی اضافہ ہوجاتا ہے۔ اور اس کا دامن تک شبہات کی گنجائش سے خالی نظر آتا ہے۔

اب سوال تنظیم کا ہے جو اس سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ ہوم ورک کی تنظیم میں حسب ذیل امور ملحوظ رکھے جائیں:۔

۱۔ ابتدائی سال میں یوم والدین (سال کے شروع میں تمام طلبا کے والدین کو کالج میں اکٹھا کیا جاتا ہے اور ان کے بچوں کے متعلق چند ہدایات دی جاتی ہیں۔ اس دن کو "یوم والدین" کہتے ہیں) کے موقع پر تمام طلبا کے سرپرستوں کو تبلایا جائے کہ طالب علم کو گھر پر کتنی دیر ہوم ورک کے لئے مصروف رکھا جائے۔

۲۔ ہوم ورک ہفتہ میں پانچ دن دیا جائے۔

۳۔ طبقہ وسطانیہ کے لئے ایک گھنٹہ سے زیادہ ہوم ورک نہ ہو۔

۴۔ طبقہ فوقانیہ کے لئے یعنی ۱۶ سال کی عمر والوں کے لئے دو گھنٹے سے زیادہ کا ہوم ورک نہ دیا جائے۔ ویسٹ صاحب کا خیال ہے کہ دسویں جماعت کے لئے تین یا چار گھنٹے کا ہوم ورک دیا جائے۔

ہوم ورک کی اصلاح | ہوم ورک کی اصلاح کے سلسلہ میں دو قسم کے دبستان خیال پائے گئے ہیں۔ ایک یہ ضروری سمجھتا ہے کہ تمام غلطیوں کی تصحیح کر دی جائے۔ دوسرا نقطۂ خیال یہ ہے کہ غلطیوں پر صرف نشان

لگا دیا جائے۔ میرے خیال میں ہوم ورک کی اصلاح ہر دو دبستان خیال کے بین بین ہونی چاہیئے یعنی بعض غلطیاں مثلاً غیر موزوں الفاظ کی جگہ موزوں الفاظ اور جملوں کی غلط بناوٹ کو صحیح طور پر لکھا جائے اور دیگر غلطیاں مثلاً قواعد اور ہجّہ کی جگہ صرف نشان کر دیئے جائیں تاکہ بچّہ خود غور کرکے درست کرلے۔ اور مدرس کا فرض ہوگا کہ دوسرے ہوم ورک کے موقع پر پہلے یہ معلوم کرلے کہ طالب علم نے یہ تصیح خود کی ہے یا نہیں۔

ہدایات ہمیشہ تعمیری اور حوصلہ افزا ہونی چاہیئے۔ بعض اوقات غلطیوں کو علانیہ تختۂ سیاہ پر لکھ کر تبلایا جاتا ہے۔ یہ طریقہ نفسیاتی اصول سے سخت غلطی پر مبنی ہے۔ چنانچہ فریز راس سلسلہ میں لکھتا ہے کہ جنگِ عظیم کے دوران میں جب دوسرے رنگروٹوں کے ساتھ وہ بھی ڈرل کر رہا تھا تو ڈرل ماسٹر نے ایک جوان کی بندوق کی غلط نشانہ اندازی کو سب کے سامنے علانیہ تبلاکر سب کو متنبہ کیا۔ دوسرے دن اس ماسٹر کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب ڈرل کے دوران میں اسی غلط نشانہ اندازی کا اعادہ بہت سے جوانوں نے کیا۔

محمد مختار احمد بی ایس سی۔ ڈپ۔ ایڈ

محمد علیؒ

مجبور بہت ظلم سے مخلوق خدا تھی　　ہر سمت زباں بندیٔ ارباب وفا تھی
زندانِ ستم سلطنتِ اہلِ جفا تھی　　تنقید کیا، آنکھ اٹھانے پہ سزا تھی
لیکن تجھے کچھ فکر نہ تھی دار ورسن کی
بگڑی تری ہمت سے بنی دین و وطن کی

قبضے میں مسلمان کے دنیا تھی نہ دیں تھا　　ہندو کے لیے مثلِ فلک رنگِ زمیں تھا
امید کے ہونٹوں پہ دم بازپسیں تھا　　ہر آن سفینے کی تباہی کا یقیں تھا
جب تیرے قوی ہاتھ نے پتوار سنبھالی
سیلاب کے بل توڑ دیے ناؤ بچا لی

نفرت ازلی تھی تجھے دینار و درم سے　　جھپکی نہ کبھی آنکھ تری جاہ وحشم سے
سر جھک نہ سکا سطوتِ اسکندر و جم سے　　بجلی تھی زباں آگ برستی تھی قلم سے
تحریر سے تھا رنگ عیاں قلب تپاں کا
تقریر میں تھا سوز مجاہد کی اذاں کا

جب ٹوٹ گئی مرکز اسلام کی طاقت　　کی تو نے بہت کوششِ احیائے خلافت
غالب رہی بے دینی مغرب کی کرامت　　محروم ہوئی سایۂ مذہب سے سیاست
کم جوش ہوا پیروی دین خدا کا
اندھوں نے دیا ساتھ زمانے کی ہوا کا

کرتے ہی رہے نیش زنی ارذل و اشرار　　غازی ہوا سامانِ سفر باندھ کے تیار
اسباب تھا قرآن و دل ریش و تن زار　　مونس تھی ولائے خلفِ حیدر کرارؓ

درپیش نیا معرکۂ کرب و بلا تھا
بے خوفِ اجل مردِ خدا مست چلا تھا
ہستی پہ تری وار کئے درد نے پیہم
لیکن نہ دیا ضعف سے جوشِ دلِ پُردم
ہمت تری بڑھنے لگی طاقت جو ہوئی کم
نعرے سے ترے گونج اٹھا قصرِ بکنگھم
یہ آخری شعلہ تھا چراغِ سحری کا
انعام تھا پروانے کی آشفتہ سری کا

بے خوف قیامت کا بہادر تھا بلا کا
قائل تھا غم و درد میں تاثیرِ دعا کا
گھبرا کے سہارا کبھی ڈھونڈا نہ دوا کا
مشکل میں بھروسہ تھا فقط ذاتِ خدا کا
اُترا نہ کبھی نشۂ پیغامِ محمد
تھا وردِ زباں بعدِ خدا نامِ محمد

تھا ہند میں کوئی نہ ترا ہمسر و ثانی
افسوس مگر قوم نے کچھ قدر نہ جانی
صدموں پہ ترے شاد رہے ظلم کے بانی
تازہ ہے تری عمر کی پُر درد کہانی
تاریخ میں محفوظ یہ بیداد رہے گی
کم ظرفیٔ ابنائے وطن یاد رہے گی

اللہ نے رکھا نہ تجھے بیکس و بے بس
دی مسجدِ اقصیٰ کی فضا دلکش و دلرس
ہے مومنِ صادق کو یہی عز و شرف بس
مدفن ہے درونِ حرمِ بیتِ مقدس
پایا ہے صلہ خوب غریب الوطنی کا
یہ فیض ہے سب عشقِ رسولِ مدنی کا

سکندر علی وجد

رجسٹرڈ ایل نمبر ۱۸۹۲

ایک معلم کی زندگی

اس کتاب کو جناب عبدالغفار صاحب مدھولی استاد مدرسہ ابتدائی جامعہ نے بڑی محنت سے مرتب کیا ہے۔ یہ ان کی آپ بیتی ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی ہر دلعزیز درسگاہ جامعہ کی دلچسپ اور مکمل تاریخ ہے۔ نیز یہ جامعہ کے اکیس سالہ تعلیمی تجربوں کا نچوڑ ہے۔ تعلیمی کام اور تجربہ کرنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت ایک ہزار صفحات قیمت ہر دو حصے للعہ ر

رگبی کی زندگی

طامس ہیوز کی شہرہ آفاق کتاب "طام براؤنس اسکول ڈیز" کا ترجمہ۔ مصنف نے افسانے کے پیرائے میں اپنے مایہ ناز استاذ ڈاکٹر طامس آرنلڈ ماہر تعلیمات کے ان تمام بنیادی اصولوں کی تشریح کی ہے جن پر انھوں نے اپنے رگبی کے مدرسہ ثانوی کے نظام کی بنیاد ڈالی تھی۔ یہ اردو کے تعلیمی ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ قیمت عہر مجلد عا ر

مکتبہ جامعہ

دہلی، نئی دہلی، لکھنؤ، بمبئی نمبر ۳

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) مطبوعہ ...

چار سو

مکتبہ جامعہ دہلی

جامعہ

زیرادارت:۔ نورالحسن ہاشمی ایم، اے

جلد ۳۸ نمبر ۵ | ماہ مئی ۱۹۴۰ء | چندہ سالانہ ۶ر فی پرچہ ۸ر

فہرست مضامین

ایک ایسے وقت میں جب کہ دُنیا ایک
انقلابی دور سے گزر رہی ہے مکتبہ جامعہ
ہندوستان کی بے مثل تعلیمی خدمت انجام
دے رہا ہے۔

دستخط خان بہادر اللہ بخش مرحوم

لینن

لینن کے والدین کا اصل وطن استراخان تھا۔ اس کا اگرچہ متوسط درجہ سے تعلق تھا لیکن فکر و عمل میں جمہوریت پسند اور انقلابی تھے۔ والد بسلسلہ ملازمت مدارس کے انسپکٹر ہو کر سمبرسک (جواب لینن کے نام پر لیننگ کہلاتا ہے) کے قصبہ میں آباد ہو گئے تھے۔ اس مقام پر ۲۲ اپریل ۱۸۷۰ء کو اللہ پاک نے ان کو ایک لڑکا عنایت فرمایا جو بعد میں لینن کے نام سے مشہور ہوا۔ ایک قصبہ میں مدارس کے انسپکٹر کا وقار اچھا خاصا ہوتا ہی چنانچہ جب لینن بڑا ہوا تو والد کے عہدہ دار ہونے کی بنا پر اچھے اسکول میں داخلہ ہو گیا۔ اسکول کی تعلیم تو شروع ہو گئی لیکن لینن اپنے فطری رجحانات کے مطابق گھر کے انقلابی ماحول سے زیادہ متاثر ہوتا رہا۔ ابھی سولہ سال ہی کا تھا کہ باپ کا سایہ سر سے گذر گیا۔ ماں اور چھ بھائی بہن رہ گئے۔ عزیز و اقارب ان بچوں کی یتیمی پر نوحہ کرتے تھے اور قدرت مسکراتی تھی چونکہ مصائب کا شکار بنا کر قدرت کو ان بچوں میں وہ استطاعت و استعداد پیدا کرنی منظور تھی جس کی وجہ سے یہ یتیم آج بھی بے شمار زندہ انسانوں سے بہ معنی میں زیادہ زندہ ہیں ان کا فکر و عمل آج کروڑوں انسانوں کے لئے مشعل راہ بنا ہوا ہے۔

والد تو گذر گئے لیکن اپنی اولاد کے دل و دماغ میں حریت کی جو شمع روشن کر گئے تھے وہ روشن ہی رہی۔ عہد شباب کو انقلابی رجحانات کا ترکہ سازگار نہیں آتا۔ جوانی کو ہنگامی خطرات زیادہ دلفریب نظر آتے ہیں۔ والد کی وفات کو کچھ عرصہ ہی گذرا ہوگا کہ لینن کے بڑے بھائی نے ایک پروگرام کے مطابق سیاسی پارٹی بنائی جس میں سب ناتجربہ کار نوجوان تھے۔ قصد یہ کیا کہ زار روس الگزنڈر سوم جب دستور کے مطابق الگزنڈر دوم کی برسی منانے اس کی قبر پر جائے تو راستہ میں اس کو قتل کر دیا جائے۔ شومیٔ قسمت کہ اس معاملہ کے متعلق ۴۰ نوجوانوں میں جو خط و کتابت ہوئی وہ زار کی خفیہ پولیس کے ہاتھ لگ گئی اور نوجوانوں کی خفیہ نگرانی شروع ہو گئی۔ عین موقع پر جبکہ بم پھینکا جانے والا تھا

لینن کا بھائی اور اس کے رفیق کار گرفتار کر لئے گئے۔ مجرم عدالت کے روبرو پیش ہوتے تو بحیثیت پارٹی لیڈر کے لینن کے بڑے بھائی نے عدالت کے سامنے دوران تقریر میں کہا "استبداد کو فنا کرنے کے لئے ہماری پارٹی یہ ضروری خیال کرتی ہے کہ پہلے استبدادیت کے بت کو فنا کر دیا جائے ہماری پارٹی موت سے نہیں ڈرتی۔ اس کی خاکستر سے حریت کے ایسے دیوانے پیدا ہوں گے جو استبدادیت کو فنا کر کے ہٹیں گے۔" مقدمہ کا فیصلہ سنایا گیا تو پانچ کو جس میں لینن کا بھائی بھی تھا پھانسی ملی اور باقی کو حبس دوام کا حکم ہوا۔ باپ کا داغ تو تھا ہی اب بھائی کا داغ بھی لینن کی عمر بھر کا ساتھی ہو گیا۔

جس سال حریت کے لئے بھائی نے جان کی قربانی پیش کی اسی سال لینن نے میٹرک میں کامیابی حاصل کی اور اوّل نمبر رہا۔ لینن کے اس طالب علمی کے زمانہ کے حالات نہیں ملتے البتہ اس کی چھوٹی بہن اور خود لینن نے جو کچھ کسی موقع پر بیان کر دیا ہے وہی معلوم ہے۔ لینن کی بہن اپنے بھائی کے اسکول کے زمانہ کی زندگی کا نقشہ اس طرح کھینچتی ہے "میرا بھائی کتابیں بغل میں دبائے آبادی سے دور چلا جاتا اور تمام تمام دن کتابوں میں غرق رہتا پڑھتا اور ساتھ ہی ساتھ اقتباسات لیتا رہتا اس زمانہ میں میں بھی لینن سے چند غیر زبانیں سیکھا کرتی تھی۔ میں اس زمانہ میں کافی کمسن تھی لیکن جس تندہی اور تواتر سے لینن مطالعہ کرتا تھا اس کا نقشہ میرے دل پر اب تک جما ہوا ہے۔ اس کی اس جانفشانی سے کام کرنے کا مجھ پر یہ اثر تھا کہ میری یہ آرزو ہوا کرتی تھی کہ وہ مجھ سے کسی کام کو کہے اور میں اس کو انجام دے کر اپنے بھائی کو ممنون کروں۔" لینن خود اپنے بچپن کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے "جب میں کم سن تھا تو مجھے اسکیٹنگ کا بڑا شوق تھا۔ میرا یہ شوق مجھے تھکا کر چور چور کر دیتا تھا۔ تھکن کی وجہ سے نیند بہت آتی تھی اس طرح بہت وقت ضائع ہو جاتا تھا آخر کار تعلیم پر اپنے شوق کو قربان ہی کرنا پڑا۔" اس ضبط نفس اور محنت کا یہ نتیجہ نکلا کہ جب اسکول کی تعلیم ختم ہوئی تو ہیڈ ماسٹر نے سرٹیفکیٹ میں لکھا "لینن بہت ذہین، جانفشانی اور تواتر سے کام کرنے والا اور جماعت میں ہمیشہ حاضر رہنے والا طالب علم ہے۔" قدرت کی نیرنگی دیکھیے کہ اس ہیڈ ماسٹر کا بیٹا کرنسکی آگے چل کر روس کی عارضی حکومت کا وزیراعظم

بنا جس کو برطرف کرنے کے بعد لینن خود وزیراعظم ہوا۔ ہیڈ ماسٹر کو کیا علم تھا کہ مستقبل میں اس کا خاص شاگرد لینن استاد زادہ سے زمام حکومت چھین لے گا۔

لینن نے جب کازان کی مشہور یونیورسٹی میں داخلہ چاہا تو بھائی کو جان بحق ہوئے قلیل عرصہ ہی گذرا تھا۔ داخلہ کے لئے اگر ایک طرف کرنسکی کے باپ کا دیا ہوا مندرجہ بالا سرٹیفکیٹ تھا تو دوسری طرف خفیہ کی رپورٹ تھی کہ لینن ایک باغی کا چھوٹا بھائی ہے۔ داخلہ تو بدقت ہوگیا لیکن یونیورسٹی کے تمام طلبا اس نئے طالب علم کی بابت چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ ابھی یونیورسٹی میں آئے ایک سال ہی ہوا تھا کہ لینن باغیانہ اظہار خیال پر اپنے نانا کے گاؤں میں جہاں لینن کی بہن پہلے سے نظربند تھی نظربند کر دیا گیا۔ اس وقت اس کی عمر ۱۷ سال کی تھی۔ دو سال نظربند رہا اس دوران میں قانون، کارل مارکس کی مشہور تصنیف "سرمایہ" اور دیگر کتب کا غور و خوض سے مطالعہ کرتا رہا نظربندی کی میعاد ختم ہوگئی تو وہ پھر تحصیل علم میں لگ گیا اور سینٹ پیٹربرگ کی یونیورسٹی سے قانون کی اعلیٰ سند حاصل کر لی۔ اب اس کے سامنے زندگی کے دو راستے تھے ایک دنیاوی آرام و آسائش کا اور دوسرا مصائب و آلام کا۔ اگر ایک طرف حکومت کی ملازمت دنیاوی اعزاز۔ عیش و نشاط کی زندگی اپنی ہر ادا سے اس کو دعوت دے رہی تھیں تو دوسری طرف والدین کا وجدانی ترکہ بھائی کی قربانی بنی نوع انسان کی درماندگیاں لینن کے دل کو اپنی طرف کھینچ رہی تھیں۔ کچھ دن تذبذب میں گزرے آخر کار والدین کے وجدانی ذوق اور مرحوم بھائی کی یاد نے اس نوعمر کو انقلابی شاہراہ پر ڈال ہی دیا۔ اس طرح والدین اور بھائی نے لینن کی ذات میں از سر نو زندگی پائی شاید حریت اپنے جاں نثاروں کو اسی طرح حیات ابدی بخشتی ہے۔ زندگی کے اس دشوار گزار راستے کے انتخاب میں شاید مرحوم بھائی کی یاد کام کر رہی تھی چونکہ ابتدائی زمانہ ہی میں یولیانوف نے اپنے مرحوم بھائی الکسندر کا لقب لینن اختیار کر لیا تھا۔ آج دنیا لینن کو اس کے اصلی نام یولیانوف سے نہیں جانتی بلکہ اس کے بڑے بھائی کے لقب لینن سے یاد کرتی ہے۔

لینن نے انقلابی [illegible] عمل اپنے لئے پسند کر لیا تو ہم خیال [illegible] حزب [illegible]

ہوئی تاکہ عملی جدوجہد شروع کی جائے۔ عوام میں تبلیغ کا مسئلہ فوری توجہ چاہتا تھا۔ اس سلسلہ میں تو لینن نے یہ کیا کہ ایک اخبار "ریڈیکل نیوز" میں انقلابی خیالات کا اظہار کرنا شروع کردیا اور ایک مختصر سا رسالہ "کسانوں میں اقتصادی تحریک" سپرد قلم کیا۔ خفیہ پولیس نے رسالہ تو نشر نہ ہونے دیا البتہ اسکو سرکاری کتب خانہ میں محفوظ کرلیا۔ انقلاب کے بعد جب لینن وزیراعظم ہوا تو یہ رسالہ خفیہ پولیس کے کتبخانہ سے برآمد ہوا۔ قدرت کی نیرنگی دیکھئے کہ اگر وہ ایک طرف موسیٰ کو فرعون کے محلوں میں پرورش کراتی ہے تو دوسری طرف انقلابی افکار کے مرقعہ کو زار کی خفیہ پولیس کے کتب خانے میں محفوظ کردیتی ہے۔

اس ابتدائی زمانے میں برلن اشتراکی دنیا کا مکہ بنا ہوا تھا بقول اشتراکیوں کے جرمنی کی ½ آبادی ان کے ہم خیال تھی پارٹی کے نام میں ۹۳۰۰۰۰ مارکس کی رقم جمع تھی اور ۱۰۴ اخبار تبلیغی کام کرتے تھے۔ لینن کو لگی ہوئی تھی سیدھا برلن پہنچا وہاں انقلابی جدوجہد کا مطالعہ کیا تقریریں کیں احرار کیساتھ تبادلہ خیالات کیا پھر روس کے جلاوطن اشتراکی قلندر پیخانوف کی قدم بوسی کو جنیوا چلا گیا اس قلندر کا تعلق روسی انقلاب سے وہی ہے جو والٹیر کا انقلاب فرانس سے تھا اور وہ اسی طرح لینن کا اشتراکی باپ تھا جس طرح روسو، روبسپیر کا یہاں اس قلندر کے مختصر سے حالات کا بیان عبرت سے خالی نہیں ہوگا۔ جب روس کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ۶ دسمبر ۱۸۷۶ء کو پیٹرو گراڈ میں اشتراکیت کا سرخ علم بلند ہوا تو زار روس کی چمکتی ہوئی تلواروں کے مقابلہ میں پیخانوف سرکف تقریر کرنے اٹھا۔ تقریر ہو رہی تھی کہ مجمع کو فوج نے آگھیرا۔ تقریر ختم ہوتے ہی پیخانوف گرفتار کرلیا گیا اور بعد میں جلاوطن۔ وطن ترک کرکے جنیوا آگیا یہاں بھی اشتراکی جدوجہد پر نہ کوئی رونے والا تھا نہ ہنسنے والا۔ دنیا اس سے بے پرواتھی اور وہ دنیا سے کنارہ کش نہ اس کو جلوسوں کی جلوہ آرائیاں میسر تھیں اور نہ حکومتوں کے ایوانوں میں اس کی آواز کی گونج سنائی دیتی تھی یہ روسی قلندر جنیوا کے ایک گوشے میں بیٹھا وہ خیالات پھیلا رہا تھا جنہوں نے ابتدائی زمانہ میں اشتراکی فکر کو سہارا دیا۔ حالت جلاوطنی میں کاٹنے اور افلاس کا یہ عالم رہا کہ ایک رسالہ بھی چھپوا کر نشر نہ کرسکا۔ تمام عمر میں مدت

بھی میسر نہ آتے اور مریدوں کی تعداد ایک بھی نہ پہنچ سکی۔ ایسا معلوم ہوتا ہی کہ جس طرح پھول اور پھل ایک خاص موسم میں آتے ہیں اسی طرح نیکی کے بارآور ہونے کے لئے بھی ایک مخصوص موسم ہوتا ہی اور اکثر مشاہیر کی زندگی کا مطالعہ ہمیں یہ بتاتا ہی کہ نیکی کے بارآور ہونے کا موسم نیکوکار کی دنیاوی زندگی میں نہیں آتا۔

پیخانوف روس کی حالت بیان کرتا ہوا اپنے خیالات کا اس طرح اظہار کرتا ہی: "دولت کی پیداوار کا طریقہ انسانوں کے آپس کے تعلقات میں تبدیلی پیدا کر دیتا ہی اور نتیجۃً سماج میں جماعتیں پیدا ہوجاتی ہیں۔ پھر سر برآوردہ جماعت کے لوگ اپنے مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے حکومت قائم کرلیتے ہیں جو بسا اوقات اس جماعت کی آمریت ہوتی ہی۔ روس میں بھی یہی ہوا کہ رفتہ رفتہ روزانہ زندگی میں سرمایہ داروں اور جاگیرداروں میں سیاسی اور اقتصادی تصادم پیدا ہونے لگا چونکہ سرمایہ دار جماعت کا سماجی طریقہ پیداوار پر قبضہ ہوگیا تھا اس لئے جو حقوق اس نے مانگے وہ جاگیرداروں کی حکومت کو دینے پڑے سرمایہ دار جماعت نے ان حقوق کا نام ملکی دستور، انسانی حقوق، اصول تہذیب وتمدن رکھا حالانکہ ان حقوق کو ان ناموں سے پکارنا تاریخی غلطی ہی۔ لیکن سرمایہ دار جماعت کی اس جدوجہد میں پرولتاری طبقہ کو چاہیئے کہ ہاتھ بٹائیں۔ مزدور جماعت کو برجوازی کی اس اقتصادی ترقی سے ہراساں نہ ہونا چاہیئے چونکہ برجوازی کے برسر اقتدار آنے سے مزدور تحریک کامیاب ہوگی۔ خواجہ وخادم کے تعلقات اگر اصل میں نہیں تو شکل میں بدل رہے ہیں۔ تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہی کہ سماجی زندگی کے ابتدائی دور میں اقتصادی استبداد ظاہر اور واضح ہوتا ہی لیکن جیسے جیسے طریقہ پیداوار پیچیدہ ہوتا جاتا ہی اقتصادی استبداد بھی اپنی نوعیت بدلتا رہتا ہی اور جب سرمایہ دارانہ تہذیب وتمدن عروج پر پہنچتے ہیں تو یہ اقتصادی استبداد اس قدر لطیف پیراہن میں ملبوس ہوکر ظاہر ہوتا ہی کہ عام نظر اس کے لطیف پیراہن ہی میں الجھ کر رہ جاتی ہی۔ نیا طریقہ پیداوار پیدا ہوجانے پر بھی پرانے تعلقات، رسم ورواج بدستور زندہ رہتے ہیں نئے تعلقات اس قدر مجہول ہوتے ہیں کہ ان کو نظروں میں پہچانتی ہی"

پیخانوف کا یہ مارکسی طرز خیال تھا جو لینن کو جینوا لے آیا۔ جب لینن پیخانوف کے کمرے میں داخل
ہوا تو دیکھا کہ روسی فلسفہ بیٹھا ہوا ہے چاروں طرف کتابیں پڑی ہیں اور کچھ سوچ رہا ہے لینن نے آداب
وغیرہ پیش کیا کچھ دیر رسمی باتیں ہوئیں پھر لینن نے اپنی زندگی کی سرگشت سنائی دونوں روحوں نے
ایک دوسرے کو پہچانا اور ملاقات سے مسرور ہوئیں۔ پیخانوف کے دو ساتھی مارٹوف اور اگلرود
نے جو اس وقت موجود تھے اس ملاقات کے تاثرات کا ذکر الگ الگ کیا ہے۔ مارٹوف لکھتا ہے پیخانوف
اور میں ایک مدت سے مارکسی خیالات کی تبلیغ میں سرگرم تھے لیکن عوام پر اس کا نمایاں اثر نہ ہوتا تھا۔
چند جمہوری اشتراکی روس سے وقتاً فوقتاً ہمارے پاس آتے رہتے تھے لیکن وہ کبھی ہماری
توقعات کو پورا نہ کر سکے۔ جب لینن سے ملاقات ہوئی تو ہم نے ٹھنڈا سانس لیا کہ آج وہ آدمی
مل گیا ہے جس کے ہاتھوں میں اشتراکیت کا علم بلا کسی تردد کے دیا جا سکتا ہے۔ اب اشتراکیت
کو ایک عملی لیڈر مل گیا ہے" اگلرود لکھتا ہے: جب لینن سے ملاقات ہوئی تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ
یہ شخص روسی انقلاب کا لیڈر ہوگا وہ صرف ایک متمدن مارکسی ہی نہ تھا بلکہ اس کا تخیل ان مسائل
کی بابت کہ کیا کرنا ہے اور کس طرح کرنا ہے بہت صاف تھا۔ اس میں اور روسی سرزمین میں کچھ باطنی رشتہ
معلوم ہوتا تھا جب میری نظر سے لینن کا پہلا رسالہ گذرا اسی وقت مجھے یقین ہوگیا تھا کہ اس رسالے
کے مصنف میں ایک بڑے رہبر بننے کے جراثیم موجود ہیں"

جینوا میں کچھ عرصے قیام کے بعد لینن روس واپس آگیا۔ اس کی خوش قسمتی کہ اس زمانہ میں زار کی
حکومت نے رعایا کی تعلیم کی خاطر تمام ملک میں مدرسے جاری کئے لینن کی تیز فکر نے ان مدرسوں کے
انقلابی امکان کو بھانپ لیا۔ اول استادوں سے دوستی کی پھر ان میں اپنے خیالات کی تبلیغ شروع
کردی استادوں کے ذریعے طالب علموں سے بھی رشتہ آشتی پیدا کر لیا۔ باقاعدہ خفیہ جلسے
ہونے لگے جس میں لینن عوام کی زبان میں تقریریں کرتا اور ان کی زندگی سے ہی مثالیں لے کر حاضرین
کو اشتراکی اصول سمجھاتا۔ اسی زمانہ میں لینن کی ایک خاتون کروپسکایا سے ملاقات ہوئی وہ بھی
ان خفیہ جلسوں میں شریک ہوا کرتی تھی اکثر اس کی لینن سے سیاسی مسائل پر گفتگو ہوتی۔ ہم آہنگی اور

ہم خیالی نے موانست کی راہ نکالی تاکہ دونوں روحیں ایک دوسرے میں ضم ہو کر مکمل ہوجائیں۔ چنانچہ کروپسکایا عرف عام میں لینن کی بیوی ہوگئی۔ زار کی خفیہ پولیس کو ان جلسوں کا پتہ لگا تو پیچھے پڑگئی۔ حالات کے مطابق اب لینن نے اس موضوع پر تقریریں کرنی شروع کیں کہ پولیس تعاقب کرے تو اس کو کس طرح دھوکا دینا چاہیئے۔ انقلابی کے لئے گلی گلی جاننا اپنے بچاؤ کے لئے کیوں ضروری ہے۔ پولیس کو دھوکا دینے کے لئے کس طرح گلیوں میں بھاگ کر مکانوں میں پناہ لینی چاہیئے۔ خطرہ گذر جائے تو وہاں سے کس طرح نکل بھاگنا چاہیئے۔ مختلف بھیس بدل کر پولیس سے کس طرح بچنا چاہیئے۔ ان تقریروں کا یہ نتیجہ ہوا کہ پولیس کو دھوکا دینے میں انقلابی اکثر کامیاب ہوجاتے تھے اور پیٹرزبرگ میں لینن اور اس کے ساتھی عوام میں "خرانٹ" کے نام سے مشہور ہوگئے تھے ان "خرانٹوں" نے پیٹرزبرگ کے قریب ایک بستی میں خفیہ چھاپہ خانہ بھی جاری کردیا۔ چند انقلابی لوگ اخبار چھاپتے چند نہایت خفیہ طور پر اخبار کے پلندے شہر میں داخل کرتے، چند سڑکوں پر پہنچاتے۔ چند مکانوں پر دے جاتے اس طرح پیٹرزبرگ میں انقلابی اخبار نشر ہوتا اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ لینن کو ان خفیہ طریقوں میں اس لئے کامیابی ہوئی کہ اس نے اپنے ساتھیوں کو بجائے تقریر کرنا سکھانے کے یہ سکھایا کہ نظر نہ آنے والی سیاہی کس طرح بنائی جائے۔ مصنوعی داڑھی اور بال کس طرح لگائے جائیں کہ دوسرا پہچان نہ سکے اور خفیہ خط و کتابت کس طرح کی جائے۔

اس زمانے میں لینن نے ایک کتاب بنام "عوام کے دوست کون ہیں اور وہ کس طرح سوشل ڈیماکراتوں سے لڑتے ہیں" لکھی جو پہلی تصانیف کا حشر ہوچکا تھا وہی اس کا بھی ہوا۔ کوئی ناشر نہ ملا لینن کے ساتھیوں نے بہ صد دقت ایک دقیانوسی پریس کی مشین پر دو سو کاپیاں چھاپیں اور اپنی پارٹی ہی میں تقسیم کردیں۔ لیکن کوئی کوشش ہورائیگاں نہیں جاتی جلدی یا دیر اس کا اثر ظاہر ہو کر ہی رہتا ہے لینن کی تین سال کی جدوجہد کا یہ اثر ہوا کہ پیٹرزبرگ میں وہ عام طور پر "چچا لینن" کے نام سے یاد کیا جانے لگا اور ایک مزدور سبھا قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا لیکن اس پہلی مزدور سبھا کے ممبروں میں اگر ایک مزدور تھا تو دس پڑھے لکھے نوجوان تھے جن کو مشکل سے مزدوروں کے زمرہ میں شمار کیا

جاسکتا تھا۔ مزدور طبقہ کی بیداری کا یہ نتیجہ نکلا کہ ۵ نومبر ۱۸۹۵ء کو ایک سگریٹ کی فیکٹری کے مزدوروں نے ہڑتال کر دی ان کی ہمدردی میں کپڑے اور جوتے کی فیکٹری میں بھی کام بند ہو گیا۔ حکومت سمجھ گئی کہ ان ہڑتالوں میں کس کا ہاتھ کام کر رہا ہے چنانچہ ۹ دسمبر کو لینن گرفتار کر لیا گیا۔ جیل ہو گئی۔ ہدایت کے مطابق ساتھی جیل خانہ میں اس کو تحفتہً کتابیں بھیجتے جن کو وہ شکریہ کے ساتھ قبول کرتا ان کو پڑھتا اور خاص خاص لفظوں پر بہت باریک نقطہ لگا دیتا۔ کتاب مطالعہ کے بعد مع شکریہ کے بھیجنے والے کو واپس کر دی جاتی۔ جب کتاب واپس آجاتی تو اس کے ساتھی نقطہ والے لفظوں کو ملا کر ان کے جملے بنا لیتے۔ لینن دودھ سے خطوط لکھ کر بھی باہر پہنچا تا تھا اس طرح جیل خانے میں رہنے کے باوجود پارٹی کو اس سے ہدایات ملتی رہیں اور انقلابی تحریک برابر جاری رہی۔

(باقی آئندہ) ایم ایم جوہر میرٹھی

حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے اُردو کارنامے

نواب حیدر علی ۱۷۶۱ء میں میسور کی ریاست کے والی بنے، اور اکیس سال کی فرماں روائی کے بعد ملک جاودانی کی راہ لی، ۱۷۸۲ء میں ٹیپو سلطان مسند حکومت پر جلوہ گر ہوئے، اور سترہ سال تک جاہ وجلال شوکت وعظمت اور کافی طمطراق کے ساتھ حکمرانی کر کے ۱۷۹۹ء میں جام شہادت نوش فرمایا، اس طرح دولت خداداد کا زمانہ حکومت صرف اڑتیس سال ہی، اور پھر اس مدت میں بھی امن وامان نصیب نہیں ہوا، اطمینان اور فارغ البالی سے حکمرانی کا موقع نہیں ملا، ہر وقت کشت وخون سے سابقہ رہا، میسور کی فضا ہمیشہ مکدر رہی، جنگ وجدل کے بادل منڈلاتے رہے، توپ وتفنگ کی گرج کے ساتھ خون کی بارش ہوتی رہی، اس کے باوجود یہ امر تعجب سے خالی نہیں ہی کہ نواب حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے علم وہنر کی بھی سرپرستی فرمائی اور علوم وفنون کو رائج کرنے میں بہت کچھ جوہر دکھائے، ان کے فیض وکرم سے بیسیوں ارباب علم وفضل متمتع ہوئے، ان کی سرپرستی میں بے حساب، شاعروں، ادیبوں، عالموں اور مصنفوں نے کتابیں لکھیں، جو آج بھی تشنگان علم کے لئے آب حیات سے کم نہیں ہیں، یہ موقع نہیں ہی کہ ہم دولت خداداد کی علمی سرپرستیوں اور ان کے عہد کے علمی کارناموں کی تفصیل کریں، ہم صرف ان کے اردو کارناموں پر مختصر تبصرہ کرتے ہیں، یقین ہی کہ موجب دلچسپی ہوگا۔

اگرچہ دولت خداداد کے زمانہ حکمرانی میں جنوبی ہند یا دکن کے ایک بڑے حصہ میں عام طور سے اُردو یا دکھنی مروج تھی، اور دکن کے اکثر حصوں میں دکھنی زبان جاننے والے موجود تھے، لیکن پھر بھی دکھنی زبان کسی ریاست کی سرکاری زبان نہیں تھی، دکن کی عظیم الشان اسلامی سلطنتیں قطب شاہی اور عادل شاہی وغیرہ کو صفحہ ہستی سے مٹے ہوئے عرصہ ہو چکا تھا، ان سلطنتوں کی علمی قدردانی اور دکھنی شاعروں اور ادیبوں کی سرپرستی معدوم ہو کر افسانہ بن چکی تھی، شمال میں مغلیہ حکومت کا چراغ گل ہو رہا تھا، شیرازہ مملکت بکھر گیا تھا، طوائف الملوکی پھیل گئی تھی، سلطنت آصفیہ اور سلطنت خداداد کی سرکاری

زبانیں فارسی تھیں، علماء وقت عموماً فارسی زبان میں اپنی تصانیف کرتے تھے، اور پھر جو اہلِ علم دنیا سے گزر رہے تھے، ان کی جگہ پر کرنے والا نظر نہ آتا تھا، اُردو یا دکھنی زبان بازاری زبان تصور کی جاتی تھی، اس میں علمی ذخیرہ بہت کم بلکہ نایاب تھا، والیانِ فرنگ ہنوز اردو کی سرپرستی کی جانب متوجہ نہیں ہوئے تھے، نہ تو کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج کی تصانیف شائع ہوئی تھیں اور نہ شاہ عبدالقادر نے قرآن شریف کی تفسیر قلمبند کی تھی، لیکن اس کے باوجود سلطنت خداداد کے بعض اُردو کارنامے تاریخ اُردو میں آبِ زر سے لکھے جائیں گے، نواب حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے اُردو زبان میں بعض ایسی یادگاریں چھوڑی ہیں جن کو زمانہ مٹا سکتا ہے، اور نہ حوادثات محو کر سکتے ہیں۔

سلطنت خداداد کے اُردو کارناموں کو ہم مختلف عنوانوں کے تحت بیان کر سکتے ہیں، مثلاً شاعری، نثر نگاری، فوجی قواعد وضابطہ میں اردو کی ترویج، معاشرت اور رسم ورواج میں اُردو کا دخل موسیقی میں اُردو کا استعمال وغیرہ۔

شاعری اُردو یا دکھنی شاعری کی ابتدا اور اس کی ترقی سے یہاں بحث مقصود نہیں ہے، یہ ہم کو معلوم ہے کہ دکن میں آٹھویں صدی ہجری یا تیرھویں صدی عیسوی سے دکھنی شاعری کے آغاز ہونے کا ثبوت موجود ہے، اس طرح دولت خداداد کے زمانہ میں دکھنی شاعری کی عمر تقریباً ساڑھے تین سو سال کی ہو چکی تھی، دکھنی مثنویوں کا وافر ذخیرہ فراہم ہو چکا تھا۔ یہ مثنویاں رزم وبزم، تصوف وفلسفہ، اخلاق وموعظت افسانہ اور حکایت، نیچر اور معاشرت وغیرہ عنوانوں پر حاوی ہیں۔ جن کی تفصیلی وضاحت میں نے اپنے دوسرے مضامین میں اور کتابوں میں کردی ہے، اس کے علاوہ اس زمانہ میں دکن کی ایک جدید شاعری یعنی غزل گوئی کی ابتدا بھی ہو چکی تھی، وؔلی کا زمانہ گزر چکا تھا، سراؔج اور ان کے تلامذہ کا دور دورہ تھا حسن وعشق اور تصوف کی گرم بازاری تھی۔

ادھر شمالی ہند میں بھی اب فارسی کے بجائے اردو شاعری سے دلچسپی پیدا ہو چلی تھی۔ میرؔ۔ سوداؔ مظہرؔ، حاتمؔ، دردؔ، وغیرہ کی شاعری پسندیدہ نظروں سے دیکھی جاتی تھی، مگر اس شاعری کا موضوع حسن وعشق، شاہد وساقی، گل وبلبل کے دائرہ تک محدود تھا، البتہ دکن میں دکھنی شاعر مختلف نہج پر

اظہار خیال کرنے کے عادی تھے، ان کی شاعری کے موضوع ہمہ گیر رہی ہیں، انھوں نے زندگی کے ہر پہلو کی تصویر دکنی شاعری میں کھینچی ہی، اگر عشق و محبت کی روئداد میں حسن و رعنائی کا اظہار کیا ہی، تو وہیں میدانِ جنگ کے دار و گیر کا صحیح نقشہ بھی پیش کر دیا ہی۔ اگر ان کے کلام میں تصوف اور عرفان جلوہ گر ہی تو وہیں انھوں نے فلسفہ کو بھی نہیں چھوڑا ہی، گھریلو زندگی کے روزمرہ واقعات کی حکایت بیان کی ہو تو وہیں مناظرِ قدرت کی دل نواز سحر طرازیاں ان کے یہاں ملتی ہیں، تاریخ اور سوانح کو بھی انھوں نے نظر انداز نہیں کیا اور پھر اخلاق اور پند میں بھی اظہار خیال سے اپنے نقش بٹھلائے ہیں، بہرحال دکنی شاعری کے موضوع ہمہ گیر رہی ہیں۔ میسور بھی دکن میں شامل ہی، یہاں کے شاعروں نے بھی ان ہی موضوع میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہی، اور اپنے افکار کے نتائج مرتب کیے ہیں، اس زمانہ کے جن شعراء سے ہم واقف ہیں، ان کے اسمار گرامی یہ ہیں، عاصی، خادم، فقیر، شہباز، میر حسین علی، محمود، شاکر، کمال، حسین، زین العابدین، عزت، طرب، اسحاق، خانہ زاد، کرمان وغیرہ، ان شعراء کا کلام ہماری کتابوں "مدراس میں اردو" "یورپ میں دکنی مخطوطات" اور عبد الخالق صاحب کی تالیف "میسور میں اُردو" میں موجود ہی۔ ان شاعروں نے اس وقت کے رواج کے مطابق مثنوی اور غزل، مرثیہ اور قصیدہ میں اظہار خیال کیا ہی، اور ان کے موضوع تاریخ، رزم، عقائد، و اخلاق، عشق و محبت وغیرہ ہیں، ان شعراء میں خصوصیت سے طرب، زین العابدین، عباد اللہ، اسحاق اور کمال خاص طور پر قابل تذکرہ ہیں، طرب نے فتح نامہ کے نام سے ایک مثنوی لکھی ہی جس کا ایک مخطوطہ انڈیا آفس لندن میں محفوظ تھا۔ اس مثنوی میں ٹیپو سلطان کے ایک جنگ کے حالات نہایت تفصیل سے نظم کیے گئے ہیں، فوجوں کا کوچ، مقابلہ کی کیفیت، میدان جنگ کا نقشہ، لڑائی کا حال جنگ کا خاتمہ صلح کی گفتگو وغیرہ امور کو نہایت عمدگی سے بیان کیا گیا ہی۔

زین العابدین نے فوجی نغموں کی صراحت کی ہی، عباد اللہ نے علم موسیقی پر اظہار خیال کیا ہی، ان دونوں کا مزید تذکرہ آگے آتا ہی، اسحاق کی تصنیف ریاض العارفین ایک مشہور و معروف مثنوی ہی، جس میں تصوف اور اخلاق پر بہترین مواد فراہم کیا گیا ہی، عاصی، خادم، اور کمال وغیرہ کی غزلیں

شہرت رکھتی ہیں، جو نازک خیالی، بلندی تخیل اور رنگینی وغیرہ کے لحاظ سے قابل داد ہیں۔

نثر نگاری دکن کے ابتدائی دور میں نثر سے زیادہ نظم نگاری پر توجہ کی گئی ہے، اس لئے ہم کو نثاروں سے زیادہ شاعروں کا حال معلوم ہے، اور ان کے نتائج افکار بھی بہت کچھ محفوظ ہو گئے ہیں، اس کے برخلاف نثر نگاری کی جانب اتنی توجہ نہیں کی گئی تھی، مگر یہ صحیح ہے کہ ہر صدی میں ہم کو نثر نگار بھی ملتے ہیں، جن کی کتابیں اردو ادب کا مایۂ ناز سرمایہ کہی جاسکتی ہیں۔ دکھنی نثر نگاری کی کتابیں مختلف موضوع پر ملتی ہیں۔ تصوف، فقہ، حدیث عقائد کے ساتھ ساتھ ادب پر بھی دکھنی نثر کی کتابیں دستیاب ہوتی ہیں۔

اگرچہ سلطنت خداداد کے پہلے دکھنی نثر کی کئی بلند پایہ کتابیں تصنیف ہو چکی تھیں، احکام الصلوٰۃ شمائل الاتقیاء، سب رس، معرفت السلوک، اخلاق ہندی وغیرہ مرتب اور مدون ہو چکی تھیں لیکن پھر بھی سلطنت خداداد کے زمانہ کی تین کتابیں نظر انداز نہیں کی جاسکتیں۔

(۱) حیدر نامہ:- افسوس ہے کہ ہم اس کے مصنف کے نام سے واقف نہیں ہیں، لندن میں اس کے دو مخطوطات محفوظ تھے۔

دکھنی زبان میں فن تاریخ کی یہ پہلی کتاب ہے جو نواب حیدر علی کے زمانہ میں ان کی سرپرستی میں لکھی گئی ہے۔ انڈیا آفس کے نسخہ میں صرف حیدر علی کے حالات پر کتاب ختم ہو جاتی ہے، اس کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کا تکملہ کیا گیا۔ چنانچہ برٹش میوزیم میں جو نسخہ تھا اس میں ٹیپو سلطان کے شہادت تک واقعات درج ہیں، افسوس ہے کہ جس طرح اس کتاب کے مصنف کے نام سے واقفیت نہیں ہے اسی طرح ہم کو یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کا تکملہ کس نے کیا ہے، ہو سکتا ہے کہ خود مصنف اول ہی نے تکملہ بھی کیا ہو کتاب معتبر تاریخی دستاویز کہی جاسکتی ہے۔

(۲) بہادر نامہ:- اس کتاب کی تصنیف ۱۱۹۶ھ اور ۱۲۱۲ھ کے درمیان ہوئی ہے، اس کے مصنف سے بھی ہم واقف نہیں ہیں، یہ بھی ایک تاریخی کتاب ہے، اس میں ٹیپو سلطان کے تخت نشینی تک کے حالات کا تذکرہ ہے، حیدر آباد کے دفتر دیوانی و مال کے کتب خانہ میں اس کتاب کا ایک مخطوطہ موجود ہے۔

(۳) خلاصہ سلطانی :- اس کتاب کا دوسرا نام احکام المناہی ہے، اس کے مصنف قاضی غلام احمد ہیں۔ جو ٹیپو سلطان کے زمانہ میں سرنگ پٹن کے قاضی تھے، یہ فقہ کی کتاب ہے لیکن اس کے ساتھ عقائد کا بھی تذکرہ ہے۔ انگلستان میں اس کے دو نسخے موجود تھے۔

اگرچہ موجودہ تحقیقات کے لحاظ سے صرف ان ہی کتابوں کا پتہ چلتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ مزید تحقیقات سے اس میں اضافہ ہوسکے، مگر اس کے باوجود اس امر کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ فن تاریخ میں دکھنی زبان میں سب سے پہلے اسی عہد میں کتابیں مرتب ہوئی ہیں، اور یہ امر کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

فوجی قواعد میں اُردو کی ترویج

فوجی قواعد میں اُردو کی ترویج ٹیپو سلطان کا ایک بہت بڑا اُردو کارنامہ ہے جو تاریخ اُردو میں آب زر سے لکھا جائے گا۔ ٹیپو سلطان کے زمانہ میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کی فوج دیسی فرمانرواؤں کی فوج سے بازی لے جاتی تھی، اس کی وجہ یہ تھی کہ اول الذکر فوج قواعد و ضوابط کے تحت کام کرتی تھی، اس کے برخلاف ثانی الذکر فوج بے قاعدہ تھی، جنگ کے موقع پر عموماً باقاعدہ فوج کو کامیابی حاصل ہوتی تھی، ٹیپو سلطان نے اس نقص کو معلوم کیا اور فوج کی تعلیم اور تربیت اور فنونِ حرب کے لیئے یورپین قواعد کی خوبی معلوم کی اور اس کو فارسی زبان میں منتقل کر دیا، فوجی اصطلاحات طریقہ جنگ معرکہ آرائی وغیرہ کے متعلق ایک کتاب فتح المجاہدین کے نام سے مرتب کرائی اس کے مصنف زین العابدین ہیں، فتح المجاہدین میں فوجی نغموں کا بھی تذکرہ ہے۔ مختلف اوقات کے لیے علیحدہ علیحدہ فوجی راگ بنائے گئے ہیں، تاکہ فوج کے ارگن میں اس نغمہ کو گایا جائے، اس کے لیئے جو نظمیں مقرر کی گئی ہیں وہ دکھنی یا اُردو میں، یہ کتاب ۱۱۹۶ھ میں مرتب ہوئی ہے۔

معاشرت اور رسم و رواج میں اُردو کا رواج

ٹیپو سلطان نے اصلاح معاشرت کا بھی بیڑا اٹھایا تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کی معاشرت کی اصلاح کرنی چاہی، اور شادی بیاہ کے رسومات کے اصلاح کے متعلق ایک ضابطہ مقرر کیا اور احکام نافذ کئے، ان کو اس امر کا بڑا خیال تھا کہ مسلمانوں کی معاشرت کی فوری ترمیم کی جائے، بلا ضرورت اخراجات اور غیر ضروری مصارف کی بیخ کنی

ہوجائے، چنانچہ اسی کے مدنظر ایک دستور العمل بنایا تھا، اس میں ان رسومات کا تذکرہ کیا گیا ہو جو شادی کے موقع پر ہونے چاہئیں، اس رسالہ یا دستور العمل کے نافذ کرنے کی وجہ بھی بتائی گئی ہو، چنانچہ دیباچہ کا مختصر اقتباس حسب ذیل ہو:-

"یہ رسالہ اس غرض سے مرتب کیا گیا ہو کہ سابق میں مسلمانانِ ہند و دکن شادی کدخدائی کی رسمیں اہل ہند کے مطابق ادا کرتے تھے، اور اس میں کوئی قباحت نہیں سمجھتے تھے، سلطان نے ان رسموں کو منسوخ کرکے چند امور مطابق شرع شریف حدیث نبوی و رسم شرفا و نجبا مقرر کئے ہیں، تاکہ تمام خواص و عوام حسب ضابطہ عمل کریں۔"

اس رسالے میں جو گانے ہیں وہ اُردو یا دکھنی ہیں۔

موسیقی میں اُردو کا رواج

ٹیپو سلطان کو موسیقی سے نہ صرف دلچسپی تھی بلکہ وہ فن موسیقی سے بھی واقف تھے، اس کمال فن کے باعث ان کی سرپرستی میں فن موسیقی پر ایک کتاب سنہ ۱۱۹۹ھ میں لکھی گئی ہو، اس کا نام "مفرح القلوب" ہو، انڈیا آفس کے کتب خانے میں اس کے نو نسخے موجود تھے، اس کے مصنف عباد اللہ ہیں، کتاب کے ابتدا میں ایک فارسی دیباچہ بھی ہو جس میں اس امر کا تذکرہ کیا گیا ہو کہ ٹیپو سلطان کے حسب خواہش یہ کتاب مرتب کی گئی ہو۔ اس میں موسیقی کے قواعد اور ضوابط کے ساتھ راگ اور راگنیوں اور نغموں کے متعلق روشنی ڈالی گئی ہو، اور پھر ہر راگ کے تحت غزلوں کو لکھا گیا ہو۔

اس کتاب کے دیباچہ میں اس امر کو واضح کیا گیا ہو کہ مفرح القلوب کی تصنیف کیوں کرائی گئی ہو۔ دیباچہ کا مختصر ترجمہ حسب ذیل ہو:-

"چونکہ دین اور دنیا، جسم و جان لازم و ملزوم ہیں، اسی طرح حرب اور ضرب بھی ایک دوسرے کے ساتھ جزو لاینفک کی حیثیت رکھتے ہیں، حرب یعنی لڑائی کے متعلق ایک کتاب مرتب ہو چکی ہو، اس لئے اب ضرب یعنی موسیقی کے متعلق یہ کتاب مرتب

کی جاتی ہے۔"

تبصرہ: صفحات گذشتہ میں نواب حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے اُردو کارناموں کا مختصر طور پر تذکرہ ہو چکا ہے۔ گو یہ صحیح ہے کہ گولکنڈہ کے سلاطین قطب شاہی اور بیجا پور کے سلاطین عادل شاہی کی طرح ان کے اُردو کارناموں کی فہرست طویل نہیں ہے۔ مگر جب ہم ان کے مختصر دورِ حکمرانی اور پھر ان کے مصائب اور دشواریوں پر نظر کرتے ہیں تو ہم کو ماننا پڑے گا کہ انھوں نے جو کچھ کیا وہ بہت زیادہ ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ ان کے زمانہ میں بعض جدید کارنامے اُردو کی ترقی اور ارتقا کے لیے عمل میں لائے گئے، انھوں نے علم و ہنر کی سرپرستی کی اور خصوصیت سے اردو یا دکھنی شاعروں اور ادیبوں اور مصنفوں کو نہال کیا، ان کے زمانہ میں شاعروں، ادیبوں اور مصنفوں نے باوجود حوادثات گوناگوں اور مصائب نامتناہی کے اپنے کام میں مصروفیت رکھی، اپنے کارناموں کو یادگار زمانہ چھوڑا، ان کا کلام خواہ نظم ہو یا نثر وہ آج بھی باوجود بیسیوں حوادثات کے موجود ہے، اور قابل ستایش اور لائق داد ہے۔

اردو کی سرپرستی سے اس امر کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نواب حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی شخصیت ہمہ گیر تھی، جوں جوں ان کے کردار اور کارہائے نمایاں پر سے پردہ اٹھایا جاتا ہے ہمارا تعجب اور احترام بڑھتا جاتا ہے۔ کاش ان کے زمانہ کے مخطوطات شائع ہو جائیں تو اردو ادب پر بڑا احسان ہوگا۔

نصیر الدین ہاشمی

بچّے جھوٹ کیوں بولتے ہیں

ہمارے تمدن کی بنیاد طرفین کے اس احترام اور اعتماد پر قائم ہے جو صرف آپس کے مخلصانہ اور امتیازانہ سلوک سے پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ بچوں کو، جو آئندہ اس تمدن کے برقرار رکھنے والے ہیں، یہ تعلیم دینی چاہیئے کہ باعزّت زندگی گذارنے کے لئے سچائی نہایت اہم اور ضروری چیز ہے اور ایک جھوٹا آدمی کبھی اپنے ساتھیوں اور دوستوں کا احترام اور اعتماد حاصل نہیں کر سکتا۔ لیکن سوال یہ رہ جاتا ہے کہ کیا سچائی کی تعلیم کا بہترین ذریعہ صرف اندھادھند مار پیٹ ہی ہے؟ اور جھوٹ بولنے کی اس بری عادت سے بچوں کو صرف اسی طریقہ سے باز رکھا جا سکتا ہے جس پر والدین عموماً عمل پیرا نظر آتے ہیں؟ بچہ جھوٹ بولنے لگا ہے تو اس کی اس عادت کو چھڑانے کے مار پیٹ کے علاوہ بھی دوسرے طریقے ہو سکتے ہیں بشرطیکہ والدین کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ بچّہ جھوٹ کیوں بول رہا ہے؟ اور یہ طریقے مار پیٹ سے زیادہ موثر اور کامیاب ثابت ہوں گے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ان مختلف اور امکانی وجوہات کا تجزیہ کیا جائے جو بچّہ کو جھوٹ بولنے پر مجبور کرتے یا اکساتے ہیں۔

جھوٹ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ دانستہ جھوٹ اور نادانستہ جھوٹ۔ دانستہ جھوٹ وہ ہے جسے بچّہ اراداتاً بولتا ہے اور جس کے ذریعے وہ کسی کو دھوکا دینے کی کوشش کرتا ہے اور نادانستہ جھوٹ وہ ہے جسے وہ غیر ارادی طور پر بولتا ہے اور اسے اس کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ اس کی اس بات میں جھوٹ کا شائبہ بھی پایا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر کہیں کھونٹی پر ایک نیلی قمیص لٹک رہی ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ ثابت کرنے کی کوشش کرے کہ قمیص کا رنگ سُرخ ہے تو ظاہر ہے کہ ہر سننے والا اس کو جھوٹا کہے گا تاوقتیکہ اس کا ذہن اس بات کی طرف منتقل نہ ہو کہ کہیں یہ شخص رنگندھا تو نہیں ہے۔ اسی طرح اپنے بچّوں کو دروغ گو کہنے سے پہلے والدین کو چاہیئے کہ وہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ بچّے دنیا کو بالکل ان ہی کی طرح کیوں نہیں دیکھتے

ایک بات اور ہی اور وہ یہ کہ بچوں میں یہ اہلیت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے خیالات کو مربوط کر سکیں یا پھر زیادہ واضح اور صاف الفاظ میں یہ کہ ان کی یادداشت اتنی اچھی نہیں ہوتی کہ وہ سابقہ معلومات کی بنا پر مختلف اشیاء میں مطابقت پیدا کر سکیں۔ اب مثلاً ایک دادی اپنے ننھے پوتے کو اپنے پاس بٹھائے پلنگ پر اس کھڑکی کے پاس بیٹھی ہی جو گلی میں کھلتی ہی اور بچے کا دل بہلانے کے لئے اسے رستم کی داستان سنا رہی ہی۔ اسی دوران میں گلی سے ایک کتا بھونکتا ہوا تیزی سے گذرتا ہی جسے بچے نے کل ہی روٹی ڈالی تھی۔ اتفاق سے اس وقت جب گلی میں سے کتا گذرتا ہی بڑی بی بچے کو رستم کی داستان اس جگہ سے سناتی ہوتی ہیں جب کیکاؤس کے قید ہو جانے پر رستم اُسے آزاد کرانے کے لئے ہفت خواں کی راہ سے جاتا ہی اور راستہ میں ایک خوفناک اژدھے سے دوچار ہوتا ہی جو زور سے پھنکارتا ہوا اس کی طرف جھپٹ کر آتا ہی۔ اب اگر بچہ اس کتے کو دیکھ کر اژدھا بتاتا ہی تو یہ جھوٹ نہیں بلکہ اس کی مختصر یادداشت کے پیش نظر قطعاً فطری امر ہی۔

اس دنیا کی طرح جسے بالغ لوگ "حقیقت" کہتے ہیں بچوں کے ذہن میں ایک اور دنیا ہوتی ہی جو افسانوں، کتابوں، اور ریڈیو کے افراد اور اخبارات و رسائل کے مزاحیہ صفحات کے کرداروں سے آباد ہوتی ہی اور جو بچے کے لئے ہماری اس "حقیقی" دنیا کی طرح حقیقی ہوتی ہی۔ اب چونکہ بچہ اصل واقعے اور تخیل کی فریب کاری میں اچھی طرح امتیاز کرنے کا اہل نہیں ہوتا، وہ کسی بھی خیالی اور افسانوی واقعہ کو سن کر یا پڑھ کر اس کی انتہائی جیتی جاگتی تشریح کرے گا اور نتیجہ میں اس کا بیان جھوٹ ثابت ہوگا۔

یہاں اس کا تذکرہ شاید بے موقع نہ ہوگا کہ کسی واقعہ کا بیان بچوں کی طرح کسی بالغ کی زبانی بھی اس کے جذبات و میلانات کے رنگ میں رنگا ہوتا ہی۔ مختلف تجربات نے ثابت کر دیا ہی کہ "روداد بیان کرنے کے آلے" کی حیثیت سے انسانی دماغ عموماً غیر معتبر ہوتا ہی۔ اس کا بہترین ثبوت کسی ایک موضوع پر مختلف شعراء کی طبع آزمائی میں مل سکتا ہی۔

یہ ہو سکتا ہی کہ کسی واقعہ کے اس ایک خاص پہلو پر ایک بچہ زیادہ سے اور نسے بڑھا چڑھا کر

بیان کرے جو ایک بالغ کی نظر میں غیر اہم ہو۔ مثال کے طور پر بچّے کے نزدیک ریل کا انجن نقل و حمل کے لئے معاون نہیں بلکہ ایک کوہ آتش فشاں کی طرح دھواں نکالنے کی چیز ہوسکتی ہو۔ یا ریچھ ایک خونخوار درندہ نہیں بلکہ انسان کی نقل کرنے والا ایک دلچسپ جانور ہوسکتا ہو یا پھر روشنائی الٹ جانے کے حادثے میں اس کے نزدیک اہم بات یہ نہ ہو کہ دوات کا الٹنا غیر معقول حرکت ہو بلکہ یہ کہ روشنائی قالین پر خوبصورت نقش و نگار بناتی ہو۔ موضوع کے کسی خاص پہلو پر زور دینے سے واقعے کی نوعیت ہی بدل جائے گی۔

علاوہ اس کے کہ بچّہ دنیا کو بالکل اسی نقطۂ نظر سے دیکھنے کا اہل نہیں ہوتا جس کی بڑوں میں صلاحیت پائی جاتی ہو، ایک وجہ یہ بھی ہو کہ وہ اپنے محدود ذخیرۂ الفاظ کی مدد سے اپنے تاثرات کو ٹھیک طور پر بیان بھی نہیں کرسکتا۔ کم عمری میں عام طور پر کسی لفظ کے غیر معیّن معنے ہوتے ہیں۔ بچے کے نزدیک میں میں "صرف بکری" ہی نہیں بلکہ ہر چار پیر کے جانور کا نام ہوسکتا ہو جو ہر گز درست نہیں۔ لیکن کیا اس وقت جب ایک گائے کو آتا دیکھ کر بچّہ یہ کہتا ہو کہ "میں میں آرہی ہو" ہم اسے جھوٹا کہیں گے؟ اس قسم کا کوئی حکم لگانے سے قبل ہمیں اس کی کوتاہیوں پر بھی نظر رکھنی چاہیئے۔ ایک بچّہ اپنے "تاثرات کا اظہار کرنے کے لئے پورا واقعہ بیان کرنے کی بجائے ایک لفظ کو بھی استعمال کرسکتا ہو۔ مثال کے لئے وہ بچّہ جس نے ایک چینی کا برتن توڑا ہو یہ دریافت کرنے پر کہ "کیا وہ برتن تم نے توڑا ہو؟" "نہیں" جواب دیتا ہو۔ یہاں اس قصوروار بچّے کی "نہیں" کا مطلب یہ نہیں ہو کہ "وہ برتن میں نے نہیں توڑا" بلکہ اس کی اس "نہیں" کے یہ معنی ہیں کہ "مجھے مت مارو۔"

ولیم اسٹرن کے اپنی کتاب "اوائل طفلی کے نفسیات" میں لکھنے کے مطابق "صریح جھوٹ کی تعداد کثیر کا ماخذ دراصل یہ امر واقعہ ہو کہ گفتگو کی ان اصطلاحات کو جنھیں ہم اقرار یا انکار کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں اکثر بچہ صرف اپنی جذباتی کیفیت کے اظہار کے لئے استعمال کرتا ہو اور اس طرح وہ بات جس سے بچّے کا مقصود محض ایک خواہش کا اظہار تھا ایک ادّعا معلوم ہونے لگتی ہو اور وہ بات جو اس نے صرف مدافعت کے طور پر کہی تھی انکار معلوم ہونے لگتی ہو۔"

اس سے قبل کہ وہ الفاظ کے ذریعہ اپنا مافی الضمیر بیان کرسکے ایک شیرخوار بچے کے محض رونے پر جھوٹ بولنے کا گمان کیا جاسکتا ہو۔ ایک بالغ و پختہ عمر انسان کے نزدیک رونے کے معنے ہیں کہ مجھے

تکلیف ہو" لیکن ایک بچہ جب روتا ہو تو اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہو کہ "میں رفاقت چاہتا ہوں" یہاں بچے کا مقصد کسی دغا یا فریب سے نہیں ہو، یہ صرف منطقی اختلاف رائے ہو۔

بچے کے غیر ارادی طور پر جھوٹ بولنے کی ایک وجہ اور بھی ہو۔ تجربے کی کمی اور کمزور قوت استدلال کی وجہ سے قیاسات سے اثر پذیر ہو جاتا ہو۔ اس کو بڑی جلدی یہ باور کرایا جا سکتا ہو کہ مکان کے صحن میں پڑی ہوئی وہ چیز جسے اس نے رسی خیال کیا تھا در اصل سانپ ہو یا دیواروں پر حرکت کرتے ہوئے انسانی سایے وہ خوفناک چڑیلیں ہیں جو گرمیوں کی سنسان دوپہر میں گھوما کرتی ہیں یا وہ بندر جو مکان کی دیوار پر بیٹھا ہوا ہو ایک زمانہ میں ہماری ہی طرح ایک انسان تھا اور پلنگ پر نماز پڑھنے کی وجہ سے بندر ہو گیا۔ یا پھر یہ کہ کوئی بچہ کسی سنی ہوئی جن یا پری کی کہانی کو اپنے ساتھیوں کے آگے سچی کہہ کر دہرائے اور اس کے ساتھی جن میں تنقیدی صلاحیت نہیں پائی جاتی اس ذہنی پیداوار کو حقیقت کے طور پر قبول کرلیں۔ یہ بات ہر شخص جانتا ہو کہ ایک بچہ ایک عقلمند آدمی کی بہ نسبت ایک بیوقوف سے زیادہ آسانی سے اثر پذیر ہو جاتا ہو اگر بیوقوف آدمی اس سے زیادہ گھل مل کر باتیں کرتا ہو۔

لہذا ایک بچے کے نادانستہ جھوٹ بولنے کی وجوہات ہو سکتی ہیں کہ وہ کسی چیز کو واضح طور پر محسوس نہیں کر سکتا، اس کو ٹھیک طور پر بیان نہیں کر سکتا یا اس پر دانشمندانہ تنقید نہیں کر سکتا۔ اس قسم کے جھوٹ پر اسے مارنا کہاں تک جائز اور درست ہو؟ والدین کا اپنے بچوں سے ایسا سلوک ایک بے رحمانہ فعل ہو۔ اس سے بھی برا یہ ہو کہ یہ سرزنش بچہ کو جھوٹ کے معنی بتلائے گی اور اس کی زبان کو جواب تک معصوم ہو گمراہ کر دے گی۔ ہو سکتا ہو کہ ایک بچہ جھوٹ کے معنی اس وقت تک نہ سمجھتا ہو جب تک کہ اس کے والدین اسے جھوٹ بولنے کا الزام نہ دیں اور اس کا مقصد اس کے ذہن نشین نہ کر دیں۔

خیر یہ تو رہے وہ نادانستہ جھوٹ جنھیں بچہ محسوس کئے بغیر غیر ارادی طور پر بولتا ہو لیکن ان دانستہ جھوٹ کو کیا کیا جائے جب بچہ عمداً دھوکا دینے کی کوشش کر رہا ہو؟ کیا اس قسم کے جھوٹ کا علاج زد و کوب کے علاوہ کچھ اور نہیں ہو؟

بچوں کے جھوٹ بولنے کی سب سے زیادہ عمومی وجہ خوف ہی اور یہ خوف عام طور پر سزا کا ہوتا ہی۔ مدافعت کا بہت ہی قدیم ذریعہ فریب ہی۔ غاروں میں رہنے والے لوگ مخاصمانہ دنیا میں رہتے تھے اور ہر طرف سے دشمنوں سے گھرے ہوتے تھے۔ جانوروں کو تو پھندوں میں پھانسا جاتا تھا اور انسانی دشمنوں کو دغا و فریب اور چالبازی کے ذریعہ بے وقوف بنانے کی ضرورت تھی۔ دھوکا اور مکاری غاروں میں بسنے والے انسان کی زندگی برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہتھیار تھے۔ لیکن بچہ تو کسی مخاصمانہ دنیا میں نہیں رہتا۔ اس کے والدین اور اتالیق اس کے دوست ہوتے ہیں جو اس کی بہبودی کے دل سے خواہاں ہوتے ہیں۔ بچہ کا گھر اس کے لئے ایک جائے پناہ کی مانند ہونا چاہیئے جہاں اس کے اردگرد ایسے لوگ رہتے ہوں جو اس کی مشکلات کو سمجھیں، اس سے ہمدردی رکھیں اور ہر وقت اس کی اعانت کے لئے تیار رہیں۔ ان حالات میں بچہ کو قصداً جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ لیکن جب وہ اپنے آپ کو محفوظ خیال نہیں کرتا، جب وہ یہ نہیں سمجھتا کہ اسے سزا کیوں دی جارہی ہی اور جب اس کی حرکات پر بظاہر غیر معقول پابندیاں عائد کردی جاتی ہیں تو صرف اس وقت بچے کو اپنی دنیا مخاصمانہ دکھائی دیتی ہی اور دھوکا ہی مدافعت کا مناسب و موزوں طریقہ معلوم ہوتا ہی۔

اس قسم کے جھوٹ کا کیا علاج ہی؟ صرف یہی کہ بچے کے لئے ایسا ماحول پیدا کیا جائے جو زیادہ ہمدردانہ اور ساتھ ہی ساتھ زیادہ مستحکم بھی ہو۔ پھر خود بخود دیکھ لیجئے گا کہ اس کے کردار میں کتنی نمایاں اصلاح ہوتی ہی اور کیسے مفید نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ بچہ کو اگر ایک رازدار مل گیا جس پر اسے پورا پورا اعتماد ہو تو وہ اپنی تمام حرکات کی روداد بے کم وکاست بیان کردے گا۔ جب اسے اپنے بزرگوں کی طرف سے دانشمندانہ اور منصفانہ سلوک کا یقین ہوجائے گا تو وہ اپنے برے افعال کا بھی بلا پس و پیش اقبال کرے گا اور اس سزا کی، جو اسے دی جاتی ہی، وجہ معلوم کرنے کی کوشش کرے گا۔

لیکن سزا کی وجہ اچھی طرح سمجھ جانے کے باوجود بھی بچہ سزا سے ڈرتا ہی۔ اگر اس کے نزدیک اس بات کا امکان ہی کہ جھوٹ بول کر وہ سزا سے بچ سکے گا تو قدرتی طور پر وہ جھوٹ بول کر ایذا اور تکلیف سے بچنے کی کوشش کرے گا۔ سمجھدار والدین یقیناً اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آیا ان کا بچہ سچ بول

رہا ہی یا جھوٹ۔ جب کسی بری حرکت پر چاہی جھوٹ بولا جائے یا نہ بولا جائے، سزا ضروری جاتی ہی، تو پھر جھوٹ بولنا بیکار ہو جاتا ہی۔

ایک عقلمند ماں نے مجھے بتایا:۔

"میرا چھوٹا بچہ کبھی کبھی اس وقت گپ لگانے کی کوشش کرتا جب کوئی ایسی حرکت کرتا جس کے لئے میں نے اسے خاص طور پر منع کر دیا ہو۔ جب میں اس کے اس طرح ہکلا ہکلا کر جھوٹ بولنے پر ہنس پڑتی تو وہ کھسیانی ہنسی ہنستا اور اپنے قصور کا اعتراف کر لیتا۔ میں اسے کبھی کوئی سخت سزا نہ دیتی بلکہ عام طور سے ایسا کرتی کہ یا تو اس کے ہاتھ پر آہستہ سے ایک تھپڑ مار دیا یا ایک گھنٹہ یا اس سے کچھ زائد وقت تک کے لئے اس سے بات چیت بند کر دی۔ ابھی اس کی عمر چار سال کی بھی نہ ہوئی تھی کہ اس کی یہ عادت ہو گئی کہ جب وہ کوئی خراب کام کرتا تو میرے پاس روتا ہوا بھاگ کر آتا اور کہتا کہ "اماں، مجھ سے ایک قصور ہو گیا۔" اور سزا کے لئے اپنا ہاتھ فوراً سامنے بڑھا دیتا۔ ایک مرتبہ میں نے اسے خود اپنے ہاتھ پر تھپڑ مارتے اور یہ بڑبڑاتے سنا "بری بات۔ بری بات۔"

اس ماں کی یہ بڑی عقلمندی ہی کہ وہ جھوٹ کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دیتی۔ وہ اسے بچے کے دماغ میں پیوست نہیں کر دیتی۔ وہ یا تو اس کی اہمیت کو کم کر کے بچے کے ذہن کو اس طرف سے ہٹانے کی کوشش کرتی ہی یا اسے بالکل نظر انداز کر جاتی ہی۔ وہ بچے کو ترغیب دلاتی ہی کہ وہ خود اپنی اصلاح کرے اور جھوٹ بولنا کیسا احمقانہ فعل ہی اس کا خود اندازہ لگائے۔

دوسری بات جو بچوں کو جھوٹ بولنے پر آمادہ کرتی ہی یہ ہی کہ بعض حالات کے پیش نظر ان میں جو احساس کمتری پیدا ہو جاتا ہی اس کی تلافی کرنے کے لئے انھیں جھوٹ کے دامن میں پناہ لینی پڑتی ہی یا پھر یہ کہ اپنی زندگی میں وہ زیادہ شہرت اور وقار کے خواہاں ہوتے ہیں اور اس کے لئے وہ جھوٹ کا آسرا لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ بچوں کے نفسیات کے بعض ماہرین بچے کی اس قسم کی اکثر و بیشتر گفتگو کو اس بات پر محمول کرتے ہیں کہ وہ اپنی متزلزل خودی کو استوار کرنا چاہتا ہی اور اس کی یہ کوشش ہوتی ہی کہ لوگ اسے دیکھیں اور اس کی طرف متوجہ ہوں۔

"میرے ابا کے پاس ایک کروڑ روپیہ ہی، یہ اس سے بہت زیادہ ہی جو تمہارے والد کے پاس ہی" یا "میں ہوائی جہاز میں بیٹھ کر سینکڑوں بار اڑا ہوں اور میں شرط لگاتا ہوں کہ تمہیں ایسا موقع کبھی نصیب نہیں ہوا" یہ اور اسی طرح کے بیسیوں جملوں کا مفہوم یہ ہوتا ہی کہ بچہ اپنے ساتھی پر اپنی برتری جتائے۔ بالفاظ دیگر وہ صاف الفاظ میں کہنا چاہتا ہی کہ "تم مجھ سے بہت سی باتوں میں بہتر ہو لیکن میں کسی نہ کسی چیز میں تم سے ضرور بڑھ جاؤں گا، چاہے مجھے اس کے لئے جھوٹ ہی کیوں نہ بولنا پڑے۔"

ہر بنی نوع انسان میں، چاہے وہ جوان ہو یا ضعیف، کسی قسم کا احساس کمتری ضرور پایا جاتا ہی۔ یہ دوسری بات ہی کہ وہ اس کا اعتراف نہ کرے۔ اس قسم کے احساس کا پیدا ہوجانا تقریباً ناگزیر سا ہی کیونکہ ایسی بہت سی خواہشات ہوتی ہیں جن کی تکمیل نہیں کی جاسکتی، کتنی ہی تمنائیں اور آرزوئیں ہوتی ہیں جو حالات کی نامساعدتیوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہوجاتی ہیں اور کتنی ہی ایسی جسمانی تکالیف ہوتی ہیں جن سے گریز ممکن نہیں ہوتا لیکن ہوشیار انسان اس عدم تکمیل کو گوارا کرلیتے ہیں اور اس احساس کو غیر اہم بنا دیتے ہیں۔ وہ تسلیم کرلیتے ہیں کہ ان کی ہستیاں اس زبردست کائنات میں حقیر ذرات کی مانند ہیں اور یہ کہ خود ان ہی کی جنس میں بہت سے ایسے ہیں جو ان سے کہیں زیادہ طاقتور اور حسین ہیں۔ وہ ان سب باتوں کو تسلیم کرلیتے ہیں ——— اور پھر بھی، حقیقی انکسار کے ساتھ، اپنی اپنی معمولی خدمات کی انجام دہی میں مسرت حاصل کرتے ہیں۔

بچہ جس کے دل میں اپنے آپ کو ماحول کے مطابق بنانے اور چیزوں سے واقف ہونے کی تمنا ایک پختہ عمر انسان سے کہیں زیادہ ہوتی ہی۔ اس بات کو شدت سے محسوس کرتا ہی کہ ذہنی اور جسمانی امداد کے لئے اسے دوسروں کا دست نگر ہونا پڑتا ہی۔ اب اگر اس کے والدین اور اساتذہ اپنی فطری کمزوریوں سے نہ تو خائف ہوتے ہیں نہ شرمندگی محسوس کرتے ہیں تو بچے میں خود بخود اس قسم کی جرأت پیدا ہوجائیگی اور وہ اپنی کمتری کی اذیت ذرہ برابر محسوس نہ کرے گا۔ بلکہ اس سے مردانہ وار مقابلے کے لئے تیار ہوگا۔ ایسے بچے کو اپنی خودداری کو سہارا دینے کے لئے جھوٹ کی حاجت نہیں ہوتی۔

بچے جھوٹ کی ایک اور قسم کا استعمال اس لئے کرتے ہیں کہ کسی ناگوار شے سے پہلوتہی کرسکیں۔

ایک بچے کے سامنے جب ایسا کھانا آتا ہے جسے وہ پسند نہیں کرتا تو وہ اپنے پیٹ کے درد کا بہانہ کر دیتا ہے۔ اگر بچے سے پے بہ پے ایسے سوالات کئے جائیں جنھیں وہ پسند نہیں کرتا تو ان سے جان چھڑانے کے لئے وہ فوراً ایسا جواب دے گا جو سوال کرنے والے کے ذہن میں ہے ـــــ خواہ یہ جواب حقیقت سے بعید ہی کیوں نہ ہو۔ یہاں بھی بچے کی مشکلات کو ہمدردانہ طور پر سمجھنے کا اقتضا یہ ہے کہ اسے جھوٹ پر سزا نہ دی جائے بلکہ اس ناگواری کو کم کیا جائے جس کی وجہ سے وہ جھوٹ بولنے پر مجبور ہوا۔

اگر کوئی بچہ پیٹ کے درد کا اس لئے بہانہ کرتا ہے کہ وہ اس خوراک کو کھانے کی تکلیف سے بچ جائے جسے وہ کھانا نہیں چاہتا تو ظاہر ہے کہ وہ جھوٹ صرف اس لئے بول رہا ہے کہ اس مشکل سے بچنے کی اسے دوسری کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اس کے والدین کو چاہیئے کہ بچے کی پریشانی رفع کرنے کے لئے یہ معلوم کریں کہ بچہ اس مخصوص کھانے کو کیوں پسند نہیں کرتا۔ اس طور پر وہ جھوٹ کی ضرورت کو موقوف کرکے جھوٹ کا انسداد کر سکیں گے۔

بچوں کے جھوٹ بولنے کی آخری وجہ مثال یا نظیر ہے۔ مُسن لوگ بکثرت جھوٹ بولتے ہیں اور بسا اوقات محض غیر ارادی طور پر۔ ایسے جھوٹ بعض اوقات بہت ہی معمولی اور ناقابلِ اعتبار ہوتے ہیں۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان میں حقیقت سے واضح انحراف پایا جاتا ہے۔ جب کوئی ایسا شخص جس سے ہم ملنا نہیں چاہتے ہمارے مکان پر آتا ہے تو ہم اپنے یہاں کے کسی بچے سے کہلا دیتے ہیں کہ "باہر گئے ہوئے ہیں" حالانکہ اس وقت ہم گھر میں موجود ہوتے ہیں۔ یا جب کوئی شخص ہم سے کوئی ایسی چیز عاریتاً مانگنے آتا ہے جسے ہم، اس خیال سے کہ بداحتیاطی سے خراب ہو جائے گی، نہیں دینا چاہتے تو کہہ دیتے ہیں کہ "وہ تو کوئی اور صاحب لے گئے ہیں" حالانکہ یہ بات بچے کے علم میں ہوتی ہے کہ وہ چیز گھر پر موجود ہے۔ اور اسی قسم کے متعدد معمولی معمولی جھوٹ ہیں جو روزانہ زندگی میں بار بار بولے جاتے ہیں۔

بڑے آدمی صرف آپس ہی میں ایک دوسرے سے جھوٹ نہیں بولتے بلکہ بچوں سے بھی بولتے ہیں۔ اپنے بزرگوں کے منہ سے بچے اس قسم کے جھوٹ سنتے ہیں جو

چندا ماموں دور کے بڑے پکائیں بور کے
آپ کھائیں تھالی میں ہمیں دیویں پیالی میں

کے دلکش فریبوں سے لے کر اس قسم کے غیر تکمیل شدہ وعدوں پر ختم ہوتے ہیں کہ "اگر تم نے کوئی شرارت نہ کی تو ہم تمھیں چار آنے دیں گے"۔ اب بچہ اپنے دل میں ضرور یہ خیال کرے گا کہ سچائی کبھی ایسی مقدس اور نیک چیز نہیں ہو سکتی جبکہ خود میرے والدین جھوٹ بولتے ہیں اور اکثر داستانوں کے سورما بھی چال اور فریب کو کام میں لاتے ہیں۔

اس بات کی بڑی ضرورت ہے کہ بچہ اپنے بزرگوں کی طرف سے بدگمان نہ ہونے پائے۔ بچہ اکثر و بیشتر باتیں تقلید کے ذریعے سیکھتا ہے۔ اس لئے اس بات کی احتیاط رکھنا بہت ضروری ہے کہ ہم اس کے سامنے صرف اپنی خوبیوں ہی کو ظاہر کریں اور اچھے سے اچھا قابل تقلید نمونہ پیش کرنے کی کوشش کریں۔

اگر کوئی بچہ جھوٹ بولتا ہے تو سب سے پہلے اس کے جھوٹ بولنے کی ذمہ داری اس کے والدین پر عائد ہوتی ہے۔ بچے کی جھوٹ بولنے کی عادت چھڑانے کے لئے والدین کی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ علاج کی بجائے انسدادی تدابیر اختیار کریں۔ اس کی نوبت ہی نہ آنے دی جائے کہ بچہ جھوٹ بولے۔ اگر بچہ کو یہ یقین ہو جائے کہ اس کے والدین معاملہ فہمی سے کام لیں گے اور اس کی زندگی کو بالغوں کی دنیا کے اصولوں کے مطابق بنانے میں اس کی مدد کریں گے تو اس کے لئے جھوٹ کا کوئی مصرف نہ رہے گا۔

بچوں کے جھوٹ بولنے کی ہر ممکن وجہ کا تجزیہ کر لینے کے بعد اب آپ خود فیصلہ کیجئے کہ کیا اس مکروہ عادت سے چھڑانے کا بہترین ذریعہ زدو کوب ہی ہے؟

(ترجمہ) اصغر علی سکندر آبادی

جمہوریت کا مستقبل

سیاسی مسائل کے متعلق پیشگوئی کرنا گو دلچسپی سے خالی نہیں لیکن غیر سائنٹفک ضرور ہی۔ گزرے واقعات پر تبصرہ کرنا اس قدر مشکل نہیں ہی جس قدر مستقبل کے بارے میں رائے زنی کرنا۔ قابلِ تحسین تاریخی تجزیہ وہ ہی جو واقعات کے رونما ہونے سے پہلے کیا جائے۔ اور جس کی صداقت کا ثبوت آنے والے واقعات خود بہم پہنچا دیں۔

تاریخ کا سائنٹفک مطالعہ ہر حالت میں مفید ہی یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہی کہ اکثر و بیشتر مستقبل کے بارے میں خیال آرائیاں کمزور بنیادوں پر قائم ہوتی ہیں لیکن اگر واقعاتِ ماضی کا مطالعہ کیا جائے اور یہ تصور کر لیا جائے کہ انسانی خواص تاریخ کے ہر دور میں یکساں ہوں گے تو ہم آنے والے واقعات کا ایک صحیح نقشہ اپنے ذہن میں کھینچ سکتے ہیں۔

جب ایک مورّخ جمہوریت کے مستقبل کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہی تو اُسے دو پیچیدہ سوالوں کا جواب تلاش کرنا پڑتا ہی۔

(۱) کیا جمہوریت پسند ممالک ان ملکوں کو جہاں آمریت کا طوطی بولتا ہی فتح کر کے وہاں کا نظام یکسر بدل دیں گے۔

(۲) کیا آمریت کے زہر آلود اثرات باقی ماندہ جمہوری ملکوں میں بھی پھیل جائیں گے۔

قبل اس کے کہ ان سوالات کا تشفی بخش جواب دیا جائے۔ ان بالکل حسبِ ذیل تصریحی بیانات کا تجزیہ کر لینا چاہیے جو غالباً مستقبل پر بھی روشنی ڈال سکتے ہیں۔

(۱) جو آمریت اس وقت سرزمین یورپ پر مسلط ہی یا دنیا کے دیگر ممالک میں فروغ پا گئی ہی وہ ایسے ممالک میں ہی جہاں یا تو جمہوریت نے جنم ہی نہیں لیا اور اگر لیا بھی تو اپنا قدم نہ جما سکی اس لئے ہم یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ آمریت نے جمہوریت پر غلبہ پا لیا ہی جو کچھ اس نے حاصل کیا ہی وہ

ایک انقلابی نظام ہی جس کی بنیادیں متزلزل اور فانی ہیں۔

(۲) آمریت کو خوشحال اور مطمئن ملکوں کے باشندے کبھی نہیں سراہتے۔ اگر ہم جرمنی۔ اٹلی۔ روس اور جاپان کی معاشی تاریخ پیش نظر رکھیں تو یہ امر بخوبی عیاں ہوجاتا ہی کہ غربت و افلاس اور ذلت کے احساس ہی نے ان ملکوں میں آمریت کا بیج بو دیا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہئے کہ تمام جمہوری ممالک خوشحال ہیں اور آمریت پسند ممالک غربت کے آہنی پنجوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ ایک اہم حقیقت ہی کہ اگر کوئی ملک معاشی نقطۂ نگاہ سے آزاد ہوتا ہی تو وہاں آمریت نہیں پھیلتی۔

(۳) یہ بھی سچ ہی کہ اس وقت جو ممالک آمریت کے دلدادہ ہیں ان میں آمریت کا جذبہ جنگ عظیم کے بعد پیدا ہوا۔ روس اور ہنگری میں آمریت کا دیوتا جنگ کے اختتام پر ظہور میں آیا۔ لیکن اٹلی اور جرمنی میں کچھ دنوں کے بعد۔ آمریت کی پیدائش کے اسباب دونوں صورتوں میں ایک ہی ہیں۔ یہاں بھی ہمیں یہ اخذ نہیں کرنا چاہیئے کہ یہ جنگ کے بعد محارب ممالک آمری نظام قبول کرلیتے ہیں۔ یا آمریت کا ظہور بغیر بین الاقوامی مناقشات کے ناممکن ہی۔ دورانِ جنگ میں اطاعت کے قبول سے جو جذبہ پیدا ہوجاتا ہی وہ آمریت کے قائم کرنے میں بہت مفید ثابت ہوتا ہی اور یہی وجہ ہی کہ آمریت کا تخیلِ آزادی محدود اور تاریک ہی۔

(۴) جمہوریت اس وقت ان ملکوں میں فروغ پارہی ہی جنھوں نے جنگ عظیم کے بعد فتح و نصرت کے شادیانے بجائے یا دورانِ جنگ میں غیر جانبدار رہی۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیئے کہ ہر فاتح یا غیر جانبدار ملک میں جمہوری نظام قائم ہوگیا۔ اٹلی۔ جاپان اور اسپین میں آمریت پائی جاتی ہی حالانکہ اٹلی اور جاپان جنگ عظیم میں فاتح قوموں کے ساتھ تھے اور اسپین غیر جانبدار تھا۔ یہ بھی ایک دلچسپ بات ہی کہ موجودہ جنگ سے پہلے جمہوریت فرانس۔ بلجیم۔ برطانیہ عظمیٰ۔ ممالک متحدہ۔ ہالینڈ اور سوئٹزرلینڈ میں قائم تھی اور اس فہرست میں شکست خوردہ ملک ایک بھی نہیں۔

(۵) ایک اور بات بھی قابلِ غور ہی۔ ان ممالک میں جہاں آمری نظام قائم ہی وہ مقروض قومیں ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہی کہ جمہوری لبادہ اوڑھ لینے سے کوئی قوم مقروض کے بجائے قرض خواہ ہوجائے گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آمری ملک کا شمار نادار ملکوں میں ہوتا ہی۔

آیئے اس بحث کی روشنی میں ہم آمریت کا مستقبل تلاش کریں۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہی کہ موجودہ ڈکٹیٹروں کے حق میں چند واقعات ایسے ظہور پذیر ہوئے جن سے انھوں نے پورے پورے فائدے اٹھائے۔ سب سے اہم حقیقت یہ ہی کہ فوجی طاقت پر ان کا مکمل تسلط قائم ہی۔ اس صنعتی دور میں جبکہ وسائل آمد و رفت بہت وسیع ہوگئے ہیں سیاسی شورش کا ہونا تقریباً ناممکن ہی جس وقت تک ایک ڈکٹیٹر کو اس بات کا پورا پورا الیقین نہ ہوجائے کہ اس کی قوم اس کے اشاروں پر چلنے کے لئے تیار ہی اس کا فضائی اور بحری بیڑہ اس کا معاون ہی اور پولیس پر اس کا اقتدار قائم ہی اس وقت تک اس کی اندرونی پوزیشن مضبوط نہیں۔ یورپ کے ڈکٹیٹروں کی دلی خواہش ہمیشہ سے یہی رہی کہ وہ اپنی قوم کو مطیع اور فرمانبردار بنالیں اور اس سعی پیہم میں وہ ایک حد تک کامیاب بھی ہوگئے۔ وہ فوجی افسروں کی خوشی اور اطاعت کو نقد انعامات میڈل اور مزید ترقی کی لالچ دے کر خریدتے رہی۔

دوسرا کامیاب حربہ جو ڈکٹیٹروں کے پاس ہی وہ یہ ہی کہ وہ ان تمام وسائل کو جس سے پبلک کے خیالات کو متاثر کیا جاتا ہی اپنے بس میں کرلیتے ہیں۔ ملک کے گوشہ گوشہ میں ایسے خیالات پھیلائے جاتے ہیں جن سے متاثر ہوکر عام لوگ ڈکٹیٹروں کے فدائی بن جاتے ہیں۔ رائے عامہ کو ریڈیو اخبارات اور متحرک تصویروں کے ذریعہ ڈکٹیٹروں کے حق میں کرلیا جاتا ہی۔ نظامِ تعلیم کا بنیادی اصول بھی یہی رکھا گیا ہی۔ چھوٹے مدرسوں سے لے کر اعلیٰ تعلیم گاہوں میں ایک ہی راگ گایا جاتا ہی۔ پبلک کی تنقیدی حس مردہ کردی جاتی ہی۔ ہر طرف یہ احساس پھیلایا جاتا ہی کہ جو کچھ کیا جارہا ہی اس کا مقصد صرف قومی مفاد ہی اور ذاتی غرض کا عنصر بالکل مفقود ہی۔ اس کوشش میں وہ پوری طرح کامیاب بھی ہوگئے۔ اٹلی اور جرمنی میں پروپیگنڈا کا فوری اثر یہ ہوا ہی کہ عموماً لوگوں میں مصنوعی طور پر قوت

اور اتحاد کا جذبہ پیدا ہو گیا۔
تیسری چیز جس نے ڈکٹیٹروں کی شہرت کو ترقی دی وہ ان کا ذاتی کیریکٹر ہی۔ وہ ہر کام کو محنت اور جانفشانی سے کرتے ہیں اور ان کے پیش نظر صرف ایک ہی مقصد ہوتا ہی ——— قوم کا مفاد ——— انھوں نے رقص و سرود اور تعیش سے جو یورپ کی تہذیب کا ایک جزو لاینفک بن گیا تھا گریز کیا۔ ہٹلر اور مسولینی کا احترام ان کے اہل ملک صرف اسی وجہ سے نہیں کرتے کہ ان کے کارنامے بہت بلند پایہ ہیں اور وہ ملک و قوم کے لئے رہبر اعظم ہیں بلکہ اس لئے بھی کرتے ہیں کہ ان ڈکٹیٹروں میں وہ عمدہ صفات بھی موجود ہیں جن کا ذکر سطورِ بالا میں کیا گیا ہی۔ گو ان ڈکٹیٹروں کو وہ مقبولیت حاصل نہیں ہو سکی جس کے لئے وہ مدت سے کوشاں تھے۔ پھر بھی ان کی ذاتی ان تھک مساعی اور ان کے جذبۂ قومی نے ان کی قوم میں ایک روح پھونک دی اور اس میں شخصیت پرستی کا جذبہ پیدا کر دیا۔ ان کا یہ کارنامہ قابلِ قدر ضرور ہی۔

لیکن ان کی کامیابی قدر و منزلت اور ہر دلعزیزی کا سب سے بڑا راز ان کی متواتر ملکی فتوحات میں مضمر تھا۔ ان کی خارجی اور داخلی پالیسی ابتدا میں نہایت کامیاب رہی گو ان ڈکٹیٹروں نے اپنے حصولِ مقصد کے لئے نہایت وحشیانہ طریقے اختیار کئے اور کمزور ہمسایہ قوموں کو اپنی بے پناہ فوجی قوت کے "سایہ عاطفت" میں لے لیا لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ آمریت پسند مدبر ایک عمدہ نظام قائم کر دینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ انھوں نے مسئلہ بیکاری کو جو جمہوری ممالک باوجود انتہائی کوشش کے حل نہ کر سکے تھے ان ڈکٹیٹروں نے عملی طور سے اپنے ملک میں حل کر لیا تھا انھوں نے اپنے افرادِ قوم میں ملی بیداری پیدا کر دی۔ اٹلی ۱۹۲۲ء سے قبل اور جرمنی ۱۹۳۳ء سے قبل مردہ اور تیسرے درجہ کی طاقتیں تھیں۔ لیکن آج ان کا شمار دنیا کی بڑی طاقتوں میں ہوتا ہی اور ان کے ظلم اور استبداد سے یورپ تھرا رہا ہی۔ بات تو یہ ہی کہ جس قوم میں جذبۂ ملی اور سیاسی بیداری پیدا ہو جاتی ہی وہ بام ترقی پر آناً فاناً میں پہنچ جاتی ہی۔
اٹلی اور جرمنی نے یہ طاقت بڑی قربانیوں کے بعد حاصل کی۔ ان ممالک کا معیارِ زندگی بہت

گر گیا ہی۔ لیکن اس کے باوجود تمام سماجی انتشار اور اندرونی بےچینی عرصے تک کم رہی۔ انھوں نے اپنی صنعتی پیداوار کو اس قدر بڑھا لیا تھا کہ معاشی ناکہ بندی کا ان پر شروع میں کوئی اثر نہیں ہوا۔ اور اسی صورت سے یہ ملک دورانِ جنگ میں بغیر خارجی مدد کے اتنے عرصے تک جنگ کر سکے۔

خارجی پالیسی کے میدان میں ڈکٹیٹروں کا پلہ ابتدا میں بھاری رہا۔ ہٹلر نے اپنی انتقامی اور جارحانہ پالیسی سے یورپ کی بیشتر قوتوں کو سرنگوں کر دیا۔ اس چار سال کے مختصر عرصہ میں پولینڈ۔ ہالینڈ۔ بلجیم۔ فرانس اور یونان جیسی طاقتوں کو کچل کر رکھ دیا۔ اور اب روس سے برسرِ آزمائی ہی۔ امید ہی نپولین کی طرح ہٹلر بھی اسی مشرقی محاذ پر شکست کی ہزیمت اٹھائے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اٹلی اور جرمنی کے سیاسی کارنامے خارجی اور داخلی میدان میں بہت عظیم الشان رہی۔ یہ دوسری بات ہی کہ ان کے کارنامے عالیہ تہذیب پر بدنما داغ ہیں۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے کارنامے جس قدر فوجی ہیں اسی قدر کمزور بھی۔

ہر آمریت پسند ملک کے مستقبل کا انحصار زیادہ تر اس کے باشندوں کے اطمینان اور بےچینی کے توازن پر ہوتا ہی۔ اگر جوانوں کا طبقہ آمریت کے اصولوں پر کاربند ہوگا تو وہاں انقلابی بےچینی کبھی نہیں ہو سکتی۔ آمریت پسند ممالک کے سامنے اس وقت کوئی اور دوسرا سیاسی نظام نہیں ہی۔ آمریت کا بھوت ان پر اس قدر غالب آگیا ہی کہ ان کا سیاسی زاویہ نگاہ بھی محدود ہو گیا ہی۔ اکثر لوگوں کا خیال ہی کہ آمریت کے مظالم سے تنگ آکر عام لوگ علم بغاوت بلند کرینگے۔ لیکن یہاں پر اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہی کہ وہاں کے باشندوں کی عملی قوت کو آہنی قوانین میں محصور کر دیا جاتا ہی۔ پھر بھی اب بےچینی کے آثار نمایاں ہیں۔

ایک چیز جو ہمارے اس عقیدہ کو کہ آمریت کا مستقبل شاندار نہیں ہی مضبوط کرتی ہی وہ یہ ہی کہ اس طرزِ حکومت میں شخصیت کو بہت دخل ہی۔ لیڈر پرستی کا اصول اسی وجہ سے مذموم قرار دیا جاتا ہی کہ اس کے مرنے کے بعد اس کی جگہ مشکل سی پر ہوتی ہی۔ جب تک ایک لیڈر زندہ ہی وہ اپنے حریفوں کو ترقی کرنے نہیں دیتا۔ آمری نظام میں لیڈر کی شخصیت تمام نظام کی روح ہوتی ہی اور اس کی ذات سے اس نظام کو زبردست تقویت حاصل ہوتی ہی۔ جمہوری ممالک میں شخصیت کو زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہی اس کی وجہ یہ ہی کہ جمہوری نظام چند اصولوں پر قائم ہوتا ہی جن کا تعلق کسی خاص فرد سے نہیں ہوتا۔ ان اصولوں

جو کوئی بھی کاربند ہوتا ہی وہ جمہوری نظام کو بدرجہ احسن چلا سکتا ہی۔ موجودہ آمر کبھی لقمہ اجل ضرور بنیں گے۔ ایسی صورت میں جو شخص آمریت کے مستقبل کے بارے میں غور کرنا چاہتا ہی اس کو یہ بھی سوچنا پڑتا ہی کہ ان آمروں کی موت کے بعد کس قسم کے واقعات رونما ہوں گے۔ کیا ان کے جانشین بھی ایسے ہی طاقتور ہونگے کیا وہ اپنے ذاتی کیرکٹر سے پبلک کو اپنے پیش رو کی طرح موہ لیں گے ؟ کیا ان کی قومی پالیسی کو اسی گرمجوشی سے سراہا جائے گا۔ یہ پیچیدہ استفسارات قابل غور ہیں۔

تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ آمریت کا قائم کرنا تو آسان ہوتا ہی لیکن اس کا موروثی بنانا مشکل ہی۔ آمروں کے اکثر جانشین ناکارہ ثابت ہوتے ہیں اور پھر یکایک آمری نظام کمزور ہوجاتا ہی۔ جو کچھ پیش کیا گیا ہی اس کا خلاصہ حسب ذیل ہی:۔

(۱) اٹلی اور جرمنی کی آمریت مضبوط بنیادوں پر قائم ہی اور کثرت سے لوگ اس کے موافق ہیں اور اس وقت تک قائم رہی گی جب تک کہ (ا) اس کی معاشی بنیادیں مضبوط ہیں۔ (ب) اس کا وقار اور دبدبہ قائم ہی (ج) وہ موجودہ جنگ میں شکست کی ہزیمت نہیں اٹھاتی (د) وہاں کے باشندے باوجود تکالیف کے علم بغاوت بلند نہیں کرتے۔ (ر) ان کے لیڈروں کی کیرکٹر کی مضبوطی قائم ہی۔

آیئے اب جمہوریت کے مستقبل پر غور کریں۔ اس مسئلہ پر ہمیں ایک نئے پہلو سے روشنی ڈالنا ہوگی۔ اس سلسلہ میں یہ واضح کردینا بھی ضروری ہی کہ جمہوریت صحیح معنوں میں جمہوریت اسی وقت ہوتی ہی جب اسکے نقاد کو مکمل آزادی ہو کہ وہ اس کی برائیوں اور نقائص پر خیال آرائی کرسکے۔ ہر جمہوری نظام میں امیر مخالف کی قدر کی جاتی ہی۔ جمہوریت کی سب سے اعلیٰ خوبی یہ ہی کہ اس میں ہر شہری کو آزادی اور مساوی حقوق حاصل ہوتے ہیں جب تک کہ دنیا میں ایسے لوگ موجود ہیں جو سلطنت کو افراد کی بہبودی کا آلہ سمجھتے ہیں اس وقت تک جمہوریت بھی دنیا میں قائم رہی گی۔ اس کے برخلاف جرمنی کا وزیر پروپگینڈا ڈاکٹر گوبلز اپنا نظریہ آزادی ان الفاظ میں پیش کرتا ہی:۔

"جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ذمہ دار گورنمنٹ کو پبلک کے نمائندے بخوبی کامیاب بنا سکتے ہیں وہ جمہوریت کے مفہوم کو یکسر سمجھتے ہی نہیں۔ افراد قوم سلطنت میں نظم قائم نہیں کرسکتے اور نہ وہ

کرنا چاہتے ہیں۔ان کی اولین خواہش یہ ہوتی ہو کہ ان پر عادلانہ حکومت کی جائے اور ان کو اس بات کا یقین ہو جاتا ہو کہ سب کچھ ان کی بھلائی کے لئے کیا جا رہا ہو۔ تو وہ بالکل مطمئن ہو جاتے ہیں۔

اس کا جواب مسٹر آمری بائی گور نے یوں دیا ہو:-

"برطانیہ عظمیٰ نسلی برتری کے تخیل پر قائم نہیں ہو۔ بلکہ یہ آزاد ملکوں اور لوگوں کی ایک جماعت ہو یہاں مجلس آئین ساز کے ذریعہ قوانین بنائے جاتے ہیں اور ہر شخص کو ان قوانین پر نکتہ چینی کا حق حاصل ہوتا ہو۔ اقلیت کے جائز حقوق کا بہت خیال رکھا جاتا ہو اور ان قوانین کی پابندی بلا امتیاز مذہب نسل اور قوم سب پر لازم ہوتی ہو۔"

آج جمہوری ممالک کے مقابل میں آمری ممالک صف آرا ہیں۔ اس خونریز جنگ کا انجام کیا ہوگا۔اس کے آثار ابھی سے ظاہر ہیں یہ صحیح ہو کہ ابتدا میں جمہوری ممالک نے جارحانہ جرات سے کام نہیں لیا۔ اور ان کی جنگی پالیسی مدافعانہ رہی۔ ہم اس بنا پر جمہوریت کو مذموم قرار نہیں دے سکتے جمہوری نظام صلح و آشتی کے زرّیں اصولوں پر مبنی ہو۔ اس نظام کو فطرتاً جنگ و جدل سے نفرت ہو۔ جمہوریت پسند ممالک اپنے غریب اور اپنے ہمسایوں کو فوجی قوت اور سنگینوں سے غلام بنانا نہیں چاہتے۔

۱۹۱۸ء میں جمہوری ممالک کو کبھی فتح حاصل نہ ہوتی اگر عام لوگوں کو یہ احساس نہ ہوتا کہ جمہوریت امن وامان قائم کرنے کے لئے آمادۂ پیکار ہوگئی ہو۔ اس جنگ میں بھی مسٹر چرچل وزیر اعظم برطانیہ نے بار بار اس بات کو دھرایا ہو کہ یہ جنگ اس وجہ سے لڑی جا رہی ہو کہ دنیا میں جنگل کا قانون رائج نہ ہو سکے۔ جمہوریت اور آمریت کے نظریاتی اختلافات کی خلیج اس قدر وسیع ہوگئی ہو کہ اب اس کا پُر ہونا ناممکن ہو۔

موجودہ جمہوریت دراصل اُن قوانین کے خلاف ایک بغاوت ہو جو انسانی آزادی کو محصور کر دیتے ہیں اور انسانی برادری میں سماجی اور سیاسی امتیازات قائم کرتے ہیں۔ جمہوریت کی تعریف ابراہم لنکن نے ان الفاظ میں کی ہو "جمہوریت کے معنی عوام کی گورنمنٹ ہو جس کی عنانِ حکومت

عوام کے ہاتھوں میں ہو اور جس کا مقصد عوام کو فائدہ پہنچانا ہو۔" لیکن اکثر مدبروں کی متفقہ رائے یہ ہی کہ اصولی بنا پر جمہوریت کو چلانا ہر دور میں ناممکن ہی۔ موجودہ جنگ ہی کا تجربہ ہمیں بتلاتا ہی کہ جمہوری ممالک میں بھی آمریت پیدا ہو جاتی ہی۔ چونکہ دوران جنگ میں قوم کے تمام ذرائع کو ایک مقصد کے لئے جمع کرنا ضروری ہو جاتا ہی۔ اس لئے جنگی پالیسی کے مختارِ کل مخصوص ہستیوں کو بنا دیا جاتا ہی۔ جن پر پوری قوم کو اعتبار ہوتا ہی۔

جمہوریت کے سامنے ہمیشہ دو مسائل پیش ہوتے ہیں۔ (۱) سلطنت کو عوام کی متفق رائے کے مطابق چلانا۔ (۲) شخصی آزادی کو برقرار رکھنا۔ ان مسائل کا حل آسان نہیں ہی۔ ہم اس مسئلہ کا حل دو طریقوں سے کرسکتے ہیں۔ (۱) جمہوریت شخصی آزادی کے دعویٰ کو محض الفاظ تک محدود نہ کرے بلکہ اس کو عملی طور پر دکھلائے مثلاً معاشی مساوات قائم کرے۔ یہاں پر معاشی مساوات کو سرمایہ دارانہ مفہوم میں نہیں لینا چاہیئے۔ سرمایہ داری کی عفونت نے جمہوریت کے جسم مصفا کو بدبودار کر دیا ہی۔ نظام سرمایہ داری طبقاتی جنگ اور ناہمواری کی بڑی حد تک ذمہ دار ہی۔ مزدور طبقہ کی معاشرتی پستی کے اسباب متعدد ہیں۔ ان اسباب میں سرمایہ داری بھی ایک ہی۔ جمہوریت اگر اپنا مستقبل خوشگوار اور کامیاب دیکھنا چاہتی ہی تو اس کے لئے یہ ضروری ہی کہ وہ اشتراکی نوعیت سے تقسیم دولت کے مسئلہ کو حل کرے۔

سب سے مکمل جمہوری نظام وہ ہی جہاں اکثریت کا بول بالا ہو۔ مجلس آئین ساز میں ہر سیاسی جماعت کو حق رائے دہندگی حاصل ہو اور اقلیت کے حقوق پر چھری نہ پھیری جاتی ہو۔ لیکن جو چیز بار بار کھٹکتی ہی وہ یہ ہی کہ مجلسی نظام قومی وحدانیت پیدا کرنے میں روڑے اٹکاتا ہی۔ اکثر جماعتی اختلافات کی بنا پر قومی مفاد کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہی۔ اگر مجلس آئین ساز کو توڑ کر تمام ذمہ داریوں کو چند اشخاص کے سپرد کر دیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ اس صورت میں تمام اختیارات ان اشخاص کی تفویض کرنا چاہی جن پر پوری قوم کو اعتماد کامل ہو۔ جیسا کہ آج کل انگلستان اور ٹرکی میں کیا جا رہا ہی۔ موجودہ دور کے اکثر مدبروں کا خیال ہی کہ جمہوریت اگر استقامت چاہتی تو اسے

مجلسی نظام کو توڑ دینا چاہیئے۔

جمہوریت کا مستقبل دراصل ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو جمہوری مشن کو چلا رہے ہیں ایک ماہر معاشیات یا مورخ کا فرض صرف اس قدر ہے کہ وہ اس طرزِ حکومت کے معاشی اور آئینی نقایص کو بلاخوف وخطر پیش کر دے۔ جمہوری ممالک کے مدبروں اور سیاسی رہبروں کی عقلمندی اور بیدار مغزی پر ہی بڑی حد تک جمہوریت کی استقامت کا دار ومدار ہے۔ اگر جمہوریت اس فتنۂ شیطانی کو جو موجودہ عالمگیر جنگ کی صورت میں نمودار ہوا ہے دبانے میں کامیاب ہو گئی اور ان پیہم چوٹوں کو جو آمریت نے اسے متعدد بار پہنچائی ہیں صبر وتحمل کے ساتھ برداشت کر گئی تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ آئندہ آئین جمہوری کو ہر ملک کے دستور اساسی میں ایک نمایاں جگہ حاصل ہو جائے گی اور پھر غالباً جمہوریت کی متزلزل بنیاد مضبوط قوی ستونوں پر ہمیشہ کے لئے قائم ہو جائے گی۔ جمہوریت نے گذشتہ جنگ میں آمریت کو صرف شکست دے کر اسے دوبارہ ابھرنے کا موقع دیا لیکن اس مرتبہ آمریت کے جراثیم کو بالکل ختم کر دیا جائے گا۔

ساز بلگرامی

خمخانۂ جاوید جلد پنجم پر ایک نظر

اُردو شعراء کے اس تذکرے کی پہلی جلد اب سے قریباً ۶۰ برس پہلے لالہ سری رام آنجہانی نے شائع فرمائی تھی۔ سری رام جی اُردو زبان کے بہت بڑے محسن تھے۔ اُردو ادب کی تاریخ میں آپ کا نام ہمیشہ سنہرے حروف میں لکھا جائے گا۔ آپ ۴ر دسمبر ۱۸۷۵ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلۂ نسب اکبر اعظم کے مشہور نورتن راجہ ٹوڈرمل سے ملتا ہے۔ ایم۔ اے۔ کی ڈگری حاصل کرنے کے فوراً بعد آپ منصف ہو گئے۔ علم و ادب کے ساتھ کچھ اتنا گہرا شغف تھا کہ ۱۹۰۴ء میں سرکاری ملازمت ترک کرکے اردو ادب کی خدمت میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ اردو شاعری اور اس کی تاریخ سے آپ کو بچپن سے ہی بہت لگاؤ تھا۔ چنانچہ ابھی آپ طالب علم ہی تھے کہ انور مرحوم کا کلام جمع کرکے شائع کر دیا۔ سری رام جی کے لئے قدرت بہت فیاض واقع ہوئی تھی۔ روشن دماغی۔ علم و فضل اور نیک دلی کے ساتھ ساتھ دنیوی وجاہت اور مال و دولت کی بھی فراوانی تھی۔ انھیں امتیازی خصوصیات کا نتیجہ تذکرہ ہزار داستان ہے۔ اس تذکرے کی تالیف میں جس قدر شغف و انہماک سے آپ نے کام لیا ہے۔ اس کی نظریں بہت کم ملتی ہیں۔ اس تذکرے کو اردو شاعری کی انسائیکلو پیڈیا سمجھنا چاہیئے۔ اس کی چار ضخیم جلدیں آپ نے اپنی زندگی ہی میں مرتب فرما کر شائع فرما دیں۔ جب اس تذکرے کی پہلی جلد شائع ہوئی۔ تو دنیائے ادب نے نہایت گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا۔ شمس العلماء منشی ذکاء اللہ مرحوم نے فرمایا "یہ مصنف کا بڑا احسان اہل زبان پر ہے کہ اس نے اُردو لٹریچر پر اپنے اس تذکرے کی تصنیف سے ایسا بے بہا اضافہ کیا ہے۔ کہ پہلے کبھی نہیں ہوا ہے۔

مولانا حالی مرحوم کا ارشاد بھی ملاحظہ فرمایئے "یہ تذکرہ جامعیت کے لحاظ سے بلا مبالغہ شعراء اُردو کی ایسی انسائیکلو پیڈیا ہوگی جس کی نظیر اردو تذکروں میں نایاب سمجھی جائے گی" ابھی اس تذکرے کی صرف چار جلدیں شائع ہوئی تھیں کہ اُردو شاعری کا یہ محب و محسن ۲۵ مارچ ۱۹۳۰ء کو اس جہان فانی سے کوچ کر گیا۔ مرحوم کو تذکرے کی تکمیل کی بہت شدید آرزو تھی۔ چنانچہ موت سے پہلے جہاں آپ نے

اپنی کثیر جائداد کے اہتمام و انتظام کے متعلق وصیت فرمائی۔ وہاں اس تذکرے کی تکمیل کے لئے بھی ایک ٹرسٹ قائم کر دیا۔ ٹرسٹ کی صدارت کے لئے مرحوم کی نظر انتخاب اُردو شعر و ادب کے عاشق اور بالغ نظر مبصر جناب پنڈت اقبال کشن صاحب ڈر پر پڑی اور تذکرے کی تکمیل کا کام ملک کے مایۂ ناز ادیب اور شاعر حضرت علامہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی مدظلہٗ کے سپرد کیا گیا۔ علامہ موصوف نے اب تذکرے کی زیر تبصرہ جلد مرتب فرمائی ہے۔ علامہ کیفی کی تمام زندگی اردو ادب کی خدمت میں گذری ہے۔ شعر و ادب آپ کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ اُردو زبان کی تاریخ پر آپ کو کامل عبور حاصل ہے۔ الفاظ اور محاورات کی سرگذشت سے آپ پوری طرح آشنا ہیں۔ شعر و ادب میں آپ کو درجہ استناد حاصل ہے تنقید میں اصابت رائے بالغ نظری اور سلامت روی کے لئے آپ خاص طور پر مشہور ہیں۔ نظم و نثر کی کئی کتابیں اس وقت تک آپ کے قلم سے نکل چکی ہیں۔ ایک ضخیم دیوان بھی زیر اشاعت ہے۔ اُردو ہندی کے جھگڑے میں جس فراخدلی، اولوالعزمی اور حق پرستی کا ثبوت علامہ موصوف نے دیا ہے اس کی نظیر بہت کم ملتی ہے۔ فرقہ وارانہ سیاسی طوفان کی رَو میں اچھے اچھے سلیم الطبع انسان بہہ جاتے ہیں۔ آپ نے نہ صرف سینہ سپر ہو کر اُردو زبان کی حمایت کی ہے بلکہ عملی طور پر بھی دن رات اس کی خدمت میں زبان و قلم سے مصروف رہتے ہیں۔

زیر نظر جلد میں علامہ موصوف نے نہایت تجسس، محنت اور کاوش سے شعراء کا حال اور کلام بہم پہنچایا ہے۔ تنقید میں نہایت سلامت روی ہمدردی اور رواداری سے کام لیا ہے۔ کم درجے کے شعراء کے لئے آپ کی تنقید ہمت افزا ہے۔ باکمال اور مستند شعراء کے ذکر میں آپ نے بہت ادب و احترام سے کام لیا ہے۔ یہ جلد بڑی تقطیع کے ۴۰۰ صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ حرف ش سے حرف ع تک ۶۰۷ قدیم و جدید شعراء کا ذکر ہے۔ اس تذکرے میں بیک وقت اردو شاعری کے قریباً تمام اصناف سامنے آجاتے ہیں اور زمانے کے ساتھ ساتھ اردو شاعری میں جو جو انقلابات نمودار ہوتے رہے ہیں ان کا بھی صحیح اندازہ ہو جاتا ہے۔ غزل۔ قصیدہ۔ مثنوی۔ رباعی۔ مسدس اور طرز جدید کی مختصر اور نیچرل نظمیں موجود ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ دیگر اصناف کی نسبت غزلیات بہت زیادہ ہیں لیکن حقیقت بھی یہی ہے کہ اردو شاعری کا بیشتر سرمایہ اسی صنف سخن پر مشتمل ہے۔ اور آج بھی جبکہ غزل کے خلاف مختلف اطراف سے یورشیں

ہوری ہیں اس کے عشاق کی تعداد بہت زیادہ ہو۔ آزاد نظم کا کوئی نمونہ اس جلد میں نظر سے نہیں گذرا، اگر اس کے بھی کچھ اچھے نمونے شامل کئے جا سکتے تو تذکرے کی جامعیت زیادہ معتبر ہو جاتی۔ بہرحال اُردو شاعری کے شائقین کے لئے یہ تذکرہ کافی جامع اور دلچسپ ہے۔ صرف ایک جلد میں ۱۰۳ ہندو شعراء کا ذکر ہو۔ جب تذکرہ مکمل ہوگا تو یہ تعداد غالباً ایک ہزار سے زائد ہوگی۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُردو زبان کتنی ہمہ گیر اور مقبول عام ہو۔ پانچ سات غیر ملکی یورپین شعراء کا بھی ذکر پایا جاتا ہو۔ تذکرے میں یو۔پی کے شعراء کی تعداد بہت زیادہ ہو اس کی وجہ غالباً یہی ہوگی کہ لالہ سری رام جی اور علامہ کیفی دونوں کا زیادہ تعلق یو۔پی سے رہا ہو اور ایسے ایسے شعراء سے بھی ان کی ملاقاتیں رہی ہونگی جو دنیائے شاعری میں زیادہ معروف نہیں ہیں بہرحال اس ایک جلد میں اتنے شعراء کے حالات اور ان کے منتخب اشعار کا جمع کر دینا بجائے خود ایک بہت بڑا کام ہو۔

تذکرے کی جامعیت اور دلچسپی کا اعتراف کرتے ہوئے علامہ موصوف کی توجہ چند امور کیطرف صرف اس خیال سے مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ آئندہ ایڈیشن میں ان معروضات پر غور فرمالیا جائے۔

مرزا صادق علی خاں صادق مرحوم کے متعلق صاحب تذکرہ نے صرف اس قدر رقم فرمایا ہو۔ "ریاست کاشمیر میں ملازم تھے۔ غزل کم تر نظمیں زیادہ لکھتے ہیں ...." اس کے بعد ایک غزل کے تین نہایت معمولی شعر درج ہیں اور بس صادق مرحوم سری نگر میں اسکول ماسٹر تھے۔ اصل وطن کلانور تھا افسوس کہ جوانی میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ مخزن میں اکثر ان کی نظمیں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ منظر نگاری کی طرف ان کی طبیعت بہت مائل تھی۔

وادیٔ کشمیر کا ماحول ان کی شاعری کے لئے بہت سازگار تھا۔ ان کی نظمیں بہت مدت تک کشمیر کے مناظر کی آئینہ بردار رہیں۔ ان کے کلام کا بیشتر حصہ خاں صاحب منشی سراج الدین احمد مرحوم میر منشی ریذیڈنسی کشمیر کے پاس محفوظ تھا۔

صادق مرحوم کی بہت سی نظمیں راقم نے خاں صاحب مغفور کے یہاں ہی دیکھی ہیں۔ صاحب تذکرہ کی خانصاحب مرحوم سے کافی شناسائی تھی۔ تھوڑی سی کوشش سے ایک اچھے شاعر کے حالات

اور اشعار دستیاب ہوسکتے تھے۔

نواب مرزا شوق لکھنوی مرحوم کے حال میں صاحب تذکرہ رقمطراز ہیں: "ان کی شہرت کے عناصر اربعہ چار مثنویاں ہیں (۱) بہار عشق (۲) زہر عشق۔ (۳) فریب عشق۔ (۴) لذت عشق۔ ان مثنویوں میں سے اکثر سلاست بیان واقعہ نگاری حسن ادا فصاحت اور شگفتگی اسلوب اور صحت روزمرہ کے اعتبار سے بطور نمونہ پیش کی جاسکتی ہیں۔"

یہ ایک بین حقیقت ہے کہ مثنوی میں مرزا شوق کا پایہ نہایت بلند ہے۔ اردو زبان نے صرف دو اور بلند مرتبہ مثنوی نگار شاعر پیدا کئے ہیں۔ میر حسن اور دیا شنکر نسیم شوق کی مثنویوں کی اخلاقی فضا کے متعلق آپ کچھ بھی کہیں لیکن یہ ظاہر ہے کہ آپ کی شاعرانہ شہرت اور عظمت کا انحصار آپ کی مثنویوں پر ہی ہے۔ ایسی صورت میں غزلوں کے چند اشعار لے کر بطور نمونہ کلام پیش کر دینا قرین انصاف نہیں۔ شوق کی مثنویوں کے تمام اشعار مخرب اخلاق نہیں اسی لئے بہتر ہوتا کہ اگر مثنویوں ہی میں سے منتخب اشعار پیش کئے جاتے۔ نیز شوق مرحوم کی شاعرانہ عظمت اس امر کی متقاضی تھی کہ آپ کا ذکر کسی قدر تفصیل کے ساتھ کیا جاتا بعض مشہور شعرا کے لئے بیس بیس تیس تیس صفحے اور بعض کم درجہ اور غیر معروف شعرار کے لئے آٹھ آٹھ دس دس صفحے وقف کئے گئے ہیں۔ لیکن مرزا مرحوم کے حصے میں صرف ایک ہی صفحہ آیا ہے۔ اوپر عرض کیا جاچکا ہے کہ تذکرے میں کئی غیر معروف اور کم درجہ شعرار کا ذکر بھی پایا جاتا ہے۔ یہ تذکرے کا عیب نہیں بلکہ خوبی ہے۔ اس سے صاحب تذکرہ کے ذوق تجسس اور وسعت نظر کا پتہ ملتا ہے۔ حقیقت میں اس قسم کے تذکروں کی تالیف کسی شخص واحد کا کام نہیں۔ اس کے لئے تذکرہ نگاروں کا ایک بورڈ ہونا چاہیے۔ اس لئے یہ تعجب کی بات نہیں اگر کئی شعرار کا ذکر درج ہونے سے رہ گیا ہو۔ یہاں صرف چند شعرار کا ذکر ہوگا جن کا شامل کیا جانا راقم کی رائے میں مناسب تھا۔

(۱) مولانا عبدالسلام شمیم ندوی۔ آپ اپنی بیش بہا علمی اور ادبی تصانیف کے باعث ملک بھر میں مشہور ہیں۔ آپ کی غزلیں کبھی کبھی رسالہ معارف اعظم گڈھ میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔

(۲) جناب منصور مرزاپوری۔ آپ پرانے رنگ میں غزل لکھتے ہیں۔ شعر و سخن کے متعلق چند ایک

رسائل بھی لکھے ہیں۔ دنیائے ادب میں شہرت رکھتے ہیں۔

(۳) سید عابد علی عابد ایم۔اے۔ او۔ ایل۔ ایل ایل بی پروفیسر دیال سنگھ کالج لاہور آپ کا شمار پنجاب کے بہترین شعراء میں کیا جاتا ہی۔ غزل اور نظم دونوں پر یکساں قدرت ہی۔ مضامین اور انداز بیان کی شگفتگی اور برجستگی آپ کی شاعری کے جوہر ہیں۔ افسانہ نگاری میں بھی یدطولیٰ رکھتے ہیں۔ کئی علمی اور ادبی مضامین بھی آپ کے قلم سے نکل چکے ہیں۔

(۴) ملک نصراللہ خاں عزیز۔ بی اے۔ برسوں اخبار مدینہ بجنور کے ایڈیٹر رہی دنیائے صحافت میں آپ اپنی انشا پردازی کے لئے خاص شہرت رکھتے ہیں۔ شعر کم لکھتے ہیں لیکن جب لکھتے ہیں خوب لکھتے ہیں۔

(۵) شاد عارفی رام پوری کا کلام اکثر رسائل میں شائع ہوتا رہتا ہی۔ غزل اور نظم دونوں اچھی لکھتے ہیں۔ ان شعراء کا تذکرہ یا عدم تذکرہ اتنی اہم بات نہ تھی لیکن چند ایک نہایت ہی اہم اور جلیل القدر شخصیتوں کو بھی شامل نہیں کیا گیا۔

ہز اگزالٹڈ ہائی نس سر میر عثمان علی خاں عثمان۔ مجمع القابہ والی ریاست حیدرآباد دکن۔ اُردو زبان کے عظیم ترین سرپرست اور محسن ہیں۔ اردو ادب کے کئی دقیع ادارے حضور کے الطاف وکرم سے کام کر رہی ہیں۔ کئی علماء، ادباء اور شعراء کی زندگیاں حضور ہی کی علم پرور اور ادب نواز فیاضیوں کی مرہونِ منت ہیں۔ ملک بھر میں صرف "جامعہ عثمانیہ" ہی ایسی یونیورسٹی ہی جہاں جملہ علوم وفنون کی تعلیم اُردو کے ذریعے دی جاتی ہی۔ اُردو کی تعمیر اور ترقی کا کام جو حضور کے طفیل انجام پا رہا ہی۔ اس کی نظیر اردو زبان کی تاریخ میں نہیں ملتی حضور کا کلام گاہے گاہے اخبارات ورسائل کو زینت بخشتا رہتا ہی۔ اُردو کے اس عظیم ترین مربی اور بلند پایہ شاعر کے ذکر سے یہ تذکرہ محروم رکھا گیا ہی۔

حضور کے فرزند دلپسند والا شان شہزادہ نواب معظم جاہ بہادر شجیع بالقابہ نہایت عمدہ غزل لکھتے ہیں آپ کی غزلیں مدت تک "ہمایوں" لاہور میں مسلسل شائع ہوتی رہی ہیں۔ فکر کی پختگی انداز بیان کی برجستگی اور مضامین کی شگفتگی کے اعتبار سے یہ غزلیں استادانہ حیثیت کی ہیں۔ تعجب ہی کہ شہزادہ شجیع کے کلام پر

صاحب تذکرہ کی نظر نہیں پڑی۔

سب سے آخر مجھے مولانا ظفر علی خاں کا ذکر کرنا ہی مولانا کی سیاسی روش اور اہمیت کے متعلق مختلف رائیں ہوں تو ہوں لیکن ان کی شاعرانہ عظمت سے کسی کو مجالِ انکار نہیں۔ بدیہہ گوئی میں ان کی نظر قدیم وجدید شعرا میں شاید ہی مل سکے۔ بقول علامہ سید سلیمان ندوی "پنجاب میں پورا استاد اور کامل الفن شاعر جکی شاعرانہ پختگی قدرتِ کلام اور بدیہہ گوئی کی مثال اس وقت نہ صرف پنجاب میں بلکہ ہندوستان میں نہیں مل سکتی۔ وہ ظفر علی خاں ہیں۔ وہ ہر صنف پر یکساں قادر اور سخنوری کے ہر فن میں کامل ماہر ہیں" مولانا کا نعتیہ کلام جذب وکیفیت کا حامل ہی۔ اس میں جوشِ عقیدت شیفتگی اور عشق ومحبت سبھی کچھ ہی۔

مولانا صرف ایک بلندپایہ شاعر ہی نہیں۔ بلکہ ایک صاحب طرز انشا پرداز بھی ہیں۔ انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرنے میں آپ کو خاص مہارت حاصل ہی۔ فن صحافت میں آپ کے فیض سی کافی بلندیاں پیدا ہوئی ہیں۔

اُردو کے ایسے جلیل القدر ادیب اور شاعر کے ذکر سے اس تذکرے کا خالی ہونا نہایت تعجب انگیز ہی۔

اثر صہبائی

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن لاہور)

"کاش ....!"

کاش تم پھر مرے رازوں کے نگہباں ہوتے
دردِ بیچارگیِ زیست کا درماں ہوتے
داستانِ دلِ پُرشوق کا عنواں ہوتے
ہر نفس میں صفتِ روحِ خراماں ہوتے
ہر نظر میں صفتِ نور فروزاں ہوتے

پھر تمہیں مرکزِ تخئیل پریشاں ہوتے!
پھر تمہیں منزلِ تمکین گریزاں ہوتے!
پھر تمہیں نقطۂ امید فراواں ہوتے!
پھر تمہیں کعبۂ تسکینِ دل وجاں ہوتے!
تمہیں ارمان تمہیں حاصلِ ارماں ہوتے

پھر تمہیں ہوتے مرے حُسنِ نظر کی تصویر
پھر تمہیں ہوتے مرے دردِ وفا کی تاثیر
پھر تمہیں ہوتے مرے ذوقِ سخن کی تفسیر
پھر تمہیں ہوتے ہر اک مصرعِ تر کی تعبیر
پھر تمہیں حاصلِ ہر خوابِ پریشاں ہوتے

پھر مری روح کی خلوت میں نشیمن کرتے
پھر مرے سینۂ پُرداغ کو گلشن کرتے
منظرِ چشم کو پھر وادیٔ ایمن کرتے
پھر فضائے دلِ تاریک کو روشن کرتے
پھر سوادِ نگہِ شوق میں رقصاں ہوتے

گھاٹیوں میں کبھی سرسبز کہستانوں میں
وادیوں میں کبھی گلپوش خیابانوں میں
حسنِ فطرت کے چھلکتے ہوئے ایوانوں میں
خلدِ کشمیر[1] کے شاداب گلستانوں میں
کاش تم بھی مرے ہمراہ خراماں ہوتے

گنگناتے ہوئے عشرت بھرے کاشانوں میں
سانس لیتے ہوئے ذی روح صنم خانوں میں
حسنِ مشرق کے پُراسرار پرستانوں میں
گذری تہذیب کے سنسان شبستانوں میں
تم بھی اے کاش ندیمِ دلِ حیراں ہوتے

---

[1] کشمیر میں یہ نظم لکھی گئی۔

پھر اُسی محویتِ خاص سے ہوتے دمساز — کبھی کلیوں سے سجاتے مری خلوتگۂ راز
کبھی پھولوں سے بساتے مرا دامانِ نیاز — پاتے مجھکو جو بہ حسرت گل چینیٔ ناز
حسن سے اپنے بصد رنگ گلستاں ہوتے

پھر بصد دلبری و عشوہ و ناز و انداز ! — چھیڑ دیتے مرے ارمانوں کا سویا ہوا ساز
پھر مجھے مست بناتی وہی نورس آواز — بربطِ دل پہ مرے ہوتے کبھی نغمہ طراز
کبھی مضراب زنِ سازِ رگِ جاں ہوتے

مری نظروں میں جو اک کیف خفی سا پاتے — ایک بے نام سے احساس میں گم ہو جاتے
دور کھنچ جاتے کبھی اور کبھی پاس آتے — میری اُلجھی ہوئی سانسوں سے کبھی گھبراتے
زلفِ برہم سے کبھی اپنی پریشاں ہوتے

کبھی انگڑائیاں لیتے تو کبھی شرماتے — نشۂ حسن و جوانی میں کبھی بل کھاتے
خود بہکتے کبھی اور گاہ مجھے بہکاتے — کبھی چھپتے کبھی ہنستے ہوئے پاس آجاتے
اپنے سائے سے کبھی آپ گریزاں ہوتے

دشت میں گہ طرفِ گلشن شاداب کبھی — سمتِ گلمرگ* و سوئے وادیٔ لولاب* کبھی
سیرِ کہسار کبھی اور لبِ آب کبھی — حسن افزائے بہارِ شبِ مہتاب کبھی
کبھی زینت دہِ نوروزِ بہاراں ہوتے

پھر مجھے بخشتے گلگشتِ گلستاں کے مزے — ہاتھ رہ رہ کے دباتے کبھی چٹکی لیتے
کبھی شاخوں سے اُلجھتے کبھی کلیاں چنتے — دامنِ برگ و سمن کے کبھی پرزے اڑاتے
ٹکڑے ٹکڑے کبھی پھولوں کے گریباں ہوتے

پھر مچلتی لب و رخسار پہ وہ زلفِ دوتا — پھر مہکتی نفسِ حسن و جوانی سے فضا

---

* کشمیر کے مرغزار !

لائی پھر تازگیِ شوق کے پیغام صبا
ہوتی پھر ایک نئے جوش سے تجدیدِ وفا
نئے اقرار نئے وعدہ و پیماں ہوتے

آنکھوں آنکھوں میں کبھی تمکنتِ لاف و گزاف
نظروں نظروں میں کبھی منتِ داد و انصاف
صلح مبہم سی کبھی اور لڑائی کبھی صاف
بات اتنی سی کبھی کہہ دیا کیوں وعدہ خلاف
لطف کے گاہ کبھی جور کے عنواں ہوتے

کبھی عشرت کی کبھی غم کی ہوائیں چلتیں!
بجلیاں سی کبھی آغوش میں دل کے پلتیں
ظلمتیں قالب انوار میں گاہے ڈھلتیں
کبھی شمعیں سی تصور کی لگن میں جلتیں
کبھی پلکوں پہ ستارے سے فروزاں ہوتے

برق حاصل کبھی اور گاہ سراپا حاصل
کبھی ہنگامۂ طوفاں کبھی امن ساحل
کبھی فریادِ جرس اور کبھی عیش منزل
گاہ ترتیب وہ زلفِ پریشانیٔ دل
گاہ برہم زدنِ سلسلۂ جاں ہوتے

پھر رہا ہی مری آنکھوں میں وہ دلکش منظر
عشق کے قلب پُر ارماں میں تلاطم سا ادھر
حسن کے سینۂ نوخیز میں ہلچل سی اودھر
الغرض پاتے نہ پُر شوق نگاہوں سے مفر
اپنے ہی حسن کی شدت سے پشیماں ہوتے

وہ جوانی کی امنگیں وہ امنگوں میں جھجک
لبِ نازک پہ تبسم کی وہ ہلکی سی جھلک
گرمیٔ حسن کی وہ عارض گلگوں میں دمک
دیکھ کر چاند سے ماتھے پہ پسینے کی چمک
فرطِ غیرت سے ستارے عرق افشاں ہوتے

پڑ گیا حسن دل آرا کا جہاں عکس جمال
پھر کہاں دل میں بھلا دو سوسۂ ہجر و وصال
کبھی افراط سکوں ہی سے جو پاتے بھی نڈھال
عشق کی ذہن میں بصد کیف باندازِ خیال
زمزمہ پاش و گل افشان و غزل خواں ہوتے

سینکڑوں نغمۂ خوابیدہ جگا دیتے تم
مجھکو اک سیل ترنم میں بہا دیتے تم

سازِ ہستی ابدیت سے ملا دیتے تم ایک ہلکے سے تبسّم میں سنا دیتے تم
وہ ترانے جو مری رُوح میں پنہاں ہوتے

نئے طوفان اٹھا کر مرے آب وگل میں! باندھتے سیل تمنّا کو کفِ ساحل میں
خون کر دیتے ہزاروں ہی امنگیں دل میں آزماتے غرض اس تو بہ شکن منزل میں
کہ فرشتے بھی ہمہ حسرتِ عصیاں ہوتے

ابھی حیلہ ابھی غمزہ ابھی شرم و انکار ابھی منت ابھی قسمیں ابھی قول و اقرار
ابھی خفگی ابھی نرمی ابھی غصہ ابھی پیار ابھی نمناک نگاہی سے رگِ ابرِ بہار
لبِ خنداں سے ابھی صاعقہ افشاں ہوتے

یہ گل و لالۂ و شبنم یہ گہر یہ آنسو یہ چمکتے ہوئے ذرّے یہ شرر یہ جگنو
یہ مئے و میکدۂ و ساغر و مینا و سبو یہ مہ و مہر یہ انجم یہ چراغِ لبِ جو
پرتوِ حسن سے صد گونہ درخشاں ہوتے

آب پر عارضِ رنگیں کا جو پڑتا پرتو! قطرہ قطرہ میں جل اٹھتے وہیں دیپک سو سو
جاتی تاحدِّ نظر چہرۂ پر نور کی ضو! ایک اک خاک کے ذرہ سے نکلتی وہ لو
کہ مہ و مہر چراغ تہِ داماں ہوتے

وہ محبت کا تقاضا وہ جوانی کی ترنگ حسن اور نازسے وہ عشق وجنوں ہم آہنگ
ساقی و مطرب و مینا، و سبو، دف و چنگ ہوتا یوں سینۂ گیتی پہ غرض رامش و رنگ
کہ نگہبان فلک سر بہ گریباں ہوتے

وہ جو صورتگہِ امکاں میں سجا رکھے ہیں غیب کے آئینہ خانے میں لگا رکھے ہیں
بہر یک ساعتِ مسعود اٹھا رکھے ہیں دل میں فطرت نے جو صدیوں سے چھپا رکھے ہیں
تم جو ہوتے تو وہ جلوے بھی نمایاں ہوتے

اس خرابے کے اودھر عالمِ افلاک کے پاس روح کی نور فشاں جلوہ گہِ پاک کے پاس

دور احساس سے اندیشۂ چالاک کے پاس — دھندلے دھندلے سے جو ہیں سرحدِ ادراک کے پاس
ان مناظر کے خد و خال نمایاں ہوتے

کاش تم سنتے دلِ زار سے نکلی ہوئی بات — کاش تم پڑھتے یہ اشعارِ محبت آیات
کاش دیتے مجھے آلامِ جدائی سے نجات — کاش یوں پار لگاتے مری کشتیٔ حیات
کبھی ساحل کبھی دریا کبھی طوفاں ہوتے

سروش عسکری طبا طبائی لکھنؤ
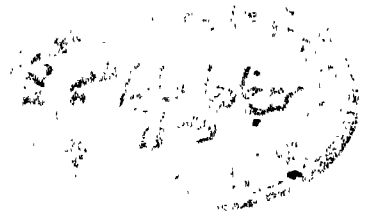
تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

تنقیدی اشارے:۔ از آل احمد صدیقی سُرور ایم اے (علیگ) ناشر:۔ نذیر اینڈ سنز علی گڈھ۔
حجم ۱۶۸ صفحات۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ قیمت مجلد ۲ؔ/، کاغذ کتابت و طباعت اچھی۔

یہ مصنف کی ان منتخب تقریروں کا مجموعہ ہے، جو آل انڈیا ریڈیو دہلی سے وقتاً فوقتاً نشر کی گئی ہیں۔
"اردو تنقید پر ایک نظر" کے مصنف پروفیسر کلیم الدین احمد صاحب نے ذرا مبالغہ سے لکھا ہے کہ "اردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے، یہ اقلیدس کا خیالی نقطہ ہے یا معشوق کی موہوم کمر" مگر اس میں شبہ نہیں کہ اردو میں تنقید کی اعلیٰ اور معیاری کتابیں بہت کم ہیں۔ گذشتہ سال چند اچھی کتابیں شائع ہوئی ہیں، جن میں سے ایک "تنقیدی اشارے" بھی ہے۔ ریڈیو کے اوقات محدود ہوتے ہیں اس لئے یہ تقریریں یا مضامین طویل اور مبسوط تو نہیں ہیں مگر تشنہ بھی نہیں ہیں۔ مصنف نے جس موضوع پر لکھا ہے، اس کے اہم نکات اور مخصوص رجحانات پوری طرح نمایاں اور واضح ہیں، تنقیدیں نہایت ہی بے لاگ اور جانبداری سے پاک ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ کتاب مختصر ہونے کے باوجود، اردو تنقید نگاری میں ایک اچھا اضافہ ہے۔

اشک و رشکِ غالب:۔ مرتبہ سید ظہیر الدین احمد علوی ایم اے، ایل ایل بی علیگ۔ ناشر نذیر اینڈ سنز علی گڈھ۔ حجم ۱۱۲ صفحات سائز ۲۰×۳۰/۱۶ قیمت ۱۲/ کاغذ، طباعت اور کتابت عمدہ

غالبؔ پر یوں تو بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں، مگر پیش نظر کتاب ان سے بالکل مختلف ہے۔ فاضل مرتب کو غالب سے والہانہ عقیدت ہے، اگر انھیں ڈاکٹر بجنوری مرحوم کے اس خیال سے اختلاف ہے کہ "دیوان غالب ہندوستان کی الہامی کتاب ہے" تو اسی کے ساتھ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ "دیوان غالب ہندوستان اور دنیا کے ادب عالیہ کے لئے مقدس دستاویز ہے جس کی تکمیل میں قدرت کی بہترین قوتیں شامل ہیں" مرتب نے غالب کے کلام کا باستیعاب مطالعہ کیا ہے، اس سلسلہ میں انھیں اشک و رشک کے تحت جو اشعار نظر آئے ان کو انھوں نے اس طرح جمع کر دیا ہے کہ ان کے مفہوم میں تسلسل پیدا ہو گیا ہے۔ اشعار کی تشریح

توضیح اور مختلف اشعار کے مفہوم میں اتحاد و یکسانیت پیدا کرنے کے لئے خود مرتب نے جو کچھ لکھا ہی، وہ بجائے خود نہایت دلچسپ اور قابل مطالعہ چیز ہی۔

جمہوریۂ چین:- از میر عابد علی خاں بی اے (عثمانیہ) ناشر:- سید عبدالرزاق بکسیلر اینڈ پبلشر، عابد روڈ حیدر آباد دکن۔ حجم ۱۹۲ صفحات سائز ۲۰×۳۰/۱۶ قیمت درج نہیں۔ کاغذ، طباعت اور کتابت اچھی۔

چین ہندوستان کا پڑوسی ہی اور ہندوستان کی طرح ایک زراعتی ملک ہی مگر یہ عجیب اتفاق ہی کہ اس کے متعلق اردو میں کوئی مستند اور معیاری کتاب نہیں ہی، چند سال ہوئے "چینی مسلمان" کے نام سے ایک مفصل اور مبسوط کتاب شائع ہوئی تھی، جسے چین کے ایک مخلص اور دردمند نوجوان جناب بدرالدین صاحب جامعی نے لکھا ہی۔ لیکن اس کے باوجود ایک ایسی کتاب کی ضرورت تھی، جس میں چین کے سیاسی اور معاشی مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہو۔ میر عابد علی صاحب کا اردو خواں طبقہ کو ممنون ہونا چاہیئے کہ انھوں نے زیر تبصرہ کتاب کو لکھ کر اس ضرورت کو بڑی حد تک پورا کردیا ہی۔ انقلاب چین جدید چین اور جنگ چین و جاپان کے متعلق موصوف نے نہایت مفید اور کارآمد معلومات جمع کردی ہیں اس لئے امید ہی کہ کتاب کو حسن قبول حاصل ہوگا۔

مضامین عظمت (حصہ دوم):- از محمد عظمت اللہ خاں مرحوم۔ حجم ۲۲۳ صفحات سائز ۲۰×۳۰/۱۶ قیمت عہ/۔ ملنے کا پتہ:- حیدر آباد بک ڈپو۔ چادر گھاٹ، حیدر آباد دکن۔

یہ عظمت اللہ خاں مرحوم کے ان مضامین کا مجموعہ ہی جو ملک کے مختلف معیاری رسالوں میں چھپ چکے ہیں۔ اس سی قبل مرحوم کے دو اور مجموعے "سُریلے بول" اور مضامین عظمت (حصہ اول) شائع ہوکر مقبولیت حاصل کرچکے ہیں۔ مرحوم حیدر آباد کے ان چند لوگوں میں سی ہیں، جنھوں نے اردو ادب میں جدید مذاق کی اشاعت کی اور اردو ادب میں نیا اسلوب اور نئی راہیں پیدا کیں۔ آج کل ترقی پسند ادب کا ہر طرف چرچا ہی عظمت اللہ مرحوم ان لوگوں میں سی ہیں جنھوں نے اس کی طرح ڈالی اور نوجوانوں میں وہ اجتہادی قوت پیدا کی، جس نے پرانی بنا اور ادب کو یکسر پلٹ دیا۔ اس مجموعے میں مرحوم کے چودہ مضامین شامل ہیں، جو تمام تر ادبی ہیں توقع ہی کہ پچھلے دو مجموعوں کی طرح اس مجموعہ کو بھی قبول عام حاصل ہوگا۔ (ع۔ ل)

جلن سوزش اور خراش!

جلن تکلیف دہ ہونے کے ساتھ ساتھ خطرناک بھی ہوتی ہے، سگریٹ
سے انگلی کی معمولی جلن کے علاج پر بھی اگر توجہ نہ کی جائے
تو اس سے خون میں زہر پھیل جانے کا خطرہ ہوتا
ہے، جیسے ہی آپ کسی شے سے جل جائیں اپنی جلنے
کی جگہ پر جلمار لگا دیجئے۔ خواہ آپ آگ
سے جلے ہوں یا کھولتی ہوئی کسی سیال شے
سے، جلمار فوراً درد کو دور کر دے گا۔ چونکہ اس
میں تیز لیکن سوزش نہ کرنے والے مصفی اجزا
شامل ہوتے ہیں اس لئے اس کے استعمال
سے جراثیم نہیں پیدا ہونے پاتے۔ یہ چھالے بھی
نہیں پڑنے دیتا۔ مزید براں اس سے جلے ہوئے
مقام پر بہت جلدی کھال پیدا ہو جاتی ہے
ہر قسم کی جلن اور سوزش کو ٹھنڈک اور آرام
پہنچانے کے لئے جلمار اپنی مثال نہیں رکھتا۔ اسی
بات کا خیال رکھئے کہ جلمار ہمیشہ آپ کے گھر
میں موجود رہے بجائے اس کے کہ خون میں زہر پھیل
جانے کے علاج پر کثیر رقم صرف کی جائے یہ زیادہ بہتر
ہے کہ جلنے سے جراثیم نہ پیدا ہونے دیجئے
آج ہی اپنے قریب کے دواساز یا اسٹور سے اس کا
ایک ٹیوب خرید لیجئے۔

آج ہی ایک ٹیوب خرید لیجئے
معلوم نہیں کس وقت
اس کی آپ کو ضرورت پڑ جائے

جلن اور سوزش کو آرام پہنچاتا ہے

سارے دواسازوں اور اسٹوروں سے دستیاب ہو سکتا ہے

سپلا بائیکلہ بمبئی

LETTERS OF IQBAL

A collection of letters by the sage, philosopher and national poet, the late Allama Sir Muhammad Iqbal during the period May, 1936 to November, 1937, a few months before his death. This period synchronises with a very eventful period in the history of Muslim India—between the establishment of the All-India Muslim League Central Parliamentary Board in June, 1936 and the great historic sessions at Lucknow in October, 1937.

After the Lucknow session, it was a great achievement for Muslim League that its lead came to be acknowledged by both the majority and minority Provinces. Sir Muhammad Iqbal played a very conspicuous part, though at the time not revealed to public, in bringing about this consummation. He had his own doubts about Sikandar-Jinnah Pact being carried out and he was anxious to see it translated into some tangible results without delay so as to dispel popular misapprehension about it.

Price, ordinary edition, As. 8

Price, de luxe ,, Re. 1/4

جامعہ

زیرِ ادارت:- نورالحسن ہاشمی ایم، اے

جلد ۲۸ نمبر ۶ | بابتہ ماہ جون ۱۹۴۳ء | چندہ سالانہ صہ فی پرچہ (۸؍)

فہرست مضامین

رضاً بقضائہ وتسلیماً لامرہ

ابھی ہمارے دل پر مس فلپسبورن کی وفات کا زخم تازہ تھا، کہ دستِ قضا نے، ایک اور رفیق عزیز کو ہم سے چھین لیا۔ ۷ ارجولائی کو جامعہ کے محبوب فرزند اور جاں نثار خادم چودھری اکبر علی نے اپنے وطن ضلع لائلپور میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۴ء تک سیاسی سیلاب کے زمانے میں بہت سی نوجوان زندگیاں بہتی ہوئی آزاد قومی تعلیم کے طوفانی سمندر میں آئیں، کچھ موجوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگئیں، کچھ ساحل کی کشش پر مجبور ہوکر، ساحل سے جا لگیں، مگر کچھ ایسی بھی تھیں، جن میں عزم اور عقیدے کا وزن تھا، جو بیچ سمندر میں لنگر ڈال کر ٹھہر گئیں۔ اکبر علی ان نوجوانوں میں سے تھے، جن کی کشتیِ حیات اس زمانے میں جامعہ ملیہ کے جزیرے میں لنگرانداز ہوئی اور اسے اپنا ساحل مراد سمجھ کر یہیں رہ گئی۔ وہ کئی بار سفر کو نکلی مگر بارِ علم اور تجربے سے گراں بار ہوکر اسی بندرگاہ میں واپس آئی، یہاں تک کہ موجِ فنا کے تھپیڑے، اسے بہا کر وہاں لے گئے جہاں سے کوئی کشتی آج تک واپس نہیں آئی۔

مرحوم کی زندگی کے حالات، ان کی سیرت اور ان کی خدمت کا بیان ایک مفصل مضمون چاہتا ہے، جو ان شاء اللہ ہم آئندہ کسی اشاعت میں پیش کریں گے، اس وقت تو ہم صرف اس جانگداز حادثے کی خبر کو درج کرکے مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کرتے ہیں اور ان کا پُرسا دیتے ہیں ان کے عزیزوں کو، ان کے دوستوں کو اور جامعہ برادری کے سب بھائیوں کو، جو خلوص اور وفا، محبت اور شفقت، دل سوزی اور ہمدردی، خوش مزاجی اور زندہ دلی کے اس مجسم خزانے سے محروم ہوگئے، جسے اکبر کہتے تھے۔

جنگ کے معاشی اثرات

موجودہ جنگ کو سیاسی جنگ کہنا صحیح نہیں اگرچہ اصولی طور پر یہ دو سیاسی نظاموں کے درمیان ایک ٹکر ہی، مگر ان سیاسی نظاموں کے اپنے اپنے علیحدہ علیحدہ معاشی نظام بھی ہیں، اور دراصل معاشی کمتری کو معاشی برتری میں تبدیل کرنے کی خاطر اس جنگ کا آغاز ہوا، اس لئے اس کو معاشی جنگ سمجھنا زیادہ صحیح ہی، جنگ اگر سیاسی ہو تب بھی اس کے اثرات پڑتے ہیں پھر اس جنگ کا تو کہنا ہی کیا جو خالص معاشی بنیادوں پر قائم ہو، ایسی صورت میں جنگ کے معاشی اثرات بہت زیادہ گہرے، اہم اور دور رس ہوتے ہیں، چنانچہ اکتوبر کے جامعہ میں راقم الحروف نے اپنے مضمون "گرانی اور ہندوستان" میں ان بالواسطہ یا بلاواسطہ اسباب اور نتائج سے بحث کی ہی جن کی وجہ سے سب سے اہم اثر یعنی گرانی نمودار ہوتی ہی، اس مضمون میں گرانی کے علاوہ دوسرے معاشی اثرات کا ذکر کیا جائے گا۔

جنگ کا پہلا اثر حکومت کے اخراجات میں زیادتی کی صورت میں نمودار ہوتا ہی، اگرچہ ہندوستان اس جنگ میں برسرِ پیکار ہی مگر اس کی آبادی اور وسعت کو دیکھتے ہوئے اس کے سر جو جنگی اخراجات کا حصہ ڈالا گیا ہی وہ بہت کم ہی، یہ کن مصالح کی بنا پر کیا گیا ہماری بحث سے خارج ہی، البتہ یہ چیز ظاہر ہی کہ جنگ کی وجہ سے حکومت کے اخراجات میں قابل لحاظ اضافہ ہوا ہی۔ اب اس اضافہ کو دو طرح پورا کیا جاتا ہی یا تو نئے محصول لگا کر اور پرانے محصولوں کی شرح میں زیادتی کر کے حکومت اپنی آمدنی بڑھاتی ہی یا پھر قرض لیتی ہی۔ جہاں تک پہلی مد کا تعلق ہی حکومت نے دونوں طریقوں کو اختیار کیا، اور جب کبھی بجٹ پیش ہوتا ہی تو پرانی شرحوں میں زیادتی یا کوئی نیا محصول عائد کر دیا جاتا ہی، مگر محصول عائد کرتے وقت حکومت کو عوام کے جذبات کا بڑا خیال رکھنا پڑتا ہی یعنی ہر نیا محصول عوام کو ناگوار گذرتا ہی، اور اس خیال سے کہ ہر نئے محصول سے ان کی قوت خرید کم ہوتی ہی وہ اس کے خلاف احتجاجی آواز بلند کرتے ہیں، اور یہ چیز ان صورتوں میں اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے جہاں محصول کا بار خود محصول ادا کرنے والی کی ذات پر پڑتا ہی، جنگ کے زمانے میں ہر [illegible]

میں کسی قسم کا شور شغب دیکھنا پسند نہیں کرتی اور نہ وہ اپنی جانب سے عوام کے خیالات خراب کرتی ہے، بالخصوص ہندوستان میں غیر ملکی حکومت ہونے کی وجہ سے اس کا بڑا خیال رکھنا پڑتا ہے چنانچہ حکومت ان اندیشوں سے بچنے کے لئے ایک تو نئے محصول کم لگاتی ہے اور دوسرے عموماً ان ہی محصولوں کی شرح میں اضافہ کرتی ہے جن کو دوسروں پر منتقل کیا جا سکتا ہے، اس طرح محصول کا بار بٹ جاتا ہے اور کسی کو خاص ناگواری نہیں ہوتی اور حکومت کا کام چلتا رہتا ہے، یا پھر حکومت ان چیزوں کے ذریعہ سے اپنی آمدنی بڑھاتی ہے جن سے سب لوگ براہ راست مستفید ہوتے رہتے ہیں، مثلاً ریلوں اور بسوں کے کرایوں میں اضافہ، یا خطوں، پارسلوں، ٹیلیفون اور تار کی شرحوں میں اضافہ۔ مگر اس میں بھی ناگزیر ضروریات میں بہت زیادہ اضافہ نہیں کیا جا سکتا، مثلاً حکومت ہند کو نمک کا اجارہ حاصل ہے، لیکن اب وہ ایسا نہیں کر سکتی کہ ایک دم اس کی قیمت میں دوگنا یا تگنا اضافہ کردے، کیونکہ اس کے اثرات بڑے مہلک ہوں گے، لہذا حکومت کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ اور ان ذریعوں سے آمدنی میں بہت زیادہ اضافہ نہیں ہوتا۔

دوسری چیز قرضہ ہے، یہ بھی دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک وہ جو بیرون ملک حاصل کیا جائے، اور دوسرا جو اندرون ملک لیا جائے، جنگ کی صورت میں بیرونی قرضہ بڑا مہلک ہوتا ہے، کیونکہ یہ جنگی اغراض کے لئے لیا جاتا ہے، اس میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ اپنا اصل و سود خود ادا کرتا رہے، بلکہ بعض اوقات تو اس قرضہ سے ملک کو ضمنی فوائد مثلاً مزدوروں کی اجرت یا ملازمین کی تنخواہ وغیرہ جیسی چیزیں بھی حاصل نہیں ہوتیں۔ کیونکہ بیرونی ملک نقد رقم میں بہت کم قرض دیتے ہیں بلکہ وہ اس رقم کی مشینیں آلات، تیار شدہ مال یا خام مال روانہ کرتے ہیں، نیز یہ قرضہ ہمیشہ سودی ہوتا ہے، گویا اس قرضہ کی اصل و سود کی ادائی ملک پر ایک بار ہوتی ہے، بعض وقت حکومتوں کو اپنے ملک کا کچھ حصہ بطور کفالت پیش کرنا پڑتا ہے۔ اور قرضدار ملکوں کے ساتھ دوسری رعائتیں کرنا پڑتی تھیں مثلاً درآمد و برآمد میں ان کے ساتھ "رعایت یافتہ والی قوم" کے قانون پر عمل کرنا پڑتا ہے۔ غرضیکہ ہر طرح حکومت اور اہل ملک کو اس سے نقصان ہی پہنچتا ہے مگر ناگزیر حالات میں اس کے بغیر چارہ ہی نہیں ہوتا اور ملک کی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے جہاں طرح طرح کی قربانیاں کی جاتی ہیں وہاں اس کے ناقابل برداشت اثرات کو

بھی قبول کیا جاتا ہی۔

دوسری صورت اندرونی قرضوں کی ہی یہ بھی دو طرح کے ہوتے ہیں ایک سودی اور دوسرے بلا سودی اس وقت حکومت ہند یہ دونوں طرح کے قرضے حاصل کر رہی ہی مگر سودی قرضہ کی مقدار زیادہ ہی یہ قرضے بھی غیر پیداوار ہوتے ہیں، لہذا یہاں شرح سود پیدآوری کے لحاظ سے مقرر نہیں کی جاتی بلکہ بعض وقت تو زائد رقم حاصل کرنے کے لئے حکومت کی طرف سے طرح طرح کی ترغیبات دی جاتی ہیں، مثلاً محصول آمدنی معاف کر دیا جاتا ہی یا اس کاروبار پر ٹکٹ لگانے کی ضرورت نہیں ہوتی، ان قرضوں سے بھی ملک کو نقصان پہنچتا ہی مگر اس کے اثرات اتنے خطرناک نہیں ہوتے جتنے کہ بیرونی قرضوں کے ہوا کرتے ہیں۔

حکومت کی ان مشکلات کو دیکھتے ہوئے نہ صرف غیر پڑھے لکھے بلکہ اکثر تعلیم یافتہ آدمی بھی یہ کہا کرتے ہیں کہ کیوں نہ حکومت نئے نوٹ چھاپ چھاپ کر اپنے زائد اخراجات کو پورا کرنا شروع کر دیتی ہے۔ یہ خیال ایک تو ناواقفیت کی بنا پر پیدا ہوتا ہی دوسرے وہ سمجھتے ہیں کہ نوٹ چھاپنے میں حکومت کا کوئی خرچ نہیں ہوتا، نیز اس خیال کو تقویت اس وجہ سے بھی ہوتی ہی کہ جنگ کے زمانہ میں کاغذی زر کا رواج بڑھ جاتا ہی، یہ ٹھیک ہی کہ اس زمانہ میں حکومت کو سونے اور چاندی کی ضرورت ہوتی ہی کیونکہ وہ بیرونی ملک جن کو ہمارا ملک کسی قسم کی چیزیں نہیں بھیجتا بغیر سونے اور چاندی کے سامان نہیں دیتے، اس لئے حکومت ان قیمتی دھاتوں کا کچھ حصہ جو ملک میں گردش کرتی رہتی ہیں، واپس لے لیتی ہے۔ مگر قیمتی دھاتوں کو گردش سے ہٹانے کی بڑی ذمہ داری خود عوام پر بھی عائد ہوتی ہی، عموماً جنگ کے زمانے میں عوام کے دل میں حکومت کی جانب سے ایک قسم کی بدگمانی پیدا ہو جاتی ہی، اس لئے وہ قیمتی دھاتوں کے سکوں کو جمع کرنا یا محفوظ کرنا شروع کر دیتے ہیں اور اپنی ضرورتوں میں نوٹ استعمال کرتے ہیں، یہ چیز بالکل ایسی ہی ہی جیسے ہمارے پاس جب کوئی کھوٹا روپیہ آجاتا ہی تو ہم سب سے پہلے اسی کو چلانے کی کوشش کرتے ہیں، اور اچھے سکوں کو محفوظ رکھتے ہیں۔ جب ہر شخص اس اصول پر عمل کرنے لگتا ہی تو دھاتوں کے سکے غائب ہونے لگتے ہیں اور ملک میں نوٹ ہی نوٹ

نظر آتے ہیں۔ اب تھوڑی دیر کے لئے فرض کر لیجئے کہ حکومت کثیر مقدار میں نئے نوٹ چھاپ چھاپ کر چلانے لگے تو کیا ہو؟ یہ کوئی نئی چیز نہیں ہی اور اکثر حکومتوں نے نازک موقعوں پر الیا کیا ہی ۱۹۱۴ء کی جنگ میں یورپ کے اکثر ملکوں میں یہی ہوا، مگر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ نوٹوں کی قیمت گرنے لگتی ہی، اس کو مثال سے یوں سمجھا جا سکتا ہی کہ پہلے ملک میں چار چیزیں تھیں اور چار نوٹ تھے تو ایک نوٹ میں ایک چیز آتی تھی، اگر اب چیزیں تو وہی رہیں مگر نوٹوں کی تعداد آٹھ ہو گئی، تو ظاہر ہی کہ اب دو نوٹوں میں ایک چیز آئے گی، گویا چیزوں کی قیمت دوگنی ہو گئی یا نوٹ کی قیمت آدھی رہ گئی۔ گذشتہ جنگ میں جرمنی کے اندر نوٹوں کی قیمت اتنی گری کہ معمولی معمولی چیزیں خریدنے کے لئے نوٹوں کی ایک بڑی مقدار دینا پڑتی تھی۔ اور لڑائی ختم ہونے کے بعد حکومت کو خود اپنے ان نوٹوں کو منسوخ کر دینا پڑا، نوٹوں کی کثرت کا ایک اثر یہ بھی ہوتا ہی کہ چیزوں کی قیمتیں دو ہو جاتی ہیں، یعنی اگر دھاتوں کے سکّے دیئے جائیں تو ایک چیز ارزاں مل جاتی ہی اور اگر اسی کے ہم مقدار نوٹ دیئے جائیں تو وہ چیز دستیاب نہیں ہوتی، اس طرح وہ لوگ جن کے پاس نوٹ ہوتے ہیں بڑے نقصان میں رہتے ہیں، عام کاروبار، تجارت، لین دین اور دوسرے شعبوں میں اس کے اثرات بڑے ہولناک ہوتے ہیں۔ لہذا یہ سمجھنا کہ حکومت نوٹوں کی کثیر مقدار چھاپ کر اپنی مشکلات کو دور کر سکتی ہی صحیح نہیں۔ البتہ یہ ہوتا ہی کہ حکومت نوٹ جاری کرنے والے اداری سے بعض دوسری قسم کی امداد نہیں لیتی ہی، مثلاً وہ ایک مقررہ مقدار سے زائد قیمتی دھاتوں کے سکوں کی گردش روک دیتی ہی، یا ذخیرۂ محفوظ کی مقدار گھٹا دیتی ہی یا وہ نوٹ جو سونے اور چاندی کی کفالت پر جاری ہونا چاہئے تھے ان کو تمسکوں کی کفالت پر جاری کرا دیتی ہی۔ اسی طرح حکومت کو بھی فوائد حاصل ہوتے رہتے ہیں اور ملک میں زائد از ضرورت نوٹ بھی گردش نہیں کرتے۔

جنگ کا ایک اثر راشننگ کی صورت میں نمودار ہوتا ہی، یعنی حکومت کی جانب سے اشیاء کی مقداریں معین ہو جاتی ہیں اور کسی فرد کو اس سے زیادہ مقدار نہیں ملتی، حلیف ملکوں میں آج کل تقریباً تمام خوردنی اور اکثر و بیشتر استعمالی اشیاء کا راشننگ ہو چکا ہی، لیکن ہندوستان میں ابھی راشننگ صرف پیٹرول تک محدود ہے، لیکن اگر جنگ طویل ہوتی گئی تو دوسری چیزوں کی

مقدار میں معین کرنا بھی ضروری ہو جائیں گی۔ راشننگ ان چیزوں کا کیا جاتا ہی جن کی حکومت کو بھی جنگی اغراض کے لئے ضرورت ہی اور ملک میں بھی ان کی مانگ ہی، اور وہ چیزیں محدود مقدار میں پیدا یا تیار ہو رہی ہیں، نیز ان اشد ضروری چیزوں کا بھی ہوتا ہی جن کی گو حکومت کو ضرورت نہیں مگر ملک میں ان کا استعمال عام ہی، اور وہ محدود مقدار میں یا باہر سے ایک خاص مقدار میں آرہی ہیں، لہذا راشننگ کے وقت ایک جانب تو حکومت کو اپنے مصالح پیش نظر ہوتے ہیں اور دوسرے جانب یہ بھی اندیشہ ہوتا ہی کہ کہیں مالدار لوگ ان چیزوں کے ذخیرے نہ کرنا شروع کر دیں۔ ایسی صورت میں غریبوں کو یا تو وہ چیزیں دستیاب نہیں ہوں گی یا گراں قیمت پر ملیں گی، اور یہ دونوں صورتیں ملک کے لئے مفید نہیں، لہذا حکومت ہر آدمی کے لئے ایک مقدار معین کر دیتی ہی اور اس کو اس سے زیادہ چیز نہیں ملتی، اور اس طرح مضر اثرات کا ازالہ ہو جاتا ہی۔

جنگ کے معاشی اثرات صرف لڑائی کے زمانے تک ہی محدود نہیں رہتے بلکہ اس کے اثرات بعد میں بھی پڑتے ہیں، بلکہ بعد کے اثرات موجودہ اثرات سے زیادہ بھیانک ہوتے ہیں، مثلاً میدانِ جنگ سے ساری فوجیں واپس آجاتی ہیں، ان میں سے بہت سی فوجیں توڑ دی جاتی ہیں، اور یہ سپاہی بے روزگار ہو جاتے ہیں۔ سپاہیوں کا بے روزگار ہونا بڑا خطرناک ہوتا ہی، چنانچہ گذشتہ جنگ کے اکثر بیکار سپاہی مشہور ڈاکو اور لٹیرے بن گئے، ہر انسان موت سے زیادہ ڈرتا ہی مگر سپاہی اپنی فوجی زندگی میں ہر وقت موت سے کھیلتا ہی اس لئے موت کا وہ ڈر جو دوسروں کے دلوں میں ہوتا اس کے دل میں نہیں ہوتا، اور یہ بہت آسانی سے ہر قسم کے خطرات کو برداشت کر لیتا ہی، چنانچہ اس خرابی کے دفعیہ کے لئے ابھی سے کوشش ہو رہی ہی مثلاً پنجاب میں بہت سی چاہی اور نہری زمینیں بے روزگار سپاہیوں کے لئے مخصوص کی جا رہی ہیں۔ بلکہ بعض صوبوں میں تو سول ملازمتوں میں بھی اس وقت عارضی ملازم لئے جا رہے ہیں جن کا مقصد یہی ہی کہ جنگ کے بعد ان عہدوں پر فوجیوں کا تقرر کیا جائے۔ اسی طرح وہ کارخانے جو خالص فوجی اغراض کے لئے کام کر رہے ہوتے ہیں ایک دم بند نہیں کئے جا سکتے، بلکہ ان کے انجنوں مشینوں، سامان اور عمارتوں کا کوئی معقول انتظام کرنا پڑتا ہی، اور بے روزگار مزدوروں کے لئے بھی کوئی سبیل نکالنے کی ضرورت ہوتی ہی۔ بعض کارخانے بند تو نہیں ہوتے مگر ان کی پیداوار میں کمی کی ضرورت

ہوتی ہے اگرچہ رات کا کام کر دینے یا اوقات کار میں کمی کر دینے سے سامان کی تیاری میں کمی ہوجاتی ہے۔ مگر اس طرح کچھ مزدور بھی بے روزگار ہوجاتے ہیں اور ان کا کوئی علاج بھی کرنا پڑتا ہے۔ پھر اسی وقت مختلف قسم کے مال کی افراطی پیدائش کا بھی بڑا خطرہ رہتا ہے، اس کے دو سبب ہوتے ہیں ایک تو کارخانے اگرچہ اپنے مال کی مقدار گھٹانا شروع کرتے ہیں مگر پھر بھی وہ ایک دم کم نہیں ہوتی، دوسری طرف بازار محدود ہونا شروع ہوجاتا ہے، سپاہی اور کارخانوں کے مزدور بے روزگار ہونا شروع ہوجاتے ہیں اور ان کی قوت خرید گھٹ جاتی ہے اس طرح زائد سامان کا کوئی خریدار نہیں ملتا، اور یہ سامان کارخانوں، اسٹوروں اور دوکانوں میں پڑا رہتا ہے۔

جب کسی علاقہ میں مصیبت آتی ہے یا وہاں کے لوگ قحط، سیلاب یا کسی بڑی آتش زدگی سے تباہ ہوجاتے ہیں تو حکومت ان کی مدد کرتی ہے، اور مدد کرنے کا عام طریقہ یہ ہے کہ وہ مفاد عامہ کے کام شروع کر دیتی ہے، مثلاً اس علاقے میں سڑکیں، نہریں، تالاب بنوانا، یا پرانی چیزوں کی مرمت، یا کسی اور قسم کے تعمیری کام۔ اس طرح مصیبت زدوں کی مدد ہوجاتی ہے اور انھیں کام مل جاتا ہے، اور لوگوں کو بھیک مانگنے یا مفت میں روٹیاں توڑنے کی نوبت نہیں آتی، اور حکومت کا کوئی اچھا کام بھی ہوجاتا ہے۔ مگر جنگ کے بعد حکومت کے لئے ایسے کام کرنا بھی آسان نہیں ہوتے، کیونکہ ہر حکومت فتح کے بعد بھی قریب قریب دیوالیہ ہوجاتی ہے اور اس پر جنگی اخراجات اور جنگی قرضوں کے اصل و سود کا بار اس قدر زیادہ ہوتا ہے کہ وہ عام حالات میں کچھ نہیں کر سکتی، چنانچہ حکومت کچھ تو پرانے قرضوں کو نئے قرضوں میں تبدیل کرکے اور کچھ مزید قرض حاصل کرکے اپنے کام شروع کرتی ہے مگر یہ کام بلا سوچے سمجھے نہیں ہوتا، اور اس پر پہلے سے غور و خوض کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس مرتبہ پہلی بار ہندوستان میں بھی ان امور کی جانب توجہ کی گئی ہے۔ چنانچہ ۲۴ر اکتوبر کو دہلی میں ملک کے مشہور معاشئین کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس کو "مابعد جنگ معاشی نظم کی مشاورتی کمیٹی" کہا جا سکتا ہے اس کا مقصد یہی بتایا گیا کہ ملک کے معاشئین کے بہترین مشورے حاصل کرکے جنگ کے بعد کا ایک ایسا خاکہ تیار کیا جائے جس سے ملک کی تجارت، صنعت و حرفت اور زراعت کو خاطر خواہ ترقی ہوسکے اور

ملک کے لئے ایک معقول معیار زندگی کا تعین ہو سکے، نیز اس پر بھی غور کیا جائے کہ ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کی کس طرح کھپت کی جائے، اس کمیٹی کا افتتاح حکومت ہند کے وزیر تجارت نے کیا، اور انھوں نے اس کے مقاصد کی تشریح کرتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ ہندوستانی تاریخ میں یہ پہلا موقعہ ہی کہ حکومت ملک کے بہترین معاشیں کو جمع کر کے ان سے مشورہ طلب کر رہی ہی، حالانکہ دوسرے ملکوں کے نظام سیاست میں یہ چیز اہم اور نمایاں حصہ رکھتی ہی۔

ہندوستان میں ابتک ایسا کیوں نہیں ہوا اس کے مختلف وجوہ ہیں، مگر اس کا ایک اہم سبب اعداد و شمار کی عدم موجودگی بھی تھی، جب تک کسی چیز کے اعداد نہ ہوں اس کے متعلق کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا جا سکتا، اور اگر اصلاح و تنظیم کی کوشش کر بھی لی جائے تو اس کی مثال اندھے کے تیر کی ہوگی جو ممکن ہی نشانہ پر بیٹھ جائے ورنہ عام حالات میں اس کا خطا ہونا لازمی ہی، بغیر اعداد کے نظریہ اور اس کی عملی صورت میں بڑا فرق ہو جاتا ہی، چنانچہ اس مرتبہ بھی جب حکومت نے اس جانب قدم اٹھایا تو سب سے پہلے اسی جانب توجہ کی، اور حکومت ہند کے معاشی مشیر اور دوسرے سرکاری محکموں تک محدود نہیں رکھنا چاہیئے بلکہ یہ اعلانات اور معلومات غیر سرکاری اداروں مثلاً مزدور سبھاؤں، تجارتی مجلسوں، آجروں کی انجمنوں، دیسی اور انجمن ہائے امداد باہمی سے حاصل کرنا بھی بہت ضروری ہیں۔

حکومت ہند نے اس سلسلہ میں پانچ حسب ذیل کمیٹیاں بنائی ہیں:-

(۱) پہلی کمیٹی مزدوروں کے متعلق ہی جس کا مقصد یہ ہوگا کہ وہ ان مزدوروں کے متعلق غور کرے جو اس وقت جنگی کاموں میں مصروف ہیں اور جنگ ختم ہونے کے بعد بے روزگار ہو جائیں گے، یہ ان طریقوں پر غور کرے گی کہ کس طرح ایک صنعت کے مزدور آہستہ آہستہ دوسری صنعت میں منتقل کر دیئے جائیں۔ تاکہ ملک میں عام بیروزگاری کی شکایت پیدا نہ ہو۔

(۲) دوسری کمیٹی کا مقصد یہ ہوگا کہ وہ یہ غور کرے کہ اس سامان کو کس طرح ٹھکانے لگایا جائے جو اس وقت جنگی فرائض کے تحت کارخانوں میں استعمال کیا جا رہا ہی، اور امن قائم ہونے کے بعد بھی اس بات کی ضرورت ہوگی کہ ان صنعتوں کی سرپرستی کی جائے جن سے جنگ کے زمانہ میں مدد لی گئی ہی کہ اس عرصہ میں یہ صنعتیں

نئے حالات کے مطابق اپنے آپ کو منظم کرلیں۔

(۳) تیسری کمیٹی حکومت کے مفاد عامہ کے کاموں کی توسیع کے متعلق اپنی تجاویز پیش کرے گی تاکہ جنگی کاموں سے نکالے ہوئے بیروزگاروں کے لئے کام مہیا کیا جائے۔

(۴) چوتھی کمیٹی تجارتی اصولوں، درآمد برآمد اور بین الاقوامی تجارتی پالیسیوں کے مدنظر ملک کی تجارتی پالیسی کا تعین کرے گی، نیز یہ سوچنا کہ ہندوستان کو خود مختار اور خود کفیل یا ایک علیحدہ اکائی بنانا کس حد تک قابل عمل اور مناسب ہے اس کے فرائض میں داخل ہوگا۔

(۵) پانچویں کمیٹی دراصل ایک قسم کی تعاونی کمیٹی ہوگی جس میں حکومت کے ان تمام محکموں کے سکرٹری اور ممبر شامل ہوں گے جن کا تعاون اس نظام العمل کے لئے ضرور ہوگا۔

یہ کانفرنس ختم ہوگئی مگر اس کی تفصیلات اخباروں میں شائع نہیں ہوئیں، اب یہ غور وخوض کے بعد جب اپنی اپنی رپورٹیں پیش کریگی تب اس کے متعلق کوئی رائے قائم کی جاسکے گی۔ بہرحال یہ ہیں جنگ کے وہ مختلف معاشی اثرات جن سے ہمارے ملک کو دوچار ہونا پڑرہا ہے۔

محمد احمد سبزواری، ایم اے

لینن

(گذشتہ سے پیوستہ)

سزا کی میعاد ختم ہونے پر جب لینن کو رہائی ملی تو حسب دستور انقلابی جدوجہد شروع کر دی۔ اب کے بار ۳۵۰۰۰ کپڑا تیار کرنے والوں نے ہڑتال کی۔ ان کا مطالبہ تھا کہ ۱۳ گھنٹے کام کے اوقات کو ۱۰½ گھنٹے کر دیا جائے۔ مزدور سبھا نے اس ہڑتال کی سرکردگی کی لینن نے اعلان کیا "ایک عرصے سے مختلف مقامات پر برابر ہڑتالیں ہو رہی ہیں۔ اگرچہ بظاہر یہ ہڑتالیں اپنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہوئیں لیکن مزدوروں کی جدوجہد نے پیٹربرگ کے محلوں کے رہنے والوں کو پریشان ضرور کر دیا ہے۔ سگریٹ کپڑا جوتے بنانے والوں کی ہڑتالوں نے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ ہم استبداد کے خلاف اہسا پر اکتفا نہیں کریں گے اس کے بیان کی ضرورت نہیں کہ خود کارخانہ داروں نے مزدور جماعت کو آزاد کرانے کے لئے ایک مزدور سبھا بنائی ہے جو اس سلسلہ میں وقتاً فوقتاً اشتہارات نکالتی رہتی ہے لیکن ہم یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ سربرآوردہ طبقہ اشتہارات سے نہیں ڈرتا وہ تو صرف عوام کی عملی جدوجہد کے امکانات سے خوف زدہ ہوتا ہے۔" ان حالات میں حکومت نے تشدد شروع کیا۔ گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ سزائیں ملیں۔ بھوک و پیاس کی شدت نے ہڑتالیوں کو بدحال بھی کیا لیکن وہ ہمت مرداں مدد خدا کے اصول پر کاربند رہے۔ چنانچہ چند روز بعد وزیر مال نے اس شرط پر مطالبہ مان لینے کا اقرار کیا کہ ہڑتال ختم کر دی جائے۔ ۱۸ جون ۱۸۹۶ء کو ہڑتالی کام پر واپس آ گئے۔ حکومت اپنے عہد پر قائم نہ رہی چنانچہ پھر ہڑتال ہوئی پھر ہزاروں مزدور گرفتار ہوئے۔ سینکڑوں جلاوطن کئے گئے اس پر بھی ہڑتال برابر جاری رہی یہاں تک کہ حکومت ۱۰½ گھنٹے کام کرنے پر مجبور ہو گئی۔ ہڑتالیوں کی فتح ہوئی تو لینن اور اس کی مزدور سبھا کا وقار تمام ملک میں بہت بڑھ گیا۔ جو سبھا حکومت کو اتنا پریشان کر دے اس کا لیڈر کس طرح آزاد چھوڑا جا سکتا تھا چنانچہ لینن کو گرفتار کر کے منگولیا کے ایک گاؤں میں ۳ سال کے لئے جلاوطن کر دیا۔ اس وقت لینن کی عمر

۴۴ سال کی تھی۔ گاؤں اور وہ بھی منگولیا کے برفستانی علاقہ کا۔ چند گھر تھے۔ آبادی کو انگلیوں پر گن لو۔ پہاڑ اور درخت برف سے ڈھکے ہوئے۔ لق ودق برفیلے میدان جن کا سناٹا بہادروں کے دل ہلادے۔ وہاں کے صبح شام زندگی میں کوئی فرق نہیں ڈالتے تھے۔ البتہ اس برفیلی بیکسی میں دو گرم دل اور ساتھ تھے ایک لینن کی بیوی اور دوسری لینن کی ساس اگر ایک طرف حسن کی کارفرمائی دو دلوں کو ایک کردیتی ہے تو دوسری طرف فکر وعمل کی ہم آہنگی بھی دو روحوں کو ایک دوسرے میں ضم کردیتی ہے۔ یہ تینوں ہستیاں ایک کسان کے مکان میں رہنے لگیں لینن کے کمرے میں ایک چارپائی تھی اور لکڑی کے چار ٹکڑوں پر ایک چوڑا تختہ رکھ کر میز بنالی تھی۔ احباب جلاوطنی میں تحفۃً جو کتابیں روانہ کرتے وہ اس میز پر چن دی جاتی تھیں۔ اس جلاوطنی میں لینن کے لئے ایک دلچسپی ضرور تھی وہ گرد و نواح کے گاؤں میں چلا جاتا جہاں اس کی طرح دوسرے انقلابی جلاوطن قیام پذیر تھے اور ان سے تبادلۂ خیالات کرتا۔ ان جلاوطنوں کے بیانات سے لینن کی غیر سیاسی زندگی پر جو روشنی پڑتی ہے اس کا ذکر یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ لینن شطرنج کا بڑا شوقین تھا اور بیک وقت ۲ کھلاڑیوں سے الگ الگ بازی کھیلتا حافظہ اس غضب کا تھا کہ پردے کے پیچھے کھلاڑی کو بساط دے کر بیٹھا دیتا اور خود پردے کی دوسری جانب سے صرف یادداشت کی بنا پر چالیں بتاتا رہتا لیکن جلاوطنی میں یہ تفریح بھی کم کردی تھی۔ شکار کا شوقین تھا لیکن اگر شکار ضرب کھاکر فرار ہوجاتا تو اس خیال سے کہ زیادہ وقت ضائع جائے گا تعاقب نہ کرتا۔ گاؤں گاؤں دوسرے جلاوطنوں میں اپنے خیالات کی تبلیغ کرتا خود اپنے گاؤں میں ایک جلاوطن فنیش مزدور ایک پولش جولاہا تھا ان کو خود پڑھاتا اور اقتصادیات کے مسئلے سمجھاتا۔ وطن سے اخباروں کا پلندہ آتا تو ایک دفعہ ہی سب کو دیکھنے نہ بیٹھتا بلکہ ایک پروگرام کے مطابق ہر روز چند اخبار کا مطالعہ کرتا اس زمانے میں ...۴ صفحے کی ایک "روس میں سرمایہ داری کا ارتقا" تصنیف کی ایک جلاوطن دوست کا بیان ہے ایک مرتبہ میں اور لینن پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے۔ سورج ڈوب رہا تھا اور موسم غیر معمولی طور پر صاف تھا باتوں باتوں میں لینن نے مارکسی اصولوں پر گفتگو شروع کردی۔ میں نے کسی دوسرے انسان کو اس موضوع پر اتنی مدلل گفتگو کرتے نہیں سنا۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ اگر کسی سیاسی تحریک میں حصہ لینے والے عام طور پر دبیع اور گہری نظر رکھتے

ہوں تو لیڈر کی عدم موجودگی میں وہ ایسے کوتاہ اندیش لوگوں کے پیچھے چل کھڑے ہوتے ہیں جن کا عمل سیاسی خودکشی کے مترادف ہوتا ہے۔ لینن کی جلاوطنی کے بعد بھی یہی ہوا کہ پارٹی نے مسٹر اشرف صاحب کو مزدور سبھا کا لیڈر منتخب کرلیا جنھوں نے اپنے سیاسی نظریئے کا اظہار حسب ذیل اعلان میں اس طرح کیا "اشتراکی نظام سرمایہ داری میں اصلاحات کرنے سے بھی قائم ہوسکتا ہے" یعنی وہ مزدور سبھا کو انقلابی راستہ سے ہٹا کر اصطلاحات کے لئے قانونی طور پر جدوجہد کرنے کے طریقۂ کار پر لے آئے جب مزدور سبھا کے لئے نئے لیڈر اور غیر انقلابی تجاویز کی خبریں لینن اور پنجالوف کو اخبار کے ذریعے سے ملیں تو دونوں بہت پریشان ہوئے لیکن جلاوطن انسان کر ہی کیا سکتا ہے یہ خبر پڑھ کر ایک منگولیا کی برفیلی زمین کو دیکھنے لگا تو دوسرا جینیوا کی جھیل کو تکنے لگا۔ ان دونوں کے نزدیک انقلابی لائحۂ عمل کا ترک اور مزدور سبھا کا اصلاحاتی تجاویز کا منظور کرنا ان کی تمام عمر کی سیاسی جدوجہد کی ناکامی تھی۔ تاریخ کی ورق گردانی سے یہ پتہ تو نہیں چلتا کہ اس خبر کا عملی ردعمل پنجالوف پر کیا ہوا۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ یہ خبر پڑھ کر لینن نے اردگرد کے گاؤں کے انقلابی جلاوطنوں کو جمع کیا اس چھوٹے سے کمرہ میں چھ سات انقلابی جمع ہوئے اور باقاعدہ بحث و مباحثہ ہو کر مزدور سبھا کے غیر انقلابی طریقۂ کار کے خلاف تجاویز منظور ہوئیں۔

تین سال پورے ہونے پر جلاوطنی ختم ہوئی تو لینن۔ اس کی بیوی اور ساس پیٹر گریڈ کو روانہ ہوگئے کس دشواری سے راستہ کٹا اور کیا کیا امنگیں اور آرزوئیں ان کے دلوں میں اس وقت موجیں مار رہی تھیں پسکایا نے اس کا تو ذکر نہیں کیا ہے البتہ یہ لکھا ہے: "ازسرنو سیاسی جدوجہد کی وسیع فضا کے تصور نے لینن کو گرما دیا تھا۔ گاڑی برف پر جا رہی تھی لیکن وہ سردی محسوس نہیں کر رہا تھا۔ اس نے اپنے جسم پر سے پشم کا لبادہ اتار کر ہم دونوں پر ڈال دیا اور تین سو میل تک گاڑی ہانکتا ہوا لے گیا۔ ہم جلدی ہی یورال پہاڑ کے اس پار پہنچ گئے۔" وطن میں آکر دیکھا تو سیاسی فضا بڑی مکدر تھی انقلابی تنظیمات زیب داستان ہو کر رہ گئے تھے۔ جو خواب منگولیا کے برفستانی میدانوں میں دیکھا کرتا تھا وہ معدوم ہونے لگا۔ لینن اس زمانے کے سیاسی حالات بیان کرتا ہوا لکھتا ہے: "میں نے روس واپس آکر"

پایا کہ اہل وطن کے مقاصد اور مطمح نظر تو بہت بلند اور وسیع ہیں لیکن عملی میدان میں کوئی قدم نہیں اٹھاتا۔" لینن چونکہ سراپا فکر و عمل تھا اس لئے فوراً اخبار نکالنے کا ارادہ کر لیا۔ کوئی انقلابی اخبار روس کے حدود میں کس طرح نکل سکتا تھا اس لئے لامحالہ یہی کرنا پڑا کہ کسی غیر ملک میں جاکر اخبار جاری کیا جائے۔ اور خفیہ طور پر روس میں فروخت ہو۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے لینن نے مقام پشیکوف میں خاص متعمدین کا ایک خفیہ جلسہ منعقد کیا جس میں اخبار کا نام جائے طباعت اور تقسیم کرنے کی خفیہ تدابیر طے پائیں۔ اخبار کا نام شرارہ، اور نام کے نیچے یہ جملہ درج کرنا قرار پایا: "شرارہ ہی سے شعلہ پیدا ہوگا۔" سفر کا سامان کرنے اور مارٹروف کو ہمراہ لینے لینن پشیکوف سے پیٹربرگ پہنچا ہی تھا کہ گرفتار کر لیا گیا۔ پولیس نے تلاشی لی تو دو ہزار روبل کے نوٹ جو پریس جاری کرنے کے لئے بڑی دشواری سے جمع کئے گئے تھے اور کچھ کاغذات جن پر دھوبی۔ باورچی کا حساب لکھا ہوا تھا دستیاب ہوئے حکومت انکار کیا کرتی ایک ہفتہ لینن کو حراست میں رکھا پھر رہائی دے دی۔ پولیس کو یہ کیا معلوم تھا کہ جن کاغذات پر دھوبی۔ باورچی اور اسی قسم کے متفرق حسابات درج تھے ان پر دودھ سے وہ تمام امور بھی درج تھے جن کے مطابق انقلابی تحریک شروع کرنی تھی۔ رہائی کے بعد ایک ہفتہ دارالسلطنت میں گذارا پھر ایک جعلی پروانہ راہداری لے کر میونخ پہنچ گیا۔ ۱۹۰۰ء کے آخر میں "شرارہ" کا پہلا پرچہ نکالا اور جرمن کی اشتراکی جمہوری پارٹی کے چند سربرآوردہ ممبروں نے مختلف خفیہ طریقوں پر اخبار روسی حدود میں پہنچایا کچھ ہی عرصے میں روس کے تمام بڑے شہروں میں "شرارہ" بہت بڑی تعداد میں فروخت ہونے لگا۔ لینن کو اپنی تدابیر میں اتنی زیادہ کامیابی ہوئی کہ خود روس میں خفیہ پریس جاری ہو گئے اور "شرارہ" کا ایک ضمیمہ جس میں مقامی حالات پر تبصرہ ہوتا تھا شائع ہونے لگا۔

میونخ میں لینن مَیَر کے مصنوعی نام سے ایک سرائے والے کے ساتھ رہتا تھا جس کمرے میں قلیم تھا اس میں تمام دن کھلنے کی لو۔ بچوں کی چیخ و پکار۔ اور باورچی باورچنوں کی چہل پہل کی بنا پر ایک لمحہ بھی خاموشی نصیب نہ ہوتی تھی اس پر طرہ یہ تھا کہ دن میں بار بار خود سرائے والا آتا اور کہتا "میر دیکھو روپیہ کس مشکل سے جمع ہوتا ہے کس مشکل کا زمانہ ہے۔ اف۔ اف دنیا میں کیسا سخت مقابلہ ہے۔ دنیا کو سوشلزم کی

بڑی سخت ضرورت ہے" یہ تمام باتیں لینن کے مشاغل میں بہت حارج ہوتیں لیکن کرتا بھی کیا. غربت مجبور کرتی تھی کہ غریبوں کے محلہ میں قیام کرے اور غریبوں کے محلہ میں محلوں کا سکون کہاں۔ ہاں جب آپ کا یا میونخ آگئی تو ۱۲ مارک میں گھر کے برتن بھانڈے فروخت کرکے سرائے والے کا حساب صاف کیا اور دوسری جگہ رہنے چلے گئے۔ اخبار کا بہت سا کام مثلاً خفیہ خطوط کو پڑھنا۔ عوام کے سوالوں کا جواب دینا۔ مختلف اخباروں کے فائل بنانا. تراشے رکھنا اور اسی قسم کے بہت سے متفرق کام اب لینن کی بیوی کرنے لگی اور وہ خود زیادہ آزاد ہوگیا لیکن مدت تک میونخ کا قیام نہ رہ سکا روسی حکومت نے پریس کے کارکنوں کو ڈرا دھمکا کر بھگا دیا. مزدور بھاگ گئے تو اخبار بند ہوگیا۔ اب یہ خیال ہوا کہ لندن سے اخبار نکالا جائے چنانچہ لینن اور اس کے ساتھی لندن آگئے۔ سائبیریا کے دوران قیام میں لینن نے کچھ انگریزی پڑھی تھی۔ اس کی بنا پر خیال تھا کہ لندن پہنچ کر اپنا مافی الضمیر تو انگریزی میں ادا کر ہی لیا کریگا لندن پہنچا تو یہ انکشاف ہوا کہ انگریزی کی بول چال سمجھنا محال ہے چنانچہ از سرنو انگریزی پڑھنی شروع کی اور یہ دستور بنایا کہ ہائیڈ پارک میں جاکر تقریریں سنتا۔ جہاں دو چار انگریز کھڑے ہوں وہاں الگ کھڑا ہو جاتا اور ان کی گفتگو پر کان لگائے رکھتا۔ کچھ عرصے ایسا کرنے سے عوام کی گفتگو سمجھ میں آنے لگی اور اخبار کا کام شروع کر دیا۔

لندن کے دوران قیام میں لینن اور اس کے ساتھی مارٹوف وغیرہ قریب قریب رہنے لگے قربت کی وجہ سے تبادلہ خیالات کا زیادہ موقع ملا۔ اب یہ احساس ہوا کہ لینن اور اس کے رفقا کے خیالات اور زاویہ نگاہ میں بہت بڑا فرق ہے۔ جب لندن میں اشتراکی کانگریس کا اجلاس ہوا تو یہ اختلاف منظر عام پر آگیا۔ ایک زاویہ نگاہ کو لینن نے پیش کیا دوسرے کو مارٹوف نے۔ پلیخانوف نے تقریر کرتے ہوئے کہا "جب لینن کی تقریر سنتا ہوں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا زاویہ نگاہ درست ہے اور جب مارٹوف کا استدلال سنتا ہوں تو یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ حقیقت سے دور نہیں ہے۔ کبھی دل میں آتا ہے کہ لینن کی تائید کروں کبھی مارٹوف کی اختلاف کو زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہیئے" اجلاس میں دونوں زاویہ نگاہ پیش ہوئے بحث و مباحثہ کے بعد لینن کا زاویہ نگاہ مسترد کر دیا گیا لینن کو شکست ہوئی لیکن وہ چپ بیٹھنے والا کب تھا اس نے فوراً ہی [illegible]

کہ "شرارہ" کا تعلق اشتراکیوں کی مرکزی کمیٹی سے نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اخبار کی نگرانی کے لئے روس کے باہر کسی غیر ملک میں ایک انتظامیہ کمیٹی بنائی جائے یہ تجویز منظور ہوگئی تو لینن نے یہ تجویز پیش کردی کہ وہ خود اور پیخانوف اخبار کے مدیر اور کارکن مقرر ہوں اس تجویز پر رائیں بھی لینن کے حق میں رہیں ۲۵ رائے لینن کو ملیں اور ۲۳ مارٹوف کو اس طرح اخبار مارٹوف کی پارٹی کے اثر سے نکل کر لینن کی پارٹی کے اثر میں آگیا۔ اس اختلاف نے اشتراکیوں کو دو پارٹیوں میں تقسیم کردیا لینن کے ساتھی بولشیوک پارٹی یعنی اکثریت اور مارٹوف کے ساتھی مینشوک پارٹی یعنی اقلیت کہلانے لگی۔ اب "شرارہ" اخبار لینن اور پیخانوف کے اثر میں آگیا کچھ دن تو کام سہولت سے چلتا رہا اور دونوں کے تخیلات میں ہم آہنگی رہی لیکن ایک عرصے کے بعد استاد اور شاگرد میں بھی اختلاف رونما ہوگیا۔ یہ اختلاف کانگریس کے ایک جلسے میں پیش ہوا لینن نے اپنے زاویہ نگاہ کی تائید میں تقریر کی اور چونکہ حاضرین جلسہ کا رجحان پیخانوف کی طرف تھا اس لئے استعفیٰ دے دیا۔

لینن نے استعفیٰ دے دیا تو مارٹوف اور اس کے ساتھی از سر نو "شرارہ" کے مدیر بن گئے۔ لینن نے دوسرے اخبار کی بنا ڈالنے کی سعی شروع کردی اس نے لندن میں کانگریس کا اجلاس بلایا مینشیوک پارٹی نے لینن کی اس غیر قانونی دیدہ دلیری پر صدائے احتجاج بلند کی لیکن اس نے ایک نہ سنی اس کانگریس نے لینن کو اپنا لیڈر تسلیم کیا بحث ومباحثہ کے بعد اہم ترین مقصد یہ قرار پایا کہ مسلح بغاوت کرکے حکومت پر قبضہ کرلیا جائے جب مسلح بغاوت مطمح نظر ہوا تو لازم آیا کہ وطن کا رخ کیا جائے چنانچہ ۱۹۰۵ء میں لینن جعلی پروانہ راہ داری لے کر پیٹرو گریڈ پہنچ گیا۔ جس طرح ۱۸۵۷ء ہندوستان میں غدر کے لئے ممتاز ہے اسی طرح ۱۹۰۵ء روسی تاریخ میں مشہور ہے۔ کیونکہ اس سال روسی حکومت اور عوام میں اس زور کی ٹکر ہوئی تھی کہ ایک دفعہ تو حکومت پر ہراس طاری ہوگیا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں سیاسی اور اقتصادی ہڑتالوں نے روس کی حالت خراب کردی تھی جو ہاتھ اب تک بھیک مانگتا تھا وہ گھونسا دکھلانے لگا تھا اور جو ہاتھ گولی چلاتا تھا اس میں رعشہ پیدا ہوگیا تھا لینن کے مقاصد کے لئے عوام کی یہ نفسیاتی تبدیلی سازگار تھی اس نے خفیہ طور پر عوام کے انقلابی عمل کی سرگرمی شروع کردی

وہ بھیس بدل بدل کر جلسوں میں شرکت کرتا۔ اپنے چند محرم راز دوستوں کو تقریریں اور اطلانات لکھ کر دیتا جو وہ جلسوں میں پڑھتے اس نے اپنی کمین گاہ سے عوام کو نیا لائحہ عمل دیتے ہوئے لکھا "اب ہمیں صاف طور پر مان لینا چاہیئے اور اس کا اعلان کر دینا چاہیئے کہ ہڑتالیں سیاسی حالات کے مطابق نہیں رہیں ان سے جو فائدہ مرتب ہو سکتا تھا ہو چکا اب مسلح بغاوت کی فوری اور اشد ضرورت ہے اگر ہم نے اس حقیقت کو عوام سے پوشیدہ رکھا تو گویا اپنے آپ اور تمام ملک و قوم کو دھوکا دیا۔" ظاہر ہے کہ سیاسی ہیجان اور اس قسم کے باغیانہ اعلانات کی موجودگی میں زار کی حکومت خاموش نہیں رہ سکتی تھی چنانچہ حکومت نے پٹروگریڈ کی سوویٹ کی منتظمہ کمیٹی کو گرفتار کر لیا۔ ٹروٹسکی جو اس زمانہ میں پیٹرسبرگ کے سوویٹ کا صدر تھا گرفتاری کے حالات بیان کرتا ہوا لکھتا ہے:

"سوویٹ کی مجلس عاملہ کا اجلاس عمارت کی دوسری منزل میں ہو رہا تھا کہ یہ معلوم ہوا حکومت مجلس عاملہ کے تمام ممبروں کو گرفتار کرنے والی ہے فوراً یہ تجویز ہوئی کہ مجلس عاملہ کے چند ممبروں کو جلسے سے چلا جانا چاہیئے تاکہ گرفتاری سے بچ جائیں اور تحریک جاری رکھیں لیکن جب تک اس تجویز پر عمل ہو پولیس نے عمارت کا محاصرہ کر لیا۔ نیچے کی منزل میں جو نمائندہ تھے انھوں نے پولیس کا مقابلہ کرنا چاہا۔ اوپر کی منزل سے صدر نے کھڑکی کھول کر بہ آواز بلند کہا "کامریڈ۔ مقابلہ نہ کرو۔ میں کہتا ہوں کہ اگر کسی نے پولیس کے گولی ماری تو ہم سمجھیں گے کہ وہ ہم میں سے نہیں ہے بلکہ خفیہ پولیس کا آدمی ہے۔ دو چار منٹ کے بعد حکومت کے سپاہی دوسری منزل میں آگئے اور صدر جلسہ اور پولیس میں حسب ذیل مکالمہ ہوا:-

صدر۔ (پولیس کے افسر سے) براہِ کرم دروازہ بند کر دیجئے اور ہمیں جلسے کی کارروائی پوری کر لینے دیجئے (صدر نے حاضرین کی طرف مخاطب ہو کر کہا) ہاں! تو جلسے کی کارروائی جاری رہ سکتی ہے۔ کون صاحب بول رہے تھے۔

مقرر:- (تقریر جاری رکھتے ہوئے) حکومت کے تشدد نے ہمارے لئے ہڑتال
کرنا ناگزیر کر دیا ہے۔ فیصلہ کا انحصار اس امر پر ہے کہ فوج ہمارا ساتھ دے گی
یا نہیں۔ کیا فوج ملک و قوم کی حمایت کرنے کے لئے تیار ہے؟"
جیسے ہی کہ یہ جملہ مقرر کی زبان سے نکلا گرفتاریاں عمل میں آنے لگیں۔ جب یہ خبر عام
ہوئی کہ پیٹربرگ کے سوویٹ کی مجلس عاملہ کے تمام ممبر گرفتار کر لئے گئے ہیں تو پھر
ہڑتال ہوئی۔

اس مرتبہ پیٹربرگ میں صرف .... ۸ مزدوروں نے ہڑتال کی باقی درماندہ و افسردہ فیکٹریوں
میں پہنچ گئے البتہ پیٹربرگ کے علاوہ دوسرے شہروں میں خاص کر ماسکو میں جہاں لینن کا اثر تھا،
کامیاب ہڑتال ہوئی ان ہڑتالوں میں لینن کی پارٹی کا نعرہ تھا " روسیو جاگو! بغاوت اور فتح یا چوڑیاں
اور نامرادی" اس زمانہ میں لینن نے ایک مختصر سی کمیٹی ہڑتال کو بغاوت میں تبدیل کرنے کے لئے بنائی
اس کمیٹی نے خفیہ تدابیر اختیار کرنی شروع کر دیں نتیجہ یہ نکلا کہ بالشیوک اور پولیس میں جھڑپیں ہونے
لگیں۔ عوام کی جرأت دیکھ کر لینن سمجھا کہ سنہرا موقع آگیا ہے اور زار کی حکومت کو طاقت سے دبایا
جا سکتا۔ حکومت بھی یہ سمجھ گئی کہ پولیس ناکافی ہے چنانچہ اِدھر بالشیوک نے شہر کی حفاظتی ناکابندی
کرنے کی کارروائی شروع کی اُدھر حکومت نے پولیس کو ہٹا کر امن عامہ کا قیام فوج کے سپرد کر دیا
گورکی اس زمانہ کے حالات بیان کرتا ہوا لکھتا ہے " تعلیم یافتہ و غیر تعلیم یافتہ۔ آقا و خادم بچے
اور بوڑھے سب ایک ہی جدوجہد میں لگے ہوئے تھے۔ لوگ خوش گپیاں کرتے جاتے تھے۔ اور
فوج کو روکنے کے لئے راستوں پر ہر قسم کا کباڑ لا لا کر ڈالتے جاتے تھے تاکہ فوج فوراً ہی شہر
میں داخل نہ ہو جائے۔" ٹروٹسکی لکھتا ہے: ... ۷ یا ... ۸ مسلح جوان ہمارے پاس تھے اور تقریباً
... ۴ ریلوے والے جن کے پاس صرف تلواریں تھیں وہ ریلوے اسٹیشن کی حفاظت کر رہے تھے
اور باقی ... ۴ پریس اور دکانوں کے ملازمین تھے جن کے پاس بندوقیں تھیں ان کو خاص دستہ
کے طور پر الگ رکھ چھوڑا تھا باغیوں کی کل اتنی ہی ..... طاقت تھی اس لیے سرو سامانی پر بھی بہادر

بولشیوکوں نے زار کی ۲۰۰۰۰ مسلح فوج کو روکے رکھا۔ اس موقعہ پر لینن نے بالشیوک نوجوانوں کے نام حسب ذیل ہدایات جاری کیں: " پہلا اصول یہ ہونا چاہیئے کہ ایک جگہ جمع نہ ہو۔ تین تین چار چار کی ٹکڑیوں میں منتشر ہوکر کام کرو۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ زار کی فوج تمہیں یک لخت نہ کچل سکے گی۔ کسی مقام کو محفوظ سمجھ کر ایک جگہ جمع نہ ہوجاؤ وہاں گولہ باری سے تم تباہ کردیئے جاؤگے۔ کوسک کی فوج پر تاک تاک کر گولی چلاؤ وہ دراصل ہمارے حقیقی دشمن ہیں لیکن بعض فوجی بادلِ ناخواستہ ہماری مخالفت کررہے ہیں ان پر حملہ نہ کرو۔ ہمارا دوسرا کام یہ ہونا چاہیئے کہ شہر کی تنظیم شہریوں کے سپرد کردیں اور خود ایک ایک کرکے شہر کے گردونواح کے مقامات پر قبضہ کرنا شروع کریں۔ "

لینن اس بغاوت میں انجام کار کامیاب تو نہیں ہوا لیکن اس جدوجہد میں ایسے لمحے ضرور آئے کہ طاقت لینن پر مسکرائی اور اس کو گمان گزرا کہ شاید اس کی زندگی کا خواب پورا ہوا چاہتا ہے۔ لینن کی بدقسمتی کہ طاقت کا دامن ہاتھ میں آتا آتا نکل گیا۔ چودہ ہزار ساتھی میدان جنگ میں کام آئے۔ بغاوت دبا دی گئی۔ حکومت نے تشدد کیا ہزاروں بے گناہوں کو دار پر چڑھا دیا۔ ستر ہزار کو جیل میں بھر دیا۔ عوام پر شکست کا ردعمل خراب ہوتا ہے۔ یہی روس میں ہوا۔ حریت پسند سیاسی جدوجہد کو خیرباد کہہ گوشۂ عافیت میں جا بیٹھے۔ انقلابی لائحہ عمل ترک کردیا گیا۔ اور یہ خیال غالب آگیا کہ صرف آئینی جدوجہد جاری رکھی جائے۔ لیکن اہل دل پر شکست کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ان کی ہمت بڑھ جاتی ہے اور ان کے ارادے میں زیادہ تقویت پیدا ہوجاتی ہے۔ لینن پر بھی یہی ردعمل ہوا شکست کو ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ اس نے ایک اعلان کیا: " ماسکو کے باشندوں کی دلیری اور جرأت نے یہ ظاہر کردیا کہ جارحانہ کارروائی کامیابی کے ساتھ ہوسکتی ہے۔ بغاوت کسانوں میں پھیل رہی ہے۔ ملک میں یکے بعد دیگرے بغاوت کی لہریں دوڑ رہی ہیں۔ ہمیں پھر غیر قانونی کارروائی کے لئے تیاری شروع کردینی چاہیئے " اب لینن شکست کے اسباب معلوم کرنے میں مصروف ہوگیا تاکہ آئندہ جدوجہد میں وہ غلطیاں نہ ہونے پائیں جو اس مرتبہ ہوئیں۔ شکست کے اسباب وعلل کی تحقیقات سے لینن حسب ذیل نتیجے پر پہنچا: " بولشیوک کے تنظیمی اداروں نے عوام کے جوش سے پوری

طرح فائدہ نہیں اٹھایا۔ ماسکو کے بہت سے محلوں میں مورچے تیار کرنے کے احکامات اتنی دیر میں پہنچے کہ مضبوط مورچے بروقت تیار نہ ہو سکے۔ نوجوانوں کو اس قدر غلط مقامات پر متعین کیا گیا کہ ہماری کل فوج کا معتد بہ حصہ انقلابی جنگ میں پوری طرح عمل نہ کر سکا۔ چند لیڈروں کی یہ رائے ہے کہ بالشیوک کی حکومت سے ٹکر نہیں لینی چاہیئے تھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ حکومت کا مقابلہ تو ضرور کرنا چاہیئے تھا مگر ہمیں زیادہ پھرتی، ہشیاری اور بہادری سے لڑنا چاہیئے تھا۔"

شکست ہو جاتی ہے تو ہر کس و ناکس شکست خوردہ جماعت کا مذاق اڑانے لگتا ہے۔ چنانچہ مونشیوک بھی بولشیوک کا مذاق اڑانے لگے جب لینن کو ہر طرف سے مایوسی ہو گئی تو کس مپرسی کی حالت میں فنلینڈ کے ایک مقام کوکالا میں جا چھپا۔ لینن کے خاص خاص ساتھی بھی اس کمین گاہ میں جا پہنچے اور از سر نو انقلابی جدوجہد شروع کر دی پہلے افسروں اور سپاہیوں کے لئے ایک کلاس جاری کیا جس میں یہ سکھایا جاتا تھا کہ سڑکوں پر کس طرح جنگ کرنی چاہیئے لینن نے اس کلاس کو ہدایت دیتے ہوئے لکھا "پولیس نے ایک نئی قسم کا خنجر اور یورپ کے ایک کارخانہ نے نئی قسم کی آلاتی بندوق ایجاد کی ہے ہمیں ان نو ایجاد ہتھیاروں کا استعمال سیکھنا چاہیئے۔ انقلابی مزدور طبقہ کو بم بنانا سکھانا چاہیئے اور ان کے لئے بندوقیں ہتھیار اور بم تیار کرنے کا مسالہ فراہم کرنا چاہیئے۔"

یہ حالات تھے کہ اسٹوک ہوم میں اشتراکیوں کی کانگریس ہوئی تاکہ واقعات پر از سر نو غور کیا جائے اور مونشیوک اور بالشیوک کے آپس کے تنازعوں کو رفع کر کے ایک متفقہ پروگرام بنایا جائے لینن نے بھی شرکت کی لیکن کانگریس کو اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی۔ لینن فنلینڈ واپس آ گیا۔ نیم آزاد ملک ہونے کے باوجود فنلینڈ میں زار کا کافی اثر تھا۔ روسی پولیس نے یہاں بھی لینن کی نگہداشت شروع کر دی اور اتنا پریشان کیا کہ وہاں رہ کر کسی انقلابی تحریک کی سرکردگی کرنا اس کے لئے ناممکن ہو گیا اب اس نے پھر جینوا کا رخ کیا۔ اس سفر میں شریک حیات ہمراہ تھی اس کا بیان ہے لینن بار بار کہتا تھا "اب میں دوبارہ اپنے تابوت میں داخل ہو رہا ہوں" لینن کا یہ کہنا کچھ غلط نہ تھا چونکہ بغاوت کے کچلے جانے سے سب پر اداسی چھا گئی تھی۔ زار کے دار و رسن نے عوام و خواص کے جوش حریت کو ٹھنڈا

کر دیا تھا۔ انقلابی تحریک دینے سے پہلے طالب علم۔ وکلا۔ ڈاکٹر۔ مصنف۔ اخباری نمائندے۔ استاد سب پولیشوک کے ساتھ تعاون کر رہے تھے۔ کالجوں کے لڑکے اپنی کتابوں۔ ٹوپیوں۔ جوتوں میں چھپاتی ہوئی خفیہ طور پر انقلابی ادب تقسیم کرتے پھرتے تھے لڑکیاں اپنے سنگھار کے بٹووں میں انقلابی اشتہارات لئے پھرتی تھیں لیکن اب سب کنارہ کش ہوکر روزمرہ زندگی کی مشغولیتوں میں منہمک ہوگئے تھے۔ فنلینڈ سے آتے ہوئے "پرولتاری" اخبار کے کارکنوں کو بھی لینن جینوا لے آیا تھا یہاں اگر اخبار جاری کیا تو خریدنے والا درکنار کوئی پڑھنے والا بھی نہ ملا۔ اب یہ مسئلہ سامنے آیا کہ اخبار کو کس طرح خفیہ طور پر روس پہنچایا جائے۔ اس کے متعلق لینن نے گورکی کو لکھا "کسی ایسی جہاز راں فرم سے، جس کے جہاز روس جلتے ہوں رشتۂ ارتباط پیدا کرو۔ فی الحال یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ کن بندرگاہوں سے روس کی کن بندرگاہوں کو جہاز روانہ ہوتے ہیں اور کتنے وقفے سے ہوتے ہیں یہ ازحد ضروری ہے کہ روس سے ڈاک کے سلسلہ کا فوری اور معقول انتظام کیا جائے۔ کیا کوئی ایسا جہاز کا افسر نہیں مل سکتا جسکو ۵۰ روبل ماہانہ ادا کردیں اور وہ ہماری ڈاک لایا اور لے جایا کرے۔ میں خود کوشش کرتا لیکن یہ مشکل آپڑی ہے کہ اب ہمارا تعلق تعلیم یافتہ طبقہ سے منقطع ہوگیا ہے صرف مزدوروں سے ہمارے تعلقات رہ گئے ہیں۔ یہ بیچارے اپنی ناخواندگی اور افلاس کی بنا پر کوئی کام انجام نہیں دے سکتے"

لینن کی اس زمانہ کی حالت پر تبصرہ کرتا ہوا شیوالوف لکھتا ہے: "جب میں لینن سے ملنے گیا تو دیکھا کہ وہ آدھی آستینوں کی قمیص پہنے سینہ نکلا ہوا کمرے میں ٹہل رہا ہے اس کا ایسا انداز تھا گویا کسی حملہ آور کو روک رہا ہے میں نے اس کے اعصاب پر نظر ڈالی اس کے ہر انداز و ادا کا مطالعہ کیا۔ اس کی گفتگو سنی ان سب میں آہنی ارادے کی جھلک دکھائی دیتی تھی"

(باقی آئندہ)

ایم۔ ایم جوہر میرٹھی

جدید شاعری پر ایک نظر

شاعری کے جدید رجحانات پر اظہار خیال کرنے سے قبل یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ موضوعِ شاعری پر ایک مختصر سی بحث اور تبصرہ کر لیا جائے۔ یہ اعتراض کیا جاتا ہے اور یہ اعتراض ادب کے تاریخی مطالعہ کی روشنی میں صحیح معلوم ہوتا ہے کہ قدیم شاعری کی بنیاد حسب ذیل عناصر پر قائم ہے:۔

(۱) گل و بلبل (۲) ساقی و میخانہ (۳) کعبہ و بتخانہ (۴) شیخ زاہد، واعظ اور ناصح (۵) قاتل و مقتل، (۶) حسن و محبت (۷) تصوف و مذہب۔

اب نئی قسم کی شاعری کا جائزہ لیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی چند مخصوص عنوانات پر مشتمل ہے۔ اور اسکے اہم ترین عنوانات حسب ذیل ہیں:۔

(۱) مزدور (۲) کسان (۳) مذہب و اخلاقیات کا مذاق اڑانا (۴) روٹی۔ پیسہ۔ فقیر۔ کفن۔ بھوک (۵) طوائف (۶) شراب پرستی (۷) حسن و محبت

جس طرح قدیم شاعری پر مخصوص عنوانات میں مقید ہوجانے کا الزام لگایا جاتا ہے، اسی طرح موجودہ شاعری پر بھی یہ الزام عائد کیا جا سکتا ہے جس طرح قدیم شاعری میں اکثر بنیادی عناصر "روایاتی درجے" پر آگئے تھے بالکل اسی طرح نئی شاعری کے اکثر عنوانات " روایاتی" بن گئے ہیں جن کو اصلیت اور حقیقت سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں۔ یہ شاعری معاشی اور سیاسی آزادی اور مساوات کو قائم کرنے کا دعویٰ کرتی ہے۔ انسانی آزادی کے راگ الاپتی ہے۔ اس کی آزادی کا تصور ہندوستان کے موجودہ مسلمہ اخلاقی تصورات کی روشنی میں، بیجا نفس پرستی اور بدتمیزی کا مفہوم رکھتا ہے۔

یہ غلط فہمی نہ ہونا چاہیئے کہ میں قدیم شاعری کی تعریف اور نئی شاعری کی مذمت کر رہا ہوں؟ میرے مضمون کا مقصد یہ ہے کہ میں نفس شاعری سے بحث کروں۔ اور اس لحاظ سے جو کلام بھی "شاعری" کے معیار پر پورا اترتا ہو صرف اس کو شاعری کے نام سے منسوب کروں۔ خواہ وہ جدید کلام ہو یا قدیم خواہ وہ کسی کہنہ مشق

استادکا ہو یا کسی نومشق شاعر کا میں بہ حیثیت ایک ترقی پسند شہری کے، معاشیات، سیاسیات، عمرانیات، فلسفہ، اخلاقیات، مذہب اور سائنس پر فنی اعتبار سے بحث کرنے اور ان میں باہمی ربط و ضبط پیدا کر کے ملک کی عام خوش حالی اور معیار زندگی کو بڑھانے کے جملہ اختیارات و امکانات کو محفوظ رکھ کر صرف ایک شاعر کی حیثیت سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ شاعری کے صرف تین ہی موضوع ہو سکتے ہیں۔

(۱) حیات (۲) کائنات (۳) اختراعی اور حسن کارانہ تخیل

تیسرے عنوان کے متعلق یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ محض حسن کارانہ تخیل بجائے خود شاعری کا کوئی موضوع نہیں ہے وہ ہر شاعری کا حسن ہے۔ خواہ وہ داخلی ہو یا خارجی۔ لیکن اختراعی تخیل شاعری کا ایک موضوع ہے۔ میں نے یہاں تینوں عنوانات بہ حیثیت ایک کل "کے استعمال کئے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زندگی اور کائنات کے ہر مظہر اور ہر منظر پر شاعری کی جا سکتی ہے۔ مثلاً کیا حسب ذیل عنوانات شاعری کا موضوع قرار دئے جا سکتے ہیں۔

۱۔ ہندوستان میں بدھ مذہب کے تنزل کے اسباب۔

۲۔ گیہوں کی پیداوار اور اس کے لئے فائدہ بخش کھاد اور زمین کا انتخاب۔

۳۔ ٹراونکور کے شمال و مغربی حصہ میں، انگور، اناس اور سنترے کی پیداوار کے امکانات۔

۴۔ نیوٹن کے کلیات۔ آئن شائن کا نظریہ اضافیت۔ کانٹ کا نظریہ تنقید عقل۔

۵۔ جاپان کی تجارت خارجہ۔ چلکی کے ساحل کی مدافعت۔ حیدرآباد کا ڈرینج سسٹم۔

۶۔ دردِ گردہ کا علاج۔ کاغذ سازی۔ وائنکس کے فوائد۔ گلبہار ہیر آئیل کمپنی کا تیل۔

تو میرا جواب یہ ہوگا کہ مذکورہ بالا جملہ عنوانات پر شاعری کی جا سکتی ہے۔ غزل گو شعرا کو ان عنوانات کو سن کر تعجب ہوگا اگر یہ کہیں کہ یہ سب عنوانات غیر شاعرانہ ہیں۔ ان کو قطعاً شاعری کا موضوع نہیں بنایا جا سکتا۔ اور تمام علم دوست حضرات جو مذکورہ بالا عنوانات پر معلومات اور عملی تجربہ رکھتے ہیں۔ میری اس بحث پر خندہ زن ہوں گے کہ کیوں کر ان عنوانات پر شعر کہے جا سکتے ہیں۔ مگر نیا شاعر مختلف دلائل سے یہ ثابت کر سکتا ہے کہ ان میں سے ہر موضوع پر شعر کہے جا سکتے ہیں۔ اس کی بحث کی بنیاد "زندگی کی نئی قدریں"، "ماحول کے

تقاضوں"، اور"وقت کی ضرورت" پر مبنی ہوگی جس طرح اکثر قدیم مکتب خیال کے شاعروں نے بغیر جانے بوجھے خودی و بے خودی، من تو شدم تو من شدی، اور دریا بہ حباب اندر، کے مضامین کا ناس مارا ہو اسی طرح نئی شاعر نے بھی ابتداً بطور فیشن کے اور بعد میں ایک پیشہ کی حیثیت سے زندگی کی نئی قدروں، ماحول کے تقاضوں اور وقت کی ضرورت جیسے الفاظ کا استعمال اپنے لئے لازمی اور ضروری کرلیا ہو۔ اس لئے کہ جب تک وہ ان الفاظ کا استعمال نہ کرے گا اس وقت تک یہ نہ سمجھا جائے گا کہ اس نے ماضی سے قطع تعلق کر کے دور جدید میں داخل ہونے کی اہلیت اپنے اندر پیدا کرلی ہو۔ نتیجہ یہ ہو کہ "زندگی کی نئی قدروں"، اور"ماحول کے تقاضوں" کی مٹی پلید ہو رہی ہو۔ اور ہر نیا شاعر جس کو "ترقی پسند" کہلانا مقصود ہو "زندگی کی نئی قدروں" کو اس طرح استعمال کر رہا ہو جس طرح کہ قدیم شعرا خودی و بیخودی کے مضامین باندھتے تھے۔ اور اس پر طرہ یہ ہو کہ یہ نیا شاعر جو سیاسی اور معاشی آزادی اور مساوات قائم کرنے کا دعویدار ہو۔ جو مزدوروں، کسانوں، مفلسوں، اور بھوکوں کو، انتہائی معاشی ترقی دینے کی جدوجہد میں مصروف ہو۔ اور جو قدیم شاعروں پر عورت پرستی کا الزام لگاکر، اپنے آپ کو ان سے ممتاز اور بلند تبلانا چاہتا ہو۔ جو دور مشنری میں اور زندگی کے بدلتے ہوئے تقاضوں میں تہذیب و تمدن کی قدیم اور فرسودہ عمارت کو مسمار کردینے کا عزم بالجزم کر چکا ہو۔ جب خود شعر کہنے کے لئے بیٹھتا ہو۔ تو قدیم شاعروں کی طرح "زلف گرہ گیر" کا اسیر ہو کر رہ جاتا ہو۔ چنانچہ ان شاعروں کے کلام کا مطالعہ کیجئے تو بجز چند مستثنیات کے اور وہ بھی خاص خاص صورتوں میں، اکثر و بیشتر شاعر نجمہ کے ساتھ چاندنی رات کا لطف اٹھاتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ یا پھر "سلمیٰ" کو یہ سمجھاتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ زندگی اور جوانی دونوں ہم معنیٰ الفاظ ہیں :-

میں اس سے متفق ہوں کہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات اور بڑھتی ہوئی ضروریات کا لحاظ رکھنا ازبس ضروری ہو۔ اور شاعر کی نظر اور تخیل کو صرف قدیم شاعری کے عناصر میں محدود نہ ہونا چاہیئے بلکہ زندگی کے دوسرے ہزاروں اور لاکھوں مسائل پر بھی اس کو نظر ڈالنی چاہیئے لیکن یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ زندگی کے دیگر مسائل میں صرف ترقی پسندی کے اجزا ہی کیوں شریک سمجھے جائیں؟ کیا زندگی کے تمام فلسفیانہ، معاشی، سیاسی، اور سماجی مسائل کی وسعت سمٹ کر اور

سکڑ کر صرف انھیں اجزاء میں آگئی ہو جو ترقی پسندی کے لئے لازمی ہیں؟ کہا جاتا ہو کہ مسائل تو اور بھی ہیں لیکن ترقی پسند ادب نے جن مسائل کو اٹھایا ہو، انھیں کے حل میں انسانیت کی فلاح و بہبود مضمر ہے گویا کہ تاریخ انسانی کی ہزاروں معلوم اور نامعلوم صدیاں گذرنے کے بعد اب ایک ایسی جماعت کا انکشاف ہوا ہو جو انسانی فلاح و بہبود کے مقدس فریضہ کو انجام دینے کے لئے زندگی کے ارتقائی دور میں نمودار ہوئی ہو" دوسرے الفاظ میں اس دعویٰ کے معنی یہ ہوئے کہ ہمارے علاوہ دنیا کے تمام سیاسی ادارہ جات، اور انجمنیں، انسانیت کو پستی اور تنزل کی طرف لے جارہی ہیں۔ ترقی پسند شاعری سے مراد، اشتراکی تصور حیات کا پرچار ہو۔ اس سے ہٹ کر اگر کوئی شاعر کچھ لکھتا ہو تو وہ نہ ترقی پسند کہلایا جاسکتا ہو اور نہ اس کے خیال و فکر سے دنیا کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہو۔ گویا ترقی پسندی کے جذبے کا لب لباب یہ ہوا کہ اگر تم اشتراکی زندگی کے حامی ہو اور اس کا پرچار کرنا تم نے اپنی زندگی کا مقصد بنالیا ہو تو تم ترقی پسند ہو ورنہ تم کو ترقی پسندی سے کوئی واسطہ نہیں۔ ترقی پسندی کا معیار کیا ہو؟ جو ہم نے مقرر کر دیا ہو وہی معیار ہو۔ اس شاعری کا مقصد اور منتہا کیا ہو؟ عوام کو اشتراکیت کی تعلیم دینا۔ ان کے سامنے اپنے مکتب سیاست کو پیش کرنا۔ سیاسی جد وجہد کرکے قوت و اقتدار حاصل کرنا۔ اور بالاصرار اشتراکی ریاست قائم کرنا۔

ترقی پسند شاعر چاہو اپنی زبان سے اس کا اقرار کرے یا نہ کرے لیکن یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہو کہ اس کی شاعری کا مقصد نہ زبان وادب کی خدمت کرنا ہو اور نہ ہندوستانی زندگی کی ترجمانی کرنا۔ بلکہ وہ اپنی دانست میں اشتراکیت کو بہترین سیاسی مسلک سمجھتے ہوئے اس کی اشاعت میں اپنا وقت برباد کر رہا ہو۔ اور ایک ایسا نظام حیات ہندوستانیوں کے سر منڈھنا چاہتا ہو جو نہ ہندوستان کے صحیح مفادات کی حفاظت و ترقی میں ممد و معاون ہوسکتا ہو۔ اور نہ ہندوستان کے تاریخی، معاشی اور تمدنی حالات میں اس نظام کے قائم کرنے کے کوئی امکانات موجود ہیں۔ میرے خیال میں یہ ایک ایسی ہی کوشش ہوگی جس طرح کہ روس کے باشندے اپنی تاریخ، قومی روایات اور تہذیب و تمدن کے ارتقاء کو فراموش کرکے چینی زندگی کے تصورات کو اپنے ملک میں رائج کرنے کی کوشش

گئیں۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ اس طرح ترقی پسند شعراء کا مسلک در اصل ایک سیاسی حیثیت رکھتا ہے۔ جو معاشی آزادی اور سیاسی مساوات کا ڈھونگ رچا کر، نئے سانچوں اور نئے تقاضوں کا نقاب ڈال کر، ماحول اور وقت کی پکار کے عنوان سے، اپنی سیاسی تنظیم کو آگے بڑھانے کی خاطر شاعری سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے۔ مگر دوسری سیاسی تنظیموں سے تعلق رکھنے والے اس کے "انداز قد" کو اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ وہ اس جماعت کے اثر، نفوذ، اور وسائل سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ لیکن وہ اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے نہ تو شاعری کی مٹی پلید کرتے ہیں اور نہ زبان میں اونٹ پٹانگ جدت طرازیاں کر کے اس کو برباد کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بالکل ہی جداگانہ سوال ہے کہ آیا ان کو اس جماعت کی تقلید کرنی چاہیئے یا نہیں۔ اس طرح یہ نام نہاد ترقی پسند شعراء کی مٹھی بھر جماعت جو بیک وقت اپنے آپ کو شاعر، فلسفی، سائنسدان اور دنیا کے تمام دیگر علوم و فنون کا ماہر سمجھتی ہے اردو زبان کو بطور ایک "زینۂ اولین" کے استعمال کر رہی ہے۔ زبان کی ترقی اور سدھار سے نہ اسے کوئی دلچسپی ہے اور نہ یہ اس کے سیاسی پروگرام میں شامل ہے۔ اس کے ادب کا بیشتر حصہ صرف "پروپیگنڈا لٹریچر" ہے اور اس سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس جماعت کے اعمال نامہ کو سامنے رکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو زبان کے حق میں یہ جماعت "نادان دوست" کا کام کر رہی ہے۔

سیاسیات و معاشیات میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہر سیاسی جماعت معاشی تنظیم کو اپنے پروگرام کا اہم جزو قرار دیتی ہے اور اپنی افادیت اور ترقی پسندی کی صلاحیت کو منوانے کے لئے ہزار ہا دلائل پیش کرتی ہے۔ ان سیاسی مکاتب خیال کا تو ذکر ہی کیا جو بین الاقوامی حیثیت سے ہر ملک کی سیاست کو متاثر کر دیتے ہیں، ہندوستان ہی کی سیاسی گتھی کو لے لیجئے۔ مسلم لیگ کے نقطہ نظر سے بجز پاکستان کے ہندوستانی سیاست کا کوئی دوسرا بہترین حل نہیں ہے۔ کانگریس پریس اور پلیٹ فارم نے اپنی پوری قوت سے اس دعویٰ کی تردید کی ہے۔ ہندو مہا سبھا نے کانگریس کے مطالبۂ آزادی اور قومیت کے تصور پر ہزاروں اعتراضات کئے ہیں اور کر رہی ہے۔ غرضکہ سیاسی اداروں میں اغراض و مقاصد کے تحت نوک جھونک ہونا ایک فطری اور ناگزیر امر ہے۔ جمہوریت نے اشتراکیت پر اور نازیت نے جمہوریت پر کیا مختلف علمی، عملی اور فنی اعتراضات نہیں کئے۔ اور کیا یہ تمام گتھیاں سلجھا دی گئی ہیں

کیا دنیا کی پوری آبادی اس نتیجہ پر پہنچ گئی ہے اور کیا یہ ممکن ہے کہ صرف کسی ایک مکتبِ خیال پر سب متفق ہو جائیں؟ اگر ترقی پسند شاعر جو مسلمہ طور پر اشتراکیت کا ایجنٹ ہے اپنے مسلک اور پالیسی کو واضح کرکے اپنے ہی حدود میں رہ کر کام کرے تو اس سے صرف سیاسی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے افراد ہی تعارض کریں گے۔ ادب اور زبان سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کا وجود اور عدمِ وجود دونوں برابر ہیں۔ مگر وہ اپنے چہرہ پر ادب اور زبان کا نقاب ڈال کر آتا ہے اس لئے اس سے بہ حیثیت ایک شاعر کے نہیں بلکہ سیاست کے طالب علم کی حیثیت سے یہ درخواست ہے کہ وہ دنیا کے جملہ سیاسی لیڈروں کی ایک گول میز کانفرنس طلب کرے اور ہمیشہ کے لئے اس کا تصفیہ کرائے کہ سوائے اشتراکیت کے اور کوئی سیاسی مسلک عموماً دنیا کی اور خصوصاً ہندوستان کی خوش حالی اور نجات کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ اور اس کے بعد اپنے اغراض و مقاصد کی ایک فہرست مرتب کرکے شاعروں میں تقسیم کردے۔ کہ آئندہ سے سوائے عنوانات مندرجۂ فہرست کے کسی اور موضوع اور عنوان پر شاعری نہ کی جائے۔ ہندوستانی عوام نہ تو بیوقوفوں کی جنت میں رہتے ہیں اور نہ شیخ چلی کی طرح ایک رنگین مگر ناممکن الحصول مستقبل کا خواب دیکھتے ہیں۔ ہندوستان کی ہر سیاسی جماعت اچھی طرح جانتی ہے کہ جب اشتراکی خیالات کا پرچار کرنے والا شاعر یہ کہتا ہے کہ وہ زبان کی خدمت اور اس میں اضافہ کر رہا ہے یا نئے رجحانات اور خیالات کی وسعت پذیری کو مدِنظر نئے سانچے ڈھال رہا ہے، تو سوائے اس کے کہ وہ اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہے اور کسی کو دھوکا نہیں دیتا۔

بہرحال ان تمام سیاسی مباحث کو چھوڑتے ہوئے جو اشتراکی شاعری کے ضمن میں لازماً پیدا ہوتے ہیں یہ بتلا دینا ضروری ہے کہ شاعری کے لئے کسی خاص موضوع کا متعین کر دینا ناممکن ہے اور آرٹ کے نقطۂ نظر سے یہ ایک مہمل اور ناقابلِ عمل حدبندی ہوگی۔ یہ تو آرنلڈ کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ اس قسم کی کوئی چیز وجود نہیں رکھتی جسے شاعرانہ موضوع کہا جا سکے۔" ایف ڈبلیو بیکن نے شاعری کا فن میں موضوع شاعری پر بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ارسطو کے نزدیک شاعری کا موضوع انسان کی زندگی ہے اس کے قلبی واردات، نفسیاتی حرکات اور اس کے اعمال۔

شاعری کا موضوع حیات ہی۔ اور ہر شاعر اپنے ذوق، وجدان، اور ذہنی کیفیات کے لحاظ سے حیات میں سے چند عنوانات کو اپنی شاعری کا موضوع قرار دیتا ہی۔ حیات میں سے کن اجزاء کو شاعری کے لئے منتخب کرنا چاہیئے اس پر لوڈیل سی اسمتھ نے اپنی کتاب ورڈ سورتھ کی ادبی تنقید، میں بہت ہی معقول رائے کا اظہار کیا ہی۔ اس کا خیال ہی کہ "شاعری کی ایک شاندار خصوصیت یہ ہی کہ اس کا مواد ہر اس موضوع سے فراہم ہو جاتا ہی جس سے انسان کو دلچسپی ہو سکتی ہی" اسی طرح آرنلڈ نے ۱۸۲۵ء کی نظموں کے دیباچے میں بیان کیا ہی کہ "شاعری کے ابدی موضوعات افعال ہیں۔ اور وہ خارجی افعال جو انسان کے بنیادی جذبات کو شدّت سے متحرک کرتے ہیں"

مذکورہ بالا آرا پیش کرنے سے یہ واضح کرنا تھا کہ شاعری کا کوئی خاص موضوع نہیں ہی۔ شاعر زندگی کے ہر منظر اور کائنات کے ہر منظر پر شعر کہہ سکتا ہی۔ لیکن شاعری خواہ کسی موضوع پر کی جائے اس میں انسان کی دلچسپی کے بنیادی اجزاء کا پایا جانا ضروری اور لازمی ہی۔ عبدالقیوم صاحب باقی کا یہ خیال بہت ہی معنی خیز ہی کہ شاعری "غربال حیات" ہی۔ اس میں اس کی گنجائش نہیں ہی کہ کچرا کوڑا، غلاظت اور گندگی، تعفّن اور سڑاہند کو شامل کر دیا جائے۔ اور اگر بفرض محال شاعر اپنے مشاہدات اور تجربات کے سلسلہ میں ان چیزوں کو بھی نظم کا جامہ پہنانا چاہے تو اس کا خیال رکھنا ضروری ہی کہ اس کی نظم "مس میو کی کتاب یعنی ڈرینج آفیسر کی رپورٹ نہ ہو جائے۔ شاعری میں جو چیز آ سکتی ہی وہ صرف زندگی، کائنات اور تخیل کا نچوڑ اسپرٹ اور ست ہی۔ ٹینی سن کا یہ خیال حقیقت پر مبنی ہی کہ "شاعری کو اگر دنیا کے سامنے پیش کرنا ہی تو شاعری کو انسانی زندگی کا 'پھل اور پھول' ہونا چاہیئے" مثلاً امونیا گیس کی تیاری ایک صنعتی مسئلہ ہی۔ اس کو شاعری کا موضوع بنانا نری حماقت ہی اور یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ جو شاعر صاحب "امونیا گیس کی تیاری" پر فکر فرمائیں گے۔ وہ کس حد تک ان میں شعریت پیدا کر سکیں گے۔ اور کس حد تک علم کیمیا کے واقف کاروں کو مطمئن کر سکیں گے۔ لیکن امونیا گیس کے شعلے کی دلفریبی، اور دلکشی شاعری کا موضوع ہو سکتی ہی۔ گلاب کے پودوں کا لگانا اور ان میں مناسب اور مفید کھاد کے ذریعے خوشبو، رنگ اور خوشنما پھولوں کا پیدا کرنا فن زراعت سے متعلق ہو لیکن

گلاب کا جمالیاتی مطالعہ شاعری کا موضوع ہو سکتا ہے۔ ہندوستانی کسان اور مزدور کے اعداد شمار فراہم کرنا، ان کی اوسط آمدنی اور اخراجات میں تطابق پیدا کرنا، محنت اور سرمایہ میں باہمی توازن پیدا کرکے ان کو منظم طریقہ پر ترتیب دینا، ان کے بچوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرنا، یہ سب معاشی مسائل ہیں۔ لیکن ان کے نفسیاتی حالات، ذہنی زندگی، اور جذباتی کش مکش کا مطالعہ شاعری کا موضوع بن سکتا ہے۔ اسی طرح محبت کی کیفیات کے اظہار میں (خواہ وہ محبت افلاطونی نظریہ پر مبنی ہو یا فرائڈ کے نظریہ پر خواہ وہ کوئی خالص حیوانی اور کاروباری حیثیت رکھتی ہو یا روحانی و وجدانی) سماجی رکاوٹوں کا دکھڑا، اپنے یا محبوب کے معاشی حالات کا رونا، خاندانی خصومتوں کا تذکرہ، محبوب کے اور اپنے معاشرتی درجات کے تفاوت کا اظہار، محبوب کو حاصل کرنے کے لئے اپنی اور اپنے دوست واحباب اور عزیز و اقارب کی کوششوں اور اس کے مختلف مراحل و مدارج کا بیان نہ صرف غیر ضروری، غیر دلچسپ اور تضیع اوقات کا باعث ہے بلکہ اجتماعی مسائل حیات میں ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ البتہ محبت میں قلب و ذہن پر گذرنے والے جذبات و خیالات کی کش مکش اور اس کے نچوڑ کو شعر کی گرفت میں لے لیا جائے تو اس سے متاثر ہونے پر انسان مجبور ہو جاتا ہے، مثلاً یہ شعر مذکورہ بالا دعویٰ کی ایک کامیاب مثال ہے ؎

یہ میری شومیٔ قسمت کہ تم کو پا نہ سکا
غرورِ عشق امارت کے بت کو ڈھا نہ سکا　　　(جمیل فاروقی)

جگر کے یہ دو اشعار جنسی زندگی کی خاص کیفیات اور واردات پر مبنی ہیں۔

کچھ نہ کہا اور بس یونہی چل دئے　　　کچھ نہ سنا اور خفا ہو گئے

یا

جیسے رونق تری قدموں سے وہ کہہ چھین لی رونق　　　وہ لاکھ آباد ہو اس گھر کی ویرانی نہیں جاتی

یا غالب کا یہ شعر ؎

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ　　　اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

میں ان رنگین افسانوں کی جو ان اشعار کی اسپرٹ میں پائے جاتے ہیں تشریح و توضیح کرنے کا

لطافت اور نزاکت کو برباد کرنا نہیں چاہتا۔ ان اشعار کو سمجھنے کا تعلق دماغ سے نہیں دل سے ہی۔ ان کے معنی سمجھنے سے زیادہ محسوس کئے جاتے ہیں۔ یہ خاص ذہنی کیفیتوں اور قلبی واردات کا نچوڑ ہیں۔ یہ جذبات انسانی ہیں۔ خواہ کوئی شخص مزدور ہو یا کسان، سرمایہ دار ہو یا غریب، جو بھی ان حالات سے گذرا ہو، وہ ان جذبات کو ضرور محسوس کرتا ہی یہ اور بات ہی کہ اتنی لطافت اور پاکیزگی کے ساتھ نہ کرتا ہو اور نہ کر سکتا ہو ان کے اظہار پر قدرت نہ رکھتا ہو۔ اب اگر جگر سے یا غالب سے ان اشعار کے "محرکات" کو دریافت کیا جائے تو وہ ایک طویل فہرست ایسے واقعات کی پیش کردیں گے جو ایک کامیاب ڈرامے، دلچسپ افسانے اور دلکش ناول کے لئے مفید مواد کا کام دے سکتی ہی۔ لیکن شاعری میں اس فہرست کا کوئی قیام نہیں۔ اس لئے کہ شاعری خواہ کسی موضوع پر کی جائے اس موضوع کا نچوڑ ہونا چاہیئے نہ کہ خود موضوع۔ اس کی کامیاب مثالیں جوش کے "کسان" "نا سزا جوانی" اور "انگیٹھی" میں پائی جاتی ہیں۔ شوق قدوائی کا "آئینہ خیال" بھی ہندوستانی ازدواجی زندگی کی ایک بہترین مثال ہی۔ مخدوم کا "پرسہ" اور نظر کی "وداع" بھی زندگی کا نچوڑ ہیں۔ میں جس چیز کو مثالیں دے کر زندگی کے نچوڑ اور اسپرٹ سے تعبیر کر رہا ہوں اس کو شاعری کا موضوع بنانا، قابلیت، محنت، عملی تجربے، اور دماغ و قلب کی ایک خاص متوازن کیفیت کا کام ہی۔ قدیم شعراء نے اس کو شاعرانہ انداز میں "حاصل زیست" کے نام سے تعبیر کیا ہی۔

نیا شاعر خواہ دانستہ یا نادانستہ ان تمام نزاکتوں اور باریکیوں میں نہیں جاتا اس لئے کہ زندگی کے گوناگوں مسائل کی کثرت اور وقت کی قلت کے باعث وہ ان کو ترک کردینے پر مجبور ہی۔ وہ عوامی خیالات کا پرچار کرنے والا شاعر ہے۔ عوامی خیالات اور زندگی کی ترجمانی سے کیا مراد ہی؟ اشتراکیت کی اشاعت۔ کس قدر دلچسپ منطقی استدلال ہی۔ اس کے استدلال کی صداقت کا تجزیہ کرنے کے لئے کسی شاعر یا آرٹسٹ کی ضرورت نہیں۔ بلکہ ہر سنجیدہ اور متمدن شہری کرسکتا ہی۔ میں عوامی خیالات اور زندگی کی ترجمانی کے متعلق اب تک اجمالی طور پر کچھ بیان کر چکا ہوں، کسی قدر وضاحت اور تفصیل کے ساتھ پھر اسی موضوع پر بحث کروں گا۔ یہاں اس قدر ذہن نشین کر لینا ضروری ہی کہ اب سے کچھ

عرصہ پہلے اشتراکی شاعری ہندوستان میں نام کو نہ تھی اور اگر تھی بھی تو برائے نام جس کا نہ کوئی اثر تھا اور نہ وزن۔ لیکن خوش قسمتی یا بدقسمتی سے جیسے ہی روس اور برطانیہ متحد ہوگئے، اشتراکی بھی منظرِ عام پر آنے لگے۔ اور برطانیہ نے اپنے اغراض و مقاصد کی پیش رفت میں ان کی باگیں کسی قدر ڈھیلی کر دیں جنگ کیا صورت اختیار کرے گی انگریز اور روس کی دوستی ایک دوسرے کے ساتھ خلوص و ہمدردی پر مبنی ہے یا مجبوری اور جنگی حکمتِ عملی پر۔ دیرپا ہے یا جنگ کے زمانہ میں قائم رہے گی۔ برطانوی شہنشاہیت کا روس کی امداد کرنا خود اس کے اپنے سیاسی مفاد کے لئے ضرورت ہے یا اشتراکیت کے قیام کے لئے۔ کمیونسٹ کیوں اتحادیوں کو عملی امداد دینے اور تعاون کرنے پر آمادہ ہیں اور سوشلسٹ صرف ہمدردی کیوں رکھتے ہیں۔ جنگ کے بعد برطانوی شہنشاہیت، امریکن سرمایہ داری اور اشتراکیت میں سے کون، کہاں غالب رہے گا۔ اور اس کے اثرات و نتائج کیا ہوں گے۔ یہ اور اسی قسم کے متعدد سوالات ہیں جو سیاسی نوعیت رکھتے ہیں۔ ان پر میں بہ حیثیت ایک شاعر کے سوچنے کی نہ ضرورت سمجھتا ہوں اور نہ یہ میرے مضمون سے براہِ راست متعلق ہیں۔

نئی شاعری کا مطالعہ کرنے اور اس کو سمجھنے سے پہلے چند اصولوں کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے اولاً پڑھنے والے کے ذہن میں وہ تمام بلند بانگ دعوے ہونے چاہئیں جو اس شاعری کی تائید میں پیش کئے جاتے ہیں۔ مثلاً معاشی اور سیاسی مساوات کی اشاعت، سرمایہ داری کو نیست و نابود کر دینے کی خواہش۔ مزدوروں اور کسانوں کو نظام سرمایہ داری کے مظالم سے رہائی دلانے کی کوشش، انقلاب آفرینی، ایک بہتر، مستحکم، اور پرمسرت معاشرہ کی تخلیق وغیرہ۔ اور نئی شاعری میں ان کو تلاش کرنا چاہئے کہ کیا واقعی یہ تمام چیزیں اس میں موجود ہیں یا محض باتیں بنانے کی حد تک ہی ان اصولوں کا اظہار کیا جاتا ہے۔ شاعری کی بنیادی خصوصیات بھی اس شاعری میں پائی جاتی ہیں۔ یا یہ محض ایک "تک بندی" اور "دماغی بحران" ہے۔

چونکہ جوش مسلمہ طور پر اس گروہ کے "امام وقت" تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اس لئے میں انھیں کے متعلق اپنی نہیں بلکہ ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی رائے پیش کروں گا۔ ڈاکٹر صاحب ۱۹۴۱ء میں

اردو ادب" کے عنوان پر تقریر کرتے ہوئے (جو ۷؍فروری ۱۹۴۲ء کی "آواز" میں چھپی ہی) فرماتے ہیں کہ
"جوش وخروش اور انقلاب کے نعروں سے ان کا کلام گونج رہا ہی۔ لیکن انقلاب کیا ہی نظام جدید سے کیا
مطلب ہی اس سے انھیں بحث نہیں۔ انھیں تو غارت گری سے مطلب ہی۔ ان چیزوں میں ان کی حالت
ایک مشتعل مزاج تماشائی کی سی ہی۔ جس پر بیتتی ہی اور اپنے اصول کی خاطر سب کچھ تج دیتا ہی۔ اور طرح
طرح کے عذاب اور اذیتیں سہتا ہی اس کی آواز کچھ اور ہوتی ہی۔ جوشؔ کے کلام کو پڑھ کر لطف وسرور
ضرور حاصل ہوتا ہی لیکن اس میں بلندیٔ فکر اور تاثیر نہیں"

میرے خیال میں ڈاکٹر صاحب کی یہ زیادتی ہی کہ وہ کسی شاعر کے کلام میں ڈاکٹر اقبالؔ کے
سوائے، ایسے حقائق اور ٹھوس حکیمانہ نظریات دریافت کرنے کی کوشش کریں جس پر کسی ملت یا
قوم کی حیات اجتماعی کا سنگِ بنیاد رکھا جاسکتا ہو۔ جوشؔ کے کلام میں تخریبی ذہنیت پائی جاتی ہی۔ اور
وہ دورِ حاضر کی گوناگوں پریشانیوں سے خطرناک حد تک متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ زندگی کے انفرادی
اور اجتماعی مسائل میں وہ خود پریشان اور مشتعل ہو گئے ہیں۔ ان سے یہ امید رکھنا کہ وہ نئے نظام کا کوئی
خاکہ پیش کریں گے یا چند بنیادی اصولوں سے ہندوستان کو روشناس کرائیں گے جن پر ایک نئی مملکت
اور نیا معاشرہ قائم کیا جائے گا، عبث ہی۔ نہ وہ اس کے اہل ہیں اور نہ یہ ان کا منصب ہی۔ رہبری کرنے
اور سیاسی ومعاشی مسائل کو سلجھانے کے لئے ایک سنجیدہ اور مدبرانہ ذہن کی ضرورت ہی نہ کہ شاعرانہ اور
جذباتی تعقل کی۔ پھر بھی جوشؔ ایک جلیل القدر اور پُرجوش شاعر ہیں۔ اور ان کی شاعری شاعری کی جملہ خصوصیات
سے آراستہ ہی۔ انھوں نے آزاد اور بے قافیہ نظم کو اپنے اظہارِ خیال کا ذریعہ نہیں بنایا۔ اور نہ وہ ردیف
وقافیہ کی بندشوں کو اوروں کی طرح اظہارِ خیال میں مانع سمجھتے ہیں۔ میری رائے میں وہ کوئی مفکر نہیں
بلکہ حقیقی معنی میں متفکر ہیں۔

مخمورؔ جالندھری اپنی ایک نظم "اشتباہ" میں فرماتے ہیں کہ ؎

ہاتھ میں اُجلا تولیہ لے کر جب میں نہانے جاتا ہوں　　صابن، کنگھی، تیل وہاں پہلے ہی سے رکھے ہوتے ہیں
سب سے اچھا لباس بھی اک کھونٹی پہ ٹنگا ملتا ہی مجھے　　بوٹ کے فیتے کسنے نہیں پاتا ہوں ابھی میں اچھی طرح

مکھن، توس، پیالی چائے کی میز پہ رکھ دی جاتی ہے میری کپ میں اوروں کی نسبت دودھ زیادہ ہوتا ہے

ملاحظہ فرمایئے کہ ان اشعار میں کس قدر بے ساختہ پن اور سادگی پائی جاتی ہو۔ شاعر نے خلوص اظہار کا حق پورا ادا کر دیا ہو۔ یہ روزمرّہ زندگی کی باتیں ہیں، جن پر اب تک کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ واقعی دنیائے ادب کو مخمور صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ صاحب موصوف نے بڑی تحقیق و تلاش کے بعد اُردو ادب کو ایسے خیالات سے روشناس کر دیا ہو جس کو اُردو کے شاعروں نے اب تک نظر انداز کر دیا تھا۔ لیکن کیا یہی انقلابی شاعری ہے؟ کیا اسی شاعری سے زندگی کی نئی قدروں اور ماحول کے تقاضوں کی ترجمانی ہوتی ہو؟ کیا "دندان تو جملہ در دہان اند" زندگی کی شاعرانہ ترجمانی کرنے کے لیے کافی ہو۔

ن۔م۔ راشد اپنی ایک نظم خودکشی میں فرماتے ہیں کہ ؎

کر چکا ہوں آج عزمِ آخری
شام سے پہلے ہی کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوکِ زباں سے ناتواں
صبح ہونے تک یہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند

دو تین مصرعوں کے بعد پھر ارشاد ہوتا ہو کہ ؎

میرا عزمِ آخری یہ ہے کہ میں !
کود جاؤں ساتویں منزل سے آج
آج میں نے زندگی کو پا لیا ہے بے نقاب
آتا جاتا ہوں بڑی مدت سے میں
ایک عشوہ ساز پرزہ کار محبوبہ کے پاس
اس کے تختِ خواب کے نیچے مگر
آج میں نے دیکھ پایا ہو لہو

پھر چند مصرعوں کے بعد بیان فرماتے ہیں کہ ؎

جی میں آئی ہے لگادوں ایک بے باکانہ جست

اس دریچے میں سے جو

جھانکتا ہے ساتویں منزل سے کوئی بام کو

نظم میں عام طور پر ایک مرکزی خیال ہوتا ہے اور جیسے جیسے نظم بڑھتی جاتی ہے اس کا مرکزی خیال بھی زیادہ واضح اور روشن ہوتا جاتا ہے اور اس کو سمجھنے کے لئے ابتدائی اشعار سے ذہن میں ایک خاکہ مرتب ہوتا ہے۔ اور پھر ہر آگے کا شعر نظم کے تدریجی ارتقاء کو نمایاں کرتا جاتا ہے۔ لیکن اس نظم کی خوبی یہ ہے کہ اگر واقعی اس کے کچھ معنی ہو سکتے ہیں تو آخری اشعار سے ابتداء کی جائے اور ابتدائی اشعار پر نظم کو ختم کیا جائے اس طریقۂ عمل سے تھوڑے بہت معنی سمجھ میں آسکتے ہیں ورنہ لاکھ کوشش کر لیجیے کیا ممکن جو کچھ بھی مطلب نکل سکے۔ میری سمجھ میں جہاں کہیں اس نظم کا مطلب سمجھ میں آیا ہے وہ یہ ہے کہ "شاعر ایک ہرزہ کار وعشوہ ساز محبوبہ کے پاس ایک زمانہ دراز سے آتا جاتا ہے جو ایک عمارت کی ساتویں منزل پر رہتی ہے۔ اور اس کے کمرے کی کھڑکی ایک کوئے بام کی طرف کھلتی ہے۔ شاعر نے اس کے تختِ خواب کے نیچے تازہ درخشاں لہو دیکھ پایا ہے۔ جس کو دیکھ کر وہ اس محبوبہ سے انتقام لینے پر آمادہ ہوگیا ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس کو ایسے مواقع حاصل نہیں یا اتنی جرأت نہیں کہ وہ اس محبوبہ کو ہلاک کر دے۔ اس لئے قہر درویش برجان درویش۔ ناچار غریب خود ہی اس کھڑکی میں سے جست لگا کر اپنے آپ کو ہلاک کر لینا چاہتا ہے اور اس کا وہ عزم کر چکا ہے" مگر دیوار کو نوک زبان سے چاٹنا اور اس کا صبح تک دوبارہ بلند ہو جانا، لہو کا پایا جانا، یہ سب ایسے معمے ہیں، جو انسانی عقل وادراک سے بالاتر ہیں۔ یا پھر زندگی کے وہ تقاضے ہیں، جو انقلاب کے طوفان کو اپنے اندر چھپائے ہوتے ہیں۔ اور ن۔م۔ راشد صاحب کھلم کھلا ان کا اظہار اس لئے نہیں کر رہے ہیں کہ برطانوی سیاست اس کی اجازت نہیں دیتی۔ یہی وہ مایۂ ناز شاعری ہے جو ترقی پسندی کے کیمپ سے روزانہ نکلتی رہتی ہے۔ جو مزدور اور کسان، انسان اور مشرق، محنت و سرمایہ کے مسائل کا حل تلاش کر رہی ہے۔

ایک دوسری نظم "انتقام" میں راشد صاحب فرماتے ہیں کہ ؎

اس کا چہرہ اس کے خدوخال یاد آتے ہیں

اک برہنہ جسم اب تک یاد ہے

اجنبی عورت کا جسم

میرے ہونٹوں نے لیا تھا رات بھر

جس سے اربابِ وطن کی بےبسی کا انتقام

اس نظم کے ابتدائی حصہ میں شاعر نے ایک مغربی طرز پر سجے ہوئے کمرہ کا ذکر کیا ہے جس میں جا بجا دھات اور پتھر کے بت رکھے ہوئے تھے۔ اور آتشدان کے قریب ایک برہنہ جسم ان کو دعوت نظارہ دیتا تھا دوسرا حصہ وہ ہے جس کو میں اوپر درج کر چکا ہوں۔ اور جو حکایتِ آغوش" بیان کر رہا ہے۔ نظم کی ترتیب اور" ارباب وطن کی بےبسی" کا انتقام لینے سے صاف واضح ہے کہ وہ اجنبی عورت کس قومیت سے تعلق رکھتی تھی۔ راشد صاحب کے ہونٹوں نے اجنبی عورت کے جسم سے رات بھر ارباب وطن کی بےبسی کا انتقام لیا ہے، اور وہ اپنی جگہ مطمئن ہیں کہ برطانوی سامراج سے ایسا انتقام لیا گیا ہے کہ پوری ہندوستانی قوم کو ان کا شکر گذار ہونا چاہیئے۔ کس قدر معصوم خیال ہے اور کس درجہ طفلانہ جذبہ ہے۔ یہ شاید زندگی کی نئی قدروں میں سے کوئی ایک قدر ہے۔ راشد صاحب کے متعلق ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی یہ رائے بہت خوب ہے کہ "ان کی بعض نظمیں سپاٹ ہو کر رہ گئی ہیں۔" کاش ان کی نظمیں اتنی بلکی ہوئی اور بامعنی ہوتیں جتنا کہ "نقش فریادی" پر ان کا مقدمہ۔ فیض احمد اس گروہ میں، جوش اور ساغر کی طرح ستھرا اور پاکیزہ مذاق رکھتے ہیں۔ ان کا خیال آزاد اور فکر اوروں کے مقابلہ میں سلجھی ہوئی ہے۔ اُن کا ایک خاص اسٹائل ہے اور یہ اپنے رنگ میں خوب کہتے ہیں۔ ان کے کلام میں وہ سب کچھ نہیں جو ترقی پسندی کے لئے لازمی اور ضروری ہے۔ "خدا وہ وقت نہ لائے" اور "مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ"۔ ان کی انداز فکر کے بہترین نمونے ہیں۔

آزاد نظم اور نئی شاعری کے شہ پارے میراجی کے پاس بکثرت دستیاب ہوتے ہیں "تن آسانی"

اور محرومی ان کی بڑی کامیاب نظمیں ہیں۔ مگر جس قدر زیادہ ان کے معنی و مطالب پر غور کیا جاتا ہے اسی قدر مبہم اور ناقابل فہم ہو جاتی ہیں۔ فانی نے تو زندگی کو "دیوانے کا خواب" سے تعبیر کیا تھا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میراجی کی شاعری پر اس کا اطلاق بڑی خوبی کے ساتھ ہوتا ہے۔

"سنگِ آستان" میں میراجی فرماتے ہیں کہ ؎

پکڑ کر ہاتھ میں پنچھی کو اس دھرتی کے جنگل میں
اسی خلوت کے محمل میں
ترے دل میں
جگادوں گا میں اپنی گرم آہوں سے
اسی نغمہ کو جو سویا ہے تیرے جسم کے محبوب تاروں میں

غور کا مقام ہے کہ "سنگِ آستان" کو اس پنچھی سے کیا نسبت جس کو میراجی دھرتی کے جنگل میں پکڑنے کے لئے بے چین نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری میں تاثیر، جوش، سوز، صداقت اور دیگر خصوصیات شعری کا تو ذکر ہی کیا میں دریافت کرتا ہوں کہ اس کے کوئی معنی بھی ہیں۔ کیا یہی زندگی کی ترجمانی ہے۔ کیا یہی وہ شاعری ہے جو زندگی سے بہت قریب آگئی ہے۔ کیا یہی وہ نئے خیالات، میلانات اور جذبات ہیں جن پر اردو کے دوسرے شاعروں نے اب تک کوئی توجہ نہیں کی تھی۔ اردو ادب میں یہ بہکی ہوئی فکر کا طرز یقیناً نیا ہے۔ اور آنے والی نسلوں کے لئے ایک احمقانہ ریکارڈ سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ کیا ایسی ہی نظموں سے سامراج کو تباہ کیا جائیگا۔ کیا یہی وہ اشعار ہیں جو ہندوستان کے لاکھوں اور کروڑوں بھوکوں کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ کیا ایسے ہی اونٹ پٹانگ الفاظ کی بھرمار سے ہندوستان کے معاشی اور سیاسی مسائل کا حل دریافت کیا جاسکتا ہے۔ قدیم شعراء نے تو ساقی و میخانہ، اور گل و بلبل وغیرہ کو اشارتاً استعمال کیا تھا۔ اور اکثر و بیشتر ان الفاظ کے استعمال سے ان کا مقصد کچھ اور ہوتا تھا۔ لیکن جدید شاعری کے کیمپ سے ایسا کوئی اعلامیہ جاری نہیں کیا گیا جس میں یہ تبلایا گیا ہو کہ فلاں فلاں الفاظ کے یہ یا وہ معنی لئے جائیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جس طرح میراجی دھرتی کے جنگل میں پریشان حال پھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح جدید شاعری کا مطالعہ

کرنے والے بھی الفاظ کے مہمل گورکھ دھندے میں کھو جاتے ہیں۔ ن م۔ راشد کی ایک آزاد نظم "اجنبی عورت" بھی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ سمجھنے سے نہیں۔ نئی شاعری کا وہ حصہ جو کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتا، ایسے دقیق فلسفیانہ مسائل۔ یا گہرے نفسیاتی اور علمی نظریات پر مبنی نہیں ہے جس کو سمجھنے کے لئے ایک خاص حد تک تعلیم یافتہ ذہن کی ضرورت لاحق ہو۔ بلکہ وہ سرے سے مہمل اور بے معنی ہے۔ ترقی پسند شعراء اگر پارٹی سیاست کے تحت کھینچ تان کر اس کے کوئی معنی نکال بھی لیں تو وہ ایسی ہی کوشش ہوگی جیسے کہ "نماز عاشقاں بر شاخ آہو" کے معنی نکالنے کی کوشش ہو سکتی ہے۔

۶ وہ شاعر جو اپنے دماغ پر کوئی بار ڈالنا نہیں چاہتا۔ الفاظ اور عنوان کے انتخاب میں وقت خراب کرنا نہیں چاہتا، شاعری کی بنیادی خصوصیات کو شعر میں نمایاں کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اس کے لئے نئی شاعری اپنے اندر بڑی کشش، اور ترغیب رکھتی ہے اس لئے کہ اس قسم کی شاعری چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، سوتے لیٹتے، ہنستے بولتے، غرض کہ ہر وقت کی جا سکتی ہے۔ رہا یہ اندیشہ کہ اس خرافات کو کون شائع کرے گا۔ اس کا اب کوئی وجود نہیں اس لئے کہ اردو زبان کے رسالے ہاتھوں ہاتھ ایسی شاعری کو لے لیتے ہیں۔ اور شائع کر دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان کی آبادی کا ہر تیسرا آدمی انقلابی شاعر بن گیا ہے۔ اور اگر اس کی رفتار کا یہی عالم رہا تو وہ دن دور نہیں جبکہ پوری ہندوستانی قوم انقلابی شاعروں کی قوم میں تبدیل ہو جائے گی اور پھر سامراج کی تباہی اور ہندوستان کی آزادی منٹوں میں حاصل کی جا سکے گی۔

میں نے اوپر کہیں بیان کیا ہے کہ نئی شاعری کو زیادہ سے زیادہ اشتراکی شاعری کہا جا سکتا ہے لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ روسی ادب میں ایسی شاعری کا کوئی وجود نہیں ہے۔ چونکہ ترقی پسند شعراء سیاسی حیثیت سے اشتراکیت کے حامی ہیں اور اسی مسلک کے پرچار کو انھوں نے اپنی شاعری کا مقصد قرار دے لیا ہے اسی لئے میں نے ان کی شاعری کو اشتراکی شاعری سے موسوم کیا ہے۔ بلکہ صحیح طریقہ پر یہ کہنا مناسب ہوگا کہ یہ خود ساختہ "اشتراکی شاعری" ہے۔ نہ اس میں شعریت ہے اور نہ ہندوستانیت۔ نہ یہ شاعری زندگی کی ترجمانی کرتی ہے اور نہ زندگی سے قریب ہے۔ بلکہ یہ فکری انتشار کا لازمی اور ضروری نتیجہ ہے جس طرح مجذوب کی بڑ

اور دیوانے کی بڑ اس میں کچھ کام کی باتیں نکل آتی ہیں۔ اسی طرح اس شاعری میں بھی کہیں کہیں حقیقت اور شعریت کی جھلکیاں نظر آجاتی ہیں۔ شاعری خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی۔ داخلی ہو یا خارجی اس میں شعریت ضرور ہونی چاہیئے۔ لیکن مذکورہ بالا قسم کی شاعری میں، ایک معتدبہ حصہ ایسے خیالات و جذبات پر مشتمل نظر آتا ہے جس میں شعریت تو کجا، معنی و مفہوم بھی نہیں پائے جاتے۔ اس شاعری کے متعلق خود میراجی کی رائے بہت صحیح ہے جو انھوں نے ۷ر جنوری ۱۹۴۳ء کی آواز میں اپنے ایک مضمون "نئی شاعری کی بنیادیں" میں ظاہر فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ؎

" نیا شاعر ایک ایسے چوک میں کھڑا ہے جس کے دائیں بائیں آگے پیچھے کئی رستے نکلتے ہیں لیکن اسے پوری طرح نہیں معلوم ہے کہ کونسا رستہ اس نے طے کرلیا ہے۔ ماضی کی تجربے کیا اہمیت رکھتے ہیں۔ کب تک اسے یونہی کھڑے رہنا ہے۔ حال کی اضطراری کیفیات کب تک اس کا ساتھ دیں گی۔ اور کون سے راستہ پر اس کو چلنا ہے۔ مستقبل کے خطرات اس کو کیا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ نیا شاعر ماحول میں اپنی گہری دلچسپی کا بہانہ کرتا ہے لیکن حقیقتاً وہ صرف اپنی ذات کے ایک دھندلے سے عکس میں محو ہے۔"

صمد رضوی

آپ ہنستے کیوں ہیں؟

ایک بچّہ سڑک پر گر جاتا ہے۔ آپ نہیں ہنستے۔

ایک خود پسند آدمی، جو ریشمی ہیٹ اور پُر تکلف واسکٹ پہنے ہوئے ہے، کیلے کے چھلکے سے پھسل کر ایک مضحکہ خیز انداز سے گر جاتا ہے اور اس کا ہیٹ دور جا پڑتا ہے۔ اب آپ ضرور ہنستے ہیں، یا پھر خوش خلقی کے پیش نظر اپنی ہنسی کو ضبط کرتے ہیں۔

ایک شخص جسے آپ انتہائی طور پر ناپسند کرتے ہیں، اسی قسم کے حادثہ سے دوچار ہوتا ہے۔ اب آپ کی ہنسی سننے کے لائق ہوتی ہے ــــــ حقیقی معنوں میں وہ ہنسی جس سے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں۔

آپ اس وقت کیوں نہیں ہنستے جب کوئی بچّہ، یا کوئی گھوڑا، یا کوئی ضعیف عورت گرتی ہے؟ محض اس لئے کہ آپ انھیں اپنا مد مقابل یا اپنے سے برتر سمجھنے کا خیال تک نہیں کر سکتے۔ لیکن خود پسند آدمی آپ کی تذلیل کر کے اپنی عظمت کی نمائش کر رہا ہے، اور اپنے کو ایک برتر و فائق ہستی کے طور پر پیش کر رہا ہے اور اس شخص کے متعلق آپ کے احساسات کی شاید ہی یہ صورت ہوتی، جیسی کہ اب ہے، اگر اس شخص نے آپ کی برتر ہونے کی فطری خواہش کو ٹھیس نہ لگائی ہوتی۔ ممکن ہے یہ ٹھیس اتنی لطیف رہی ہو کہ آپ اسے شعوری طور پر محسوس ہی نہ کر سکے ہوں۔

مختصر یہ کہ آپ اس لئے ہنستے ہیں کہ آپ خود پسند ہیں، کیونکہ ذہنی طور پر آپ اپنے دل میں خود کو پوری طرح مطمئن محسوس کرتے ہیں۔ اس وقت آپ ایک فاتح انسان ہوتے ہیں جس کی ہنسی زبان حال سے کہتی ہے کہ "میں کیسا غیر معمولی بہتر آدمی ہوں!"

یہ جنگجویانہ الفاظ ہیں، ان میں مزاج کو مطلق دخل نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت آپ اپنی شخصیت کے اس انمول جوہر کی حفاظت کے واسطے، جسے "ذوق ظرافت" کہا جاتا ہے، پورے جوش و خروش کے ساتھ میدان میں کود پڑنے کے لئے کمربستہ ہو رہے ہیں۔

خیر جب آپ اس کے متعلق اس طرح سوچ رہی ہیں تو ہم دونوں ہی کو چھوڑے دیتے ہیں۔ ہابس کی تعریف کے مطابق "ہنسی خود نمائی ہے" ذوق ظرافت کوئی معصوم اور خوشگوار خوبی نہیں ہے بلکہ اس سے خبث باطن کا اظہار ہوتا ہے ہنسی اس صورت کا نام ہے جس کے ذریعہ آپ اپنے موضوع مزاح، کائنات، بنی نوع انسان اور مسموم جذبہ کمتری پر اپنا فوقیت آمیز تصرف ظاہر کرنا چاہتے ہیں جبکہ دراصل دل میں اپنے کو کمتر محسوس کرتے ہیں۔

"فوقیت آمیز تصرف" وہ الفاظ ہیں جو انگریز فلسفی انتھونی لڈو ویسی نے ہنسی کے انتہائی عمیق نظریہ کو پیش کرتے ہوئے استعمال کئے ہیں۔ یہ نظریہ اس نے اپنی کتاب "اسرار خندہ" میں پیش کیا ہے جس میں آپ ایسے بہت سے نکات کا بیان پائیں گے جن کا احاطہ اس مختصر مقالہ میں نہیں کیا جا سکتا وہ فوقیت آمیز تصرف کی توضیح لومڑی اور سارس کے فرضی قصّے سے کرتا ہے۔ لومڑی نے سارس کو کھانے پر مدعو کیا اور کھانا ایک ایسی طشتری میں نکالا جس میں سے صرف وہ خود ہی کھا سکتی تھی۔ اس کے بعد سارس نے ایک لمبی اور پتلی گردن والے برتن میں کھانا نکالا جس کے اندر صرف اس کی لمبی چونچ جا سکتی تھی۔ پہلی صورت میں لومڑی کو فوقیت آمیز تصرف حاصل تھا۔ دوسری میں سارس کو۔

لیکن آپ ابھی یقین نہ کریں گے کہ آپ کی ہنسی اسی فوقیت آمیز تصرف کی بنا پر ہے پہلے پہل ——— تقریباً کوئی بھی اس کا یقین نہیں کرتا۔ لہذا ہم اس مشورے کے ساتھ، اس موضوع پر چند نکات پیش کریں گے ان کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ کسی آئندہ دعوت یا جلسہ میں، جس میں آپ جان ڈالنا چاہیں، ذوق ظرافت کے موجودہ نظریہ پر حملہ کرنے کے لئے فوراً بلا پس و پیش اٹھ کھڑے ہوں گے۔

واضح رہے کہ آپ کی بھی ایسی ہی سرگرمی سے مخالفت اور تکذیب کی جائے گی جیسی کہ اس وقت آپ کر رہی ہیں۔ عورتیں خصوصاً اس کی حمایت میں پیش پیش نظر آئیں گی باوجود اس کے کہ وہ مردوں سے کم ذوقِ ظرافت رکھتی ہیں جیسا کہ لڈو ویسی توضیح کرتا ہے کہ ایک شوہر میں ذوق ظرافت عورتوں کے لئے قابلِ قدر چیز ہے کیونکہ اس شخص کو جو اپنے خود کے اختیارات کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دیتا جس کے

منسوبوں کو ہنسی میں اڑایا جا سکتا ہے، اس کی نصف بہتر اسے ناک پکڑ کر آسانی سے جدھر چاہے موڑ سکتی ہے۔

مثال کے طور پر اپنے دلائل کو بے باکانہ انداز میں پیش کرنے کا آپ کے لئے وہ بہترین موقعہ ہے جب کسی دعوتی جلسے پر ہنسی کے ایک شدید دورے کے بعد کچھ دیر کے لئے سکوت چھا گیا ہو۔

"ہنسی دنیا میں سب سے زیادہ ظالمانہ فعل ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے؟ کس قدر تعجب خیز بات ہے کہ بہت کم لوگ اسے محسوس کرتے ہیں کہ یہ دراصل بڑی بزدلانہ اور کاہلانہ حرکت ہے اور جس کی اہمیت کا اندازہ لگانے میں صد درجہ مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔"

اس سے معتقدات کی دنیا میں زلزلہ سا آجائے گا اور آپ کی مخالفت میں ہر طرف سے آوازیں بلند ہونے لگیں گی۔ "ہرگز نہیں، ہرگز نہیں۔ ہنسی کو ان ذلیل باتوں سے کیا تعلق۔ احمق ہیں آپ، نرے احمق۔" لیکن یہی موقعہ ہے کہ آپ اپنے ہوش و حواس بجا رکھ کر اپنے دعوے کو ثابت کرنا شروع کر دیں۔

آپ دریافت کیجئے کہ "اگر ہنسی ظالمانہ فعل نہیں ہے تو جب آپ کا مذاق اڑایا جاتا ہے تو آپ اندر ہی اندر کیوں بل کھاتے ہیں؟ کوئی بھی اپنی ہنسی اڑوانا نہیں چاہتا۔ اس سے آپ کو اپنے کمتر مضحکہ خیز اور ذلیل ہو جانے کا احساس ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں جب لوگ آپ پر ہنستے ہیں تو آپ اپنے کو برتر محسوس نہیں کر سکتے۔"

"لیکن میں اتنا وسیع القلب ہوں کہ اس مذاق کو بھی برداشت کر سکتا ہوں جو میرا اڑایا گیا ہو۔" کوئی صاحب اعتراض کرتے ہیں

"درست! فرض کیجئے کہ ہوا سے آپ کا ہیٹ اڑ جاتا ہے اور آپ سڑک پر اس کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ آپ کی اس ہئیت پر تماشائی مسکراتے ہیں۔ جب آپ کا ہیٹ آپ کے ہاتھ آجاتا ہے اور آپ اسے اپنے سر پر منڈھ لیتے ہیں تو آپ بھی دانت نکال دیتے ہیں۔ آپ اپنی ہنسی سے اس خیال کو ذہن نشین کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ آپ ہوا میں اپنے ہیٹ کے اڑ جانے جیسے بیہودہ حادثہ سے بلند ہیں ——— یعنی یہ کہ وہ برتر تماشائی دراصل برتر نہیں ہو سکے کیونکہ آپ خود

اس مذاق پر ہنس رہی ہیں۔"

اس نظریہ کی حمایت کرنے والے حضرات کو تازہ دم ہونے کے لئے شاید تھوڑا وقفہ لگے گا۔ اسکے بعد دفاعی حملہ ہوگا جو مندرجہ ذیل کی طرح متعدد سطور کا ہو سکتا ہی۔

ایک صاحب فرماتے ہیں کہ "جب میں کوئی معمولی سی حماقت کر بیٹھتا ہوں تو اپنے اوپر خود ہنستا ہوں حالانکہ متاثر کرنے کے لئے میرے آس پاس کوئی نہیں ہوتا۔"

آپ انھیں بتلایئے کہ "وہاں آپ ہمیشہ موجود ہوتے ہیں۔ جب آپ اپنی کسی معمولی سی انوکھی حرکت پر ہنستے ہیں تو آپ یقین کیجئے کہ وہ چیز پوشیدہ طور پر آپ کو برہم کرتی ہی۔ آپ کی معمولی سی ہنسی آپ کو بتاتی ہی کہ آپ دراصل اس سے برتر ہیں۔ یہ ہنسی پریشانی کی ہنسی سے ملتی جلتی ہی۔ بدتمیزی سے ہنسنے والا نوجوان اور پریشان بالغ ہمیشہ ہنسنے کے لئے تیار رہتے ہیں کیونکہ یہ پریشانی سے جان چھڑانے کا، جس کی جڑیں احساس کمتری میں ہوتی ہیں، نہایت آسان طریقہ ہی۔ ایسی ہنسی دھونس جمانے کی ہنسی ہی ——— بالفاظ دیگر فوقیت آمیز تصرف کا خیال پیدا کرنے کے لئے محاذ پیدا کرنا۔"

لیکن ہنسی کی ایسی بہت سی قسمیں ہیں جن کا فوقیت سے کوئی تعلق نہیں ہی۔ فرض کیجئے کہ آپ ایک بچے کا تعاقب کرتے ہیں۔ وہ اپنی ماں کی طرف بھاگتا ہی۔ جب وہ اس کے پیش بند کے پاس پہنچ جاتا ہی تو آپ کی طرف منہ کرکے ہنستا ہی۔"

واقعیٰ وہ ہنستا ہی ——— کیونکہ ماں کے پیش بند کے فیتوں میں وہ امن و سلامتی پاتا ہی۔ اس نے اپنے آپ میں آپ کے تعاقب کے خطرے سے فوقیت آمیز تصرف پیدا کرلیا ہی۔ ایک ماں اپنے بچہ کے کسی معمولی سے حادثہ پر اکثر ہنس پڑتی ہی جس سے وہ رو پڑتا ہی۔ اس کی ہنسی بچہ کو اس حادثہ سے بلند ہونے میں مدد دیتی ہی۔ آدمی صحبت پسند ہے اور ہم ایسے آدمیوں کو پسند کرتے ہیں جو ہمارے ساتھ ہنسیں کیونکہ اس سے تھوڑا بہت رفاقت کا پہلو نکلتا ہی۔ ہم مل جل کر ایسی دنیا کا مقابلہ کرتے ہیں جو ہمارے اوپر ہنسنے اور ہم میں احساس کمتری پیدا کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتی ہی۔"

اب ہنسی کی ایسی بہت سی مثالیں پیش کی جائیں گی جو آپ کے بیانات کی تردید کرتی ہوئی معلوم ہوں گی۔

آپ کے مخالفین میں سے ایک صاحب فرماتے ہیں کہ "میں ایک پاکیزہ ضلع جگت پر ہنستا ہوں۔ اب یہ چیز کس طرح میرے فوقیت آمیز تصرف کا اظہار کرتی ہے۔؟"

آپ انھیں جواب دیجیے کہ "میں خوش ہوں کہ آپ نے خود اس بات کو پیش کردیا۔ جب آپ کسی ضلع جگت پر ہنستے ہیں تو الفاظ سے اس کھیل کا اعتراف کرکے آپ اپنے معمولی اطمینان بالذات کا اظہار کرتے ہیں۔ جب ضلع جگت کسی ایسے لفظ پر جا پڑتا ہے جو کسی غیر زبان کا ہوتا ہے تو آپ اور جی کھول کر ہنستے ہیں کیونکہ آپ ایک اجنبی زبان سے واقف ہونے میں دوگنی برتری محسوس کرتے ہیں۔"

ایک اور صاحب کہتے ہیں کہ "لیکن آپ نے فرمایا ہے کہ ہنسی بڑی بزدلانہ اورکاہلانہ حرکت ہے آپ اسے کس طرح ثابت کریں گے؟"

"آپ مجھ سے کوئی سنجیدہ سوال دریافت کیجیے۔ مثلاً سیاست یا مذہب سے متعلق۔ صریح اور غیر مبہم جواب کے بجائے میں کوئی طنزیہ فقرہ کہتا ہوں جس سے لوگ ہنس پڑتے ہیں۔ دیکھیے میں نے آپکو مدافعانہ حالت میں کردیا ہے اور آپ کے سوال کے گہرے مفہوم کو سمجھنے کی تکلیف برداشت کیے بغیر ہی میں نے آپ کو میدان سے بھگا دیا ہے اور مجھے آپ کی طرف سے پیش کیے ہوئے ایسے کسی دعوے کا جواب بھی نہ دینا پڑا جس میں میری شکست کا بہت کچھ امکان تھا۔"

اب آپ کہیے کہ "ہاں میں آپ کو ہنسی کی تین قسمیں بتا سکتا ہوں جن سے یقینی طور پر ظاہر نہیں ہوتا کہ ہنسی فوقیت آمیز تصرف ہے۔ جب آپ کے گدگدی کی جاتی ہے تو آپ ہنستے ہیں، جب آپ ہنسانے والی گیس میں سانس لیتے ہیں تو ہنستے ہیں اور ایک ہنسی جنون اور دیوانگی کی ہوتی ہے۔"

جنون اور دیوانگی کی ہنسی خلاف معمول اور علامت مرض ہے۔ سوائے دیوانہ کے کوئی ٹھیک طور پر نہیں جانتا کہ اس کے دماغ میں کیا ہے۔ اس کا بہت کچھ امکان ہے کہ دیوانہ کی ہنسی ان حالات سے کسی حد تک ماضی برتری کا اظہار کرتی ہے جنھوں نے کمتری کے وہ تلخ احساسات پیدا کردیے ہیں جو اسکی

دماغی بیماری سے متعلق ہیں۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جنونی قسم کے دیوانوں میں بعض انتہائی مسرور افراد پائے جاتے ہیں جنھیں برتری کا صریحی یقین ہوتا ہی۔

"ہنسانے والی گیس خوشگوار احساسات پیدا کرتی ہی اور خوشی کی بنیاد ہمیشہ فوقیت آمیز تصرف کے احساسات میں ملتی ہی۔ ہمارے جب گدگدی کی جاتی ہی تو کچھ تو ہم اس لئے ہنستے ہیں کہ اس قسم کی حرکتیں ہمارے بہت ہی بے تکلف دوست کرتے ہیں اور عام طور سے اس لئے کہ فوقیت آمیز تصرف کا احساس ہر وقت رہتا ہی زود حس مقامات عام طور سے جسم کے ہیجان خیز حصّوں میں پائے جاتے ہیں۔ اور ہیجان کا رشتہ جنسی فعل سے ہی جس کے دوران میں فوقیت آمیز تصرّف کا احساس مستقل ہوتا ہی۔

میرا خیال ہی کہ آپ یہ بھی کہیں گے کہ میں برتر محسوس کرتا ہوں کیونکہ میں MICKEY MOUSE کے مضحکہ خیز خاکوں پر ہنستا ہوں؟"

یہ تو کھلی ہوئی بات ہی۔ یاد رکھئے کہ ہم صرف ان ہی چیزوں پر ہنستے ہیں جو انسانی ہیں اور کے جانور انسانی ہیئت میں لُولُو (CARICATURE) بنا کر اور اکثر لغو اور مہمل حالت میں پیش کئے جاتے ہیں۔ ان کی خیالی مہمات ہمیں ایک بے سروپا دنیا میں لے جاتی ہیں جہاں معقولیت کی عام بندشیں درست اور بجا نہیں رہتیں۔ اس لئے ہم منطق اور معقولیت کی تمام قیدو بند سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ —— اپنی حقیقی دنیا سے، جہاں اس قسم کی بندشیں ہماری مزاحم ہیں، ہم بلند و برتر ہو جاتے ہیں۔ ہم لُولُو پر اس لئے ہنستے ہیں کیونکہ اس میں کسی انسان کے سب سے کم جاذب نظر حصّہ جسم کو بدباطنی سے انتہائی غلو کے ساتھ پیش کیا جاتا ہی تاکہ وہ شخص خلاف معمول اور ہم سے کمتر معلوم ہو۔

بے کیف کہانیاں اور فحش مذاق ہنسی میں بندشوں سے ایسی ہی آزادی کو واضح کرتے ہیں "گندی کہانیاں" ایک شخص کو شائستگی کی پابندیوں سے آزادانہ اور غیر ذمہ دارانہ جذبات کو اکساتی ہیں —— یہاں بھی وہی فوقیت آمیز تصرف کارفرما ہی۔ اسی سماج سے جو ہمیں دبانا چاہتی ہی۔ جنسی افسانے ہمیشہ کسی نہ کسی ایسے نکتے کی طرف مڑ جاتے ہیں جن سے فوقیت آمیز تصرف کا پہلو نکلتا ہی جب سماج یہ چاہتی ہی کہ ہمارے نفسانی [illegible] ہو تو ہماری غیر شعوری بغاوت کا اظہار ہنسی کے ذریعے ہوتا ہی جس کا دراصل یہ مطلب ہوتا ہی

کہ "میں ایسا ویسا آدمی نہیں ہوں کہ اس قسم کی چیزوں کو اہمیت دوں"۔ یہی وجہ ہے کہ ہم گرجا میں دبی ہوئی ہنسی ہنستے ہیں اور اسی لئے عدالت کے کمرے میں تماشائی بہت ہی معمولی سے اشتعال پر ہنس پڑتے ہیں۔

ہم ان قوانین اور رسم و رواج سے، جو ہمیں پابند کر دیتے ہیں، برتر محسوس کرنا چاہتے ہیں، اس لئے ان کی زرہ بکتر میں ہنسی کی درازیں تلاش کرتے ہیں۔

بچے، وحشی اور نوجوان عملی مذاق اور جسمانی عیوب پر ہنستے ہیں۔ وہ وحشی جو اپنے دوست کے بھالا بھونکتا ہے اپنی اس حرکت پر ہنستا ہے۔ فوقیت آمیز تصرف ظاہر ہے وہ نوجوان جو جسمانی تکلیف پہنچا کر دل لگی کرتا ہے وحشی ہی کی طرح ہے۔ وہ اس لئے ہنستا ہے کیونکہ اپنے آپ کو اپنے شکار سے برتر سمجھتا ہے۔ بہت سے تہذیب یافتہ اور متمدن لوگ اس قسم کے مذاق میں اس حد تک بڑھ جاتے ہیں کہ اپنی ہنسی کو ایک حد تک روحانی سطح پر لے جا کر لفظی مذاق میں تبدیل کر دیتے ہیں —— وہ سطح جہاں فوقیت آمیز تصرف کا شناخت کرنا زیادہ مشکل ہو جاتا ہے لیکن وہ ہوتا ہے یقینی طور پر موجود۔

دھوتی میز پر یقیناً تند و تیز بحث ہو گی مگر ان مثالوں کے ساتھ، جن کا تذکرہ کیا جا چکا ہے، مندرجہ ذیل مثالیں آپ کو ڈٹے رہنے میں مدد دیں گی۔

اعتراض کیا جاتا ہے کہ "جب ایک بچہ ڈبے کے گڈے پر ہنستا ہے تو بلاشبہ وہ برتر محسوس نہیں کرتا۔"

آپ انھیں بتلایئے کہ "تعجب اور توقع کے معنی ہمیشہ سے امکانی خطرہ کے رہے ہیں —— یعنی کمتر صلاحیت۔ لیکن جب تعجب بے ضرر ظاہر ہوتا ہے تو ہمارا خوف اعتماد میں بدل جاتا ہے —— بالفاظ دیگر فوقیت آمیز تصرف۔"

ایک اور صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ "میں کسی مقامی زبان کے مذاق پر ہنستا ہوں، کیونکہ وہ پر لطف ہے، اس لئے نہیں کہ میں کسی طرح بھی برتر محسوس کرتا ہوں۔"

"بجا اور درست! لیکن ہم اپنی زبان کو اتنے اچھے طریقے سے جانتے ہیں کہ اس پر کسی دوسرے کا ہماری ہی طرح عادی نہ ہو جانا اس کو کمتر ظاہر کرتا ہے، لہٰذا ہم برتر حیثیت میں رہے۔"

تیسرے بزرگ کہتے ہیں کہ "میں سوانگ بھرنے والے پر اس لئے ہنستا ہوں کیونکہ وہ پُر مذاق ہے۔"

آپ جواب دیجئے کہ "آپ لطیف ظرافت پر اس لئے ہنستے ہیں کیونکہ آپ کامیاب پہلو پر رہنا چاہتے ہیں۔ اس سے آپ برتری محسوس کرتے ہیں۔ بہت سے سوانگ بھرنے والوں کے ساتھ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو ان کی بذلہ سنجی کے تختۂ مشق بنے رہتے ہیں۔ ہم فاتح کے ساتھ، جب وہ اپنے مدمقابل پر کامیابی حاصل کرتا ہے، ہنستے ہیں اور اس کے ساتھ ہم بھی کامیابی حاصل کرتے ہیں۔"

ان تمام اعتراضات کا جواب دے چکنے کے بعد اب ذرا آپ ان سے یہ سوال کیجئے کہ "کیا آپ کبھی اس وقت بھی کسی مذاق پر ہنستے ہیں جبکہ آپ کو اس میں ظرافت کی بات نہ ملی ہو؟ ——— یقیناً نہیں۔ کس لئے؟ کیونکہ آپ ان سب کی نظروں میں، جنھیں ظرافت کی بات مل گئی ہے، اپنے کو کمتر نہیں ہونے دینا چاہتے۔"

مختصر یہ کہ آپ صرف اس لئے ہنستے ہیں کہ اپنے کو برتر محسوس کرتے ہیں۔

(ترجمہ) اصغر علی سکندر آبادی

افکارِ فضلی

کارزارِ زندگی مثلِ نبردِ عشق ہے! زخم کھاتے جائیں گے اور مسکراتے جائیں گے

پریشانی سے کچھ حاصل نہیں، یہ جانتا ہوں میں مگر پھر بھی نہ جانے کیوں پریشانی نہیں جاتی
زمانے کا اثر اللہ اکبر، کیا بیاں کیجئے کہ آئینے میں اپنی شکل پہچانی نہیں جاتی
پریشاں باطنی کا ہی نتیجہ یہ پریشانی نہ ہو ذوقِ یقیں جب تک پریشانی نہیں جاتی

تجھے جلدی ہی کیا، عمرِ گریزاں وہ اب آیا، اب آیا چاہتے ہیں
فضائیں دل سے ہر دم کہہ رہی ہیں وہ اب تشریف لایا چاہتے ہیں
نسیمِ صبح نے کچھ تو کہا ہے کہ غنچے مسکرایا چاہتے ہیں
یہ ان کی آمد آمد کا اثر ہے کہ ذرے جگمگایا چاہتے ہیں
وہ آئے بھی تو اب یہ ڈر لگا ہے کہ جیسے اب وہ جایا چاہتے ہیں
یہ سب امید کے دھوکے ہیں، ورنہ نہ وہ آیا نہ جایا چاہتے ہیں
غضب ان کا یہ غصے میں بھی عالم کہ جیسے مسکرایا چاہتے ہیں
وہ ان سے شیخ جی کا بات کرنا کہ جیسے گڑبڑایا چاہتے ہیں
یہ اس نے زیرِ لب آخر کہا کیا کہ فضلی مسکرایا چاہتے ہیں

کچھ لطف زندگی ہی تو شوقِ سفر میں ہے اللہ میری دوریٔ منزل کا شکریہ
لو آگئی قفس میں بھی آوازِ ہمنوا!!! موجِ نسیم و شورِ عنادل کا شکریہ
اس شوخ کا بھی یوں تو ہے احساں بہت مگر دل کی جو پوچھئے تو مرے دل کا شکریہ
جو ہر لئے ہوں اور کوئی دیکھتا نہیں بنگال کا اور اپنی سلاسل کا شکریہ

فضلی

آپ بیتی

دنیا کے ہر اک دام سے آزاد رہا میں!
میرا نہ ہوا کوئی کسی کا نہ ہوا میں!

دل میں نے لگایا نہ کبھی بلبل و گل سے
مانندِ صبا محفلِ گلشن میں رہا میں!

معلوم نہیں مجھ کو مگر، کس لئے پھر بھی
سرگشتہ و بے تاب رہا صبح و مسا میں!

کیوں اشک بدامن رہیں ہر شب مری آنکھیں
کیوں صبح کو اُٹھ اُٹھ کے رہا غرقِ دعا میں

ہرچند نہ تھا ساغر و میناسے سروکار
سرمستیِ جاوید سے سرشار رہا میں!

اللہ! مری بیخودیٔ شوق کا عالم!!
دنیا کو تو کیا! آپ کو بھی بھول گیا میں

کھو جانا رہِ عشق میں ہر وصل کی منزل
آخر ترے جلوؤں سے ہم آغوش ہوا میں

اب ایک ہوئے قطرۂ و دریا کی طرح ہم
کچھ مجھ سے جُدا تو ہے، نہ کچھ تجھ سے جُدا میں

معلوم نہیں مجھ کو، فنا کیا ہے! بقا کیا!
ہے اتنا ہی احساس، مرا تو ہو ترا میں!

اثر صہبائی

نئے ایڈیشن

شعلۂ طور پچھلے سال شعلۂ طور کا چوتھا ایڈیشن شائع ہوا تھا، مگر اس قدر مقبول ہوا کہ محض چند مہینوں میں ختم ہوگیا۔ اب پانچواں ایڈیشن شائع ہو رہا ہی، کتابت اور طباعت پچھلے ایڈیشن سے کہیں بہتر ہی۔ اس مرتبہ عام ایڈیشن کے علاوہ ایک خاص ایڈیشن بھی شائع کیا گیا ہی، اس کا کاغذ خاص طور پر نہایت عمدہ اور چکنا ہی۔ قیمت قسم اعلیٰ [illegible] قسم دوم [illegible]

میدانِ عمل میدان عمل ایک عرصہ سے ختم تھا، عوام کے اشتیاق اور مطالبہ کے پیش نظر اب اس کا تیسرا ایڈیشن شائع کیا گیا ہی۔

منشی پریم چند آنجہانی کو، ناول نویسی اور افسانہ نگاری میں جو درجہ حاصل ہی، وہ سب کو معلوم ہی میدانِ عمل اُردو زبان میں ان کا آخری ناول ہی، جس میں ان کی فن کاری سب سے زیادہ نمایاں ہی اور ملک کی مستقل بےچینی اور بڑھتی ہوئی بیداری کی جتنی مکمل تصویر اس میں ہی، ان کے کسی اور ناول میں نہیں۔ قیمت چار روپے (للعہ ر)

حکومت اور نگرانیِ قیمت کا مسئلہ از امتیاز حسین خاں بی اے (جامعہ) بی کام (لندن)

یہ [illegible] سائز پر ایک مختصر سا رسالہ ہی جس میں بتلایا گیا ہی کہ جنگ کے زمانے میں حکومت اشیاء پر کنٹرول کیوں کرتی ہی اور اس سے عوام کو کیا فائدہ پہنچتا ہی؟ اور [illegible] مسئلہ کے معاشی اسباب کیا ہیں؟ قیمت صرف چار آنے (۴ر)

مکتبہ جامعہ دہلی

جلن تکلیف دہ ہونے کے ساتھ ساتھ خطرناک بھی ہوتی ہے۔ سگرٹ سے انگلی کی معمولی جلن کے علاج پر بھی اگر توجہ نہ کی جائے تو اس سے خون میں زہر پھیل جانے کا خطرہ پیدا ہوتا ہے۔ جیسے ہی آپ کسی شے سے جل جائیں آپ جلنے کی جگہ پر فوراً **جلمار** لگا دیجئے۔ خواہ آپ آگ سے جلے ہوں یا کھولتی ہوئی کسی سیال شے سے، جلمار فوراً درد کو دور کر دے گا۔ چونکہ اس میں تیز (لیکن سوزش نہ کرنے والے) مصفی اجزا شامل ہوتے ہیں اس لئے اس کے استعمال سے جراثیم نہیں پیدا ہونے پاتے، یہ چھالے بھی نہیں پڑنے دیتا۔ مزید براں اس سے جلے ہوئے مقام پر بہت جلد نئی کھال پیدا ہو جاتی ہے۔

ہر قسم کی جلن اور سوزش کو ٹھنڈک اور آرام پہنچانے کے لئے **جلمار** اپنی مثال نہیں رکھتا۔ اس بات کا خیال رکھئے کہ **جلمار** ہمیشہ آپ کے گھر میں موجود رہے۔ بجائے اس کے کہ خون میں زہر پھیل جانے کے علاج پر کثیر رقم صرف کی جائے، یہ زیادہ بہتر ہے کہ جلنے سے جراثیم نہ پیدا ہونے دئے جائیں۔

آج ہی اپنے قریب دواساز یا اسٹور سے اس کا ایک ٹیوب خرید لیجئے۔

آج ہی ایک ٹیوب خرید لیجئے
معلوم نہیں کس وقت
اس کی آپ کو ضرورت پڑ جائے

جلمار

جلن اور سوزش کو آرام ...

سارے دواسازوں اور اسٹوروں سے دستیاب ہو سکتا ہے

سپلا بائیکلہ بمبئی

مکتبہ جامعہ دہلی

جغرافیے کی چند کتابیں

مرقع عالم :- ۴۴ تصویریں۔ ۶۴ رنگین نقشے اوران سے متعلق تفصیل۔ قیمت مجلد ۲عہ

جغرافیہ دنیا :- واقعات عالم کے پہلو بہ پہلو عمدہ نقشے اور دلکش و نایاب عکسی تصویریں۔ قیمت ۵عہ

مصوّر تاریخی اٹلس :- بیں رنگین نقشے اوران کے ساتھ تاریخ کے ضروری نوٹ بلاک میں۔ قیمت ۷ر

مصوّر جدید اٹلس :- ۳۲ صفحوں پر جغرافیائی رنگین نقشے اور ۱۰ صفحوں پر عکسی تصویریں۔ قیمت ۱۲ر

مصوّر ارزاں اٹلس :- ۱۶ طبعی رنگین نقشے اور بہت سی تصویریں۔ قیمت ۶ر

جیبی اٹلس تاریخ و جغرافیہ :- ۲۴ چار رنگی اور ۴۷ یک رنگی نقشے اور تصویریں معہ مکمل تفصیل و تشریح۔ قیمت ۸ر

مصوّر جیبی اٹلس دنیا :- تمام نقشے شروع سے آخر تک عکسی رنگین بلاکوں کے ذریعے آرٹ پیپر پر چھاپے گئے ہیں۔ قیمت ۷ر

نقشہ ہندوستان :- ۲۰ × ۳۰ سائز پر چھاپا گیا ہے۔ قیمت ۵ر

دیواری رنگین چارٹ :- مشہور حیوانات کی رنگین تصویریں۔ نام اردو، ہندی اور انگریزی تینوں زبانوں میں۔ قیمت عہ

مکتبہ جامعہ دہلی

جامعہ

زیر ادارت:- نور الحسن ہاشمی ایم، اے

جلد ۳۹ نمبر ۱	بابتہ ماہ جولائی ۱۹۴۳ء	چندہ سالانہ ۵ر فی پرچہ ۸ر

فہرست مضامین

سجاد حیدر یلدرم مرحوم

سجاد حیدر کی قبر پر حقیقت اور محبت کے دو پھول رضا علی کی طرف سے

مونس ہو بعد مرگ کسی کا جہاں میں کون
دو پھول بھی لحد پہ کوئی دھر نہ جائے گا

سر سید احمد خاں علیہ الرحمۃ کی اس اصلاحی تحریک کو جس نے ۱۸۷۵ء میں شہر کول میں درسگاہ کی صورت اختیار کی میں اپنے نزدیک سلطنت مغلیہ کے خاتمہ کے بعد مسلمانان ہند کا سب سے بڑا سرمایہ سمجھتا ہوں علی گڈھ کی زندگی کا پہلا دور ۱۸۷۵ء میں شروع ہو کر ۱۸۹۵ء میں ختم ہوا۔ اسی طرح دوسرے اور تیسرے دور کا آخری سال ۱۹۱۵ء اور ۱۹۳۵ء کو سمجھنا چاہیے۔ چوتھا دور نصف کے قریب گذر چکا ہے۔ قرینہ یہ ہے کہ ۱۹۵۵ء تک کم و بیش صحیح اندازہ ہو سکے گا کہ ہمارے ملک میں تعلیم کو سیاست سے کیا مناسبت ہے اور اگر کسی خدا کے بندے کو علی گڈھ کی سچی تاریخ لکھنے کی توفیق اس وقت بن پڑی تو معلوم ہو جائے گا کہ تنہا تعلیم کے دائرہ میں ہی نہیں بلکہ طلب حق۔ خدا شناسی اور خدا پرستی۔ عالی حوصلگی اور رواداری کے بے آب و گیاہ لق و دق بیابانوں۔ معاشرتی اصلاح کی نظر فریب وادیوں اور سیاسی مسلک کے طلسمی کارخانوں میں جو منزلیں علی گڈھ نے طے کی ہیں ان سے وہ توقعات کس حد تک پوری ہوئیں یا ان کے پورے ہونے کی امید ہو سکتی ہے جو سر سید احمد خاں مرحوم اور ان کے رفیقوں نے تحریک علی گڈھ کو عملی جامہ پہناتے وقت قائم کی تھیں۔

سجاد حیدر کی موت اس دردناک حقیقت کو یاد دلاتی ہے کہ علی گڈھ میں علمی مذاق کی قدر کبھی نہیں ہوئی ادبی مذاق پیدا کرنے یا طلبا کا علمی ذوق بڑھانے یا ان کی ہمت بندھانے کا خیال علی گڈھ کے پہلے دور میں بھی نہ اساتذہ کو تھا نہ ٹرسٹیوں کو۔ مولوی عزیز مرزا مرحوم اور خواجہ غلام الثقلین مرحوم دور اول کے بہترین علمی اور ادبی ذوق رکھنے والے طالب علم تھے ہم عصر ان دونوں صاحبوں کی بڑی قدر کرتے تھے مگر کالج کے ارباب حل

عقد کی آنکھوں میں ہمیشہ کھٹکتے ہی رہے۔ دوسرے دور کے طلبا میں سجاد حیدر کا مرتبہ بلحاظ علمی قابلیت کے بہت بلند تھا، اردو اور انگریزی بہت اچھی لکھتے اور بولتے تھے۔ انشا پردازی کی سنہری لڑیوں میں موقع محل سے ہمیشہ لطافت اور بذلہ سنجی کے موتی پروتے تھے، مطالعہ کا دائرہ بہت وسیع تھا ہماری قومی زندگی میں جن نئے خیالات کو مفید سمجھتے تھے ان کی زبردست تائید تحریر اور تقریر کے ذریعے سے کرتے تھے۔ رواداری کا یہ عالم تھا کہ دوسروں کی بات سننے اور اس پر عمل کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ بڑے خوش خلق اور سادہ مزاج تھے۔ تعلیم نسواں کے بڑے زبردست حامی تھے کھیل کود سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے جس کی غالباً سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مسٹر بیک کے چہیتے طلبا سب کھلاڑی تھے جن کو علمی مذاق سے کچھ سروکار نہ تھا۔ کھیل کود کے ذریعے سے جسم کی تربیت نہایت ضروری چیز ہے لیکن کھیل کود ذریعہ ہے ایک مقصد حاصل کرنے کا۔ اصلی مقصد دماغ کا صحیح نشو ونما اور اس کی تربیت اور صحت کو اچھی حالت میں رکھنا ہے جس کے حاصل کرنے کا کھیل کود، ورزش، اکسرت ایک ذریعہ ہے۔ اصل مقصد کو چھوڑ کر ذریعہ کو بجائے خود مقصد بنالینا بالکل غلط طریقہ ہے مگر یہ طریقہ میرے زمانہ میں علی گڈھ کی مقدس روایات میں داخل تھا۔ مسٹر بیک کی زبردست شخصیت نے اس مذموم طریقہ کے پھیلاؤ کو یہاں تک پہنچا دیا تھا کہ اس زمانہ میں ذوق ادب اور کھیل کود کی قدر و قیمت کا اپنی اپنی جگہ جائزہ لینے کے بحث پر مولانا شوکت علی مرحوم نے لاہور کے اسلامی اخبار پنجاب آبزرور میں جو انگریزی میں نکلتا تھا ایک مضمون لکھا تو بجائے نام لکھنے کے اپنا ادبی لقب بڑے فخر سے HELTHY BARIAN یعنی "مسٹنڈا وحشی" مضمون کے آخر میں درج کیا۔ کھلاڑی طلبا کی اس بے جا قدر و منزلت کا یہ نتیجہ ہوا کہ علمی اور ادبی ذوق رکھنے والے طالب علموں کی بے تعلقی کھیل کود، ورزش اور کسرت سے بڑھتی گئی اور رفتہ رفتہ وہ کرکٹ کی گیند کو ہاتھ لگانا یا فٹ بال کو پابوسی کا موقع دینا اپنے لئے باعث توہین سمجھنے لگے صدیوں کی تعلیم و تربیت نے مغربی ممالک میں ان قابلیتوں کی تربیت کی حدود مقرر کر دی ہیں جن کا تعلق جسمانی اور دماغی نشو ونما سے ہے۔ ہمارے ملک نے اس معاملہ میں ابھی کافی تجربہ حاصل نہیں کیا ہے اور میری ناچیز رائے میں نہایت ضروری ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے ارباب بست و کشاد دماغ کو دماغ اور جسم کو جسم سمجھیں اور اس پالیسی کو نہ دہرائیں جس نے

اب سے چالیس پچاس برس پہلے طلباء کے ذوق علم و ادب پر کرکٹ کے نیٹ کا پردہ ڈال رکھا تھا۔

میری پہلی ملاقات سجاد حیدر یلدرم مرحوم سے جولائی ۱۸۹۵ء میں ہوئی تھی۔ محمد حیات خاں، مشتاق احمد زاہدی اور حیدر حسن مرحوم بھی اس زمانے کے علمی ذوق رکھنے والے طلباء میں سے تھے بی اے پاس کرنے کے بعد مشتاق احمد نے علیگڑھ چھوڑ دیا۔ مگر دوستوں سے ملنے کے لئے اکثر علیگڈھ آتے تھے۔ یہ سب حضرات علی گڈھ کی زندگی کے گہرے نقاد تھے۔ علی گڈھ میں اس وقت تک کوئی ایسا انتظام نہ تھا کہ اگر کوئی ہونہار طالب علم کسی خاص مضمون میں کمزور ہوتا تو اس کمزور مضمون کی طرف اساتذہ خاص توجہ کرتے۔ سجاد حیدر مرحوم ریاضی سے گھبراتے تھے اور اسی وجہ سے ایف۔ اے کے امتحان میں درمقصود کی تلاش میں ایک سے زیادہ مرتبہ غوطے لگانے پڑے۔ میرے نزدیک ایسے ہونہار طالب علموں کو جنھیں کسی خاص درسی مضمون سے مناسبت نہ ہو ان کے حال پر چھوڑ دینا بڑی غلطی ہے۔ اسلامی درسگاہوں اور بالخصوص مسلم یونیورسٹی کا اہم فرض ہے کہ ہونہار طالب علموں کی تعلیم کا اس مضمون میں جس سے انھیں خاص مناسبت نہ ہو مناسب انتظام کرے تاکہ ان کی عمر کے ایک یا دو عزیز سال رائیگاں نہ جائیں۔

سرسید احمد خاں علیہ الرحمہ کے اکثر دوست نہ صرف روشن خیال اور ضرورت زمانہ کے پہچاننے والے تھے بلکہ علم و فضل میں بھی ان کا درجہ بلند تھا۔ نواب حاجی اسمٰعیل خاں صاحب رئیس دتاولی سید صاحب کے بڑے مخلص دوست تھے۔ نواب صاحب عربی اور فارسی میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔ اردو کے بہت اچھے ادیب اور صاحب تصنیف تھے۔ ان کو پولیٹکل معاملات سے بھی گہری دلچسپی تھی اور تین سال تک بذریعہ نامزدگی ہمارے صوبہ کی کونسل کے ممبر رہ چکے تھے۔ ۱۸۹۲ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی بموجب میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کو یہ حق دیا گیا تھا کہ صوبہ کی کونسل پر بعض جگہوں کو بذریعہ انتخاب پُر کرسکیں۔ مگر رائے دہندوں کا جو اکثر ہندو تھے کسی مسلمان کو منتخب کرنا ایسا ہی بعید از فہم تھا جیسا مسٹر چرچل یا مسٹر ایمری کا کسی ہندوستانی کو صوبہ کا گورنر مقرر کرنا یا پولینڈ والوں کا سوویٹ روس کی انصاف پسندی اور راست بازی کی داد دینا یا جاپانیوں کا دنیا کو یہ یقین دلانا کہ وہ چین کے سچے دوست ہیں اور چین کو مضبوط بنانے اور اہل یورپ سے اس کا پنڈ چھڑانے کے لئے بادل ناخواستہ چین سے

جنگ کر رہی ہیں۔ نواب اسماعیل خاں صاحب اس زمانہ میں علی گڈھ سے ایک ماہانہ رسالہ نکالتے تھے جس کا نام معارف تھا۔ ملک کے مشہور ادیب اس رسالے میں مضامین لکھتے تھے اور علم و ادب کے علاوہ جو مضامین اقتصادیات، معاشرتی اور سیاسی مسائل یا دیگر مباحث پر لکھے جاتے تھے ان کا معیار بھی بہت بلند ہوتا تھا۔ سجاد حیدر مرحوم نواب صاحب کے سکریٹری تھے اور رسالہ معارف کے مضامین کے متعلق نواب صاحب کے فرائض کی انجام دہی میں ان کی مدد کرتے تھے۔ معارف کے ایڈیٹر مولوی وحید الدین سلیم تھے۔ مولوی صاحب اور مولانا محمد علی نے سب سے پہلے اردو داں اخبار بین حضرات کو سیاسی مسائل کے سادہ دسترخوان پر ادب کی چاشنی سے لذت آشنا کیا۔ سجاد حیدر معارف میں خود بھی مضمون لکھتے تھے اور معارف کے لئے انگریزی رسالوں کے اعلیٰ مضامین کا اردو میں ترجمہ کرتے تھے۔ مرحوم اس خدمت پر کئی سال تک مامور رہے۔ مغربی ممالک کا موجودہ نظریہ تو یہ ہے کہ ہر ذہین اور طباع آدمی جس کام پر توجہ کرے اس میں پوری مہارت حاصل کر سکتا ہے۔ ممکن ہے یہ نظریہ تمام تر صحیح ہو یا تمام تر غلط یا جزاً صحیح ہو اور جزاً غلط لیکن اس میں شبہ نہیں کہ بعض طبیعتوں میں بعض کام کرنے کی نظری قابلیت موجود ہوتی ہے۔ سجاد حیدر کی طبیعت کا رجحان علم و ادب کی طرف تھا لیکن آج سے چالیس برس پہلے ہندوستانی اس قابل نہیں سمجھے جاتے تھے کہ کوئی یونیورسٹی انھیں فارسی عربی یا سنسکرت یا ریاضی کی تعلیم دینے کے سوا کسی اور مضمون کے پڑھانے کی خدمت ان کی سپرد کر سکے کالجوں میں ریاضی پڑھانے کی خدمت ہندوستانیوں کی سپرد اس لئے ہونے لگی تھی کہ بنگالیوں نے ثابت کر دیا تھا کہ ریاضی پڑھانے کی قابلیت ان میں انگریزوں سے کم نہیں ہے۔ پی۔ گھوش کی ارتھمیٹک (علم حساب کی کتاب) اس زمانے کی مشہور تصنیف تھی۔ بابو جادب چندر چکرورتی نے بھی جو علی گڈھ میں ریاضی کے پروفیسر تھے ایک بہت اچھی ارتھمیٹک لکھی تھی جو ہمارے صوبہ کی اکثر درسگاہوں میں بجائے پی۔ گھوش کی کتاب کے استعمال کی جاتی تھی لیکن ہمارا صوبہ تعلیم کے معاملہ میں اس قدر پسماندہ تھا کہ انگریزی ادب کے علاوہ بھی اکثر و بیشتر مضامین کے پروفیسر انگریز ہوتے تھے۔ میری ناچیز رائے میں اگر سجاد حیدر مرحوم بی۔ اے پاس کرنے کے بعد علی گڈھ کالج میں انگریزی زبان کے جونیر لیکچرر مقرر کر دئے جاتے تو انگریزی ادب کی دنیا میں کافی شہرت حاصل کرنے کا موقع ان کو مل جاتا۔ اردو غریب اس زمانہ میں اس

قابل قدر سمجھی جاتی تھی کہ کسی یونیورسٹی یا کالج کے احاطہ میں اسے باریابی کا شرف حاصل ہوسکے۔ سجاد مرحوم کے سپرد اگر فارسی پڑھانے کی خدمت کردی جاتی تو لکیر کے فقیر ہونے کی بجائے ان کی جدت پسند طبیعت بیسویں صدی عیسوی کے ایرانی چمن کے گل بوٹے اہل وطن کے سامنے اس خوبی سے پیش کرسکتی کہ فارسی زبان و ادب کے خوش نما تختے ہمارے نوجوانوں کے دلوں میں نئی امنگیں پیدا کرتے۔ نواب اسمٰعیل خاں اور ان کے علم دوست احباب کی صحبت اور رسالہ معارف سے عملاً سب ایڈیٹری کا تعلق ہونے کے باعث سجاد حیدر مرحوم کو بہت فائدہ ہوا۔ یہ افسوس ضرور ہے کہ سرکاری ملازمت کی قیود و شرائط کے باعث مرحوم کی طبیعت کے جوہر پورے طور پر نہ کھلنے پائے۔ بھلا غور کیجئے جب سجاد جیسے آزاد منش اور شگفتہ مزاج آدمی کو چھ سات گھنٹے روزانہ کچہری میں بیٹھ کر مال کے مقدمات میں کھتونی اور خسرہ کے اندراجات کو پٹواری کے اس بیان سے مطابق کرنا پڑے جو واقعات مذکورہ کے بالکل متضاد ہو اور جب بہ حیثیت مجسٹریٹ ضرب شدید کے مقدمہ میں ملزم کے ایک درجن معزز گواہان صفائی کی یہ شہادت قلم بند کرنا پڑے کہ جس وقت ماریپٹ کا ہونا بیان کیا جاتا ہے ٹھیک اس وقت ملزم کسی شادی میں شریک یا دعوت یا کھانا میں موجود تھا تو طبیعت کی شگفتگی کیا خاک قائم رہ سکتی ہے۔ سجاد حیدر نے بہت سے تجربے حاصل کئے۔ ممالک متوسط کے ایک بڑے رئیس کے اتالیق رہے۔ سردار یعقوب خاں صاحب کے عرصہ تک اسسٹنٹ پولیٹیکل آفیسر اور پولیٹیکل آفیسر رہے۔ سر محمد علی محمد خاں مرحوم مہاراجہ محمود آباد کے پرائیویٹ سکرٹری کی خدمات انجام دیں۔ ڈپٹی کلکٹر رہے۔ بہت ممکن ہے کہ مہتمم خزانہ کے وہ فرائض بھی انجام دئے ہوں جو دو برس کے عرصہ میں آدمی کو انسان سے مشین بنا ڈالتے ہیں۔ سیر و سیاحت کی۔ علمی و ادبی شغف جاری رکھا۔ پنشن لی۔ اور پھر محمود آباد پہنچ گئے۔ جب زندگی میں اتنے مرحلے پیش آئیں اور دنیا کے جھگڑے چین نہ لینے دیں تو بڑے سے بڑے ہنسوڑ آدمی کی طبیعت بھی مرجھا جائے گی۔

سجاد حیدر رسوم وقیود کے پابند نہ تھے بلکہ وہ ایسے رسم و رواج کی اصلاح کرنا چاہتے تھے جن سے سوسائٹی کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ شادی کے معاملہ میں انھوں نے بڑی ہمت و جرأت سے کام لیا اور ایک اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتہ خاتون سے جو ایک شریف خاندان میں پیدا ہوئیں اور خود کی

شیعہ ہیں شادی کی بنت نقد الباقر صاحبہ (بیگم سجاد حیدر) مرادآباد کے ایک معزز سید خاندان کی بیٹی ہیں ان کے والد نے ان کو بہت اچھی تعلیم دلائی اور آج سے تیس برس پہلے وہ نسوانی اصلاحی تحریک کی صف اول کی ممتاز کام کرنے والیوں میں تھیں۔ رواداری عجب نعمت ہے، سجاد حیدر سنی تھے اور بی بی شیعہ مگر دونوں نہایت خوش وخرّم اور فرقہ وارانہ اختلاف کی پراگندگی سے محفوظ دامون رہی۔ سجاد حیدر اور بیگم سجاد حیدر نے اپنی اولاد کو بھی جو نہایت سعید ہے۔ بہت اچھی تعلیم دلائی یلدرم نہٹور ضلع بجنور میں پیدا ہوئے تھے ان کے والد پولیس کے انسپکٹر اور اخیر زمانہ میں بنارس کے کوتوال تھے، اس زمانہ میں لکھنؤ، بنارس، الہ آباد، آگرہ، بریلی اور میرٹھ کی کوتوالی محکمۂ پولیس میں سب سے بڑا عہدہ تھا جو ہندوستانیوں کو مل سکتا تھا یلدرم کے دو چھوٹے بھائی ہیں ان دونوں نے بھی علی گڈھ میں تعلیم پائی۔ نصیرالدین حیدر علی گڈھ میں میرے ہم جماعت تھے ڈپٹی کلکٹری سے پنشن لینے کے بعد اب تین چار سال سے ریاست ٹونک میں ریونیو منسٹر (وزیر مال) ہیں۔ خان بہادر ڈاکٹر وحیدالدین حیدر سول سرجن تھے وہ بھی اب غالباً پنشن لے چکے ہیں۔

مرحوم کی طبیعت میں بلا کی شوخی تھی۔ یوں تو تصنیف و تالیف کا سلسلہ کم وبیش زندگی بھر قائم رہا مگر طالب علمی کے زمانے میں جو نظمیں اور مضامین انھوں نے لکھے ہیں وہ بڑے پُرلطف ہیں اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر مرحوم کو زمانہ چین سے بیٹھنے دیتا تو وہ ملک وقوم کی عظیم الشان ادبی خدمت انجام دیتے۔ مرزا پھویا چھوٹی سی نظم ہے جو سجاد نے ۱۹۰۰ء میں لکھی تھی۔ مرحوم نے اس نظم میں ایک سچی کہانی بیان کی ہے۔ کہانی یہ ہے کہ سرسید احمد خاں کی وفات کے بعد علی گڈھ کالج کی امداد کے لئے سرسید میموریل فنڈ قائم کیا گیا۔ محسن الملک نے ملک کا دورہ کیا اور بہت سے شہروں میں جلسے کرکے تقریریں کیں اور ان تقریروں میں بتایا کہ قوم کا فرض ہے کہ اپنے کالج کی مالی امداد کرے اور مسلمان لڑکوں کو تعلیم کے لئے علی گڈھ بھیجے۔ مرزا پھویا لکھنؤ کے ایک تعلقہ دار کے اکلوتے بیٹے تھے۔ مرزا کی عمر بیس سال کی تھی۔ بڑے نازونعمت سے پلے تھے اور گھر سے باہر نکلنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ محسن الملک کی سحر بیانی کا یہ اثر ہوا کہ مرزا کے باپ نے مرزا کو علی گڈھ

بھیجنے کا تہیہ کر لیا۔ یہاں نظم کے کچھ شعر سنئے ؎

اس ارادے کو جب کہا گھر میں پڑ گیا رونا پیٹنا گھر میں
چیخی مرزا کی ماں کہ ہائے غضب کوئی جا کر ذرا انھیں سمجھائے
میرا بچہ نہ جائے گا کوئل میرا بچہ تو کانپتا ہے دل

باپ نے ایک نہ سنی اور مرزا کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔ وداعی منظر ملاحظہ کیجئے ؎

خالہ اماں، ہومانی، بھابی جان اپنے مرزا پہ سب ہوئیں قرباں
آپا جانی نے بھی بلائیں لیں سب نے مل مل کے یوں دعائیں دیں
یا الٰہی یہ خیرت سے پھرے اور دشمن پہ اس کے بجلی گرے
واسطہ مرتضیٰ علی کا تجھے جلد لا کر ملائیو ہم سے

مرزا علی گڈھ پہنچے۔ نئی دنیا نظر آئی ہکا بکا ہیں کسی سے کچھ نہیں کہتے۔ ہفتہ بھر تک علی گڈھ کے طور طریق دیکھے اس کے بعد قبلۂ و کعبہ کی خدمت میں عریضہ لکھا۔ اب علی گڈھ کے حالات مرزا کی زبان سے سنئے ؎

یاں کے لڑکوں کا حال ہی ہے جدا ایسا دیکھا کبھی، کبھی نہ سنا
جنس ہر اک نئی دکان نئی اور تو اور ہے زبان نئی!
ایک دال ایک گوشت کہتے ہیں جانے کس دیس میں یہ رہتے ہیں
ہوں پریشاں تو آلیا فرمائیں! خوش ہوں گر تو ہیر ہیر یہ سنائیں
گر ہوا اچھا لباس ٹھاٹ کہیں اور گنواروں کو راج گھاٹ کہیں
بو تنعم کی ہو ذرا سی بھی اس کو کہتے ہیں یاں یہ عیاشی
عمدہ کھانا کھلانا عیاشی عمدہ شربت پلانا عیاشی

علی گڈھ کی منظم زندگی کی تصویر لکھنؤ کے رئیس زادے کی عینک لگا کر دیکھئے ؎

صبح تڑکے ڈرل کرتے ہیں ایسے بے رحم ہیں تھکاتے ہیں

حکم ہر وقت ہی یہ کھانا کھاؤ شام کو ایک جگہ جمع ہو جاؤ
بھوک ہو یا نہ ہو نہیں پروا ہر اُسی وقت تھوڑتا پڑتا

طلبا، کو بغیر اجازت حاصل کئے شہر جانے کی ممانعت تھی۔ مرزا اس کی شکایت کرتے ہیں۔

یاں کی آزادی ہی بہت محدود شہر جانا بھی ہو گیا مردود
اس لئے عرض ہی کہ یہ چیزیں لکھنؤ سے روانہ آپ کریں
ایک ڈبیہ دیا سلائی کی پوڑیہ اک نیلی روشنائی کی
اک برش جوتہ صاف کرنے کا اور براں کو بھی ساتھ تھوڑا سا
بوٹ کے لیس کی ضرورت ہی اور موزے بھی چند اچھے ہو
دو گھڑے اک صراحی پیالے چاء اور ممکن ہو گر تو تھوڑا اچار
اور باقی تو خیریت ہی سب سب کو تسلیم زیادہ حد ادب

ممکن ہو کہ زبان پر دلی اور لکھنؤ کے ناقدان سخن اعتراض کریں لیکن دو باتیں ملحوظ خاطر رہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ کلام سجاد حیدر کے لڑکپن کا ہی۔ دوسرے یہ کہ جس زبان میں یہ نظم لکھی گئی ہی اس کا تعلق دلی اور لکھنؤ سے ہو یا نہ ہو مگر یہ وہ زبان ہی جو اب سے چالیس پینتالیس برس پہلے علی گڈھ کالج کی ٹکسالی زبان تھی میں نے قصداً بعض ایسے شعر منتخب کئے ہیں جن میں علی گڈھ کے مخصوص محاورے زبان حال سے تبلا رہے ہیں کہ ہم نہ دلی کے مُرید ہیں نہ لکھنؤ کے چیلے۔ ہم تو اس وسیع اور ترو تازہ چمن اردو کے نئے پودوں کے رنگین پھول ہیں جو سرزمین کول پر اُگے تھے۔ یہ رنگ و بُو آپ کہیں اور نہ پایئے گا ان پھولوں کو دیکھنے اور خوش بُو سونگھنے کے لئے آپ کو کول ہی آنا پڑے گا۔ رسالہ مخزن میں جو مضامین یلدرم نے لکھے تھے وہ بھی زبان کی خوبی اور خیالات کی جدت کے لحاظ سے بڑے پُر لطف تھے اور آج بھی ہمارے نوجوان ان کے مطالعے سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

یلدرم مرحوم ترک قوم اور ترکی زبان کے بڑے والہ و شیفتہ تھے۔ ترکی زبان علی گڈھ میں ہی پڑھنا شروع کر دی تھی۔ ترکی اخبارات بھی منگاتے تھے اور ترکی زبان کی جب کوئی مخصوص طرز ادا پسند

آتی تھی تو بہت خوش ہوتے تھے اور دوستوں سے اس کا تذکرہ کرتے تھے۔ میں ترکی زبان سے ناواقف ہوں اس لئے ترکی زبان کی وسعت اور دل آویزی کے بارے میں میرا کچھ کہنا قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ اتنا ضرور مجھے معلوم ہے کہ ترکی کا اپنا ذاتی سرمایہ بہت محدود و مختصر ہے۔ ترکی زبان کا کوئی شاعر ایسا نہیں ہے جس کا مقابلہ میر یا سودا۔ ناسخ یا آتش۔ غالب یا انیس سے کیا جا سکے۔ عربی شعراء سے مقابلہ کا تو ذکر ہی کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ ترکی مدارس میں بیس سال پہلے تک فارسی شعراء کا کلام پڑھایا جاتا تھا اور فارسی شعراء کو ہی ترک اپنا قومی شاعر سمجھتے تھے۔ گذشتہ بیس برس میں جب سے اتاترک مصطفیٰ کمال نے لاطینی رسم الخط جاری کیا ہے ترکی میں یہ رواج شروع ہوا ہے کہ قومی نظمیں ترکی زبان میں کہی جائیں مگر ہنوز دلی دور است والا مضمون ہے۔ یلدرم پکے قوم پرست تھے اور انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں اسلام کی بے بسی کا جو عالم تھا اس کے لحاظ سے وہ چاہتے تھے کہ تمام دنیائے اسلام ترکی کی برتری تسلیم کرے اور ترکی کی رہنمائی میں سارے اسلامی ممالک بالخصوص ہندی مسلمان مغربی علوم و فنون سے اپنی اپنی ضرورت کے بقدر مستفید ہو سکیں مرحوم غالباً دو مرتبہ ترکی گئے تھے۔

سجاد حیدر مرحوم سے میری آخری ملاقات یکم جنوری ۱۹۴۳ء کو لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ میرے دوست سید محمد سبطین صاحب وکیل پرتاب گڈھ کے لڑکے کی برات آئی تھی اور شب گذشتہ کو عزیزی سید علی ظہیر بیرسٹر کی لڑکی سے جو ماشاء اللہ خود بھی بی، اے ہے نکاح ہوا تھا۔ یکم جنوری کو دوپہر کی دعوت میں بہت سے دوستوں کا مجمع تھا۔ سجاد حیدر بھی شریک تھے۔ صحت اچھی نہ تھی بہت سے کپڑے پہن رکھے تھے۔ عرصہ کے بعد ملاقات ہوئی تھی دو ڈھائی گھنٹے تک بہت پُرلطف صحبت رہی۔ محمد سبطین صاحب خود بھی فارسی کے اچھے ادیب ہیں اور شعر بھی کہتے ہیں۔ بلا کا حافظہ ہے بسمہ وزیر حسن اور خان بہادر سید اصغر حسن بھی موجود تھے۔ دیر تک علی گڈھ کی پرانی صحبتوں کے تذکرے ہوتے رہے۔ زمانہ بڑی عجلت کے ساتھ بدل رہا ہے تاہم ہماری سوسائٹی کا ابھی تک یہ حال ہے کہ جہاں دس پانچ ذوق سلیم والے آدمی جمع ہو جاتے ہیں وہاں شعر و سخن کا تذکرہ ہونا لازمی ہے۔ چند ہفتے پہلے سر محمد یعقوب کی وفات پر میں ایک مضمون سرگذشت میں لکھ چکا تھا اس مضمون کی جو یاد دوران گفتگو میں سجاد حیدر

نے دی اسے میں کبھی نہ بھولوں گا۔ کہنے لگے تمہارا مضمون میں نے پڑھا اور میں اس سے اس درجہ متاثر ہوں کہ میں نے ارادہ کرلیا ہے کہ یعقوب مرحوم کا مرثیہ ضرور لکھوں گا جس میں ان حالات کا تذکرہ کروں گا جو تم نے اپنے مضمون میں لکھے ہیں۔ دنیا عجیب جگہ ہے۔ افسوس ہے کہ اس قدر جلد وہ وقت آگیا کہ مرثیہ لکھنے والے کا ہی مرثیہ کوئی اور لکھے۔ سجاد کی کس کس خوبی کا تذکرہ کیا جائے۔ علی گڈھ کے دور ثانی میں بڑی مشکل سے کوئی اور شخص ایسا ملے گا جس کی ذات میں اتنی جامعیت ہو جو سجاد حیدر کی ذات میں موجود تھی۔ مرحوم نے دوستوں کا وسیع حلقہ چھوڑا ہے جن میں بہتوں کی سجاد کے بعد یہ حالت ہوگئی ہے۔

شعر:-　　تمہارے بعد یہ ہے حال ہم صفیروں کا !

اس آشیاں میں صدا دی اُدھر پکار آئے

سید رضا علی

سنہ ۴۲ء کا معاشی ماحول

سنہ ۴۲ء بڑی امید وبیم کا سال گذرا ہے، اس سال ہندوستان کو جتنی مشکلات، مصائب اور نئے مسائل سے دوچار ہونا پڑا وہ تاریخ میں ہمیشہ یاد رہیں گے، ہندوستان کا ایک قدیم صوبہ جو حال ہی میں الگ ہوا تھا ہاتھ سے چلا گیا، بعض ہندوستانی علاقوں پر دشمن نے قبضہ کرلیا، ہندوستان پر پہلی مرتبہ بمباری ہوئی، سر اسٹیفورڈ کرپس برطانیہ کی جنگی وزارت کے ایک رکن ہندوستانی مسئلے کو سلجھانے یہاں آئے اور عین اس وقت جب گھنگھور گھٹا چھا گئی تھی اور سب کو بارش کا یقین ہو چلا تھا دفعتاً بادل چھٹے اور تیزی سے منتشر ہوگئے گو مطلع وقتی طور پر صاف ہوگیا مگر اپنے بخارات چھوڑ گیا جنھوں نے چھ مہینے کے اندر ہی ایک دوسری شکل اختیار کرلی، معاشی اہم واقعات میں سنگاپور، ملایا اور برما پر جاپان کے قبضے سے ہندوستان کی مشرقی تجارت کا خاتمہ، برآمد کی زیادتی، غذا اور دوسری اشیاء کی قلت، انخلائیوں اور بیرونی وفود کی آمد صنعت وحرفت اور دفاعی اخراجات میں زیادتی، اسٹرلنگ کے قرضے میں کمی، روپیہ اور نوٹوں کا بہت زیادہ جاری ہوجانا، اور کانگریس کی تحریک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں، صوبہ داری مسائل میں سندھ میں حروں کی شر انگیزی اور سیلاب اور بنگال کے اضلاع کے خوفناک طوفان قابلِ ذکر ہیں۔

تجارت۔ سنہ ۴۲ء میں دنیا کے چند اور ملک جنگ میں شریک ہوگئے، باہر سے آنے والی چیزوں میں اور کمی ہونے لگی ہے چنانچہ ذیل کے اعداد سے اس کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

درآمد لاکھ روپوں میں

	سنہ ۳۸-۳۹ء	سنہ ۳۹-۴۰ء	سنہ ۴۰-۴۱ء	[illegible]
روئی کی مصنوعات	۱۴۱۵	۱۳۰۵	۱۲۳۵	[illegible]
مشینیں	۱۹۷۲	۱۵۳۷	۱۲۸۳	[illegible]

خام ریشم اور اس کی مصنوعات	۱۹۴	۱۸۲	۱۷۲	۱۴۹
شیشے اور مٹی کا سامان	۱۶۴	۱۳۸	۱۱۷	۱۰۱
فرنیچر یا لکڑی کا سامان	۴۵	۳۹	۴۱	۱۸
کاغذ، دفتی اور اسٹیشنری	۳۸۹	۴۱۱	۴۵۱	۴۰۷

دوسری طرف ہندوستان کی مشرقی تجارت کا خاتمہ ہوگیا، اور برما پر جاپانی قبضے کی وجہ سے چین سے تجارت رک گئی، لیکن دوسری طرف عراق وعرب، مصر، شام، ایران، افغانستان، فلسطین اور جنوبی و مغربی افریقہ وغیرہ سے تجارت کا راستہ کھل گیا، اور اگر ہندوستان صنعتی ملک ہوتا تو بڑی آسانی سے ان ملکوں کے بازاروں پر قبضہ کرسکتا تھا، مگر ہندوستان زرعی ملک ہی، اور اس کی صنعت وحرفت غیر ملکی مشینوں کے بل بوتے پر چل رہی ہی لہٰذا یہ نہ ہوسکا، البتہ فوجی ضروریات کے لئے کپڑا، جوتے وغیرہ اور غذا کے لئے اشیائے خوردنی باہر جانے لگیں، اس طرح ملک کی درآمد کم اور برآمد زائد ہوگئی، نیز جنگ کی وجہ سے برآمد کا بڑا حصہ برطانیہ اور اس کے مقبوضات کو جانے لگا، چنانچہ ذیل کے مقابل اعداد سے اس کا اندازہ ہوسکے گا۔

برآمد (کروڑ روپوں میں)

	سنہ ۳۸-۳۹ء	سنہ ۴۱-۴۲ء
برطانیہ	۵۵٫۵۱	۷۷٫۰۱
لنکا	۵٫۰۹	۹٫۷۷
آسٹریلیا	۲٫۹۷	۱۱٫۴۵
کینیڈا	۲٫۱۴	۶٫۴۸
جنوبی افریقہ	۱٫۴۹	۶٫۶۶
دیگر برطانوی مقبوضات	۸٫۱۴	۲۵٫۷۵
امریکہ کی متحدہ ریاستیں	۱۳٫۸۸	۴۶٫۴۰

زائد برآمد کے بعض دوسرے نتائج کا ذکر رزو بینک کے سلسلے میں کیا جائے گا۔

صنعت و حرفت | جنگ کے زمانے میں ہندوستان کی صنعت و حرفت میں برابر ترقی ہوتی رہی، ۱۹۴۱ء میں رسد کے صیغے کا ایک الگ وزیر بنایا گیا، ہندوستان میں فوجی ضروریات کے لئے جنگ کے پہلے سال میں ۴۰ کروڑ دوسرے سال ۱۶۵ کروڑ اور تیسرے سال ۲۶۵ روپیہ کا سامان خریدا گیا، لوہے، کوئلے، فولاد، کپڑے اور کاغذ کی پیدائش میں گذشتہ اعداد سے بہت زیادہ سامان تیار ہوا البتہ جوٹ اور شکر کی مقدار کم رہی، جنگ سے پہلے پارچہ کی فوجی ضرورتیں صرف ایک کارخانے سے پوری ہو جاتی تھیں مگر گذشتہ سال دس کارخانے اس کام میں لگے رہے، گورنمنٹ کے زین سازی کے کارخانے میں جہاں دو ہزار آدمی کام کیا کرتے تھے وہاں گذشتہ سال ۱۵ ہزار آدمی مصروف تھے، ۱۹۴۱ء میں فوج کے لئے ۱۲½ لاکھ جوڑ جوتے تیار ہوئے اور گذشتہ سال ان کی تعداد ۴۰ لاکھ جوڑے رہی۔ اب ہندوستان میں رائفلیں، مشین گنیں، اور توپیں تیزی سے تیار ہو رہی ہیں، مختلف بھک سے اڑ جانے والے مادے مثلاً ٹی این ٹی پہلی مرتبہ ہندوستان میں تیار ہوئی، فوجی چھتری سازی کا کارخانہ بھی گذشتہ سال مکمل ہوا، الومنیم کی پیدائش کا آغاز بھی ہو گیا، بیون ٹریننگ اسکیم کے تحت ڈھائی سو ہندوستانیوں کو برطانیہ بھیجا گیا اور اب یہ لوگ یہاں کی سرکاری اور غیر سرکاری صنعتوں میں مصروف ہیں۔

جنگ کے آغاز پر ہندوستان میں چھوٹے بڑے ورک شاپوں کی تعداد ۶۰۰ تھی، مگر گذشتہ سال ان کی تعداد ۱۵۰۰ ہوگئی، جس میں انجینیری کے ۸۰۰، معمولی اوزاروں کے ۳۰۰، اور ریلوں کے ۴۰۰ کارخانے تھے، ان کے علاوہ متعدد چھوٹے چھوٹے کارخانے الگ ہیں جو حکومت کی نگرانی میں نہیں ہیں، ۳۰ ہزار آدمی جہازوں کی مرمت وغیرہ میں لگے ہوئے تھے، اس صنعتی چہل پہل کا نتیجہ یہ ہوا کہ منافعوں کا اوسط بھی بڑھ گیا اور صنعتی منافعوں کا اوسط ۱۰۰ سے بڑھ کر ۱۱۲ ہو گیا۔ اگرچہ جنگ کے زمانے میں مجموعی منافع ابرت میں اضافے اور زائد محصول عائد ہونے یا عام قیمتوں کی گرانی کی وجہ سے کم ہو جاتا ہے تاہم کثیر منافع اہمیت ضرور رکھتا ہے۔

زراعت اور اشیائے خوردنی گذشتہ سال مجموعی طور پر فصلوں کی حالت اچھی رہی، مگر پیداوار کی بڑی قلت ہوگئی، مارچ میں ہندوستان کے اکثر شہروں اور صوبوں میں گیہوں نایاب ہوگیا، وسط سال میں شکر اور نمک کی بھی قلت ہوگئی، نمک نے تو ایسی شدید صورت اختیار کی کہ کانگریس نے ایک ریزولیشن کے ذریعہ ذاتی استعمال کے واسطے نمک بنانے پر زور دیا، مگر حکومت نے بتایا کہ ہندوستان میں نمک کا سالانہ خرچ ۵۳۰ لاکھ من ہے اور ملک میں یہ مقدار موجود ہے لہذا مراعات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جہاں تک غلّوں کی قلت کا سوال ہے اس کی صورت یہ ہے کہ ملک میں ایک کروڑ ٹن گیہوں، ۲۶۵ لاکھ ٹن چاول اور ۱۵۴ لاٹن جوار و باجرہ وغیرہ کا سالانہ خرچ ہے، گذشتہ سال ملک میں ۹۹۰ لاکھ ٹن گیہوں پیدا ہوا، رہی دس لاکھ ٹن کی کمی تو وہ حکومت نے آسٹریلیا سے گیہوں منگوا کر پوری کرلی، چاول کی حیثیت ذرا مختلف رہی، ہندوستان میں ۱۴ لاکھ ٹن چاول برما سے آتا تھا جو گذشتہ سال نہیں آسکا اور ملک کی پیداوار میں ۹ لاکھ ٹن کی کمی ہوگئی گویا ملک میں ۲۳ لاکھ ٹن چاول کی کمی تھی، مگر چاول کی کمی یوں اور زیادہ محسوس ہوئی کہ باہر سے آنے والے ۸، ۹ لاکھ پناہ گزینوں کی خاص خوراک چاول ہے، دوسرے ہماری ان محدود رسد میں لنکا بھی شامل ہے، کیونکہ وہاں بھی چاول برما سے جاتا تھا، مگر ان سب چیزوں کے باوجود غلّے کی کمی نہیں ہونا چاہیئے تھی کیونکہ جوار باجرہ کی پیداوار ۱۸۹ لاکھ ٹن اور خرچ ۱۵۴ لاکھ ٹن ہے گویا ۳۵ لاکھ ٹن کی بچت رہی اور بچت سے چاول کی تلافی بخوبی ہوسکتی تھی۔

گویا قلت کے اسباب پیداوار کی کمی نہیں تھی بلکہ دوسرے تھے مثلاً ملک میں نقل و حمل کی دشواریاں، بیوپاریوں کا غلّے کے بڑے بڑے ذخیروں کو پوشیدہ کر دینا، اور حکومت کا فوجی اور دوسری اغراض کے لئے غلّہ کا باہر بھیجنا، حکومت نے غلّے کی قلت پر غور کرکے زائد خوراک والی اشیاء اور پھلوں اور ترکاریوں کی کاشت کی تحریکیں شروع کیں، غیر خوردنی اشیاء مثلاً چھوٹے ریشے والی روئی، جوٹ، السی وغیرہ کی پیدائش کم کی گئی، صوبوں اور ریاستوں میں نئے رقبے زیر کاشت آنا شروع ہوئے مگر ان سب کے نتائج سے گذشتہ سال کوئی خاص فائدہ نہ اٹھایا گیا۔

مالیہ | گذشتہ سال کے بجٹ میں ۴۷ کروڑ کے خسارہ کا اندازہ کیا گیا، انکم ٹیکس، تار، ٹیلیفون، لفافے موٹر اسپرٹ اور مزید سرچارج ٹیکس کے ذریعہ ۱۲ کروڑ کی آمدنی حاصل کی گئی پھر بھی ۳۵ کروڑ کا نقصان رہا جو قرض لے کر پورا کیا گیا، مالیہ میں اضافہ دفاعی اخراجات کی وجہ سے ہو رہا ہے، عام حالات میں دفاع پر ۴۳/۴ ۳۶ کروڑ روپیہ صرف ہوتا تھا مگر گذشتہ سال ۱۳۲ کروڑ کے مصارف ہوئے،

ہندوستانیوں کو ان کثیر اخراجات پر اعتراض ہے، ان کا کہنا ہے کہ ہندوستان کو لڑائی جیتنے اور اخراجات کا بار برداشت کرنے میں صرف اسی وقت حصہ لینا چاہیئے جبکہ وہ آزاد ہو، اس کا مالیہ اس کے ہاتھ میں ہو، اس کی دفاعی اور خارجی پالیسی اس کے تحت ہو اور اس کی قومی فوج ہو، لیکن موجودہ صورت یہ ہے کہ اخراجات تو ہندوستان کے سر ڈال دیئے گئے ہیں مگر اس کو اختیارات کچھ بھی نہیں ہیں۔ حکومت کی جانب سے اس کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ جنگ اب ہندوستان کے سر پر آ پہنچی ہے، ہندوستان میں قومی حکومت بھی قائم ہو گئی ہے، وائسرائے کی کونسل کے ممبروں میں سے گیارہ غیر سرکاری ہندوستانی ہیں، جغرافی طور پر کونسل میں سب صوبوں کی نمائندگی ہے، مذہبی اعتبار سے بھی ہر جماعت کے نمائندے شامل ہیں، دفاع کا محکمہ ایک ہندوستانی کے ہاتھ میں ہے، پھر ہندوستان کے دفاعی اخراجات آبادی کے تناسب سے بہت کم ہیں، اور برطانیہ بھی ۴۰۰ کروڑ روپیہ کی حد تک سالانہ امداد کر رہی ہے۔

ہندوستان کی جانب سے اس کے دوسرے جوابات پیش کئے جاتے ہیں، اور مختصر یہ کہ حکومت اور عوام ایک دوسرے سے مطمئن نہیں ہیں، گذشتہ سال وزیر مالیہ اور حکومت کے معاشی مشیر نے انگلستان کا سفر کیا، اس سفر نے بے اعتمادی میں اور زیادہ اضافہ کر دیا۔

گذشتہ سال کی ایک اور چیز اسٹرلنگ کے قرضے میں کمی ہے، لڑائی کی وجہ سے ہماری درآمد کم اور برآمد زیادہ ہو گئی ہے، زائد برآمد کا معاوضہ ہمیں سونے کی شکل میں ملنا چاہیئے، مگر حکومت نے اس زائد رقم سے پرانے قرضوں کو بے باق کرنا شروع کیا، اور اس غرض سے ملک میں اور قرضے بھی حاصل کئے گئے، مثلاً اکتوبر میں ۱۵ کروڑ روپیہ ریلوے کا اسٹرلنگ قرضہ ادا کرنے کے لئے لیا گیا، اس کی مقدار ۳۴۱ لاکھ پونڈ تھی، اس رقم سے اس میں سے ۳ کروڑ پونڈ ادا ہو گئے اور اب ۱/۲ ۴ لاکھ پونڈ قرض باقی

رہ گیا، اس طرح ہندوستان جو عرصے سے دین دار ملک چلا آرہا تھا اب لین دار ملک بن گیا، بعض پرانی تاریخی مثالوں کی روشنی میں ہندوستانی اس سے مطمئن نہیں ہیں، ان کو ڈر ہو کہ اس وقت انگلستان کو جو قرض دیا جارہا ہی وہ کہیں لڑائی ختم ہونے کے بعد بطور جنگی تحفے کے انگلستان کو نذر نہ کر دیا جائے. جیسا کہ گذشتہ جنگ کے بعد ۱۵۰ کروڑ کی رقم برطانیہ کو پیش کی گئی، یا یہ بھی ممکن ہو کہ یہ رقم برطانیہ کو ارزاں شرح سود پر قرض دے دی جائے، اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انگلستان کی برآمد کے لئے ہندوستان میں ایک بازار قائم کیا جارہا ہی، اور برطانیہ کو ترجیحی رعائتوں کے سامان مہیا کئے جارہے ہیں، یہ رقمیں ہم کو انگلستان سے مال خریدنے پر مجبور کریں گی، اور ارزاں بازار چھوڑ کر انگلستان سے مال خریدنا دانش مندی نہیں کہلائی جا سکتی۔

جولائی میں مرکزی حکومت نے تیسرے دفاعی قرضے کا آغاز کیا جو ۱۹۵۴ء میں ادا ہوگا، اکتوبر میں ریلوں کے قرض کی ادائی کے لئے روپیہ لیا گیا، ان کے علاوہ مدراس، بمبئی، پنجاب اور صوبہ متوسط و برار نے ستمبر میں تین فیصدی کے حساب سے علی الترتیب ۱۲۵، ۳۵۰، ۲۵۰ کروڑ اور ۵۰ لاکھ روپیہ قرض لیا جو ۱۹۵۵ء میں قابل ادا ہی، ان سے یہ صوبے اپنے مرکزی حکومت والے قرضے ادا کریں گے۔

<u>بینک و بازار</u> ریزرو بینک کی شرح سود مستقل رہی، گذشتہ سال عند الطلب رقموں کی شرح ½ فیصدی اور تین ماہ والی معیادی امانتوں کی شرح نصف فیصدی سے ایک فیصدی کے درمیان رہی، البتہ ریزرو بینک کے جاری اور گردش کرنے والے نوٹوں اور اسٹرلنگ تمسکوں کی تعداد میں بے حد اضافہ ہوا، ذیل کے اعداد سے اس کا اندازہ ہو سکے گا۔

(کروڑ روپوں میں)

	اگست ۱۹۳۹ء یعنی قبل از جنگ	جنوری ۱۹۴۳ء کا دوسرا ہفتہ
اسٹرلنگ تمسک	½ ۵۹	۳۵۶
جاری شدہ نوٹ	۲۱۷	۶۰۵
گردش کرنے والے نوٹ	۱۷۹	۵۹۱

گویا اسٹرلنگ تمسکوں کی تعداد میں ۲۹۶ کروڑ روپیہ کا اضافہ ہوا، اور حکومت نے ان تمسکوں کی بنیاد پر نوٹ جاری کرنا شروع کر دئے، چنانچہ گردش کرنے والے نوٹوں کی تعداد میں ۲۳۰ فیصدی کا اضافہ ہوگیا، نوٹوں کی اس کثیر مقدار کا یہ نتیجہ ہوا کہ چیزیں گراں ہونے لگیں، اور ملک کے معاشئین نے حکومت کو افراط زر کے خطرات سے آگاہ کرنا چاہا، مگر حکومت افراط زر کو تسلیم نہیں کرتی، بہر حال قیمتیں بڑھتی رہیں اور اس کا اندازہ ذیل کے اعداد سے ہو سکے گا۔

	کلکتہ انڈکس نمبر سنہ ۱۹۱۴ء = ۱۰۰	بمبئی انڈکس نمبر سنہ ۱۹۱۴ء = ۱۰۰	معاشی مشیر کے مرتبہ انڈکس نمبر ۱۹؍اگست سنہ ۱۹۳۹ء = ۱۰۰
سنہ ۱۹۳۹ء	۱۰۸	۱۰۹	
سنہ ۱۹۴۱ء	۱۳۹	۱۳۷	۱۲۹٫۷
جنوری سنہ ۴۲ء	۱۵۵	۱۸۴	۱۴۳٫۷
اپریل سنہ ۴۲ء	۱۵۷	۱۹۶	۱۴۶٫۱
جولائی سنہ ۴۲ء	۱۸۲	۲۲۵	۱۵۹٫۹
اکتوبر سنہ ۴۲ء	۲۰۹	۲۲۹	۱۶۴٫۳
دسمبر سنہ ۴۲ء	۲۳۸	•	•

یہ صحیح ہے کہ جنگ کی وجہ سے اشیاء گراں ہو جاتی ہیں مگر ان میں اتنا اضافہ نہیں ہوتا، مثلاً انگلستان میں جولائی سنہ ۱۹۴۲ء میں انڈکس نمبر ۱۲۲٫۶ تھا، سونے اور چاندی کی کمی کی وجہ سے حکومت نے چاندی کے روپے واپس لینا شروع کر دئے اور ان کے بجائے نوٹ جاری کرنا شروع کئے، نتیجہ یہ ہوا کہ نوٹوں کی قیمت گرنے لگی اور قیمتی دھاتوں کی قیمت بڑھنے لگی، سونے کی قیمت ۴۶ سے ۷۰ روپیہ کے درمیان رہی مگر چاندی کی قیمت میں حیرت انگیز اضافہ ہوا اور وہ ۷۰ سے بڑھ کر ۱۱۵ تک پہنچ گئی، تانبے کی قیمت میں بھی اضافہ ہوگیا، اس کی وجہ سے تانبے کے سکوں پر بھی مصیبت آگئی، اور یہ اس تیزی سے غائب ہونا شروع ہوئے کہ اکثر شہروں میں ریزگاری کا قحط ہوگیا۔ ایک اندازے کے مطابق ۱۲ کروڑ روپیہ کے تانبے کے

سکّے بازار سے غائب ہوئے۔

گذشتہ سال ہندوستانی بینکوں کی میعادی امانتوں میں بڑی کمی ہوئی، آغاز جنگ پر ان کی مقدار ۱۶۰ کروڑ تھی مگر مارچ ۴۲ء میں وہ صرف ۱۰۰ کروڑ رہ گئیں، مگر بعد میں جب اعتماد کچھ بحال ہونے لگا تو دسمبر ۴۲ء میں ان کی مقدار ۱۱۰ کروڑ تک پہنچ گئی، اس کے برخلاف عند الطلب امانتوں میں تیزی سے اضافہ ہوا، اور آغاز جنگ پر ان کی مقدار ۱۴۰ کروڑ تھی تو دسمبر ۴۲ء میں ۳۴۰ کروڑ تک پہنچ گئی، اس کا مطلب یہ تھا کہ لوگوں کے پاس روپیہ ہے اور وہ اس کو جمع بھی کرنا چاہتے ہیں مگر عام بے اعتمادی کی وجہ سے اس کو سیال شکل میں رکھنا چاہتے ہیں تاکہ جب چاہیں واپس لے سکیں، مگر اس سے مالی نظام پر اثر پڑتا ہے اور بینک وغیرہ عند الطلب امانتوں سے کوئی خاص استفادہ نہیں کر سکتے اور اس طرح ملک کی کثیر رقمیں بینک کی تجوریوں میں محض بیکار پڑی رہتی ہیں۔

بیرونی وفد اپریل میں ایک امریکن صنعتی وفد ہندوستان آیا، جس کے صدر ڈاکٹر ہنری گارڈی تھے، یہ مشہور ماہر معاشیات ہیں اور انھوں نے گذشتہ جنگ کے بعد یورپ کے مالی نظام پر ایک مفصل رپورٹ پیش کی تھی، اس وفد کا مقصد جنگی سامان کی پیدائش کے سلسلے میں ہندوستان سے پورا پورا استفادہ کرنا تھا۔ پانچ ہفتے قیام کے بعد یہ وفد واپس چلا گیا اور ۲۵ سفارشات صدر امریکہ کی خدمت میں پیش کیں، ان میں سب سے اہم سفارش یہ تھی کہ ہندوستان میں انتظامی امور پر نگرانی کرنے والا ایک اعلیٰ ادارہ قائم کیا جائے جو حکومت کی موجودہ ایجنسیوں سے آزاد ہو، نیز مختلف چیزوں کی پیدائش اور توسیع کے متعلق بھی سفارشات کیں، مگر حکومت ہند نے ان سفارشات سے کوئی خاص فائدہ حاصل نہ کیا، نومبر میں ایک اینگلو امریکن وفد اس غرض سے ہندوستان آیا کہ وہ ہندوستان کے مغربی بندرگاہوں کا معائنہ کرے، اور نئے بندرگاہوں کی تعمیر اور ہندوستان میں جہاز سازی کے متعلق غور و خوض کرے، آخر دسمبر میں ایک برطانوی وفد ربر کی تحقیقات اور اس کی کاشت کی توسیع کی غرض سے ہندوستان آیا، اس کا مقصد یہ تھا کہ جنوبی ہند میں زیادہ سے زیادہ ربر پیدا کیا جائے، یہ تینوں وفد دراصل اغراض جنگ کے سلسلے میں ہندوستان سے پورا پورا استفادہ کرنا چاہتے تھے۔

انخلا | گذشتہ سال ہندوستان کی تاریخ میں یہ مسئلہ بڑا معرکتہ الآرا رہا، یہ ہندوستان کے لئے بالکل نئی چیز تھی، اور سیلون اور جنوبی افریقہ میں قانون سازی کے باوجود کبھی اتنی تعداد میں لوگ ہندوستان نہیں آئے، آنے والوں میں جزائر غرب الہند، لنکا، ملایا، اور انڈمان وغیرہ کے لوگوں کی کافی تعداد تھی مگر سب سے زیادہ تعداد برما سے آنے والوں کی تھی جہاں سے تقریباً ۵ لاکھ آدمی آئے، جن میں زیادہ تر ہندوستانی تھے۔

ہندوستانیوں کو دوسرے ملکوں یا علاقوں میں جو تکلیفیں اور اذیتیں اٹھانا پڑتی ہیں ان کا اکثر مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، لیکن حالت اس وقت اور زیادہ افسوسناک ہوجاتی ہے جب وہ اپنے ملک میں واپس آتے ہیں تو ان کی اپنی حکومت بھی ان کے ساتھ غیر مساوی سلوک کرتی ہے، سمندر پار ہندوستانیوں کے وزیر کے ساتھ کونسل آف اسٹیٹ کے دو ممبروں نے جب آسام کے پناہ گزینوں کے کیمپوں کا معائنہ کیا تو بتایا کہ "اکثر جگہ افسروں نے ان کو مارا، جب دال ختم ہوگئی تو ان کو صرف نمک اور چاول دیے گئے بعض راستے ہندوستانیوں کے لئے بند ہیں" اس کے ساتھ ہی حکومت نے ایک گشتی اعلان کے ذریعہ صوبہ جاتی حکومتوں کو ہدایت کی کہ وہ یورپین اور انیگلو انڈین پناہ گزینوں کو ۸۵ روپے فی کس یا ۵۰۰ روپیہ ماہوار فی خاندان اور ہندوستانیوں کو ۵ سے ۲۵ روپیہ فی کس ماہوار کے حساب سے مدد کریں، جب ان نسلی امتیازات کے خلاف آواز اٹھائی گئی تو یہ جواب ملا کہ یورپین باشندوں کا معاوضہ برطانوی حکومت نے طے کیا ہے اور وہی اس کی ادائی کی ذمہ دار ہے، اور ہندوستانیوں کا مسئلہ ہندوستانی حکومت کے ذمے ہے، اور چونکہ برطانوی حکومت کے مقابلے میں ہماری حکومت غریب ہے لہذا اسی اعتبار سے الاونس بھی کم ہے۔

گو اس ۷، ۸ لاکھ آبادی کی عارضی رہائش وغیرہ کا انتظام ہوگیا ہے، مگر ان کے روزگار، ان کی مستقل رہائش، اور ان کے بچوں کی تعلیم وغیرہ کے مسائل کے متعلق ابھی تک کوئی خاص تصفیہ نہیں ہوا۔

کانگریس | جب سر اسٹیفورڈ کرپس ہندوستان کی سیاسی گتھی سلجھانے میں ناکام رہے اور ان کی تجاویز

کو ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتوں نے رد کر دیا تو کانگریس نے فیصلہ کیا کہ برطانیہ ہندوستان خالی کر دے ۸
۔ ۷ ،اگست کو بمبئی میں کانگریس کا جلسہ ہوا اور قرار داد منظور کی گئی، ۹ رکی صبح کو مجلس عاملہ اور گاندھی جی
گرفتار کر لئے گئے، اور ساتھ ہی ساتھ سارے ہندوستان میں کانگریسی رہنماؤں کی گرفتاریاں شروع ہوگئیں
کانگریس اور اس کی تمام ذیلی جماعتوں کو غیر آئینی قرار دیا گیا، عوام میں اس سے ہیجان برپا ہوگیا، انھوں
نے جلوس نکالنے اور جلسے کرنا چاہی، پولیس نے ان کو روکا، آخر کار دونوں میں تصادم ہوگیا، لاٹھی چارج
ہوا، آنسو لانے والی گیس استعمال ہوئی اور آخر میں گولیاں چلنے لگیں، عوام نے جوش میں تھانوں، اسٹیشنوں
ڈاک خانوں، عدالتوں، ریلوں، بسوں اور ٹریموں پر حملہ شروع کیا، تار کاٹے جانے لگے سرکاری عمارتوں
کو جلایا گیا، اور بعض جگہ پرجوش عوام نے وحشیانہ تشدد سے کام لیا، کارخانوں میں ہڑتالیں ہوئیں
اخبارات کو بند کیا گیا، خبروں پر سنسر ہوا، میونسپلیٹیاں توڑی گئیں، گرفتاریاں عام ہوگئیں اور مجموعی
تعزیری جرمانے شروع ہوئے، پولیس اور فوج کی مدد سے کچھ دنوں میں صورت حال پر قابو پا لیا گیا۔ کہا
جاتا ہے کہ ان کارروائیوں کا مقصد حکومت کی فوجی اغراض کو نقصان پہنچانا تھا، مگر اس میں ناکامی ہوئی
ہو سکتا ہے کہ فوجی نقصان نہ پہنچا ہو مگر ملک کو کافی معاشی نقصان ضرور ہوا، محض ریلوں کے نقصان
کا اندازہ ایک کروڑ سے زائد ہے، دوسرے نقصانات الگ ہیں، ہڑتالوں سے پیدائش پر کافی اثر
پڑا، کل نقصان کا صحیح اندازہ تو نہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی مقدار کئی کروڑ تک ضرور ہے۔

غرضیکہ گذشتہ سال معاشی نقطۂ نظر سے ہندوستان کے لئے بڑے ہی مصائب اور مشکلات
کا سال تھا۔ سوائے صنعتی چہل پہل کے ہندوستان کو اور کوئی فائدہ نہیں پہنچا، یہ ضرور ہے کہ بیروزگاری
میں کمی رہی اور منافعوں کی مقدار بڑھ گئی۔ لیکن عام اشیاء کی گرانی اور ضرورت سے زائد نوٹوں کے اجرا
ہو جانے کی وجہ سے ان کے فوائد بہت کم ہو گئے۔

محمد احمد سبزواری، ایم اے

لینن

(گذشتہ سے پیوستہ)

جینیوا کے دوران قیام میں لینن کو روپیہ پیسے کی بہت تنگی ہوگئی تھی۔ نہ معلوم کس طرح گذارا چلتا تھا۔ گورکی نے دعوت دی تو اس کو لکھ بھیجا "تمہارا دعوت نامہ قبول کرنے سے قاصر ہوں۔ روپیہ کہاں سے لاؤں کہ تمہارے پاس پہنچوں آج کل ہماری سب سے بڑی دشواری روپیہ کی کمی ہے" پھر تین روز بعد لکھتا ہے "الف۔ ل۔ کو چاہیئے کہ پھر روپیہ فراہم کرنے میں سرگرم ہوجائے۔ روس میں روپیہ کی کمی کی وجہ سے ہمارے ساتھی جلا رہے ہیں" یہ وہی زمانہ تھا جبکہ لٹوینوف جو آج کل امریکہ میں روسی سفیر ہے اور ایک اور بولشیوک تفلس سے چرائے ہوئے روپیوں کو دوسرے ملک کے سکوں میں تبادلہ کرتے ہوئے پکڑے گئے تھے اور یورپ کے سرمایہ دار اخباروں نے یہ شور مچایا تھا کہ بولشیوک کا گذارا چوری سے چلتا ہے جب لینن سے لٹوینوف کی چوری کا ذکر کیا گیا تو اس نے صرف یہ کہا "بین الاقوامی پولیس ہمیشہ ایسے معاملات کو بہت نمایاں کرکے دکھاتی ہے"

اس زمانہ میں پیرس میں تمام انقلابی پارٹیوں کا جلسہ ہوا اور دوبارہ یہ سعی کی گئی کہ مختلف گروہوں کے اختلافات کو مٹا کر ایک متفقہ لائحہ عمل مقرر ہو اور متحدہ طور پر سیاسی جدوجہد کی جائے۔ لینن بھی اس جلسہ میں شریک ہوا سب نے اس پر زور دیا کہ وہ اپنی پارٹی اور تخیل کو ختم کرکے مشترکہ لائحہ عمل قبول کرے لیکن لینن نہ مانا۔ اس جلسہ کی روداد بیان کرتے ہوئے گورکی کو لکھا "تین ہفتے برابر روحانی عذاب میں مبتلا رہا۔ ہر موئے بدن کانپ اٹھا۔ پیرس کے جلسے کی خصوصیت یہ تھی کہ بنیادی اصولوں اور ہنگامی سیاسی ضرورت کو خلط ملط کیا جا رہا تھا جلسہ میں یہ ماحول تھا کہ خواہ کتنی ہی قیمت ادا کرنی پڑے لیکن آپس میں صلح ہوجائے۔ بولشیوک کے خلاف کافی غم و غصہ کا اظہار ہوا۔ اختلافات اتنے بنیادی تھے کہ اتحاد کی شکل رونما نہیں ہوئی مجھے تو اس قسم کے بحث و مباحثہ، چالوں اور خوش گپیوں سے نفرت ہوگئی

ہے لیکن کیا کروں جذبات کو قابو میں رکھ کر اس قسم کے جلسوں میں شریک ہونا ہی پڑتا ہے امید یہ ہے کہ آپس میں تنازع روس کے باہر ہی ختم ہو جائیں گے اور ہماری پارٹی تمام مشکلات پر حاوی آجائے گی" چند روز کے بعد گورکی کو لینن نے لکھا "پرولتاری اخبار کے پرچے نظر سے گذر رہے ہوں گے۔ کیا اب بھی پرولتاری کے مقالے لطف دے رہے ہیں۔ کیا لطف آتا ہوگا؟ اس کا حال بھی میری طرح تباہ ہے۔ اخبار سے کبھی اتنا بے پروا نہیں ہوا جتنا کہ آج کل ہوں۔ یہ زمانہ میکسٹ کے فلسفے کے مطالعہ میں نکلا چلا جارہا ہے" چند روز بعد لکھتا ہے:- روس کی دیہی حالت کی بابت میرا مقالہ کیوں نشر نہیں کرا سکتے مجھے ہرگز ہرگز بھی اس کے لئے کوئی ناشر نہیں ملے گا۔ اس قسم کی رکاوٹیں مجھے دیوانہ بنائے دیتی ہیں"

اگر ایک طرف لینن کو یہ شکایت تھی کہ انقلابی رجحانات تیزی سے نہیں بڑھتے تو دوسری طرف زار روس کو اس کا رونا تھا کہ انقلابی رجحانات بڑی تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ واقعہ یہ تھا کہ اس زمانہ میں راسپوٹن اور اس کی مرید زاریہ کی سیاست نے روس میں بہت سیاسی بے چینی پیدا کر رکھی تھی۔ عوام کا غم و غصہ اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ عوام کے ایک نمائندہ میلیکوف نے زار کی سرزنش کے خوف کے باوجود ڈوما کے کھلے اجلاس میں دوران تقریر میں کہا کلیسا معدودے چند پادریوں کے چنگل میں ہے پادری حکومت کے زیر اثر ہیں اور حکومت پر ایک بدمعاش (راسپوٹن) کا قبضہ ہے" ڈوما کی ان بیباکانہ تقاریر کا پتہ لینن کو لگا تو بہت مسرور ہوا اس کو ان تقریروں میں آنے والے انقلاب کی گرج سنائی دی تو دل بہت مطمئن ہوا۔ اس کے بعد یہ خوش خبری ملی کہ ماسکو سے انقلابی اخبار اسوستیا جاری ہوگیا ہے۔ سونے پر سہاگا ہوگیا۔ لینن نے پیرس سے اسوستیا کو ایک مقالہ نشر کرنے کے لئے روانہ کیا جب اسوستیا کے پرچوں کا پلندہ جس میں مقالہ نشر ہوا تھا لینن کو ملا تو اس کی مسرت کی انتہا نہ رہی۔ پلندہ ہاتھ میں تھا کھولنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ہاتھ تھر تھر کانپ رہے تھے اسی روز ایک دوست کو خط میں لکھتا ہے:- آج اسوستیا کا نومبر کا پرچہ ملا۔ ہمیں مبارک باد دو۔ ہمارا نوعمر مارکسی اخبار ماسکو سے نکل رہا ہے۔ بس آج کی یہی ایک اچھی خبر ہے"

عملی جد وجہد کیا کچھ نہیں کرسکتی۔ لینن اور اس کے ساتھیوں کی سعی جاری تھی جن کا یہ نتیجہ

ہو رہا تھا کہ چار سال کے بعد دوبارہ عوام میں کراہنے کی ہمت پیدا ہو گئی۔ مزدور ادارے پھر وجود میں آنے شروع ہو گئے۔ سیاسی تقریریں ہونے لگیں اور انقلابی ماحول از سر نو پیدا ہو گیا۔ ۱۹۱۱ء میں ...... نے ہڑتال کی۔ لینن نے گورکی کو لکھا "ہمارے مزدور کارکنوں کو مبارک باد کا پیغام ضرور روانہ کر دینا وہ سب پُرخلوص اور مستعد کارکن ہیں۔ اس میں ایک بے چارہ مصنف بھی ہے۔ میرے پاس پیرس میں روسی ملاحوں کا خفیہ وفد آیا تھا (اس کا ذکر دوسرے سے نہ آئے) وہاں ملاحوں کا کوئی ادارہ نہیں ہے۔ یہ بڑا افسوسناک امر ہے۔ اگر تمھاری بحری افسروں سے دوستی ہو تو اس سلسلہ میں ضرور کچھ نہ کچھ کرنا۔" اب چونکہ روس کے سیاسی حالات میں انقلاب کی جھلک دکھائی دینے لگی تو لینن نے ایک معزول بادشاہ کی طرح یہ مناسب خیال کیا کہ وطن کے قریب جوار میں کہیں اقامت اختیار کرے چنانچہ روس کی سرحد کے قریب مقام کراکو میں آکر آباد ہو گیا۔ یہاں گھنٹوں آسٹریا اور روس کی سرحد پر گھومتا رہتا۔ سنتریوں کی آنکھ بچتی تو روس کی سرحد میں داخل ہو جاتا۔ کہا کرتا تھا: "میرا یہ جی چاہتا ہے کہ روسی فضا میں سانس لوں اس لئے چند لمحوں کے لئے روسی سرزمین میں داخل ہو جاتا ہوں۔" کراکو آنے سے یہ فائدہ ہوا کہ روسی اخبارات جلد اور باقاعدہ طور پر ملنے لگے۔ خفیہ وفد آنے جانے لگے۔ لینن ڈوما کے بالشیوک ممبروں کو تقریریں و تجاویز تیار کر کے دینے لگا۔ خاص پیٹرو گریڈ میں بالشیوک کا اخبار پراودا جاری ہو گیا۔ قریب ۳۰۰۰۰ پرچے روزانہ فروخت ہو جاتے تھے۔ حقیقت میں تو لینن اڈیٹر تھا لیکن سخت مضامین پر اخبار کے ظاہرا مدیروں کو حکومت سزا دیتی رہتی تھی اس خفیہ طریقہ کار کا یہ نتیجہ ہوا کہ سیاسی جدوجہد برابر جاری رہی اور عوام پھر انقلابی عمل کے لئے تیار ہو گئے ہڑتال ہوئی اور کشت و خون بھی ہوا فرانسیسی سفیر ۲۳ جولائی ۱۹۱۴ء کو اپنی یادداشت میں اندراج کرتا ہے: "آج پھر پیٹرو گریڈ کے صنعتی حصہ میں مزدوروں نے ہنگامہ کیا۔ پولیس کے اعلیٰ افسر نے مجھے یقین دلایا ہے کہ حالات پر قابو پا لیا گیا ہے اور مزدور کل سے پھر حسب دستور کام شروع کر دیں گے۔" حکومتی تشدد نے واقعی قلیل عرصے میں مزدوروں کی نعشیں بچھا دیں تھیں، حکومت کے غرور اور مزدوروں کے ہراس نے یہ بھی معلوم نہ ہونے دیا کہ اس قتل عام میں کتنے مزدور جان بحق ہوئے۔ اس تشدد کا یہ

نتیجہ نکلا کہ انقلابی تحریک پھر دب گئی۔ انقلابی مجاہد زار کے کشتہ ستم ہوگئے جو باقی رہ گئے ان کو شکست نے بجائے گرمانے کے سرد کردیا۔ حالات کی نامساعدت کا ہر انقلابی کی زبان پر شکوہ تھا۔ انقلابی فکر و عمل کی روشنی روس کے کسی گوشے میں بھی نظر نہ آتی تھی۔ اس زمانے میں لینن بھی اس انتظار میں خاموش بیٹھا تھا کہ کہیں سیاسی بم پھٹے تو از سرِ نو انقلابی جدوجہد شروع کی جائے اس نے گورکی کو لکھا "یورپ میں جنگ نہیں ہوگی۔ اس لئے یہاں ہی قیام بہتر ہے اگر آسٹریا اور روس میں جنگ چھڑ جائے تو انقلابی رجحانات کے لئے بہت مفید ثابت ہوگی" لینن کو وہم و گمان بھی نہ تھا کہ جنگ عظیم شروع ہونے والی ہے جب اخباروں میں جلی سرخیوں میں اعلان جنگ نظر پڑا تو ششدر رہ گیا۔ جنگ شروع ہوگئی تو پھر انقلاب کی امیدیں بندھ گئیں۔ انقلاب کی امید بندھی تو خیال ہوا کہ جسمانی حالت بہتر کرنی چاہیئے۔ مقام کراکو میں ایک ریل کے پل کے پاس ورزش کر رہا تھا کہ کسی گاؤں والے راہ گیر نے دیکھ لیا۔ ایک غیر ملکی کو ایسے غیر مقام پر ورزش کرتے ہوئے دیکھ کر دہقان کا ماتھا ٹھنکا پولیس سے کچھ انعام کی امید پر تھانے میں جا کر اطلاع کردی یہ تو معلوم نہیں کہ اس دہقان کو پولیس نے کیا انعام دیا لیکن لینن گرفتار کرلیا گیا۔ جیل خانے میں اور قیدی بھی تھے ان میں سے زیادہ تر قرض نہ ادا کرنے کی بنا پر مقید تھے لینن نے ان کے مصائب سنے تو کراکو کے کتب خانے سے قانونی کتابیں منگا کر ان کو قانونی مشورہ دینا شروع کردیا لینن کی یہ ہمدردانہ روش دیکھ کر قیدیوں نے لینن کو اپنا سرپنچ مقرر کردیا۔ سرپنچ ہونے کی حیثیت سے اس کو جیل میں اعزاز حاصل ہوگیا۔ پولیس کے سپاہی کی معیت میں اس کو بازار سے دوسرے قیدیوں کے لئے تمباکو وغیرہ لانے کی بھی اجازت مل گئی۔ اس طرح کچھ عرصہ ہی جیل میں گذرنے پایا تھا کہ آسٹریا کے ایک ڈموکریٹ نے اس بنا پر کہ لینن زار کا دشمن ہے اور موجودہ جنگ میں مفید ثابت ہوگا رہائی دلا دی۔ رہا ہوتے ہی اس نے سوئٹزرلینڈ کا رخ کیا۔ یہاں پہنچتے ہی حسب دستور انقلابی جدوجہد شروع کردی ستمبر ۱۹۱۴ء میں ایک مقالہ میں لکھا "موجودہ جنگ نے روسی انقلاب کو روک دیا۔ چونکہ اب زار کے ساتھ

انگریزی و فرانسیسی سرمایہ دار بھی ہوگئے ہیں۔ اس لئے زار کی حکومت بہت طاقتور ہوگئی ہے۔
دوسری طرف اسٹریا اور جرمنی کے اشتراکی جمہوریت پسندوں نے اپنے اپنے سرمایہ دار
ملکوں کی حمایت لی ہے۔ اس لئے انقلابی کمزور ہوگئے ہیں اب روسی سرمایہ دار روسی انقلابی
سے یہ کہتا ہے۔ دیکھو! جرمنی اور اسٹریا کے انقلابی تو اپنے ملک کی طرف سے لڑ رہے ہیں اور
تم روسی انقلابی ایسے غدار کہ اس آڑے وقت میں بھی اپنے ملک ہی میں انقلاب پیدا کرنا
چاہتے ہو" اس زمانے میں نہ صرف جرمن اور آسٹرین اشتراکی ہی اپنے ملکی مفاد کی خاطر
جان کی قربانی پیش کر رہے تھے بلکہ پنچانوف جیسے اشتراکی نے ایک مضمون سپرد قلم
کیا اور غیر مارکسی جذبات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا "جرمن ڈاکو میرے پیارے وطن کے
دروازے پر کھڑے ہیں اور لوٹ مار مچا رہے ہیں۔ روسیو! ڈاکوؤں کے خلاف کمربستہ
ہوجاؤ" نہ صرف پنچانوف کا یہ زاویہ نگاہ تھا بلکہ لینن کے بہت سے ساتھی بھی پنچانوف کے
ہم خیال ہوگئے تھے لینن کا زاویہ نگاہ حسب ذیل تھا "دوسرے سرمایہ دار ملکوں کی طرح روس
بھی ایک سرمایہ دار ملک ہے جہاں ایک طبقہ دوسرے طبقوں کی محنت پر جیتا ہے روس ہمارا ملک نہیں
بلکہ سرمایہ دار طبقہ کا ملک ہے۔ روس اس وقت ہمارا ملک ہوتا جبکہ ملک کی حکومت کا مطمح نظر عوام
کی بہبودی ہوتی پہلے ہمیں یہ کرنا چاہیئے کہ روس کو اصل معنی میں اپنا وطن بنائیں یعنی حکمران سرمایہ دار
طبقہ سے حکومت چھینیں پھر روس ہمارا ملک ہوگا اور اس وقت روس کی حفاظت کرنا ہمارا فرض
ہوگا جب تک روس سرمایہ دار طبقہ کے چنگل میں ہے تو اس کی حفاظت کرنا بھی سرمایہ دار
طبقہ کا کام ہے ہمارا کام نہیں" لینن اس زمانے کے ایک مضمون میں لکھتا ہے: "دوران جنگ
میں کسی ملک میں انقلاب کرنے کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ خانہ جنگی شروع کردی جائے۔ خانہ جنگی
اس وقت کامیابی سے ہوسکتی ہے جبکہ میدان جنگ میں حکومت کو شکست ہو۔ طبقاتی جدوجہد
بغیر اپنے ملک کے بر جوازی طبقہ کو نقصان پہنچائے نہیں ہوسکتی دوسرے الفاظ میں
انقلابی جدوجہد جس سے حکومت کو نقصان نہ پہنچے بے معنی ہے" اس خیال کے ماتحت

جب کبھی زار کی شکست کی خبر آتی تو لینن بہت خوش ہوتا چونکہ اس کے خیال کے مطابق زار کی شکست انقلاب کو قریب تر لاتی تھی اس زمانے میں لینن کی بے کسی کا ذکر ریزیف نے اس طرح کیا ہے "شاید دنیا میں ایک درجن انسان بھی نہ ہوں گے جو لینن کی تائید کریں اور پارٹی میں تو کوئی بھی اس کے ہم خیال نہ تھا" پارٹی کا انحراف دیکھ کر لینن نوجوانوں کی طرف متوجہ ہوا۔ سارے دن وہ چند نوعمر لڑکوں کو جنگ عظیم اور انقلاب کا تعلق سمجھاتا رہتا دوست احباب مضحکہ خیز انداز میں کہتے "یہ لڑکوں کو پڑھانا کیا شروع کیا ہے؟" تو جواب دیتا "یہ میرے قبضہ قدرت میں تو ہے نہیں کہ معقول قسم کے انسانوں کو جمع کروں اور پھر تبلیغ کروں اس لئے جب کسی کا بھی رجحان اپنی طرف پاتا ہوں تو اس کو سمجھانے بیٹھ جاتا ہوں آخر شروعات تو کرنی ہی چاہیئے" لیکن اس کس مپرسی کی حالت میں بھی وہ بولشوک جلاوطنوں کی ایک کانفرنس بلانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کانفرنس میں لینن نے ایک مقالہ پڑھا جو اس وقت تو بہت مضحکہ خیز معلوم ہوا لیکن آگے چل کر یہ مقالہ ہی روسی انقلاب کا سنگ بنیاد بنا اس مقالہ میں لینن لکھتا ہے "روس میں انقلاب کرنے کے یہ معنی ہوں گے کہ وہاں پرولتاری طبقہ کی جمہوری اشتراکی آمریت قائم کی جائے گی۔ لوگ سوال کرتے ہیں کہ آمریت قائم کرنے کے بعد کیا ہوگا اس کا یہ جواب ہے کہ پرولتاری آمریت صلح کرے گی اور روس میں پرولتاری کی فتح تمام یورپ اور ایشیا میں انقلاب کا دروازہ کھول دے گی"

اس ابتدائی زمانہ میں لینن کے مندرجہ بالا تخیلات جتنے عجیب وغریب معلوم ہوتے تھے اس سے کہیں زیادہ اس کا رہن سہن تھا ایک پرانے بوسیدہ سرائے میں ایک تاریک کمرہ کرایہ پر لے رکھا تھا اگرچہ کمرے میں کھڑکی تھی لیکن اس کے کھولنے سے برابر کے قیمہ کے سموسے بنانے کے کارخانے سے اتنی بساند آتی تھی کہ اس کو بند ہی رکھنا پڑتا تھا اس کمرے میں ایک لکڑی کی میز۔ دو کرسیاں۔ دو پلنگ اور ایک کپڑا سینے کی مشین تھی بس یہ لینن اور اس کی بیوی کی کل کائنات تھی۔ ساتھ کے کمرے میں تین آدمی رہتے تھے اس میں ایک اسٹرین کسان تھا دوسرا جرمن باورچی اور تیسرا بے روزگار اطالوی تھا۔ کھانے کے وقت لینن اس کی بیوی اور یہ تینوں ساتھ کھانا

میں جمع ہو جاتے جہاں کھانا بھی کھایا جاتا اور سیاسی بحث و مباحثہ بھی ہوتا رہتا۔ پلکایا کا بیان ہے۔
"ایک روز باورچی خانے میں حسب دستور بحث و مباحثہ ہو رہا تھا کہ سرائے کی مالک کی زبان سے یہ جملہ نکلا "اس جنگ میں فوجیوں کو چاہیئے کہ وہ اپنی ہی حکومت کو گولی کا نشانہ بنائیں۔ یہ لینن کے دل کی بات تھی جو اس وقت مالک کی زبان سے نکلی۔ اب لینن نے فیصلہ کر لیا کہ وہاں ہی رہیں گے اگرچہ جو کچھ رقم ہم اس سرائے والی کو دیتے تھے اس رقم میں اس سے بہتر جائے رہائش کا انتظام ہو سکتا تھا۔" اس زمانے میں لینن کے تین چار دوست تھے ان میں ایک بیچارے کو تو بھوک پیاس نے دیوانہ کر دیا تھا جو دیوانے نہیں تھے وہ بدحال ضرور تھے جب یہ لوگ لائبریری جاتے تو لباس کی خستگی اور شکل و صورت کی بے رونقی کی بنا پر دربان ان کو لائبریری کے کمرے میں داخل نہ ہونے دیتا۔ یہ شکر تھا کہ لینن کے پاس ایک صاف کوٹ اور سالم جوتہ موجود تھا جس کی وجہ سے اس کو لائبریری میں داخلہ مل جاتا تھا۔ یہاں اس نے اپنی مشہور تصنیف بنام "سامراج سرمایہ داری کی آخری منزل ہے" مکمل کی۔ جن خیالات کا لینن نے اس تصنیف میں ذکر کیا ہے وہ فی زمانہ اتنے عام ہو گئے ہیں کہ ان کا یہاں دہرانا غیر ضروری ہے۔[1]

ایم ایم جوہر میرٹھی

---

[1] مضمون بہت طویل ہے اس لئے اب یہ سلسلہ یہیں ختم کیا جاتا ہے۔ پورا مضمون کتابی صورت میں چھپے گا۔
(جامعہ)

چینی مسلمان اور جاپان

چنکنگ کی آخری اور سب سے بڑی مسجد جو خاندان تنگ کے زمانہ کی یادگار تھی جون ۱۹۴۱ء میں جاپانی ہوابازوں کے ہاتھوں برباد ہوگئی۔ جب سے چین و جاپان کی جنگ شروع ہوئی ہے جاپانی ہوائی جہاز دو سے زاید مسجدیں ڈھا چکے ہیں۔ ان مسجدوں میں سیان کی مشہور عالم ہواچنچ زی بھی شامل ہے۔ یہ مسجد ایرانی طرز تعمیر کا نمونہ تھی۔ اس کی تعمیر تقریباً تیرہ سو برس پہلے ہوئی تھی۔ آزاد و مقبوضہ چین میں جاپانی حملہ آور مسلمانوں کو قتل، مجروح اور بُری طرح بے آبرو کر چکے ہیں۔ اس طرح جاپان نے جو مظلوم چینی مسلمانوں کی حفاظت کا مدعی ہے خدا سے اپنی محبت کا ثبوت دیا ہے اور اس کے پروپیگنڈا کرنے والے دنیا کو یہ باور کرانے کی سعی میں مصروف ہیں کہ جاپان نے یہودیوں کے خلاف محاذ جنگ تیار کیا ہے اس میں پانچ کروڑ مسلمان اس کے ساتھ ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ چینی مسلمانوں کا طرز عمل چین و جاپان کی جنگ میں کیسا رہا ہے۔ ابھی بہت دن نہیں گزرے کہ شمالی چین کے ایک معزز و محترم شخص شیخ عبدالرحیم ماسنگٹنگ چنکنگ تشریف لائے۔ کہا جاتا ہے کہ جاپانیوں نے شیخ صاحب کی خدمت میں چار لاکھ ڈالر پیش کیے لیکن انھوں نے صرف اتنا ہی نہیں کیا اس رقم کے لینے سے انکار کر دیا بلکہ (جاپانی اثر سے آزاد رہنے کے لیے) چنگشا اسلامی نارمل اسکول کو پیپنگ سے کیلین (جو کانگسی کے صوبہ میں واقع ہے) منتقل کر دیا۔ اس مدرسہ کو شیخ صاحب نے سولہ برس پہلے جاری کیا اور ابتدائے قیام سے وہ اس کے سرپرست رہے ہیں۔ اس مدرسہ میں اس وقت ایک ہزار سے زیادہ طلبا تعلیم پا رہے ہیں۔ شیخ عبدالرحیم اچھی طرح جانتے ہیں کہ پیپنگ کے مسلمان کیسے ہیں۔ وہ اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ جاپانیوں کا بنایا ہوا مسلم فیڈریشن ایک فریب ہے اور پیپنگ والوں کی طرف سے جو اسے تائید حاصل ہے یہ دراصل ان کا مغالطہ ہے۔ فیڈریشن بنے یا نہ بنے جب تک مسلمانوں کی مذہبی رسوم بغیر کسی رکاوٹ کے ادا ہو سکتی ہیں مسلمانوں کو اس کی کوئی پروا نہیں۔ شیخ عبدالرحیم نے ایسی متعدد مثالیں پیش کیں جن سے جاپانیوں کے نفرت انگیز ظلم و ستم کے مقابلہ میں چینی مسلمانوں کے اٹل جوش و جذبہ کا پتہ چلتا ہے۔

شیخ صاحب نے بتایا کہ جاپانیوں نے پیکنگ شہر کی وسعت بڑھانے کے لیے جو نقشہ تیار کیا تھا اس میں انھوں نے مسلمانوں کے وسیع قبرستان کو جو مغربی گھاٹ کے راستہ میں پڑتا ہو شامل کرنا چاہا۔ مسلمانوں کی پوری قوم نے اس بات کا تہیہ کرلیا کہ اگر جاپانیوں نے ان کے قبرستان کو ہاتھ لگایا تو وہ اپنا خون بہادیں گے بغاوت کے اس خطرہ کو محسوس کرکے جاپانیوں نے اپنا ایک انجنیر مسلمانوں کے پاس بھیجا کہ وہ ان کو سمجھا دے کہ ان کا قبرستان نقشہ میں غلطی سے آگیا تھا۔

پیپنگ شہر میں سات سو سے زیادہ قصاب مذبحوں میں جن کے مالک مسلمان ہیں کام کرتے ہیں۔ جاپانیوں نے ان مذبحوں پر اپنی حریصانہ نگاہیں جمائیں اور ان کو آمدنی کا ذریعہ بنانا چاہا اور ایک انجمن کی بناڈالی جس کا مقصد قصابوں کی تجارت پر قبضہ کرلینا تھا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے انھوں نے ماآن نام کے ایک سیدھے سادے چینی مسلمان کو تیار کیا لیکن عین اسی دن جس دن ماآن نے اس عہدہ کا چارج لیا دس نوجوان مسلمان اس کے دفتر میں داخل ہوئے اور ان میں سے ایک نے اپنے دوسرے ساتھیوں کی مدد سے ایک تیز چاقو سے اس کا ایک کان کاٹ لیا، اور پھر خود ہی اپنے آپ کو پیپنگ کے ڈسٹرکٹ کورٹ کے حوالے کردیا۔ اس کو فوراً ہی گویا ایک ہیرو کی حیثیت حاصل ہوگئی اور سیکڑوں کی تعداد میں مسلمان روزانہ اس کے پاس پہنچنے لگے تاکہ اُسے ہر قسم کا آرام پہنچا سکیں۔ کچھ دنوں بعد انھوں نے ماآن کو اس بات پر آمادہ کرلیا کہ وہ اپنے حملہ آور کی بریت کے لیے ایک درخواست عدالت میں دیدے۔ انھوں نے ماآن سے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر تم کو ایک کان کے ساتھ بھی زندگی پیاری ہو تو جو کچھ ہم لوگ کہتے ہیں اس پر عمل کرو، بالآخر حملہ آور کو رہائی مل گئی اور معاملہ ختم ہوگیا۔

پیپنگ کی مستحکم مسلم فیڈریشن کے مقابلہ میں چنگنگ کی چینی اسلامی نیشنل سالویشن فیڈریشن ایک ٹھوس کام کرنے والی جماعت ہے۔ اس فیڈریشن کی بنیاد ۱۹۳۸ء کی ابتدا میں ہنکو کی مسجد میں مجمع عام میں ڈالی گئی تھی، اور اس میں چین کے ہر حصہ کے مسلمان شریک تھے۔ اس جلسہ کے قابل ذکر مقررین میں جنرل عمر پائی چنگ شی بھی تھے جو صوبہ کوانگسی کی اسلامی فوج کے کمانڈر اور چینی قومی فوج کے ڈپٹی چیف اسٹاف تھے اور بعد میں ان کو فیڈریشن کا صدر منتخب کیا گیا۔

فیڈریشن کے افتتاح کے فوراً ہی بعد ایک وفد قومی مجلس جنگ کے ایک رکن جنرل وانگ یوچ پو کی سرپرستی میں شمال مغربی صوبہ کو بھیجا گیا تاکہ وہاں کے لوگوں کے ساتھ خوشگوار تعلقات قایم کیے جاسکیں کئی مہینوں کے دورے کے بعد یہ وفد ہانکو واپس پہنچا اور اپنے ساتھ شمال مغربی صوبہ سے جنرل چیانگ کائی شیک کے لیے ایک جھنڈا بطور تحفہ لایا۔ اس جھنڈے پر "قاید مشرق" لکھا ہوا تھا۔ یہ تحفہ پانچ کروڑ چینی مسلمانوں کی طرف سے وفاداری کے عہد کے طور پر تھا۔

دوسرا وفد مشرق قریب کو بھیجا گیا۔ ایک بیان کے مطابق جو ابھی حال ہی میں ایک چینی اخبار میں چھپا تھا، اٹلی اور جاپان کے ایک معاہدہ میں جو سنہ ۱۹۳۶ء میں یہودیت کے خلاف ہوا تھا ایک پوشیدہ شرط یہ تھی کہ جاپان کو مشرق قریب میں اشتراکیت کا سد باب اور ساتھ ہی سیاسی و معاشرتی ترقی کی بھی کوشش کرنی چاہیے تاکہ ان کے تعلقات جو برطانیہ اور فرانس کے ساتھ ہیں ختم ہو جائیں۔

اسلامی مقبوضات پر قبضہ حاصل کرنے کے لیے جاپان نے جو طریقے اختیار کیے وہ مندرجہ ذیل تھے تحفے تحائف، چاپلوسی، رفاقت، وفور محبت، سیاسی ترغیبات اور معمولی واقعات کو اہم سانحے بنانا۔

اسلامی دنیا میں جاپانی یہ نعرہ لگاتے پھرتے ہیں کہ جاپانی و مسلم اتحاد چمکتے ہوئے سورج، چاند اور تاروں کی طرح ہے۔ جاپان نے اسلامی ریاستوں اور ممالک کے ساتھ اپنی دوستی کا اظہار مصر کی شاہی شادی میں بیش قیمت تحائف کی شکل میں کیا۔ اسی طرح دوسری رسوم کی مجلسوں مثلاً ایک عرب بادشاہ کی سالگرہ کے جشن میں شریک ہو کر اپنی محبت و خلوص کا ثبوت دیا یا پھر جاپان میں دو مسجدیں (ایک کوبے میں اور دوسری ٹوکیو میں) بنوا کر اپنی اسلام دوستی کا ثبوت دینے کی کوشش کی۔ ان دونوں مسجدوں کے افتتاح کے موقع پر اسلامی حکومتوں کے نمایندوں کی انتہائی خاطر و مدارات کی گئی۔

جب ٹوکیو میں جاپانی اپنے مسلمان مہمانوں کی خاطر مدارات میں مشغول تھے۔ پانچ چینی مسلمانوں نے جو حکومت چنگنگ کی طرف سے مشرق قریب کے دورے پر گئے ہوئے تھے چنگنگ واپس آکر ان معاملات کی خبر کی۔ ان پانچوں مسلمانوں نے فریضۂ حج بھی ادا کیا تھا اور سلطان ابن سعود اور دوسرے امرائے کبار کے درباروں میں بھی حاضر ہوئے تھے مصر میں ان لوگوں نے "نوجوان مسلمانوں کی انجمن"

اور مصری خواتین کی انجمن سے رابطۂ اتحاد پیدا کیا ان دونوں انجمنوں نے مل کر چین کی مدد کے لیے کام کرنا شروع کیا اور ساتھ ہی جاپانی مال کے بائیکاٹ کی تحریک بھی شروع کردی گئی۔ ان چینیوں کی آمد پر ہندوستان میں چین کے لیے ایک امدادی کمیٹی بنائی گئی اور پھر بعد میں پانچ ڈاکٹروں کا ایک وفد طبی امداد کے لیے چین بھیجا گیا۔

اپنی رپورٹ میں ان چینی مسلمانوں نے جاپانی پروپیگنڈوں کا بھی ذکر کیا اور اس سلسلہ میں کچھ اپنے ذاتی تجربات بھی بیان کیے جب وہ ہانگ کانگ سے چلے تو دو پستہ قد آدمی اسی جہاز پر سوار ہوئے مکہ میں ان چینی مسلمانوں کو ان کے ہموطنوں نے بتایا کہ دو جاپانی جو خود کو مسلمان بتاتے تھے ان لوگوں سے پہلے ہی مل چکے تھے اور یہ خبر بھی سنائی کہ ٹنگنکیا کے مسلم صدر جنرل عمادالدین ماہنگ کیوہی نے ایک اسلامی خود اختیار حکومت قایم کی ہو۔ یہ دونوں جاپانی جنھوں نے اپنے نام حمزہ کی اور عبداللہ بتائے تھے خود کو جاپان کے "بڑے مولوی" کہنے کے دعویدار تھے۔ اور اس کے ثبوت میں انھوں نے ۱۹۳۵ء میں کوبے کی مسجد کے افتتاح کے موقعہ پر جو تصویر لی گئی تھی وہ پیش کی۔ اس افتتاح کا انتظام ان دونوں جاپانیوں میں سے ایک نے کیا تھا۔

ان چینی نمایندوں کو ایک عرب حاکم نے اپنے یہاں دعوت کے موقعہ پر وہ تصویر دکھائی تھی اس کے علاوہ دوسرے مشرقی ممالک مثلاً ایران، شام، مصر وغیرہ میں متعدد موقعوں پر ان کو وہ تلوار دکھائی گئی جس پر چاند، سورج اور تارے بنے ہوئے تھے۔ یہ تلواریں حکومت جاپان کی طرف سے ان ممالک کے حکمرانوں کی خدمت میں پیش کی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ جاپان نے مختلف ذرائع اور طریقوں سے اس بات کے یقین دلانے کی کوشش کی کہ اسلام کا آیندہ محافظ جاپان ہوگا۔

اس وفد کو واپس آئے ہوئے کچھ ہی دن گزرے تھے کہ چنکنگ میں یہ خبر پہنچی کہ جاپان پانچ چینی مسلمانوں کو پیپنگ کے مسلم فیڈریشن کا نمایندہ بنا کر حج کے موقعہ پر مکہ بھیج رہا ہے چنکنگ فیڈریشن نے محمد ماکین نام کے ایک چینی مسلمان کو جو الازہر میں مقیم تھے۔ فوراً ایک نمایندہ جماعت تیار کرنے کے لیے تار دیا۔ محمد ماکین نے تیس چینی طلبا کو اکٹھا کرلیا اور یہ جماعت فوراً مکہ روانہ ہوگئی اور اپنے نام "چینی مسلم بھائیو"

کے پہنچنے سے پہلے وہاں موجود تھی۔ ان چینی نوجوانوں نے مختلف مسجدوں میں جاکر تقریریں کیں مختلف بارسوخ لوگوں سے مل کر چینی مسلمانوں کے حقوق ان کو سمجھائے اور ان کو بتایا کہ تمام چینی مسلمان چنکنگ کے جھنڈے کے نیچے متحد ہو چکے ہیں۔ اور پیپنگ فیڈریشن محض جاپانیوں کا ایک کھلونا ہے۔ پیپنگ فیڈریشن کے نمایندے اپنا سا منھ لے کر رہ گئے۔

ابھی تھوڑے ہی دنوں سے چینی طلبا تکمیل تعلیم کے لیے جامعہ ازہر بھیجے جا رہے ہیں۔ آج تک چین کل چالیس مسلمان طلبا جامعہ ازہر بھیج چکا ہے۔ ان میں سے بارہ واپس آچکے ہیں اور اٹھائیس ابھی وہاں ہیں ان بارہ طلبا میں جو واپس آچکے ہیں، محمد ماکین، عبدالرحمٰن ناچنگ اور بدرالدین مئی ویلنگ چین میں اسلامی تہذیب و تمدن میں مستند مانے جاتے ہیں اور ان کی رائیں آخری تسلیم کی جاتی ہیں۔ ماکین نے ایک تاریخ اسلام اور کئی دوسری کتابیں لکھی ہیں۔ عبدالرحمٰن ناچنگ سنہ ۱۹۴۰ء میں ایک ضخیم مسودہ اپنے ساتھ ازہر سے لا رہے تھے جو بدقسمتی سے جاپان میں ضبط کر لیا گیا۔ اس میں ایک حضرت نبی کریم کی "سیرت" بھی تھی۔ مئی اردو زبان میں مستند مانے جاتے ہیں اور اس زبان میں متعدد کتابیں تصنیف کر چکے ہیں۔ انھوں نے عہد تانگ کی نظموں کا بھی اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ان تینوں نوجوان طلبا نے اپنے جامعہ ازہر کے دوران قیام میں لن یوٹانگ کی کتاب "میرا ملک اور میری قوم" کا عربی میں ترجمہ کیا۔

یہ تینوں نوجوان تین قومی اداروں میں اسلامی تہذیب و تمدن کے عہدوں پر فائز کیے جانے والے تھے لیکن چونکہ اس مضمون کے طلبا کی تعداد بہت کم تھی اس لیے وہ تینوں نیا عہدہ قبول کرنے سے معذور رہے۔ محمد ماکین اس وقت شا تین میں ایک نئے اسلامی مدرسہ کے صدر ہیں اور دوسرے دو بھی دو اسلامی مدرسوں میں درس تدریس میں مشغول ہیں۔

ایک دوسرا چینی طالب علم سعدلین چنگ منگ جو حال ہی میں جامعہ ازہر سے واپس آیا ہے چینی حکومت کے قایم کردہ براڈکاسٹنگ اسٹیشن چنکنگ میں ملازم ہے۔ وہ اسلامی ممالک کو عربی زبان میں خبریں نشر کرتا ہے۔ ایک اور طالب علم سعد وانگ شہ منگ کا تقرر جدہ میں بحیثیت قونصل ہوا ہے۔ وہ پہلا چینی مسلمان ہے جو ایسے ممتاز عہدہ پر فائز ہوا ہے لیکن توقع ہے کہ عنقریب دوسرے بہت سے مسلمان مشرق قریب میں

بحیثیت قونصل بھیجے جائیں گے۔

محمد ابراہیم شاہ کوچن (سابق پرنسپل منگ ٹہ اسلامی اسکول کننگ) سب سے پہلے شخص تھے جو سلسلہ ۱۹۳۲ء میں پانچ چینی مسلمان طلبا کا ایک گروہ لے کر جامعہ ازہر گئے تھے۔ محمد ابراہیم شاہ ۱۹۳۸ء میں چین واپس آئے۔ پھر ان کو برما اور ہندوستان بھیجا گیا تاکہ وہاں کے مسلمانوں کے ساتھ خوشگوار تعلقات کی بنا ڈالیں۔ محمد ابراہیم دونوں ملکوں میں ستر سے زائد جگہوں میں گئے۔ جاپانیوں نے جنوب مشرقی ایشیا کے لاکھوں مسلمانوں میں جو جال پھیلا رکھا تھا۔ اس کو توڑنے کے لیے ایک دوسرا وفد تیار کیا گیا۔ یہ وفد جزائر غرب الہند، الحاقی وغیر الحاقی ملایا ریاستیں، اور شمالی برٹش بورنیو وغیرہ گیا اور وہاں کے حکمرانوں اور ممتاز لیڈروں سے ملاقات کی۔ یہ وفد بہت سی جگہوں سے پانچ صدی بلکہ اس سے بھی پہلے کی یادگار اپنے ساتھ لایا۔ وہ یادگار کیا تھی؟ چین کے سب سے پہلے بحری افسر جنگ ہو عرف سان پاؤ بائیس ہزار پانچ سو مسلمانوں کی جماعت کے جزائر بحر جنوبی کو بحری بیڑہ لے کر گئے تھے۔ ان کے بہت سے ساتھی اس جزیرے میں رہ پڑے اور ان کے اخلاف اب تک اس جزیرے میں پائے جاتے ہیں۔ شہر سان پاؤ اور ملاکا کی دیوار سان پاؤ اور جاوا کا شہر سمرنگ اسی چینی مسلمان کپتان کی یادگار میں بنائے اور آباد کئے گئے تھے۔ ان کے علاوہ بہت سی مسجدوں کے نام بھی اس کپتان کے نام پر رکھے گئے تھے۔ موجودہ چین کے نمایندوں نے اپنے دوران سفر میں تاریخ کے اس باب کا اکثر ذکر کیا۔

اس طرح چینی مسلمانوں نے جاپانیوں پر ہر طرف سے فتح پائی ہے۔ اس سلسلہ میں چین کے جانباز مسلمانوں کی ان کوششوں کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے جو وہ جنگ میں جاپانیوں کے خلاف کر رہے ہیں۔

اگرچہ چینی مسلمانوں کی سرگرمیاں زیادہ تر بلا تحریک غیر رہی ہیں لیکن چینی حکومت اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ وہاں کے مسلمان حب الوطنی میں دوسروں سے پیچھے نہیں ہیں۔

نوجوان چینی مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد حکومت کے فوجی کالجوں میں داخل ہو چکی ہے جنرل عمر پائی چنگ شی نے پندرہ سو نوجوانوں کو مرکزی فوجی تعلیم گاہ میں داخل کرایا ہے۔ اسی طرح عیسی یوسف نے جو جلیبیہ کے ایک ممبر ہیں سنکیانگ سے ایک کثیر تعداد نوجوانوں کی اسی مقصد کے لیے حاصل کر لی ہے

چنگٹا نارمل اسکول کو چینی حکومت کی وزارت کے زیر اہتمام یکم جولائی سنہ ۱۹۴۱ء سے قومی ادارہ بنا دیا گیا ہے۔ دوسرے مدارس بھی عنقریب قومی اداروں میں تبدیل کر دیے جائیں گے۔ جون سنہ ۱۹۴۲ء میں جب چنگنگ کی آخری اور سب سے بڑی مسجد جاپانی بم کے نذر ہو گئی اور وہاں کے مسلمان لیڈروں نے فوراً ایک دوسری مسجد بنانے کی تیاری شروع کر دی تو تین لاکھ ڈالر میں سے (جو اس مسجد کی تعمیر کے خرچ کا تخمینہ تھا) ایک بڑا حصہ "نیشنل ریلیف کمیشن" نے جو حکومت کی سرپرستی میں ایک ادارہ ہے دینے کا وعدہ کیا۔

جنرل چیانگ کائی شیک نے اپنی تقریروں میں بارہا اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مسلمان بھی یقیناً بدھ مت اور مسیحی مذہب کے پیروؤں کی طرح مذہب کے ماننے والے ہیں۔ ملک کے سب سے بڑے لیڈر کے اس بیان نے اِس صدیوں پُرانے خیال کی تردید کر دی کہ مسلمان چینی قوم سے الگ ہیں اسی لیے اب ان کو مسلم گروہ (Hui Min) نہیں کہا جاتا بلکہ اسلام کے پیرو (Chiao Jen) کہا جاتا ہے اور اس نئے دور میں اب یہ مقولہ کہ "آگ میں جل کر مر جاؤ لیکن کسی مسلمان سے دوستی نہ کرو" بالکل اسی طرح غلط ثابت ہو گیا ہے جس طرح یہ مقولہ کہ "کوئی نیک آدمی سپاہی نہیں بن سکتا۔"

(ترجمہ از "ایشیا" مطبوعہ امریکہ)

عبدالرزاق قریشی

چینی فلسفہ

باوجود اس کے کہ چین ہندوستان کا پڑوسی ہے اور گزشتہ زمانے میں دونوں کے باہمی تعلقات بہت گہرے رہے ہیں پھر بھی آج ہماری ناواقفیت اس بڑے ملک کے بارے میں حیرت انگیز ہے لیکن آج بین الاقوامی کیفیت نے پھر ان دونوں ملکوں کو ایک طرف کھینچا ہے اور ہمارے خیالات آج پھر اس ملک کی طرف جاتے ہیں اور ہم اس وقت کا تصور کرتے ہیں جب چین کے بڑے بڑے عالم جیسے کہ ہوان شانگ، فاہیان ہمارے ملک میں آئے اور یہاں کے ادب اور فلسفے سے مستفید ہو کر اُسے اپنے ساتھ لے گئے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ چینی فلسفہ ہندوستانی خیالات کا ایک عکس ہے گو کہ کچھ پہلو ایسے ضرور ہیں جن میں ہندوستانی رنگ جھلکتا ہے لیکن بیشتر اس کے کہ ہم ان کا ذکر کریں ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ چین (ہندوستان کے علاوہ) دنیا میں سب سے پرانا ملک ہے اور یہاں کی تہذیب اور اس کا تمدن اور فلسفہ وہ اہمیت رکھتا ہے جس کی دوسری مثال نہیں ملتی۔ قدیم زمانے میں شاید ہی کوئی دنیا میں ایسی تحریک ہو جس کا بنیادی تعلق چینی فلسفہ اور چینی تربیت سے نہ ہو۔

چینی تہذیب اور فلسفہ کے آغاز سے تو تاریخ بھی بے بہرہ ہے لیکن جن خیالات پر اس کی تہذیب اور روزمرہ کی زندگی بنی ہے ان کی بنیاد قریب ۲۵۰۰ برس پہلے پڑی تھی یہ وہ زمانہ تھا کہ جب چین میں بدامنی اور بے چینی پھیلی تھی اس وقت ایک ایسا بزرگ ہوا جس نے چین کی زندگی پر دائمی اور غیر فانی اثر ڈالا۔ اس کا نام کنفیوشس تھا۔ اس کے اثر کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ عام مثل ہے کہ کنفیوشس چین ہے اور چین کنفیوشس ہے جس طرح منو نے ہندوستانی سماج کی بنیاد ڈالی اسی طرح کنفیوشس نے چینی زندگی اور تہذیب کو قایم کیا۔ کنفیوشس ایک ایسا فلسفی تھا جس نے زندگی کے ہر پہلو پر نظر ڈالی اور ایسی کارآمد باتیں بتائیں اور اخلاقی دنیا میں ترقی کرنے اور کامیاب ہونے کے ایسے سبق سکھائے جو آج بھی ہر چینی کے دل پر نقش ہیں اور جن کی بدولت وہ باوجود خوفناک غربت اور تاریکی کے اپنی زندگی بہادری اور ایمانداری سے گزارتا ہے کنفیوشس کا فلسفہ منطق کی دقیق باریکیوں پر نہیں بنا ہے جو کہ معمولی آدمی کی سمجھ میں نہ آئے۔ بلکہ اس نے ان باتوں پر توجہ دلائی ہے جو روزانہ

زندگی میں بہت ضروری ثابت ہوتی ہیں اور جن پر عمل کرنے سے انسان اپنی زندگی کو محفوظ اور پر لطف بنا سکتا ہو اور اصلی مقصد کو حاصل کر سکتا ہو سقراط کی طرح کنفیوشس ایک اخلاقی فلسفی تھا نہ کہ ما بعد الطبیعاتی۔ اس کو انسان کی زندگی اور اس کے مسائل سے دلچسپی تھی وہ اس حقیقت کا متلاشی نہ تھا جو کہ قدرت کے پردہ میں چھپی ہو اور انسان کو مل نہ سکے۔ اس کے لیے قدرت کا بھید انسان کی زندگی ہی میں اور اس کے اخلاقی برتاؤ میں ظاہر تھا اور اسی لیے کنفیوشس نے اپنے کو صوفیانہ یا پوشیدہ طریقوں سے الگ رکھا۔ اس نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ انسان کی زندگی کس طرح بہتر بنائی جا سکتی ہو اور اخلاق میں کس طرح ترقی ہو سکتی ہو۔ اخلاقی دنیا کا سدھار اس کی زندگی کا مقصد تھا اور اس میں اسے پوری کامیابی ہوئی۔

کنفیوشس نے اخلاقی اور سیاسی زندگی کے ہر پہلو پر نظر ڈالی اور سنتے راستے بنائے صحت کا قائم رکھنا۔ دوست دشمن کی پہچان۔ دولت حاصل کرنا اور اس کا استعمال۔ ملک کا نظام۔ شادی بیاہ کے طریقے۔ طلاق اور اس قسم کے تمام مسائل پر اس نے نہایت مفید نصیحتیں دیں۔ مثلاً وہ شادی کے بارے میں کہتا ہو کہ اگرچہ ہر تندرست مرد یا عورت کا شادی کرنا فرض ہو لیکن کچھ صورتوں میں شادی کی اجازت نہیں جس نے کوئی جرم کیا ہو یا سزا پائی ہو وہ شادی کا مستحق نہیں۔ یا جس کو کوئی بیماری ہو یا جس کا دماغ خراب ہو وہ بھی شادی نہیں کر سکتا۔ اسی طرح طلاق کی سات وجوہات بیان کی ہیں۔

۱۔ جبکہ بیوی خاوند کے والدین کے ساتھ مل کر نہ رہ سکے۔
۲۔ جبکہ اس سے اولاد نہ ہو۔
۳۔ جبکہ وہ بدکار یا بد اخلاق ہو۔
۴۔ جبکہ وہ اپنے خاوند کی نسبت بے بنیاد اور خراب افواہیں اڑائے
۵۔ جبکہ وہ ایسی بیماری میں مبتلا ہو جس سے نفرت اور کراہت پیدا ہو۔
۶۔ جبکہ وہ بہت سخت اور بدزبان ہو۔
۷۔ جبکہ وہ اپنے خاوند کی بلا اجازت اس کی کوئی چیز لے لے۔

لیکن یہ اختیارات چند صورتوں میں خاوند کو حاصل نہیں ہیں۔ جیسے کہ اگر۔

۱۔ بیوی کے والدین نہ ہوں۔

۲۔ خاوند کے ماں یا باپ کے مرنے کے بعد تین سال نہ گزرے ہوں یا

۳۔ جبکہ خاوند شادی کے وقت غریب رہا ہو اور پھر امیر ہو گیا ہو۔

کنفیوشس کا فلسفہ اسی طرح کی سینکڑوں عبرت خیز کہاوتوں سے بھرا ہی۔ ان پر عمل کرنے سے انسان کمال حاصل کرتا ہی اور انسان کامل کے درجہ کو پہنچتا ہی۔ کنفیوشس خود بھی ایک انسان کامل تھا اور چینی اس کو اسی نظر سے دیکھتا ہی اور پوجا کرتا ہی۔

جس طرح کنفیوشس کا فلسفہ بالکل عام فہم ہی اس کے برخلاف اس کے ہم عصر لاؤتزے کے خیالات مشکل اور راز سے بھرے ہوئے ہیں۔ لاؤتزے کا طریقہ کنفیوشس سے بالکل الگ ہی۔ کہا جاتا ہی کہ جب لاؤتزے اور کنفیوشس کی ملاقات ہوئی تو لاؤ طا سو نے پوچھا کہ کیا تم اصل راستہ یا حقیقت کو پہچانتے ہو کنفیوشس نے جواب دیا کہ نہیں میں تیس سال سے تلاش کر رہا ہوں لیکن میری کوشش بیکار رہوئی۔ لاؤتزے نے حقیقت کا بیان ایسے لفظوں میں کیا ہی جو کہ ہندی فلسفی اکثر استعمال کرتے ہیں خصوصاً اُپنشد میں۔ لاؤتزے کہتا ہی کہ حقیقت وہ بے نام و نشان راز ہی جس کی وجہ سے دنیا وجود میں آئی اور قایم ہی۔ اس کو وہی شخص سمجھ سکتا ہی جس نے اپنے جذبات اور نفس پر قابو پا لیا ہو۔ اور جس کا جسم تو اس دنیا میں لیکن جس کی روح دوسرے عالم میں ہو۔ جس کا دھیان بیرونی چیزوں سے ہٹ کر اصلیت کی طرف ہو۔ لیکن وہ آدمی جو اپنی خواہشات کا شکار ہو اور جس کو اپنے دل پر قابو نہ ہو۔ اُس سے اصلیت بہت دُور ہی۔ اگرچہ اصلیت کا راز ہر چیز میں پنہاں ہی لیکن اُس کی شناخت معمولی نفسی آلہ سے نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے ایک غیر معمولی احساس کی ضرورت ہی۔ اس سے روحانیت کا راز کھلتا ہی لاؤتزے کا کہنا ہی کہ جو اس کو جان گیا اُس کا کہنا ہی کیا ہی۔ لاؤتزے ہندوؤں کی طرح تناسخ یا پنر جنم میں بھی اعتقاد رکھتا تھا۔ وہ کہتا ہی کہ جو لوگ نیچے درجہ کے ہیں وہ حقیقت کے معمہ کو اس زندگی میں نہیں سمجھ سکتے۔ جب وہ دوسری زندگی میں روحانیت کے پیمانہ میں اونچے ثابت ہوتے ہیں تب ان پر ذات حقیقی یا راز حقیقت ظاہر ہو جاتا ہی۔ لاؤتزے کے چند بیانات ایسے ہیں جو کہ بعد میں انجیل میں ملتے ہیں مثلاً اس نے کہا کہ جو اپنے کو سب سے چھوٹا سمجھتا ہی وہ اونچا بنایا جاتا ہی۔ یہ انجیل کی ایک مشہور آیت ہی اور اس پر عیسائیت کی بنیاد رکھی گئی ہی۔ اس طرح لاؤتزے نے بہت سے ہندو دھرم کے مسئلوں پر نئی روشنی ڈالی ہی۔ ان سب باتوں سے کچھ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ

ہندوستان ضرور آیا ہوگا لیکن ہم یہاں یہ بحث نہیں چھیڑنا چاہتے۔ لاؤتزے نے ایک نیا طریقہ یا تاؤ جاری کیا جس سے تاویت کا فلسفہ اور مذہب ایجاد ہوا۔ تاویت ایک صوفیانہ یا راز کا فلسفہ ہے جو کہ عوام کی سمجھ سے باہر ہے لیکن وہ لوگ جن کو راز حقیقت کی تلاش ہے ان کے لیے تاویت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ لاؤتزے اور کنفیوشس دونوں بدھ کے زمانے کے فلسفی تھے اور ہم عصر تھے۔ گو کہ دونوں کے طریقے الگ ہیں لیکن چین پر ان کا اثر بہت گہرا پڑا۔ اصل میں یہ دو طریقے دو قسم کے آدمیوں کے لیے ہیں یا یہ کہ آدمی کے دو پہلو ہیں جن کے لیے یہ دونوں شاید ضروری ہیں۔ ہر شخص میں اپنی زندگی کو مفید اور کامیاب بنانے کے علاوہ دنیا کا مقصد اور اس کی حقیقت جاننے کی خواہش بھی ہوتی ہے۔ اس لیے تاویت کا پیرو اور کنفیوشیت کے طریقے دونوں ہیں اپنی اپنی جگہ اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ لاؤتزے اور کنفیوشس کے شاگردوں میں دو مشہور فلسفی ہوئے جن کا ذکر کرنا ضروری ہے یعنی چنگ سو اور مزی سس چنگ سو لاؤ کا ہم خیال تھا۔ یہ تیسری چوتھی صدی عیسوی کے پہلے ہوا اور تاویت کا بڑا پیرو کار تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ تاؤ ہر چیز میں ہے یعنی قانون قدرت ہر چیز میں ہے۔ زندگی ہو یا موت سب تاؤ یا قانون کے مطابق ہے۔ پھر انسان کو موت سے کیا ڈر کیونکہ موت کے معنی بربادی یا فنا نہیں بلکہ ایسی زندگی کا آغاز ہے جو اس زندگی سے کہیں بالاتر ہے۔ روایت ہے کہ جب چنگ سو کی بیوی نے انتقال کیا تو لوگ ماتم کے لیے گئے اور انھوں نے دیکھا کہ چنگ سو لاش کے پاس بیٹھا گا رہا ہے لوگوں کو حیرت ہوئی، چنگ سو نے جواب دیا کہ پہلے مجھے تکلیف ضرور ہوئی لیکن جب میں نے غور کیا تو یاد آیا کہ میری بیوی کی پیدائش سے پہلے کوئی دوسری ہستی ضرور تھی اور مرنے کے بعد کوئی اور ہوگی پھر افسوس بیکار جبکہ ہم کپڑے تبدیل کرتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں۔ اسی طرح موت کے معنی ایک نیا لباس اختیار کرنے کے ہیں کیونکہ روح لافانی ہے۔ چنگ سو ایک صوفی یا حق شناس تھا اور اس کا فلسفہ خاص لوگوں یا خاص وقت کے لیے تھا۔

منگ سو یا مزی سس کنفیوشس کے ۱۰۰ برس بعد ۳۷۲ قبل مسیح میں پیدا ہوا۔ اس کا فلسفہ کنفیوشس کی طرح مقبول عام ہے۔ یہ افلاطون، ارسطو، زینوم، ڈیماستھنیز وغیرہ کے دور میں ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب کنفیوشس کی تعلیم کے اثر کو پختہ کرنے کی ضرورت تھی۔ یہ کام مزی سس نے کیا۔ اس نے اپنے فلسفہ کو معمولی لوگوں کی خاطر ایک آسان کتاب میں ترتیب دیا جس کا نام رہنمائے شہزادگان ہے۔ اس میں نہایت دوراندیشی اور عقل کی باتیں

ہیں جن کے پڑھنے اور ان پر عمل کرنے سے زندگی کے سارے مقصد اور فرائض پورے ہوتے ہیں۔

ان چینی فلسفیوں کا اثر نہ صرف چین پر بلکہ ایشیا اور مہذب دنیا پر ہمیشہ پڑا ہے۔ اس معنی میں چین نے دنیا میں رہنمائی کی ہے۔ کنفیوشس کا اثر تو خاص طور پر ایشیائی تہذیب و تمدن پر پڑتا رہا ہے اور چین کی تو کنفیوشس جان ہے کیونکہ عوام کی زندگی اس سے وابستہ ہے۔ روزمرہ کی زندگی، رسم و رواج، زبان و مذہب اور اخلاق پر جو اس نے اثر ڈالا اس کی مثال دوسری جگہ مشکل سے ملے گی۔ برخلاف اس کے تاؤیت ایک خاص دائرہ میں محدود رہا ہے۔ لاؤتزے ایک ایسا پہاڑ ہے جس کی چوٹیاں بادل میں چھپی ہیں اور جن تک عام آدمی کی پہنچ نہیں۔ اس وجہ سے تاؤیت کم لوگوں کو پسند ہے لیکن کنفیوشسزم ایک روزانہ زندگی کی ترتیب ہے اور اس وجہ سے ہر چینی چاہے اس کا مذہب جو کچھ بھی ہو اور چاہے کسی فرقہ کا ہو مگر وہ کنفیوشس ضرور ہوگا۔ اصل میں کنفیوشسزم چین میں محدود نہیں یہ ایک ایسا خیال ہے جو کہ ساری دنیا کی تہذیب اور تربیت سے تعلق رکھتا ہے اور یہی ہم تاؤیت کے لیے بھی کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ ان کی شکل کتنی کیوں نہ بدلی ہو یہ خیالات فطرت کے رگ و ریشہ میں پیوست ہو چکے ہیں اور ہر زمانہ اور ہر ملک میں ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو، لکھنؤ) کالی پرشاد ایم اے

شیلی*

شیلی کی شاعری بیک وقت زندگی سے بغاوت بھی ہے اور موت سے انتقام بھی۔ وہ زندگی میں کبھی زندگی سے متنفر نہ رہا۔ یہ اور بات ہے کہ پے بہ پے مایوسیوں نے اسے موت کا تسکین بخش رخ دکھانے کی کوشش کی۔ لیکن خود اس نے زندگی اور موت دونوں سے الگ ہو کر ایک نئی امیدوں، نئی آرزوؤں، اور نئے خیالات کی دنیا بسائی تھی جہاں سے زندگی اسے مستقبل کے پردے میں دکھائی دیتی تھی اور موت ماضی کے پردے میں!

قدرت نے شیلی کے ساتھ کوئی ظلم نہیں کیا اور سچ تو یہ ہے کہ کسی کے ساتھ نہیں کرتی۔ یوں اگر کسی میں مظلوم بننے کی اہلیت ہی ہو تو کوئی کیا کرے۔ مگر شیلی ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو صرف سسکتے رہتے ہیں۔ جو صرف کاہلی اور سستی کے ساتھ زندگی بھر موت کے نغمے گایا کرتے ہیں۔ اسے فطرت سے حسن ملا تھا صحت ملی تھی، رنگین طبیعت ملی تھی، آزادی اور بغاوت کا جذبہ ملا تھا، اس نے ان سب کو استعمال کیا جس طرح بھی اس نے چاہا۔ ہماری غلطی ہے اگر ہم آج بیٹھ کر یہ سوچیں کہ ان چیزوں کے ساتھ فطرت نے اسے غم اتنا کیوں دیا تھا۔ یہ بچوں کی سی باتیں ہیں۔ دراصل یہ بات ظرف پر منحصر ہوتی ہے، قدرت خوب جانتی ہے کہ کس کے کاندھے، کتنے وزنی بوجھ کے متحمل ہو سکتے ہیں۔

شیلی نے عمر بھر جو گیت گایا۔ جو نغمے سنائے وہ آج بھی ہمارے لئے ویسے ہی تازہ ہیں۔ ان کی بھینی بھینی سی لپٹیں آج بھی ہمارے ذہن کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہیں اور جب تک انسانیت زندہ ہے، میں نے غلط کہا جب تک مشین اور سائنس ہمارے دلوں سے جذبات کے خانے کو الگ نہ کر دیں گے، جب تک ہم میں قانون سے دور "مستثنیات" پر غور کرنے کی اہلیت یا جرأت باقی رہے گی اس وقت تک شیلی

---

* جواں مرگ برطانوی شاعر (۱۷۹۲ء تا ۱۸۲۲ء)

کی نظمیں ہمارے دلوں کو یوں ہی متاثر کرتی رہیں گی۔ سچ تو یہ ہے کہ شیلی کی سب سے پہلی نظر اور شاید سب سے آخری بھی مستثنیات پر جاتی ہے "کلیہ" پر نہیں۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ قاعدہ کلیہ صرف انسانی دلیلوں کی ایک حد ہے جہاں پہنچ کر وہ ٹھہرتا ہے اور وجہ و سبب کا رشتہ اس کے آگے، اس سے چھوٹا نظر آتا ہے۔ سارے قاعدے انسانی فہم و ادراک کے راستہ پر سنگ میل" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جہاں کھڑے ہو کر انسان اپنی منطق کا سارا بوجھ پھینک دیتا ہے اور پھر ہلکے ہو کر آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ شیلی کا تخیل اسی غریب یا انسانی کمزوری کے خلاف پہلی صدائے بغاوت ہے۔ وہ خود کہتا ہے کہ "میں دیوانہ ہوں، اگر دیوانگی اس کا نام ہے کہ دنیا سے الگ ہٹ کر سوچا جائے؟"

اس کی زندگی جس ماحول میں گذری اس نے شیلی کی مدد صرف باغی بننے میں کی۔ اکہرا بدن، کھلتا ہوا کتابی چہرہ، بے صبر آنکھیں ــــــــ شیلی میں عورتوں کی سی ایک سے زیادہ خصوصیتیں تھیں۔ اس کی تصویر دیکھ کر بے اختیار سیفو کے نقش و نگار میرے ذہن کے سامنے چمکتے ہیں۔ سیفو کی زندگی کا مرکز ایک لڑکی کہی جاتی ہے۔ اسے اس کی لیمانیت کہہ لیجئے کہ اس میں مرد کی محبت کا جذبہ مفقود تھا یا کم از کم حالات نے اسے بالکل ختم کر دیا تھا۔ تاریخ کے اوراق شہادت نہ دیں گے ورنہ مجھے یہ کہنے میں ذرا تامل نہ ہوتا کہ اس نے ضرور زندگی کے کسی حصہ میں ایسے مرد سے محبت کی یا کسی ایسی چیز کو اپنانے کی کوشش کی جو اصل میں کسی اور کی ملک تھی۔ ایک عورت کی زندگی میں اس قسم کے تجربے کا ردّ عمل ضرور ہوتا ہے۔ لیکن شیلی کا معاملہ ایسا نہ تھا۔ اس نے عورت اور فن دونوں کو اس دنیا سے الگ ہٹ کر دیکھنا چاہا اسے اس بات کا یقین تھا کہ معاشرتی قدریں ڈگمگا رہیں گے اور لوگ اصلیت اور سچائی، خلوص اور محبت کی قدر کر سکیں گے۔ لیکن کب؟ جب تاروں کی ٹھنڈک لوگوں کی آنکھوں میں آجائے گی، جب دل چاند سے روشن ہوں گے، جب لوگ غم میں خوشی کی جھلک دیکھ سکیں گے، وہ یہ سب سوچ رہا تھا، ایک آسمانی فرشتہ کی طرح جو اپنے نورانی بازوؤں کے لئے دنیا کو تنگ پا کر آسمان کی بلند فضاؤں میں اڑ جانا چاہتا ہو، جس کی روح ایک غلام جسم کی قید سے آزاد ہونے کے لئے "شاہین" کی طرف پُر امید نگاہوں سے تک رہی ہے!

شیلی کو بچپن ہی سے سائنس سے دلچسپی تھی، اس چیز نے اس کے مطالعے اور مشاہدے کو وسیع نہیں تو کم از کم زیادہ صحیح ضرور بنا دیا تھا۔ وہ تجربے کا قائل ہے لیکن خود اسے برتا نہیں۔ اس کی زندگی

کی داستان محبت سے شروع ہوئی، محبت میں گذری، اور اپنے محبوب سمندر کی موجوں میں اس نے آخری سانسیں لیں۔ محبت دل کو گداز کر دیتی ہے، اتنا گداز کہ اس میں ہر چیز حتیٰ کہ نفرت بھی اسی آسانی سے گھر کر سکتی ہے۔ جو چیزیں دور سے بہت خوب صورت اور قابل حصول معلوم ہوتی تھیں۔ ان کو اس نے جب قریب سے، یا اکثر حاصل کر کے دیکھا تو اسے معلوم ہوا کہ بجلی کی خیرہ کر دینے والی روشنی صرف رات کی تاریکی میں اپنی بہار دکھاتی ہے، سورج نکل آئے تو وہ پھیکی پڑ جاتی ہے بے رونق ہو جاتی ہے! تو نفرت اس نے ان چیزوں سے کی جن سے وہ محبت کر چکا تھا۔ فرانسیسی انقلاب نے انسانی اوصاف کی جس طرح تذلیل کی تھی اس کا اسے بہت صدمہ تھا لیکن چونکہ خود باغی تھا اس لئے اس بات کا کامل اعتماد تھا کہ دنیا میں انقلاب آئے بغیر نہیں رہ سکتا دنیا نے نفرت کے کلمے سنے تو اسے پسمانی کہا۔ لیکن وہ نہ سمجھی کہ اس کی نفرت، اس کا غم، محبت اور خوشی کے لئے بدلے ہوئے چولے تھے، جو اگر نہ ہوں تو حیات بے معنی ہو جائے، فرسودہ اور بے رنگ بھی!

اس کے نزدیک حسن دنیا کی ہر چیز کے اندر ہے لیکن صرف اپنے ہی لئے! آپ کہیں گے ”مجھے تو فلاں چیز خوب صورت لگتی ہے، اچھی معلوم ہوتی ہے، یہ اس چیز کا کمال یا حسن نہیں، آپ کی اپنی آنکھوں کا فریب اور حسن ہے جو دوسروں میں خوب صورتی دیکھتی ہیں۔ آپ کہیں گے ”یہ حسن ظاہری ہوتا ہے جن کے بارے میں ہماری آنکھیں دھوکا دیتی ہیں۔ باطنی حسن کے متعلق؟“ بجا ہے، شلی کا جواب اس معاملے میں صاف ہے۔ وہ جھٹ کہہ دے گا ”باطنی حسن آنکھیں نہیں دیکھتیں۔ وہ دل دیکھتا ہے، پاک معصوم دل، پاک معصوم چہرے ہی دیکھے گا۔“ اس بارے میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن ذرا آپ شلی کے اپنے خلوص کو دیکھئے، اس کے تجربے یا مشاہدے سے آپ کو اختلاف ہو سکتا ہے مگر جب وہ پھول کو دیکھ کر کہتا ہے کہ اس کے دل کو شگفتہ بھی کہا جا سکتا ہے اور شکستہ بھی“ تو کیا یہ احساس نہیں ہوتا کہ بجائے خود پھول نہ معلوم ہنس رہا ہے، اپنی اپنی نظر ہے۔ بہت خوبی کے ساتھ ہمارے ایک شاعر نے اسے یوں پیش کیا ہے ؎

پھول وہی چمن وہی، فرق نظر نظر کا ہے ۔۔۔ فصل بہار میں تھا کیا، دور خزاں میں کیا نہیں

[illegible] کے لئے شلی کہتا ہے:-

"تیرا نغمہ بہار کی ہلکی پھواروں کی طرح سنائی دیتا ہی؛ جو ہولے ہولے رکتی ہوئی گھاس پر پڑ رہی ہوں ———

تیرا نغمہ گلاب کی ان پتیوں کی طرح کانپ رہا ہی جو گرم ہوا کے خوف سے آہستہ آہستہ اپنی خوشبو اور مٹھاس دونوں ہوا میں پھینک کر مطمئن ہو جانا چاہتی ہوں ———

تیرا نغمہ ایک دوشیزہ کی یاد دلاتا ہی جو محل کی برجی میں غمگین بیٹھی ہوئی کچھ گا رہی ہو لیکن اس طرح کہ اس کے دل کے سوا کوئی نہ سن سکے"

تو ایک نیا نقش زیادہ پائدار، زیادہ درد بھرا اور زیادہ حسین، زندگی کے افق پر ابھرتا ہی اس میں ایک طرح کی ابدیت ہی، واقعیت ہی، جیسے وہ خود اپنے کو زندگی کے کانٹوں میں دھکیل رہا ہی، اپنے دل کو تسلی دیتے ہوئے کہ سارے حسن، ساری خوشی کی بنیاد ایسے غم پر ہی جو پوشیدہ ہو جس کے نغمے، جس کی خوشبوئیں دل کے نہاں خانوں میں چھپی ہوئی ہوں! ——— ایک اور جگہ کہتا ہی

"زندگی کے نشیب و فراز میں اس چیز کو تلاش کرتے ہیں ——— جو ہم میں نہیں ہی جو ہم میں نہیں ہو سکتی! تب ہمارے قہقہے پھیکے اور درد انگیز ہو جاتے ہیں ——— جیسے ان میں کسی چیز کی کمی ہی! اور ہمارے رس بھرے نغمے وہی ہو جاتے ہیں، جن کی بنیاد شدید ترین غم پر ہو!"

کیسا عجیب فرق ہی۔ وہی آنکھیں جو نیپلز کے ساحل پر دنیا کو ایک کیف اور خوشی کے عالم میں مدہوش پاتی تھیں جو تاروں سے کھیل کو زندگی بھر کھیلنا چاہتی تھیں، جب بدلتی ہیں تو دنیا کی ہر چیز کو رنج و الم میں ڈوبا ہوا پاتی ہیں، چاند کو دیکھتی ہیں تو کہتی ہیں :-

"اے چاند تیرے چہرے پر یہ زردی کیسی

شاید کسی ساتھی کی تلاش میں تو برج برج پھر رہا ہی ——— اور بیکسی کے ساتھ دنیا والوں کو تک رہا ہی یا پھر تو تاروں کے جھلمل سے نکل بھاگنا چاہتا ہی ——— تاکہ تیری آنکھوں کی گہرائی میں کوئی چیز مستقل ہو ——— ابدی اور جاوداں!

کیا یہ شاعر کے خود اپنے دل کی صدائے باز گشت نہیں؟

دراصل شیلی صرف سرمستی اور اپیقوری فلسفہ پر یقین نہیں کرتا۔ وہ چاہتا ہو کہ دنیا کے علاقی نظرئے بدل جائیں۔ اگر دنیا میں غم کی فراوانی ہی تو انسان اس سے گھبرائے کیوں، اس سے نا امید کیوں ہو۔ اس نے غم کو انسانی زندگی میں ترقی کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھا اسے یہ کہنے میں عار نہیں کہ "غم نے مجھے جو سبق دیئے ہیں اپنے اشعار میں میں نے انھیں دہرایا ہی" وہ اپنے خیال کی رنگینی و رعنائی پر زور دیتا ہی۔ اسے دنیا کی بدصورتی، بدذوقی اور کم ظرفی کا شکوہ کرنے سے چڑھ سی ہی۔ غالب کا شعر ہی ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

اور فانی کا بھی

یاس نے درد ہی نہیں حق تو یہ ہی دوا بھی دی — فانیؔ نا امید کو موت کا آسرا دیا!

لیکن کہنا پڑتا ہی کہ ان میں یاسیت ہی۔ بندِ غم اور دردِ حیات کا علاج ان کے پاس صرف موت اور اس کا انتظار ہی۔ کچھ امید کی جھلک ان اشعار میں نظر آتی ہی ؎

سوزِ غمِ ہستی کو مانوس تمنا کر — شاید غمِ ہستی سے حاصل ہو سبکدوشی

یا

میں عقدہ کشا یہ خارِ صحرا — کم کر گلہ برہنہ پائی!

لیکن شیلی زندگی ہی میں غم کو خوشی سے بدل سکتا ہی۔ اس لئے کہ دنیا تو اس کے نزدیک خود اپنا ایک پرتو ہی۔ پھر کیوں نہ اپنا دل خوش و مطمئن کرکے اپنی آنکھوں سے خوشی کا اظہار کرے — اپنے لبوں کو تبسم سے کھیلنے دے، غم آپ ہی روٹھ جائے گا۔ جل جائے گا، فنا ہو جائے گا۔ اس تخیل میں اس شعر سے زیادہ تسلی ہی ؎

دل کو کیا کیا سکون ہوتا ہی — جب کوئی آسرا نہیں ہوتا!

اس طرح آزادی اور بے باکی کے ساتھ اس نے زندگی کے ابتدائی انتیس سال کاٹ دیئے۔ انگلستان تو بڑا متعصب ملک ہی۔ وہاں کے سب ہی بڑے باغیوں نے وطن سے بھاگ کر غیروں کے گھروں میں

پناہ لی ہی۔ پھر شیلی وہاں کیوں کر رہ سکتا تھا، شادی کرتے اور غم کھاتے اس کی زندگی کا وہ حصہ گذر گیا جس میں یہ دونوں چیزیں مشکل سے یکجا ہوتی ہیں۔ انگلستان چھوڑ کر، اپنے بچوں کی یاد میں جو زندہ تھے مگر اس کے لئے مرچکے تھے، ان عورتوں کی یاد میں جنھوں نے اس سے محبت کی تھی لیکن محبت کی بہن نفرت سے ناواقف تھیں ——— وہ یورپ کے براعظم پر، فرانس، سوئٹزرلینڈ اور اٹلی کے دل کش پہاڑوں، انگور کے باغوں، لہلہاتے ہوئے کھیتوں اور موجیں مارتے ہوئے سمندر کے کناروں پر گھومتا رہا۔ اپنے ہم عصر بائرن اور کیٹس سے ملا۔ یہ دونوں شیلی سے بہت متاثر تھے۔ کیٹس کی موت پر شیلی نے جو مرثیہ لکھا ہے اس سے پتہ چلتا ہی کہ شیلی ایک تھکے ہوئے مسافر کی طرح منزل تک جلد پہنچنا چاہتا ہی لیکن موت کی طرف سے ناامید نہیں۔ اپنی ایک طویل نظم میں جس میں ایک ہزار سے زائد اشعار ہیں اس نے حیات بعد موت کے معروضہ پر بڑی خوش اسلوبی سے بحث کی ہی اور اسلامی احیا کی طرف بھی اشارے کئے ہیں۔ اس کو پڑھ کر کچھ ایسا معلوم ہوتا ہی کہ شیلی کے رجحانات "وحدت" کی طرف ہو گئے تھے۔ اور اسے اپنے موحد ہونے پر فخر بھی تھا۔[۱]

شیلی کی دوسری طویل نظمیں بھی ہیں لیکن اس کا سب سے زیادہ دلفریب سرمایہ وہ غنائیات ہیں جو اس کی عمر کے آخری زمانے میں اس کی قلم سے نکلی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی دل کش نظمیں، جن میں غزلوں کا سا انداز ہی اور عجیب لطف سے بھرے ہوئے خطوط جو اس نے اپنے دوستوں کو لکھے ——— دراصل ان ہی میں شیلی کی شخصیت نمایاں ہوتی ہی۔

اب وقت قریب آرہا تھا۔ رسم ورواج، سوسائٹی اور سیاست کے تمام بندھنوں سے آزاد ہوکر، یہ تیس برس کا جوان شاعر سمندر کے کنارے ایک مقام پیا پرا آکر ٹھہر گیا۔ یہ سال اس کی زندگی کا آخری سال تھا۔ جو نظمیں اس نے اس زمانے میں یہاں لکھی ہیں ان سے پتہ چلتا ہی کہ اس کے دل کو یاس وناامیدی سے کیسی کیسی لڑائیاں لڑنا پڑیں۔

---

[۱] یہ نظم شیلی کا شاہکار (THE REVOLT OF ISLAM.) ہی۔

اسے کشتی رانی کا بڑا شوق تھا۔ ایک شام ہوا بالکل خاموش تھی، شیلی کشتی میں بیٹھ کر بحیرۂ روم کی دلفریب اور خنک موجوں سے کھیلنے لگا۔ دھیرے دھیرے ہوا چلی، پھر تیز ہوگئی۔ طوفان مختصر تھا لیکن تیز اور سخت چرواہوں نے شیلی کو کشتی میں بیٹھتے ہوئے دیکھا تھا لیکن اترتے ہوئے کبھی نہ دیکھ سکے بہت دنوں بعد اس کی نعش مل سکی۔ اس کا دل بائرن نے محفوظ کرالیا اور نعش سپرد آتش کردی گئی۔

کیا شیلی خود اپنے غمِ حیات کو انگیز کرسکا؟ اس کی موت اس سوال کا منہ چڑا رہی ہے، ہنس رہی ہے۔ مگر شیلی زندہ ہے۔ کیونکہ وہ بہت سے مایوس دلوں کو اب بھی امید کا پیغام دیتا ہے۔ وہ ہمیشہ زندہ رہے گا اور سمندر کی موجوں سے ہم آغوش ہوتے ہوئے یہ کہتا ہوا سنائی دے گا:-

"اے بادِ خزاں۔ تو آئی ہے تو بہار، کیا نہ آئے گی؟"

جلال الدین احمد

رجسٹرڈ ایل نمبر ۱۸۹۲

جلن، سوزش اور خراش

جلن تکلیف دہ ہونے کے ساتھ ساتھ خطرناک بھی ہوتی ہے۔ سگرٹ سے انگلی کی معمولی جلن کے علاج پر بھی اگر توجہ نہ کی جائے تو اس سے خون میں زہر پھیل جانے کا خطرہ پیدا ہوتا ہے۔ جیسے ہی آپ کسی شئے سے جل جائیں آپ جلنے کی جگہ پر فوراً **جلمار** لگا دیجئے۔ خواہ آپ آگ سے جلے ہوں یا کھولتی ہوئی کسی سیال شئے سے، جلمار فوراً درد کو دور کر دے گا۔ چونکہ اس میں تیز (لیکن سوزش نہ کرنے والے) مصفی اجزا شامل ہوتے ہیں اس لئے اس کے استعمال سے جراثیم نہیں پیدا ہونے پاتے، یہ چھالے بھی نہیں پڑنے دیتا۔ مزید براں اس سے جلے ہوئے مقام پر بہت جلد نئی کھال پیدا ہو جاتی ہے۔

ہر قسم کی جلن اور سوزش کو ٹھنڈک اور آرام پہنچانے کے لئے **جلمار** اپنی مثال نہیں رکھتا۔ اس بات کا خیال رکھئے کہ **جلمار** ہمیشہ آپ کے گھر میں موجود رہے۔ بجائے اس کے کہ خون میں زہر پھیل جانے کے علاج پر کثیر رقم صرف کی جائے، یہ زیادہ بہتر ہے کہ جلنے سے جراثیم نہ پیدا ہونے دئے جائیں۔ آج ہی اپنے قریب دواساز یا اسٹور سے اس کا ایک ٹیوب خرید لیجئے۔

آج ہی ایک ٹیوب خرید لیجئے
معلوم نہیں کس وقت
اس کی آپ کو ضرورت پڑ جائے

JALMAR HAS SAVED YOU!

جلمار

سارے دواسازوں اور اسٹوروں سے دستیاب ہو سکتا ہے

سپلا بائیکلہ بمبئی

نئی کتابیں

انتخاب [illegible] کی شاعری پر [illegible] نے نہایت [illegible] انداز میں تنقید لکھی ہے "[illegible] آسمان شاعری کا ایک ایسا درخشاں ستارہ تھے جو ایک افق سے [illegible] ہوا اور اپنی روشنی سے سب کی آنکھوں کو خیرہ کرکے دوسرے اُفق میں غائب ہوگیا" اس کی تفصیل دیکھنی ہو تو اس کتاب کا مطالعہ فرمائیے۔ قیمت [illegible] بارہ آنے (۱۲ر)

نورتن یا ایک ایکٹ کے ڈرامے:۔ علی عباس حسینی صاحب کے نام سے کون واقف نہیں۔ اب تک ان کے افسانوں کے مجموعے شائع ہوئے ہیں مگر یہ ان کے نو ڈراموں کا مجموعہ ہے اور یہ ڈرامے صحیح معنی میں ان کے نورتن ہیں۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ)

ستالن:۔ ستالن کی شخصیت کا آج کس کو اعتراف نہیں! اسے "موجودہ دور کا بڑا آدمی" کا خطاب دیا گیا ہے۔ اس کے مفصل حالات اور کارنامے معلوم کرنے ہوں تو اس کتاب کا مطالعہ فرمائیے جسے ملک کے مشہور لیڈر آصف علی صاحب نے اسٹیفن گرہم کی کتاب اسٹالن سے ترجمہ کیا ہے۔ فاضل مترجم کا ایک مبسوط مقدمہ بھی شامل ہے۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے (عیہ)

مذہب و تمدن:۔ یہ مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی کا ایک بصیرت افروز مقالہ ہے جو جامعہ کی مجلس دینیات کی دعوت پر جامعہ میں پڑھا گیا تھا۔ اس میں مذہب اور تمدن کے مسائل پر نہایت عالمانہ بحث کی گئی ہے۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے (عہ)

جدید ایڈیشن

شعلۂ طور۔ قیمت قسم اوّل عہ قسم دوم للعہ | **میدانِ عمل۔** قیمت للعہ

مناظرِ قدرت (اوّل) قیمت عہ

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ بمبئی نمبر ۳

جامعہ

زیر ادارت:- نور الحسن ہاشمی ایم، اے

جلد ۳۹ نمبر ۲ | بابتہ ماہ اگست ۱۹۴۳ء | چندہ سالانہ صہ فی پرچہ (۸ر)

فہرست مضامین

چند نئے ڈرامے

"یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو کا دامن ڈرامہ نگاری سے افسوسناک حد تک تہی دست ہے مگر اس کے ساتھ یہ امر بھی موجب مسرت ہے کہ اب ہمارے تعلیم یافتہ حضرات اس طرف توجہ کر رہے ہیں اور ان کی گرم جوشی کا یہی عالم رہا تو مستقبل قریب میں اردو ڈرامہ نگاری ترقی کی بلند سطح پر پہنچ جائے گی۔ ان حضرات میں سے جنھوں نے اپنا قلم ادب کے اس نہایت ضروری شعبے کی ترقی کے لئے وقف کردیا ہے، جناب اشتیاق حسین صاحب ایک خاص درجہ رکھتے ہیں۔ آپ کے متعدد ڈرامے مثلاً گناہ کی دیوار، صید زبوں، ہمزاد، معلم اسود شائع ہوکر کافی مقبولیت حاصل کرچکے ہیں۔"

"ادب لطیف"

(بابتہ ماہ جولائی ۳۶ء)

مکتبہ جامعہ سے قریشی صاحب کے حسب ذیل چار نئے ڈرامے شائع ہوئے ہیں۔

۱۔ کٹھ پتلیاں۔	قیمت ۸ر	۳۔ بند لفافہ	قیمت ۴ر
۲۔ مٹھائی کی ٹوکری	″ ۴ر	۴۔ ملاء اعلیٰ	″ ۴ر

دوسری نئی کتابوں کا اعلان ٹائٹل کے صفحہ ۲ و ۳ پر ملاحظہ کیجئے۔

مکتبہ جامعہ دہلی قرول باغ

سیاست اور جنگ[1]

ہر جنگ کا ایک محاذ ہوتا ہے جہاں سپاہی لڑتے ہیں اور ان منصوبوں کو پورا کرنے کے لئے جو ان کے سپرد کئے گئے ہوں جان لیتے ہیں اور جان دیتے ہیں۔ دوسرا محاذ جس کے سپاہی کو مطلب ہوتا ہے نہ ہونا چاہئے سیاسی ہوتا ہے۔ دراصل اس محاذ پر جنگ ہمیشہ جاری رہتی ہے، اس کے طریقے، اس کے آلات مختلف ہوتے ہیں مگر مقابلہ اتنا ہی سخت ہوتا ہے جتنا کہ میدان کارزار میں۔ اس محاذ پر کبھی لوگ مسکراتے ہوئے لڑنے کو آتے ہیں کبھی اکڑتے ہوئے، کبھی کندھے پر ہاتھ رکھ کر، میٹھی میٹھی باتیں کرکے اپنا مطلب حاصل کرتے ہیں کبھی غصہ دکھا کر اور دشمن بن کر۔ بڑی مشکل یہ ہے کہ اس محاذ کا کوئی مقام نہیں ہوتا، اس پر جو کچھ پیش آتا ہے اس کی صحیح کیفیت معلوم ہو تب بھی بیان نہیں کی جا سکتی۔ ایک اور مشکل، جس کا اعتراف کرتے ہوئے شرم آتی ہے، یہ ہے کہ سیاست دوستی کو مانتی ہے نہ اس پر بھروسہ کرتی ہے، اس کے نزدیک صرف دشمنی کے درجے ہوتے ہیں، اور دوستی اور اتحاد کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جس سے کم دشمنی ہو اس سے مل کر بڑے دشمن سے لڑو۔ اس لئے سیاست ایک محاذ دشمن کے خلاف کرتی ہے تو دوسرا محاذ دوست کے خلاف بھی تیار کرتی رہتی ہے کہ دوستی سے کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے عالمگیر جنگ اس کی علامت ہے کہ سیاست کے محاذ بھی عالمگیر ہو گئے ہیں۔ اس میں قوموں کی فرقہ بندی جنگ کی مصلحت کراتی ہے، اور یہ فرقہ بندی صرف اس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک کہ سیاست اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے جنگ کو چھوڑ کر اور ذریعے اختیار کرنا مناسب نہ سمجھے۔ تب وہ سپاہیوں سے کہتی ہے کہ اب تم میدان سے ہٹو، میں نے جو روگ پالے ہیں انھیں میں ہی کاٹ سکتی ہوں۔

---

[1] پروفیسر محمد مجیب صاحب جنگ کے چار سال کے نام سے جو کتاب لکھ رہے تھے، اس کی تمہید جامعہ بابت فروری ۴۳ء میں شائع ہو چکی ہے۔ پیش نظر مضمون "سیاست اور جنگ" اسی کتاب کا آخری باب ہے۔ کتاب مکمل ہو کر پریس جا چکی ہے، انشاء اللہ جلد ہی شائع ہوگی۔ (جامعہ)

یہ چوتھی زمانے کی عالمگیر جنگ کا سیاسی اور تاریخی پس منظر۔ لڑائی کے میدان بدلتے ہیں، کسی کی ہار ہوتی ہے کسی کی جیت، کشت و خون کا پیمانہ کبھی بڑھتا ہے کبھی صلح کی تدبیریں اور تجویزیں ہوتی ہیں کبھی لڑائی جاری رکھنے کی، مگر سیاسی پس منظر وہی رہتا ہے۔ ہم یہاں یورپی قوموں کے مقاصد تفصیل سے بیان نہیں کرسکتے۔ اور تفصیلات میں پڑنے کا ابھی وقت بھی نہیں آیا ہے، لیکن یورپ میں جو دو بڑے فوجی اور سیاسی محاذ قائم ہیں ان پر غور کیجئے تو اندازہ ہوجائیگا کہ جنگ سیاست میں کس طرح الجھی ہے اور سپاہی کی تلوار کیسی کیسی گتھیاں سلجھانے کے لئے استعمال کی جارہی ہے۔ ایک محاذ مشرقی یورپ میں ہے، دوسرا مغربی اور جنوبی یورپ میں۔ ایک طرف روس اور جرمنی کی لڑائی ہورہی ہے، دوسری طرف اتحادیوں اور جرمنی کی۔ لیکن جرمنی کی مخالفت روس کے سیاسی مقاصد میں سے صرف ایک ہے، اور اتحادی فوجیں جرمنوں کو اٹلی سے بیدخل کرنے کی جس کوشش میں مصروف ہیں اس کا آپ اتحادیوں کے سیاسی اور فوجی مقاصد سے مقابلہ کیجئے تو وہ اتنی حقیر معلوم ہوگی کہ شاید آپ اٹلی کی جنگ کی خبریں پڑھنا چھوڑ دیں۔ روس میں جرمن فوجیں پسپا ہورہی ہیں، یہ ایک بہت پیچیدہ اور بہت خطرناک فوجی کارروائی ہے، لیکن جب جرمن فوجیں روس کو خالی کردیں گی تو آپ دیکھیں گے کہ یہ ایک گہری سیاسی چال تھی، کہ جنگ کا اس طرح فیصلہ ہوتے ہی روسی سیاست اپنے پرے جمائے گی، جرمنی کو امید ہے کہ وہ بیچ میں سے نکل جائے گا اور یورپی سیاست میں ایسے انقلاب ہوں گے کہ اس کے لئے جنگ جاری رکھنا کچھ آسان ہوجائے گا۔

دسمبر ۱۹۴۱ء سے کئی مہینے بعد تک ایسی خبریں آتی رہیں جن سے معلوم ہوتا تھا کہ پاپائے روم کے دربار میں جرمنی، جاپان، روس اور اٹلی کے جو سفیر ہیں ان کے درمیان گفتگو ہورہی ہے، اور جاپانی اس کی کوشش کررہے ہیں کہ روس اور جرمنی میں سمجھوتہ ہوجائے۔ انھیں کامیابی نہیں ہوئی، غالباً اس لئے کہ جرمنی کو خیال تھا کہ روسیوں نے بہت نقصان اٹھایا ہے اور وہ سخت شرطیں ماننے پر مجبور ہوں گے۔ روسیوں میں بہت دم باقی تھا، اتحادی بھی انھیں سہارا دے رہے تھے، اور جاپان کے جنگ میں شریک ہوجانے سے ان کو یقین ہوگیا ہوگا کہ جنگ نمائشی نہیں رہ سکتی۔ انھوں نے لڑائی جاری رکھی اور انھیں ان کے صبر اور استقلال کا پھل ملا۔ لیکن جنگ کے مقاصد ایسے نہیں ہیں کہ بالکل واضح بیان کئے جاسکیں، ۱۴ اگست ۱۹۴۱ء کو پریزیڈنٹ روزولٹ اور مسٹر چرچل نے جو مشترک اعلان کیا (منشور اٹلانٹک) اس میں کوئی ایسی دفعہ

نہیں تھی جس سے روسیوں کو اطمینان ہوتا کہ ان کے سیاسی مفاد کا لحاظ کیا جائے گا، اور اگرچہ برطانیہ اور روس کے درمیان ایک باضابطہ معاہدہ ہو گیا (۱۲ جولائی سنہ ۴۱ء و ۲۶ مئی سنہ ۴۲ء) متحدہ ریاستوں کا روس سے جو تعلق ہے اس کا سیاسی پہلو اب تک وضاحت سے محروم رہا ہے۔ اگست سنہ ۴۲ء میں، جب جرمن پیش قدمی شدت پر تھی، روسیوں نے اچانک مطالبہ کیا کہ ہرہٹلر کے نائب ہرہیس (Hess) جو برطانیہ میں نظربند تھے عدالت کے سامنے پیش کئے جائیں۔ روسی جانتے ہوں گے کہ ہرہس کو کسی عدالت میں مجرم کی طرح لا کر کھڑا کرنا سیاسی آداب کے خلاف ہوگا، اور ہرہس کے ساتھ کوئی زیادتی کی جائے گی تو جرمن حکومت برطانوی قیدیوں سے اس کا بدلہ لے گی، وہ صرف برطانوی وزارت کو آزمانا اور یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ برطانیہ کے شہری ان سے کتنی ہمدردی رکھتے ہیں۔ معلوم نہیں روسیوں نے اپنے مطالبے کا اثر دیکھ کر کیا نتیجے نکالے، بہرحال یہ بات تو واضح ہو گئی کہ وہ جنگ میں منہمک ہونے کے باوجود سیاست کے کسی پہلو سے غافل نہیں ہیں۔ جنوری سنہ ۴۳ء میں مسٹر چرچل اور پریذیڈنٹ روزولٹ کی ایک کانفرنس کازابلانکا میں ہوئی جس کا مقصد یورپی جنگ کے منصوبوں کو مقرر کرنا تھا، اس میں روس کو شریک ہونے کی دعوت نہیں دی گئی، مگر جنرل فرینکو کازابلانکا آکر مسٹر چرچل اور پریذیڈنٹ روزولٹ سے ملے، اور اگرچہ اعلان یہ کیا گیا کہ اتحادی اس وقت تک لڑائی بند نہ کریں گے جب تک کہ محوری ہتھیار نہ ڈال دیں، روسی یہ شکایت کر سکتے تھے کہ اتحادی لیڈروں نے محوریوں کے ایک نمائندے سے گفتگو کی اور انھیں یہ نہیں بتایا گیا کہ اس نے کہا کیا تھا۔ اگست سنہ ۴۳ء میں اتحادیوں کی ایک اور بڑی کانفرنس کیوبک (Quebec) اور واشنگٹن (Washington) میں ہوئی۔ اس میں بھی روس کو شریک ہونے کی دعوت نہیں دی گئی، اور دعوت نہ دینے کا سبب اس وقت بتایا گیا جب اس پر کافی چہ میگوئیاں ہو چکی تھیں۔ اس مرتبہ روسیوں نے پہلے ہی کہہ دیا کہ وہ اس وجہ سے شریک نہیں ہو رہے ہیں کہ انھیں دعوت نہیں دی گئی ہے، اور کازابلانکا کانفرنس کے موقع پر جو عذر پیش کیا گیا تھا کہ مارشل سٹالن مصروف بہت ہیں، اس لئے انھیں زحمت دینا مناسب نہیں سمجھا گیا، وہ اس موقع پر کام نہیں دے سکتا تھا۔ روسی اپنی طرف کچھ بہت نیازمند نہیں تھے ۱۹ مارچ سنہ ۴۳ء کو روس میں امریکہ کے سفیر ایڈمرل سٹینڈلے (Standley) نے ایک تقریر میں کہا کہ

روس کی اپنی صنعتی کارگزاری کا بہت ذکر کرتے ہیں مگر انھیں جو مدد امریکہ سے ملتی ہے اس کی نہ تفصیل شائع کرتے ہیں نہ ظاہر میں اس کا احسان مانتے ہیں۔ اس تقریر کی اشاعت ہوتے ہی متحدہ ریاستوں کی وزارت خارجہ نے بیان دیا کہ ایڈمرل سٹینڈلے نے جو کچھ کہا وہ اپنی ذمہ داری پر کہا، انھوں نے وزارت خارجہ سے اس بارے میں مشورہ نہیں لیا تھا۔ روسیوں نے اپنی طرف اس سے انکار کیا کہ امریکہ کی مدد نظر انداز کی جاتی ہے، اور بات بنانے کے لئے کچھ اعداد و شمار بھی شائع کئے۔ اس واقعے سے خاصی بدمزگی پیدا ہوگئی، لیکن یہ صرف ایک علامت تھی اس بدظنی کی جو بتدریج پیدا ہورہی تھی۔ مارشل ستالن نے فروری میں فوج کو مخاطب کرتے ہوئے ایک بیان میں کہا "سفید (یعنی وسطی مغربی) روس میں، لتھوئینیا میں، لیتویہ، استھونیا، مولدادیہ میں، کریمیا میں، کریلیا میں جرمن حملہ آور اور ان کے شریک کار اب بھی حکمراں ہیں"۔ جس سے یہ مطلب نکالا جا سکتا تھا کہ روس لتھوئینیا، لیتویہ، اور استھونیا کی ریاستوں پر، جو جنگ سے پہلے آزاد اور خود مختار تھیں، اور ان کے علاوہ فن لینڈ اور پولینڈ کے مشرقی علاقوں پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ اسی بنا پر روس اور پولینڈ کی آزاد حکومت کے درمیان جو لندن میں قائم کی گئی ہے، خاصی مخالفت ہوگئی، اور بات اس قدر بڑھی کہ آخر اپریل میں روس نے سفارتی تعلق بند کر دیا۔ اتحادی اور خاص طور سے برطانوی مدبروں نے بیچ میں پڑ کر معاملہ کو رفع دفع کر دیا۔ برطانیہ سے ۲۶ مئی ۱۹۴۲ء کو جو معاہدہ ہوا اس میں تو روس نے وعدہ کیا تھا کہ لڑائی کے ذریعہ دوسرے ملکوں یا ان کے کسی حصے پر قبضہ نہ کرے گا، لیکن پولینڈ کی آزاد حکومت کی اس فرمائش کا کہ روس اعلان کر دے کہ اس کی اور پولینڈ کی سرحد وہی رہے گی جو ستمبر ۱۹۳۹ء سے پہلے تھی کوئی قطعی جواب نہیں دیا گیا۔ جولائی اور اگست ۱۹۴۳ء میں ایک پراسرار واقعہ یہ ہوا کہ روس نے متحدہ ریاستوں سے اپنے سفیر لتونوف اور برطانیہ سے مائسکی کو واپس بلا لیا اور ان بہت مشہور سیاست دانوں کی جگہ ایسے سفیر مقرر کئے جن کی سیاسی اور سفارتی دنیا میں خاص عزت نہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ برطانیہ اور متحدہ ریاستوں سے روس کے تعلقات ایسے نہیں ہیں کہ ان ملکوں میں ہوشیار

اور تجربہ کار سفیروں کو رکھنے کی ضرورت ہو۔ متحدہ ریاستوں کے اخبار لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ ان میں سے ایک نے یہاں تک کہہ دیا کہ روس نے ۱۹۳۹ء میں اپنے سیاسی رویّے کو بدلنے (یعنی جرمنی سے معاہدہ کرنے) کا ارادہ کیا تھا تب بھی موسیو لتوینوف کو، جو اس وقت متحدہ ریاستوں میں روسی سفیر تھے، واپس بلا لیا تھا۔ اخباروں کی باتیں تو ایسی ہی ہوا کرتی ہیں، ممکن ہے اسٹالن کا منشاء صرف یہ ظاہر کرنا ہو کہ وہ اتحادیوں کے طرزِ عمل کو پسند نہیں کرتے، اور اگر وہ غلط فہمیوں کو بڑھانا نہیں چاہتے تو انھیں روسی حکومت سے مشورہ کر کے طے کر لینا چاہیئے کہ جنگ کے بعد یورپ کی نئی تنظیم اور ریاستوں کی حدبندی کس طرح کی جائے گی۔ روس کے رویّے کا اتحادیوں پر یہ اثر ہوا کہ مسٹر چرچل نے کوبیک کانفرنس کے بعد اس کا اعلان کیا کہ روس، برطانیہ اور متحدہ ریاستوں کی ترکمی کانفرنس ہوگی، اور شروع اکتوبر تک کی اطلاعات سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ کانفرنس ہوگی اور ماسکو میں ہوگی۔ بحرِ روم کے مسائل پر غور کرنے کے لئے ایک کمیشن اسی زمانے میں مقرر ہو گیا۔ اور اس میں روس نے اپنے ایک نمائندے کو بھیجدیا۔

اتحادی اور روسی دونوں اس حد تک تو بالکل متفق ہیں کہ جرمنی کو شکست دینا اور وہاں کی نازی حکومت کو برطرف کر دینا چاہیئے۔ لیکن جرمنی کی شکست ایسی بھی ہو سکتی ہے کہ جس کی وجہ سے وہاں کا نظامِ حکومت ہی نہ بدلے، نظامِ معاشرت بدل جائے۔ پچھلی جنگِ عظیم کے بعد جرمنی میں جمہوری حکومت بڑی مشکل سے قائم ہوئی اور وقت کے ساتھ ہر دلعزیز ہونے کے بجائے قوم کی نظروں میں گرتی ہی رہی۔ آخر میں نازی اور کمیونسٹ پارٹیاں مقابلے پر آئیں، اور جرمنی کے سرمایہ داروں نے نازی پارٹی کی سرپرستی کر کے اسے برسرِ اقتدار کیا، اس ڈر سے کہ کمیونسٹ پارٹی اپنی حکومت قائم کرے گی۔ نازیوں نے کمیونسٹ پارٹی کا خاتمہ کر دیا، لیکن اب اگر انقلاب ہوا تو یہی پارٹی پھر ابھر کر جرمنی کی سیاست پر حاوی ہو جائے گی، اس لئے کہ نازی پارٹی اور متوسط طبقے کی آمریت کے ناکام اور برباد ہو جانے پر صرف مزدوروں اور کسانوں کا طبقہ رہ جاتا ہے جو حکومت کا دعویدار ہو سکتا ہے۔ اتحادی اصولاً تو یہ مانتے ہیں کہ ہر قوم کو اس کا حق ہے کہ جس طرح کی حکومت چاہے قائم کرے، لیکن جرمنی کی صنعت اتنی ترقی یافتہ اور جرمن قوم

کی صنعتی استعداد اتنی نمایاں ہو کہ اگر وہاں کی معاشی تنظیم کومیونسٹ طریقے پر کی گئی تو اس سے ان ملکوں کی
معاشی زندگی کو بہت صدمہ پہنچ سکتا ہے جو سرمایہ داری کے مسلک کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ جنگ کا ایک سبب
جرمنی کا یہ ارادہ تھا کہ یورپ پر تسلط حاصل کرے، لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ جرمنی جنگ کے ذریعے تسلط
حاصل کرنے کا حوصلہ ہی نہ کرتا اگر یورپ کی قوموں میں سرد مہری اور بے پروائی عام نہ ہوگئی ہوتی، اور
جنگ کے بعد کوئی اور اصول پیش نہ کیا گیا جس کی خاطر لوگ قربانی کرنے اور مصیبت اٹھانے پر تیار ہوں
تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر ملک میں کومیونسٹ تحریک اٹھے گی اور فروغ پائے گی۔ ۲۲ رمئی کو بین الاقوامی
کومیونسٹ کی مرکزی کمیٹی نے جس کا صدر مقام ماسکو تھا، اپنی خواہش سے اپنا خاتمہ کر دیا۔ اسی کے ساتھ
روس میں مذہبیت عام ہو رہی ہے، لوگ گرجاؤں میں جانے لگے ہیں اور انقلاب سے پہلے روس کا جو
کلیسائی نظام تھا وہ دوبارہ قائم کر دیا گیا ہے۔ ان دونوں باتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ روسی حکومت کو کومیونزم
کی تبلیغ سے اب کوئی سروکار نہیں، لیکن ان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کومیونزم، مذہب اور قومیت میں کوئی
بنیادی تضاد اور لازمی عداوت نہیں، اور ایسی قومیں بھی کومیونزم کے مسلک کو اختیار کر سکتی ہیں جو مذہب اور
قومیت کو چھوڑنا نہ چاہتی ہوں۔ یہ کایا پلٹ کومیونزم کو سرمایہ داری کے لئے اور زیادہ خطرناک بنا دیتی
ہے اور کوئی تعجب نہیں کہ اتحادی سیاست ایسی کارروائیوں اور فیصلوں سے بچنا چاہتی ہو جن کی بدولت
جنگ میں جلد کامیابی ہو لیکن اس کا بھی اندیشہ پیدا ہو جائے کہ جنگ کے بعد یورپ کی قومیں بے قابو ہو جائیں گی
جرمن قوم متحد رہنا چاہے تو اسے الگ خود مختار حصوں میں زبردستی تقسیم نہیں کیا جا سکتا، اتحادی اس پر مستقل
فوجی قبضہ نہیں رکھ سکتے، اور اس کی معاشی حالت جتنی خراب ہوئی اتنا ہی زیادہ امکان سیاسی انقلابوں کا
ہوگا۔ اتحادی کوئی ایسا فیصلہ کرنا نہیں چاہتے جس پر عمل کرنے میں روس شریک نہ ہو، اور روسی کومیونزم کو
اپنی مخصوص قومی مسلک قرار دیں اور یورپ میں ہر جگہ کومیونسٹ تحریک کو دبانے کی کوشش کریں تب بھی
جرمنی کے مقابلے میں ان کی کامیابی ایک ایسی مثال ہے جو اپنا اثر ضرور دکھائے گی، اور اس کا نتیجہ سرمایہ داری
نظام کے حق میں مفید نہیں ہو سکتا۔

متحدہ ریاستوں اور برطانیہ کے درمیان ایک گہرا تہذیبی اور سیاسی رشتہ ہے جو ہر نازک موقع

پر ان دونوں کو ایک دوسرے کی مدد پر آمادہ کر دیتا ہی۔ متحدہ ریاستوں کے شہری آزادی اور جمہوریت کے اصولوں کا بڑا احترام کرتے ہیں، اور پریزیڈنٹ روزویلٹ محوری سیاست کی شروع سے اس امید میں مخالفت کرتے رہے ہیں کہ ان کی قوم ان کا ساتھ ضرور دے گی۔ لیکن آزادی اور جمہوریت کا یہی احترام سیاست میں بڑی پیچیدگیاں پیدا کرتا رہتا ہی۔ برطانوی مدبروں کو یہ بات سمجھانے میں بہت دن لگے اور بہت وقت ہوئی کہ ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ دورانِ جنگ میں طے نہیں کیا جا سکتا، لیکن اب جو محوری پیش قدمی کا دور ختم ہو گیا ہی اور اتحادیوں کو یقین ہو گیا ہی کہ محوری کسی میدان میں اُن کا زیادہ عرصہ تک مقابلہ نہیں کر سکیں گے تو سیاسی مسائل کی طرف توجہ کی جا رہی ہی اور امریکہ میں پھر اس کا مطالبہ کیا جا رہا ہی کہ یورپ اور ایشیا میں جو جنگ ہو رہی ہی اس کے سیاسی مقاصد بالکل واضح کر دیئے جائیں۔ جنگ نہ ہو اور سیاسی اختلافات نہ ہوں تب بھی سرمایہ داری کا عام رواج صنعت اور تجارت کے میدان کو قوموں کا اکھاڑہ بنا دیتا ہی، اور اس لڑائی میں خرچ اتنا ہوا ہی اور صنعتی نظام کو جنگ کے کاموں سے الگ کر کے پرانے ڈھرے پر لگانے میں ایسی دشواریوں کا اندیشہ ہی کہ لوگ چاہتے ہیں کہ حکومتیں ابھی سے اپنے منصوبے اور ارادے صاف صاف بیان کر دیں۔ جنگ کے بعد برطانیہ پر قرض کا بہت بار تو نہ ہوگا، لیکن ادھار پٹے کے قانون نے امریکی تجارت کے لئے ایسی راہیں کھول دی ہیں کہ دنیا کی منڈیوں پر امریکہ والے چھائے رہیں گے اور تجارتی آزادی کا اصول برتا گیا تو دوسرے ملک نقصان میں رہیں گے۔ اگر تجارت پر پابندیاں لگائی گئیں تو امریکہ والے شکایت کریں گے کہ ان کی تجارت کو سیاسی ذریعوں سے روکنے کی کوشش کی جا رہی ہی، اور دنیا میں پھر وہی معاشی فرقہ بندی پیدا ہو جائے گی جو عالم گیر جنگ کی بلا لائی ہی۔ ان مسائل کو اس طرح حل کرنا کہ ہر فریق مطمئن ہو جائے قریب قریب ناممکن ہی، لیکن اگر اتحادی جنگ کے بعد دنیا کی تنظیم میں پورا اتحاد عمل قائم رکھ سکے تو کم از کم وہ انتشار تو نہ ہوگا جس نے پچھلی جنگ عظیم کے بعد برسوں تک دنیا کو بے چین رکھا۔

محمد مجیب

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

چین میں اشتمالیت

روس کے بعد جن ممالک میں اشتمالیت کو فروغ، استحکام اور ہمہ گیریت کا موقع ملا ان سب میں ممتاز چین ہی ہے۔ آج روس کے بعد اشتمالیت کا بڑا مرکز چین ہی کو سمجھا جاتا ہے۔ اشتمالی نظام نے جدید چین کی تعمیر میں حیرت انگیز مدد کی ہے، اگرچہ اس نظام کے فروغ پانے میں بڑی مشکلات پیدا کی گئیں مگر اس نظام کو مقبولیت حاصل ہو کر ہی رہی۔

مانچو خاندان کی مطلق العنان اور مستبد حکومت کا جب ۱۹۱۱ء میں خاتمہ ہو گیا اور چین میں پہلی مرتبہ جمہوریت نے جنم لیا، اس وقت عوام کی معاشی حالت انتہائی پست اور ابتر تھی۔ یوں بھی چین میں قحط، وبا اور دریاؤں کے ہمیشہ بدلتے ہوئے رخ کی وجہ سے ہزاروں اموات واقع ہوا کرتی ہیں، ان مصائب سے قطع نظر مرکزی حکومت کی بیچارگی، ممالک غیر کا بڑھتا ہوا اقتدار، اندرونی خانہ جنگیاں، غدار صدر جمہوریہ یان شی کائی کی استبدادیت اور جنگ عالمگیر ۱۸-۱۹۱۴ء نے عوام کو اس قدر مفلوک الحال اور مفلس بنا رکھا تھا کہ وہ تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق ان مشکلات کا فوری خاتمہ چاہتے تھے۔

ماحول کا یہی تقاضا تھا کہ ۱۹۱۷ء میں جبکہ ساری دنیا آگ و خون کی ہولی کھیل رہی تھی، روس میں ایک نئے نظام نے جنم لیا۔ زار کی حکومت ختم کر دی گئی اور لینن نے اشتمالی حکومت کی بنیاد رکھی اور فوراً ہی اعلان کیا کہ "اشتمالی روس بیرونی ممالک میں دخل نہ دے گا اور ان تمام علاقہ جات و مقبوضات کو واپس کر دیگا جو زار کے زمانہ حکومت میں فتح کر لئے گئے تھے۔"

چینی عوام کے لئے یہ انقلاب غور و فکر کا مرکز بنا۔ مغربی اقوام کے روابط سے چین میں سرمایہ داری نے جنم لیا تھا۔ سرمایہ داری کی اس ترقی سے ملک میں بورژوائی اور پرولتاری جماعتیں پیدا ہو چکی تھیں اور ان میں معاشی مسائل سے متعلق اختلافات کی خلیج دن بدن وسیع ہوتی جا رہی ہے۔ ان اختلافات کی موجودگی میں روس کے انقلاب نے چینی عوام کو غور و فکر کی دعوت دی کہ اس سرمایہ دارانہ نظام کی موجودگی میں چینی عوام کبھی آرام کا

سیانس نہ لے سکیں گے۔ اشتمالی انقلاب نے بورژوانی ارتقاء کی بنیادیں ہلادی ہیں اور چین کی ترقی بھی ایسے ہی نظام سے ممکن ہو سکے گی۔ چینی عوام کے اس ایقان سے یہ ظاہر ہو چکا کہ وہ پرولتاری انقلاب سے متاثر ہیں اور اشتمالیت کو اپنے درد کا علاج اور مشکلات کا حل سمجھتے ہیں۔ چنانچہ مفلوک الحال اور پسماندہ اقوام کی ایک بڑی جماعت نے اشتمالیت کو اپنا نصب العین قرار دے لیا۔

سنہ ۱۹۲۰ء کے آخری دنوں میں روس کا انقلاب مکمل کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہنچا۔ ان تمام حامیانِ زار کا خاتمہ کیا گیا جو پھر زاریت کو حیات بخشنا چاہتے تھے۔ اس کے فوراً ہی بعد منظم طریقے سے اشتمالیت کی تبلیغ کی جانے لگی۔ دوسرے ممالک کی طرح چین میں بھی اشتمالی مبلغ آئے اور ترقی پسند چینی عوام نے ان کی تعلیمات پر لبیک کہا۔ اس گروہ نے جو اشتمالیت کو قبول کر لیا تھا ستمبر سنہ ۱۹۲۰ء میں شنگھائی کے مقام پر ایک ممتاز روسی اشتمالی ولنسکی (Wilensky) کی رہنمائی میں اپنی ایک جماعت بنائی۔ اور کچھ ہی دنوں بعد کینٹن، پیکنگ، ہانکاؤ اور چنگشا وغیرہ میں اشتمالی جماعتوں کا قیام عمل میں آیا۔

اس دوران میں چین کی خانہ جنگیوں اور طوائف الملوکی نے غیر اقوام کو بھی مجبور کر دیا تھا کہ چین کی بیچارگیوں کو رفع کریں چونکہ کمزور مرکزی حکومت کی وجہ سے ایک انتشار پھیلا ہوا تھا جس کے باعث ہر ملک کی تجارت خطرے میں پڑ چکی تھی۔ اس مقصد کے لئے ۱۲ر نومبر سنہ ۱۹۲۲ء کو واشنگٹن میں ایک کانفرنس طلب کی گئی جس میں برطانیہ، فرانس، امریکہ، اطالیہ، بلجیم، ہالینڈ، پرتگال، جاپان اور چین کے نمائندے شریک تھے اس کانفرنس نے ایک معاہدہ مرتب کیا جس کا متن یہ تھا کہ چین کی آزادی اور کاملیت کو تسلیم کیا جائے اور تمام ممالک کو چین سے تجارت کے مساوی حقوق حاصل رہیں۔ یہ کوشش جو چین کی سیاسی اصلاح کے لئے روبعمل لائی گئی تھی دراصل اپنے مفاد کے استحکام کا ایک ذریعہ تھی۔ اس کوشش سے چینی عوام کو کوئی طمانیت حاصل نہ ہو سکی اور وہ اشتمالیت ہی کو اپنا حل سمجھنے لگے۔ انہی دنوں میں جان جیسے مشہور روسی اشتمالی چین میں موجود تھے۔ ڈاکٹر سن یات سین اس زمانے میں شنگھائی میں مقیم تھے اور یہ کوشش

کر رہے تھے کہ جس طرح بھی ممکن ہو بیرونی ممالک سے امداد حاصل کر کے ملک کی مرکز گریز طاقتوں کا خاتمہ کیا جائے اور مضبوط مرکزی حکومت کی بنیاد رکھی جائے۔ ڈاکٹر سن نے اس مقصد کے لئے قرضے حاصل کرنے چاہے اور اسی لئے برطانیہ و فرانس سے سلسلہ جنبانی کی مگر ان ممالک نے ڈاکٹر سن کو کوئی خاطر خواہ جواب نہ دیا۔ ڈاکٹر سن ان ممالک سے مایوس ہو کر روس کی طرف متوجہ ہوئے اور ۱۹۲۳ء میں چیانگ کائی شک کو روس بھجوایا تاکہ دونوں ممالک میں اتحاد کا معاہدہ ہو جائے اور روس سے امداد حاصل ہو سکے۔ روس بھی یہ چاہتا تھا کہ چین سے دوستانہ تعلقات قائم ہوں چنانچہ روس اس معاہدہ کے لئے راضی ہو گیا اور جاف کو ہدایت کی وہ چینی راہنما ڈاکٹر سن یات سین سے گفت و شنید کریں اور معاہدہ اتحاد مرتب کریں جاف اور ڈاکٹر سن نے اپنی گفتگو جاری رکھی اور ان دونوں میں ایک معاہدہ ہوا۔ ڈاکٹر سن نے کہا کہ "چین میں فوری اور قطعی طور پر اشتمالی نظام حکومت قائم نہیں کیا جا سکتا چونکہ موجودہ حالات کے تحت چین کا ماحول، اشتمالیت کو قبول کرنے سے قاصر ہے"۔ جاف نے بھی اس کو تسلیم کر لیا اور ہر طرح کی امداد و اعانت کا وعدہ کیا۔

اس معاہدے کے بعد ڈاکٹر سن جنوبی چین واپس آئے اور اشتمالی مدبروں کی مدد سے کومنتانگ کی اصلاح کے لئے ایک تعمیری نظام نامہ مرتب کیا اس نظام نامہ کی بنیاد بڑی حد تک اشتمالی مسلک کی حامل تھی۔ کومنتانگ میں ایک مجلس عاملہ بنائی گئی جس کی ہیئت ترکیبی روس کی مجلس عاملہ جیسی تھی۔ اس کے علاوہ جنوبی چین میں فوجی تربیت کے لئے ایک ادارہ بھی قائم کیا گیا جو روسی اشتمالی عہدہ داروں کے زیر انتظام تھا۔ ڈاکٹر سن نے یہ فوجی ادارہ اس لئے قائم کیا تھا کہ ایک تربیت یافتہ اور قوی فوج کی مدد سے مرکز گریز قوتوں کا خاتمہ کیا جائے۔ ڈاکٹر سن نے کومنتانگ کی تنظیم و اصلاح کے لئے بعض اور ممتاز اشتمالی بروڈین (Borodin) جنرل بلوکر (Bleucher) اور گیلن (Galen) کو دعوت دی۔ ان اشتمالیوں کی آمد سے کومنتانگ اور جنوبی چین کے عوام میں اشتمالی اثرات پھیلنے لگے۔ اس تنظیم کے بعد سن یات سین نے چین کی اشتمالی جماعتوں کو جو کہ چین کے مختلف صوبوں میں موجود تھیں جنوری ۱۹۲۴ء میں کومنتانگ سے ملحق کر دیا۔ یہ دونوں جماعتیں اب تک علیحدہ علیحدہ تصور کی جاتی

تھیں۔ ان کے اتفاق سے ایک وحدت پیدا ہوگئی اور سارے جنوبی چین میں اس جماعت کا تسلط ہوگیا۔
جنوبی چین کی ان کامیابیوں کو دیکھ کر شمالی چین کے بعض عہدہ دار اشتمالی روس سے تعلقات پیدا کرنا چاہا۔ چنانچہ ۳۱ مئی ۱۹۲۴ء کو شمالی چین کی حکومت اور اشتمالی روس میں ایک دوستی کا معاہدہ مرتب ہوا جس کی رو سے روس اور پیکنگ کی حکومتوں کے مابین جو قدیم معاہدے تھے وہ منسوخ کر دیئے گئے۔ اس کے علاوہ تمام مراعات، اجارے، باکسر کی بغاوت کا تاوان اور ارضی حقوق جو روس کو حاصل تھے انھیں ختم کر دیا گیا۔ بیرونی منگولیا کو چین کے حدود میں شریک کر لیا گیا اور ان دونوں ممالک میں سفیروں کے تقرر کو تسلیم کیا گیا۔ چنانچہ خاراخان پہلے روسی سفیر مقرر ہو کر چین آئے۔

۱۲ مارچ ۱۹۲۵ء کو ڈاکٹر سن کا انتقال ہوگیا اور چیانگ کائی شک کومنتانگ کے صدر بن گئے۔ کائی شک نے کومنتانگ اور روسی اشتمالیوں کی مدد سے چین کی خانہ جنگیوں کو ختم کیا اور وہ آرزو جو کہ چین کو متحد کرنے کی تھی بڑی مدت کے بعد پوری ہوئی۔ چیانگ کائی شک کی یہ کامیابیاں اشتمالیوں کی رہینِ منت تھیں۔ اشتمالی جماعت دن بدن وسیع اور قوی ہوتی جارہی تھی۔ اس جماعت کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو چیانگ کائی شک نے اپنے لئے مضرت رساں سمجھا۔ اسی لئے کومنتانگ میں دو جماعتیں پیدا ہوگئیں جو یمینی اور یساری کہلانے لگیں۔ یمینی جماعت میں قدامت پسندوں کی اکثریت تھی اور یساری جماعت ترقی پسندوں اور اشتمالیوں پر مشتمل تھی۔ یساری جماعت مرکزی حکومت اور کائی شک کی حکمتِ عملی پر تنقید کرنے لگی۔ چنانچہ اسی وجہ سے کائی شک اشتمالیوں کے مخالف ہوگئے اور مشہور روسی قائدین جنرل گیلن اور بروودن وغیرہ کو چین سے باہر نکال دیا نیز ۱۰ دسمبر ۱۹۲۷ء کو روس سے بھی اپنے تعلقات منقطع کر لئے اور نانکنگ میں اپنی ایک علیحدہ آزاد قومی حکومت قائم کی جس میں کسی اشتمالی کو شریک نہیں کیا گیا۔ قومی حکومت کے قیام کے بعد کائی شک نے مستقل طور پر اشتمالیوں کا پیچھا شروع کیا کومنتانگ سے تمام اشتمالی ارکین نکال دیئے گئے اور ملک میں اشتمالی تحریک کو ممنوع قرار دیا۔ کائی شک کی اس حکمتِ عملی سو جاپان

بہت خوش تھا چونکہ اس سے چین میں اشتمالیت کے فروغ کے امکانات ختم ہو رہے تھے۔

ان تمام مخالفتوں اور پابندیوں کا چینی اشتمالیوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ جب وہ ہانکاؤ سے نکال دیئے گئے تو یہ تمام چاؤ۔ این لائی کی رہبری میں نانچنگ میں پناہ گزیں ہوئے۔ یہاں پر چاؤ این لائی نے سُرخ فوج کی بنیاد رکھی۔ کائی شک نے اشتمالیوں کو نانچنگ سے بھی نکال دیا۔ اشتمالی یہاں سے نکالے جانے پر کینٹن میں پناہ گزیں ہوئے۔ لیکن یہاں بھی انھیں سکون نصیب نہ ہوا۔ چاؤ این لائی اور چو تھے دونوں مل کر صوبہ کیانگسی اور فوکین میں چین کی پہلی اشتمالی جمہوری حکومت قائم کی۔

جب چینی اشتمالی صوبہ کیانگسی میں پناہ گزیں ہوئے تو چیانگ کائی شک نے عارضی طور پر ایک قلیل عرصے کے لئے ان کا تعاقب ملتوی کر دیا۔ چونکہ انھیں شمال کے سرکش اور باغی عہدہ داروں کو مطیع کرنا ضروری تھا۔ اس مختصر سے وقفے میں اشتمالیوں نے اپنے کو منظم کرنا شروع کیا اور اپنی طاقت بڑھانے میں مصروف رہے۔ چینی عوام بالخصوص مزدور، کسان، سپاہی اور طالب علم کثیر تعداد میں سرخ فوج میں شریک ہونے لگے۔ جولائی ۱۹۲۸ء میں ماسکو میں چھٹی کمیونسٹ انٹرنیشنل کانگریس منعقد ہوئی۔ اس موقعے پر چینی اشتمالیوں نے بھی اپنی ایک کانفرنس منعقد کی جس کو کمیونسٹ انٹرنیشنل کی تائید حاصل تھی۔ چینی سُرخ فوج اور چینی اشتمالیوں کی یہ کامیابیاں دیکھ کر حکومت روس نے اپنے مشیر اور فوجی ماہرین کو ان کی امداد کے لئے روانہ کیا تاکہ تمام منتشر اشتمالی ایک محاذ پر جمع ہو جائیں اور چیانگ کائی شک کا مقابلہ کریں۔

شمال کے فوجی عہدہ داروں کو شکست دینے میں چیانگ کائی شک کو انتہائی دشواریاں پیش آ رہی تھیں۔ چنانچہ ان کے مقابلہ کے لئے کائی شک نے مرکزی اور جنوبی چین کی متعینہ افواج کو شمال میں روانہ کیا۔ اشتمالیوں کے لئے یہ ایک زرین موقعہ تھا جس کو غنیمت جان کر انھوں نے کیانگسی کے ایک بڑے رقبہ پر قبضہ کر لیا۔ ۱۷ نومبر ۱۹۳۱ء کو جبکہ اسی دن روس میں انقلاب کی سال گرہ منائی جا رہی تھی چینی اشتمالی صوبہ کیانگسی میں جمع ہوئے اور اشتمالی جمہوری چین کی ایک عارضی حکومت کے قیام

کا اعلان کیا۔ چین کی سُرخ فوج اس قلیل عرصے میں تین ہزار سے ایک لاکھ بارہ ہزار کی تعداد تک پہنچ گئی تھی۔

چیانگ کائی شک نے اشتمالیوں کی طاقت کو ختم کرنے کے لئے ان کے خلاف اپنی افواج روانہ کیں۔ چار مرتبہ سُرخ فوج اور حکومتی فوج میں تصادم ہوا مگر ہر بار کائی شک کو ناکامی ہوئی۔ ان ناکامیوں سے پریشان ہوکر، چیانگ کائی شک نے اکتوبر ۱۹۳۳ء میں اشتمالیوں کے خلاف اپنا طاقتور اقدام شروع کیا۔ یہ مقابلہ ایک سال تک جاری رہا۔ کائی شک کا ان متواتر حملوں سے بیحد جانی و مالی نقصان ہوچکا تھا۔ اس کے علاوہ گذشتہ مسلسل مقابلوں کی وجہ سے اشتمالیوں کی طاقت میں بڑی حد تک کمی ہوگئی تھی۔ اپنی ان کمزوریوں کو دیکھ کر اشتمالیوں نے کیانگسی سے کسی دوسرے مقام پر چلے جانے کا تصفیہ کیا۔ اس واقعہ کو چینی سُرخ فوج کی حیرت انگیز "طویل مسافت" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ سُرخ فوج کی یہ طویل مسافت ۱۶ اکتوبر ۱۹۳۴ء میں شروع ہوئی جو چیانگ کائی شک کی افواج کے مقابلہ سے محفوظ رہنے کے لئے شروع ہوئی تھی۔ یہ طویل مسافت تقریباً چھ ہزار میل طولانی تھی۔ اس دوران میں سُرخ فوج تقریباً بارہ صوبوں سے گذری اور جب طویل مسافت ختم ہوئی تو یہ اندازہ کیا گیا کہ سُرخ فوج کے نصف سپاہیوں کا نقصان ہوا ہے۔ حکومت نے یہ ظاہر کیا کہ سُرخ افواج اور حکومتی افواج میں بارہ بڑی جنگیں اور تین سو جھڑپیں ہوئیں۔ سُرخ فوج دو سو اڑسٹھ (۲۶۸) دن پیدل چلتی رہی۔ اور صرف ایک سو دن آرام کیا، اٹھارہ پہاڑ اور کئی دریاؤں کو عبور کیا۔ ان تمام دشواریوں کے باوجود سُرخ فوج کو شکست نہیں ہوئی اور یہ فوج ینان پہنچ کر اپنی اشتمالی جمہوری حکومت قائم کی۔

جب کائی شک نے پیکنگ فتح کیا تو منچوریا کے فوجی عہدہ دار چیانگ سولن کو وہاں سے نکال باہر کیا۔ چیانگ سولن اس وقت نہ صرف منچوریا کا حاکم تھا بلکہ شمالی چین کا مالک بھی تھا۔ پیکنگ کے سقوط کے بعد وہ منچوریا جا رہا تھا کہ راستے میں ریل کے ایک حادثے سے اس کی موت واقع ہوئی۔ چیانگ سولن کے انتقال پر اس کا لڑکا چیانگ سولیانگ جسے "ینگ مارشل" بھی کہا جاتا ہے منچوریا

اور جیہول کا حاکم بن بیٹھا۔ کائی شک نے اس کی حکومت کو تسلیم کرلیا مگر کچھ ہی دنوں بعد ۱۹۲۱ء میں مانچوریا
پر جاپان کا قبضہ ہو گیا جس کی وجہ سے ینگ مارشل کو مانچوریا سے بھاگنا پڑا۔ ینگ مارشل چین آکر کائی شک
کے اقتدار کو تسلیم کرلیا۔ ینگ مارشل کی طاقت اور ان کی افواج سے کائی شک کو یہ خوف تھا کہ یہ کہیں
بغاوت نہ کر بیٹھیں۔ چنانچہ جب سُرخ فوج ینان پہنچی تو کائی شک نے ینگ مارشل کو سُرخ فوج سے
مقابلہ کا حکم دیا تاکہ ینگ مارشل کی قوت ضائع ہو اور سُرخ فوج کا بھی استیصال ہو سکے۔ اس معرکہ
میں ینگ مارشل کو متعدد شکستیں ہوئیں اور ان کے سپاہی ان مقابلوں سے بیزار ہو کر سُرخ فوج
کی اشتمالی تعلیمات سے متاثر ہونے لگے۔ خود ینگ مارشل بھی اشتمالی اصول کو تسلیم کرنے
لگے تھے۔ ان کی اس دلچسپی کو دیکھ کر مشہور اشتمالی جنرل چاؤ این لائی نے اپنا پروگرام اور
نصب العین انھیں سمجھایا اور ینگ مارشل نے اشتمالیت کو قبول کرتے ہوئے سُرخ فوج میں معہ اپنی
افواج کے شرکت کرلی۔ جب چیانگ کائی شک کو ینگ مارشل کی اس تبدیلی کا حال معلوم ہوا تو وہ پریشان
ہو کر اس اتحاد سے پیدا شدہ خطرے کو رفع کرنے کے لئے فوراً بذریعہ ہوائی جہاز مقام سیان پر آئے ینگ مارشل
نے کائی شک سے متحدہ محاذ کے قیام اور اشتمالیوں سے مفاہمت کے لئے زور دیا لیکن کائی
شک نے ان مطالبات پر غور کرنے سے انکار کردیا اور دونوں میں ناخوشگوار تعلقات پیدا ہونے لگے
اور ۱۲ دسمبر ۱۹۳۶ء کو سُرخ فوج کے بعض افراد نے چیانگ کائی شک کو گرفتار کرلیا اور ان کے سامنے اپنے آٹھ مطالبات پیش
کئے جس کا اختصار یہ ہے کہ "جاپان کے بڑھتے ہوئے خطرات کی فوری روک تھام کے لئے متحدہ محاذ قائم
کیا جائے اور اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ ملک کی تمام جماعتیں آپس میں متحد ہو جائیں" چیانگ کائی شک
ان مطالبات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھے مگر مادام چیانگ کائی شک نے بڑی فراست سے
کام لے کر ان مطالبات کو منظور کروایا اور مفاہمت ہو گئی۔ ۲۵ دسمبر کو مارشل چیانگ کائی شک رہا
کردئے گئے۔ ان مطالبات کا تسلیم کیا جانا سُرخ فوج کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ طویل مسافت کے
دوران میں سُرخ فوج کو جن ایثار اور قربانیوں سے کام لینا پڑا انھیں اس کا معاوضہ مل گیا کہ ان
کے ایثار نے اشتمالی تحریک کو فنا ہونے سے نہ صرف بچائے رکھا بلکہ ترقی کے اور مواقع فراہم
کئے ان تمام کامیابیوں کا سہرا مشہور اشتمالی راہنما ماؤزی تونگ، چاؤ این لائی اور چو تھے کے

سرہوگئے جنھوں نے آلاتِ حرب کی کمی اور دیگر دشواریوں کے باوجود چیانگ کائی شک کی کثیر افواج کے مقابلے میں فتوحات حاصل کیں۔

سُرخ فوج اور چیانگ کائی شک کی مفاہمت سے تاریخ چین میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ملک میں جو اختلافات اور خانہ جنگیاں تھیں وہ یک لخت ختم ہوگئیں چیانگ کائی شک نے ۲۶ جنوری ۱۹۳۶ء کو تمام مخالف اشتمالی احکام منسوخ کر دئے ۲۲ جنوری ۱۹۳۷ء کو کائی شک نے تمام اشتمالی مطالبات کو تسلیم کرلیا ۱۵ مارچ کو چینی اشتمالی جماعت، چینی اشتمالی حکومت اور سُرخ فوج کی جانب سے یہ اعلان شائع ہوا کہ وہ حکومت چین سے متفق ہوگئے ہیں اس اتحاد پر کومنتانگ کے پرچم پر طلوع ہوتا ہوا سورج، اور چینی اشتمالیوں کے پرچم پر جو سُرخ ستارے کا نشان تھا ان دونوں نشانات کو ایک نئے پرچم میں شریک کیا گیا۔ چیانگ کائی شک نے چینی اشتمالیوں سے مفاہمت کے بعد اشتمالی روس سے بگڑے ہوئے تعلقات کو خوشگوار بنانے کی سعی کی اور ۲۱ اگست ۱۹۳۷ء میں ان دونوں ممالک میں اتحاد کا معاہدہ ہوا۔

اشتمالیوں نے چین کی تعمیر میں حیرت انگیز قربانیوں اور ایثار کو برداشت کیا ہے اور اسی ایثار کا یہ نتیجہ ہے کہ آج سارا چین متحد ہو کر فاشسٹ طاقت کے خلاف بڑی پامردی سے مقابلہ کر رہا ہے آج اشتمالیوں کو چین میں ممتاز مقام حاصل ہے وہ اپنے وطن کی مدافعت میں ہمہ تن منہمک ہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ ایک نئے حیات بخش نظامِ زندگی کی تعمیر میں بھی مصروف ہیں۔

میر عابد علیخاں بی۔ اے

جذباتی

افراد

بغرا خاں۔ بلبن کا لڑکا، کیقباد کا باپ، بنگال کا صوبہ دار

کیقباد۔ بغرا خاں کا لڑکا، شہنشاہ دہلی

صلابت یار۔ بغرا خاں کا فوجی سپہ سالار

قیام الدین۔ بغرا خاں کا دیوان۔

نظام الدین۔ فخر الدین کا داماد، کیقباد کا سب سے بڑا معتمد۔

ملک فخر الدین۔ ملک الامراء، کوتوال، بلبن کا درباری، نوّے برس کا بوڑھا۔

لُولی۔ ایک ماہر حاضر جواب رقاصہ جو کیقباد کی محبوبہ ہے۔

خواتین، درباری، امراء، ملازمین و عمال۔

پہلا سین

(سرِ ندی کے کنارے بغرا خاں ٹہل رہا ہے۔ چہرے سے وحشت اور اضطراب کے علامات نمایاں ہیں۔ صلابت یار داخل ہوتا ہے)

بغرا خاں:۔ کیا ہے صلابت؟"

صلابت یار:۔ ظل اللہ! غنیم پر بہ آسانی کمین گاہ سے حملہ ہو سکتا ہے۔ آپ کی اجازت کی دیر ہے، ابھی پانسہ پلٹ سکتا ہے"

بغرا خاں:۔ کیسی باتیں کر رہے ہو صلابت، کیا انھیں ہاتھوں سے، جن سے میں نے کیقباد کو بارہا گود میں

لیا ہے، اس کے خلاف تلوار کھینچوں ؟"

صلابت یار: "مگر ظل سبحانی، انھوں نے کب اس کا خیال کیا۔ سرکار عالی کے مہر پدری سے فائدہ اٹھاکر وہ سلطان دہلی بن بیٹھے، غفران مآب سلطان کے تمام قوانین بدل دئے، امرا کو برگشتہ و بدحال کردیا تن آسانی و عیش رانی میں یہ بھی بھول گئے کہ تخت و تاج کا صحیح وارث بنگال میں موجود ہے۔"

بغرا خاں: "مگر صلابت 'از خورداں خطا و از بزرگاں عطا'۔"

صلابت یار: "صحیح ہے ظل اللہ مگر وہیں تک جہاں تک کہ بندگان خدا کی، جو صحیح طور پر فرزندان خسروی ہیں، جان و عزت پر نہ بن آئے۔"

بغرا خاں: "تو آیا تو ہوں اسی لئے کہ اس یوسف گم کردہ کا ہدایاں کو سمجھاؤں۔"

صلابت یار: "صحیح ہے حضور، مگر انھوں نے کس طرح خوش آمدید کہا ایک لشکر جرار سے! معلوم ہوتا کہ سرکاران کے آقا اور اب محترم نہیں بلکہ کوئی سرکش صوبہ دار بنگال ہیں ——— میں اسی لئے تو کہتا ہوں کہ اس وقت موقع گوشمالی کا ہے۔ حضور اجازت دیں، میں شب کی تاریکی میں فوج دریا پار اتار دوں اور کل انھیں پا بہ جولاں سامنے حاضر کردوں ....!"

بغرا خاں: "نہیں، میں نے خود اپنے ہاتھ سے اسے خط لکھ کر بھیجا ہے جواب کا انتظار ضروری ہے (قیام الدین آتا دکھائی دیتا ہے) "لو جواب آ ہی گیا۔ دیکھوں اس نے کیا لکھا ہے؟" (قیام الدین سلام کرتا ہے اور خط پیش کرتا ہے۔ بغرا خاں خط پڑھ کر خاموش ہو جاتا ہے)

صلابت یار: "کیا بندگان عالی بھی سُن سکتے ہیں اس جواب کو؟"

بغرا خاں: "لکھا ہے دربار عام میں حاضر ہو اور اسی طرح حاضر ہو جس طرح ایک صوبہ دار اپنے شہنشاہ کے سامنے حاضر ہوتا ہے!"

صلابت یار: "میں تو کہتا ہی تھا حضور کہ تادیب ضروری ہے۔"

قیام الدین: "مگر ایک معمولی سی بات کے لئے ہزاروں بندگانِ خدا کا ہلاک کرنا قرینِ مصلحت نہیں۔"

صلابت یار: کیا یہ مقتضائے شرافت و عزت ہے کہ وہ اپنی بساط سے باہر باتیں کریں اور ہم اسی طرح خاموش دیکھا کریں، درانحالیکہ ہمارے ہاتھوں میں، تلواریں ہیں چوڑیاں نہیں ہیں"

بغرا خاں: "لیکن صلابت، کیقباد کے معاملے میں میرے ہاتھ میں تلوار محض صنوعی ہے: میں اس سے اسے ڈرا دھمکا سکتا ہوں مگر استعمال نہیں کر سکتا"

قیام الدین. اور بندگان عالی کی بھی یہی رائے ہے"

بغرا خاں: ہاں مناسب یہی ہے کہ میں اس کی ہٹ پوری کر دوں"

صلابت یار: "یعنی؟"

بغرا خاں: میں اس کے دربار میں ایک صوبہ دار کی حیثیت سے جاؤں گا"

صلابت یار: تو حضور غلام کی تلوار حاضر ہے" (اپنی تلوار گھٹنے ٹیک کر دونوں ہاتھوں پر رکھ کر پیش کرتا ہے)

بغرا خاں۔ یہ کیوں صلابت؟"

صلابت یار: اس لئے حضور کہ یا تو اسے توڑ کر پھینک دیں یا پھر اس سے خادم کا سر اڑا دیں"

بغرا خاں: آخر کیوں؟"

صلابت یار: اس لئے حضور کہ اگر خدانخواستہ اعیان سلطنت کی نیتوں میں فتور آیا تو پھر یہ تلوار کوئی کام نہ کر سکے گی اور اس کا باقی رہنا ہی بیکار ہے"

بغرا خاں: صلابت تم سپاہی ہو، جاں نثار ہو، وفادار ہو، لیکن کیقباد کے باپ نہیں ہو، تم کیا جانو کہ محض اس خیال سے کہ میں اتنے دنوں کے بعد اسے اپنی آنکھوں سے دیکھوں گا میرے دل کی کیا کیفیت ہو جاتی ہے"

صلابت یار: "مگر ظل اللہ.........!"

بغرا خاں: مجھے ظل اللہ نہ کہو، ظل اللہ وہی ہے جسے خدا نے دلی کا تخت دیا، میں اس کا ایک ادنیٰ صوبہ دار ہوں!"

صلابت یار: لیکن..........!

بغرا خاں: لیکن ویکن کچھ بھی نہیں۔ ذرا اس کی آن تو دیکھو، باپ سے کہتا ہی دربار میں درباری کی طرح آئیے۔ ایسی باتوں سے تخت و تاج کی وقعت بڑھتی ہی!" (صلابت خاموش ہو کر سر جھکا لیتا ہی، بغرا خاں آگے بڑھ کر اس کے جھکے ہوئے سر پر ہاتھ رکھ دیتا ہی۔ پھر سمجھانے اور روٹھے کو منانے والے لہجے میں کہتا ہی) "آؤ دریا چلیں! لڑکے کے تیور اچھے ہیں!"

دوسرا سین

(دربار خاص ہی، کیقباد مرغ زریں بنا ایک زرنگار تخت پر بیٹھا ہی۔ مخصوص اراکین قرینہ سے باادب بیٹھے ہیں۔ سامنے نُوّلی ناچ رہی ہی۔ نظام الدین اسے آنکھ سے اشارہ کرتا ہی وہ نلچتے نلچتے ایک بار بادشاہ کی طرف مخاطب ہو جاتی ہی)

نُولی۔ (صراحی سے شراب انڈیلتی ہی اور بادشاہ کی طرف بڑھاتی ہی) "کافر عشق بود گر نہ بود بادہ پرست"

بادشاہ۔ (جام لیتے ہوئے) "شب زمے توبہ کنم از بیم نازِ شاہداں — بامداداں روئے ساقی باز در کار آورد"

نُولی: "غمزۂ زاہد فریبم عابد صد سالہ را — موئے پیشانی گرفتہ پیش خمار آورد"

نظام الدین: "سبحان اللہ کیا حاضر جوابی ہی"

بادشاہ: "اگر ساقی تو خواہی بود ما را — کہ می گوید کہ مے خوردن حرام است؟"

نُولی: "ما گرچہ کہ خوب تر زمانیم — ہم بندۂ بندگانِ شاہیم"

بادشاہ: "تمھارے گلنار چہرے پر ہزاروں ماہتاب صدقے!"

نُولی۔ "ظل اللہ ذرّے کو آفتاب بنا رہے ہیں"

نظام الدین: "یہاں تو ساری روشنی تمھارے ہی دم کی ہی"

بادشاہ: "سچ کہا نظام" (انتہائی سرور میں) "ہم سب اسی آفتاب کے گرد گھوم کر کسب ضیا کرتے ہیں"

دکھڑا ہو کر ولی کے گرد ناچنے لگتا ہی۔ اور بار بار یہ شعر پڑھتا ہی۔

فغاں کیں اولیان شوخ وشیریں کار وشہر آشوب

چناں بردند صبر از دل کہ ترکاں خوان یغما را

مصاحبین تالیاں پیٹ پیٹ کر تال دیتے ہیں۔ ٹولی بھی ناچتی رہتی ہی ٹھیک اسی وقت حاجب آواز دیتا ہی)

حاجب:۔ ظل سبحانی، ملک الامرا فخرالدین اور حشمت جنگ قیام الدین اجازت باریابی چاہتے ہیں"

بادشاہ۔ (آہستہ سے) "یہ کہاں دونوں بے موقع آمرے ــــــــــ" (خود تخت پر بیٹھ جاتا ہی، صراحی و جام، ارباب نشاط لیے دوسرے کمرے میں چلے جاتے ہیں) بلاؤ انھیں"

(حاجب جاتا ہی، درباری پھر سلیقے سے بیٹھ جاتے ہیں۔ نظام الدین بادشاہ کی پشت پر کھڑا ہوجاتا ہی۔ فخرالدین و قیام الدین داخل ہوتے ہیں۔ تین سلام کرتے ہیں)

فخرالدین:۔ آفتاب دولت وحشمت تاباں و منور باد!"

بادشاہ۔ "کیسے آنا ہوا ملک الامرا؟"

فخرالدین:۔ جہاں پناہ حشمت جنگ بہادر صوبہ دار بغرا خاں کے پاس سے پیام لائے ہیں"

بادشاہ۔ ہم اسے سننے کے لئے بیتاب ہیں"

قیام الدین:۔ ظل اللہ وہ کل جہاں پناہ کی زیارت و قدمبوسی کے لئے دربار عام میں حاضری کی اجازت طلب فرماتے ہیں"

بادشاہ:۔ اجازت ہی ــــــــ"

قیام الدین سلام کرکے پیچھے ہٹتا ہی، دفعتہً نظام الدین بادشاہ کے کان میں کچھ کہتا ہی۔ بادشاہ ہاتھ کے اشارے سے قیام الدین کو روکتا ہی) "ٹھہرو! صوبہ دار بنگال تک یہ ہمارا پیغام پہنچا دینا کہ صرف منتخب مصاحبین کو ان کے ساتھ باریابی کی اجازت دی جا سکتی ہی۔ ان کا لشکر وہیں دریا کے کنارے مقیم رہیگا، جہاں اس وقت ٹھہرا ہی"

قیام الدین: "بہت خوب ظل اللہ"

بادشاہ: "اور سنو ابا جان .... صوبہ دار بنگال بغرا خاں سے کہدینا کہ جس طرح ہم اس موقع پر نجی اور ذاتی رشتے کا خیال کر کے ان کے ساتھ خاص مراعات نہیں برت سکتے اسی طرح انھیں بھی یہ نہ فروگذاشت کرنا چاہیئے کہ وہ اپنے آقا و ولی نعمت شہنشاہ دہلی کی خدمت میں حاضر ہو رہی ہیں۔"

قیام الدین: ظل اللہ کا ارشاد میں حرف حرف ان تک پہنچا دوں گا۔"

"بادشاہ: ہاں انھیں ان تمام رسوم و قوانین کی پابندی کرنی پڑے گی جو ایک صوبہ دار پر اس سلطنت میں ہمارے حضور میں باریابی کے وقت لازم ہی۔"

قیام الدین: "بہت خوب جہاں پناہ!" (وہ سلام کر کے باہر جانے لگتا ہی۔ فخرالدین پھر دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتا ہی)

فخرالدین۔ جاہ و حشمت سلطان کیقباد پاینده باد!" (اور سلام کر کے قیام الدین کے ساتھ چلا جاتا ہی۔ ان کے جاتے ہی بادشاہ تالی بجاتا ہی۔ حاجب حاضر ہوتا ہی)

بادشاہ: "بلاؤ ساقی و مطرب کو، لاؤ صراحی و جام!"

تیسرا سین

(دربار عام ہی۔ کیقباد سر پر تاج رکھے تخت شاہی پر متمکن ہی، دو رویہ مسندوں پر امرا، خوانین و اکابر سلطنت اپنے مرتبے اور منصب کے لحاظ سے بیٹھے ہیں)

حاجب۔ شہزادۂ عالی وقار ناصرالدین بغرا خاں صوبہ دار بنگال اجازت داخلہ طلب فرماتے ہیں۔

(بادشاہ اشارہ کرتا ہی۔ بغرا خاں داخل ہوتا ہی۔ اور ایک نگاہ غلط انداز مجمع پر ڈالتا ہوا

پہلا معزرہ سلام کرتا ہے۔ پھر آگے بڑھتا ہے، دوسری بار سلام کرتا ہے، اب کے بادشاہ پر نظر کرتا ہے۔ بادشاہ گھبرا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ بغرا اور آگے بڑھتا ہے اور تیسرا سلام کرتا ہے۔ کیقباد تخت سے اتر کر بے ساختہ دوڑتا ہے۔ بغرا کے قدم پر سر رکھ دیتا ہے)

بغرا خاں:" ہیں ہیں، کے، تم بادشاہ ہو، میں ادنیٰ صوبہ دار!"

کیقباد۔ (روتے ہوئے) نہیں نہیں، تخت و تاج آپ کا ہے، میں خود بھی آپ کا ہوں!"

(بغرا خاں اسے سینے سے لگا کر پیشانی کا بوسہ لیتا ہے)

بغرا خاں:" یہ تمہاری سعادت مندی ہے......"

کیقباد۔ (ہاتھ جوڑ کر تخت کی طرف اشارہ کرتا ہے)" اب حضور ادھر تشریف لے چلیں" (دونوں تخت کی طرف جاتے ہیں۔ کیقباد بغرا خاں کے تخت پر بیٹھنے کے لئے اصرار کرتا ہے) اباجان اس پر متمکن ہوں۔"

بغرا خاں: نہیں نہیں بیٹے، یہ تمہاری جگہ ہے۔"

کیقباد:" میں نہ مانوں گا۔"

بغرا خاں:" اچھا لو، تمہاری خاطر سے چند لمحوں کے لئے بیٹھا جاتا ہوں۔"

(کیقباد سر سے تاج اتار کر بغرا خاں کے سر پر رکھنا چاہتا ہے۔ وہ ہاتھ سے روکتا ہے۔ کیقباد جھپٹ اسے اس کے قدموں میں ڈال دیتا ہے)

کیقباد:" یہ تاج ان قدموں پر نثار۔"

(بغرا خاں اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے، تاج تخت پر رکھ دیتا ہے۔ درباریوں سے مخاطب ہوتا ہے۔)

بغرا خاں:" امرا سلطنت، خوانین، مشائخ، ارکان حکومت، جملہ حاضرین دربار۔ میں جانتا ہوں کہ آپ حضرات کو میرے اس فرزند کیقباد سے طرح طرح کی شکایتیں ہیں۔ میں خود بھی یہ سن کر بنگال سے مصیبتیں برداشت کرتا چلا آرہا ہوں، لیکن اس وقت کی باتوں نے مجھے اس امر کا یقین دلا دیا ہے کہ واقعی آپ کے شہنشاہ میں امارت و حکومت کی ساری صلاحیتیں

موجود ہیں اور اگر آپ نے حق نمک ادا کیا اور اس کے دست و بازو بن کر کام کیا تو وہ دوسرا ناصر الدین بلبن ہوگا!"

سارے درباری: یقینی، بلاشبہ!"

بغرا خاں: "میں اس لئے اس مملکت کی حکومت کے حق سے دست بردار ہوتا ہوں اور یہ تاج شاہی اپنے ہاتھوں سے ان کے سر پر رکھتا ہوں" (کیقباد کے سر پر تاج رکھ کر اسے تخت پر بٹھا دیتا ہے) زندہ باد شہنشاہ کیقباد!"

(امراء و درباری کھڑے ہو کر اس نعرے کو جوش سے دہراتے ہیں۔ کیقباد کھڑا ہو کر سب کو بیٹھ جانے کا اشارہ کرتا ہے سوائے بغرا خاں کے سب بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھتا ہے۔ پھر بڑی متانت سے کہتا ہے)

کیقباد: "میں سب سے پہلے اس خالق یکتا اور سلطان ارض و سما کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے مجھے ایسے منبع جود و عطا، معدن فیض و سخا، صاحب فضل و کرم، ہما صفت، ذات اقدس کی صلب میں پیدا کیا جس کے سایہ عاطفت میں ان کے اطفال و اولاد خاقانی و فغفوری کرتے ہیں اور کوس لمن الملک بجاتے ہیں۔ پھر آپ سب خوانین و رؤساء و امراء، مفتیان و مشائخ کو اس کا یقین دلاتا ہوں کہ میں آئین بلبنی پر گامزن ہوں گا۔ اور عدل گستری و رعایا پروری اپنا شیوہ بناؤں گا! میں نے اس خوشی میں کہ مجھے آج اپنے والد بزرگ اور تخت کے صحیح حقدار کی زیارت و قدمبوسی کا موقع ملا۔ تمام مجرموں اور معتوبوں کی خطائیں و سزائیں معاف کیں اور ایک لاکھ تنکہ منظور کیا کہ وہ اہل حاجت و مفلسین میں تقسیم کر دیا جائے!"

نظام الدین: "زندہ باد شہنشاہ کیقباد! زندہ باد شہنشاہ معدلت!"

(اہل دربار نعرہ دہراتے ہیں۔ کیقباد پھر ہاتھ سے اشارہ کرتا ہے، شور رک جاتا ہے)

کیقباد: "مجھے اس کا موقع دیجئے کہ میں والد محترم کے روئے زیبا کی جی بھر کر زیارت کروں۔ اس لئے حضار بر خواست!"

(مجمع اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے، کیقباد و لغرا خاں دروازے سے باہر نکل جاتے ہیں)

قیام الدین: "آداب شاہی اور ایشیائی تہذیب دونوں کو خوب نبا ہا۔ اس لڑکے میں سنبھل جانے کی ساری صلاحیتیں موجود ہیں۔"

فخر الدین۔ (سر ہلا کر) "کچھ نہیں، باپ بیٹے دونوں جذباتی ہیں۔ گھڑی میں فولاد، گھڑی میں موم۔"

(پردہ)

علی عباس حسینی

یہ ڈرامہ علی عباس حسینی صاحب کی نئی کتاب "نورتن یا ایک ایکٹ کے ڈرامے" سے ماخوذ ہے جو مکتبے سے شائع ہو رہی ہے۔ قیمت عمر ہے۔ (جامعہ)

"مجذوبِ فرنگی"

جس مجذوب کا اس صحبت میں تذکرہ ہے، وہ ایک کافر تھا جس کے قلب کی تخلیق کسی مومن کے خون گرم سے ہوئی تھی مگر جسے مومن کا صبر و ضبط میسر نہ ہوا تھا جس کی نظر وسیع تھی اور عمیق تھی مگر جس پر سوزِ عشق کے دروازے بند تھے۔ جس کی فکرِ رسا تو اپنی معراج کو پہنچ گئی تھی لیکن جو محروم ذکر تھا، جو "مقامِ عقل" سے تو پلک جھپکاتے گذر گیا تھا، مگر جسے "مقامِ عشق" سے گذرنے کی توفیق نہ ہوئی ——— پھر "کھوئے جانے" کا کیا سوال؟

مغرب میں جو ذرا سی انسانی بلندی کا احساس ہو چلا تھا، اور جس کا اظہار وہاں کے اکثر اہلِ فکر کرتے رہتے ہیں، وہ کسی مسیحی مشن کے مقدس پادری کا رہینِ منت نہ تھا ——— یہ کارنامہ نیٹشے[1] کا ہے۔ لوگ کہتے ہیں وہ دیوانہ تھا، مغرور تھا، تنہائی پسند تھا۔ اس کا فلسفہ انسان سے نفرت کا اعلان ہے، اس کے اقوال میں قومی عصبیت اور نسلی نخوت کا زبردست اثر ہے، وہ پیامِ جنگ لایا تھا اور صلح کرنا جانتا ہی نہ تھا۔ وہ عورت سے ناواقف تھا اس لئے دنیا کی آدھی "مخلوقات" کے لئے اس نے کچھ نہ کیا، اور اس کے مضامین نفسیاتی تنومندی، جنسی اضمحلال اور دماغی توازن کے عدمِ اعتدال کا نتیجہ ہیں!

اور ایک گروہ تو یہاں تک کہتا ہے کہ نیٹشے کسی سنجیدہ مطالعے کا مستحق ہی نہیں، وہ تو بس ایک

---

[1] جرمن مفکرِ اعظم فریڈرک ولیم نیٹشے۔ ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۸۶۹ء میں قدیم ادب کی زباں دانی کی وجہ سے بیسل کی یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر ہوا۔ ۱۸۷۶ء میں آنکھوں میں شکایت کی وجہ سے چھٹی لی اور ۱۸۷۹ء میں مجبوراً پنشن لے لی۔ ۱۸۸۹ء تک علیل رہا اور مختلف صحت گاہوں میں گھومتا رہا اور اسی عرصے میں اپنی شہرۂ آفاق کتابیں لکھیں۔ ۱۹۰۰ء تک تنہائی کی زندگی بسر کرنے کے بعد دماغی توازن کھو بیٹھا اور ۲۵ اگست ۱۹۰۰ء کو اس دنیا سے کوچ کر گیا۔

رخصت ہوا اسے فلسفہ اور موسیقی دونوں سے بڑا لگاؤ تھا اور شروع میں وہ مشہور جرمن مفکر "شوپن ہار کے فلسفۂ غم" سے بے حد متاثر تھا۔ موسیقی کے شوق نے اسے ویگنر سے بھی وابستہ کر دیا۔ ویگنر دنیا کے مشہور ترین ماہرین موسیقی میں سمجھا جاتا ہے اور اس کا کمال بھی یہی درد و گھلاوٹ، حزن و یاس سے لبریز نے اور دل پر اثر کرنے والے دکھ کے گیت تھے نیٹشے نے اس سے ملاقات کی اور بہت جلد دونوں میں دوستی ہو گئی اسی زمانے میں اس نے "بزرگان سلف" سے متعلق ایک کتاب لکھی جس کی سرکاری طور پر بڑی مخالفت ہوئی۔

اس چیز نے نیٹشے کی آنکھیں کھول دیں۔ وہ جس چیز کو "آزادیٔ افکار" سمجھ رہا تھا، آج وہ اس کے سامنے ہی کچل دی گئی، لیکن وہ صرف خفا ہوا۔ اس نے دیکھا کہ جرمنوں کے آبا و اجداد اتنے بہادر، اتنے وسیع القلب اور روشن خیال تھے کہ عظیم الشان لڑائیاں، کامیابی کے ساتھ لڑ کر فتح بھی کرتے اور پھر بھی اس "احساس برتری" کے نشے میں چور نہ ہوتے بلکہ حق و صداقت کا بول بالا کرنے میں کسر نہ اٹھا رکھتے تھے۔ برخلاف اس کے اس وقت جرمن ۱۸۶۴، ۶۶، ۷۰ کی فتوحات میں مست "پدرم سلطان بود" کے اس خواب میں مست پڑے ہوئے تھے جس میں مسلمان آج تک پڑے ہیں۔

اس کے علاوہ اسے اس کا بھی احساس ہوا کہ اس وقت ویگنر کی "نغمہ ریزیاں" عیش و عشرت کی جس فضا کی غمازی کر رہی تھیں وہ یقیناً قوم کے لئے لعنت ہے۔ وہ شعر و ادب جو قوم کو سلا دے، اسے بزدلی اور روباہی کی طرف لائے وہ شاعری نہیں زہر ہے۔ یہی حال شوپنہار کا تھا۔ اس نے قوم کی بہادرانہ طبیعتوں کو رنج و الم کا نشانہ بناتے بناتے یاس و ناامیدی کا خوگر بنا دیا تھا۔ نسلی طور پر وہ لوگ زندگی کے میدان میں "کمتری" اور "پسپائیت" دکھا رہے تھے: "عورت" ان کی زندگی پر یوں چھائی ہوئی تھی۔ جس طرح آج ہندوستان میں، جس کے لئے علامہ نے کہہ ہی دیا تھا ؎

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس　　آہ ان بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

(اقبال)

غرضکہ اگر آپ اس نئے زاویئے سے دیکھیں تو نیٹشے اور اقبال کی نہ صرف روحوں بلکہ ان کے "ماحول" میں بھی کچھ فطری یگانگت پائیں گے۔ نیٹشے کے پیش نظر بھی دنیا کی اصلاح تھی لیکن اقبال کی

طرح اس کے دل میں یہ خیال جما ہوا تھا کہ دنیا کی اصلاح نہ صرف ناقابل عمل بلکہ بے معنی بھی ہے جب تک افراد کی نشو نما جماعتی اصولوں پر نہ ہو۔ وہ جرمنوں پر ویسی ہی اپنایت کی نظر رکھتا تھا جیسی علامہ مسلمانوں پر۔ اس میں بھی انسانی عظمت کا بڑا خیال ہے اور انسانی روح کی برگزیدگی کو بڑی اہمیت دیتا ہے بلکہ کبھی کبھی تو وہ خدا کے خلاف بغاوت ہی اس ایک نظریئے سے کرتا ہے کہ خدا کی کوئی ضرورت نہیں ——— انسان ہی بڑھتے بڑھتے خدا ہو جائے گا۔ مگر کیا نیٹشے خود اس منزل تک پہنچ سکا؟ کیا وہ خدا کی ایک معمولی سی صفت "رحم" ہی کا مظاہرہ کر سکا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ دراصل یہ نیٹشے کی شعوری "بے باکی نہیں ہے جس عقل میں عشق کی گہرائی نہ ہو اس کا یہی انجام ہوتا ہے۔ اقبال بھی اس منزل سے گذرے تھے مگر کتنی خوب صورتی کے ساتھ وہ اس سے عہدہ برا ہوئے ہے

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے ۔۔۔ خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

(اقبال)

کہنا تو نیٹشے بھی یہی چاہتا تھا ——— کم از کم اس نے انھیں اصولوں پر اپنی فکر کو ترتیب دیا تھا مگر وہ خود اپنے کو سنبھال نہ سکا۔ یہاں پہنچ کر ضرورت تھی ضبط کی، نظام کی، معین حدود کے اندر زندگی اور اس کی قدروں کو جانچنے پرکھنے کی۔ مگر نیٹشے اس شراب کا ایک جام پی کر بہکنے لگا۔ اس نے "مافوق الانسان" کا نظریہ پیش کرتے کرتے، انسان کے وجود ہی کو سرے سے خدا کے وجود میں مدغم کر کے ایک "بڑا انسان" نہیں بلکہ ایک "چھوٹا خدا" بنانے کی کوشش کی!!

یہ اس کی بھول تھی اور ایسے ہی نازک وقت میں ہمیشہ مشرق مغرب کے آڑے آتا ہے۔ زندگی کی جنگ مغرب کسی طرح کیوں نہ لڑے اگر موت کے میدان میں یہ طوفان اٹھا۔ مشرق ہی کو ہوتا ہے کہ وہ اس جانکنی کے عالم میں بھی چوٹ کرتا جائے ہے

جہاں ہری کہ اگر مرگ است مرگ دوام ۔۔۔ خدا زکرده خود شرمسار گردد [illegible]

اور اس جرأت کی ایک خاص وجہ بھی ہے۔ دراصل اسے موت کے بعد جس زندگی کا خیال ہے اس کے آگے اس زندگی کی ساری باتیں ہیچ معلوم ہونے لگتی ہیں۔ اس دنیا میں انسانی زندگی کا معیار کچھ بھی ہو اس کا اندازہ اور اس کی جانچ کے لئے ایک حکم ہونا چاہیئے جو اس سارے نظام عالم کو چلاتے، جو ستاروں کی گردش اور زمین کی کشش میں نقطۂ اعتدال معلوم کرے، جو ایک چھوٹے سے حقیر بیج کے اندر اس نشو نما کی دیکھ بھال کرے جو کبھی پھوٹ کر ایک عظیم الشان بارآور درخت کی شکل میں نمودار ہو سکے، جو زندگی کی تکالیف اور مصائب میں "امید" کی کرن بن کر چمکے اور ہمارے پاؤں کو استقلال بخشے! اسی بنیادی خیال نے مشرق کو وہ قناعت عطا کی ہے جس سے مغرب کی مادیت عاری ہے!

خود نیٹشے نے "اچھی، حسین اور سچی" چیزوں کا تجزیہ تو کیا لیکن ان کی ہیئت، اور ان میں نشو نما کی قوت دیکھ کر مرعوب ہو گیا، گھبرا گیا، پکار اٹھا "ہذا ربی ہذا اکبر"! کاش اس نے لمحہ بھر کے لئے غور کر لیا ہوتا کہ یہ چیزیں بذاتِ خود کچھ نہیں۔ یہ تو صرف پرتو ہیں، ایک مصوّر کی بنائی ہوئی تصویریں ہیں ——— یہ خالق نہیں مخلوق ہیں، یہ جاندار ہیں لیکن اپنی جان کے لئے کسی اور کی محتاج ہیں اور پھر جب مخلوق کی عظمت کا یہ عالم ہے تو خود خالق کی کیا کچھ حیثیت نہ ہوگی؟ لیکن یہ سب سوچنے سے قبل، یہ "مجذوب" سوچنے اور سمجھنے کی کلفت سے آزاد ہو چکا تھا۔

جہاں تک جرمنی کا تعلق ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نیٹشے نے اس کے افراد کے احیاء کے لئے جو کچھ کیا اس کی مثال یورپ کی کسی بڑی سے بڑی مصلحانہ تحریک سے بھی نہیں دی جا سکتی۔ وہ انقلاب فرانس یا انقلاب روس قسم کی چیزیں نہیں سوچ رہا تھا جن کے معاشرتی ڈھانچے میں آج بھی جھول نظر آتا ہے اور جہاں عورت اسی طرح مردوں کے کندھوں سے کندھا ملانے کی کوشش کر رہی ہے یہ چیز پہلے ہی اسے کھٹک رہی تھی اور اس نے کہہ رکھا تھا کہ جنس کی تفریق مٹانے والے اس کا خیال رکھیں کہ وہ نہ صرف عورت کی فطری عصمت، محبوب صورتی اور نزاکت کو تباہ کر دیں گے بلکہ وہ ایک ایسی قوم پیدا کریں گے اگر وہ اتنا بھی کر سکے، جو عاجز، نااہل، بزدل اور کمتر انسان کے زمرے میں آئیگی۔ اس جنگ نے نیٹشے کے اس خیال کی بڑی حد تک تائید کی ہے۔ اور جرمنی کی جسمانی برتری کی دلیل میں بھی

اسے پیش کیا جاسکتا ہے۔

لیکن اس سے بھی بڑھ کر اس کے ذہن میں سرخ انگارے کی طرح ایک اور ہی خیال بھڑک رہا تھا ـــــــ کہ یہودیوں نے غداری کی۔ انھیں ایک اعلیٰ آسمانی صحیفہ ملا تھا لیکن انھوں نے جو معیار مقرر کیا وہ "بہادری، اولوالعزمی، بے باکی، سرفروشی اور خودداری" کے اصولوں پر مبنی نہ تھا۔ ان کے سامنے صرف دولت اور عشرت کے دھندے رہ گئے۔ اس طرح زندگی کے ان اجزا کا خاتمہ ہوگیا جو اسے ترقی دینے والے تھے، اس کی عزت و عظمت کے محافظ تھے اور اس کے اصولوں کی قدر کرتے تھے اس کے بجائے انھوں نے "مائل بہ تنزل" قسم کے نظریۂ زندگی کے کندھے پر لاد دئے۔ عورت، دولت اور آرام ان کا معراج حیات قرار پایا اور لازمی طور پر، ایک خود مختار و خوددار انسانی روح سمٹ، سکڑ، اور کسی حد تک مردہ ہو کر بھی ـــــــ ایک پسمانی اور غلامانہ ذہنیت کی عادی ہوگئی!

یہ تھا وہ تصور جو نیٹشے کے ذہن میں رچ بس گیا تھا۔ بس اس نے اپنے نحیف سے جسم اور صداقت سے معمور دماغ کی تمام کوششیں اس میں لگادیں کہ جرمن قوم بیدار ہوجائے اور اس کے ہم وطن اس مہلک جال سے پیچھا چھڑائیں جس میں یہودیوں نے جرمنوں کی ہڈیوں تک کو اسیر کر رکھا تھا۔ اس نے کہا کہ تم اپنی تقدیر کو رو رہے ہو، تم خدا کو جبر کا دیوتا مانتے ہو، تم سمجھتے ہو کہ تم اور تمہاری تمام نسلیں مُردوں کی طرح قبر کی تنہائیوں اور تنگیوں میں گذر بسر کرکے خاک میں مل جائیں گے اور ان کا ماضی مطلق کچھ بھی نہ رہے گا۔ تمہارا خیال ہے کہ زندگی میں فتح دوسروں کے لئے ہے اور شکست تمہارے لئے اور یہ کہ تمہارا کام صرف مسحور ہونا ہے، سحر کا توڑ کرنا نہیں ـــــــ تو آؤ! اے بزدلی اور غیب پر ایمان نہ لانے والو! اے انسانی لباس میں خدا کی نوید کے منتظر انسانو! مجھے دیکھو ـــــ میں وہ وحی ہوں، میں وہ الہام ہوں اور تمہیں "اُس" کا پیغام دیتا ہوں۔ میں تم سب سے بلند ہوں۔ تم مجھے صرف دور سے تکتے ہو لیکن اگر تم بھی تھوڑی دیر کے لئے اپنی زندگی کو موت پر قربان کردو تم دوبارہ ایک نئی زندگی، ہمیشہ کی زندگی پر قابض ہوجاؤ گے۔ تم ثبوت چاہتے ہو تو جاؤ۔ تھوڑی دیر کے لئے یہ بھی سمجھ لو کہ اس "خدائی" کے پردے کے پیچھے "میں" ہی ہوں!

ذرا کی ذرا منصور کے "انا الحق" پر بھی دھیان رکھتے چلئے۔ منصور کو کسی قوم کی اصلاح منظور نہ تھی لیکن اسے ایک واقعہ، ایک آنکھوں دیکھی، بلکہ یوں کہیئے کہ دل دیکھی بات کی گواہی دینا تھی ــــــــ وہ چپ نہ رہ سکا، بول اٹھا! ــــــــ اسے آپ کوئی الزام نہیں دیتے۔ پھر نیٹشے کو کیوں قصوروار گردانیئے ــــــــ اس نے یہ نہیں کہا کہ "میں خدا ہوں" اس نے یہ کہا کہ انسان کے لئے اس دنیا میں صرف ایک چیز ہی ــــــــ آگے بڑھنا، ترقی کرنا، سوچ سمجھ کر چلتے رہنا، دوڑتے رہنا ــــــــ اور اس ارتقائی دور میں وہ خدا سے قریب ہو جاتا ہی، اتنا قریب، اتنا قریب کہ آخر "مافوق الانسانیت" کی منزل سے گذر کر وہ ساری دنیا پر حاوی ہو جاتا ہی ــــــــ "آفاق" اس میں "گم" ہو جاتے ہیں اور یہی منزل "یزداں بکمند آور" کی حالت تک پہنچتی ہی!

اور اس طرح وہ کاہل اور مردہ دل اہلِ وطن کو اس ایک نقطے پر لانا چاہتا ہی، جہاں ان میں اس بلندی کی طرف پرواز کرنے کی خو پیدا ہو جاتے۔ ان کے شرمندہ، جھجکتے عزم جو کبھی کھل کر ہنس بول نہ سکے، پھر سے ان کے ماتھے پر خود نما، سرکش، اور نڈر شکنوں کی صورت میں نمودار ہو جائیں ــــــــ ان کی وہ آبدار تلواریں جنھوں نے ایک شاندار ماضی کو تابندگی بخشی تھی۔ پھر سے میدان میں نکل آویں ــــــــ ــــــــ ان کی روحوں پر، جو زنگ آلودہ ہو چکی ہیں، پھر سے جلا کی جائے اور وہ ایک بار پھر تلوار بند ہاتھوں سے مدرسۂ یورپ کو فلسفۂ حیات کے درس دے!

مگر نیٹشے کا عشق "خام" تھا، اس لئے اس کی فکر بھی پختہ نہ رہی۔ وہ ایک مجدد ہی، مصلح ہی، اس نے ایک "تخریب" کی اصلاح کی ــــــــ مگر تعمیر کو ادھورا چھوڑ گیا۔ تمام چیزوں کی طرح دنیا کو بھی تباہ و برباد کر دینا، آسان ہی، مگر اس کو پھر سے اس طرح تعمیر کرنا کہ اس کی بنیادوں کو اکھاڑ پھینکنے کی ضرورت نہ ہو، یا اس کی جرأت نہ کی جا سکے، یہ کام ذرا کٹھن تھا، ہی، اور رہی گا۔ یہ مرحلہ نیٹشے کے بس کا نہ تھا! تعمیر میں راج کے علاوہ "انجینئر" کی ضرورت بھی پڑتی ہی۔ یہ کام اقبال کر سکتا تھا اور اس نے کیا مگر اس نے تو سرے سے ایک نئی عمارت ہی بنا ڈالی ــــــــ وہ عمارت اسلامی نظام تمدن کی مضبوط بنیادوں پر کھڑی ہی۔ اقبال کو اتنی فرصت نہ تھی کہ نیٹشے کے خاکے کی اصلاح کرتا

وہ خود راج بھی تھا اور انجینئر بھی، اس کے علاوہ وہ آرائش و تزئین سے بھی واقف تھا۔ اپنی زندگی کا بڑا حصہ اسے اس عمارت کی تکمیل میں نہ لگا ـــــــ جی نہیں وہ تو بس اس عمارت میں بسنے والوں کی تلاش کرتا رہا، یہاں کے تہ خانوں اور پائیں باغ کی بابت بتاتا رہا۔ اس کے قلعوں کی حفاظت کے لئے ہدایات دیتا رہا ـــــــ اور انھیں عقل و عشق دونوں قسم کے ہتھیاروں سے لیس کرکے، ذرا سی دیر کے لئے بیرونی دنیا کا نظارہ بھی کرنے لگا ـــــــ وہاں ایک اپنے ہی ہم پیشہ کی ناکامی ـــــــ مگر لگاتار کوششوں سے متاثر ہوا اور ایک شعر سنا کر، خاموش ہو گیا ؎

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں،
تو اقبالؔ اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے! (اقبالؔ)

اسی لئے میں کہتا ہوں کہ نیٹشے کو کسی اقبال کی ضرورت تھی!

جلال الدین احمد

علم النفس

علم النفس کی ابتدا ایک فلسفیانہ بحث کی طرح ہوئی اور یہ آج سے نہیں بلکہ فلسفہ کے ساتھ قدیم زمانوں سے موجود رہی۔ کہا جاتا ہے کہ عہد افلاطون یا اس کے کچھ پہلے سے اس کا سلسلہ شروع ہوتا ہے مگر اس پر تمام کا اتفاق ہے کہ اس کی ابتدا یونان کے فلاسفر کی وقت طبع و فکر کا نتیجہ ہے اور اس کی بحث و تفحص پر یونان کے غیر معتد بہ علماء و مفکرین نے کاوشیں صرف کی ہیں جن میں ارسطو ایک اہم شہرت کا مالک ہے۔ اس کا رسالہ جو اس نے اس علم پر تالیف کیا ہے اصحاب نظر کی آنکھوں سے پوشیدہ نہیں۔ ہمیں اس نے بتلایا ہے کہ انسان کا نفس "حیوانی جذبات اور قوائے عقلیہ کا مجموعہ ہے۔ اور یہ دونوں چیزیں اپنی جگہ پر مستقل اور باہم وظائف و اعمال میں مختلف ہیں عقلی محرکات انسان کو صواب اور معرفت حق کی طرف لے جاتی ہے اور حیوانی جذبات سراسر مادہ اور دنیا کے حقیر امور کی جانب رہبری کرتے ہیں۔ ارسطو کا یہ اصول عہد وسطیٰ کے فلسفہ کا عام اور مسلم نظریہ تھا اور اسے ایشیائی مذاہب نے بھی اس طرح دینی رنگ چڑھا کر اپنے میں سمو لیا ہے کہ انسانی روح اور جسد کا مجموعہ ہے۔ اس کی روح الہٰی اور ماوراء مادی امور کی داعی ہے اور جسد دنیا اور طلسم سرائے بجبری میں منہمک کرنے والا ہے۔ روح باعث نجات و راحت ہے اور جسد وجہ عذاب و ہلاکت۔

لیکن فلسفہ کا یہ دور علم النفس کا کوئی روشن عہد نہیں ہے بلکہ ایک عہد تھا۔ اس کا حقیقی اور منور زمانہ وہ ہے جب اس نے فلسفہ کے ساتھ آہستہ آہستہ ترقی کر کے گلیلو اور ڈیکارٹ کے دور علم و تحقیق میں قدم رکھا۔ ہم اس کو قدیم عہد تاریک اس لئے کہہ رہے ہیں کہ اس زمانے میں نہ تو کوئی وسیع تجربہ تھا اور نہ کوئی ٹھوس اور منظم مشاہدہ؟ بلکہ محض متفرق اور غیر منظم خیالات اور ناقص تجربات کا ایک مجموعہ تھا جسے علم النفس کہتے تھے۔ اور دوسرے اس عہد میں اس کی بحث کے دائرے محض چند مخصوص

چیزوں سے آگے نہیں بڑھے تھے یا اسے یوں کہیئے کہ اس باب میں جن فلاسفہ نے کاوش نظر کی تھی ان کی بحث وفکر کی حدیں محض دو تین زاویوں تک محدود تھیں۔ پہلی چیز نفوس بشری اور یونانیوں کے لحاظ سے انکے تین افسانے، اور فارابی اور مسلم فلاسفہ کے نقطۂ نظر سے پانچ اقسام پر رائے زنی تھی۔ دوسری چیز حافظ وخیال کی بحث، اور تیسری عقل وبدن کا علاقہ اور ان کے وظائف واعمال کی توضیح۔ بس ان تین اشیاء پر بحث وفکر کے بعد علم النفس کا باب ختم ہوجاتا تھا مگر اس کے بعد جب انیسویں صدی اپنا خورشید منتصف سما پر پہنچ رہا تھا اس وقت فلسفہ نے ایک غیر معمولی ترقی کی اور اس وقت مفکرین فلسفہ ان تمام قید وبند سے آزاد ہوگئے جن میں فلسفہ پہلے مقید تھا اور انھوں نے فکر وفلسفہ کے اسلوب وقواعد کی نئی بنا ڈالی۔ اس تعمیر نو میں علم النفس کے قدموں کی رفتار بھی تیز ہوگئی اور وہ ترقی کے ان منازل پر پہنچ آیا کہ اب اس پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہی کہ اس سرعت رفتار کی کوئی دوسری مثال نظر نہیں آتی۔ اس عہد میں اس کی بحث کے معیار میں کافی تنوع آگیا اور تفحص کے لاتعداد نواحی پیدا ہوگئے۔ اور مفکرین نے بے شمار مذاہب (اسکولوں) کی بنیاد ڈالی جو بعض اوقات تو اس درجہ مختلف ہیں اور ان میں جدال ومعرکہ کا وہ منظر ہی جو ہمیں تاریخی معرکوں میں نظر آتا ہی۔ مگر ان سب کے باوجود ان جنگوں نے اس علم کی بنیاد کو ضعیف نہیں کیا ان سے علم کے بعید ترین گوشے باہم مجتمع ہوگئے اور اس نے ایک پائیدار اور منظم شکل اختیار کرلی جو اپنے پاس متین اور ٹھوس بنیادیں رکھتا ہی۔ آج ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ گذشتہ سو سالوں میں علم النفس نے جو ترقی کی ہی اس کا مقابلہ وہ دوسرے علوم نہیں کرسکتے جو اس وقت اس کے ہم رفتار تھے اور آج علم النفس کے محقق کے لئے تو ایک وسیع میدان یہ خود ہی کہ وہ اس کی محض صد سالہ ارتقاء کی تاریخ سے واقفیت حاصل کرے۔ ہم نے نیچے نہایت سرعت کے ساتھ اس کی کوشش کی ہی کہ اس عہد کے ارتقاء کو بالاختصار واضح کریں۔ انشاء اللہ آئندہ کبھی اس کے مذاہب اور مدرسوں پر بتفصیل نظر ڈالی جائے گی ———— ہم نے اس عہد ترقی کو تین ادوار میں تقسیم کرلیا ہی اور ہر ایک پر اجمالی نظر ڈالی ہی۔

دورِ اول | پہلا دور سنہ ۱۸۳۳ء سے شروع ہوتا ہی اور سنہ ۱۸۶۰ء میں اس کا سلسلہ ختم ہوتا ہی۔ یہ عہد اس سے

ممتاز اور نمایاں ضرور ہے کہ اس میں دو ایسے نظریات کا وجود پایا جاتا ہے جو علم النفس کے میدان میں باہم مختلف ہیں۔ اس دور کے علماء و محققین دو فریقوں میں منقسم ہیں ایک فریق کا یہ خیال ہے عقل محض ایک محرک آلہ ہے جو چلا دینے سے برابر چلتا رہتا ہے نہ تو اس میں کوئی ارادہ ہوتا ہے اور نہ حس و شعور۔ بالکل اسی طرح یہ ہماری انسانی عقل ہے جو ایک مشین کی طرح چل رہی ہے اور وہ اپنی طبیعی راہ کے خلاف کوئی ارادہ نہیں کر سکتی ہے اس کے برخلاف دوسرے گروہ کا یہ خیال ہے کہ عقل ایک جاندار، ذی شعور و حس عامل و متصرف شئی ہے جس کے عمل و نشاط کی حدیں متعین نہیں جس طرح اس تعریف عقل میں اختلاف ہے اسی طرح ہمیں عقل کے اعمال و وظائف کی تفسیر میں بھی متضاد رائیں نظر آتی ہیں۔ ایک جماعت یہ مانتی ہے کہ بہت سے عقلی ملکات ہوتے ہیں جو باہم دوسروں سے بہت حد تک الگ ہو کر خود مستقل عمل کرتے ہیں اور یہ مجموعی طور پر بعض اشخاص میں بہت قوی ہوتے ہیں اور بعض افراد میں بہت ضعیف یہ موجودہ نظریات تمرین و تحسین کے ذریعہ کمال کو بھی پہنچائے جا سکتے ہیں مثلاً شعر کا حفظ عموماً قوت ذاکرہ کو تقویت پہنچاتا ہے اگر کسی کو شعر یاد کرایا جائے تو وہ صاحب حفظ اور دوسری چیزیں بھی آسانی سے یاد کر سکے گا۔ یہ مذہب جسے "مذہب ملکات عقلیہ" کہتے ہیں بہت قدیم مذہب ہے اور افلاطون کے عہد سے علماء اس کی بحث کے معتقد رہے ہیں مگر انیسویں صدی میں آکر جدید تحقیقات نے اس کے فساد و بطلان کو واضح کر دیا۔

دوسرا مدرسہ (اسکول) وہ ہے عقلی اعمال کی تفسیر تسلسل فکر اور اشتباہ و تضاد[1] کے قاعدہ پر کرتا ہے۔ ان محققین کا ہر گروہ اپنی بحث کو ایک خاص نہج پر ترتیب دیتا ہے اور علم النفس اور حیات عقلیہ کی تحلیل کے لئے عجیب و غریب مفروضات مقرر کرتا ہے۔ اور چونکہ ان دنوں علم الکیمیاء روبارتقاء تھا۔ اس لئے ہربرٹ براؤن اور اسٹورٹ مل وغیرہ نے اس کی روشنی میں عقل کی ایک کیمیاوی نظریہ کے ماتحت تحلیل کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عقل ایک کارخانہ ہے جس میں افکار اسی طرح تیار ہوتے ہیں جس طرح

---

[1] اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ہم ایک شخص کو جو ہمارے کسی دوسرے جانے ہوئے آدمی کے مماثل یا ضد ہوتا تو فوراً ہمارا ذہن اور حافظہ اس آدمی کی طرف پھر جاتا اور ہمیں اس کی یاد آتی ہے یہ تسلسل فکر ہے۔

ایک کالحاظ نہ میں کیمیاوی مواد کی تحلیل و تفاعل سے ایک شے تیار ہوتی ہے اس سے اور آگے بڑھ کر ووٹڑ نے ایک غلطی کی ہے کہ اس نے علم الفراستہ کی بحث میں ہر عقلی قوت کا اعصابی مقامات میں ایک مرکز قرار دیدیا ہے اور ہلمہولٹنز نے تو اسے بالکل علم الابدان (فزیولوجی) کے تابع کر دیا ہے جس کی رو سے علم النفس خالص ایک علم الاعضاء ہو کر رہ گیا ہے۔ اس نے اسی کے ماتحت حاسۂ سمع و بصر کی کافی تحقیق و تفحص کے بعد ایک مذہب "مذہب قولی" کی بنیاد ڈالی جس میں اس نے تبلایا ہے کہ قوی فکریہ کا اعصاب حسیہ پر کہاں تک قیام ہے۔

دور ثانی | یہ دور ۱۸۶۳ء سے ۱۹۰۰ء تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں بہت مختلف اور متعارض آراء و مذاہب نے بناء پائی۔ پہلا منظم نظریہ ہے جو کہتا ہے کہ پہلے ہمیں چاہیئے کہ ہم فلسفہ کی طرح علم النفس کے چند فکری نظام قائم کرلیں جنھیں ہماری عقلیں متفق طور پر تسلیم کرتی ہوں اور اس کے بعد انھیں دائروں میں رہ کر ہم ایک عقلی اور فلسفیانہ نظر کے ساتھ بحث و تحقیق کی ابتدا کریں۔ اس کا نظریہ کا تقابل "تجزئی" نظریہ ہے جس کے بانی ونٹ اور اینجھاس ہیں۔ انھوں نے ساری کوشش اس امر میں صرف کی ہے کہ ادراک حسی اور انفعال و تداعی فکر کا تجربہ کیا جائے نہ کہ محض اس پر نظر و فکر اس کے بعد تلی اور ویکیان کا نظریہ ہے کہ عقلی اعمال کے درس و تفحص میں ہمہ دار و مدار محتویات پر ہونی چاہیئے۔ یہ "اشتمالی" نظریہ ہے۔ اس کے برخلاف نظریہ واقعی ہے جسے برنتالو اور اس کے انصار و اعوان نے ساوی اسکول کے اتباع مثلاً ایرنفلس اور مینونک و دیگر اساتذہ کبار جیمس، وارڈ، اسٹاوٹ لیپس، ہوفونگ اور کولپ سے اخذ کیا ہے یہ کہتے ہیں کہ عقلی اعمال کے درس و بحث میں ضروری ہے کہ یا تو محض عمل کی تحقیق کی جائے یا تنہا عقل کی۔ یہ غلط ہے کہ وہ تمام محتویات و عناصر مد نظر ہوں جن پر عمل کا اشتمال ہے۔

ان کے بعد سب سے آخر میں گالٹین (انگلستان) کا نظریہ ظاہر ہوا جس نے انفرادی علم النفس اسکول کی بنیاد ڈالی جس میں فردی خصوصیات و رجحان کی تحقیق پر بہت اہتمام صرف کیا گیا۔ اس کے مقابل میں کیٹل نے دوسرے اسکول کی بنیاد ڈالی جو انفرادی خصوصیات سے قطع نظر اجتماعی امور

[illegible] نوع انسان کی عمومی خصوصیات پر توجہ صرف کرتا ہے۔ اس کو عمومی اسکول کہتے ہیں۔
ان اسکولوں کے بعد علم النفس کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا اور اس کی بحث کا میدان، اطفال اور حیوان وغیرہ عام جانداروں کی نفسیات کے علم پر ہمہ گیر ہوگیا۔

دور ثالث | یہ دور ۱۹۰۰ء سے شروع ہوتا ہے اور اس کے اندر بے شمار مذاہب نے جنم لی۔ ان میں سے پانچ جدید متناقض نظریے لائق ذکر ہیں۔

پہلا نظریہ ترکیبی ہے جس کا بانی ٹچنر ہے۔ اس کا مقصود یہ ہے کہ اصل یہ جاننا چاہیئے کہ عقل کیا ہے اور اس کی ترکیب کس طرح ہوئی ہے اور اس کے عمل کا طبیعی رجحان کیا ہے، اس کا معارض نظریہ عملیہ جس کے اولین اصحاب ڈیوی، انگل، اور جیڈ وغیرہ ہیں۔ ان کا مقصود یہ ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ عقل کے وجود سے کیا فائدہ اور اس کا کیا مقصود ہے؟ پھر اس کے ہر عمل کی غایت کیا ہے؟ ان دونوں نظریوں میں فرق یہ ہے کہ پہلا اسباب و ماہیت سے بحث کرتا اور دوسرا مقصود و نتیجہ سے!!

اس کے بعد اصولی نظریہ آتا ہے جس کا مدمقابل تشکیلی یا گسٹالٹ اسکول ہے جو تمام قدیم اسکولوں کے ہدم کی غایت لے کر اٹھا ہے۔ یہ ایک اطالوی نظریہ ہے جس کے بانی ورتھائمر، کہلر اور کوفکا ہیں۔ ان کی رایوں کا ملخص نقطۂ نظر یہ ہے کہ عقلی ادراکات اور انفعالات کا ہم حقیقی علم اس وقت تک نہیں حاصل کرتے جب تک ہم اس کا مجموعی اور کلی علم نہ حاصل کریں۔ اس لئے کہ عقل کسی خاص حس کا نام نہیں بلکہ یہ مجموعہ ہے ان تمام احساسات کا جو اس میں موجود ہیں۔ اس لئے اگر ہم فکر و نظر میں بجائے ترکیب کے تحلیل و تجزیہ سے کام لیں گے تو ناکام رہیں گے۔ ان دونوں اسکولوں میں بس یہی فرق ہے کہ وہ تجزیہ و تحلیل کا قائل ہے اور یہ ترکیب و جمع کا۔

اس اسکول نے اخیر چند سالوں میں بڑی بے پایاں ترقی کی ہے اور اس کے نظریات اور اس کی رائیں بحث و تمحیص کے جدید اور وسیع تجربات سے ثابت ہو رہی ہیں اور لوگوں کو توقع ہے کہ آگے چل کر علم النفس کے میدان میں یہ نظریہ تنہا مسلّم نظریہ قرار پائے گا۔

تیسرا نظریہ سلوکین کا مذہب ہے۔ یہ لوگ عقل کو بالکل نہیں مانتے اور امور عقلیہ کو ناقابل عنایت خیال کرتے ہیں کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں ایسی عقل کو تسلیم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں جس کے اعمال وہ وظائف جسد کے وظائف سے علیحدہ کوئی چیز ہیں اور اس کی خود ایک الگ دنیا ہے جو اس مادی حیات کے اصول و قواعد سے خارج ہے۔ ان کے نزدیک تمام انسانی حرکات بدن اور عصبی اجہزہ تعلق رکھتے ہیں۔ یہ نظریہ تامل باطن یا باطنی غور وفکر کی مخالفت میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے ان کے خلاف یہ بات پیش کی کہ تامل باطن کی ترکیب سے کسی حقیقت کو معلوم کرنے میں ہمیں لاتعداد شکوک سے گذرنا پڑے گا۔ اس لئے کہ باطن ایک شے مخفی ہے اور ہر انسان کے شخصی عوامل ومحرکات مختلف ہوتے ہیں انھوں نے مزید کہا کہ چونکہ اصحاب باطنہ حیوانیت کی تحقیق و درس کے مخالف ہیں۔ اس لئے اگر ایک حیوان کوئی کام لے تو وہ ہمیں اس کے متعلق کچھ نہیں بتا سکتے کیونکہ حیوان تامل باطن سے بالکل عاری ہے۔ تو اب جب یہ ثابت ہوگیا تو یہ دیکھنا چاہیے کہ جو کچھ عقلی ظواہر انسان کے پاس ہیں وہی حیوان کے پاس بھی ہیں یا نہیں ؟ اگر یہ دونوں برابر ہیں تو پھر انسان کے لئے ایسی حیات کے ملنے کی کیا ضرورت ہے جو دائرہ حیوانیت سے خارج ہے۔ گویا انھوں نے اس طرح انسان کو چند جسمانی حرکات وافعال کا تابع حیوان قرار دیا جو اگر مطلق و بے قید بند ہیں تو بسیط ہیں اور اگر محدود و مکرر ہیں تو فطرت ہے اس نظریئے کی اس قدیم نظرئے نے مخالفت کی اور نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں نے باہم دوسروں کی عمارت منہدم کردی۔

ان کے بعد چوتھا مذہب نظریہ آلہ ہے جو قدیم علم النفس کے مقابل میں ایک انقلاب کی شکل میں نمودار ہوا اور اس نے بتلایا کہ عقل بشری کی حیثیت محض ایک بے معنی مشین کی سی ہے۔ یہ ..... میٹاطہ گل کا نظریہ ہے جسے نظریہ مقصدی بھی کہتے ہیں۔ اس نے اس مذہب کی تائید کی جو افلاطون نے پیش کیا کہ خدا نے ہر چیز کو غرض وغایت سے پیدا کیا ہے اور یہ ہماری عقل بھی شے لا مقصد نہیں ہے بلکہ اس کا بھی ایک مقصود ہے۔ اس نظرئے نے اور بھی دلچسپ مخفی چیزوں کا انکشاف کیا ہے۔

پھر پانچواں نظریہ وہ ہے جسے ہم نظریہ شعور کہتے ہیں یہ کامل بیداری اور احساس کلی کا

داعی ہو۔ اس کا خیال ہو کہ نوم اور احلام وجنون وغیرہ کی حالتوں میں بھی ہم سے جو افعال سرزد ہوتے ہیں وہ محض عبث اور بے قیمت ہیں۔ اس کی مخالفت میں نظریہ عدم شعور قائم ہوا۔ اس نے انسان کے تمام عقلی ظواہر کی ایک معجزانہ تعلیل کی اور اسی کے ساتھ اس نے ان عقلی امراض کا علاج بھی سوچا جن سے طب قدیم عاجز آچکی تھی۔ اور آج اسی نظریۂ عدم شعور نے اتنا فائدہ پہنچایا کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ عدم شعور ہی شعور کی کلید ہو۔

اسی طرح برابر ایک نظریہ انقلاب کی شکل میں نمودار ہوکر دوسرے کو مغلوب کرتا آرہا ہو ہمیں افسوس ہو کہ ہم طوالت کے خیال سے اس بحث کا دلچسپ منظر نہ دکھا سکے کہ کس طرح ایک نظریہ نے ظہور پایا اور وہ دوسروں پر فائق ہوگیا۔ یہ چند سطور علم النفس کی مجمل تاریخ ہیں۔

صدرالدین عظیم

ایک فلسفی* سے

کھلتا ہی ترا ادراک ان اسرار سے کیوں؟ — جن کا اسرار ہی رہنا ہی تقاضائے حیات
ان دھندلکوں میں بھٹکتا ہی ترا طائرِ فکر — جن میں کچھ اور الجھتا ہی معمائے حیات

ریزۂ سنگ سہی پھول کی نازک پتی — تودۂ خاک سہی پیکرِ ابنِ آدم!!
ذرۂ ریگ سہی قلب کا ایوانِ حسیں — قطرۂ بحر سہی وسعتِ ہر دو عالم!!

یہ جہاں خواب سہی۔ ایک پریشاں سا خواب — اور تعبیر ہی اک تیرہ و تاریک خلا!
جس کی پنہائی میں اُڑتے ہیں وہ ننگے بھتنے — نوعِ انساں کے کلیجے ہیں فقط جن کی غذا

اے میرے دوست میرے شعر کے متوالے دوست — تیری ہر بات کو تسلیم کئے لیتا ہوں
میرے احساس کے سورج میری رازوں کے امیں — تیرے کہنے پہ میں یہ زہر پئے لیتا ہوں

میں نے احساس کی میزان میں تولی ہی حیات — میں نے تخئیل کے سانچے میں جوانی ڈھالی
میں نے افکار کی بکھری ہوئی مہکاروں میں — تیرے بھٹکے ہوتے ادراک کی منزل پا لی

فلسفہ ہیچ ہی اس وہم گزیدہ دل کی!! — جس کے اندازِ تفکر میں کوئی ضبط نہ تھا

---

* میرے عزیز دوست ش۔ خورشید احمد خاں متعلم ایم اے (فلسفہ) گورنمنٹ کالج لاہور۔ جو مرغی کی کُڑکُوں کوں اور موٹر کے ہارن میں بھی فلسفہ اور نفسیات کا کوئی نہ کوئی نکتہ تلاش کر لیتے ہیں۔ ندیم

فلسفہ بھی ہی اس سازِ شبستانی کی ! 　 جس کے دلدوز ترانوں میں کوئی ربط نہ تھا

فلسفہ ٹیس ہی ان روح کے ناسوروں کی 　 جن کو رہتا ہی سدا جبرِ مشیت کا گلا
فلسفہ ہوک ہی ادراک کے ان زخموں کی 　 فیلسوفوں سے کبھی جن کا مداوا نہ ہوا

سوچتا ہی تو مرے شعر کے ایوان میں آ 　 جس میں رازوں کو حجابوں سے بلا کی کد ہی
چھلکتے رہتے ہیں جہاں مست خیالوں کے خمار 　 بحث و تکرار، نہ افسانۂ نیک و بد ہی

بنسری عشق کی بجتی ہی تو آہنگ کے ساتھ 　 پھڑ پھڑاتے ہیں بہشتوں میں فرشتوں کے پرے
جھلملاتے ہیں درِ بام پہ انوارِ یقین 　 راکھ ہو جاتے ہیں اوہام سرشتوں کے پرے

جامِ جمشید پہ بھاری ہی اگر روحِ ندیم 　 پھر ترا عقل کے جنگل میں بھٹکنا کیسا
جب یہاں ہیں گل و نسرین و سمن کے انبار 　 پھر ترے قلب میں کانٹوں کا کھٹکنا کیسا

کانٹ کی فکر میں الجھا نہ خیالات اپنے 　 کہ ترا ذہن ہی اک شعرِ حسیں کا محتاج
جس کے بجتے ہوئے الفاظ سے اک آنچ اٹھے 　 موم بن جاتے ترے علم کا یخ بستہ مزاج

شمعِ عرفاں سے نہ ڈر، نار نہیں نور ہی یہ 　 شمع ناچے گی جب آئیں گے یہ پروانے دو
اصطلاحات کی چھٹ جائیں گی سب تیرگیاں
"خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو"

احمد ندیم قاسمی

شامِ تنہائی

تنہا ہی رواں ہوں دشتِ غم میں — کوئی مرا ہم سفر نہیں ہے
ہر سمت ہے ایک ہُو کا عالم — کوئی بھی اِدھر اُدھر نہیں ہے
اللہ! یہ ظلمتوں کے طوفاں ! — آنکھیں ہیں مگر نظر نہیں ہے
وحشت کے ہجوم سے، مرا سر — اک کوہِ گراں ہے سر نہیں ہے
دہشت کی وہ یورشیں کہ توبہ — پانی ہے جگر، جگر نہیں ہے
آواز مری صدا بصحرا — فریاد میں کچھ اثر نہیں ہے
منزل کی تلاش میں ہوں بے کل — منزل کی مگر خبر نہیں ہے

اے خالقِ مہر و ماہ و انجم
اس شام کی کیا سحر نہیں ہے!

اثر صہبائی

تنقید و تبصرہ
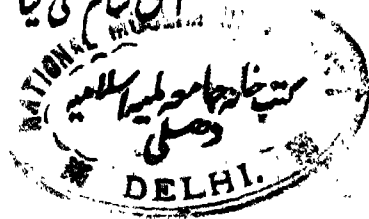
(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

میسور میں اُردو مرتبہ محمد سعید عبدالخالق، صفحات ۹۶، سائز ۳۰×۲۰/۱۶ قیمت ۱۰ر ملنے کا پتہ:- درسگاہ اردو معظم بلڈنگ حیدرآباد دکن۔ کاغذ، کتابت، طباعت اچھی۔

سید عبدالخالق صاحب نے زیر نظر کتاب میں بڑی تحقیق اور کاوش سے کام لیا ہے اور تمام پرانے ماخذات سے میسور کی پرانی اُردو کا پتہ لگایا ہے اور پھر حیدر علی اور ٹیپو نے اُردو کے لئے جو کچھ کیا یا ان کے زمانے میں اُردو کے لئے جو کچھ ہوا، ان سب باتوں کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی تحقیق کو موجودہ زمانے کی علمی و ادبی سرگرمیوں کے ذکر پر ختم کیا ہے۔

کتاب تحقیق کے لحاظ سے بہت اچھی ہے جگہ جگہ حوالے دئے گئے ہیں۔ اردو ادب کے طلبا کے لئے یہ کتاب یقیناً مفید ہوگی۔

اسلام کا تاریخی کارنامہ از ایم این رائے مترجمہ علی امام ایم اے۔ صفحات ۸۰، سائز ۲۶×۲۰/۸ قیمت عہ ملنے کا پتہ ہندوستانی لٹریچر کمپنی فلیمنگ روڈ لاہور، کاغذ کتابت، طباعت اچھی۔

ایم۔ این رائے کے مذہبی یا سیاسی عقائد سے لوگوں کو اختلاف ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ ایک غیر مسلم نے اسلامی فکر و عقائد کو کاوش کر کے سمجھنے کی کوشش تو کی ہے اور آج کل کی فضا میں یہ کچھ کم نہیں۔

جہاں تک ترجمے کا تعلق ہے مترجم نے کوشش کی ہے کہ وہی اسلوب کی شگفتگی اور زور قائم رہے جو اصل میں ہے۔ اور اس میں بلاشبہ وہ بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں۔ جگہ جگہ ناشر نے حاشیہ پر مفید نوٹ بھی دے دئے ہیں۔

گلنار بیگم ازالیاس احمد صاحب مجیبی۔ صفحات ۱۵۰۔ سائز ۱۷×۲۷/۱۶ قیمت ۱۲/ کاغذ دبیز خاکی۔ کتابت وطباعت بہت اچھی۔ ملنے کا پتہ بچوں کا بکڈپو۔ احمد منزل کلاں محل، دہلی۔

حرکت میں برکت ازالیاس احمد صاحب مجیبی۔ صفحات ۱۶۰ سائز ۱۷×۲۷/۱۶ قیمت ۱۰/ کاغذ دبیز خاکی۔ کتابت وطباعت بہت اچھی۔

ملنے کا پتہ بچوں کا بکڈپو۔ احمد منزل۔ کلاں محل، دہلی

اچھی کہانی ازالیاس احمد صاحب مجیبی۔ صفحات ۲۸ سائز ۱۷×۲۷/۱۶ قیمت ۴/ کاغذ دبیز خاکی کتابت وطباعت بہت اچھی۔ ملنے کا پتہ بچوں کا بکڈپو۔ احمد منزل کلاں محل دہلی

مجیبی صاحب نے بچوں کے لئے یہ چند نئی کہانیاں تیار کی ہیں۔ اول الذکر دو میں الف لیلہ کی کہانیاں ہیں۔ جن میں التزام یہ رکھا ہے کہ پیچ در پیچ اور اخلاق سے گری ہوئی کہانیوں کو بھی صاف اور ستھرا کر کے لکھا ہے اور اس طرح لکھا ہے کہ ان سے اخلاقی سبق ہی حاصل ہوتے ہیں۔ زبان اور طرز بیان کے متعلق تو کچھ کہنا نہیں۔ بچوں کے پرانے ادیب ہیں۔ امید ہے کہ اسکولوں اور لائبریریوں میں بچوں کے لئے اسے ضرور مہیا کیا جائے گا۔ آخری کتاب "اچھی کہانی" میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ ہے اور اسے بھی مصنف نے اپنے مخصوص انداز میں خوب لکھا ہے۔

سچی کہانیاں از عندلیب شادانی (پریم پجاری) ملنے کا پتہ: کتب خانہ علم وادب دہلی۔ صفحات ۲۷۲ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ قیمت سے/ کاغذ، کتابت طباعت اچھی۔

یہ پندرہ کہانیاں سچی ہوں یا جھوٹی، لیکن چونکہ دلچسپی واقعات اور اس کے نتائج پر مرکوز ہے اس لئے پہلی دفعہ پڑھنے میں خصوصاً بہت دلچسپ معلوم ہوتی ہیں۔ اور افسانہ نگار کہانی کہنے یعنی افسانے کو اور حقیقت کو افسانہ بنا دینے کے گُر سے واقف معلوم ہوتا ہے ـــــ تقریباً تمام افسانے جذبہ ہیں جس سے افسانہ نگار کی غم پسندی واضح ہوتی ہے لیکن پڑھنے والا اس ہجوم بلا سے اکثر اکتا جاتا ہے۔ طرز بیان کے لحاظ سے افسانوں کا یہ مجموعہ تفریحی ادب میں ایک اچھا اضافہ ضرور ہے۔

مولانا حیدر حسن خاں از رئیس احمد جعفری ندوی، صفحات ۶۰، سائز ۲۲×۱۶/۲۰، قیمت ۱۲ ار
ملنے کا پتہ۔ منیجر آفتاب اکاڈمی، تیکراشریٹ بمبئی، کاغذ، طباعت، کتابت معمولی۔

آفتاب اکاڈمی کے سلسلہ کی پہلی کتاب ہے۔ رئیس احمد صاحب اپنے گزرے ہوئے محسنوں اور دوستوں کو یاد کرتے ہیں۔ مولانا حیدر صاحب ندوہ کے سابق مہتمم اور شیخ الحدیث تھے۔ ان کے اوصاف حمیدہ اور جعفری صاحب کو جو عقیدت ان سے تھی اس کو دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ قیمت کچھ کم ہونا چاہیئے تھی۔

مصنف رسالے:۔ مدیر سید الطاف علی صاحب بریلوی بی اے (علیگ)، صفحات ۱۴۸، سہ ماہی،
سائز ۲۲×۲۰/۲۶، قیمت سالانہ للعہ، ملنے کا پتہ۔ کانفرنس کمپاونڈ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ۔ کاغذ اچھا، کتابت وطباعت معمولی۔

رسالہ "مصنف" کا چوتھا نمبر پیش نظر ہے۔ علی گڈھ میں ایک مجلس مصنفین قائم ہوئی ہے جس کے سکرٹری الطاف علی صاحب ہیں۔ اس مجلس میں وقتاً فوقتاً مقالے پڑھے جاتے ہیں جن کو یکجا کر کے یہ رسالہ مرتب کیا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ زیادہ تر یہ مقالے تحقیق اور کاوش سے لکھے جاتے ہیں اور قابل مطالعہ ہوتے ہیں۔ علی گڈھ میں اس مجلس کا قیام اور اس رسالے کا اجرا دنیائے علم وادب کے لئے بڑا مستحسن قدم ہے اور امید ہے کہ بریلوی صاحب کے زیر انتظام اسے ضرور استقامت نصیب ہوگی۔

پیام ادب ماہنامہ۔ مدیر سید عبدالوہاب، ناشر ادارۂ اشاعت اردو، حیدرآباد دکن۔ صفحات ۴۸،
سائز ۲۰×۳۰/۲۰، قیمت فی پرچہ ۸ر سالانہ ۔ ؎ ر کاغذ، کتابت، طباعت بہت اچھی۔

ستمبر ۱۹۴۳ء سے یہ رسالہ نکلنا شروع ہوا ہے۔ مقصد بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ادب کی خدمت کے ساتھ ساتھ رسالہ "کتاب" و "کتاب نما" کی طرح اپنے ادارہ کی مطبوعات بھی ملک و شائقین ادب کے سامنے پیش کی جائیں۔ کاغذ بہت اچھا استعمال کیا ہے، طباعت اچھی ہے۔ اس لئے سالانہ قیمت پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ ورنہ ۴۸ صفحات کے ایک ادبی رسالے کے لئے یہ رقم یقیناً زیادہ ہے۔

م۔ م۔ ع

رجسٹرڈ ایل نمبر ۱۸۹۲
جلن، سوزش اور خراش
کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
NATIONAL MUSLIM UNIVERSITY
DELHI
مگر وہ آگ کی معمولی جلن کے علاج پر بھی اگر توجہ نہ کی جائے
تو اس سے خون میں زہر پھیل جانے کا خطرہ پیدا ہوتا ہے جیسے
ہی آپ کسی شے سے جل جائیں آپ جلنے کی جگہ پر فوراً جلمار
لگا دیجیے۔ خواہ آپ آگ سے جلے ہوں یا کھولتی ہوئی کسی ابلتی
شے سے جلمار فوراً درد کو دور کر دے گا۔ چونکہ اس میں تیز
(لیکن سوزش نہ کرنے والے) معقمی اجزا شامل ہوتے ہیں اس لئے
اس کے استعمال سے جراثیم نہیں پیدا ہونے پاتے، یہ چھالے
بھی نہیں پڑنے دیتا۔ مزید براں اس سے جلے ہوئے مقام پر
بہت جلد نئی کھال پیدا ہو جاتی ہے۔
ہر قسم کی جلن اور سوزش کو ٹھنڈک اور آرام پہنچانے کے
لئے جلمار اپنی مثال نہیں رکھتا۔ اس بات کا خیال رکھئے کہ
جلمار ہمیشہ آپ کے گھر میں موجود رہے۔ بجائے اس کے کہ
خون میں زہر پھیل جانے کے علاج پر کثیر رقم صرف کی جائے، یہ
زیادہ بہتر ہے کہ جلنے سے جراثیم نہ پیدا ہونے دئے جائیں۔
آج ہی اپنے قریب دواساز یا اسٹور سے اس کا
ٹیوب خرید لیجئے۔
آج ہی ایک ٹیوب خرید لیجئے
معلوم نہیں کس وقت
اس کی آپ کو ضرورت پڑ جائے
JALMAR HAS SAVED YOU!
جلمار
سارے دواسازوں اور اسٹوروں سے دستیاب ہو سکتا ہے

مکتبۂ جامعہ دہلی

جامعہ

زیر ادارت: نور الحسن ہاشمی ایم، اے

جلد ۳۹، نمبر ۳ | بابتہ ماہ ستمبر سنہ ۳۴ء | چندہ سالانہ صرفی پرچہ ۸/

فہرست مضامین

نئی کتابیں

مکتبے نے ابھی حال میں بچوں اور بڑوں کے لئے نہایت مفید اور معیاری کتابیں شائع کی ہیں۔ تفصیل سرورق کے اندرونی صفحات پر درج ہے۔ اگر آپ نے ابھی تک ملاحظہ نہ فرمایا ہو تو ایک نگاہ ضرور ڈال لیجیے۔

ایک اہم ادبی تحریک

پچھلے دو ڈھائی سال کے عرصے میں نئے ادب کے متعلق بہت سے مضامین اور مقالے لکھے جا چکے ہیں، اور گذشتہ آٹھ دس مہینوں سے تو ان کی تعداد اتنی زیادہ ہو گئی ہے کہ یہ بات قطعی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ "نیا ادب" موجودہ زمانے کا اہم ترین ادبی موضوع ہے۔

اب تک جو مضامین اور مقالے لکھے گئے ہیں ان سب میں ایک چیز مشترک ہے۔ یعنی کلی موافقت یا کلی مخالفت جس سے میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ نئے ادب کے تمام پہلوؤں پر نہ تو موافقین نے نگاہ ڈالی ہے اور نہ مخالفین نے۔ کیونکہ ایک ادبی تحریک کو تمام زاویہ ہائے نگاہ سے دیکھنے والا اس کی کلی موافقت یا مخالفت کر ہی نہیں سکتا۔ ہر ادب میں خوبیاں اور خامیاں دونوں ہوتی ہیں۔ تنقید نگار کا فرض ہے کہ وہ دونوں کو ظاہر کرے نہ کہ کسی ایک کو۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ میرا مضمون اس موضوع پر حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ البتہ اس میں اس بات کی کوشش ضرور کی گئی ہے کہ کوئی زاویہ نگاہ رہنے نہ پائے۔

نئے ادب کا لفظ کس نے اور کب ایجاد کیا مجھے صحیح معلوم نہیں۔ لیکن جہاں تک مجھے علم ہے لکھنؤ میں [illegible] میں "ترقی پسند مصنفین" کی ایک انجمن قائم ہوئی۔ اس کے اراکین نے ایک نئی قسم کی تحریریں لکھنی شروع کیں جن کا نام بعد میں "نیا ادب" پڑ گیا۔ اس طرح اس تحریک کو اس وقت تقریباً سات سال ہو چکے ہیں۔ موجودہ دور میں، جو بجا طور پر "عہدِ رفتار" کہلاتا ہے کسی تحریک کا اتنی مدت تک جاری رہنا بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ اس میں ہر دم ترقی کے [illegible] [illegible] کی [illegible] کے بعد تحریک کا باقاعدہ [illegible] ہم اس کا جائزہ لینا شروع کر دیں۔ [illegible] مضمون اسی قسم کی ایک جانب [illegible] کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ اس میں حسب ذیل عنوانوں کے ماتحت بحث کی جائے گی

(۱) تاریخی پس منظر
(۲) ابتدا اور ارتقاء
(۳) تنقید
(۴) مستقبل

تاریخی پس منظر دماغی حیثیت سے انسانوں کی تین قسمیں کی جا سکتی ہیں، ادنیٰ، اوسط اور اعلیٰ طبقہ۔ ادنیٰ تو ہمیشہ جانوروں کی طرح تن پروری اور تن آسانی کی فکر میں لگا رہتا ہے، اور اس کا دماغ غور و فکر کرنا جانتا ہی نہیں۔ طبقۂ اوسط کا دماغ تن پروری اور تن آسانی کے علاوہ انفرادی حیثیت سے اپنی ہستی کے متعلق بھی کبھی کبھی غور کر لیا کرتا ہے۔ لیکن اجتماعی حیثیت سے سوچنے کا اہل صرف طبقۂ اعلیٰ کا دماغ ہوا کرتا ہے۔ اس آخری قسم کے دماغ والے انسان ہمیشہ اس فکر میں رہتے ہیں کہ کس طرح بنی نوع انسان کی تکلیفیں دور کی جائیں اور اطمینان قلب حاصل کیا جائے۔ یعنی وہ ہمیشہ نوع انسانی کی مادی اور روحانی ترقی کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔

قسم اعلیٰ کے دماغ رکھنے والے انسانوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے اور قسم اوسط کی زیادہ اور قسم ادنیٰ کی بہت زیادہ۔ حکومت اور مذہب کی باگ ڈور بالعموم مؤخرالذکر لوگوں کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ لہٰذا سوسائٹی ہر حال میں مقرر راستوں پر چلنے کے لئے مجبور ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ یہ جبر سوسائٹی کے لئے طبیعت ثانیہ بن جاتا ہے اور وہ خود تغیر کو ناپسند کرنے لگتی ہے۔ عام اس سے کہ تغیر برائے بہتر ہو یا برائے بدتر۔ لیکن قسم اعلیٰ کے دماغ (جن کا شمار قسم اعلیٰ میں ہے ہی)، اس لئے کہ وہ عام روش سے ہٹ کر چلنے کی قابلیت رکھتے ہیں، سوسائٹی کے اس طرز عمل کو آنکھ بند کر کے قبول نہیں کر سکتے۔ وہ ہر زمانے کے "ترقی پسند" عناصر ہوتے ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ ترقی پسندی کسی خاص ہی زمانے سے مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ اس کا وجود ہر زمانے میں پایا جاتا ہے۔

اگر تاریخ عالم پر نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ترقی پسندی کا دور جدید یورپی نشاۃ ثانیہ سے شروع ہوتا ہے اور یہی دور جدید معرض بحث میں ہے۔ نشاۃ ثانیہ ایک عام ذہنی بیداری تھی جو یورپ کے صدیوں کے جمود و تاریکی کے بعد ظہور پذیر ہوئی۔ جب انسان سینکڑوں سال کے خواب غفلت کے بعد بیدار ہوا تو سب سے پہلے اس کی نگاہ فطرت کے طبیعی مظاہر پر پڑی۔ لہٰذا اُس نے سب سے پہلے انھیں پر اپنی توجہ صرف کی۔ اس طرح علوم طبیعی (طبیعیات، کیمیا، حجریات، فلکیات، حیاتیات وغیرہ) کی بنیاد پڑی۔ مدت تک قوانین فطرت کے انکشافات نے اس کو محو حیرت بنائے رکھا اور اسے خود اپنے متعلق غور و فکر کرنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ کئی صدیوں کے بعد، جب وہ قوانین فطرت سے کسی قدر مانوس ہو گیا تو اس نے انھیں قوانین کی روشنی میں اپنا جائزہ لینا شروع کیا۔ اس طرح علوم معاشرتی (معاشیات، سیاسیات وغیرہ) کی بنیاد پڑی اور انسان پہلی بار اس قابل ہوا کہ اپنی اجتماعی حیثیت کا سائنٹیفک طریقے سے مطالعہ کر سکے۔

لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط ہوگا کہ معاشرتی علوم کی پیدائش سے پہلے معاشرتی مسائل بھی نہیں تھے۔ یہ مسائل تو ابتدائے آفرینش سے موجود نہیں تھے۔ لیکن ابھی تک ان کا سائنٹیفک طریقے سے مطالعہ نہیں کیا گیا تھا۔ ابھی تک معاشرتی مسائل کے جو حل موجود تھے وہ سب کے سب مذہبی تھے اور ان کی تخلیق اور ارتقاء میں انسان کی رائے کو کوئی دخل نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی چیز کو سائنٹفک مطالعے اور تجربے سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔

معاشرتی علوم کا بانی کوئی ایک شخص نہیں تھا۔ بلکہ ایک خاص قسم کا اجتماع حالات تھا جو ان کی پیدائش کا باعث بن گیا۔ نشاۃ ثانیہ کے بعد علوم طبیعی کی ترویج و ترقی کی بدولت یورپ تھوڑے ہی عرصے میں کچھ سے کچھ ہو گیا۔ جہاں پہلے خانقاہوں کے اندر پادریوں میں الٰہیاتی بحث و تکرار، اور ان کے باہر لوگوں میں خدا کی [illegible] پیدا کرتی تھی وہاں دولت کی فراوانی اور ماکولات و مشروبات کے انبار نظر آنے لگے تھے۔ یورپ میں

صدیوں کے اندر ایک قطعی زرعی ملک سے ایک قطعی صنعتی ملک ہو گیا۔ اسی واقعے کا نام تاریخ میں "صنعتی انقلاب" ہے۔ صنعتی انقلاب اول اول تو بالکل "جنت ارضی" معلوم ہوتا تھا کیونکہ ایشیا، افریقہ اور امریکہ کی دولت سے یورپ کا ہر متنفس، حتیٰ کہ بھک منگے تک، مستفید ہوئے۔ اور وہاں کا عام معیار زندگی بلند ہو گیا۔ لیکن یہ "جنت ارضی" بہت جلد "جنت شداد" ثابت ہوئی۔ صنعتیت کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اگر صنعتیں حکومت کے زیر اہتمام نہ ہوں تو دولت گویا اپنا مرکز ثقل تلاش کر لیتی ہے یعنی چند مخصوص جیبوں میں جانے لگتی ہے۔ اور دوسرے اس سے محروم ہونے لگتے ہیں۔ یہیں سے سرمایہ پرستی شروع ہوتی ہے۔ اور اس کی لعنتوں سے موجودہ زمانے کا انسان اتنا باخبر ہے کہ توضیح کی ضرورت نہیں۔ بہرحال یورپ میں صنعتی انقلاب کے بعد، اور اس کے نتیجے کے طور پر معاشی توازن درہم برہم ہو گیا۔

یہ تھے ایک قسم کے حالات، دوسرے قسم کے حالات وہ تھے جن کے زیر اثر انسان نے پہلے فطرت کے طبیعی مظاہر پر اور پھر اپنی ہیئت اجتماعی پر غور کیا تھا اور جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ ضرورت، جو ایجاد کی ماں ہے، اور انسانی دماغ جو ایجاد کا باپ ہے، ایک وقت میں جمع ہو گئے۔ نتیجہ ظاہر ہے! معاشرتی علوم کی ابتدا تقریباً اٹھارھویں صدی عیسوی کی ابتدا سے ہوئی۔ اس کے بعد یورپ کے مختلف ملکوں میں مختلف اہل فکر پیدا ہوئے۔ جنہوں نے ان علوم کی تحقیق بڑی کاوش اور جگر سوزی سے کی۔ معاشرت کے عناصر ترکیبی چار ہیں۔ معشیت، سیاست، مذہب اور جنس۔ معشیت اور سیاست کے متعلق سب سے زیادہ ہمہ گیر اور انقلاب انگیز نظریہ ایک جرمن مفکر کارل مارکس نے پیش کیا۔ اس نے دنیا کو ایک ایسے معاشرے کے تصور سے روشناس کرایا جس میں امیروں اور غریبوں کے طبقے نہ ہوں، جس میں [illegible] تقسیم [illegible] ہر شخص کو جس [illegible] نہ تو پاک [illegible] ہوں [illegible]

ایک ایسی ریاست کا تصور بھی پیش کیا جو اس قسم کے معاشرے کی تخلیق کا باعث اور اس کی بقاء کا ضامن ہو سکے۔ جہاں تک اس نظریے کے مقاصد کا تعلق ہے شاید کوئی معقول شخص ان کی مخالفت نہ کرے گا۔ لیکن کوئی معاشی نظریہ کامیاب نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ وہ اصولاً قابل عمل اور عملاً سوسائٹی کے تمام پہلوؤں پر حاوی نہ ہو۔ مارکس سے پہلے ہمہ گیر معاشی اور سیاسی مسائل کے جتنے حل تجویز کئے گئے تھے ان کی حیثیت شاعری سے زیادہ نہ تھی لیکن

آرزوؤں سے بنا کرتی ہیں تقدیریں کہیں!

مارکس کا نظریہ ایک مکمل دستور العمل تھا جو دنیا بھر کے "روٹی" کے سوال کا حل ایک نئے اور دلیرانہ طریقے سے تجویز کرتا تھا۔ صنعتی انقلاب کی لعنتوں کی بدولت یورپ ایک ایسے ہی حل کی تلاش میں تھا۔ چنانچہ جلد یا بدیر یورپ کے تمام بڑے مفکرین نے مارکس کے نظریے کی کم از کم اصولی تائید کی۔ اور وہاں کے ایک ملک نے تو اس نظریے کو عملی جامہ بھی پہنا دیا۔

مذہب کے متعلق کوئی ہمہ گیر نظریہ نہیں پیش کیا گیا جس کی وجہ یہ ہے کہ (جہاں تک میری نظر کام کرتی ہے) اہل یورپ نے مذہب کو کبھی اجتماعی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ وہ مذہب کو ہمیشہ ایک خالص مابعد الطبیعیاتی چیز سمجھتے رہے طبیعیاتی علوم کی چکا چوند سے مابعد الطبیعیاتی تفکر بھی ماند پڑ گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ کا مذہب فلسفۂ مادیت یعنی دہریت ہو کر رہ گیا۔ اس میں شک نہیں کہ کانٹ، ہیگل ہیوم، برگساں وغیرہ جیسے لوگوں نے مادیت سے بلند ہو کر بھی کچھ سوچا۔ لیکن مذہب کی اجتماعی حیثیت کی طرف ان کی بھی نگاہیں نہ گئیں۔ لہٰذا بحیثیت مجموعی یہ کہنا بالکل درست ہے کہ فلاسفۂ یورپ نے عمداً یا سہواً معاشرت کے ایک اہم جز یعنی مذہب کو نظر انداز کر دیا۔

جنسیات کے متعلق ایک ہمہ گیر نظریہ ڈاکٹر سگمنڈ فرائڈ نے پیش کیا۔ اس نظریے کا خلاصہ یہ ہے کہ جنس انسان کا قوی ترین جذبہ ہے جو انسان کے تمام خیالات کا جزو غالب اور تمام افعال میں کارفرما ہے۔ گویا انسان کا پورا کردار جنس ہی کی بنیاد پر استادہ ہے۔ اس جذبے کا کچھ حصہ سطح شعور کے اوپر رہتا ہے اور کچھ نیچے۔ اوپر کا حصہ شعوری اور نیچے کا تحت الشعوری کہلاتا ہے جب اس جذبے کو اپنی تسکین کا ذریعہ شعوری حصے میں نہیں ملتا تو یہ تحت الشعوری حصے کا رخ کرتا ہے۔ وہاں پہنچ کر یہ انسانی کردار کے مختلف عناصر پر اثر انداز ہوتا ہے چونکہ انسانی کردار کے مختلف عناصر تحت الشعوری حالت میں واضح اور امتیازی وجود نہیں رکھتے اس لیے جذبۂ جنسی کی رسائی تحت الشعور میں ایک قسم کی کش مکش پیدا کر دیتی ہے جس کو نفسیات کی اصطلاح میں "الجھن" کہتے ہیں۔ ان الجھنوں کا انسان کے کردار پر زبردست اور برا اثر پڑتا ہے۔ چونکہ نوع انسانی کی فلاح بڑی حد تک افراد کے کردار سے وابستہ ہے اس لئے افراد کو ایسی الجھنوں سے بچ کر رہنے کی ضرورت ہے، لیکن موجودہ زمانے کے مہذب ممالک کی معاشرتوں میں اس جذبے کی تسکین کا خاطر خواہ انتظام نہیں ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایسے ملکوں کے زیادہ تر باشندے نفسیاتی الجھنوں میں مبتلا ہیں۔ اور خود اس حقیقت کا نتیجہ یہ ہے کہ مہذب انسانوں کی صحت اور اخلاق دونوں آئیڈیل سے بہت پست ہیں۔ فرائڈ کا مطمح نظر ایک ایسی سوسائٹی کی تخلیق ہے۔ جس میں اس قسم کی نفسیاتی گتھیوں کے پیدا ہونے کے امکانات کم سے کم ہوں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ان تمام ترقی پسند عناصر میں سے جن کو سب سے زیادہ قبولیت عام ہوئی وہ مارکس اور فرائڈ کے نظریات ہیں۔ ان کی وجہ یہ ہے کہ ان کی بنیادیں دو زبردست انسانی محرکات یعنی بھوک اور جنس پر قائم ہیں۔ اور یہ واقعہ ہے کہ ان دونوں محرکات کے عمل اور رد عمل سے جو مسائل پیدا ہوتے ہیں اگر ان کا کوئی قابل عمل حل دستیاب ہو جائے تو انسان کے گویا دو تہائی مسائل حل ہو گئے۔

یورپ کے نشاۃ ثانیہ اور صنعتی انقلاب کا دائرہ اثر رفتہ رفتہ وسیع ہو کر ان ملکوں تک پہنچنے لگا جو یورپی ملکوں کے زیر نگیں تھے۔ ہندوستان کے دور جدید کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء اہم ترین سال ہے۔ اس لئے نہیں کہ اس میں وہ مشہور ہنگامہ ہوا جو غدر کہلاتا ہے یہ ہنگامہ بجائے خود کوئی زیادہ اہم واقعہ نہیں تھا۔ چند فوجیوں کا بغاوت کرنا اور اس کے نتیجے کے طور پر چند نام نہاد اور دائم المریض ریاستوں کا دم توڑ دینا بجائے خود کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ اہمیت کی وجہ یہ ہے کہ اہل یورپ کی آمد کے بعد سے عہد قدیم رفتہ رفتہ ختم ہو رہا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد عہد جدید کا تخم زمین توڑ کر پودا بن کر باہر نکل آیا اور کھلی ہوا میں سانس لینے لگا۔ اس سال کے بعد سے تقریباً سارا ہندوستان انگریزوں کے قبضے میں آگیا اور ایک مستحکم حکومت کی بنیاد پڑی۔ علوم و فنون کی ترقی کے لئے ایسی حکومت ناگزیر ہے۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء تک ہندوستان کی عام تعلیمی حالت (بہ استثنار بنگال کے) تقریباً صفر کے برابر تھی اور صحیح معنوں میں عام تعلیم اس کے بعد شروع ہوئی۔ یورپ میں نشاۃ ثانیہ کے بعد سے علوم و فنون میں جو ترقیاں ہو چکی تھیں، ان سے ہندوستان کو روشناس ہونے کا موقع اب جا کر حاصل ہوا۔

یہ تو ہے ہندوستان کے دور جدید کی تاریخ پر خارجی اثرات کا خاکہ۔ اب اس عہد کی داخلی تاریخ پر نظر ڈالنی ہے۔ داخلی تاریخ سے مراد معاشرتی تاریخ ہے۔ معاشرتی تاریخ سیاسیات، معیشت، مذہب اور صنعتوں کی تاریخ پر مشتمل ہوتی ہے۔ ہندوستان کے دور جدید میں سیاست اور معیشت کچھ اس طرح گتھی ہوئی ہیں کہ ان کو علیحدہ کرنا مشکل ہے۔ مسلمانوں کا زوال تو اورنگ زیب عالمگیر کے عہد سے شروع ہو گیا تھا۔ لیکن ہندوستان کا وہ خاص معاشرتی [illegible] جو ہندوؤں اور مسلمانوں کی صدیوں کی ہم وطنی سے پیدا ہو گیا تھا مسلمانوں کے زوال کے بعد بہت دیر تک باقی رہا۔ بلکہ [illegible] تک [illegible] یورپ [illegible] سے اس ڈھانچے کے ساتھ پیدا کر کسی قدر [illegible]

صدی اور نصف انیسویں صدی کے عرصے میں ہندوستان اس حالت کو پہنچ گیا کہ وہ
ایک طرف تو سوا خام اشیاء کے اور کوئی چیز پیدا نہ کرسکے اور دوسری طرف تمام
صنعتی اشیاء کے لئے یورپ کا دست نگر رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زمین پر آبادی کا بوجھ
بڑھ گیا۔ یعنی ہندوستان کی زیادہ تر آبادی کو اپنی روزی زمین سے پیدا کرنے پر مجبور ہونا
پڑا۔ ہندوستان کی زمین کی پیداواری صلاحیت جو پہلے ہی سے محدود تھی، اور بھی کم ہوگئی
اس کا ایک نتیجہ عام افلاس کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اگر بات یہیں تک رہتی تب بھی غنیمت
تھا۔ لیکن ہندوستانیوں کی اپنی صنعتوں کا فقدان اور یورپی مصنوعات کا سیلاب

سمندِ ناز پہ اک اور تازیانہ ہوا

یعنی مفلسی میں آٹا گیلا ہوگیا۔ ہندوستان کی رہی سہی دولت بھی ڈھل ڈھل کر یورپ کو
جانے لگی۔ یہاں کا معیار زندگی تو بلند ہوگیا لیکن آمدنی کی ترقی کی رفتار بہت سست رہی
نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کا معاشی توازن بہت جلد درہم برہم ہوگیا۔

چونکہ اہل ہند کا عروج بنگال سے شروع ہوا تھا۔ لہذا سب سے پہلے بنگال ہی میں
ان کی معاشی پالیسی کے اثرات محسوس کیے گئے۔ چنانچہ وہاں کے ڈیڑھ سو سال پہلے کی
تاریخ میں وہی عناصر کارفرما نظر آتے ہیں جو ہندوستان کے دوسرے حصوں کی تاریخ
میں بہت بعد میں ظاہر ہوئے۔ ہندوستان کے ان حصوں میں اس پالیسی کے اثرات
۱۸۵۸ء کے بعد ظاہر ہونا شروع ہوئے۔ چونکہ بنگال ہندوستان کا محض ایک چھوٹا سا
ٹکڑا ہے۔ اس لئے جو معاشی تبدیلیاں وہاں ۱۸۵۸ء سے پہلے ہوچکی تھیں وہ ملک کی
مجموعی حالت کے پیش نظر کچھ زیادہ اہم نہیں کہی جاسکتیں۔ ہندوستانی معیشت کے
دورِ جدید کی ابتدا مجموعی طور پر ۱۸۵۸ء کے بعد ہی سے سمجھنی چاہیے۔

ہندوستان کے دورِ جدید کی مذہبی تاریخ بجائے خود کوئی اہمیت نہیں رکھتی کیونکہ
[illegible] کے عروج سے ہندوستان کے مذاہب پر براہِ راست کوئی [illegible]

نہیں بدلا۔ لیکن اگر مذہب اور معاشیات پر ایک ساتھ نگاہ ڈالی جائے تو ایک نہایت ہی
اہم فرق کا احساس ہوتا ہے۔ ہندوستان میں اسلامی حکومت کے قائم ہوتے ہی یہاں کی معاشیات
دو مذہبوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ مسلمانوں نے زیادہ تر سرکاری ملازمت اور زمینداری اختیار کی تھی
اور ہندوؤں کے حصے میں بیشتر زراعت، صنعت و حرفت اور تجارت آئی تھی۔ یہ حالت کم و بیش
۱۸۵۷ء تک باقی رہی۔ اگرچہ یورپی اقتدار کی ترقی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی سرکاری ملازمت
اور ہندوؤں کی حرفت و تجارت میں بتدریج کمی ہوتی جا رہی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد
مسلمان قوم خاص طور پر معتوب قرار دی گئی۔ اعلیٰ دفتر کی زبان کچھ پہلے سے فارسی کی بجائے انگریزی
ہو چکی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی معاش کا ایک زبردست ذریعہ دفعتہً اُن کے ہاتھوں سے نکل
گیا۔ انگریزی زبان سیکھنے سے مسلمان مدت تک کتراتے رہے۔ کچھ تو اپنی دیرینہ حکومت کے
نشے میں، کچھ احمقانہ تعصب کی وجہ سے اور کسی قدر بے جا احساس برتری کی بنا پر۔ پھر وہ سرکاری
ملازمتوں کے اہل کیوں کر ہو سکتے تھے؟ مسلمانوں کی معاش کے دوسرے ذریعے یعنی زمینداری
پر براہ راست حملہ تو نہیں ہوا لیکن اول تو زمین بہت تھوڑے لوگوں کے پاس تھی۔ دوسرے
جو کچھ بھی تھی نہایت تیزی کے ساتھ آنے والی نسلوں پر تقسیم ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اس سب کا نتیجہ
یہ ہوا کہ مسلمان قوم معاشیات کے لحاظ سے بہت پیچھے رہ گئی۔ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے۔ یورپی
اقتدار کے عروج سے ہندوؤں کی معاشی حالت بھی بہ حیثیت مجموعی بدتر ہو گئی تھی۔ لیکن انھوں نے
اپنی صنعت اور تجارت کی کمی کو انگریزی زبان سیکھ کر سرکاری ملازمت حاصل کر کے کسی حد تک پورا
کر لیا لیکن مسلمانوں کو اپنی کھوئی ہوئی معاشی پوزیشن حاصل کرنے میں بہت عرصہ لگا۔ بلکہ یہ کہنا
زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ اس پوزیشن کو اس وقت تک حاصل نہ کر سکے۔

اب ہندوستان کے دور جدید کی [illegible] تاریخ پر نگاہ ڈالنی ہے۔ ہندوستان کا اقتدار
[illegible] سے یہاں کے رہنے والوں کی [illegible] ملکیت ہو کر رہ گیا تھا۔ اور اس کی حیثیت [illegible]
[illegible]

وہ اس معاملے میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں کچھ زیادہ فرق نہ تھا۔ اس کے دو سبب تھے۔ اوّل یہ کہ ہندوستانیوں کے مزاج میں بالعموم جنسی رقابت کا جذبہ شدید ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی عورتوں کو "مالِ عرب" بنا کر رکھنے کے لئے مجبور تھے اور ہیں۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ مغربی علوم کی ترویج سے پہلے یہاں کی تعلیم "عقلی" کم اور "نقلی" زیادہ تھی جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ لوگ عام طور پر مقررہ شاہراؤں سے ہٹ کر چلنا یا مسلّم خیالات یا اعتقادات سے الگ ہو کر سوچنا جانتے ہی نہ تھے۔ پہلا سبب تو اب بھی کارفرما ہے۔ لیکن دوسرا سبب اپنی پوری قوت کے ساتھ صرف اس وقت تک مصروفِ عمل رہا جب تک کہ یہاں مغربی تعلیم کی ترویج عام طور پر نہیں ہو سکی اور یہ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ ہندوستان میں عام مغربی تعلیم کے رواج کے امکانات ۱۸۵۷ء کے بعد ظاہر ہوئے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ ۱۸۵۷ء ہندوستان کے دورِ جدید کی خارجی اور داخلی دونوں تاریخوں میں اہم ترین سال تھا اور اس سال کے ہنگامے کے جو اثرات بیان کئے گئے ان میں اہم ترین بات یہ تھی کہ مسلمانوں میں اپنی سیاسی، معاشی اور مذہبی پوزیشن کے کھوئے جانے کا احساس یک لخت بیدار ہوا (ہندوؤں میں اس قسم کی بیداری بعد میں پیدا ہوئی جس کا ذکر آگے آئے گا۔) اس طرح (۱) ہندوستانیوں کا بالعموم اور مسلمانوں کا بالخصوص تباہی ادبار و فلاکت (۲) مسلمانوں کی بیداری احساس اور (۳) مغربی علوم اور طرزِ فکر کا رواج ——— یہ تین مختلف قسم کے عوامل بیک وقت مجتمع ہو گئے۔ اس کا نتیجہ ایک اسلامی اصلاحی تحریک کی شکل میں ظاہر ہوا جس کے علم بردار سرسید، مولانا حالی، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا آزاد، اکبر الہ آبادی اور مولانا شبلی تھے۔ ان سب کی تقریر و تحریر، نظم و نثر میں انہی تینوں عوامل کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ یہ اسلامی اصلاحی تحریک اپنی نوعیت کے اعتبار سے معاشرت کے جملہ پہلوؤں پر حاوی تھی، لیکن جو لوگ صرف اس کی ظاہری شکل و صورت پر نگاہ رکھتے ہیں، وہ اسے ایک خاص ادبی تحریک سمجھتے ہیں۔ حالانکہ [illegible]

مگر صحیح ہے کہ اس تحریک کا ادب بجائے خود کافی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ ادب ان تمام رجحانات کا آئینہ ہے جو ۱۸۵۷ء کے بعد ظاہر ہوئے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے کے مفکرین ان رجحانات سے کس طرح متاثر ہوئے اور ان میں کیا ردعمل ہوا۔ سرسید کے مضامین، حالی کی اخلاقی نظمیں، نذیر احمد کے اخلاقی ناول، آزاد کی آزاد نظمیں، اکبر کی طنزیہ شاعری، شبلی کی سیرت نگاری، سب آئینہ دار ہیں اس آویزش کے جو ۱۸۵۷ء کے بعد قدیم و جدید میں واقع ہوئی۔ اور ان سب میں رجعت پسندی کی پیوندکاری نظر آتی ہے۔ اردو ادب کی وہ مخصوص فضا جو ان ادیبوں کی کوششوں سے پیدا ہوئی، انیسویں صدی کے آخر تک باقی رہی۔

۱۸۵۷ء سے کر ۱۹۰۵ء تک کے عرصے میں مسلمانوں میں مغربی تعلیم کا کافی رواج ہو گیا۔ اب انھیں بھی سرکاری ملازمتیں آسانی سے ملنے لگی تھیں۔ اس بات نے مسلمانوں کے متوسط طبقے میں کچھ عرصے ایک عارضی اور مصنوعی خوش حالی پیدا کر رکھی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرسید وغیرہ کی تحریک آہستہ آہستہ ماند پڑنے لگی اور مولانا حالی کی وفات کے بعد بالکل ختم ہو گئی۔ اصلاحیت کی تحریک چونکہ ایک معاشرتی تحریک تھی اس لئے اس کا تعلق براہ راست یہاں کی واقعاتی زندگی سے تھا۔ لیکن محولۂ بالا عارضی اور مصنوعی خوشحالی نے ایک طرف تو مسلمانوں کے متوسط طبقے کو یہاں کی واقعاتی زندگی سے علیحدہ کر دیا اور دوسری طرف اس طبقے کی طبیعت میں وہ ذہنی تعیش پسندی پیدا کر دی جو سیاسی کامرانی اور دولت کی فراوانی کی بدولت بعض مغربی ملکوں کے مذاقِ عامہ میں داخل ہو چکی تھی۔ یہی چیز ابتداء تھی اس کی نمو کی جو اردو ادب کی تاریخ میں "رومانیت" کہلاتی ہے۔ گزشتہ جنگ عظیم تک یہ دو ایک منظم تحریک کی صورتیں ظاہر نہیں ہوئی۔ لیکن اس کے بعد باقاعدہ یلدرم، سجاد حیدر، مجنوں گورکھپوری، [illegible] احمد، [illegible] وغیرہ کی کوششوں سے [illegible] ایک تحریک کی شکل میں نمودار ہوئی۔ ان حضرات نے اردو ادب کو

خیالستانی جزیروں اور لالہ زار جنیا بانوں کی خوب خوب سیریں کرائیں لیکن چونکہ ان کی
حسین و جمیل خیال آرائیوں کا ہندوستان کے "حقیقاتی" دوزخوں اور خارزار ریگستانوں سے کوئی علاقہ
نہ تھا۔ اس وجہ سے تحریک رومانیت زیادہ عرصے تک نہ چل سکی۔ اور تقریباً ۱۹۳۲ء تک ختم ہو گئی

مسلمانوں کی طرح ہندو بھی پہلے اصلاحی دور سے گزرے۔ لیکن ان کی اصلاحی
تحریکیں اسلامی تحریک کے بعد ظاہر ہوئیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ادبار و فلاکت کا وجود اور
مغربی علوم اور طرز تفکر کا رواج، یہ دو عوامل تو ہندوؤں میں اسی طرح موجود تھے جس
طرح کہ مسلمانوں میں تھے۔ لیکن تیسرا عامل یعنی بیداری احساس ہندوؤں کے یہاں (بنگال
سے قطع نظر کرتے ہوئے) ابتدا میں مفقود تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ہندو صدہا سال سے
محکومیت کے عادی چلے آرہے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں نہ تو ان کی کوئی
سلطنت چھنی، نہ ان کے قومی وقار کو کوئی صدمہ پہنچا۔ پھر ان میں بیداری احساس
ہوتی تو کیونکر؟ لیکن کچھ تو اسلامی تحریک کے اثر نے اور کچھ مغربی تعلیم نے رفتہ
رفتہ ان کی رگ احساس کو بھی بیدار کر دیا۔ اور انیسویں صدی کے ربع آخر میں دو خالص
ہندو تحریکیں ظاہر ہوئیں۔ مذہبی رنگ میں "آریہ سماج" کی تحریک اور سیاسی لحاظ
سے انڈین نیشنل کانگرس کی تحریک۔ اگرچہ کانگریسی تحریک کا سنگ بنیاد ایک انگریز
سوبلیں کے ہاتھوں نے رکھا، لیکن میں نے اس کو ایک خالص ہندو تحریک اس لئے
کہا کہ اس سے مسلمان ابتدا میں بالکل علیحدہ رہے۔ اور بیشتر ہندو ہی اس کے کرتا دھرتا
رہے۔ اسلامی اصلاحی تحریک کی طرح یہ دونوں تحریکیں بھی نیم رجعت پسندانہ اور
نیم ترقی پسندانہ تھیں۔ اور یہ حالت یہاں بھی گذشتہ جنگ عظیم تک جاری رہی۔

اب گذشتہ جنگ کے زمانے کو دیکھنا اور اس کے اثرات پر غور کرنا ہے۔ جیسا کہ
اوپر عرض کیا جا چکا ہے۔ معاشرت کے عناصر ترکیبی چار ہیں۔ معیشت، سیاست،
مذہب اور جنس۔ پہلے معاشی حیثیت پر غور کرتا ہے۔ اگرچہ حکومت کی پالیسی [illegible]

یہ تھی کہ ہندوستان میں صنعتی دور محدود رہے۔ لیکن جنگ کی ضرورتوں کے آگے
حکومت کی بھی نہ چل سکی۔ جنگ شروع ہوتے ہی تقریباً ساری بحری شاہراہیں مسدود
ہوگئیں۔ اور ہندوستان کی درآمد یک لخت موقوف ہوگئی۔ کچھ ہندوستانی پبلک
کے خیال سے۔ لیکن زیادہ تر جنگی ضرورتوں کی وجہ سے حکومت کو یہاں چند جدید قسم
کی صنعتیں مجبوراً قائم کرنی پڑیں۔ چنانچہ احمدآباد، بمبئی، ناگپور اور کانپور میں پارچہ
بافی کے نئے کارخانوں کا قیام اور جمشید پور میں ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی کا استحکام
انہی جنگی ضروریات کا نتیجہ تھا۔ اس کے علاوہ اور بہت سی چھوٹی صنعتیں، مثلاً شکر
اور دیا سلائی کے کارخانے بھی، جنگ کے باعث وجود میں آئے۔ بہرحال جنگ کے
بعد کا ہندوستان قبل از جنگ کے ہندوستان سے کافی مختلف تھا۔ اور یہاں
دورِ صنعتیت کی قطعی طور پر بنیاد پڑ چکی تھی۔ اس وقت سے یہاں کی صنعتیت برابر
ترقی کر رہی ہے۔ اور موجودہ جنگ کے گذشتہ دو سال کے اندر تو وہ بہت آگے
پہنچ گئی ہے۔ جنگ عظیم کے اختتام پر خلافت اور عدم تعاون کی تحریک نے بھی
ہندوستان کی نوزائیدہ صنعتیت کو کافی تقویت پہنچائی۔ ہندوستانیوں میں عام طور
پر "سودیشی" اور "بدیشی" کا احساس پیدا ہوگیا۔ اور یہ تاریخ کا سبق ہے کہ دورِ صنعتیت
کے آغاز میں اس قسم کا احساس پیدا ہونا نہایت ضروری ہے۔ صنعتیت کے فروغ سے
زیادہ تر ہندوستانی سوسائٹی کے دو گروہ مستفید ہوئے، یعنی طبقۂ اعلیٰ کے سرمایہ دار
اور طبقۂ ادنیٰ کے نیم تعلیم یافتہ افراد۔ متوسط طبقے کو اس سے کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچا
کیونکہ اس طبقے کے افراد کا ذریعہ معاش یا تو زمین تھی یا سرکاری ملازمت یا دوسرے [illegible]
[illegible] اور صنعتیت کی ترقی نے [illegible] پر کوئی خاص اثر نہ ڈالا اور [illegible]
[illegible]
[illegible]

حالات عارضی طور پر کچھ بہتر ہوگئی۔ لیکن جنگ کے زمانے کے بے تحاشا اخراجات اور مجنونانہ اسراف کے نتائج بعد میں ظاہر ہوئے۔ ان میں سے ایک نتیجہ یہ تھا کہ ملازمتوں میں تخفیف اور موقوفی کا بازار گرم ہوا۔ اور سنہ ۲۲ء اور سنہ ۳۲ء تک ملازمت پیشہ طبقے کی حالت بہت ردّی ہوگئی۔ اس کے بعد سے ۱۹۳۹ء تک حالات اور زیادہ خراب ہوتے گئے۔ لیکن موجودہ جنگ کے چار سال میں اس طبقے کی حالت بہت کچھ سدھر چکی ہے۔ مگر یہ کیفیت گزشتہ جنگ کی طرح محض عارضی ہے۔ اس جنگ کے بعد ممکن ہے حالات پہلے سے بھی زیادہ خراب ہوجائیں۔

سیاسی حیثیت سے بھی پچھلی جنگ کا زمانہ خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں ہندوستانیوں نے ہر لحاظ سے دل کھول کر امداد کی اور فطرتاً ان کے دلوں میں یہ اُمید قائم ہوگئی کہ اس کارگزاری کے صلے میں جنگ کے بعد ہندوستانیوں کو کچھ سیاسی حقوق ملیں گے۔ لیکن جنگ کے بعد ہندوستان کو جو سیاسی حقوق ملے وہ ملک کی بیشتر سیاسی جماعتوں کے نزدیک ناکافی تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی خالص اصلاحی تحریکیں جو اب تک گنگا اور جمنا کی طرح الگ الگ بہہ رہی تھیں۔ اختتام جنگ کے تھوڑے ہی عرصے بعد آپس میں مل گئیں اور ان کا "الہ آباد" وہ عملی وفاق تھا جو عدم تعاون اور خلافت کی متحدہ تحریک کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اگرچہ اس تحریک کی نوعیت سیاسی اور عمر بہت کم تھی۔ لیکن بہ حیثیت مجموعی اس کا خاصا اثر ہندوؤں اور مسلمانوں کی ساری معاشرت پر پڑا۔ ان دونوں قوموں کی تہذیبوں کے درمیان نقطہائے مَس پہلے کی نسبت زیادہ ہوگئے۔ یعنی دونوں میں قدامت پرستی کا زور کم ہونے لگا اور جدیدیت کا زور بڑھنے لگا۔ دوسرے الفاظ میں رجعت پسندانہ عناصر کم ہونے لگے اور ترقی پسندانہ عناصر نشوونما پانے لگے۔

مذہبی حیثیت سے گزشتہ جنگ کا زمانہ بجائے خود کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا لیکن جنگ کے فوراً بعد ہندوستان کے افق پر جو زبردست سیاسی تحریک نمودار ہوئی اس کے [illegible] بہت دوررس تھے اور جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے اس سے ہندوستان کی ساری معاشرت

مذہبی۔ ہندوستانی معاشرت کا اہم ترین پہلو مذہب ہی ہے جس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اس تحریک کے اہم ترین اثرات ہندوستان کے مذاہب پر مترتب ہوئے۔ لیکن یہ نتیجہ عملی حیثیت سے اتنا واضح نہیں ہے جتنا کہ منطقی حیثیت سے ہے۔ بات یہ ہے کہ ہندوستانی مذہب کے معاملے میں سخت جمود پسند واقع ہوئے ہیں اور اگر کسی تحریک کے نتیجے کے طور پر مذہبی معاملات میں ذرا سا بھی تغیر واقع ہو تو بہت بڑی بات سمجھنا چاہئے۔ اب یہ ایک حقیقت ہے کہ ۲۲-۱۹۲۱ء کی تحریک کے بعد ہندوؤں کی چھوت چھات اور مسلمانوں کی جارحانہ "بت شکنی" میں کچھ کمی ظاہر ہوئی اور ہندوستان کی یہ دو بڑی قومیں ایک دوسرے سے قریب تر ہو گئیں۔ اس میں شک نہیں کہ بعد کے سیاسی حالات نے ان کی درمیانی خلیج کو پھر وسیع کر دیا۔ لیکن باہمی مفاہمت کا جو بیج ۲۱-۱۹۲۰ء میں بویا جا چکا تھا وہ فنا نہیں ہوا اور اگر مناسب حالات مل جائیں تو بیج پنپ سکتا ہے۔

گذشتہ جنگ عظیم کا اور اس کے بعد کی سیاسی تحریک کا اثر ہندوستان کی جنسیات پر بھی پڑا۔ لیکن بالواسطہ اور صرف متوسط طبقے پر۔ ۲۱-۱۹۲۰ء کی سیاسی تحریک میں بعض ہندو عورتوں نے دل کھول کر حصہ لیا۔ چونکہ یہ ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئی چیز تھی اس لئے اس کا کافی اثر ہنود کے طبقۂ نسواں پر پڑا۔ ان میں بیداری کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اور تعلیم نسواں کا مسئلہ دفعتاً ایک زندہ اور قومی مسئلہ بن گیا۔ تعلیم اور آزادی میں چولی دامن کا ساتھ ہے اس لئے ہنود میں تعلیم نسواں کے ساتھ آزادیٔ نسواں بھی رواج پانے لگی۔ تعلیم اور آزادی کے نتائج بہ حیثیت مجموعی مفید ہوتے ہیں۔ لیکن تنقید نگار کا فرض ہے کہ ان کے مضر نتائج پر بھی نگاہ رکھے۔ ان مضر نتائج میں سے ایک بات تو یہ کہ ہندوؤں کے طبقۂ متوسط کا مسئلہ شادی پیچیدہ اور مشکل پڑ گیا۔ اور دوسری یہ کہ اس طبقے کے نوجوانوں میں احساس جنسی کی ایک نئی لہر پیدا ہوئی جس سے ہندوستانی اب تک نا آشنا تھے۔ ہندوستان میں اس احساس کی تسکین کے ذرائع اتنے آسان نہیں تھے جتنے کہ ان کے ملکوں میں جہاں

عورتوں میں تعلیم اور آزادی عام ہے۔ لہذا ہندوؤں کے متوسط طبقے کے نوجوانوں میں ایک قسم کی جنسی کش مکش شروع ہوگئی۔ تعلقات جنس پر اثر انداز ہونے والا اس کش مکش کا ایک سبب متوسط طبقے کا وہ اقتصادی انحطاط بھی تھا جو گذشتہ جنگ عظیم کے بعد رونما ہوا تھا۔ یہ تو تھا ہندوؤں کا حال۔ مسلمانوں میں تعلیم نسواں بہت بعد میں شروع ہوئی۔ اس لئے اس کے نتائج بطور خود ابھی تک ظاہر نہیں ہوئے۔ لیکن ہندو لڑکیوں کے ساتھ تعلیمی رفاقت نے مسلمان نوجوانوں کو ایک مدت سے متاثر کر رکھا ہے۔ یعنی ایک طرف تو اُن کے حسن و تہذیب کی کشش ہے اور دوسری طرف اپنی ہم مذہب عورتوں کی ناتراشیدگی۔ لیکن ابھی تک ہندوؤں اور مسلمانوں میں ازدواجی تعلق تقریباً ناممکن ہے۔ اس لئے مسلمانوں کے درمیانہ طبقے میں بھی جنسی کش مکش پائی جاتی ہے۔

آپ نے دیکھا کہ گذشتہ جنگِ عظیم کے بعد کا زمانہ معاشی، سیاسی، مذہبی اور جنسی حیثیت سے کتنا اہم اور تغیر آفریں عہد تھا۔ ان چاروں عوامل کی کار فرمائی سے ہندوستانی سوسائٹی کے چند حصوں میں ایک خاص قسم کا خمیر تیار ہوگیا جو اپنے اندر انقلابی جراثیم رکھتا تھا چونکہ ان عوامل سے سب سے زیادہ متوسط طبقہ متاثر ہوا تھا اس لئے اس خمیر کی پیدائش بھی اسی طبقے میں زیادہ ہوئی۔ جس زمانے میں ہندوستان کے اندر یہ خمیر تیار ہو رہا تھا۔ اتفاق سے اسی زمانے میں روس میں ایک نئی قسم کا تجربہ کیا جا رہا تھا یعنی اہل روس اپنی حکومت کی تنظیم مارکس اور فرائڈ کے اصولوں پر کر رہے تھے۔ تقریباً پانچ چھ سال کے عرصے میں جب روسیوں کو اپنے تجربے میں کامیابی نظر آئی تو انھوں نے اپنے طرز حکومت کا پروپاگنڈا شروع کیا۔ یہ ایک دوسرا اتفاق تھا کہ ہندوستان میں یہ پروپاگنڈا اُس وقت آنا شروع ہوا جب کہ یہاں کی معاشرتی فضا مارکس اور فرائڈ کے اصولوں کو قبول کرنے کے لئے نہایت ساز گار تھی۔ اس سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں روسی ادب اندازاً ۱۹۲۶ء سے مقبول ہونا شروع ہوگیا۔

موجودہ عنوان یعنی "تاریخی پس منظر" کا خلاصہ یہ ہے کہ ترقی پسندی کی موجودہ

[illegible]ء کے بعد سے شروع ہوئی تھی سنہ ۱۹۱۴ء تک اصلاحی دور میں رہی۔ سنہ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۲۹ء تک زمانہ نیم اصلاحی اور نیم رومانوی دور کہا جا سکتا ہے اور سنہ ۱۹۲۹ء کے بعد کا زمانہ یقینی طور پر انقلابی دور ہے حالانکہ رومانیت کا اثر تقریباً سنہ ۱۹۳۶ء تک باقی رہا۔

ابتدا، آثار اور ارتقاء اس انقلابی دور کی ابتداء دراصل نئے ادب کی بھی ابتدا ہے۔ یہ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ وہ مخصوص خمیر جو معاشی، سیاسی، مذہبی اور جنسی عوامل کے باہمی عمل اور ردعمل سے تیار ہوا تھا، سب سے پہلے یہاں کے متوسط طبقے میں رونما ہوا۔ اس طبقے کی جس جماعت پر ان عوامل نے سب سے زیادہ اور سب سے پہلے اثر کیا وہ فارغ التحصیل طلباء کی جماعت تھی۔ جن لوگوں نے ۱۹۲۹ء کے قریب ڈگریاں حاصل کیں وہ جانتے ہیں کہ اُن کا زمانہ کس قدر پریشانی اور بے اطمینانی کا زمانہ تھا۔ جب کسی انسان کو اپنی چودہ پندرہ سال کی محنت اور کثیر اخراجات کا کوئی مصرف نظر نہ آئے تو اس کا تہذیب دشمن نراجی یا قنوطی قسم کا فلسفی ہو جانا یقینی ہے۔ انقلابی تصوّرات ایسے ہی لوگوں کے دماغوں میں پرورش پا سکتے ہیں۔ چنانچہ اس زمانے کے فارغ التحصیل طلباء میں بیشتر تعداد ایسے ہی لوگوں کی تھی۔ ان لوگوں نے مارکس اور فرائڈ اور ان کے ہم خیال مفکرین کے تصورات کو اس طرح قبول کیا جس طرح پنجاب کے تپتے ہوئے میدان پہلی بارش کو جذب کرتے ہیں! ان لوگوں نے کتابیں لکھیں تقریریں کیں، جلسے کئے، غرض وہ سب کچھ کیا جو ایک پڑھے لکھے نوجوان کو کرنا چاہیئے پھر انھیں میں سے بعض کو کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جگہیں مل گئیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ انقلابی تصورات جو اب تک تعلیم گاہوں کے باہر پرورش پا رہے تھے اب ان کے اندر پہنچ گئے لہٰذا [illegible]ء سے لے کر [illegible]ء تک طلباء کی جس نسل نے تعلیم پائی ان کو ان انقلابی تصورات کی نشوونما کے لئے داخلی اور خارجی دونوں حیثیتوں سے موافق آب و ہوا ملی۔ یہ تصورات ابتداءً ترجمہ اور تقلید کی شکل میں ظاہر ہوئے۔ ترجمہ نثر میں اور تقلید نظم میں مغربی زبانوں کے جدید افسانے، ڈرامے، خاکے، مقالے اور مضامین کثیر تعداد میں

ہندوستانی زبانوں میں منتقل ہونے لگے۔ اول اول یہ بے تکے اور انمل بے جوڑ سے معلوم ہوتے تھے۔ جس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ ہندوستانی زبانیں خیالات اور اسلوب دونوں کے لحاظ سے مغربی زبانوں کے مقابلے میں بہت تہی دامن تھیں۔ اور دوسری یہ کہ ابتدا میں ہر نیا تجربہ بے تکا اور انمل بے جوڑ سا ہی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ہندوستانی زبانوں خصوصاً اردو میں بہت جلد ان خیالات اور اسالیب کو اپنانے کی قابلیت پیدا ہو گئی اور اب نوبت یہ ہے خیالات اور اسالیب اتنے "اپنے" ہو گئے ہیں کہ ان کے "پرائے پن" کا احساس تک نہیں ہوتا۔

ان تمام تبدیلیوں کی ذمے دار بہ حیثیت مجموعی طلبا کی وہ نسل تھی جو ۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کے درمیان تیار ہوئی۔ اور شعرا ادبا اور اساتذہ کی وہ جماعت بھی جس نے اس نسل کو تیار کیا۔ لیکن بہ حیثیت ایک منظم تحریک کے انقلابی دور کی روح ۱۹۳۲ء میں ظاہر ہوئی جیسا کہ اس مضمون کے شروع میں بتایا جا چکا ہے۔ ۱۹۳۶ء میں "انجمن ترقی پسند مصنفین" کی بنیاد پڑی۔ علی گڑھ اور لاہور کی تعلیم گاہوں میں ۱۹۲۷ء سے جو "لاوا" تیار ہو رہا تھا وہ بھی اسی زمانے میں پھوٹ بہا۔ یعنی شمالی مغربی ہندوستان کے تین تعلیمی مرکزوں سے ایک ہی قسم کی تحریک بیک وقت اٹھ کھڑی ہوئی۔ بعد میں اس تحریک کا نام "نیا ادب" پڑ گیا۔ جو حالات اس کی تخلیق کا باعث ہوئے تھے ان کا تقاضا یہ تھا کہ یہ تحریک اپنی نوعیت اور ہیئت دونوں اعتبار سے "انوکھی" ہو کیونکہ وہ حالات ان دونوں اعتبارات سے خود ہی انوکھے تھے۔ اس کا مفصل ذکر عنوان "تنقید" کے ماتحت آئے گا۔ نئے ادب کی نوعیت کا انوکھا پن تو وہی لوگ محسوس کر سکتے تھے جو اس کو سمجھنے کی قابلیت رکھتے اور ایسے لوگ آج بھی کم ہیں! لیکن ہیئت کا انوکھا پن اردو ادب کے مبصرین کو فوراً کھٹکا۔ نئے ادیبوں نے ابتدا ہی سے نثر اور نظم دونوں میں ایک قطعی نیا اسلوب ادا اختیار کیا۔ اس اسلوب کے حسن و قبح کے متعلق مفصل بحث عنوان "تنقید" کے ماتحت ہوگی۔ یہاں صرف اتنا بتا دینا

کافی ہے کہ اسلوب شروع شروع میں بہت نامقبول ہوا اور عرصے تک اس کا مذاق اُڑایا گیا۔ اس کے دو سبب تھے۔ اول یہ کہ نئے ادیبوں نے ایک قطعی غیر مانوس انداز بیان کو یک لخت اردو ادب میں ٹھونس دیا۔ اور اس کی مطلق پرواہ نہیں کی کہ انداز بیان کا تغیر (اگر ضروری ہو تو) بتدریج ہونا چاہیئے۔ دوسری بات یہ تھی کہ یہ انداز بیان بعض حیثیتوں سے بجائے خود قابل اعتراض تھا۔ لیکن اس نامقبولیت کے باوجود نئے ادب کی تحریک نے بہت تھوڑے عرصے میں بہت زیادہ ترقی کی۔ اس کی وجہ نئے ادب کے اسلوب کی خوبی نہیں تھی بلکہ یہ کہ نئے ادب کے مقاصد ایسے تھے کہ اُن کا حصول وقت کی ضرورت کو پورا کرتا نظر آتا تھا۔

نئے ادب کا مقصد صاف لفظوں میں شاید ابھی تک کسی نے نہیں بیان کیا۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کا مقصد مختصر الفاظ میں "ایک نئے سماج کی تخلیق" ہے ———— ایسا سماج جس کی بنیادیں مارکس اور فرائڈ کے اساسی اصولوں پر قائم ہوں۔ مارکس اور فرائڈ کے اساسی اصول اس قدر ہمہ گیر اور "موحدانہ" ہیں کہ اُن سے تمام معاشرتی مسائل حل ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انسان فطرۃً "موحد" پیدا ہوا ہے۔ یعنی ایسے نظریے جو فطرت اور معاشرت کے بظاہر مختلف اور متناقض مظاہرات کا ایک ہی سبب بتاتے ہیں، انسان کو طبعاً مرغوب ہیں۔ اور خصوصاً اس وقت جبکہ انسان کی کسی جماعت میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہو کہ اُن کی معاشرتی خرابیوں کی جڑیں حقیقت میں بہت ہی وسیع ہیں۔ ایک ایسا نظریہ جو یہ بتلائے کہ تمام خرابیوں کا سبب ایک ہے اور علاج بھی ایک ہی ہے، یقیناً بہت زیادہ اپیل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے نئے ادب کی مقبولیت کی۔ مجھے ایسے بہت سے لوگوں کے متعلق علم ہے جو نئے ادب کے مقاصد سے ہمدردی رکھتے ہیں درآں حالیکہ اُن کو نئے ادب کا طرز ایک آنکھ نہیں بھاتا۔

لیکن ایسے لوگوں کی تعداد ان دوسرے لوگوں سے بہت کم ہے جو نئے ادب کے

مقاصد اور طرز نگارش دونوں سے بھڑکتے ہیں۔ ان لوگوں میں دو گروہ ہیں۔ ایک وہ جو نئے ادب کے مقاصد کو سمجھتا ہے اور نہ اس کے طرز نگارش کو اور محض ایک "بدعت" سمجھ کر ہی اس کی مخالفت کرتا ہے۔ اس گروہ میں زیادہ تر علمائے دین شامل ہیں۔ دوسرا گروہ اُن لوگوں کا ہے جو نئے ادب کے مقاصد اور طرز نگارش کو سمجھتے تو ہیں لیکن بعض مصالح کے پیش نظر اُن کی ترویج و اشاعت کو اپنے حق میں مُضر سمجھتے ہیں۔ یہ اغراض مستقل (VESTED INTERESTS) کا گروہ ہے۔ اور موجودہ زمانے میں سب سے زیادہ با اثر اور طاقت ور گروہ یہی ہے۔

نئے ادب کی تحریک کی مخالفت ان دونوں گروہوں کی طرف سے ہوئی اور اب بھی ہو رہی ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۲ء یا ۱۹۳۳ء میں (یعنی اس تحریک کی باقاعدہ ابتدا سے پہلے) "انگارے" کی اشاعت پر ان دونوں گروہوں نے وہ طوفان بے تمیزی برپا کیا کہ خدا کی پناہ! لیکن اس طوفانِ بے تمیزی کا ایک فائدہ بھی ہوا وہ یہ کہ نئے ادیبوں کو زمانے کی رفتار نبض کا کسی قدر اندازہ ہو گیا جس کے نتیجے کے طور پر اُنھوں نے اپنے اسلوب ادا کو کسی قدر معتدل کر دیا۔ اگر ان نگارشات کا درجۂ حرارت وہی رہتا جو "انگارے" کا تھا، تو ان دونوں گروہوں کی متفقہ مخالفت نئے ادب کی تحریک کو یقیناً کچل کر رکھ دیتی لیکن ۱۹۳۶ء میں جب نئے ادب کی تحریک باقاعدہ طور پر شروع کی گئی تو نئے ادیبوں نے "انگارے" والے تجربے کی روشنی میں اپنا لائحۂ عمل مقرر کیا۔ اگرچہ یہ لائحۂ عمل بھی آئیڈیل سے بہت پست تھا۔ تاہم اس کی تدوین میں اس کا خیال ضرور رکھا گیا کہ ماحول سو فی صدی سازگار نہیں ہے۔

اس لائحۂ عمل کی اہم ترین دفعہ غالباً پروپاگنڈا ہے۔ نئے ادیب پروپاگنڈا کے فن سے واقف ہیں یا نہیں۔ یہ تو میں نہیں جانتا۔ لیکن مجھے یہ معلوم ہے کہ وہ لوگ نہایت ہی ہوشیاری سے گرم نرم اور ملا جلا ہر طرح سے کام لیتے رہتے ہیں۔ چنانچہ یہ شاید

کی بات ہے کہ نئے ادیب عام طور پر باہمی تنقید نہیں کرتے بلکہ " امداد باہمی کے اصول" پر ایک دوسرے کی تقریظ فرماتے رہتے ہیں - اُن کے تنقیدی تیروں کا ہدف زیادہ تر پرانا ادب رہتا ہے - میں یہ بات بطور عیب جوئی کے نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ مدعا یہ ہے کہ اس وقت اس قسم کی تقریظ خود نئے ادب کے حق میں مضر ہے یہ صحیح ہے کہ جس طرح کسی پودے کے نشوونما کی ابتدائی حالت میں اُس کی چھٹائی کرنا ٹھیک نہیں ہے بالکل اُسی طرح کسی نئی ادبی تحریک کی ابتدائی حالت میں اس کی سخت تنقید کرنا غلط ہے لہٰذا اگر نئے ادب کے بالکل ابتدائی زمانے میں نئے ادیبوں نے باہمی تنقید سے پرہیز کیا تو اچھا کیا - لیکن اب اس کا بالکل ابتدائی زمانہ نہیں ہے - اب اس پودے میں خاصی توانائی آگئی ہے - اس لئے نئے ادیبوں کا باہمی تنقید سے پرہیز کرنا اب کوئی معنی نہیں رکھتا - اب اس تحریک کے نشوونما کے لئے باہمی تنقید مضر نہیں بلکہ مفید ہوگی -

بہرحال اس پروپاگنڈے کا ایک اثر یہ ہوا کہ نئے ادب کو کئی ایسے ہمدرد اِس طبقے میں سے مل گئے جو نئے ادب کے تخلیقی حالات سے براہِ راست متاثر نہیں ہوئے تھے نئے ادب کے ساتھ اُن کا تعلق " داخلی " نہیں بلکہ " خارجی " ہے - ان ہمدردوں اور ساتھیوں میں جوشؔ اور فراقؔ خاص طور پر نمایاں ہیں - جوشؔ کی بے پناہ قوت ادا اور فراقؔ کا مغربی اصولِ تنقید پر عبور - یہ دونوں چیزیں نئے ادب کی ترقی کے حق میں بہت مفید ثابت ہوئیں - اگر یہ دونوں حضرات نئے ادب کی ترجمانی اور حمایت نہ کرتے تو وہ کبھی اس قدر کم مدت میں اتنی ترقی نہیں کرسکتا تھا -

اس پروپاگنڈے کا دوسرا اثر یہ ہوا کہ نوجوان طلبہ کی جماعت کا تقریباً ہر فرد نئے ادب کا حامی بن گیا خواہ وہ ہندوستانی سوسائٹی کے کسی طبقے سے تعلق رکھتا ہو اور خواہ وہ اس کے مقاصد اور اسلوب ادا کو سمجھتا ہو یا نہ ہو - اگر کسی نئی چیز کو نوجوان طلبہ میں مقبولیت حاصل ہوجائے تو اس کا عام فیشن ہوجانا یقینی ہے - چنانچہ کچھ کم

نوجوان طلبہ میں منجملہ فیشن کی اور چیزوں کے ایک چیز "ترقی پسندی" بھی ہے۔
اچھا پروپاگنڈا وہ ہے جو "شکار" کے نفس کی سطح لاشعور تک اتر جائے۔ لیکن ایسا جبھی ہوسکتا ہے جب کہ پروپاگنڈے کی گولی اتنی سبک اور شیریں ہو کہ نفس کا شعوری حصہ اس کی گرانی اور تلخی کو قطعی محسوس نہ کرے۔ دوسرے الفاظ میں جس فرد یا جماعت کو پروپاگنڈے سے متاثر کرنا مدنظر ہے، اُس کے سامنے نئے خیالات ایک مانوس انداز میں پیش کئے جانے چاہئیں۔ لیکن جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جاچکا ہے، نئے ادیبوں نے نئے خیالات کے لئے انداز بیان بھی بالکل انوکھا اختیار کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا پروپاگنڈا اس حد تک نامکمل رہا۔ تاہم باوجود اس خامی کے مارکس اور فرائڈ کے تصورات متوسط طبقے کی سطح لاشعور تک پہنچ ہی گئے۔ ان کی وجہ خود ان تصورات کی ہمہ گیری تھی نہ کہ پروپاگنڈے کی خوبی۔ سطح لاشعور پر پہنچ کر ان تصورات نے پرانے مدفون تصورات سے جنگ شروع کردی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پچھلے چند سال سے ہندوستانی سوسائٹی کے ہر طبقے میں ایک قسم کی کش مکش پائی جاتی ہے۔ خواہ اس طبقے کے افراد نئے ادب کا نام بھی نہ جانتے ہوں۔

۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۵ء تک یعنی موجودہ انقلابی دور کے ابتدائی حصے میں، زیادہ تر توجہ ترجمہ اور تقلید پر صرف کی گئی ——— ترجمہ نثر میں اور تقلید نظم میں۔ لیکن اس دس سال کے عرصے میں مغربی نظم و نثر کے بنیادی تصورات اور اسالیب فکر وادا یہاں کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے ذہن و مذاق پر اس قدر حاوی ہوگئے کہ نہ ترجمے کی ضرورت باقی رہ گئی اور نہ تقلید کی۔ ترجمہ اور تقلید بے جان چیزیں ہیں جو تصنیف اور تخلیق کا بدل نہیں ہوسکتیں خواہ مترجم اور مقلد کتنے ہی قابل کیوں نہ ہوں۔ اور جن لوگوں کے خرمن کی خوشہ چینی کی جارہی ہے وہ کیسے ہی زبردست مصنف یا فن کار کیوں نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۲۵ء اور ۱۹۳۵ء کے درمیانی عرصے کا

نیا ادب "حرارت عزیزی" نہیں رکھتا۔ نئے ادب میں سب سے پہلے آثارِ زندگی "انگارے"
کی اشاعت کے بعد ظاہر ہوئی۔ یہ پہلی چیز تھی جو صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے
نوجوان ہندوستانیوں کے اُس تاثیر کی صحیح ترجمانی کرتی تھی جو انھوں نے گذشتہ جنگِ
عظیم کے بعد کے حالات سے اخذ کیا تھا۔ یہ نئے ادب کی پہلی "تصنیف" تھی۔

نئے خیالات رواج تو ۱۹۲۵ء ہی سے پا رہے تھے۔ لیکن ابھی تک نطق سے
محروم تھے "انگارے" کی اشاعت کے بعد ان خیالات کو ایک نثری زبان اور موثر لہجہ
بھی مل گیا۔ اس زبان اور لہجے کی اچھائی، برائی کے متعلق مفصل بحث عنوان "تنقید"
کے ماتحت کی جائے گی۔ یہاں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ کسی نئے تصور کی تفہیم، ترویج اور
اشاعت کے لئے ایک مخصوص زبان اور لہجہ یا طرزِ ادا بہر حال ضروری ہے۔ "انگارے" کی
اشاعت سے پہلے "نئے ادب" میں کسی "تصنیف" کے نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس
وقت تک اس ادب کے پاس کوئی مناسب زبان اور لہجہ نہیں تھا۔ یہ کتاب خود تو ضبط
ہو گئی لیکن اپنی مختصر سی زندگی میں اردو ادب کی نثر میں ایک نئے طرز کا بیج بو گئی۔
* "انگارے" میں جو بات کہی گئی تھی وہ شاید روپے میں آٹھ آنے سچ تھی۔ لیکن اس طریقے
سے کہی گئی تھی کہ نوجوانوں کو سولہ آنے سچ اور بوڑھوں کو سولہ آنے جھوٹ معلوم
ہوتی تھی! اس کتاب کا طرزِ تحریر بیک وقت غایت درجہ "تہہ گیر" اور بے باکانہ
تھا اور یہی سبب تھا نوجوانوں کی گرویدگی کا اور بزرگوں کی خفگی کا!

طرزِ تحریر میں "تہہ گیریت" اور بے باکی کی جو روایات "انگارے" نے قائم
کیں وہ بہت جلد نوجوان طبقے میں مقبول ہو گئیں۔ اس کے دو سبب تھے۔ ایک تو
** یہ کہ نئے ادب کی تخلیقی فضا خود اس قسم کے طرزِ تحریر کی متقاضی تھی۔ دوسرے یہ کہ
نوجوان بالطبع بے باک ہوتا ہے۔ رہا "تہہ گیریت" تو اس کا ذہن خود تو تہہ گیر
نہیں ہوتا لیکن [illegible] کے تہہ گیر [illegible] کے لئے تیار [illegible]

دوسرا محاذ

جرمنی کے لئے سب سے بڑا خطرہ ، اور لڑائی ختم کرنے کا سب سے موثر طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ جرمنی پر مشرق اور مغرب دونوں طرف سے حملہ کیا جائے ۔ جنگ شروع ہوئی تو جرمنوں نے روس سے معاہدہ کرکے مشرق میں محاذ قائم ہونے کے خطرے کی پیش بندی کر لی تھی ، اور پھر فرانس پر لشکر کشی کرکے مغرب کے محاذ کو توڑ دیا ۔ فرانس میں شکست کھانے کے بعد انگریزوں کو اس کا بہت اندیشہ تھا کہ جرمنی اُن کے مُلک پر چڑھائی کرے گا ، لیکن جرمن صرف ہوائی حملے کرتے رہے ۔ ۱۹۴۱ء کے وسط تک ، جب جرمنی نے روس کے خلاف اعلان جنگ کیا ، برطانیہ اس قابل ہوگیا تھا کہ روس کی مدد کرنے کا وعدہ کرسکے ۔ اور جب روس کی حالت نازک ہونے لگی تو ان لوگوں نے جو روس کے ہمدرد تھے یا جو سمجھتے تھے کہ برطانوی حکومت جنگ میں کافی سرگرمی نہیں دکھا رہی ہے اس کا مطالبہ کرنا شروع کیا کہ جرمنی کے خلاف مغربی یورپ میں دوسرا محاذ قائم کیا جائے ۔ خود روسی بھی اسے اپنا حق سمجھ کر اس پر اصرار کرنے لگے اور رفتہ رفتہ یہ اتحادیوں کے خلوص اور نیک نیتی کا معیار ہوگیا کہ وہ کتنی جلدی اور کہاں پر جرمنی کے خلاف دوسرا محاذ قائم کرتے ہیں ۔ لیکن جرمنی نے شمالی فرانس کے ساحل کی مورچہ بندی کر لی تھی وہاں فوجیں اُتارنے کی کوشش کی جاتی تو اس میں بہت نقصان ہوسکتا تھا ۔ اس لئے مسٹر چرچل دوسرے محاذ کے مطالبے کو ٹالتے اور اعتراض کرنے والوں کو یہ سمجھاتے رہے کہ جرمنی پر بمباری کرنا دشمن کو کمزور کرنے اور روس کو مدد پہنچانے کا ایک کارآمد طریقہ ہے ۔ ۱۹۴۲ء سے جب ہوائی جہازوں کی کمی نہیں رہی تھی ۔ برطانیہ کا ہوائی بیڑا جرمنی کے صنعتی مرکزوں پر مسلسل بمباری کرنے لگا ۔ ہامبرگ (HAMBURG) اور کولون (COLOGNE) قریب قریب برباد کر دئے گئے اور برلن میں رہنا اتنا خطرناک

ہوگیا کہ بہت سے سرکاری دفتر وہاں سے ہٹالئے گئے۔ ہوائی حملوں کا قوم کے اعصاب پر بہت
برا اثر پڑتا ہے۔ لیکن برطانیہ پر جو حملے جرمنی نے کئے ان سے برطانوی قوم کی ہمت پست
نہیں ہوئی۔ بلکہ اس کے برعکس اس کا استقلال اور نمایاں ہوگیا۔ معلوم نہیں برطانیہ
کے حملوں کا جرمنی کی آبادی پر اسی طرح الٹا اثر پڑا یا نہیں۔ بہرحال ڈیڑھ سال سے زیادہ
کی بمباری جرمنوں کی ذہنیت کو اس طرح نہیں بدل سکی ہے کہ دوسروں کو کوئی فرق محسوس
ہو اس کا اندازہ بھی جنگ کے بعد ہی کیا جاسکے گا کہ جرمنی کے صنعتی نظام کو بمباری سے
کتنا نقصان پہنچا۔ وسطی، مغربی اور جنوبی جرمنی کے صنعتی مرکز برطانوی بمباروں کی زد
میں ہیں اور اگرچہ یہ کہا جاتا ہے کہ مارشل گورنگ کو جرمنی کے ہوائی بیڑے پر اتنا بھروسا تھا کہ انھیں
یقین تھا کہ جرمنی پر بمباری نہ کی جاسکے گی صنعتی نظام کے نگراں ایسے ناعاقبت اندیش نہ
ہوں گے کہ ان کارخانوں کو جن میں جنگ کا سامان تیار ہوتا ہے بالکل دشمن کے اختیار میں
چھوڑ دیں۔ جرمنی میں سینکڑوں کارخانے برباد ہوگئے ہوں گے یا انھیں برباد کردینا پڑا ہوگا، لیکن
ان میں بہت کم ایسے ہوں گے جن میں جنگ کے آلات بنتے ہیں۔ برطانوی بمبار خاص طور
پر ان کارخانوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ جن میں آبدوزوں کے انجن اور دوسرے آلات
تیار کئے جاتے ہیں۔ لیکن جرمن آبدوزوں کی تعداد برابر بڑھتی رہی ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ
دوسرے کارخانوں کے بارے میں بھی برطانوی ہوائی بیڑے کے افسران اعلیٰ کو ایسی ہی
غلط فہمی ہو، کارخانے برباد ہوتے رہیں اور جرمنی جنگ کے آلات برابر تیار کرتا رہے۔

سنہ ۴۲ء کے وسط تک اتحادیوں کے بمباروں کی تعداد اور اُن کی کارگذاری بہت بڑھ گئی
اور فوج اور جنگ کا سامان بھی اتنا ہوگیا کہ بڑے بڑے منصوبے پورے کئے جاسکتے تھے۔ برطانیہ
میں منتخب سپاہیوں کو ساحل پر اُتر کر اور مختلف قسم کی رکاوٹوں کو دور کرکے مورچوں پر
حملہ کرنے کی خاص طور پر مشق کرائی گئی۔ یہ سپاہی کمانڈو کہلاتے ہیں اور فوج کا ایک الگ
اور خود مختار شعبہ بن گئے ہیں۔ ۲۲ اپریل سنہ ۴۲ء کو ایک کمانڈو دستے نے شمالی فرانس

کی بندرگاہ بولون (BOULOGNE) کے قریب چھاپا مارا اور کچھ نقصان پہنچا کر واپس چلا آیا ۔
۱۹ اگست کو زیادہ بڑے پیمانے پر حملہ کیا گیا۔ کمانڈو فوج کے اُترنے کے لئے بندرگاہ ڈیپ
(DIEPPE) کا علاقہ منتخب کیا گیا اور اس منصوبے میں بحری اور ہوائی بیڑے سے
پوری مدد لی گئی۔ ہمیں اس کمانڈو فوج کی صحیح تعداد معلوم نہیں جو اس مہم پر بھیجی گئی۔ برطانوی
بیانات نے کارروائی کے پیمانے کو زیادہ سے زیادہ چھوٹا اور جرمن بیانات نے اُسے
بہت بڑا ثابت کرنے کی کوشش کی۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس میں دس بارہ ہزار آدمی شریک
ہوئے، اور ان کے ساتھ ۲۰ ٹینک بھی بھیجے گئے، کیونکہ ٹینکوں کو اتارنے کی مشق کرنا بھی
مقصود تھا۔ کمانڈو فوج تین حصّوں میں کی گئی تھی اور چھ الگ مقاموں میں اُتری۔ اس
کے دائیں بازو نے چھ انچ کی توپوں کے ایک مورچے کو برباد کیا اور گولا بارود کے ایک
ذخیرے میں آگ لگادی، وسطی حصّے نے بندرگاہ ڈیپ میں ٹینکوں کو اتارا اور ایک ریڈیو
اسٹیشن اور طیارہ شکن توپوں کے مورچے کو توڑا۔ لیکن یہاں پر پورا مقابلہ ہوگیا اور اس
کا نتیجہ یہ ہوا کہ ٹینکوں کو چھوڑ کر چلے آنا پڑا۔ کمانڈو فوج کا بایاں بازو ساحل کے قریب
آتا ہوا دیکھ لیا گیا، جرمن توپوں نے اس پر گولہ باری شروع کردی اور ساحل تک پہنچنے نہیں
پایا۔ برطانوی حکومت نے بیان کیا کہ حملے کا مقصد دشمن کے دفاعی انتظامات کا امتحان
لینا تھا اور اس کے لئے جان بوجھ کر ساحل کا وہ حصّہ چُنا گیا جس کی دشمن نے خاص اہتمام
سے مورچہ بندی کی تھی۔ کمانڈو فوج پروگرام کے مطابق پہنچی اور اپنا کام کرکے اسی وقت
پر واپس چلی آئی جو واپسی کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ اخباروں اور پارلیمنٹ میں اعتراضات
اور سوالات کئے گئے تو یہ معلوم ہوا کہ اس مہم کی تیاری میں پانچ مہینے صرف ہوئے اور جو
سپاہی بھیجے گئے تھے اُن میں سے قریب آدھے کام آئے۔ برلن سے جو بیانات شائع ہوئے
ان میں کہا گیا کہ برطانیہ نے ایک خاصی بڑی فوج اُتارنے کی کوشش کی تھی، اور
اسے انتہائی ناکامی اور بہت نقصان ہوا۔ جرمنوں کے نزدیک اس کارروائی کا مقصد یا تو

تھا (یعنی ان لوگوں کی خوشنودی حاصل کرنا جو "دوسرے محاذ" کا مطالبہ کر رہے تھے) فن جنگ کے لحاظ سے اس کی معقولیت ثابت نہیں کی جا سکتی تھی اور یہ محض اناڑیوں کا کام معلوم ہوتا تھا ڈیپ کی مہم سے اس کا اندازہ ہو گیا ہو گا کہ فرانس کے ساحل پر فوج اتارنے میں بڑی دشواریاں ہیں، ورنہ شروع نومبر میں، جب اتحادی فوجوں نے شمالی افریقہ میں قدم جمائے تو فرانس پر بھی حملہ کیا جاتا۔ تونسیا کی جنگ کے دوران میں مغربی یورپ میں محاذ قائم کرنے کی کوشش نہیں کی گئی، اور چونکہ وسط نومبر سے روسیوں نے پیش قدمی شروع کر دی تھی اور اس میں کامیاب ہو رہے تھے، "دوسرے محاذ" کی سیاسی اہمیت بھی کم ہو گئی۔ وسط مئی ۱۹۴۳ء میں اتحادی تونسیا کی فتح سے فارغ ہو گئے۔ اور اس کے بعد آگے بڑھنے کی تیاری کی جانے لگی۔ پہلے پانتے لیریا (PANTELEERIA) اور لامپے دوسا (LAMPEDUSA) کے جزیروں پر قبضہ کیا گیا، اور پھر ۱۰ جولائی کو جنوبی سسلی میں اتحادی فوجیں اتریں۔ سسلی جزیرہ ہے اور اس میں پورا مقابلہ کرنے کے لئے لازمی تھا کہ محوریوں کا بیڑا فوج کی مدد کرے اور کچھ نہیں تو کم از کم آبنائے مسینا (MESSINA) کو اتحادی بیڑے سے محفوظ اور فوج اور سامان کی آمد و رفت کے لئے کھلا رکھے۔ اٹلی اپنا بیڑا داؤں پر لگانے کو تیار نہ ہو گا اس لئے جرمنوں نے شمالی مشرقی سسلی میں کوہ اٹنا (ETNA) کے گرد اور اسی سلسلے میں جنوب کی طرف کتانیہ (CATANIA) کی پہاڑیوں تک اپنی فوجیں رکھیں، باقی جزیرے کی حفاظت اٹلی کے سپرد کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اتحادی فوجیں، جو پہلے سے جنوبی سسلی پر شدید گولہ باری اور تیاری کر چکی تھیں، اطمینان سے اتریں اور پھر گرام کے مطابق مختلف حصوں میں بڑھنے لگیں۔ اطالوی فوجیں جنگ سے بیزار تھیں، سسلی کی آبادی بھی معلوم ہوتا تھا اتحادیوں کا انتظار کر رہی تھی۔ اس سے اتحادیوں کا کام بہت آسان ہو گیا۔ ان کی ایک فوج مغرب کی طرف، ایک سسلی کے وسطی حصے میں بڑھی اور دونوں کوششیں ان قریب قریب صاف تھا۔ جزیرہ کی آخری فوج کے پہلو کا پاکر فتح کرنے کا منصوبہ

کیا گیا تھا۔ اسے سب سے زیادہ دیر لگی اور زحمتیں اٹھانا پڑیں اس لئے کہ اس کا مختلف جرمن سپاہیوں سے سابقہ تھا۔ ساحل پر اترنے کے ایک ہفتہ بعد یہ کتانیہ کے میدان میں پہنچی (۲۰ جولائی) اور یہاں اس کا رستہ روک لیا گیا۔ جرمنوں نے کوہ اٹنا کا سہارا لے کر شمالی سسلی کے ایک کونے میں اپنا محاذ قائم کیا تھا۔ اور کتانیہ سو وہ اسی وقت ہٹے جب شروع اگست میں اتحادی فوجوں نے مغربی و وسطی سسلی پر قبضہ کر کے پوری طاقت سے ان کے محاذ پر حملہ کرنا شروع کیا اور اس کا اندیشہ ہوا کہ کتانیہ میں جو اُن کے سپاہی تھے وہ گھیر لئے جائیں گے۔ اس کے بعد جرمن سڑکوں کو برباد کرتے اور جگہ جگہ پر اتحادیوں کو پریشان کرنے کے لئے مشین گنوں کے چھوٹے مورچے اور نشانہ اندازوں کو چھوڑتے ہوئے پس پا ہوتے رہے۔ اتحادی فوجیں انھیں گھیرنے کی کوشش کرتی رہیں مگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ ۱۷ اگست کی صبح کو ۸ بجے کے قریب پہلے امریکی سپاہی سسلی کے آخری جرمن مورچے شہر مسینا (MESSINA) میں داخل ہوئے اور اسے سمندر کی طرف سے بھی گھیر لیا۔ لیکن اس وقت جرمن آبنائے مسینا کے مشرقی کنارے پر پہنچ گئے تھے، اور وہاں سے اُن کی توپیں اتحادیوں پر گولہ باری کر رہی تھیں۔

جرمنوں نے اس کا اعتراف کیا کہ اتحادیوں نے پیش قدمی کے لئے میدان منتخب کرنے میں بڑی ہوشیاری سے کام لیا کہ یہ سب مقام ایسے تھے جہاں جرمن فوجوں کی حیثیت ضمنی تھی، اور جہاں اس بات سے پورا فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا کہ جرمنوں کے پاس فوجی کارروائیوں میں مدد کرنے کے لئے بحری بیڑا نہیں ہے۔ تونسیا کی جنگ کے آخری دور اور سسلی کی پوری جنگ میں جرمن ہوائی بیڑے کی مدد کے بغیر لڑے اور اگرچہ نئے طریق جنگ کو دیکھتے ہوئے یہ ایک کارنامہ تھا۔ ہوائی امداد نہ ہونے کی وجہ سے جرمن کہیں بھی مستقل محاذ قائم نہ کر سکے۔ دوسری طرف یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب سمندر پر ان کا قبضہ تھا اور دشمن ان کے ہوائی بیڑے کی طرح نہیں لے سکتا تھا تو اتحادیوں نے سسلی

میں اپنی فوجیں اتار کر ایک مہینہ کیوں ضائع کیا۔ وہ چاہتے تو جنوبی اٹلی پر اس طرح
حملہ کر سکتے تھے کہ سسلی کی محوری فوجیں پھنس جائیں اور اٹلی میں جو سیاسی انقلاب ہوتا وہ
اس قدر اچانک ہوتا کہ جرمن اپنے بچاؤ کی تدبیریں نہ کر سکتے۔ سسلی کی فتح کو ایک الگ مہم
بنا کر انھوں نے جرمنوں کو اس کا موقع دیا کہ شمالی اٹلی میں فوجیں جمع کر لیں اور اٹلی کے
نما دینے سے جو سیاسی ابتری پیدا ہو سکتی تھی اس کے لئے تیار ہو جائیں۔ ۱۰ر جولائی کو
سینور مسولینی اور ہر ہٹلر کی ملاقات ہوئی تھی جس میں سینور مسولینی نے جرمنی سے مزید امداد
کا مطالبہ کیا اور ہر ہٹلر نے اس سے انکار کر دیا۔ اس ملاقات کی رپورٹ فاشسٹ پارٹی
کی مرکزی کمیٹی میں پیش کی گئی، اور کمیٹی میں سینور مسولینی کی ایسی مخالفت کی گئی کہ ان کا
برسر اقتدار رہنا ناممکن ہو گیا۔ ۲۵ر جولائی کو اٹلی کے بادشاہ وکٹر ایمانوئل VICTOR
EMMANUEL) نے ان کو بلا کر اطلاع دی کہ ان کی جگہ مارشل بدولیو (BADOGLIO)
وزیر اعظم مقرر کر دئے گئے ہیں، اور محل سے نکلتے ہی سینور مسولینی گرفتار کر لئے گئے
مارشل بدولیو سینور مسولینی کے پرانے مخالف تھے، اور انھوں نے یہ بھی طے کر لیا
تھا کہ اتحادیوں سے جتنی جلدی ممکن ہو صلح کر لیں۔ لیکن اٹلی پر جرمنی کا تسلط ایسا تھا
کہ مارشل بدولیو اپنے ارادے چھپانے پر مجبور تھے۔ انھوں نے شروع میں یہ ظاہر کیا
کہ اٹلی بدستور جنگ جاری رکھے گا۔ مگر خفیہ طور سے اتحادیوں سے گفتگو شروع کر دی
اور آخر اگست میں لڑائی بند کرنے کی شرطیں طے ہو گئیں۔ بعد کو ہر ہٹلر نے مارشل بدولیو
پر یہ الزام لگایا کہ انھوں نے جرمنی کو دغا نہیں دی بلکہ اتحادیوں سے بہتر سودا کرنے کے
لئے جرمن فوجوں کو پھانسنے کی بھی کوشش کی۔ بہرحال اس کا تو مارشل بدولیو نے اتحادیوں
سے وعدہ کیا تھا کہ سینور مسولینی کو ان کے حوالے کر دیں گے۔ لڑائی بند کرنے کی ایک
شرط یہ تھی کہ اس صلح کا اعلان اس وقت کیا جائے گا جب اتحادی کا سپہ سالار جنرل
آئزن ہاور (EISEN HOWER) مناسب سمجھیں۔ ۳ر ستمبر کو [illegible] کی آٹھویں فوج

آبنائے مسینا کو پار کر کے اٹلی کے ساحل پر اتری اور پھر اس کا اہتمام کیا گیا کہ جیسے ہی آرمسٹس کا اعلان ہو، اتحادی فوجیں کئی مختلف مقاموں پر حملہ کریں۔ ۹ ستمبر کو معلوم ہوا کہ اٹلی نے لڑائی بند کر دی ہے، اور اسی روز امریکہ کی پانچویں فوج نے نیپلز (NAPLES) کے جنوب سالرنو (SALERNO) کے قریب ساحل پر قدم جمائے، اور یہ خبر مشہور ہوئی کہ اٹلی کی اور مغربی بندرگاہوں پر اتحادی فوجیں اتر رہی ہیں۔ ادھر شمالی فرانس کے ساحل پر فوج اتارنے کی "مشق" کی گئی۔ لیکن اس سارے اہتمام کا نتیجہ کچھ نہیں نکلا۔ ہرہٹلر نے اس کی خبر سنتے ہی فون رومل کو شمالی اٹلی کی جرمن فوجوں کا سپہ سالار مقرر کیا۔ مارشل کسل رنگ (KESSEL RING) کو وسطی اور جنوبی اٹلی کی فوجوں کا، اور یہ دونوں فوراً مشورے کے لئے بلائے گئے۔ مشورے میں بھی دیر نہیں لگی۔ جرمنوں نے شمالی اور وسطی اٹلی کو مقبوضہ قرار دے کر اپنی عمل داری قائم کر لی، روم پر قبضہ کر لیا، اور سالرنو کی امریکی فوج کے جرمن جوابی حملوں کی ایسی تھپیڑ لگی کہ وہ سمندر میں گرتے گرتے بچی۔ اسی سلسلے میں جرمن سپاہی اچانک اس چھوٹے جزیرے میں جہاں سینور مسولینی قید تھے ٹپک پڑے اور انہیں صفائی سے نکال لے گئے۔ سینور مسولینی نے آزاد ہوتے ہی اپنی پارٹی کے تمام وفادار اراکین کو جرمنوں کے دوش بدوش لڑنے کی ہدایت دی۔ اور اس طرح یہ کہنے کو ہو گیا کہ جرمن اپنی غرض کے لئے نہیں فاشسٹ قومی حکومت کی طرف سے لڑ رہے ہیں۔ آرمسٹس کی بدولت جس انقلاب کی امید تھی وہ تو نہیں ہوا۔ اور شاید ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ لیکن اٹلی کے بیشتر جنگی جہاز اتحادیوں کو مل گئے، جرمنوں کو سارڈینیا (SARDINIA) کو خالی کرنا پڑا، اور اس کے علاوہ بحر یونان میں چند جزیروں پر اتحادیوں کا قبضہ ہو گیا۔ اب تک لڑائی کی جو شکل رہی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اتحادی بتدریج آگے بڑھیں گے جرمن ان کی پیش قدمی کی رفتار کو جہاں تک ممکن ہوگا دھیما کرتے رہیں گے اور شمالی اٹلی اس مقابلے کا میدان ہوگا۔ تب شاید کہا جائے کہ جنوبی یورپ میں دوسرا محاذ قائم ہو گیا

لیکن اتحادیوں نے کوبیک (QUEBEC) کانفرنس میں جاپان کے خلاف بڑے پیمانے پر جنگ کرنے کا ارادہ کیا ہے، اور اب جرمنی کی پیش قدمی کا کوئی اندیشہ نہیں رہا ہے اور بحیرۂ روم کا شمال خطرے میں نہیں ہے تو کوئی تعجب نہیں کہ اتحادی جنوب مشرقی ایشیا کی طرف زیادہ توجہ کریں اور یورپ میں لڑائی اطمینان سے ہوتی رہے۔

(جنگ کے چار سال)

محمد مجیب
جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

دِل بہلاوا

افراد :-

سلمیٰ :- ایک پردہ نشین باتونی خاتون

رحیمن :- ایک جہاں دیدہ ماما

بزاز

[ایک کمرہ ہے جس کی دیواریں زیادہ تر دھوئیں سے کالی ہیں۔ کونوں میں جالے لٹک رہے ہیں۔ تخت پر چاندنی کا فرش ہے اگاؤ سے لگی ہوئی سلمیٰ بیٹھی ڈلی کاٹ رہی ہے۔ سامنے ایک بڑا سا پاندان ہے اور تخت کے نیچے اگالدان رکھا ہے۔ تخت سے تھوڑے فاصلے پر دو پلنگ بچھے ہیں۔ جن میں سے ایک پر میلی سی دری پڑی ہے۔ دوسرے پر بستر سرہانے تہہ کیا ہوا رکھا ہے رحیمن ایک پیڑھی پر بیٹھی ہے۔]

سلمیٰ :- کس جگہ لاکے بند کیا ہے انھوں نے۔ نہ تو کسی سودا بیچنے والے کی آواز آتی ہے، نہ پھیری والے کی۔ نہ کہیں سڑک دکھائی دیتی ہے اور نہ کوئی برات آتی جاتی دیکھ سکتی ہوں اور نہ کوئی جنازہ۔ واہ کیا مکان ہے۔ ایک کمرہ۔ دو چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں۔ صحن ندارد۔ بس اس میں پنجرے کی چڑیا کی طرح بند پھڑ پھڑاؤ۔ نوج اللہ میاں نے ہم لوگوں کو عورت کا جنم دیا (سروتا اور ڈلی ہاتھ سے رکھتے ہوئے) اور یہ موئی ڈلی بھی آج کل نہ جانے کیسی چلی ہے۔ دام سنو تو تین روپے سیر۔ اور آدھی سے زیادہ سڑی گلی۔ میں کہتی ہوں یہ بنئے بھی بڑے ٹھگ ہیں۔ دیسے کی چیز بھی آج کل سوا ڈیڑھ روپے میں دیتے ہیں اب کل ہی دیکھو نہ ہمسائی جو دوپٹہ دکھاتی تھیں۔ ہوگا کوئی تین آنے گز کا اور ان کے میاں سے لئے ڈیڑھ روپے گز۔

رحیمن :- مگر بی بی بنے تو کپڑا بیچتے نہیں، کپڑا تو بزاز بیچتے ہیں۔

سلمیٰ :- اوئی رحیمن، تم نے بھی کیا بات نکالی، چاہے بزاز انھیں کہو یا بنئے۔ سب ہیں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے۔ کوئی دال چاول لے کے خلق خدا کو ٹھگنے بیٹھ گیا اور کوئی کپڑا لے کر لوٹنے لگا۔ میں کہتی ہوں ان پاجیوں کے دل میں ذرا بھی خدا کا ڈر نہیں۔ آخر یہ اتنا نفع لے کے کریں گے کیا۔ انھیں نیتوں کا تو پھل ہے کہ جیسے سنو بے اولاد ہے۔ پوچھو تم گاہکوں کا کلیجہ تو نکال لیتے ہو، بھلا تمھارے کلیجے میں کیا ٹھنڈک پڑے گی۔

رحیمن :- یہ بی بی آپ نے بالکل ٹھیک بات کہی۔ ہم غریبوں کا دل دکھلتے ہیں جب ہی کُھدا بھی اُن سے ناخوش رہتا ہے۔

سلمیٰ :- اے یہ تو اور کیا۔ وہ بھانہ بنیا جو ہمارے ہاں لگا ہوا تھا ارے بھلا سا تو نام تھا اُس کا کلاو۔ نہیں نہیں بلاو، ارے پیٹ میں ہے۔ مُنہ میں نہیں آتا۔ پلاؤ۔ ارے ہاں یاد آگیا۔ کھلاو۔ میں کہتی ہوں ان موؤں کو نام بھی نہیں رکھنے آتا۔ عجیب عجیب طرح کے نام رکھتے ہیں۔ گھورو، گھسیٹے ......

رحیمن :- نام تو بی بی میں نے پنجاب میں سُنے ہیں۔ ایسے سکھت سکھت کہ جبان ٹوٹ جائے اور نام نہ نکلے۔

سلمیٰ :- اے تو میں کہتی ہوں کہ ان کی کون سی بات درست ہوتی ہے۔ کبھی بات کرتے سنو معلوم ہوتا ہے پتھر کھینچ کر مار رہے ہیں۔ اور بھی کیا پہناوا ہے اس طرف کا۔ چھوٹی قمیص اور شلوار۔ مردوں کو دیکھو تو یہی پہنے ہیں۔ نگوڑی عورتیں ہیں تو یہی پہنے ہیں۔ دیسی صورت نکل آتی ہے کہ واری قربان ہونے کو جی چاہتا ہے۔ دنیا جہان کے مردوں عورتوں کے پہناوے الگ الگ ہیں۔ مگر اس دیس کی ریت ہی نرالی ہے۔ ان کا پاجامہ ہے دو سوتا ہے۔ ان کے ان مرد عورت میں فرق ہی نہیں [illegible] ہے۔ کپڑا لو، کپڑا پاجامے کے لئے، پاجاموں کے لئے، شیر خانیوں کے لئے، ہر طرح کا کپڑا [illegible]

زنانہ جوتا) اسے تیری آواز کیسے دینے، تو بولا تو، میری کا رحمن سڑک کے سے جلدی کر
لے ہے ذرا جلدی اٹھو بوا۔ تم تو اس طرح سٹر سٹر چلتی ہو جیسے پسے دن ہیں۔ ذرا تو
قدم بڑھا دے میری بیوی

رحیمن :۔ اے کپڑے والے، ارے او میاں بزاز۔

بزاز :۔ کدھر پکارا جی۔

رحیمن :۔ ارے ادھر آ میرا بھائی ڈیوڑھی پہ۔

سلمیٰ :۔ ارے تو ذرا تم باہر تک تو جاؤ بی۔ تم کیوں پردہ کی بوا بن گئیں۔ ذرا دیکھ کے پاجامہ والے تھان نکلوا دو۔ (رحیمن باہر جاتی ہے۔ سلمیٰ تخت سے اتر کے تابی سے ڈیوڑھی تک خود بھی جاتی ہے۔ باہر جھانکتی ہے) ہاں، ہاں پاجامہ والے۔ ہاں وہ تھان لیتی آؤ، رحیمن ارے وہ بھی لے لو۔ ہاں وہ بھی۔ ارے اسے ادھر کہاں رکھ دیا۔ وہ تو بڑا وضع دار معلوم ہوتا ہے۔ کل دس ہی تھان تو ہوئے۔ اور تم ہو کہ تم سے اٹھتا ہی نہیں ـــــ اے لے بھی آؤ کسی طرح چند قدم تو چلنا ہے۔ کوئی دلی تھوڑے جانا ہے (رحیمن تھانوں سے لدی اندر آتی ہے۔ سلمیٰ جلدی سے دو ایک اس سے لے لیتی ہے اندر پلنگ پہ کھینچ کر بیٹھ جاتی ہے) واہ واہ کیا کہنا ہے اس کا۔ کیا بوٹیاں ہیں اس کی۔ کیا رنگ ہے، کیا چمک ہے اس کا۔ پائینچہ دار خوب ہوگا۔ مگر اس میں گوٹ کاہے کی لگے گی؟

رحیمن :۔ اسی کی گوٹ لگا دیجئے گا بی بی۔

سلمیٰ :۔ نا بی بی بھلا اس میں اسی کی گوٹ کیا خاک جچے گی اس میں تو لیس ٹپا پٹی ہی کی ہونی چاہئے اسی کی گوٹ لگا دو گی تو بجھ کے رہ جائے گا۔ ارے دیکھا نہیں تھا تم نے بڑی نند کو میری بہو جن کے دماغ میں انگریزیت سوار ہے۔ میں کہتی ہوں تو بہ کس کو اسکول میں پڑھانے جہاں انھوں نے دو چار حرف پہچان لئے اور لگیں گٹ پٹ بکنے۔ اور ہر چیز کو نام میں کرنے۔

رحیمن :۔ یہ لو اچھی کیا بلا ہے بی بی؟

سلمیٰ :- لے لو تم بوڑھی ہونے کو آئیں اور ان چھوکریوں کی ٹوماچس ہی نہیں جانتیں۔ اے بی، ٹوماچس کہتے ہیں رنگ میں رنگ ملانے کو۔ ایک ہم لوگ تھے کہ اگر ہم نے پائجامہ پہنا سُرخ تو کرتا پہنیں گے دھانی، اور دوپٹہ ہوگا فاسئی اور گندھکی یا آج کل یہ وطیرہ چلا ہے کہ جس رنگ کا دوپٹہ ہو اسی رنگ کی قمیص، اُسی رنگ کا پاجامہ، اسی رنگ کا موزہ، اُسی رنگ کا جوتا، اور اُسی رنگ کا رومال اور اُسے کہتے ہیں ٹوماچس۔

رحیمن :- اچھا تو ٹوماچس ایک ہی رنگ کے پہناوے کو کہتے ہیں۔ میں یہ سمجھتی تھی کہ یہ چھپا چائی کی قسم ہے بی بی۔

سلمیٰ :- اے تو وہ اس کی قسم نہ سہی۔ پر کی جاتی ہے اسی لئے۔ مرد ہیں تو وہ الگ ٹوماچس میں لگے ہیں اور لڑکیاں ہیں تو الگ اور نتیجہ اس پہناوے کا یہی ہوتا ہے کہ دیکھیں دکھاویں اور.............

بزاز :- ماماجی! ماماجی!

رحیمن :- کیا ہے؟

بزاز :- کچھ پسند بھی آیا کہ نہیں۔ کہو ذرا جلدی کریں۔ دیر ہو رہی ہے۔

سلمیٰ :- لو یہ بھی ہوا کے گھوڑے پر سوار آیا ہوا۔ میں کہتی ہوں یہ آخر آج کل کاہے کی بھاگا بھاگ لگی ہے۔ جس سودے والے کو دیکھو بس یہی رٹنے لگتا ہے۔ جلدی کیجئے، جلدی، دیر ہو رہی ہے۔ سودا خریدنا نہ ہوا ناک صاف کرنا ہوئی۔ بس جھٹ دام سے پوچھ ڈالی اور کام میں لگ گئے۔

بزاز :- (پکارتا ہے) ارے ماماجی کوئی چیز پسند بھی آئی کہ نہیں۔

رحیمن :- اے پسند کر رہی ہیں میرے بھائی۔ تم تو بس منٹ بھر میں گلا پھاڑنے لگے۔

سلمیٰ :- اے اس سے کہو کوئی اس کے تھان لے کر بھاگ نہ جائے گا۔ ہم کوئی ٹھگ اُٹھائی گیرے نہیں ہیں۔ ذرا دیکھ بھال لیں۔ کپڑا لینا ہے۔ اس کا رنگ دیکھیں گے وضع

دیکھیں گے، مول بھاؤ کریں گے۔ کوئی اس کی گاڑی چھوٹی جاتی ہے، کہ اسے اسی قدر جلدی ہے۔

رحیمن:- تو بی بی اسی تھان کا پاجامہ بنا ڈالئے۔

سلمیٰ:- اس کا؟ یہ جو بوٹیوں والا ہے؟ ہے تو اچھا مگر مجھے اس کا رنگ کچا معلوم ہوتا ہے بھلا سوچو تو مٹھی بھر روپے صرف کروں، اے ہاں۔ آج کل تو ہر چیز میں آگ لگی ہے، جس چیز کو دیکھو اس کے دس گنے بیس گنے دام ہیں۔ ہاتھ جلتا ہے کوئی نیا کپڑا اٹھاتے۔ بڑے دل گردے کے ہیں۔ وہ لوگ جو اس مہنگی کے سمے میں بھی نئے کپڑے خرید لیتے ہیں۔ نا بی بی ہماری اتنی ہمت نہیں کہ ہم خالی چک بھڑک پر جائیں اور دھوبی کے ہاں سے جو پلٹ کر آئے تو معلوم ہو پوتڑے دھل کے آئے ہیں۔

بزاز:- ارے ماما جی، بڑی دیر ہو رہی ہے خالہ!

رحیمن:- ارے تیری کھالا کو کالا ڈیرے جلے موئے۔ مجھے کھالا پکار رہا ہے جیسے میں ساٹھ برس کی کوئی بوڑھی کھوسٹ ہوں۔ اور یہ سولہ، سترہ برس کا انیلا جوان!

سلمیٰ:- ہے ہے رحیمن تم تو اس سے لڑنے لگیں۔ ذرا ان کپڑوں کو تو دیکھو۔ کچھ رائے صلاح کرو، کچھ مشورہ دو بی بی، تم تو اس طرح منہ میں گھنگنیاں بھر کے کھڑی ہو جیسے تمھیں سانپ سونگھ گیا ہے۔ واہ بوا، واہ، تم تو بازار میں نکلتی ہو، اپنی آنکھوں سے سینکڑوں ہزاروں تھان تم نے دیکھے ہوں گے۔

رحیمن:- اللہ بنائے رکھے بی بی آپ سی سرکاروں کو۔ سینکڑوں، ہزاروں دیکھے بھی اور خریدے بھی، پر............

سلمیٰ:- ہاں، ہاں، تو میں خود بھی تو وہی کہتی ہوں۔ اب تم ہی بتاؤ کہ میں اس بوٹی دار کا پاجامہ بناؤں، لگے گا کوئی گیارہ گز، اور پھر اتنے پر وہ کچا ہی تو پھر تو میں کہیں کی نہ رہی۔ بھلا بخشیں گے وہ مجھے۔ بس اٹھتے طعنے دیں گے، بیٹھتے [illegible]۔ میں کہتا

ہوں تم عورتوں کے منہ پر ناک نہ ہوتی تو تم مجس چیز کھاتیں! تو بی بی اس طرح کے طعنے کون سہے۔ یوں ہی کلیجہ پکار کھا ہے ان کی باتوں نے، اس پہ پیچھے بٹھائے میں ان کو ایک اور بہانہ دے دوں بتانے کا۔ نا بی بی مجھ سے اس بزاز سے کوئی رشتہ ناتا نہیں ہے، لے جائے اپنے ایسے گلے سڑے تھان اور بیچ لے اپنی ہوتیلا سوتیوں کے ہاتھ..........

رحیمن :۔ تو دے آؤں اس کو ؟ (اٹھانے لگتی ہے۔)

سلمیٰ :۔ ہے ہے ذرا ٹھہرو تو اور تھان تو دیکھ لوں۔ معلوم ہوتا ہے تم کو بھی اس موئے خفقانی بزاز کی ہوا لگ گئی۔ تم بھی ہتھیلی پر سرسوں جمانے لگیں (رحیمن گھبرا کر تھان رکھ دیتی ہے۔ سلمیٰ دوسرا تھان اٹھا لیتی ہے) وضع تو اس کی بھی اچھی ہے۔ مگر کپڑا ابھی سے بہا جا رہا ہے۔ بھلا یہ مشین پر کیا چڑھے گا اور کسی طرح سنبھال کے دبا کے سی بھی لو تو پہنتے ہی تار تار الگ۔ کہیں مونڈھا کھسکا، کہیں بغل نکل گئی۔ کہیں دامن میں پھولسڑے نکل آئے۔

رحیمن :۔ تو بی بی اسے ہرگز نہ لیجئے، کوئی اور پسند کیجئے۔

سلمیٰ :۔ ہاں اسے تو رہنے ہی دو۔ وہ سا اٹھاؤ۔ ہاں، ہاں وہی جس پہ چار خانہ سا بنا ہے۔ ارے یہ تو بالکل ٹاٹ ہے۔ میں کہتی ہوں ان بنانے والوں کو اتنی بھی عقل نہیں کہ ذرا سوچیں تو کہ کوئی ٹاٹ کا پاجامہ بنا کر کیا کرے گا۔ نہ ناف پر ٹھہرے گا نہ کولہے پر رکے گا۔ بس کوئی اسے پہنے تو یوں پہنے کہ ایک ہاتھ سے ہر وقت بند تھامے رہے۔ نہیں تو ہسل کر دیجئے اور بی بی بالکل ویسی کھڑی ہیں جیسا اللہ نے بنایا۔ تو بی بی یہ تو بیچ کھنواڑو شکل ہوگی۔ کیسا بھی دیا اور پھر بھی دیکھے...

بزاز :۔ ارے بوا، مجھے بتا بھی جلدی کہ میں یوں ہی کھڑا رہوں۔

سلمیٰ :۔ تو بھی اس کے پیٹ میں چوہے کودنے لگے۔ وہ سمجھتا ہے ہم نے اس کے تھان

مار لیے۔ بس ہم دیکھتے ہی دیکھتے اسے کھا جائیں گے، پی ڈالیں گے، ہضم کر دیں گے۔ لے نوج کوئی ان بزازوں جیسا ہو، یہ خود جو بے ایمان ہیں تو ساری دنیا کو بے ایمان سمجھتے ہیں۔

رحیمن :- تو بی بی کوئی پسند بھی تو کیجیے۔

سلمیٰ :- اے لو تم بھی اسی کی سی کہنے لگیں۔ ارے بوا پسند تو کر رہی ہوں اور کیا کر رہی ہوں۔ اب جو تم چاہو کہ میں یہ گھوڑے پر ڈالنے والا کمل لے لوں یا یہ دری کا ٹکڑا خرید لوں تو میں یہ نہیں کرنے کی۔ اب چاہے تم اس میں ناخوش ہو یا تمھارا وہ چہیتا خالہ پکارنے والا بزاز۔ میں تو چیزلوں گی تو دیکھ بھال ہی کے۔

رحیمن :- اچھا تو سرکار ذرا اسے دیکھیے۔ یہ تو بڑا بہاردار ہے۔

سلمیٰ :- ہاں ہے تو، اچھا ذرا اس کے دام تو پوچھو (رحیمن تھان لے کر باہر کی طرف چلتی ہے) مگر دیکھو ذرا اس بزاز سے سمجھا کے کہہ دینا کہ خواہ مخواہ دام زیادہ نہ ہانکے۔ ہم نے ایک سے ایک کپڑا دیکھا ہے، کوئی ہیلے نئے نہیں ہیں (رحیمن جلدی سے باہر چلی جاتی ہے) اے لو وہ چل دیں۔ ان ماما دائیوں کو بھی سودے سلف والوں سے بڑی ہمدردی ہوتی ہے۔ بس مالک کو چاہے جتنا ٹھگ لو ہیں روپے میں دونی دے دینا۔ یہ بڑھیا بھی کیا کسی سے کم ہے (رحیمن آتی ہے) کیا دام بتلائے ہیں اُس نے ؟

رحیمن :- کہتا ہے پانچ روپے گز سے کم نہ لے گا۔

سلمیٰ :- وہ تو میں پہلے ہی جانتی تھی کہ وہ ایک کے دس مانگے گا۔ بتاؤ ابھی پارسال ہی تو اس کے دام چودہ آنے تھے۔ آج یہ خدائی خوار پانچ مانگتا ہے۔ واہ لیا واہ تم نے کہا نہیں کہ جب تو مانگنے ہی پر آیا ہے تو دس روپے گز کیوں مانگتا، جب اسی طرح بے تکی اڑاتا ہے تو پھر تھوڑا کیوں بتاؤ......

رحیمن :- تو کیا کہہ دوں اس سے بیوی ؟

سلمیٰ :- اے تم اس سے کہو کہ ہم تو جو چودہ آنے گز لیتے تھے وہی لیں گے، اس کی سو مرتبہ غرض ہو تو گیارہ گز دیدے نہیں تو جھک مارے، اپنی گٹھری سنبھالے اور دوسرا گھر دیکھے (رحیمن جاتی ہے) اچھا آیا وہاں سے لوٹنے والا۔ پانچ روپے گز لیں گے جیسے ہیرے جواہرات ٹکے ہیں اس کے تھان میں اور ہمارے روپیوں میں کیڑے پڑے ہیں۔

رحیمن :- سرکار وہ اپنے تھان واپس مانگ رہا ہے۔ وہ کہتا ہے چودہ آنے میں چوڈ برس نہ دوں گا۔

سلمیٰ :- اُخاہ بڑا ایک بات والا آیا ہے بن کے وہ ! جیسے کوئی بڑا سیٹھ ہے۔ لے گلی گلی تو مارا پھرتا ہے اور اس پر یہ دماغ کہ چودہ برس نہ بیچوں گا۔ معلوم ہوتا ہے بزاز نہیں کوئی پوترڑوں کا رئیس ہے ---------

بزاز :- ارے بوا لاؤ تھان - بڑی دیر ہو رہی ہے۔

سلمیٰ :- دے آؤ بھئی دے آؤ، اس لاٹ گورنر کو اس کے تھان - اسے دیر ہو رہی ہے' کچہری کرنا ہے اسے، اہلکار، چپراسی، مقدمہ والے سب بیٹھے اس کا انتظار کر رہے ہوں گے، اسے جو پانچ منٹ کی دیر ہو جائے گی تو سینکڑوں کام بگڑ جائیں گے - ملک جو ہے وہ اس دیس کا۔ ہم تو اس کی رعایا پرجا ہیں - ہم اس کے کپڑے دیکھ تھوڑے سکتے ہیں اور نہ اس سے مول بھاؤ کر سکتے ہیں۔

رحیمن :- تو بجور آپ بھی تو ایسے دام لگاتی ہیں کہ ---------

سلمیٰ :- اے بی بی تو مجھ کو کیا معلوم تھا کہ تم بیچ بیچ کی اس کی خالہ ہو۔ نہیں تو چپ مارے بیٹھی رہتی۔ زبان نہ ہلاتی۔ وہ ایک کے دس مانگتا تو میں کان بھی نہ ہلاتی - بس دام تمہارے ہاتھ میں لا کے گنا گن گن دیتی۔ تم نے اشارے کنائے میں بتا دیا ہوتا۔

تھیں تو الٹی اس پر بگڑنے لگیں (رحیمن جھلا کے سارے تھان سمیٹتی ہے) لئے جا یہی ہو نہ سب؟ خدا اس کو گھنا دینا اور اچھی طرح دکھا دینا کہ دیکھ لے بابا کہیں سے تیرا ایک انگلی بھی کم نہیں ہے۔ نہ کسی نے کھا لیا، نہ کوئی ہضم کر گیا۔

رحیمن:۔ (تھان دے کر بلٹتی ہے) مُفت مُفت میں ہلکان کر مارا، نہ لینا نہ دینا کھاک!

سلمیٰ:۔ واہ بوا واہ، تم نے بھی اچھی کہی۔ یہ جو اسی بہانے دو گھڑی دل بہل گیا وہ؟

(ختم)

علی عباس حسینی

راز گریز

دیارِ ہوش کی بے کیفیوں سے کوسوں دور — اک ایسا دیس ہے خوابوں کے نشہ زاروں میں
جہاں حیات سکون و سرور کا ہے نام — غمِ زوال پر افشاں نہیں ستاروں میں
ہے بے نیازِ خزاں جس کی وادیِ گل پوش — ہجومِ نکہت و مستی ہے سبزہ زاروں میں
افق پہ گھرے سنہرے غبار کانپتے ہیں — ترانے گونجتے ہیں دم بخود نظاروں میں
بجائے برق چمکتے ہیں مرمریں غلغال — گرج کی جا پہ ترنم ہے ابر پاروں میں
فلک کی لمبی مسافت سے تھک کے شمس و قمر — دھندلکے اوڑھ کے سوئے ہیں کوہساروں میں
وہ سازِ روح ہے جسے زخمہ ور نہ چھیڑ سکے — ہے نغمہ ریز سمن پوش جوئباروں میں

یہی جہاں ہے مرے مرکزِ نظر کا مقام
وہیں ملی ہے مجھے لذتِ حیاتِ دوام

مری اڑان کو دنیا گریز کہتی ہے — مرے خیال کی پرواز کو شکستِ حیات
مگر خموش ستیزوں میں یہ راز مجھ پہ کھلا — کہ سب خروش ہے محکوم کی حیات و ممات
یہاں غنیم کا کھٹکا نہ حادثات ستیز — نہ ذوق و شوقِ شہادت نہ حریت کے نکات
امیر ساقی و ساغر کے مخمصوں میں اسیر — غریب زر کو سمجھتے ہیں قاضی الحاجات
مجھے نہیں ہے تعفن کی زندگی منظور — کہ میری روح پہ ہے سایۂ حریمِ ذات
جہانِ تیرہ نہ میرے جنوں کو راس آیا — کہ اس میں رات بھی ہے رات اور دن بھی رات
میں کیوں نہ شعر کی ان رفعتوں پہ اڑتا پھروں — جہاں سمجھتا ہوں محکومیوں کو خواب کی بات

[illegible] جواب بھی چاہو تو لا دو جہاں کو تڑپا دیں [illegible]
[illegible] مگر نہ چھلکے پڑے آسمان پہ اٹھ جائیں [illegible]

احمد ندیم قاسمی

تنقید و تبصرہ

دستور الفصاحت:- از احد علی یکتا۔ مرتبہ عرشی صاحب رامپوری، مطبوعہ ہندوستان پریس رامپور۔ سائز ۲۰×۲۶/۸ صفحات تقریباً ۲۵۰، کتابت ٹائپ، کاغذ عمدہ۔ قیمت عہ/ غیر مجلد مجلد دو روپے آٹھ آنے (عہ/)

کتاب خانہ رامپور کی یہ چوتھی کتاب ہے جو امتیاز علی عرشی صاحب کی مرتب کی ہوئی ہے۔ عرشی صاحب ناظم کتب خانہ تقریباً ہر سال کسی نہ کسی کتاب کو بڑی محنت، جانفشانی اور دقت نظری سے مرتب کرکے اردو داں پبلک کے سامنے پیش کرتے رہتے ہیں۔ مکاتیب غالب ان کا پہلا کارنامہ ہے۔

زیر نظر کتاب اردو کی اولین قواعد میں سے ہے۔ جو باوجودیکہ ۱۲۴۹ھ میں صاف ہوئی لیکن ۱۹۳۶ء تک منصۂ ظہور پر نہ آسکی۔ ابتدا میں ۷۲ صفحات کا عرشی صاحب کا دیباچہ ہے جس میں رسالہ مذکور کے مصنف احد علی یکتا کے حالات، نسخے کی کیفیت، ترتیب مضامین، زمانۂ تالیف، اس کے مآخذ سے بحث کی ہے اور اس میں جو خاص نکات ہیں ان کا بھی ذکر کیا ہے اس کے بعد رسالے پر خود عرشی صاحب نے جو حواشی دیے ہیں ان کی فہرست بڑی شرح و بسط کے ساتھ ۸۰ صفحات میں دی ہے جو بجائے خود ایک مفید مضمون ہے اور اس سے کتاب خانہ رامپور کے نادر قلمی مطبوعہ فہرست تذکرہ جات کا بھی ایک اندازہ ہوجاتا ہے۔

مختلف داخلی شہادتوں سے عرشی صاحب نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ یہ کتاب یا رسالہ دریائے لطافت سے پہلے کا لکھا معلوم ہوتا ہے۔ میرے خیال میں اگر دریائے لطافت کی تیاری کے زمانے کو بھی اسی طرح جانچا جاتا جس طرح "دستور الفصاحت" کے زمانے کو جانچا گیا ہے تو دریائے لطافت بھی اپنے سال اختتام (۱۲۲۲ھ) سے پہلے کی تالیف ثابت ہوتی۔ ایک

علاوہ تقدیم و تاخیر ثابت کرنے کے لئے دونوں کے ابواب و عنوانات کا مقابلہ بھی ضروری تھا اس سے یہ معلوم ہو جاتا کہ کہیں یکتا نے دریائے لطافت' سے خوشہ چینی تو نہیں کی ہے جس سے وہ ظاہر بالکل منکر ہے اور کسی 'قواعد اردو' کے اس وقت وجود تک سے انکار کرتا ہے۔

"ہیچ کتابے از کتب ایں فن ورسائل ایں ہنر کہ مفید مطلب و معین مقصد دریں باب می شد، در نظر نداشتم کہ موافق آں می نوشتم۔"

حالانکہ خاتمے میں انشار کے بیان میں اس نے دریائے لطافت کے نام سے انکا ظاہر کیا کہ

فاضل عالی تقریر شاعر رنگین تحریر، غواص بحر فصاحت، صاحب 'دریائے لطافت' ظریف طبیعت حکیم انشار اللہ خاں انشار۔ ممکن ہے اس میں کوئی اس کی مصلحت ہو۔

بہرحال تقدیم و تاخیر کا یہ مسئلہ دلچسپ ضرور ہے اور اگر قواعد اردو کی ترتیب کی تاریخ لکھنا ہے تو عرشی صاحب کو صفیر بلگرامی کا یہ دعویٰ بھی پیش نظر رکھنا ہوگا کہ انشار نے تاریخ کے اصولوں کا سرقہ کیا ہے یا تمام تر اُن ہی کی خوشہ چینی کی ہے'۔ قمرالدین خاں قمر۔ یکتا اور تاریخ دونوں کے مربی تھے۔ یہ دونوں ہم نشیں اور ہم صحبت ضرور رہے ہوں گے، بہت ممکن ہے اسی اختلاف سے صفیر بلگرامی کا یہ شک اور بھی قوی ہو سکے اور شاید وہ حیات ہوتے تو دستور الفصاحت پر بھی یہی الزام رکھ سکتے۔ یکتا کا اپنے خاتمے میں جس میں انھوں نے سرآمد شعرائے عصر کا ذکر کیا ہے تاریخ کا ذکر کرنا بھی تعجبات سے معلوم ہوتا ہے۔

غرضکہ پیش نظر قواعد اردو ایک مفید اور اہم دریافت ہے جو عرشی صاحب نے کی ہے اور انھوں نے جو حاشی اس رسالے پر اردو کے تمام مشہور اور غیر معروف تذکروں کو پیش نظر رکھ کر لکھے ہیں وہ اردو ادب کے طالب علم کے لئے از بس مفید ہیں۔ بہتر ہوتا اگر یہ حواشی بھی عرشی صاحب اردو ہی میں لکھتے۔

یادگار شعرا، مترجم طفیل احمد صاحب۔ مطبوعہ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد سائز ۲۰×۳۰ قیمت ۲ عمر کتابت ٹائپ۔ کاغذ عمدہ اچھا صفحات ۔۔۔

یہ کتاب ڈاکٹر اسپرنگر کی فہرست کتب خانہ شاہان اودھ کے اس حصے کا ترجمہ ہے جس میں انھوں نے اردو کے شعرا کے حالات لکھے ہیں۔ ان شعرا کی تعداد ۱۰۵۱۹ ہے اور صرف ان کا ذکر ہے جن کا پتہ ۱۸۵۰ء تک چلا تھا۔ شروع میں مسعود حسن صاحب رضوی کی تقریظ ہے جس میں اس فہرست کے متعلق جملہ معلومات درج ہیں۔

ڈاکٹر اسپرنگر ۱۸۴۸ء میں گورنمنٹ کی طرف سے اودھ کے شاہی اور مختلف رؤسا کے ذاتی کتب خانوں کی فہرست بنانے کے لئے مامور کئے گئے تھے۔ ۱۸۵۰ء تک ان کا اودھ میں قیام رہا اور اس عرصے میں تقریباً دس ہزار کتابوں کی فہرست انھوں نے تیار کی اس فہرست کی صرف پہلی جلد ۱۸۵۴ء میں کلکتے سے شائع ہوئی تھی۔ اس میں جو اردو کے شعرا کا حال ہے اس کا یہ ترجمہ ہے۔ اس تذکرے میں شعراء کا انتخاب نہیں دیا گیا ہے۔ لیکن ایک بڑے کام کی بات یہ ہے کہ جس شاعر کا حال جن جن تذکروں سے لیا ہے ان کا حوالہ بھی دے دیا ہے۔ اس سے تحقیقی کام کرنے والوں کو بڑی مدد ملے گی۔

بہت ضرورت تھی کہ اسپرنگر کی فہرست کے اس مفید حصے کا ترجمہ ہو جائے۔ مترجم نے سلاست اور ناشرین نے صحت کا خاص طور پر خیال رکھا ہے۔ اور اس نے جگہ جگہ مفید اور مختصر حواشی بھی دے دئے ہیں۔ لیکن یہ حواشی بہت ہی مختصر ہیں۔

قرآن اور علاج خوف :۔ از ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب استاد فلسفہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔ رسالہ مؤلف سے چار آنے میں مل سکتا ہے۔ سائز ۲۰×۲۶/۸ صفحات ۱۳

اس مضمون میں مصنف نے یہ بات بتائی ہے کہ قرآن کی رو سے خوف اور اس کے مختلف طریقوں سے نجات ممکن ہے۔ علم کی تصحیح یعنی عقائد کا درست رکھنا اور عمل کا صحیح استعمال یعنی عقائد درست رکھنے کی بابت فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ کو رحیم و حکیم سمجھو، کائنات کو دوست خیال کرو اور حق تعالیٰ کی معیت کا یقین رکھو۔ عقائد کی اس درستی کے بعد ان کا صحیح استعمال اس طرح ہو سکتا ہے کہ محبت، شعور اور تعلق کے ساتھ بچوں کا سا سلوک کرو اور اپنے عمل الفت سمجھا کے بجھائے رکھو

رجسٹرڈ ایل نمبر ۱۸۹۲
جلن، سوزش اور خطرناک
DELHI
جلنے کی تکلیف دہ ہونے کے ساتھ ساتھ خطرناک بھی ہوتی ہے۔
سگرٹ سے آگ کی معمولی جلن کے علاج پر بھی اگر توجہ نہ کی جائے
تو اس سے خون میں زہر پھیل جانے کا خطرہ پیدا ہوتا ہی ہے۔ جیسے
ہی آپ کسی شے سے جل جائیں آپ جلنے کی جگہ پر فوراً جلمار
لگا دیجئے۔ خواہ آپ آگ سے جلے ہوں یا گرم تیل ہوئی کسی تیل
شے سے جلمار فوراً درد کو دور کر دے گا۔ چونکہ اس میں تیز
لیکن سوزش نہ کرنے والے اصلی اجزا شامل ہوتے ہیں اس لئے
اس کے استعمال سے جراثیم نہیں پیدا ہونے پاتے یہ چھالے
بھی نہیں پڑنے دیتا۔ مزید براں اس سے جلے ہوئے مقام پر
بہت جلدی کھال پیدا ہو جاتی ہے۔
ہر قسم کی جلن اور سوزش کو ٹھنڈک اور آرام پہنچانے کے
لئے جلمار اپنی مثال نہیں رکھتا۔ اس بات کا خیال رکھئے کہ
جلمار ہمیشہ آپ کے گھر میں موجود ہے۔ بجائے اس کے کہ
خون میں زہر پھیل جانے کے علاج پر کثیر رقم صرف کی جائے، یہ
زیادہ بہتر ہے کہ جلنے سے جراثیم نہ پیدا ہونے دئے جائیں۔
آج ہی اپنے قریب دواساز یا اسٹور سے اس کا ایک
ٹیوب خرید لیجئے۔
آج ہی ایک ٹیوب خرید لیجئے
معلوم نہیں کس وقت
اس کی آپ کو ضرورت پڑ جائے
JALMAR HAS SAVED YOU!
جلمار
جلمار دواسازوں اور اسٹوروں سے دستیاب ہو سکتا ہے

جامعہ

زیر ادارت:- نورالحسن ہاشمی ایم، اے

جلد ۲۹ نمبر ۴	بابتہ ماہ اکتوبر ۱۹۴۳ء	چندہ سالانہ صہ فی پرچہ (۸)

فہرست مضامین

اُردو اکادمی

"جامعہ ملیہ دہلی کی اردو اکادمی" نے علمی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ عام ضرورتوں کی طرف زیادہ توجہ کی ہے اور علاوہ علمی کتابوں کے عام دلچسپی کی کتابیں اور بچوں کے کام کی کتابیں اچھی تعداد میں سلیقے سے شائع کی ہیں اور اس طرح اُردو کے ادبی خزانے میں مفید اضافہ کیا ہے"۔

(ماخوذ از خطبۂ صدارت آل انڈیا اورینٹل کانفرنس شعبۂ اُردو ۱۹۴۱ء)

آپ بھی اس اکادمی کے ممبر ہو کر اس کی مطبوعات سے فائدہ اٹھائیے۔

قواعد و ضوابط ایک کارڈ لکھ کر طلب کیجیے۔

ہمارے یہاں سے ہندوستان کے دیگر اداروں کی کتابیں بھی اپنی اصلی قیمت پر ملتی ہیں۔

مکتبہ جامعہ دہلی
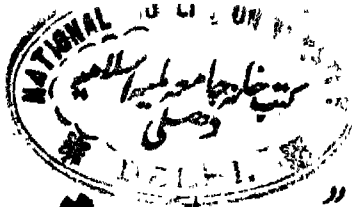
"میرا سیاسی عقیدہ"

(یہ مختصر مقالہ جی۔ لوز ڈکنسن کا لکھا ہوا ہے جو کیمبرج کے کنگز کالج کا متعلم تھا اور بعد میں اس کا فیلو بن گیا۔ یہ اسی صدی کا مصنف ہے اور اس نے ۱۹۳۲ء تک ہم سے معاصرت کی ہے۔ تب اس نے وفات پائی۔

یہ مقالہ لارڈ کیلتوپ کا سیاسی عقیدہ" کے عنوان سے چھپا ہے جس کے تحت ایک قدامت پرست (ٹوری) کے مخصوص نظریوں کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس اعتبار سے یہ قابلِ قدر ہے کہ اس میں بڑی بے باکی سے ذاتی افکار کا اظہار کیا گیا ہے، یہ وہ افکار ہیں کہ ان کا انحصار پوری طرح ذاتی تعصبات پر ہے۔ جس عقیدے کی پیروی کی گئی ہے وہ بڑا پرانا معلوم ہوتا ہے، اتنا پرانا کہ اس وقت کی دنیا میں ایک سرے سے ناقابلِ عمل ہے۔ دنیا ہر لحظہ نت نئے انقلاب کو جنم دیتی ہے اور اس پر مجبور نہیں کہ ہمیشہ جوں کی توں رہے۔ حالات کا بدلتا ہوا تقاضا افعال اور تحریکات کو یک رخی نہیں رہنے دیتا، ہوا ہر سمت چلتی ہے نہ کہ ایک سمت۔ یہ ایسی سچائی ہے کہ زندگی کے ہر پہلو سے نمایاں ہے۔ ریاست اور سیاست اس کے اثر سے کسی طور محفوظ نہیں۔

یہ خیال کہ ریاست کا ایک طبقہ حکومت کرنے کا حق رکھے، صریحاً ناقص ہے۔ اس سے ریاست کا اصل منشا پورا نہ ہوگا اور حکومت موروثی اجارہ بن کر رہ جائے گی۔ یہ ملوکیت پرستی ہے اور اس میں قباحتیں ہی قباحتیں ہیں۔ پھر یہی کیا کم قباحت ہے کہ زمانے کے انقلابی رجحانات اسے برداشت نہیں کرتے۔ کاغذ کی یہ ناؤ مدتوں چلی ہے اور دنیا نے بڑے بڑے شہنشاہی دور دیکھے ہیں لیکن اب شکل وہ نہیں۔ ملوکیت نئے اسلوب کو جگہ دے رہی ہے۔

یہ امر [illegible] اور انسانیت سے قطعاً بعید ہے کہ افراد میں نسلی، ملی یا دیگر امتیازات کو ختم کرنے کی بجائے ابھارا جائے، اتنا ابھارا جائے کہ احساس بالجبر ہو جائے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر [illegible]

دبوے دیگراست۔ لیکن ایک کو ایک پر ترجیح دینا جھگڑے کی بات ہے، ہاں اگر ترجیح کا سوال اڑا دیا جائے تو جھگڑا چکایا جا سکتا ہے، چمن میں پھول کھلتا ہے اور بھلا لگتا ہے۔ لیکن بعض طبیعتیں ایسی ہوں گی جو نہ مانیں گی کہ بھلا ہے یا بھلا ہے تو اتنا یا ایسا ہی بھلا ہے جتنا یا جیسا آپ سمجھتے ہیں۔ یہ ٹھیک سہی کہ آپ اپنی محبوبہ کی تعریف کریں یا چاہیں تو اسے پوجیں۔ لیکن کیا ضرور ہے کہ دوسرے بھی آپ کے حسب منشا ایسا ہی کریں۔ ہمارا سماج فرشتوں کی آبادی نہیں جہاں ہر تضاد کا فقدان ہو بلکہ یہ ان افراد پر مشتمل ہے جو نیکی اور بدی، دونوں کے امتزاج سے مل کر پیدا ہوئے ہیں۔ سماج میں ہر اچھے بُرے کی کھپت ہے۔ لیکن ضرورت اس کی ہے کہ سماج کو امن اور صلح کے قیام کے لئے ان کا پرخلوص تعاون حاصل ہو۔ مکان کی تعمیر کے لئے جہاں پوری اینٹ کام دیتی ہے وہاں ٹکڑے بھی کھپ جاتے ہیں اور کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ یہ کہنا کہ فلاں کو فلاں پر ترجیح حاصل ہے، بے بنیاد اور بے معنی ہے۔ ابھی تک ایسا کوئی حقیقی معیار قائم نہیں کیا گیا جس کی رو سے ہر فرد کی صحیح صحیح اضافی قدر معلوم ہو سکے۔ اخلاق کے بعض اصول ہیں، لیکن وہ غیر مادّی اقدار کا معیار قائم کرتے ہیں۔ اور ہمارے مادّی مسائل مادّی وسائل سے حل چاہتے ہیں۔ اگر یہ ہو جائے تو ہم متفقانہ طور پر بہت بڑی دشواری کا سدّباب کر پائیں گے اور باہمی اختلاف کی قبیح اور غیر اخلاقی صورت بدل دیں گے۔

"ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز" کا فلسفہ صرف اتنا ہی محدود نہیں کہ نماز پڑھتے وقت اس کا ورد کیا کریں بلکہ عبادت گاہ سے باہر، سماجی زندگی میں اس کی عام ترویج کی جائے تاکہ "بندہ" اور "بندہ نواز" یا محکوم اور حاکم، یا غلام اور آقا کا مفہوم ایک ہو جائے۔ ہر کامیاب اور بلند پایہ مذہبی تحریک کا اوّلین مقصد اخوت یا مساوات تھا۔ اسلامی تاریخ کے نمائندے ادوار یہ ثابت کر سکیں گے کہ اخوت اور مساوات دھوکا یا دکھاوا نہ تھا بلکہ سچ تھا۔ اب ہمیں موقع میسر آ سکتا ہے کہ اُسے ہم زیادہ سائنٹفک طرز پر تشکیل دیں۔ فی الحال ہم دیکھ رہے ہیں کہ نااہل اور خود غرض افراد برسر اقتدار آ گئے ہیں اور خود کو برگزیدہ بندے سمجھتے ہیں، باقی سب ان کے آگے کمتر درجے والے ہیں۔ یہ بہت بڑی بے اصولی اور خرابی ہے۔ اسے اخلاق، مذہب یا کسی مثالی مسلک سے واسطہ نہیں۔ ہم لئے ہم پائیدار سمجھتے ہیں۔

کیونکہ یہ انقلاب کی زد سے محفوظ نہیں۔

افراد کا باہمی اختلاف، جس کی رو سے ان کی تعیین معاشی درجوں میں ہوتی ہے، بڑی حد تک دور ہو جاتا ہے جب ہم نئے اور ترقی یافتہ حالات کا سماجی کرہ تیار کر دیتے ہیں، ایسا کرہ جو محنت اور معاوضے کے اعتبار سے مساوات کا ماحول رکھتا ہو۔ اس وقت نقشہ ہمارے مفہوم کے برعکس ہے، ہمارے ذرائع، ہمارے مفاد اور ہماری دولت کی تقسیم غیر منصفانہ اور خود غرضانہ بے اصولی پر رائج ہے اور اس کا ذاتیاتی طرزِ عمل یکسر مذموم و مضر ہے۔ اگر ہم اپنی قوم کے ہر فرد کو اکائی کا درجہ دیں اور کسی فرد کو ترجیحاً ایک سے زائد اکائی کا درجہ نہ دیں تو ہم ریاست میں مثالی دیا کریسی کو جنم دیں گے۔ ہم اس مثالی نصب العین کو پیش نظر رکھتے ہوئے افراد کے سماجی اختلاف کو کم سے کم کر دیں گے اور صحیح طریقے سے اقتصادی و سیاسی صداقت کی آخری منزل پالیں گے۔ یہ ہماری ترقی کا معیاری مسلک ہے اور اسی سے ہم افراد کے سماجی عارضوں کا علاج کر سکتے ہیں۔ اگر ہم ہر فرد کو اپنے امکان بھر یکساں ماحول مہیا کر دیں، ہر فرد کو اس کے ذہنی و بدنی قویٰ کی نشو و نما کا برابر موقع دیں اور شخصی ترجیح کا خاتمہ کر دیں تو ہم نجات حاصل کر لیں گے۔ ہر فرد قدرتاً تین طرح سے کم و بیش یکساں ضرورت مند ہے۔ خورد و نوش، پوشش اور رہائش کی ضرورتیں سب کے ساتھ ہیں اور تمدن کی "مالابد" ہیں۔ انہی کی پیچیدگی نے اشیاء کی جائز تقسیم کو محال کر دیا ہے، جب تک اس مسئلے کو صاف صاف، اشتراکی اور سچے جمہوری اصول سے حل نہ کیا جائے گا، مشکل آسان نہ ہوگی۔ موجودہ تمدن کی اقتصادی خرابی اور مسلسل آشوب کا سبب حکمران طبقہ یا سرمایہ داروں کا گروہ ہے۔ جب ایک فرد اقتدار حاصل کرتا ہے تو وہ انہی تینوں ضرورتوں پر قبضہ کرتا ہے اور دوسروں کو آگے بڑھنے سے روک دیتا ہے۔ آج کل دنیا میں دو طبقے پائے جاتے ہیں ——— رکھنے والوں (HAVES) اور نہ رکھنے والوں (HAVE-NOTS) کے۔ سب بے چینی اور بدامنی ان کے مہلک تصادم سے ہے، اس غیر تعمیری اور تخریبی تصادم کا سد باب ضروری ہے۔ ہمیں طبقاتی معاشرت نہیں چاہیئے

ہمیں وہ سماج درکار ہے جو ایک طبقے والی ہو۔ اب وہ طبقہ خواہ رکھنے والوں کا ہو اور خواہ نہ رکھنے والوں کا۔

سماج کا بگڑا ہوا رجحان بدلنے کی ضرورت ہے۔ ہماری لعنت کا وہ نامبارک لفظ جسے "حکومت" کہتے ہیں، پردے میں غلامی کی بناڈالتا ہے۔ ہماری سماج کو ایسی حکومت کی ضرورت نہیں۔ حاکموں نے غلامی پھیلائی ہے۔ اور ڈھوروں کی تعداد میں اضافہ کیا ہے۔ ہمارا تخیل مصلحانہ ہے اور بھلے لوگوں کو چاہتا ہے جو کام کو کام سمجھیں اور اسے مشترکہ مفاد کے لئے کریں، یہ نہیں کہ اسے خودغرضی اور اقتدار کا ذریعہ بنائیں۔ آئینی، انتظامی، صنعتی یا کسی نوع کا ریاستی کام ہو اسے سماجی فریضہ جان کر کریں۔ سماج بھر میں اسی ایک رجحان کا رواج ہو اور دیگر مضر اور تخریبی رجحانات کو قانوناً جرم قرار دیا جائے۔ پھر ہم جمہوری ہونے کا دعویٰ کر سکیں گے۔ (رحمٰن مذنب)

"میں سیاسیات میں کیوں پڑا؟ کس لئے ایسا کیا؟ یقیناً مجھے علم نہیں۔ درحقیقت میرا یہ ارادہ نہ تھا۔ میرا ارادہ سادہ لوح دیہاتی کا تھا اور باقی زندگی میں مجھے یہی بننے کی امید ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ میری کنارہ کشی کا یہی سبب ہے۔ جب میں نوعمر تھا تو ایک طرح کا خانگی فرض سمجھ کر مجھے سیاسیات میں ڈھکیلا گیا، آدمی جب ایک بار اس میں پڑ جائے تو پھر اس کے لئے نکلنا محال ہوتا ہے۔ میں اب نکل رہا ہوں کیونکہ میرے لئے اس میں دوسری بہتیری چیزوں کے ساتھ چنداں گنجائش نہیں۔ "ٹوری پن" ختم ہو چکا اور میں آپ کے صحیح بیان کے مطابق ٹوری ہوں۔ آپ معلوم کرنا چاہتے ہیں، کیوں؟ معلوم نہیں کہ میں آپ کو بتا سکوں گا! غالباً مجھے اس لائق ہونا چاہیئے۔ رینہم حتی الامکان واضح ترین طریقے سے بتا سکتا ہے اور بتا دے گا کہ وہ کیوں حرّیت پسند (لبرل) ہے۔ لیکن رینہم اصول رکھتا ہے، اور میرے پاس صرف تعصبات ہیں۔ میں قدامت پسند ہوں کیونکہ میں یونہی پیدا ہوا، یہ اسی طرح ہے کہ جیسے کوئی انقلاب پسند ہو کیونکہ وہ یونہی پیدا ہوا۔ لیکن دراصل میں تسلیم کرتا ہوں کہ رینہم حرّیت پسند ہے کیونکہ وہ خود کو باور کرا چکا ہے کہ اسے یہی ہونا چاہیئے۔ بدیں بنا میں اسے سراہتا ہوں، لیکن میں اُسے سمجھنے سے بالکل قاصر ہوں۔ رہا میرا سوال، سو میں اپنی حمایت بلکہ اپنی وضاحت کے لئے فقط یہ کر سکتا ہوں کہ اپنے تعصّبات کی تصریح کر دوں۔ میں فی الحقیقت خوش ہوں کہ مجھے اس کا موقعہ ملا، صرف اس لئے کہ آدمی جو عقیدہ رکھتا ہے وقتاً فوقتاً اس کے تذکرے سے اسے اطمینان ملتا ہے، یہ وہ شے ہے جو سیاسی زندگی میں عنقا ہے۔

میرے تعصبات میں پہلا تعصب ہی کہ میں عدم مساوات کا قائل ہوں۔ مجھے ہرگز اعتماد نہیں کہ یہ تعصب مجھی تک
محدود ہی ——— بہتیرے لوگ اس پر عمل کرتے ہیں، یہاں تک کہ امریکہ میں یہی دستور ہی۔ میں بس حقیقت
کا قائل ہی نہیں بلکہ عدم مساوات کے مثالی نظریے کو قبول کرتا ہوں۔ میں ڈارون یا جرمنی کے قیصر کا ہمپایہ نہیں
ہونا چاہتا، پھر نہ جانے کوئی دوسرا کیوں میرا ہمپایہ ہونے کا متمنی ہو۔ میں ایسا سماج پسند کرتا ہوں جو ٹھیک طریقے سے
درجوں اور گروہوں میں منقسم ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا قصاب یا میرا مالی مجھے سلام کرے اور اسی طرح مجھے ملک کے
حضور میں برہنہ سر کھڑا رہنا منظور ہی۔ نہ جانے گاؤں کے بڑھئی سے بہتر ہوں کہ بدتر لیکن میں اس سے مختلف ہوں
میں چاہتا ہوں کہ وہ اس اصلیت کو جانے اور میں بھی اسے جانوں۔ مجھ سے کہا گیا ہی کہ امریکہ میں ہر آدمی، بہ ہر قول
و بہ ہر فعل، آپ کو ہمیشہ براہِ راست یا بالواسطہ آگاہ کرتا رہی گا کہ وہ اتنا ہی اچھا ہی جتنے آپ ہیں۔ یہ درست نہیں
اور اگر ہی تو یوں کہتے رہنا عمدہ اخلاق کی بات نہیں۔ میں اس سماج کو ترجیح دیتا ہوں جس میں افراد کے درجے ہوں
اور وہ ان سے واقف ہوں۔ ہر ممکن سماج میں افراد ہمیشہ طبقوں سے رہتے ہیں، صرف جمہوری سماج میں وہ اس
کا اعتراف کرنے سے انکار کرتے ہیں جس کا یہ نتیجہ ہی کہ انگلستان میں زیادہ اکھڑ، زیادہ ناگوار اور کمتر اخلاقی رستے
پائے جاتے ہیں۔ جتنے کہ وہ ہیں یا ہوتے تھے۔ یہ میرا پہلا تعصب ہی، اسی کا تقلیدی نتیجہ یہ ہی کہ مجھے پوری جمہوری
تحریک سے نفرت ہی۔ میں سیاسی اعتبار سے افراد کو مساوی بنانے میں کوئی دانش نہیں پاتا جب کہ وہ ہر دیگر اعتبار
سے غیر مساوی ہیں۔ آپ جو چاہے کیجیے، لیکن ہمیشہ محدود افراد ہی ہوں گے جو حکومت کریں گے۔ حق رائے دہندگی
کی توسیع کا واقعی انجام، سیاسی اقتدار کو جاگیرداروں سے کاروباری جماعتوں اور تارکشوں میں منتقل کرنا ہی۔
خیر، میرے نزدیک یہ تبدیلی مستحسن نہیں پھر بھی یہ چیز مجھے دوسرے تعصب کی جانب لے جاتی ہی۔ یہ تعصب
کاروبار کے خلاف ہی۔ میرا مطلب نہیں کہ ہم اس کے بغیر کام چلا سکتے ہیں۔ ملک میں دولت ضرور ہونی چاہیے
گو مجھے گمان ہی کہ جب ہمارے پاس اس سے کم دولت تھی جتنی کہ اب ہی تو ہمارا ملک زیادہ خوش حال
تھا۔ مجھے اس سے بحث نہیں کہ بہت خوب، ذی وقار اور ہوشیار کاروبار والے ملتے ہیں، لیکن میرا
عقیدہ یہ ہی کہ دولت کے لئے تگ و دو افراد کو ریاست کے کام کے لئے ناکارہ کرنے کا رجحان رکھتی ہی۔ میں
پرانے زمانے کے اس انتہا پسندانہ نظریے سے ہمدردی کا اظہار کرتا ہوں کہ کاروباریوں کو سیاسی امور سے

بے واسطہ کیا جانا چاہیئے۔ میں بھلے مانسوں کی حکومت کا معترف ہوں اور بھلے مانس کے لفظ کا مطلب ٹھیٹ پرانی انگریزی کے مطابق لیتا ہوں کہ وہ غیر محتاج ہو، بچپن سے سیاسی ماحول میں پلا ہو اور اپنے تئیں فوج، بحریہ، کلیسا یا پارلیمان کے لئے مخصوص کر چکا ہو۔ یہی فرد تھا جس نے رومہ کو عظیم بنایا اور اسی نے ماضی میں انگلستان کو عظیم بنایا۔ میں نہیں مانتا کہ جس ملک پر سوداگروں، بنیوں اور پیشہ وروں کی حکومت ہو، وہ کبھی عظیم ہو سکے گا۔ یہ نہیں کہ یہ افراد مقتدر نہیں ہو سکتے، بلکہ ان کی زندگی کے اطوار اور پیشے انھیں سیاسی کام کے لائق نہیں رہنے دیتے۔

"خیر، یہ ایک نوع کا جذبہ ہے ———— (میں اسے اصول نہیں کہوں گا) جو میری سیاسی زندگی میں میرا مسلک بنا۔ یاد رکھئے کہ اوّل اوّل جب سیاست میں میں نے قدم رکھا تب اس کا اظہار کرنا آج کی نسبت کہیں زیادہ سہل معلوم ہوتا تھا۔ پہلے قانونِ اصلاحات کے بعد تک انگلستان میں ہنوز زمیندار شرفا حکومت کرتے تھے۔ میری رائے میں قانونِ اصلاحات کو غلط انداز سے زیرِ غور لایا گیا، اگر میں حسبِ مراد کرپاتا تو وہ یونہی کرنے لگتے۔ اصل میں یہ کوئی ایسی پارلیمانی اصلاح نہ تھی کہ اس کی ضرورت ہوتی، یہ بہتر اور دانشمندانہ حکومت تھی۔ تب کی مقتدر جماعت ایسی حکومت مہیا کر سکتی تھی جیسا کہ افلاس بندی کے نئے قانون، صحتِ عامہ کے قوانین اور دیگر مسلسل اقدامات سے ظاہر ہے۔ غلّے کے قوانین کی تنسیخ تک یہ واضح ہے کہ وہ کم از کم قوم کی خاطر اپنے مفاد کو قربان کرنے میں کتنی صلاحیت والے تھے، ورنہ بصورتِ دیگر میں اس اقدام کو ان کی سب سے بڑی غلطی سمجھتا ہوں۔ میں سیاسی اقتصاد داں ہونے کا مدعی نہیں اور میں ان سے استفادہ کرنے کو تیار ہوں جن کا کام یہ جاننا ہے کہ ہماری دولت آزاد تجارت کے ذریعے بڑھی ہے۔ لیکن کسی نے مجھے یہ باور نہیں کرایا اگرچہ بہتیروں نے اس کی سعی کی، کہ دولت کی ترقی قوم کی حکمتِ عملی کا تنہا مقصد ہونا چاہیئے۔ اور یہ ضرور روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ آزاد تجارت نے ہماری سماج کا پورا ڈھانچہ بگاڑ دیا ہے۔ اس نے تندرست مزدوروں کے بجائے خستہ حال شہری پرولتاری کو زمین پر متمکن کر دیا ہے۔ اس نے دولت کا بڑا ذخیرہ دیہی شرفا سے لے کر کاروباریوں کو پکڑا دیا ہے۔ اس نے ایسا کر کے زیادہ سے زیادہ طاقت ان کی بجائے جو اسے استعمال کرنے کی روایتی شان رکھتے ہیں، ان کے پاس پہنچا دی ہے جو ذخیرہ بازی کے سوا اور کوئی

روایات نہیں رکھتے۔ یہی بات جو میں نے سوچی ہی بلا شبہ کسی سیاست داں کے کرنے کا کام ہی یعنی جماعتوں کے
باقاعدہ باہمی رشتوں کا اندازہ کرنا جنھیں ہم نے مقابلے کے موقعوں کے سپرد کر دیا ہی۔ ہم نے مسئلہ کا حل تلاش کرتے
کی بجائے اسے مایوسانہ ترک کر دیا ہی، یہ معلوم ہوتا ہی کہ ہماری آبادی ہمارے ہی سامنے جسمانیت، اخلاق، مذاق
اور ہر قابلِ لحاظ امر میں پست ہو رہی ہی، اور پھر ہم بڑھتی ہوئی دولت کے انبار سے اپنی دلجمعی کرتے ہیں۔ میری رائے
میں آزاد تجارت، ملک کی حکمران جماعت کی پہلی بڑی خود فریبی تھی اور دوسری حق رائے دہندگی کی توسیع۔ میں
یہ نہیں کہتا کہ میں پارلیمانی آئین میں ایک سرے سے کوئی تبدیلی نہ کرتا جو بعدہٗ ہم تک قائم رہتی۔ لیکن میں نے
بے کم و کاست یہ ہرگز قبول نہ کیا ہوتا کہ ہر ایک کو رائے دینے کا حق حاصل ہی اور پھر اس سے کمتر یہ کہ
سب برابر کا حق رکھیں۔ یوں ہم کچھ بھی کہیں، لیکن سماج افراد پر نہیں، طبقات پر مشتمل ہوتی ہی اور اس کی نمائندگی
جماعتی اسلوب سے ہونی چاہیئے۔ میں کاشتکاروں، کاریگروں، تاجروں اور اشیاء سازوں کو حسبِ مراد حق
رائے دہندگی دے دیتا، لیکن مفاد کی غرض سے جماعت کو لیتا نہ کہ افراد کو اور ہر ایک کے ذمے اتنا بار سونپتا جو
موثر ہونے کا احساس دلا دیتا، در انحالیکہ دیہی شرفا کے لئے برتری محفوظ کر لیتا۔ بے شک یہ دشوار ہوتا، لیکن یہ
کرنے کے لائق ہی۔ میرے نزدیک یہ اتنا ہی احمقانہ تھا جتنا چناؤ کرنے والے نئے گروہوں کا اضافہ کرنا سہل تھا
بیان تک کہ مجھے اعتماد ہی کہ بہ اعتبار کیفیت ہم عالمگیر تکلیف میں مبتلا ہو جاتے اور یہ ہرگز نہ مانتے کہ ہم نے کبھی
اس کی آرزو کی تھی۔

لیکن جو کچھ کیا جا چکا ہی وہ فیصلہ کن اور لاعلاج ہی۔ آئندہ عوام، بلکہ وہ جو عوام پر قابو رکھتے ہیں، انگلستان
پر اقتدار پائیں گے اور یہ وہ لوگ نہ ہوں گے جن کے زیرِ نگیں رہ کر اس نے عظمت حاصل کی ہی۔ مجھ جیسوں
کے لئے سیاست میں چنداں گنجائش نہیں۔ اور جہاں تک میرا واسطہ ہی میں یہ جان کر درحقیقت خوش ہوں جنھوں
نے ہمیں اس جنجال میں ڈالا ہی انھیں ہمیں باہر نکالنا چاہیئے۔ غالباً وہ اپنے طور سے یوں ہی کریں گے، لیکن اس
طریقے سے اسے اس انگلستان سے مختلف کر دیں گے جسے میں نے جانا، سمجھا اور چاہا۔ ہمارے یہاں شہری
مخلوق کی آبادی ملے گی، مجھے امید ہی کہ لوگ اب کی نسبت خورد و نوش اور سکونت کے لحاظ سے بہتر ہوں گے
زیادہ ہوشیار، تیز اور چست ہوں گے، اپنی عقل کے سہارے چلیں گے، لحظے بھر میں معتقد ثابت ہونے میں

ہر اس بات کے لیے مستعد ہوجائیں گے جن سے وہ واقف ہوں۔ لیکن حقیقتاً وہ بہت تھوڑی واقفیت رکھتے ہوں گے اور وہ بھی خوب نہ ہوگی۔ ایسے لوگ بہت کم ہوں گے جن سے میں لطف اندوز ہوتا ہوں، جنھیں میں مخصوص طرز کا انگلستانی سمجھوں اور جو گاؤں کے پروردہ ہوں، وہ لوگ جو سبزیوں کی مانند بڑھتے ہیں اور نہیں جانتے کہ کیسے ہیں۔ وہ لوگ جو ایک وقت حمایت آفریں زرد چہرے لئے، جو ہڑ کی طرح ساکن ہو کر گھنٹہ بھر تک کسی گھوڑے یا سور کو دیکھتے رہتے ہیں۔ اور جنھیں شہروں سے آنے والے بیوقوف سمجھتے ہیں۔ کیونکہ یہ ایک سوال کا جواب دینے میں پانچ منٹ صرف کرتے ہیں اور شاید اس کا جواب دینے کے لئے دوسرا سوال کر بیٹھتے ہیں۔ لیکن جنھوں نے خود میں تجربے کی اتنی دولت معمولی ہے کہ ان کے قدری معیار کے مقابلے میں وہ بہت کثیر اور پیچیدہ ہے۔ وہ اپنے رجحانات، نہ کہ دماغوں کے طفیل جیتے ہیں، ان کے رجحانات قدرت کے دوش بدوش طویل اور مدید عملی واسطوں کے آہستہ رو آثار ہیں۔ یہ ہے وہ فرد جسے میں چاہتا ہوں اور میں ان جیسے افراد کے درمیان اپنی مرضی کے مطابق رہنا چاہتا ہوں ——— ایسے روایتی رشتے میں جس سے انھیں کبھی کراہت نہیں ہوتی اور اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ مجھے اس سے نفرت کرنے کا گمان نہیں۔ آپ اس نوع کا رشتہ پیدا نہیں کر سکتے، یہ خود زائیدہ ہوتا ہے اور باپ سے بیٹے کے ورثے میں آتا ہے۔ نئے افراد جو کھیتی باڑی کی طرف رجوع کرتے ہیں کبھی جم نہیں پاتے۔ وہ اپنے ساتھ ایسی بیگانگی لاتے ہیں جو شہروں کی ساختہ ہے۔ ان میں اجرتوں کے سوا اور کوئی میل ملاپ کا وسیلہ نہیں، وہ بیگانگی کے نکتے کو نہیں سمجھتے۔ یہ مجھے ایک اچنبھے کی یاد دلاتی ہے۔ لوگ شہروں میں دلچسپی اور تفریح کے لئے جاتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ دیہات کے سوا سچے معنی میں اور کہیں تفریح نہیں، دیہات میں ہم بیوقوف ہو جائیں لیکن ہم وہاں ایسے نظامِ اشیا سے تعلق رکھتے ہیں جو کئی نسلوں کی دانش اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ وہاں ہم آرائشی کمرے میں نہیں ملتے بلکہ شکارگاہ میں، وہی رنج پر یا شکاروں اور گنواروں کی بھائی کی شبانہ ضیافتوں میں ملتے ہیں۔ ہمارا ذاتی معاملہ سب سے گتھا ہوا ہے۔ ہمارا پیشہ مقابلے کا جھنجٹ نہیں رکھتا، اور روزانہ کے فرائض کی ادائیگی کو ہم ایک نوع کی قومی خدمت خیال کرتے ہیں۔ یہ وہ نظامِ اشیاء ہے جسے میرے بزرگوں نے جیسے مجھ سے پہلے سمجھا اور اس کے گن گائے، ویسے ہی میں اسے سمجھتا ہوں اور اس کے گن گاتا ہوں، اور یہی سبب ہے کہ میں ٹوری ہوں، اپنے نظریات کی وجہ سے نہیں، اپنی طبیعت کی وجہ سے ہوں، میں ٹوری ازم کے حق

کھڑا ہوا جب اس کا کچھ مطلب تھا لیکن اب اس کا کچھ مطلب نہیں، میں اس کے لئے کھڑا نہیں ہوتا، پھر بھی تھوڑی تھوڑی سننے پر مجبور ہوں۔ انگلستان جیسا اب ہی، میرے زمانے تک رہیگا، انگلستان جیسا آئندہ ہوگا، اس سے مجھے دلچسپی نہیں اور یہ خوب ہی کہ مجھے اس کی رہبری سے واسطہ نہ ہوگا۔

" نہ جانے مجھے جس سوال کا جواب دینے کے لئے کہا گیا تھا اس کی یہ کافی توضیح ہی کہ نہیں، تاہم میرے نزدیک یہ بہترین ہی اور میرے خیال میں اس پر اکتفا کر لینا چاہیئے۔ اگر خدا مجھ سے میرا حال پوچھے تو میں اس سے یہی کہنے کا ارادہ رکھتا ہوں، جیسا تو نے مجھے بنایا، ویسا میں حاضر ہوں۔ تو چاہی ماخوذ کر یا بخش دے۔ اگر مجھے دوبارہ جینا پڑے تب بھی میں جوں کا توں رہوں گا۔ اگر تجھے میرا مختلف طرز سے جینا منظور ہو تو مجھے مختلف بنا۔ افسوس میں نے اس مسلک کی حمایت کی جو تلف ہوچکا۔ لیکن اس کے لئے میرا کلیجہ نہیں پھٹتا۔ میں باقی زندگی اسی انداز سے بسر کروں گا جس کی میں قدر کرتا ہوں اور جسے پسند کرتا ہوں۔ قوم کو میں رہنماؤں کے ہاتھوں سونپ کر مطمئن ہوں، جسے میں دیکھتا ہوں کہ میری بے دینیوں کا جواب دینے کے لئے ہمہ تن بیقراری بن گیا ہی۔

رحمٰن مذنب

ایک اہم ادبی تحریک

(گذشتہ سے پیوستہ)

تنقید | مقصدِ فن کے متعلق آج کل تین نظرئے پائے جاتے ہیں۔

(۱) فن برائے فن

(۲) فن برائے مسرت

(۳) فن برائے زندگی

ادب فن کی ایک شاخ ہی۔ لہذا مقصدِ ادب کے متعلق بھی گویا یہی تین نظرئے ہیں۔ "فن برائے فن" کے متعلق کسی دوسرے مضمون میں مفصل بحث کرچکا ہوں جس کے اعادے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ اس بحث کا خلاصہ یہ ہی کہ میرے نزدیک "فن برائے فن" کا نظریہ محض لفظی کرتب بازی ہی جس کا مطلب کچھ نہیں اور میں صرف باقی دو مقاصد کو قابلِ لحاظ سمجھتا ہوں۔ نیا ادب ایک "مقصدی" ادب ہی جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کو اوپر دئے ہوئے نمبر (۱) سے کوئی تعلق نہیں ہوسکتا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہی کہ نئے ادب کا مقصد حصولِ مسرت سے متعلق ہی یا ارتفاعِ زندگی سے۔ فلسفیانہ نقطۂ نگاہ سے حصولِ مسرت بلند تر اور وسیع تر مقصد ہی بہ نسبت ارتفاعِ زندگی کے کیونکہ ارتفاعِ زندگی کا مقصد بھی تو آخر حصولِ مسرت ہی ہی۔ لیکن عام نقطۂ نظر سے یہ دونوں مقاصد الگ الگ ہیں۔ اور یہاں بھی عام نقطۂ نگاہ زیرِ بحث ہی۔ یہ پہلے عرض کیا جاچکا ہی کہ نئے ادب کا مقصد ایک نیا سماج پیدا کرنا ہی۔ ظاہر ہی کہ یہ مقصد ارتفاعِ زندگی سے قریب تر ہی بہ نسبت حصولِ مسرت کے۔ لہذا ادب کا مقصدِ آخری ارتفاعِ زندگی ہوا۔

یہاں پر ایک بات صاف کردینا مناسب معلوم ہوتا ہی۔ نئے ادب کا جو مقصد میں نے بیان کیا ہی بعض نئے ادیبوں کے خیالات اس سے مختلف ہیں۔ مثلاً میرا جی نے اپنے مقالہ "نئی شاعری کی بنیادیں" میں لکھا ہی:

"............میرے خیال میں نئی شاعری ہر اس موزوں کلام کو کہا جا سکتا ہے جس میں ہنگامی اثر سے ہٹ کر کسی بات کو محسوس کرنے، سوچنے اور بیان کرنے کا انداز نیا ہو یعنی کوئی شاعر روائتی بندھنوں سے الگ رہ کر کسی احساس، جذبے یا خیال کے اظہار میں اپنی انفرادیت نمایاں کر سکتا ہے تو وہ نیا شاعر ہے ورنہ پُرانا.........."

اگرچہ اس عبارت میں صرف شاعری کا ذکر ہے لیکن غالباً مصنف کے خیالات سارے نئے ادب کے بارے میں بھی ہوں گے۔ مجھے میراجی کی رائے سے اختلاف ہے۔ اس لئے کہ نئے انداز سے محسوس کرنا، سوچنا اور بیان کرنا تو ہر درجۂ اول کے ادیب اور شاعر کے لئے ضروری ہے خواہ وہ نیا ہو یا پرانا۔ کسی ادیب یا شاعر کا شمار درجۂ اول میں ہوتا ہی اس لئے ہے کہ وہ ہنگامی اثر سے ہٹ کر کسی بات کو محسوس کرنے، سوچنے اور بیان کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اور اگر کوئی ادیب یا شاعر روائتی بندھنوں سے الگ رہ کر کسی احساس، جذبے یا خیال کے اظہار میں اپنی انفرادیت نمایاں نہیں کر سکتا تو وہ درجۂ دوم یا سوم کا ادیب یا شاعر سمجھا جائے گا۔ کالی داس، والمیکی، ہومر، ورجل، دانتے، شکسپیئر، رومی، حافظ، خیام، غالب، اقبال یہ سب اپنے اپنے زمانے میں نئے انداز سے سوچتے، محسوس کرتے اور بیان کرتے تھے اور ان سب میں اس کی قابلیت تھی کہ روائتی بندھنوں سے الگ رہ کر کسی احساس، جذبے یا خیال کے اظہار میں اپنی انفرادیت نمایاں کر دیں۔ پھر کیا لوگ نئے ادیب یا شاعر کہے جا سکتے ہیں؟ اگر کہے جا سکتے ہیں تو پھر نیا ادب کیا اور پرانا کیا؟ دونوں برابر ہیں اور ان میں کوئی فرق نہیں۔ غالباً میراجی یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں گے کہ نئے اور پرانے ادب میں کوئی فرق نہیں! لیکن اگر یہ لوگ نئے ادیب اور شاعر نہیں کہے جا سکتے تو کیوں؟ وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ اس مخصوص فلسفۂ زندگی کی ترجمانی نہیں کرتے جو اس زمانے میں عام طور پر انسان کی تمام معاشرتی بیماریوں کا تنہا علاج تسلیم کر لیا گیا تھا۔ یعنی یہ لوگ یا تو نئے سماج کا تصور ہی نہیں کر سکتے یا کرتے ہیں تو اس طریقے پر نہیں جو مارکس اور فرائڈ نے بتایا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ نئے ادب کا مقصد اور تعریف یہ ہے کہ وہ ایک ایسا نیا سماج پیدا کرنا چاہتا ہے جس کی بنیادیں مارکس اور فرائڈ کے اساسی اصولوں پر قائم ہوں۔ لہٰذا میراجی نے جدید شاعری (اور ضمناً نئے ادب) کی جو تعریف کی ہے

میراجی کی تعریف اصولی حیثیت سے غلط ہونے کے علاوہ عملی حیثیت سے خود نئے ادب کے حق میں مضر ہی کیونکہ کسی تحریک کے مقاصد اُسی وقت حاصل کئے جا سکتے ہیں جبکہ وہ پہلے اچھی طرح سمجھ لئے گئے ہوں۔ میراجی کی تعریف میں ہر وہ ادب یا شاعری آجاتی ہی جس میں اعلیٰ درجے کی جدت ہو۔ مثلاً اختر شیرانی کی رومانی شاعری بھی جدید شاعری میں شمار کی جا سکتی ہی لیکن ظاہر ہی کہ اختر شیرانی کی رومانی شاعری کو نئے ادب کے مقاصد سے کیا تعلق ہو سکتا ہی۔ اس قسم کی شاعری کو نئے ادب میں شامل کرنے کا نتیجہ یہی ہو سکتا ہی کہ اختر شیرانی اور نئے ادب دونوں کی مٹی پلید ہو۔ نئے ادب کے مقاصد صحیح طور پر متعین نہ ہونے کی وجہ سے اس میں بہت سا ایسا ادب بھی شامل ہو گیا ہی جو محض چند خوب صورت جدتوں کا حامل ہی اور ارتفاعِ زندگی کے خیال کی اس کو ہوا تک نہیں لگی۔ نئے ادب کے سچے ہمدردوں کا فرض ہی کہ وہ اس قسم کے ادب کو آپریشن کے ذریعے سے نئے ادب سے علیحدہ کریں۔ لیکن اندیشہ ہی کہ اس عمل سے خود میراجی کا بیشتر کلام نئے ادب سے خارج قرار پائے گا!

کسی چیز کی اچھائی یا برائی کا سب سے آسان معیار یہ سوال ہی کہ آیا وہ اپنے مقصد کو پورا کرتی ہی یا نہیں اگر کرتی ہی تو اچھی ہی ورنہ نہیں۔ یہ ایک امرِ واقعہ ہی کہ نیا ادب ابھی تک نیا سماج نہیں پیدا کر سکا۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ ایسا کبھی نہیں کر سکتا۔ نئے سماج کی تخلیق کے متعلق نئے ادیبوں کے ذہنوں میں شعوری یا غیر شعوری طور پر جو پروگرام ہی وہ غالباً یہ ہی کہ (۱) مارکس اور فرائڈ کے تصورات سب سے پہلے طبقہ اعلیٰ و اوسط کی تعلیم یافتہ جماعت میں رائج کئے جائیں۔ حتیٰ کہ ان کا اثر اس جماعت میں مکمل طور پر نفوذ کر جائے۔ (۲) پھر طبقۂ عوام کو ان تصورات سے روشناس کرایا جائے، اور جب ملک کی ساری سوسائٹی پر ان تصورات کا اثر چھا جائے تو (۳) ان کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی جائے۔ یہ پروگرام ابھی تک پہلی منزل میں ہی۔ لہٰذا اس بات کا اندازہ لگانے کے لئے کہ نئے ادب کو اپنے مقصد میں کامیابی ہوگی یا نہیں، دراصل اسی پہلی منزل کی تاریخ اور رجحانات پیشِ نظر رکھنے ہوں گے۔ دوسری اور تیسری منزلوں کے متعلق رائے زنی تو ہو سکتی ہی لیکن ان کو کسی پیشین گوئی کی بنیاد بنانا غلط ہوگا۔

جہاں تک پہلی منزل کا تعلق ہی، یہ بات محتاجِ ثبوت نہیں کہ نئے ادب نے کافی ترقی حاصل کر لی ہی۔ طبقہ اعلیٰ و اوسط کی تعلیم یافتہ جماعت میں مارکس اور فرائڈ کے تصورات بلحاظ حد تک مقبول ہو چکے ہیں اور یہ مقبولیت

روز افزوں ترقی پر ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر یہ پیشین گوئی غالباً صحیح ہے کہ نئے ادب کو اپنے مقصد میں کامیابی ہوگی۔ لیکن اس سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ نئے ادب کی تحریک اپنی موجودہ منزل میں آئیڈیل طریقے سے چل رہی ہے اور اس میں کوئی خامی نہیں۔ خامیاں ہیں۔ اس تحریک کی موجودہ منزل کا انداز اور رفتار کا جائزہ لینا اور اس کی خامیاں واضح کرنا عنوانِ زیر بحث کا مقصد ہے۔

نئے ادب کی موجودہ منزل کچھ اس قسم کی ہے جیسی کہ کسی غیر مزروعہ یا افتادہ زمین کو کاشت میں لانے کی پہلی منزل ہوتی ہے۔ یعنی ابھی کھدائی اور صفائی کا کام ہو رہا ہے۔ اگر کوئی شخص اس کام کے مقصد یعنی کاشت سے واقف نہ ہو تو وہ کھدائی اور صفائی کے کام کو محض ایک فعل عبث سمجھے گا۔ اور اگر بالفرض وہ اُس غیر مزروعہ زمین کے خس و خاشاک سے الفت رکھتا ہو تو وہ کھدائی اور صفائی کے کام کو محض فعلِ عبث ہی نہیں بلکہ فعلِ تخریب بھی خیال کرے گا۔

بالکل یہی حال نئے ادب کی موجودہ منزل کا ہے۔ جو لوگ اس تحریک کے مقاصد سے آگاہ نہیں ہیں وہ اس کو محض فنِ "جمالیات" کی ایک شاخ سمجھتے ہیں۔ اور جو لوگ اُس خس و خاشاک سے جو یہاں کی ادبی دنیا میں پہلے سے موجود ہے، محبت رکھتے ہیں، ان کو نئے ادب کی تحریک فقط ایک تخریبی تحریک معلوم ہوتی ہے۔ اس تحریک کی صحیح تنقید کا اہل وہی شخص ہو سکتا ہے جو ایک طرف تو اُس کے مقاصد سے کماحقہٗ آگاہی رکھتا ہو اور دوسری جانب نئے ادیبوں کی جدت طرازیوں سے خواہ مخواہ مرعوب نہ ہو۔

ہر انقلابی تحریک اپنے ابتدائی مدارج میں ایک تخریبی پہلو لئے ہوئے ہوتی ہے۔ انقلاب پیوند لگانے یا مفاہمت کرانے کا نام نہیں ہے۔ انقلاب کہتے ہیں الٹ دینے کو، بدل دینے کو، پرانی عمارت گراکر نئی بنیاد و سلسلہ نئے طرز کی عمارت بنانے کو۔ لیکن بالآخر انقلاب کا مقصد بھی تعمیر ہے تخریب نہیں۔ لیکن تخریب بہت آسان ہے اور تعمیر بہت مشکل۔ اس لئے دورِ تخریب میں انسانی فطرت سے بعید نہیں کہ وہ تخریب ہی کو اپنا مقصد آخری سمجھ بیٹھے لیکن اگر کسی انقلابی کو اپنے مقصد کا مکمل علم اور اس کی افادیت پر پورا اعتماد ہو تو پھر اس کو "انہدام" کے لئے پوری جد و جہد کرنی چاہیئے تاکہ اس ناگوار فرض سے جلد از جلد سبکدوشی ہو۔ اور اس کو پرانی عمارت کے گرانے کی سائنٹفک تدابیر اختیار کرنی ہیں۔

اس استعارے سے نئے ادب کی بعض نمایاں خصوصیات کے بنیادی عوامل پر روشنی پڑتی ہے۔ پہلی بات

تو یہ کہ انہدام یا تخریب کا کام عام طور پر ناخوشگوار ہوتا ہے ــــــــــ اس فعل کو انجام دینے والے کے لئے بھی اور اس شخص یا جماعت کے لئے بھی جس کی عمارت منہدم کی جا رہی ہو۔ لہذا اگر نئے ادب میں موجودہ سماج کی پول کھولی جاتی ہے، سرمایہ داروں کی دُرگت بنائی جاتی ہے، ملوکیت کا رازِ دل افشا کیا جاتا ہے، علما کی ریش ہائے مقدس کو سنڈاس کی ٹٹی سے تشبیہ دی جاتی ہے، گندگی، گرد، غلاظت، تعفن، فاقہ، جرم، عیاری، مکر، فریب، بے وفائی، دغابازی، نمک حرامی، ظلم، زنا، جوا، بدمعاشی، لُچپن وغیرہ کے اذکار زیادہ ملتے ہیں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے! یہی چیزیں تو ہیں جو موجودہ سماج کی عمارت میں دراڑوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ نئے ادب کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ ایسی خطرناک عمارت کو جس میں ایسی دراڑیں ہوں، جلد سے جلد ڈھا دیا جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ انہدام کے کام میں کسی قدر سختی اور "بے دردی" کی ضرورت ہوتی ہے۔ نئے ادب کے لہجے کی خشونت اور درشتی (جس کے علامہ اختر علی تلہری بہت شاکی معلوم ہوتے ہیں) کہیں یہی سختی اور "بے دردی" تو نہیں ہے؟

تیسری بات یہ ہے کہ پرانی عمارت کے جسم میں بعض شرمناک مقامات ہیں۔ جو لوگ اس عمارت کو قائم رکھنا چاہتے ہیں ان کی قدرتی طور پر یہ خواہش ہے کہ یہ مقامات بہرحال پوشیدہ رہیں۔ عریاں نہ ہوں۔ لیکن عمارت گرانے والے کی سیدھی سادی منطق یہ ہے کہ جب عمارت گرانا ہی ٹھیرا تو پھر اس عیب پوشی سے حاصل؟ اس سے کوئی فائدہ تو پہنچ نہیں سکتا۔ ہاں نقصان یہ ہو سکتا ہے کہ اگر ان شرمناک مقامات کی قلعی نہ کھولی گئی تو ممکن ہے یہ نئی عمارت میں بھی جا کر مستور ہو جائیں۔ نئے ادب میں جو زیادہ "عریانیت" نظر آتی ہے اس کا سبب بھی ایک حد تک یہی ہے۔ موجودہ سماج کے اندر جو شرمناک جنسی بیماریاں ہیں، ان کا علاج "طبی معائنے" کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ اور طبی معائنے کو عریانیت وہی کہہ سکتا ہے جس کا سر پھر گیا ہو۔

چوتھی بات یہ ہے کہ انہدام یا تخریب کے عمل میں اتنی ہوشیاری، چابکدستی، فنی نفاست اور باریک بینی کی ضرورت نہیں ہوتی جتنی کہ تعمیر کے عمل میں ہوتی ہے۔ نیا ادب چونکہ ابھی اپنے پروگرام کے تخریبی حصے پر عمل پیرا ہے اس وجہ سے اس کے نمونوں میں ہوشیاری، چابکدستی، فنی نفاست اور باریک بینی کم نظر آتی ہے۔

لہذا نئے ادب میں ان چاروں خصوصیات کی موجودگی سمجھ میں آسکنے والی چیز ہے۔ بشرطیکہ ان کی کمی

حد ہو۔ اس حد کا مقرر کرنا مشکل نہیں۔ صرف "احساس مناسبت" کی ضرورت ہی اور احساس مناسبت نئے ادب کے مقاصد موجودہ سماج کی خرابیوں اور ان کے انسداد کی تدابیر پر سنجیدہ غور و فکر سے پیدا ہو سکتا ہی۔ جو لوگ اس غور و فکر کے عادی نہیں ہیں۔ بعض لوگ (مثلاً نئے ادیب بالعموم) یہ سمجھتے ہیں کہ نئے ادب کی ان خصوصیات کو وسعت دینے میں کسی حد بندی کی مطلق ضرورت نہیں۔ دوسرے لوگوں کا خیال ہی کہ ان خیالات کو پنپنے ہی نہ دینا چاہیئے۔ میرے نزدیک یہ دونوں گروہ غلطی پر ہیں۔ نئے ادب کے مخالفین کی تفریط کا جواب تو اوپر ہو چکا۔ اب اُس کے حامیوں کی "افراط" پر نگاہ ڈالتی ہی۔ نئے ادب میں بھوک، بیماری، غلاظت، جرم وغیرہ کا ذکر یعنی "واقعیت" کی اہمیت مسلّم۔ لیکن موجودہ سماج صرف اسی قسم کے واقعات کا حامل تو نہیں ہی۔ ہماری موجودہ دنیا میں صفائی، پاکیزگی، خوشبو، آسودگی، وفاداری، انصاف، شرافت، ایمانداری وغیرہ بھی تو ہیں۔ اور وہ باوجود اپنی تمام خامیوں کے ایک دل کش دنیا ہی۔ تخریب کے عمل میں انسان کی نگاہوں سے اس دلکشی کا محو ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ لیکن ہم کو یاد رکھنا چاہیئے کہ ہمارا مقصدِ آخری تخریب نہیں بلکہ تعمیر ہی۔ اگر ہم دنیا کے صرف تاریک پہلو کی عکاسی کرتے رہے اور روشن پہلو کی طرف سے مسلسل چشم پوشی کرتے رہے۔ تو عجب نہیں کہ کچھ عرصے کے بعد تاریکیت ہی ہمارا نصب العین بن جائے۔ کیونکہ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہی کہ ایک ہی عمل کو بار بار دہرانے سے انسان اُس کا عادی ہو جاتا ہی۔ لہٰذا ضروری ہی کہ نئے ادب کی موجودہ ٹکنیک کسی قدر تبدیل کی جائے۔ عکاسی صرف تاریک پہلو کی نہیں بلکہ روشن پہلو کی بھی کی جائے۔ اس کے جواب میں نئے ادیب شاید کہیں کہ روشن پہلو کے اظہار سے تخریبی پروگرام میں رکاوٹ پڑنے کا اندیشہ ہی۔ یہ بات غلط ہوگی کیونکہ اگر ہم موجودہ سماج کی تاریکیوں کے مقابل مستقبل کے سماج کی تجلیات بھی ظاہر کرتے رہیں تو موجودہ سماج کو ختم کرنے میں دشواری نہیں بلکہ آسانی ہوگی۔ نئے ادب کی موجودہ واقعیت پرستی کے متعلق مجھے ایک نقطہ اور کہنا ہی اور وہ یہ کہ کسی بدنما شے کے بیان کے لئے یہ ضروری نہیں کہ الفاظ بھی مزبلے سے کرید کرید کر لائے جائیں۔ نیا ادب بھی ایک قسم کا ادب ہی۔ لہٰذا ادب بھی ایسا جس کی مخاطب (کم از کم موجودہ منزل میں) طبقۂ اعلیٰ و ادنیٰ کی تعلیم یافتہ جماعت ہی۔ نئے ادیبوں کو اگر اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کرنی ہی تو کم از کم ابتدا میں انھیں اسی جماعت کو متاثر کرنا ہوگا۔ اور وہ جماعت متاثر ہو نہیں سکتی تاوقتیکہ کم از کم اندازِ بیان میں "شرافت" اور "شستگی" اختیار نہ کی جائے۔

میرے بیان کے مطابق نئے ادب کی دوسری خصوصیت لہجے کی خشونت اور درشتی ہے۔ اس کے دو سبب ہیں۔ اوّل یہ کہ نئے ادب کی تحریک ابھی اپنے پروگرام کے تخریبی حصے پر عمل پیرا ہے اور عمل تخریب کے لئے سختی اور بے دردی اسی طرح ضروری ہے جس طرح عمل جراحی کے لئے دوسرا سبب یہ ہے کہ نئے ادیب ننانوے فیصدی نوجوان ہیں اور نوجوانوں کے قلم وزبان میں پختہ کارانہ اعتدال کہاں سے آسکتا ہے۔ لیکن لہجے کی درشتی بہرحال ایک معیوب چیز ہے اگر کوئی معیوب چیز عارضی طور پر استعمال کرنی بھی پڑے تو بھی وہ بحیثیت مجموعی معیوب ہی رہتی ہے۔ نئے ادب میں لہجے کی درشتی موجودہ سماج کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے تو ضروری ہے۔ لیکن بیدار ہونے کے بعد اس کو قائل کرنے کے لئے ضروری نہیں ہے۔ قائل کرنے کا لہجہ تو جتنا نرم اور سبک ہو اتنا ہی بہتر ہے۔ اس لئے کیا اچھا ہو اگر نئے ادیب اپنے قلم وزبان کی بمباری کو صرف مناسب موقع ومحل پر استعمال کریں ۔ نئے ادیبوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر

لیکن پھول کی پتی سے ہیرے کا جگر کاٹنے کے لئے اقبال کی سی جراحی قابلیت چاہیئے۔ لہجے کی سختی ادب کے لئے طبعاً موزوں نہیں ہے۔ نیا ادب بھی ادب ہی کی ایک صورت ہے۔ اس لئے "چنگیزی" لہجے سے جہاں تک ہوسکے اجتناب کرنا چاہیئے۔ موجودہ سماج کی تعلیم یافتہ جماعت جو نئے ادب کی موجودہ منزل کی اصلی مخاطب ہے۔ "حریر وپرنیاں" کی عادی ہے۔ "سنگ وخشت" کی نہیں۔ اور نئے ادب کو اپنی ابتدائی منزل میں اسی جماعت سے کام لینا ہے۔ بھلا یہ جماعت "خشت باری" کے سامنے کیا ٹھیرے گی!

نئے ادب کی تیسری خصوصیت "عریانیت" ہے۔ میں پہلے یہ عرض کرچکا ہوں کہ "عریانیت" اپنی نوعیت کے لحاظ سے موجودہ سماج کے جسم کا "طبّی معائنہ" ہے اور بس۔ میرا مطلب یہ تھا کہ اس کو ایک طبّی معائنہ ہونا چاہیئے۔ لیکن نئے ادب کی "عریانیت" تمام تر "طبّی معائنہ" نہیں۔ اور اس پر کچھ جنسی تلذذ بھی شامل ہے یعنی یہ الزام تمام تر بے بنیاد نہیں ہے کہ

وہ بوالہوس بھی جنھیں جرأتِ گناہ نہیں
ادب میں ڈھونڈھ رہے ہیں علاج تشنہ لبی!

لطف یہ ہے کہ بعض نئے ادیب خود "عریانیت" کو "علاج تشنہ لبی" کہتے ہوئے پس وپیش نہیں کرتے

ان کا استدلال یہ ہوتا ہے کہ اُن کی تشنہ لبی "اس جنسی کش مکش کا قدرتی نتیجہ ہے جو گزشتہ جنگِ عظیم کے بعد سے نمودار ہوئی ہے اور اس کا علاج ادبی عریانیت" کے سوا کچھ نہیں۔ میرے نزدیک یہ استدلال صحیح نہیں ہے جنسی تشنگی کی تسکین کا بہترین ذریعہ صرف ایک ہے یعنی صنفین کا جسمانی اتصال۔ اگر یہ ذریعہ کسی وجہ سے دستیاب ہو تو پھر دوسرا بہترین ذریعہ "ارتفاعِ جذبہ" ہے خواہ وہ تصوّف کی شکل میں ہو خواہ آرٹ کی، خواہ مذہب کی۔ اگر جنسی تشنگی کی تسکین کا قدرتی ذریعہ (خدانخواستہ!) آپ کے پاس نہ ہو تو آپ ادب میں اس کو حاصل کرسکتے ہیں۔ لیکن ادب کی ادبیت کو نقصان نہ پہنچے، یہ صرف ایک صورت میں ممکن ہے اور وہ "ارتفاعِ جذبہ" کی صورت ہے۔ ادب میں جنسی تشنگی کی تسکین اگر آپ کسی اور طریقے سے تلاش کریں گے تو ادب ادب نہیں رہ سکتا۔ جو لوگ ادب میں اس قسم کی تسکین "عریانیت" کے ذریعہ حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ جانتے ہی نہیں کہ ادب ہے کیا چیز۔ "عریانیت" (یا زیادہ صحیح الفاظ میں "واقعیت") ادب میں وہیں تک مناسب ہے جہاں تک کہ موجودہ سماج کی خرابیوں کو منظرِ عام پر لا کر ان کا انسداد مقصود ہو۔ "ادبی واقعیت" کو جنسی تلذّذ کا ذریعہ بنانا، یا ادب کے پردے میں جنسیات پر کتابیں لکھنا، میں نہیں سمجھتا کہ کوئی مفید فعل ہے۔ خواہ ادبی حیثیت سے خواہ تجارتی۔ جنسی موضوعات پر ہر قسم کی "باتصویر" کتابیں بک سٹالوں پر بکثرت ملتی ہیں۔ اگر کوئی صاحب ان سے لطف اندوز ہونا یا اُن کی تعداد میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں تو ملک کا مروّج قانون انھیں منع نہیں کرتا۔ وہ شوق سے ایسا کرسکتے ہیں۔ لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ کوک شاستر کی تصنیف کے لئے بھی ادب پر احسان فرمایا جائے؟ میں ایک بار پھر دُہراتا ہوں کہ نیا ادب بھی ایک قسم کا ادب ہے۔ اور اگر وہ تعلیم یافتہ جماعت میں مقبول ہونا چاہتا ہے تو اس کو اپنا اندازِ بیان اور موضوع ادبی ہی رکھنا چاہیئے۔

نئے ادب کی چوتھی خصوصیت فنّی نفاست کی کمی ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ نیا ادب ابھی تک اپنے پروگرام کے تخریبی حصّے پر عمل پیرا ہے اور تخریب کے عمل میں ہوشیاری چابکدستی، فنّی نزاکت وغیرہ کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی جتنی کہ تعمیر کے عمل میں ہوتی ہے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ نئے ادیب تقریباً سب کے سب نوجوان اور ناتجربہ کار ہیں۔ اور نوجوانوں کے اُسلوب ادا میں پختہ کارانہ صفائی کیونکر ہوسکتی ہے؟ تیسرا سبب یہ ہے کہ نئے ادیب عموماً پرانی روایات سے قطعی اور مکمل انحراف کرنا

چاہتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ زبان کے پرانے معیار کو بھی بدل دینا چاہتے ہیں۔ نئے ادب کا موجودہ دور بے شبہ ایک تخریبی دور ہے لیکن تخریب کے معنی فنا کر دینے کے تو نہیں۔ کسی عمارت کو گرانے کا یہ مطلب تو نہیں ہو سکتا کہ اس کی ثابت اور مضبوط اینٹوں کو بھی چکنا چور کر دیا جائے۔ موجودہ سماج کی عمارت میں سبھی اینٹیں شکستہ نہیں ہیں۔ بہت سی ثابت اور مضبوط اینٹیں بھی ہیں۔ میرے نزدیک انھی ثابت اینٹوں میں سے ایک اینٹ "زبان" ہے۔ میں مانتا ہوں کہ نئے ادب کی تحریک ایک انقلابی تحریک ہے لیکن انقلاب کے اجزائے ترکیبی سب کے سب نئے نہیں ہوتے اور نہ ہو سکتے ہیں۔ انسانوں کے ہزاروں سال کے تجربوں کو آنکھ بند کر کے ٹھکرا دینا غلطی ہی نہیں بلکہ ناممکن فعل بھی ہے۔ نئی روایات پرانی روایات کے بیج سے پیدا ہوتی ہیں۔ صرف "کاشت" نئی نوعیت کی ہوتی ہے۔ اسی طرح نیا ادب بھی پرانے ادب کو یک قلم فراموش نہیں کر سکتا۔ لہٰذا بعض نئے ادیبوں کی یہ کوشش کہ ان کے کام کے اجزائے ترکیبی بالکل نئے ہوں، سعیِ لاحاصل ہے۔ ایسی کوشش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک طرف تو یہ اجزائے ترکیبی نئے نہیں ہوتے اور دوسری طرف وہ پرانی خوبیوں کو بھی کھو بیٹھتے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر نئے ادب نے اپنے تخریبی دور میں فنی نزاکت، خوب صورتی، چابکدستی وغیرہ کو ضائع کر دیا تو پھر تعمیری دور کے لئے یہ چیزیں کہاں سے آئیں گی؟ ضرورت اس کی ہے کہ موجودہ دور میں بھی ان چیزوں کا خیال رکھا جائے۔

ابھی تک میں نے تمہیداً ان چند عوامل کا تذکرہ کیا ہے جو نئے ادب کی بعض خصوصیتوں کی تہ میں کارفرما ہیں۔ اب تفصیل کے ساتھ خود نئے ادب پر تنقید کی جائے گی۔ نئے ادب کا مقصد ایک نئے سماج کی تشکیل ہے۔ اس کے حصول کی پہلی منزل یہ ہے کہ طبقۂ اعلیٰ و اوسط کی تعلیم یافتہ جماعت میں مارکس اور فرائڈ کے تصورات رائج کئے جائیں۔ ان کو رائج کرنے کا ذریعہ تحریر ہے یا تقریر۔ یہ دونوں چیزیں "ادب" کی تعریف میں آتی ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ادب میں وہ کونسی چیز ہوتی ہے جو اس کو سامعین یا ناظرین کے لئے قابلِ قبول یا مردود بناتی ہے۔ وہ چیز "اثر" ہے۔ اگر کسی ادب میں اثر نہیں تو وہ اپنے مقصد تک کبھی نہیں پہنچ سکتا خواہ وہ مقصد انبساط ہو یا ارتفاعِ زندگی۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ ادب میں اثر کیونکر پیدا ہوتا ہے۔ میرے نزدیک ادب میں اثر ہونے کی شرط لازمی یہ ہے کہ وہ "حسین" ہو۔ شاعری میں اثر انگیزی کے لئے ایک

اور شرط ضروری ہے یعنی جذباتیت۔ اس کا ذکر جدید شاعری کے عنوان میں آئے گا) یعنی اگر کسی ادب میں حُسن نہیں تو وہ پُر اثر بھی نہیں ہو سکتا۔ ادب کا حُسن تین صورتوں سے ذہن میں آتا ہے۔

(۱) حُسن موضوع

(۲) حُسن تخیل

(۳) حُسن ادا

اب ان تینوں صورتوں کی روشنی میں نئے ادب کی نظم اور نثر کا الگ الگ جائزہ لیا جائے گا۔ پہلے نثر کو لیجئے۔ حُسن موضوع سے مراد یہ ہے کہ ادیب جو بات کہنی چاہتا ہے اس میں بذاتِ خود مسرت یا ارتفاعِ زندگی کے امکانات معقول حد تک موجود ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ ایک قابل فن کار کسی حقیر، کثیف، فرسودہ یا پیش پا افتادہ موضوع کو لے کر بھی اچھی صناعی کر سکتا ہے اور ایک معمولی فن کار کسی اونچے اور اچھوتے موضوع کو لے کر بھی اچھی صناعی نہیں کر سکتا۔ لیکن اس سے موضوع کی اہمیت میں فرق لازم نہیں آتا۔ اور نہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ موضوع بذاتِ خود اچھا یا برا ہوتا ہی نہیں۔ موضوع کے حُسن و قبح کی ماہیت کے بارے میں۔ میرے نزدیک اچھے ادبی موضوعات وہ ہیں جو زندگی کے ابدی اقدار کی بقار کی کوشش کریں، کائنات اور زندگی کو ہمہ گیر اور "موحدانہ" اصولوں کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کریں اور زندگی کے غیر ابدی اقدار کو تاریخی تجربے کی روشنی میں پرکھنے کے بعد ایک قسم کی ابدیت بخشنے کی کوشش کریں۔ اس معیار پر نئے ادب کے مقاصد پورے اترتے ہیں کیونکہ مارکس اور فرائڈ کے تصورات جو ان مقاصد کی بنیاد ہیں، میرے خیال میں ابدی اقدار کی بقار کے حامی ہیں۔ (گو بادی النظر میں ایسا نہیں معلوم ہوتا) زندگی کے متعلق ان سے زیادہ ہمہ گیر اور موحدانہ نظریہ آج تک کسی نے پیش ہی نہیں کیا۔ اور مارکس کا نظریہ تو تمام تاریخی تجربات کا نچوڑ ہی ہے۔ لہذا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ نئے ادب کا موضوع بذاتِ خود ایک اچھا موضوع ہے۔

— لیکن کیا تمام نثری نگارشات جو نئے ادب کے نام سے موسوم ہیں۔ اس موضوع کی صحیح نمائندگی کرتی ہیں جہاں تک میں دیکھتا ہوں اس موضوع کی صحیح نمائندگی بہت کم کی جاتی ہے۔ نئے ادب کی نثر زیادہ تر افسانوں اور ڈراموں پر مشتمل ہے۔ ان کے موضوعات عام طور پر ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا نئے ادب کے مقاصد سے

کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ تقریباً نوے فیصدی افسانہ نگاروں کو افسانہ نگاری کے وقت نئے سماج کی تخلیق یا ارتقاءِ زندگی کا خیال بھی نہیں آتا۔ اُن کے موضوعات بالعموم یہ ہوتے ہیں۔

(۱) کسی کسبی کی پرائیویٹ زندگی (ملاحظہ ہوں منٹو کے افسانے)

(۲) کسی "غیر معمولی" جنسی رجحان کی عکاسی (ملاحظہ ہوں عصمت کے افسانے خصوصاً "لحاف")

(۳) شعور، تحت الشعور اور لاشعور میں جنسی احساسات کی کش مکش (ملاحظہ ہوں ممتاز مفتی کے افسانے خصوصاً "اندھا")

(۴) کسی مخصوص کردار کی نفسیاتی کیفیات کا تجزیہ (ملاحظہ ہوں بیدی کے افسانے خصوصاً "ٹرمینس")

میں یہ مانتا ہوں کہ ان موضوعات کو لے کر بھی ایک قابل فن کار نئے ادب کے مقاصد کی ترجمانی کر سکتا ہے۔ لیکن ان موضوعات کی بنیادوں پر محولہ بالا فن کاروں نے جو افسانے تعمیر کئے ہیں وہ میرے نزدیک نئے ادب کے مقاصد کی ترجمانی نہیں کرتے، تاوقتیکہ ان کی تاویل میں صفحے کے صفحے سیاہ نہ کئے جائیں۔ پھر یہ حال ان فن کاروں کا ہے جو نئے ادب میں چوٹی کے افسانہ نگار سمجھے جاتے ہیں۔ دوسرے اور تیسرے درجے کے افسانہ نگاروں کو نہ تو نئے ادب کے مقاصد سے بحث ہے اور نہ اُس کے موضوعات سے۔ ان کو تو کسی خیال کو انوکھے انداز میں پیش کرنے سے مطلب ہے خواہ اس انوکھے پن پر مہملیت کا اطلاق ہی کیوں نہ ہوتا ہو۔ یہ وہ افسانے ہیں جو میراجی کی تعریف کے مطابق نئے ادب میں شمار ہونے کے لائق ہیں لیکن میری تعریف کے مطابق اس سے خارج ہیں۔

ادب کی خوب صورتی کی دوسری صورت حسنِ تخئیل ہے۔ تخئیل اُس ذہنی عمل کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ سے کوئی فن کار اپنے موضوع سے متکیف ہوتا ہے اور حسنِ تخئیل کا مطلب یہ ہے کہ یہ "تکیف" ایک خوبصورت طریقے سے واقع ہو۔ انسان کسی نہ کسی حد تک ہر اس شئے یا واقعہ سے متاثر ہوتا ہے جس سے کہ وہ اپنی زندگی میں دوچار ہوتا ہے۔ یہ شئے یا واقعہ اس کے ذہن پر اپنا عکس ڈالتا ہے۔ بعض ذہنوں میں اس عکس کو قبول کرنے اور محفوظ رکھنے کی صلاحیت کم ہوتی ہے۔ بعض میں زیادہ، بعض میں بہت زیادہ۔ یہ صلاحیت جس ذہن میں جتنی زیادہ ہوتی ہے، اسی قدر گویا اس کی قوتِ تخئیل بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ اس اکتسابِ عکس کی خوب صورتی یہ ہے کہ

عکس نہایت مکمل اصل کے مطابق ہو جس قدر وہ اصل کے مطابق ہوگا اُسی قدر فن کار کو اُسے دوبارہ وجود عطا کرنے میں آسانی ہوگی۔ یعنی فن کار کو اپنے موضوع کا احساس "جس قدر واضح ہوتا ہے اسی قدر اس کی قوتِ ادا بھی واضح ہوتی ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ حسنِ تخیل اور حسنِ ادا ایک ہی چیز ہے۔ یہ صحیح ہے کہ تخیل اگر واضح اور خوب صورت ہو تو وہ عام طور پر اپنے لئے ایک واضح اور خوب صورت پیرایۂ اظہار تلاش کر لیتی ہے بشرطیکہ فن کار کو مختلف پیرایہ ہائے اظہار سے تھوڑی بہت واقفیت ہو۔ لیکن پیرایۂ اظہار کی خوب صورتی یا حسنِ ادا پھر بھی ایک جداگانہ حیثیت رکھتا ہے جس کا بیان آگے آئے گا۔ یہ ہے تخیل کی ایک صورت۔ سہولت کے لئے اس کو تخیل تمثیلی" کہہ سکتے ہیں۔

لیکن تخیل کے معنی صرف اکتسابِ عکس نہیں ہیں تخیل کی دوسری اور اہم صورت یہ ہے کہ فن کار کے ذہن میں مختلف اشیاء اور واقعات کے جو مختلف عکس موجود ہیں وہ ان سب کو ملا کر ایک تصویر بنا سکے یا ایک ایسی تصویر کے اجزاء کو جو اس کے ذہن میں پہلے سے موجود ہے، مختلف اشیاء اور واقعات کے بعد میں آنے والے عکسوں پر منطبق کر سکے۔ یعنی فن کار کا ذہن ترکیب اور تجزیہ کر سکتا ہو۔ ترکیب کے عمل کو سمجھنے کے لئے فرض کیجئے کہ کسی فن کار کے ذہن میں ایک تصویر کسی دیہاتی جھونپڑے کی ہے، دوسری تصویر کسی متمول زمیندار کے گھر کی ہے، تیسری ایک عام شہری کے مکان کی ہے۔ اور چوتھی کسی راجہ یا نواب کے محل کی ہے۔ اب اگر ان چاروں تصویروں کو ملا کر فن کار ایک ایسی تصویر تیار کر سکے جو خواہ حقیقت میں موجود نہ ہو، لیکن چاروں تصویروں کے باہمی تقابل سے جو مجموعی اثر مترتب ہو سکتا ہے، اس کی صحیح عکاسی کرنے کی قابلیت رکھتی ہو، تو فن کار کی وہ ذہنی صلاحیت جس کی مدد سے وہ ایسا کر سکا "تخیل ترکیبی" کہی جا سکتی ہے۔ اسی طرح تجزئے کے عمل کو سمجھنے کے لئے فرض کیجئے کہ ایک فن کار کے ذہن میں آئیڈیل زندگی کی ایک تصویر موجود ہے۔ زندگی بسیط نہیں بلکہ مرکب ہے۔ اب اگر کسی فن کار کا ذہن اس تصوری زندگی کے مختلف اجزاء کو واقعی زندگی کے مختلف اجزاء پر منطبق کرنے اور اس سے نتائج اخذ کرنے کی قابلیت رکھتا ہے تو گویا اس کے ذہن میں "تخیل تحلیلی" کی صلاحیت موجود ہے۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ حسنِ تخیل کے لحاظ سے نئے ادب کی کیا حیثیت ہے۔ نئے ادیبوں میں سے وہ

وہ لوگ جو نئے ادب کے تخلیقی حالات سے براہ راست متاثر ہوئے ہیں ان میں تمثیلی تخیل کی موجودگی ایک قدرتی بات ہو کیونکہ ان لوگوں کے اذہان پر اُن حالات نے ایک واضح عکس ڈالا ہو۔ انھیں اُن حالات کا فرسٹ ہینڈ تجربہ ہو۔ اس عکس کا واضح ہونا اس بات کی ضمانت ہو کہ ان ادیبوں کے یہاں حُسنِ تخیل کی کمی نہیں ہوگی۔ حیات اللہ انصاری کے افسانے اور احسان دانش کی نظمیں دیکھئے۔ افلاس اور پستی کے وہ مرقعے جو ان فن کاروں نے پیش کئے ہیں وہ اس قدر "واضح" ہیں کہ ان کو دیکھ کر حُسنِ تخیل کے معنی خود بخود سمجھ میں آجاتے ہیں۔ نئے ادیبوں کو عام طور پر نئے سماج کی ضرورت کا احساس صرف کتابیں پڑھ کر نہیں ہوا بلکہ ایک خاص قسم کے ناساعد ماحول میں زندگی بسر کرنے کی وجہ سے ہوا ہو۔ لہٰذا یہ احساس محض کتبی یا عالمانہ نہیں بلکہ اتنا ہی حقیقی احساس ہو جتنا کہ دو وقت فاقہ کرنے کے بعد بھوک کا احساس ہو سکتا ہو! اگر کوئی احساس سچا بھی ہو اور شدید بھی تو وہ حُسنِ تخیل کے لئے بہترین خام مسالے کا کام دے سکتا ہو۔ نئے ادب میں ایک نظامِ نو کی ضرورت کا احساس سچا بھی ہو اور شدید بھی۔ لہٰذا وہ بجائے خود حُسنِ تخیل کا ضامن ہو۔

لیکن ترکیبی اور تحلیلی قسم کی قوتِ متخیلہ نئے ادیبوں میں بہت کم پائی جاتی ہو۔ بات یہ ہو کہ تخیل کی یہ دونوں قسمیں زیادہ تر وسیع "غور و فکر" سے ترقی پاتی ہیں۔ اور نئے ادیب عام طور پر صرف عمیق "غور و فکر" کے عادی ہیں، یہی وجہ ہو کہ ان کے افسانے اور نظمیں زیادہ تر داخلی ہوتی ہیں۔ ادب میں داخلیت کا مذاق ایک مستحسن چیز ہو لیکن نئے ادب کے مقصد کے پیشِ نظر داخلیت سے زیادہ مفید چیز خارجیت ہو۔ داخلی کیفیات کی صحیح عکاسی بے حد مشکل چیز ہو۔ اب جب تک وہ صحیح نہ ہو ناظرین یا سامعین پر اس کا اثر وہ نہیں ہو سکتا جو کہ خود فن کار پر ہوا ہو۔ اس لئے اگر خارجیت پر زیادہ توجہ صرف کی جائے تو میرے نزدیک نئے ادیب اپنے مقصد تک جلد پہنچ سکتے ہیں۔ عام معاشرہ صرف اسی ادب سے متاثر ہو سکتا ہو جو اس کی سمجھ میں آئے اور جو ادب داخلی مطالعے کا نتیجہ ہو وہ سمجھ میں مشکل سے آتا ہو کیونکہ داخلی مطالعے کی پرداز زیادہ تر ماورائے تجربہ فضاؤں میں ہوتی ہو۔ ادب کی خوب صورتی کی تیسری صورت حُسنِ ادا ہو۔ اس کا مطلب یہ ہو کہ تمثیلی یا ترکیبی یا تحلیلی تخیل کی بدولت جو تصور فن کار کے ذہن میں وارد ہو اس کو ایک حسین طریقے سے ادا کیا جائے۔ اگر تخیل قوی اور واضح ہوتی ہو تو وہ ایک حد تک اپنا اسلوبِ اظہار خود تلاش کر لیتی ہو۔ لیکن اسلوبِ اظہار بذاتِ خود ایک امتیازی اور مستقل وجود

رکھتا ہو۔ قوتِ متخیلہ کتنی ہی قوی کیوں نہ ہو یہ ضروری نہیں کہ اس کا اسلوبِ اظہار بھی اتنا ہی قوی ہو۔ ہر اس انسانی ذہن میں جو خلقتہً غیر شاعرانہ نہیں واقع ہوا حسین خیالات آتے رہتے ہیں لیکن کتنے لوگ ہیں جو ان خیالات کا اظہار حسین طریقے سے کرسکتے ہیں؟ نوے فی صدی لوگوں کو آپ یہی کہتے ہوئے پائیں گے کہ ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

تقریر کی لذت تو ہر معقول آدمی محسوس کرسکتا ہے لیکن تقریر کرنا بہت کم لوگ جانتے ہیں اسی طرح اگر کسی فن کار کو حسنِ ادا میں یدِ طولیٰ حاصل ہو تو یہ ضروری نہیں کہ اس کے یہاں حسنِ تخیل بھی بدرجۂ اتم موجود ہو۔ "ادا" یا اسلوبِ اظہار کا تعلق موضوع اور تخیل سے کم اور فن کار کی تکنیکی قابلیت سے زیادہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے کہنہ مشق جگت استاد جن کو موضوع اور تخیل کی اہمیت کا پتا بھی نہیں ہوتا، محض اپنی کہنہ مشقی اور جگت استادی کی بدولت فن کے اچھے نمونے پیش کرسکتے ہیں۔ اردو میں کئی غزل گو شعرار کا کلام اس کی تصدیق کرتا ہے۔ اس کلام کا موضوع بیشتر حالات میں پامال حسن و عشق کی پامال روداد ہوتا ہے جس کے متعلق پہلے سے اتنا مواد موجود ہوتا ہے کہ دماغی ورزش کی قطعی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن منجھے ہوئے، خوب صورت اور مترنم الفاظ کی محض الٹ پھیر سے ایک ہوشیار شاعر اچھے شعر نکال سکتا ہے۔ سچا آرٹ اسے نہیں کہتے۔ سچا آرٹ وہ ہے جس میں حسنِ موضوع، حسنِ تخیل اور حسنِ ادا تینوں کا دل کش امتزاج ہو۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ حسنِ ادا کے نقطۂ نظر سے نئے ادب کی نثر کا کیا پایہ ہے۔ اگر میرا مشاہدہ غلط نہیں ہے تو نئے ادب کی نثر نناوے فی صدی افسانوں اور ڈراموں پر مشتمل ہے۔ اہلِ تنقید اس بات پر متفق ہیں کہ ایک اچھے افسانے یا ڈرامے میں مندرجۂ ذیل خوبیاں ہونی چاہئیں:۔

(۱) طرزِ بیان
(۲) پلاٹ
(۳) کردار نگاری
(۴) مرکزی خیال

طرزِ بیان کی خوبیاں چار ہیں ـــــــ صفائی، سلاست، روانی اور اعتدال۔ زبان کی صفائی کا معیار یہ ہے کہ وہ بامحاورہ اور تعقیدِ لفظی و معنوی سے پاک ہو۔ سلاست سے مراد یہ ہے کہ زبان آسان اور فطری ہو۔ عالمانہ، کتبی یا مصنوعی قسم کی نہ ہو۔ روانی کا مطلب یہ ہے کہ الفاظ حتی الامکان سبک ہوں اور ان کی نشست میں موجوں کا سا اتار چڑھاؤ تو ہو لیکن بندر کی سی کود پھاند نہ ہو۔ اور فقروں اور جملوں کی باہمی ترتیب منطقی اصولوں پر پوری اُترے "چنگیزی" ہو اور نہ ہر موقع پر "ریختیانہ" جب نئے ادب کی نثر کو اس لحاظ سے دیکھا جاتا ہے تو کم از کم مجھے بڑی مایوسی ہوتی ہے نئے ادیب محاورے میں زیادہ تر مغربی زبانوں کی تقلید کرتے ہیں۔ "اُس نے کہا کہ وہ کل جائے گا" "سب سے آخر میں لیکن سب سے کم نہیں" "اُس نے دن میں چار مرتبہ دوالی" "بھوس سے چھائی گئی چھت پر دو گدھ بیٹھے ہوئے تھے" اس قسم کے بدنما ترجمے نئے ادب کی نثر میں بکثرت نظر آتے ہیں۔ ان کے پڑھنے والے کو سوا امتلائے ذہنی کے اور کیا حاصل ہو سکتا ہے؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ نئے ادیبوں کی زیادہ تعداد اپنی زبان کے محاوروں سے واقف ہی نہیں کیونکہ انھوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ ایسے ماحول میں بسر کیا ہے جہاں انگریزی ہی اوڑھنا بچھونا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ محاورے میں مغربی زبانوں کی تقلید کرنا کچھ فیشن میں داخل ہو گیا ہے۔ اور جو چیز فیشن بن گئی ہو وہ غلط کیونکر ہو سکتی ہے! نئے ادب کی نثر میں تعقیدِ لفظی و معنوی کی مثالیں بھی کافی نظر آتی ہیں۔ اظہارِ قابلیت کی کوشش یا جدت کے خبط میں فقروں اور جملوں کے سر پیر کا اکثر ہوش نہیں رہتا جس کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوتا کہ فقرہ یا جملہ بدنما ہو جائے بلکہ بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ

مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

سلاست زبان کے لحاظ سے بھی نیا ادب ناقص نظر آتا ہے۔ نئے ادیبوں میں بہت کم لوگ اہلِ زبان ہیں۔ اہلِ زبان نہ ہونے کا نقص بڑی حد تک مشاہدے اور مطالعے کی مدد سے دور ہو سکتا ہے۔ لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ نئے ادیب زبان کو اتنی اہمیت ہی نہیں دیتے جتنی کہ دینی چاہیئے۔ ان میں سے بعض تو قواعد کی غلطیاں بھی کرتے ہیں۔ اور عالمانہ، کتبی یا مصنوعی قسم کی زبان تو تقریباً سب استعمال کرتے ہیں۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ نئے تصورات کے اظہار کے لئے مانوس اور عام فہم الفاظ اردو میں کم ہیں۔ یہاں تک تو اسلوب کا تعلق قابلِ گرفت نہیں۔ لیکن اس کے علاوہ یہ وجہ بھی ہے کہ نئے ادیب عام طور پر مانوس اور عام فہم الفاظ عمداً استعمال نہیں کرتے

شاید اس لئے کہ اس ترکیب سے اُن کی شخصیت کے گرد ایک پراسرار تبحر علمی کی فضا چھا جاتی ہے۔ یہ ان لوگوں کی غلط فہمی ہے۔ اس قسم کی فضا سے صرف ناواقف لوگ متاثر ہو سکتے ہیں، مگر ایک اوسط درجے کے تعلیم یافتہ آدمی کی نظر میں یہ فضا محض نمائشی اور غیر حقیقی ہوتی ہے۔ نئے ادب کے ایک افسانے سے جو حال ہی میں شائع ہوا ہے، مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو۔

"...........زندگی کے ٹھوس مطالبات آرزوؤں کی حدت سے نقطۂ احتراق پر پہنچ کر گیس بن جاتے ہیں اور تصورات کی پنکھی چلنے لگتی ہے۔ پروازِ خیال کے آگے ہر کین اور اسپٹ فائر کی رفتارمات۔ کرنشہ کے اتار کے وقت صرف ڈپٹی مجسٹریٹی نظر آتی ہے.........."

اس عبارت میں ایک نفسیاتی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ لیکن اندازِ بیان ایک لکچر روم کا سا ہے۔ اس کو افسانے کے اندازِ بیان سے کیا تعلق؟

روانی کے متعلق زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ یہ چیز بہت مشق اور تجربہ کے بعد حاصل ہوتی ہے اور نئے ادیبوں میں ان دونوں کی کمی ہے۔ تحریر میں روانی صرف صاحبِ طرز مصنفوں کے یہاں پائی جاتی ہے اور نوجوان ادیبوں میں کسی صاحبِ طرز مصنف کا پایا جانا ناممکن ہے۔ لیکن کم از کم یہ تو ممکن ہے کہ بھدّی قسم کی "ٹھوکروں" سے احتراز کیا جائے۔ نئے ادیب اکثر بھاری بھرکم الفاظ اور ترکیبیں استعمال کرتے ہیں خواہ ان کے مترادف ہلکے پھلکے الفاظ اور ترکیبیں موجود ہوں۔ "لاشعور" "تحت الشعور" "تجرید" جیسے الفاظ کا استعمال فلسفہ یا نفسیات میں تو ٹھیک ہے لیکن افسانے یا ڈرامے میں ان کا استعمال تکلف کی بات ہے۔ الفاظ کی نشست میں موجوں کا سا اتار چڑھاؤ تو جب ہی ہو سکتا ہے جب کہ مصنف الفاظ کے "وزنِ اضافی" اور "آہنگ صوتی" سے اچھی واقفیت رکھتا ہو۔ یہ دونوں چیزیں صرف حُسنِ عبارت کے لئے ضروری نہیں بلکہ افسانے یا ڈرامے کی اثر انگیزی خود ایک حد تک انھیں پر منحصر ہے۔ مثلاً جو اندازِ بیان نقطۂ عروج پر استعمال ہونا چاہیئے، وہ اگر تمام افسانے یا ڈرامے میں استعمال کیا جائے تو نقطۂ عروج کے کچھ معنی ہی نہ رہ جائیں گے۔ نئے ادیب عام طور پر الفاظ کو اہمیت ہی نہیں دیتے۔ پھر ان سے وزنِ اضافی اور آہنگِ صوتی کے سمجھنے کی کیا توقع کی جائے؟ فقروں اور جملوں کی منطقی ترتیب بھی محض عبارت آرائی کے لئے ضروری نہیں ہوتی بلکہ مسئلہ زیرِ بحث کو

بنانے کے لئے بھی ضروری ہوتی ہے۔ انگریزی میں اسٹورٹ مل کی تصانیف پڑھنے سے منطقی اسلوب تحریر کی اہمیت اور افادیت خود بخود ذہن نشین ہوجاتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مل کا طرز تحریر افسانے یا ڈرامے میں بھی اختیار کیا جائے میرا مطلب فقط یہ ہے کہ تحریر خواہ کسی قسم کی ہو اسے منطق سے بے نیاز نہیں ہونا چاہیے۔ نئے ادب کے افسانوں اور ڈراموں میں اکثر منطقی اندازِ تحریر کا فقدان اس قدر شدت کے ساتھ محسوس ہوتا ہے کہ ان کا مرکزی خیال (اگر ان میں واقعی کوئی مرکزی خیال ہے) دریافت کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔ ایک ہی سانس میں دو مختلف بلکہ متناقض رایوں کا اظہار، ایک جملے میں ایک اصول کا استقرار اور دوسرے میں اس سے فرار ———— یہ چیزیں نئے ادب کی نثر میں اکثر نظر آتی ہیں۔

اعتدال کے لحاظ سے نئے ادب کی نثر کچھ زیادہ قابل گرفت نہیں نظر آتی۔ اس کا سبب غالباً وہی "انگارے" والا تجربہ ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ نئے ادب کی نثر کا لہجہ بیشتر حالات میں موضوع کے حسب حال ہوتا ہے۔ لیکن بعض چیزوں کے بیان میں ناروا مبالغہ پایا جاتا ہے۔ آرٹسٹ کے لئے تھوڑا بہت مبالغہ ایک حد تک ضروری ہے۔ مبالغے کی چاشنی کے بغیر آرٹسٹ کی بنائی ہوئی تصویر عکس تو ہوسکتی ہے نقش نہیں ہوسکتی لیکن مبالغہ مناسبت سے بڑھ جائے تو تصویر نہ عکس رہتی ہے نہ نقش بلکہ کارٹون بن جاتی ہے۔ نئے ادب کی بعض نثری "تصویریں" بھی کارٹون معلوم ہوتی ہیں مثلاً بیدی کے افسانے "بددعا" میں "نورے" کا کردار۔ اس میں شک نہیں کہ کارٹون سازی بھی ایک فن ہے لیکن فنونِ لطیفہ میں اس کا شمار نہیں ہوسکتا۔ نئے ادب کے بعض افسانوں کا لہجہ بلاوجہ خطابتی یا صحافتی یا دکالتی ہوتا ہے۔ ایک جدید افسانے سے جو کچھ عرصہ ہوا ایک ترقی پسند رسالے میں شائع ہوا ہے ذیل کا اقتباس ملاحظہ۔

"............ کیا وہ انسان نہیں تھی؟ کیا وہ مشین تھی؟ بے حس اور ان تھک؟ کیا مریضوں کی قے اور ان کی پیپ، ان کے پیشاب اور پاخانے سے اس کو کراہت نہ آتی تھی؟ کیا ان بیمار، زرد، یرقانی، جربانی، سلی، جھریاں پڑے ہوئے چہروں کو دیکھتے دیکھتے اس کا احساس حسن بالکل فنا ہوگیا تھا؟ کیا وہ بھی دل و دماغ رکھتی تھی؟ کیا اس کے دل میں بھی اُمنگیں تھیں؟ کیا اُس کے دماغ میں بھی منصوبے تھے؟ کیا اس کے کان بیمار کی کراہوں اور موت کی ہچکیوں

کو سنتے سنتے اتنے بے حس ہوگئے تھے کہ ستار کی ایک گت، کسی خوش گلو کے ایک گانے، چڑیوں کے چہچہانے کا ان پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا؟ کیا بیماری اور موت کی قربت نے زندگی اور زندگی کی تڑپ کو بالکل فنا کر دیا تھا......."

سچ بتائیے گا کہ یہ عبارت کسی افسانے کا ٹکڑا معلوم ہوتی ہی یا کسی تقریر یا اخباری کالم کا؟

اب افسانے یا ڈرامے کی دوسری اور تیسری خصوصیتوں، یعنی پلاٹ اور کردار نگاری پر غور کرنا ہی پلاٹ کی منطقی تعریف کیا ہی مجھے معلوم نہیں، میرے نزدیک پلاٹ کا مطلب ایسا ماحول ہی جس میں افسانے یا ڈرامے کے افراد کو اپنی "کردار نمائی" کا موقع مل سکے۔ ایسا ماحول فراہم کرنے کے لئے فن کار کو مرکزی کرداروں کے علاوہ چند ضمنی کردار بھی خلق کرنے پڑتے ہیں۔ اور واقعات کو اس انداز سے ترتیب دینا ہوتا ہی کہ ان تمام کرداروں کے باہمی تعلقات، ان کے اقوال و افعال، جذبات و احساسات، وغیرہ غیر محسوس طریقے سے از خود سامنے آجائیں تاکہ ہر فرد کا کردار اور مختلف کرداروں کی اضافی اہمیت غیر مبہم طریقے سے متشخص ہو سکے اور ان کا مجموعہ مرکزی کرداروں کے لئے ایک پس منظر کا کام دے سکے۔ جب پلاٹ کو اس نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہی تو وہ کردار نگاری کا ایک جزو لازمی ٹھیرتا ہی۔ آج کل جو خیال پیدا ہو گیا ہی کہ افسانے یا ڈرامے میں پلاٹ کوئی اہم چیز نہیں اور ضروری چیز صرف کردار نگاری ہی، غلط ہی۔ اس وجہ سے کہ افسانے یا ڈرامے میں صحیح معنوں میں کردار نگاری بغیر پلاٹ کے ممکن ہی نہیں اور اگر بغیر پلاٹ کے کردار نگاری کی کوشش کی جائے، تو نتیجہ ممکن ہی نفسیات کا کوئی مقالہ ہو، افسانہ یا ڈراما تو ہو نہیں سکتا۔

نئے ادب کے افسانوں اور ڈراموں میں پلاٹ کا عنصر بہت کم ہی اور روز بروز کم ہوتا جاتا ہی۔ اسی نسبت سے فن کردار نگاری روبہ انحطاط ہی۔ اس میں شک نہیں کہ اس کمی کی تلافی کسی حد تک اُس "نفسیاتی تجزیے" سے ہو جاتی ہی جو نئے ادب میں کسی مخصوص کردار کے داخلی پہلو کو نمایاں کرنے پر صرف کی جاتی ہی۔ میرا مقصد داخلی پہلو کی اہمیت کو کم کرنا نہیں ہی، لیکن داخلی پہلو کردار کا محض ایک جزو ہوتا ہی۔ انسان محض چند احساسات اور خیالات کا مجموعہ نہیں ہی۔ اس کا ایک نہایت اہم جزو عمل سے عبارت ہی اور اس چیز کا اظہار کوئی افسانہ یا ڈراما مکمل طور پر نہیں کر سکتا جب تک وہ ایک مناسب ماحول یعنی پلاٹ تیار نہ کرے۔ اس لحاظ سے نئے قسم کے افسانے اور ڈرامے

کردار نگاری کے اصول پر پورے نہیں اترتے۔ دراصل یہ افسانے اور ڈرامے کہلانے کے مستحق ہوتے ہی نہیں۔ ایسی نگارشات کے لئے مناسب ادبی نام "خاکہ" ہے۔

شاید بعض لوگوں کو میرا یہ بیان عجیب معلوم ہو کیونکہ نئے افسانوں اور ڈراموں کے متعلق جتنے تنقیدی مقالے اب تک میری نظر سے گزرے ہیں تقریباً اُن سب میں یہ آواز بلند یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ اردو ادب میں کردار نگاری کی بنیاد نئے ادب ہی نے ڈالی ہے۔ یہ میں بھی مانتا ہوں کہ پرانے افسانوں اور ڈراموں میں کردار نگاری کا عنصر بہت کم تھا اور ہمارے ادب میں اس کا مذاق زیادہ تر مغربی ادب کا رہینِ منت ہے۔ لیکن میں یہ ماننے کو تیار نہیں کہ ہمارے ادب میں یہ خوبی نئے ادب کے طفیل آئی ہے۔ نذیر احمد، پریم چند، مرزا رسوا، اور علی عباس حسینی کے ناولوں یا افسانوں میں یہ خوبی اس وقت سے موجود ہے جب نیا ادب پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔

مرکزی خیال کو اگرچہ ترتیب کے لحاظ سے میں نے سب سے آخر میں رکھا ہے لیکن اہمیت کے لحاظ سے یہ چیز سب سے زیادہ ہے۔ مرکزی خیال افسانے یا ڈرامے کی رُوح ہوتا ہے جس کو زبان، پلاٹ اور کردار نگاری کے پیکر میں مقید کیا جاتا ہے۔ اگر کسی افسانے یا ڈرامے میں مرکزی خیال نہیں ہے تو وہ افسانے یا ڈرامے کی بجائے پولیس کا روزنامچہ کہلانے کا مستحق ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مرکزی خیال افسانے یا ڈرامے کی واحد خوبی ہے۔ اور نہ میرا یہ دعویٰ ہے کہ افسانہ یا ڈراما لکھتے وقت فن کار کے قلب و دماغ پر مرکزی خیال حاوی رہنا چاہیئے۔ نہیں۔ آرٹسٹ کے پیش نظر سب سے زیادہ آرٹ رہنا چاہیئے اور اس کے بعد کچھ اور۔ آرٹسٹ واعظ یا پروپاگینڈسٹ نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ آرٹسٹ کا اپنا نقطۂ نظر، اپنا زاویۂ نگاہ، اپنا مقصد، اپنا پیام ہوتا ہی نہیں۔ ایک خاص نقطۂ نظر، زاویۂ نگاہ مقصد یا پیام آرٹسٹ کا بھی ہو سکتا ہے اور واعظ کا بھی۔ فرق صرف ان کے طرز ادا میں ہوتا ہے۔ واعظ دماغ کو اپیل کرتا ہے اور آرٹسٹ دل کو۔ واعظ کے آلات سائنس، فلسفہ، منطق وغیرہ ہیں۔ فن کار کے آلاتِ حسن و جمال، رقص و موسیقی ہیں۔ لیکن مرکزی خیال جیسا کہ واعظ کے وعظ میں ہوتا ہے اسی طرح فن کار کی نظم یا رقص یا موسیقی میں ہوتا ہے یا ہونا چاہیئے۔ واعظ اور فن کار کو اپنا اپنا دائرۂ عمل سمجھنا اور پہچاننا چاہیئے۔ واعظ کو شاعری اور شاعر کو پند و نصیحت نہیں اختیار کرنی چاہیئے۔ ورنہ نہ شاعر کا مقصد پورا ہو سکتا ہے اور نہ واعظ کا۔

نئے ادیبوں کو اپنے مقاصد کے پیش نظر اپنے افسانوں اور ڈراموں کا مرکزی خیال موجودہ سماج کی خرابیاں

یا نئے سماج کا تصور" رکھنا چاہیئے۔ نئے ادب کے ابتدائی افسانوں اور ڈراموں کا مرکزی خیال "موجودہ سماج کی خرابیاں"
ہوتا بھی تھا لیکن کچھ عرصے سے نئے ادیب مرکزی خیال کی اہمیت کو قطعی طور پر فراموش کر رہے ہیں۔ اور ان کا رجحان
خاص نفسیاتی "اکس رے" کی طرف ہو رہا ہے اور وہ بھی محض تفننِ طبع یا تلذذ جنسی کی خاطر۔ ممتاز مفتی کا افسانہ "حد ہوگئی" بہت دلچسپ ہے۔ لیکن اس میں جو نفسیاتی تجزیہ کیا گیا ہے اس کو نئے ادب کے مقاصد سے کیا تعلق؟ اور پھر اس کا مرکزی
خیال کیا ہے؟ اسی طرح بیدی کے "ٹرمینس" کا مرکزی خیال کچھ نہیں معلوم ہوتا۔ یہ حال تو مشہور افسانہ نگاروں کا ہے اور
درجۂ دوم و سوم کے افسانہ نگاروں کی خرافات میں تو سر پیر ہوتا ہی نہیں۔ مرکزی خیال افسانے یا ڈرامے کی صرف
ایک تکنیکی خوبی نہیں ہے بلکہ اس کی اثر انگیزی کی شرط لازمی ہے۔ کسی افسانے یا ڈرامے کے مرکزی خیال کا نقش جتنی وضاحت
اور شدت کے ساتھ ناظرین پر مرتسم ہوگا اسی قدر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگا خواہ وہ مقصد حصولِ مسرت
ہو خواہ ارتفاع زندگی۔ جب نئے ادب کا مقصد ارتفاع زندگی سے قریب تر ہے۔ بہ نسبت حصولِ مسرت کے،
تو اس کا مرکزی خیال بھی ایسا ہونا چاہیئے جس میں ارتفاعِ زندگی کے امکانات حصولِ مسرت کے امکانات سے
زیادہ ہوں۔ اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے جبکہ نفس کے مطالعۂ داخلی کے علاوہ نئے ادیب خارجی دنیا کا مطالعہ
بھی کریں۔

اب نئے ادب کی نظم کا جائزہ لینا ہے۔ یہاں بھی حُسنِ موضوع، حُسنِ تخیل اور حُسنِ ادا کا اصول پیشِ نظر
رکھنا ضروری ہے۔

(باقی مضمون دسمبر کی اشاعت میں درج ہوگا) سید باقر حسین ایم اے

روس کی خارجی پالیسی

اس مضمون کی دو قسطیں جون و جولائی ۱۹۴۲ء کے رسالہ جامعہ میں چھپ چکی ہیں۔ ان میں محض روس جرمن جنگ یعنی جون ۱۹۴۱ء تک کے حالات پر بحث کی گئی تھی۔ پیش نظر مضمون میں مابعد کے حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

"جامعہ"

جنگ کے قریب دو سال بعد تک سرمایہ پرست حکومتیں اسی خیال میں رہیں کہ روس اور جرمنی میں شیطانی معاہدہ ہو چکا ہے اور دونوں مل کر دنیا کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ خیال کہاں تک صحیح تھا ہم پہلے بیان کر چکے ہیں روس پر حملہ کرتے وقت ہٹلر کی تقریر نے اس غلط فہمی کو اور بھی دور کر دیا۔ اگست ۳۹ء کے روسی جرمن معاہدے کے متعلق ہٹلر نے کہا "میں نے ۳۹ء میں ربن ٹراپ کو ماسکو بھیجا کیونکہ میرا خیال تھا کہ روس سے سمجھوتہ ہو سکتا ہے خیر ربن ٹراپ کے ذریعہ معاہدہ ہو گیا۔ لیکن ۳۹ء کے آخر اور ۴۰ء کے اوائل میں روس نے فن لینڈ اور بالٹک ریاستوں کو اپنے قابو میں کرنے کی ٹھان لی۔ روس کا یہ عمل کھلے بندوں جرمنی کے خلاف تھا" اس نے یہ بھی کہا "جب روس نے یوگوسلاویہ کو اسلحات بھیجنے کا وعدہ کیا اور سلونیا کے ذریعہ اہل سربیہ کو ہتھیار اور ہوائی جہاز بھیجے اس وقت روسی جرمن معاہدہ ختم ہو گیا تھا"۔ ہٹلر کی تقریر نے نہ صرف سرمایہ پرستوں کی غلط فہمی کا ازالہ کیا بلکہ یہ بھی ظاہر کیا کہ روسی جرمن معاہدہ ایک وقتی چال تھی۔ دراصل نہ روسی اور نہ جرمن اس کو مضبوط بنیاد پر قائم کرنا چاہتے تھے۔

ہٹلر نے آگے چل کر یہ بھی کہا "بالشوزم نیشنل سوشلزم (فاشزم) کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ بالشویک روس اس گھات میں ہے کہ جب جرمنی مغربی محاذ پر موت و زیست کی جنگ میں مشغول ہو وہ پیچھے سے اس پر حملہ کر دے۔ ایسی حالت میں جرمنی کیوں کر خاموش رہ سکتا تھا"۔ ہٹلر کا خیال تھا کہ روس پر جرمن حملہ دنیا کی سیاست میں زبردست تبدیلی پیدا کر دے گا اور تمام سرمایہ پرست طاقتیں بالشوزم کے خلاف اس کی حمایت کریں گی۔ چنانچہ اس نے یہ بھی کہا "جرمن فوجیں صرف اپنی زیست کے لیے نہیں لڑ رہی ہیں بلکہ یورپ کے

تمدن کو بالشوزم سے بچانا چاہتی ہیں۔" ہٹلر کا خیال صحیح تھا۔ بین الاقوامی سیاست میں واقعی حیرت انگیز تبدیلی ہوئی۔ لیکن ہٹلر کے حق میں نہیں بلکہ اس کے خلاف۔ نازی حملے کی خبر پہنچتے ہی چرچل نے ریڈیو پر ایک تقریر کی جس نے بین الاقوامی سیاست کا رخ بدل دیا۔ چرچل نے نہ صرف انگلستان کی ہمدردی کا اظہار کیا اور روس سے بھائی چارہ پیدا کرنے کی ترغیب دی بلکہ انگلستان کے بہت سے ایسے اشخاص کی امیدوں پر پانی پھیر دیا جو اغلباً جرمن حملے کو بالشوزم کے خاتمے کا وسیلہ ٹھیراتے تھے۔

حملے کے چند گھنٹے بعد مولوتوف نے روس کی پالیسی کو واضح کرتے ہوئے کہا "ہم پر یہ جارحانہ حملہ جرمن عوام نے نہیں کیا۔ نہ اس میں جرمن مزدوروں اور صاحب عقل لوگوں کا ہاتھ ہے۔ ان کے حالات سے ہم خوب واقف ہیں۔ اس حملہ کے بانی جرمنی کے وہ خوں آشام فاشی گروہ ہیں جنھوں نے فرانس، چیکوسلاواکیہ، پولینڈ، یگوسلاویہ، ناروے، بلجیم، ڈنمارک، یونان اور دیگر ممالک کے عوام کو غلام بنایا ہے۔" جن الفاظ میں مولوتوف نے روس کی پالیسی کا ادعا کیا ہے ان سے صاف ظاہر ہے کہ روس انسانیت کے تحفظ کے لئے لڑ رہا ہے۔ اس کے جنگی مقاصد ہرگز یہ نہیں ہیں کہ صرف اپنے ہی ملک کا تحفظ کیا جائے۔ وہ ان تمام ممالک کی جنگ آزادی میں شامل ہے جو فاشزم کے قبضے میں آچکے ہیں۔ وہ بین الاقوامی فاشزم کے خلاف ہے جس کی تباہی پر ایک نئی دنیا آباد ہوگی۔ ایسی دنیا جس میں جبر و تشدد کا خاتمہ کیا جائے اور ہر قوم پُرامن زندگی بسر کر سکے۔

جرمن حملے کے چند روز قبل نیو اسٹیٹسمین (لندن) کے نام ایک خط میں جارج برنارڈ شا نے روس کی پالیسی پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالتے ہوئے کہا کہ انگلستان روس کے خلاف زبردست غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ انھوں نے کہا "اسٹالن کو بلا وجہ بلکہ بعض کی حد تک بُرا کہا جاتا ہے۔ آج کل ہم لوگ یا تو اسے ایک خونخوار بھیڑیے سے تعبیر کرتے ہیں جو اپنے سیاسی مخالفین کو ایک ایک کرکے موت کے گھاٹ اتار رہا ہے۔ یا اسے مثل اپنے محکمۂ خارجہ کی چالوں کے ایک ایسا چال باز تصور کرتے ہیں جو سترھویں اور اٹھارہویں صدی جیسی خانہ جنگیوں اور ملوکیت پرستی کے خواب دیکھ رہا ہے۔ اسٹالن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ایسے دو مسائل کو حل کر دیا ہے جس پر دنیا محو حیرت ہے۔ اول صرف ایک ہی ملک میں اشتراکیت کو کامیاب بنانا جبکہ وہ ملک چاروں طرف سے سرمایہ پرست دشمنوں میں گھرا ہو۔ اور دوم زراعتی حالات میں جو آج تک ہمارے

انگریزی وزرا مدد کر سکے۔ رہا یہ خیال کہ وہ جرمن فوج اور ہٹلر سے ڈرتا ہے بیحد مضحکہ خیز ہے۔ دنیا میں اسٹالن ہی ایک ایسا مدبر ہے جس نے بین الاقوامی حالات کے نازک سے نازک موقعے پر دلیرانہ پالیسی سے کام لیا ہے گویا وہ جرمن فوج کے وجود ہی کو تسلیم نہیں کرتا۔ اسٹالن کو شکست کا ذرا بھی خطرہ نہیں ہے۔ ہاں وہ کسی حالت میں بھی جنگ نہیں چاہتا کیونکہ جنگ ایک اشتراکی ملک میں سب سے بڑا قہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسٹالن ہر عاقلانہ طریقے سے جنگ سے گریز کرتا رہے گا۔" صرف برنارڈ شا پر کیا منحصر ہے۔ جرمن حملہ کے دوسرے روز رائٹر کے ڈپلومیٹک نمائندے نے بیان دیا کہ" باوجود روسی جرمن معاہدہ کے دونوں ممالک کے باہمی تعلقات کبھی خوشگوار نہ رہے۔ نہ تو بالٹک ریاستوں اور لبارابیہ کا روس میں شامل ہونا جرمنی کو بھایا اور نہ روس نے بلقان میں جرمن اثر کو اچھا سمجھا۔"

۳ جولائی کو اسٹالن نے اپنی بصیرت افروز ریڈیائی تقریر میں روس کی خارجی پالیسی صاف صاف بیان کردی۔ دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ سویٹ روس بین الاقوامی سیاست میں ہمیشہ امن کا خواہاں رہا ہے اور مجلس اقوام میں ہر امکانی کوشش کی ہے کہ دنیا میں امن قائم رہے۔ علاوہ بریں سویٹ روس ہر جمہوری ریاست کے ساتھ فاشزم کے خلاف متحدہ محاذ قائم کرنے کے لئے تیار تھا۔ اس کی بین الاقوامی وسعت نظری ضرب المثل ہے۔ چنانچہ اشتراکی روایات مدنظر رکھتے ہوئے اسٹالن نے اپنی تقریر میں روسی جرمن جنگ کو آزادی اور فاشزم کی جنگ تصور کیا ہے اور تمام ملکوں کو دعوت دی ہے کہ اس بین الاقوامی جنگ میں شامل ہو کر آزادی حاصل کریں۔ اسٹالن نے کہا" فاشزم کے خلاف جنگ محض سویٹ یونین سے نازی حملہ آوروں کو مار بھگانے تک محدود نہیں رہے گی۔ سویٹ ان تمام یورپی ممالک کے عوام و نیز جرمن عوام کی آزادی کے لئے لڑ رہا ہے جنھیں فاشیوں نے غلام بنا رکھا ہے۔ اس جنگِ آزادی میں ہم تن تنہا نہیں ہیں۔ ہمارے ساتھی یورپ، امریکہ اور خود جرمنی کے عوام ہیں۔ ہماری جنگ یورپ اور امریکہ کے ان آزادی پسند انسانوں کی جنگ میں ضم ہوگئی ہے جو جمہوری آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں۔ ہمارا محاذ تمام آزاد انسانوں کا اجتماعی محاذ ہے اور تمدن، کلچر اور انسانی قدروں کو ہٹلر کے فاشیوں سے آزاد کرانا چاہتا ہے۔ برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر چرچل کی تقریر کا بھی یہی منشا ہے اور امریکہ کا وعدہ کہ وہ ہماری مدد کرے گا اسی چیز کو ظاہر کرتا ہے۔" اسٹالن کی تقریر پر تبصرہ کرتے ہوئے لندن کے اخبار مینچسٹر گارڈین نے لکھا" اسٹالن نے روسی عوام کے مفاد کو دنیا کے عوام کے

مفاد میں مدغم کردیا ہی"۔ لندن ٹائمز نے اسٹالن کی اپیل سے ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے لکھا کہ برطانیہ اور امریکہ کا فرض ہی کہ وہ روس کی ہر طرح مدد کریں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہونا لازمی ہی کہ انگریزی حکومت جو روس کے خلاف تھی کیونکر اس قدر جلد اس کے موافق ہوگئی؟ وہ مسٹر چرچل جو کنزرویٹو پارٹی کے صدر تھے کیسے گوارا کرسکے کہ روس اور انگلستان میں بھائی چارہ پیدا ہوجائے؟ کیوں کر انھوں نے روس کی جنگ کو دنیا کے جمہوریت پسند عوام کی جنگ خیال کرلیا؟ ظاہر ہی کہ اس کا آسان سا جواب یہ ہوسکتا ہی کہ انگلستان اس بات کا خواہاں تھا کہ جرمنی اور روس آپس میں کٹ مریں اور راس کے سر سے جرمن بلا ٹل جائے لیکن یہ عامیانہ جواب وہی لوگ دیتے ہیں جن کی نظروں میں (بھلا ہو غلامانہ ذہنیت کا) برطانیہ کا ہر عمل ایک ملو کی چال ہی۔ بین الاقوامی سیاست کسی فرد یا کسی ملک کی خواہشات کی تابع نہیں ہوا کرتی۔ اصل میں ان سوالات کا جواب برطانیہ کی دو سال کی سیاسی اور سماجی زندگی میں تلاش کرنا پڑے گا۔

فرانس کی شکست نے جمہوری طاقتوں کی آنکھوں سے پردے اٹھائے اور انھیں فاشزم کا شدید خطرہ محسوس ہونے لگا۔ انھیں یہ احساس ہوگیا کہ فاشی طاقتیں خود ان کے ملک میں موجود ہیں۔ چنانچہ بیرونی اور گھریلو فاشزم سے مقابلے کے لئے وہ جلد جلد تیار ہونے لگے۔ انگریزی عوام نے اسے جلد محسوس کیا کیونکہ ہٹلر کے یورپ اور ان کے ملک کے درمیان صرف ایک تنگ آبنائے ہی۔ ڈنکرک کی شکست نے انھیں حقیقت سے دوچار کرادیا اور باوجود کنزرویٹو پارٹی کی اکثریت کے حکومت میں تبدیلی ہوئی۔ برطانوی جمہوریت، فاشزم کو ختم کرنا چاہتی تھی۔ عوام مصالحت کے سخت خلاف تھے۔ ان کی بیداری اس قیامت خیز تیزی سے شروع ہوئی کہ چیمبرلین جیسے رجعت پسند حکومت سے علیحدہ کردئے گئے اور چرچل نے لیبر پارٹی کے نمائندوں کے تعاون سے حکومت کو اس وقت از سر نو ترتیب دیا، جبکہ یورپی ممالک ایک کے بعد ایک فاشی ہوتے جارہے تھے صرف سوویٹ یونین اور انگلستان ہی فاشزم سے ٹکر لینے کے لئے تیار ہورہے تھے۔ خیر روس اور جرمنی کے تو بنیادی اور اصولی اختلافات تھے۔ آخر انگلستان کی اس فاشی دشمنی کی کیا وجہ تھی؟ اس کا سبب یہ تھا کہ انگلستان کے عوام کی روایاتی جمہوریت پسندی خواب سے بیدار ہوچلی تھی۔ وہ روایاتی جمہوریت پسندی جس کو انھوں نے میگنا کارٹا، بل آف رائٹس اور چارٹسٹ تحریکوں میں کافی جانیں ضائع کرکے حاصل کی تھی۔ سرمایہ پرستی کے انحطاطی دور میں ہر طاقت

جو جمہوری آزادی اور جدید سائنس کی گراں بہا قدروں کو فاشی بربریت سے بچانے کی کوشش کرے تمام زبوں حال عوام کی نمائندگی کرے گی اور اقتصادی افراتفری اور سیاسی تشدد کو ختم کرے گی۔ یورپ میں پارلیمانی جمہوریت سرمایہ پرست طبقے کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب سرمایہ پرست طبقہ جاگیریت کے مقابلے میں ترقی پسند تھا لیکن اب جبکہ سرمایہ پرستی ایک رجعت پسند مسلک بن چکا ہے وہ عوام کے جذبات کی ترجمانی ہرگز نہیں کرسکتا چنانچہ ۱۹۴۰ء میں یورپ کے سامنے یہ سوال تھا کہ آیا وہ سرمایہ پرستی اور ملوکیت پرستی کے ڈوبتے سفینے کو بچانے کے لیے جمہوریت کو قربان کرسکتا ہے؟ برطانیہ کے عوام نے اس کا جواب نفی میں دیا کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ سرمایہ پرستی اور ملوکیت پرستی صرف فاشزم قبول کرلینے سے بچ سکتی ہے۔

جرمن اعلیٰ کمان نے دیکھا کہ انگلستان تمام یورپ کے فاشی ہوجانے میں مانع ہو رہا ہے چنانچہ برطانیہ پر زبردست ہوائی حملے شروع ہوئے جنھوں نے انگلستان کی بہت سی عمارتوں کو ڈھا دیا لیکن عوام کے بڑھتے ہوئے جذبے کو دبا نہ سکے۔ ان ہوائی حملوں سے جرمنی کو فائدہ پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو مگر انگلستان کو ضرور پہنچا۔ وہاں ہوم گارڈ کی تیس لاکھ فوج دیکھتے دیکھتے کھڑی ہوگئی۔ اس فوج کے سپاہی وہ مزدور اور غریب عوام تھے جو دن بھر کام کرنے کے بعد شام کو فوجی تعلیم لیتے تھے۔ گھر گھر ہوم گارڈ کا چرچا ہوگیا۔ تیس لاکھ شہری چھاپہ ماری کے اصولوں سے واقف ہوگئے۔ کیا یہ انگلستان کا انقلاب نہیں کہا جاسکتا؟ ڈنکرک کے بعد جو کام شروع ہوا اس کی تکمیل ہوائی حملوں کے وقت ہوئی۔ سرکاری فوج پیچھے ہٹ بھی سکتی ہے عوام کی فوج پیٹھ دکھلانا نہیں جانتی۔ پھر یہ کہ تیس لاکھ شہری جو جمہوری آزادی کے تحفظ کے لیے جرمن فاشزم کے خلاف کھڑے ہوگئے ہیں کیا اپنے ہم وطن جمہوریت دشمن لوگوں کو کبھی پنپنے دیں گے؟

اس ذہنی انقلاب کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ سویٹ یونین اور انگلستان میں بھائی چارہ پیدا ہوجائے چنانچہ ۱۲ جولائی ۱۹۴۱ء کو نازی حملے کے ٹھیک تین ہفتے بعد دونوں ملکوں میں ایک سمجھوتہ ہوا جس کی بنا پر دونوں ملکوں نے نازی جرمنی کے خلاف جنگ میں ایک دوسرے کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا اور یہ طے کیا کہ اس جنگ میں بغیر باہمی رضامندی کے کوئی بھی نہ صلح کرے گا اور نہ اس کی بات چیت ہی میں حصہ لے گا۔ اس سمجھوتے سے دونوں ملکوں کے عوام میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ انھیں اطمینان ہوگیا کہ فاشزم کو تباہ کرنے کے لیے

ان کے ملک متحد ہوگئے ہیں۔ اینگلو روس سمجھوتے پر تبصرہ کرتے ہوئے ماسکو ریڈیو نے کہا "تمام متمدن دنیا انگریزی عوام کی بہادری کی مداح ہی جس وقت انگلستان پر فاشی حملے کا خطرہ بڑھا انگریزی عوام ملکی تحفظ کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے اپنی ایک زبردست فوج تیار کرلی۔ انگریزی عوام واقف ہیں کہ سویٹ یونین صحیح جمہوریت، کلچر اور تمدن کی سرزمین ہی۔ موجودہ سمجھوتے سے دونوں ملکوں کے عوام کے تعلقات میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا ہی۔ ایک مشترکہ دشمن یعنی فاشزم کے خلاف دونوں ملک متحد ہوگئے ہیں۔ سویٹ عوام کو یقین ہی کہ یہ سمجھوتہ فاشزم کی تباہی کا پیش خیمہ ہی" اس سمجھوتے کو معاہدے کا درجہ دیتے ہوئے لندن ٹائمز نے لکھا "گذشتہ بیس سال کے تجربے سے یہ ثابت ہوا کہ روس کو شامل کئے بغیر مشرقی اور جنوبی مشرقی یورپ سے پائیدار تعلقات نہیں قائم ہو سکتے۔ برطانیہ کے ذمہ دار لوگ روس سے سمجھوتے کو تحسین کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس کی گہرائیوں کو سمجھتے ہیں۔ کیونکہ اسی سمجھوتے کی بنا پر دنیا میں جنگ و جدال بند ہوگا اور صلح کے مقاصد واضح ہوں گے۔" ڈیلی ہرالڈ کی رائے میں یہ سمجھوتہ نہ صرف انگلستان اور روس میں سوز یقین کی روح پھونک دے گا بلکہ تمام دنیا میں سراہا جائے گا۔ نیوز کرانیکل نے لکھا "ہٹلر کے عمل نے دنیا کی دوسری بہترین فوج کو ہمارا ساتھی بنا دیا۔ اس سمجھوتے نے بے شمار سیاسی گنجائشیں پیدا کر دی ہیں جو آج سے تین ہفتے قبل مفقود تھیں۔"

روس اور انگلستان کی ذہنی مفاہمت روز بروز بڑھ رہی تھی۔ مثال کے طور پر مینچسٹر گارڈین جیسے رجعت پسند اخبار نے ۱۹ اگست ۱۹۴۱ء کو اپنے اڈیٹوریل میں لکھا "جب سے کہ مشترکہ دشمن کے خلاف روس ہمارے ساتھ لڑ رہا ہی اس ملک میں روس کے متعلق بڑی صاف دلی کا مظاہرہ ہو رہا ہی۔ ادارۂ مالیات لندن سے (جو سوٹ نظام اور سوٹ اقتصادیات کا جانی دشمن تھا)، ہمارے پاس ایک نہایت ہی دلچسپ مسودہ آیا ہی جس سے ظاہر ہوتا ہی کہ ہمارے ملک کا ذہن کس قدر روس کا حامی ہی۔ لین دین کی ایک دقیانوسی کمپنی نے اپنے گاہکوں کو ایک خط لکھا ہی جس کا مضمون یہ ہی" ہم میں بہت سے ایسے ہیں جو روسی محاذ پر جرمن فوج کی تباہی پر خوش تو ضرور ہوتے ہیں لیکن سوٹ روس کی فتح بھی نہیں چاہتے۔ یہ رویہ باہمی تعلقات میں بیحد مضر ثابت ہوگا۔ اگر ہم اینگلو روس معاہدے کو کامیاب بنانا چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہی کہ ہم اپنے اس گول گول رویے کو تبدیل کریں اور بالشوزم کے خونخوار رقصوں کے بجائے اس کی ۲۰ سال کی برکتوں پر غور کریں۔ جب تک ہم ایسا نہ کریں گے اور

ایک دوسرے کے شریک حال نہ ہوں گے بھائی چارہ ہونا محال ہو"

محوری طاقتوں پر اس سمجھوتہ کا جو اثر ہوا وہ مسولینی کی تقریر سے ظاہر ہوتا ہو۔ اپنی سیاہ وردی والی فوج کو روسی محاذ پر بھیجتے وقت انھیں مخاطب کرکے اس نے کہا "آخر کار فاشزم اور بالشوزم میں جنگ شروع ہی ہوگئی۔ اس خونخوار جنگ میں حصہ لینا تمھارے لئے باعث عزت ہو۔ بیس سال سے دنیا والے اس سوچ میں تھے کہ وہ ان دو اصولوں میں کس کو اختیار کریں جس جدوجہد کے لئے ہم برسوں سے تیار ہو رہے تھے سر پر آپہنچی۔ اس جنگی ڈرامہ کا پانچواں ایکٹ شروع ہوچکا ہو۔ سیاسی ادل بدل مکمل ہوچکا ہو۔ ایک طرف روم، برلن اور جاپان ہیں اور دوسری طرف لندن، واشنگٹن اور ماسکو"

اس زمانے میں جب جرمن فوجیں سُرخ فوج کو پسپا کرنے میں ناکام ہو رہی تھیں جرمن فوجی مدبّروں نے یہ خیال کیا کہ ترکی کی طرف سے روس پر حملہ کرنے میں انھیں جلد کامیابی ہوگی کیونکہ ایسی صورت میں روس کئی طرف سے گھر جائے گا۔ نیز یہ کہ ترکی اور ایران کی سرحد پر روسی قلعہ بندیاں کافی کمزور تھیں۔ ٹائمز کے نامہ نگار نے اس کا خطرہ محسوس کرتے ہوئے استانبول سے لکھا: "اطالوی ذرائع سے یہ خبر موصول ہوئی ہو کہ فیلڈ مارشل لسٹ روسی محاذ کو چھوڑ کر ایتھنس آرہا ہو۔ اس سے ترکی پر جرمن حملے کا خطرہ بڑھ گیا ہو" ترکی کی یورپی سرحد پر جرمن فوجیں بھی جمع ہونے لگیں۔ اس نازک موقعے پر اسٹالن نے سویٹ یونین اور جمہوری ترکی کے قدیمی دوستانہ تعلقات کا خیال رکھتے ہوئے عصمت انونو کو ایک پیغام بھیجا اور انھیں یقین دلایا کہ روس اسلحات اور فوج کے ذریعہ ترکی کی مدد کے لئے تیار ہو۔ لیکن اس کا موقع نہیں آیا۔ کچھ عرصہ بعد جرمن فوجیں ترکی کی سرحد سے ہٹالی گئیں۔

ستمبر ۳۹ء میں جب روس نے پولینڈ میں بڑھتی ہوئی نازی فوج کو روکنے کے لئے مشرقی پولینڈ پر قبضہ کرلیا تو سرمایہ پرست ملکوں نے اسے ملوکیت پرست کہا تھا اور اسٹالن کو بین الاقوامی سیاست میں ہٹلر کا شریک بتلایا تھا۔ لیکن ایک سال بعد انھوں نے محسوس کیا کہ روس کا یہ عمل نہ صرف فاشزم کے امڈتے سیلاب کو روکنے کے لئے تھا بلکہ خود پولینڈ کی شکست کے بعد انگلستان میں پولی نمائندوں اور رہنماؤں نے ایک آزاد پولی حکومت قائم کرلی تھی جس کے صدر جنرل سکورسکی تھے۔ ۳۰ جولائی ۱۹۴۱ء کو روس نے اس آزاد پولی حکومت سے

سمجھوتہ کرلیا۔ انگلستان بھی اس میں شریک تھا۔ اس سمجھوتے میں پولینڈ کی آزاد حکومت تسلیم کرلی گئی اور پولینڈ بھی اتحادیوں کے گروہ میں شامل ہوگیا۔ آج بہت سے پولی باشندے ہٹلر کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ پولی رجعت پسند رہنما جو اتنے عرصے تک پولینڈ کی تقدیر کے مالک رہے اور جنھوں نے اپنے ملک کو نازیوں کے حوالے کردیا، اس سمجھوتے سے خوش نہ تھے۔ چنانچہ سکورسکی کی "آزاد پولی حکومت" سے بعضوں نے استعفیٰ دے دیا۔ پولی روسی سمجھوتہ کے متعلق جنرل سکورسکی نے کہا" اس سمجھوتے سے پولینڈ اور روس کے تمام مسائل طے نہیں ہوسکے ہیں لیکن ہمیں بڑی خوشی ہے کہ باہمی مفاہمت کی بنیاد قائم ہوگئی ہے" ان مسائل کو آئندہ خوش نیتی سے حل کرنے کے لئے لندن کے روسی سفیر نے کہا" ہمیں ایک ساتھ مل کر اپنے دشمن سے لڑنا چاہیئے، تاکہ فتح کے بعد ہم ایک ایسے نئے یورپ کی بنیاد رکھیں جس میں ہر قوم کو مکمل خود اختیاری حاصل ہو" ماسکو میں رائٹر کے نامہ نگار خصوصی نے اس سمجھوتے پر اظہار رائے کرتے ہوئے لکھا: سویٹ حکومت کی خارجی پالیسی ہمیشہ دلیرانہ رہی ہے۔ پولینڈ سے سمجھوتہ اس کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔ برسوں سے اسٹالن کی خواہش تھی کہ فاشزم کے خلاف عوام کا ایک متحدہ محاذ قائم کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ سویٹ حکومت مجلس اقوام میں بار بار اس کا مطالبہ پیش کرتی رہی۔ ہٹلر کے چنگل میں دبی ہوئی یورپی ریاستوں کے ساتھ روس کا سمجھوتہ اور بھائی چارہ کا اظہار اس کا ثبوت ہے کہ وہ جنگ کے بعد نئے یورپ میں تمام ملکوں کے مابین خوش گوار تعلقات قائم کرنا چاہتا ہے"

(باقی مضمون دسمبر کی اشاعت میں درج ہوگا)

علی امام ایم، اے

چین کا فلسفۂ زندگی

لن یوٹنگ موجودہ چین کا ایک نامور مصنف ہے۔ اس نے پرانے چین کے فلسفۂ حیات کی تشریح و تفسیر کے سلسلے میں نہایت گراں قدر خدمات دی ہیں۔ "زندگی بسر کرنے کی اہمیت" اسی موضوع سے متعلق ایک اہم تصنیف ہے۔ یہ ایک مبسوط کتاب ہے۔ اس میں چین کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔

لن یوٹنگ نے عیسائی ماں باپ کی آغوش میں پرورش پائی تھی۔ اس کا سارا ماحول عیسائیت کا ماحول تھا۔ مگر اس کے افکار و خیالات عمر کی پختگی کے ساتھ ساتھ اپنے موروثی مذہب سے ہٹتے چلے گئے۔ اس نے مذکورہ بالا کتاب میں ایک مخصوص باب "میں کیوں ایک کافر ہوں" لکھ کر ان وجوہ کو اجمالی طور سے بیان کیا ہے جو اس کی عیسائیت سے اس کے انحراف کا سبب ہوئے ہیں۔ اس انحراف کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ پرانے چینی حکما کنفیوشش وغیرہ کے افکار و آراء کے خرمنوں سے خوشہ چینی کرنے لگا۔ اس کا اثر یہ ہونا ہی چاہیئے تھا کہ وہ پرانے چینی تمدن پرانے چینی طرزِ معاشرت کی طرف جھک جائے۔ موجودہ مغربی و امریکی تہذیب و معاشرت کے بعض خراب پہلوؤں نے اس کے اس رجحان کو اور تقویت پہنچائی۔ اب وہ پرانے چین کی ہر ادا کا دلدادہ ہے اور مغربی و امریکی تہذیب و ثقافت سے متنفر بعینہٖ اسی طرح جس طرح ہمارے بہت سے ہندوستانی مفکر قدیم تہذیب کی حمایت کے جوش میں ہر نئے رجحان سے بیزار ہیں۔

پرانے چینی فلسفہ و طرز معاشرت کے ساتھ اس کی گرویدگی کتنی ہی انتہا پسندانہ ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ اس نے ان مباحث کے ضمن میں مغربی تہذیب کے بعض اہم رجحانات کے بد تو اس سے پن کے بارے میں جو خیالات ظاہر کئے ہیں وہ توجہ سے پڑھے جانے کے قابل ہیں۔ عائلی نظام کے اہم پہلوؤں سے بھی اس نے بسط کے ساتھ بحث کی ہے۔ عائلی نظام سے تعلق رکھنے والے ابواب میں اس نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان میں کافی نکتہ سنجانہ دقت نظر پائی جاتی ہے۔ اس بارے میں چینی رجحانات بہت کچھ دوسرے مشرقی ممالک کے رجحانات سے ملتے جلتے ہیں۔

لن یوٹنگ کے نظریات کا بہاؤ عام طور سے کسی طرف بھی ہو وہ ایک اچھا خاصا مفکر ضرور ہے۔ اس کے انداز

بحث و غور میں دلچسپ تازگی پائی جاتی ہے جس سے اس کے خیالات سے خواہ کتنا ہی اختلاف ہو لیکن اس کی نظر کی وسعت اور اس کے طرز بیان کی متانت کا اعتراف کرنا ناگزیر ہے۔

ہندوستان موجودہ دور میں چین کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہا ہے اس لئے اس مشرقی خطے کے عام انداز نظر اور معاشرتی میلانات سے واقفیت اچھی ہی بات ہے۔ لن یوٹنگ کی تصنیفات اس خصوص میں ہمارے لئے رہنما بن سکتی ہیں۔

لن یوٹنگ نے کتاب مذکور کے صدر کے آغاز میں لکھا ہے "میں اس کتاب کے ذریعے سے چین کا نقطۂ نظر پیش کر رہا ہوں۔ مجھے زندگی کے اُسی نقطۂ نظر کے پیش کرنے سے دلچسپی ہے جو چین کے بہترین اور دانشمند ترین دماغوں کے نتائج افکار میں ملتا ہے میں اس سے باخبر ہوں کہ یہ ایک سست عمل کا فلسفہ ہے جو سست عملی کی زندگی سے پیدا ہوا ہے اور جواب سے ایک مختلف دور میں وجود پذیر ہوا ہے میں اپنے کو اس کے محسوس کرنے پر مجبور پاتا ہوں کہ یہ نقطۂ نظر قطعاً صحیح ہے" اس خیال کو مختلف طریقوں سے واضح کرنے کے بعد لن یوٹنگ نے اس کا دعویٰ کیا ہے کہ "اس کتاب میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ چینی قوم کے فلسفہ کی ترجمانی ہے۔ اسے چین کے کسی مخصوص دبستان فلسفہ کی وکالت سے تعلق نہیں ہے۔ یہ فلسفہ کنفوشش اور لیوتاس وغیرہ کے فلسفوں سے بھی زیادہ بڑا ہے۔ کیونکہ ان کے خیالات سے فائدہ اٹھا کر ایک صحیح مرکب تیار کیا گیا ہے چینیوں کے ادب، فن اور فلسفہ کی بحیثیت مجموعی پیمائش کرنے کے بعد مجھ پر یہ اچھی طرح واضح ہو گیا ہے کہ اُن کے تمام پیام اور تعلیم کی روح اس فلسفہ کے اندر ہے کہ دھوکوں اور فریبوں سے عام طور پر نجات حاصل کرلی جاتے اور زندگی کا لطف نہایت اچھے طریقے سے اٹھایا جائے"

اس تمہید کے بعد لن یوٹنگ نے اصل مباحث شروع کئے ہیں جن کا پھیلاؤ مختلف النوعیت چیزوں کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہے مگر ان سب باتوں کا لب لباب یہی ہے کہ زندگی اچھے طریقے سے کیونکر بسر کی جا سکتی ہے۔

لن یوٹنگ کے پاس اس کا جواب ہر جگہ یہی ہے کہ چین کے فلسفہ معاشرت پر عمل پیرا ہو کر ان کے زندگی کے مسلک پر چل کر اس کے لئے ہیں مختصر چینی مصنف نے (Lone in c) اپنی مخصوص نگار ... [illegible]

اُس طرف مارے مارے پھرنے کی بھی وکالت کی ہے جو اس کی نظر میں چینیوں کی سیرت کی خاص خصوصیت ہے آوارہ گردی کی اہمیت ثابت کرنے کے لئے اس نے کئی باب لکھے ہیں۔ ایک جگہ وہ اس سلسلے میں کہتا ہے۔

"انسان کے بارے میں سب سے زیادہ پریشان کن چیز اس کا وہ تصور ہے جسے کام اور کام کی مقدار سے تعلق ہے اس تصور کو انسان نے یا تو خود اپنے اوپر عائد کر لیا ہے یا پھر تہذیب و ثقافت نے اس پر عائد کر دیا ہے تمام فطرت آوارہ گرد ہے صرف انسان اپنی معاش کے لئے کام کرتا ہے۔ چونکہ ثقافت و تہذیب کے ارتقا کے ساتھ زندگی پیچیدہ ہوتی چلی گئی ہے۔ بہت سی ذمہ داریاں ۔ فرائض خوف ولولے اور رکاوٹیں اس کے ساتھ پیدا ہوگئی ہیں۔ (فطرت کی طرف سے نہیں بلکہ انسانی سماج کی طرف سے) اس لئے وہ کام کرنے پر مجبور ہے میں اپنی میز کے سامنے بیٹھا ہوا کام کر رہا ہوں اور ایک کبوتر کھڑکی کے سامنے کلیسا کے ایک مینار کے اردگرد اڑ رہا ہے۔ اُسے اس کی کوئی فکر ہی نہیں کہ وہ کیا کھائے گا اور کیا نہیں، مگر میں جانتا ہوں کہ میرا کھانا کبوتر کے کھانے سے زیادہ پیچیدہ ہے۔ میرے چند لقموں کے لئے ہزاروں آدمیوں کو کام کرنا پڑتا ہے جن چیزوں سے غذا تیار ہوتی ہے ان کی کاشت کی جائے۔ ان کی تجارت کی جائے۔ پھر ان سے کھانا تیار کیا جائے۔ ان تمام منزلوں سے گذرنے کے بعد کہیں غذا ملتی ہے۔ انھیں باتوں کی وجہ سے انسان کی غذا کی تیاری میں جانوروں کی غذا کی بہ نسبت زیادہ دقتیں اور زیادہ دشواریاں ہیں۔ اگر کوئی جنگل کا درندہ شہر میں آجائے اور وہ یہ سمجھ سکے کہ انسان کی غذا کی تیاری میں کتنی دشواریاں اور دقتیں ہیں تو وہ اس انسانی زندگی سے اس انسانی سماج سے گھبرا جائے۔

کتے بلیاں اپنی غذا کی فراہمی میں یہ دشواریاں محسوس نہیں کرتے مگر غریب انسان اس تہذیب و ثقافت اس پیچیدہ سوسائٹی کی وجہ سے اپنا پیٹ بھرنے کی خاطر ان دشواریوں کا مقابلہ کرنے کے لئے مجبور ہے۔ میں یہ جانتا ہوں کہ انسانی زندگی اپنے فائدے بھی رکھتی ہے۔ علم کی راحتیں۔ بات چیت کی مسرتیں اور تخیل کی لذتیں مگر ان تمام خوشیوں کے باوجود یہ مستقل بات اپنی جگہ پر رہتی ہے کہ انسانی زندگی بہت زیادہ پیچیدہ ہوگئی ہے۔ حد یہ ہے نوے فی صدی انسانی جدوجہد بواسطہ یا بلاواسطہ غذا کی فراہمی میں صرف ہوتی ہے تہذیب زیادہ تر غذا کی فراہمی سے عبارت اور ترقی کا مطلب ان راستوں کی طرف بڑھتا ہے جن سے غذا کا مسئلہ دشوار سے دشوار تر ہوتا جا رہا ہے۔ اگر غذا کی فراہمی اس قدر دشوار طلب نہ ہوگئی ہوتی تو پھر اس کی قطعاً

کوئی وجہ نہ ہوگی کہ انسان اس قدر زیادہ محنت سے کام کرے۔ اصل خطرہ یہ ہی کہ ہم تہذیب میں حدود سے آگے بڑھ گئے ہیں اور اب نقطہ پر پہنچنے والے ہیں بلکہ حقیقت میں پہنچ گئے ہیں۔ جہاں غذا کی بہم رسانی کا کام اتنا سخت ہو جائے گا کہ اس کی تلاش میں اشتہا بھوک کی خواہش ہی سرے سے ختم ہو جائے گی۔ یہ صورتِ حال نہ تو جنگلی درندے ہی کے نقطۂ نظر سے پسند کی جاسکتی ہی اور نہ ایک فلسفی کے نقطۂ نظر سے۔"

آگے بڑھ کر لن یوٹنگ نے تہذیب کی بہت سی خرابیاں دکھائی ہیں اور اُسے اُن تمام بیماریوں کا ذمہ دار قرار دیا ہی جو انسانوں کی زندگی کو تباہ کرتی چلی جارہی ہی۔ اس ضمن میں اس نے امریکہ کی بہت زیادہ مصروف زندگی۔ ان کی بہت زیادہ وقت کی پابندی کی بھی نکتہ چینی کی ہی۔ اس کا بہت زیادہ مذاق اڑایا ہی کہ ان کے یہاں مہینوں پہلے کام کے ملاقات کے پروگرام تیار کرلئے جاتے ہیں۔ لن یوٹنگ ان چیزوں کو جن میں مشین کی نوعیت پیدا ہوگئی ہی زندگی کی اصل شائستگی نہیں قرار دیتا۔ اس کی نگاہ میں شائستہ زندگی آوارہ گردی کی زندگی ہی۔ وہ صاف صاف کہتا ہی۔

"شائستگی و تہذیب کا فن درحقیقت آوارہ گردی کا فن ہی۔ چینی نقطۂ نظر سے وہ شخص جو دانشمندانہ طور سے کاہل و سست عمل ہی سب میں زیادہ شائستہ انسان ہی۔ مصروف رہنے اور عقلمند ہونے میں فلسفیانہ تضاد پایا جاتا ہی۔ جو عقل مند ہیں وہ کام میں مصروف نہیں رہیں گے اور جو مصروف رہتے ہیں وہ عقل مند نہیں ہو سکتے اس لئے عقلمند شخص وہ ہی جو نہایت سنجیدگی و متانت سے بےپات طریقہ پر اس طرف اُس طرف گھومتا ہی۔"

لن یوٹنگ سگریٹ نوشی کا بھی مداح ہی۔ وہ اس کی حمایت اخلاقی بنیاد پر کرتا ہی۔ دوستوں کے ساتھ خوش گپی کو بھی اس نے بہت زیادہ سراہا ہی۔ کھانے کی چیزوں کی تیاری کی طرف متوجہ رہنے پر اس نے بہت زیادہ زور دیا ہی۔ وہ کہتا ہی "ہماری زندگیاں دیوتاؤں کی آغوش میں نہیں ہیں بلکہ باورچیوں کی آغوش میں ہیں۔ اسی وجہ سے ہر چینی شریف آدمی اپنے باورچی کو خاص طور سے اپنا دوست بنائے رکھتا ہی۔ کیونکہ زندگی کی مسرتیں بہت کچھ اسی کے قبضے میں ہیں۔ اگر وہ چاہی تو انھیں بڑھا سکتا ہی اور چاہی تو گھٹا سکتا ہی۔" غذا کی طرف ملتفت رہنے پر زور دیتے ہوئے لن یوٹنگ آگے بڑھ کر لکھتا ہی "وہ عورت جو غذا کی تیاری میں کافی وقت نہیں صرف کرسکتی وہ اچھی عورت نہیں ہی خواہ وہ پبلک کی بہتری کے دوسرے کتنے ہی کام کرتی ہو ایسی عورت کو

کنفوشش بلا شبہ طلاق دے دیتا جس طرح اس نے اپنی عورت کو اچھا کھانا نہ پکانے کی وجہ سے طلاق دے دی تھی"

لن یوٹنگ منطق کا شدید مخالف ہے۔ وہ ایک انسان کے لیے منطقی ہونا اس کی کمزوری سمجھتا ہے۔ وہ کسی کام کو مکمل طریقہ سے انجام دینا بھی کچھ زیادہ پسند نہیں کرتا۔ کسی مخصوص فن میں مہارت حاصل کرنا (SPECIALIZATION) بھی اس کے نزدیک کوئی قابل مدح وصف نہیں ہے۔

بعض جگہ تو اس کے خیالات پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ پرانی چینی زندگی پر طنز (SATIRE) کے ہلکے ہلکے وار کر رہا ہو مگر اس کے لہجہ کی متانت اس کے بیان کی سنجیدگی اس خیال کی تکذیب کرتی ہے۔

وہ دراصل ان سب چیزوں کو جو اس کی نظر میں چینی سیرت کی ممتاز خصوصیتیں ہیں پسند کرتا ہے اس کی نظر میں انھیں چیزوں کی وکالت سے اس مصروف زندگی کا ردعمل ہو سکے گا جس کی وبا پھیلتی جا رہی ہے۔ اُسے اس مصروف زندگی میں مشین کی کیفیت نظر آتی ہے اور اسے وہ نفرت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس مشین کی زندگی کا اسے جہاں ذرا سا بھی شائبہ نظر آتا ہے وہ اس کی مذمت کرتا ہے اسے انسان کی بہت زیادہ معقول پسندی بہت زیادہ منطقی ہونے میں یہی نقص نظر آتا ہے۔

ایسی زندگی جو خرابیوں سے پاک ہو جس کا ہر گام سوچ سمجھ کر اٹھے اس کے خیال میں اس لئے بے لطف ہے کہ وہ مشین کی شان رکھتی ہے۔ وہ ایسے مورخین کو جنھیں تاریخی واقعات رٹے ہوئے ہیں جو ہر تاریخی ہستی کے اہم واقعات کو سنہ وار بیان کر سکتے ہیں مگر ان سے سبق حاصل نہیں کر سکتے بیکار سمجھتا ہے۔ ان کی زندگی بھی مشین کی زندگی ہے۔ وہ انسانی دماغ کا کام منطقی بحثیں کرنا نہیں قرار دیتا۔ مختصر یہ کہ لن یوٹنگ کی کتاب اس قسم کے دلچسپ خیالات سے بھری ہوئی ہے۔

ان میں سے چند ہی باتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور وہ نہایت ہی مختصر طریقہ سے۔ لن یوٹنگ کے ان خیالات وافکار کی اہمیت کے اندازے کے لئے ان کو اس بیان کے فریم میں دیکھنے کی ضرورت ہے جن میں مصنف نے ان کو جڑ دیا ہے۔

اس کے ان خیالات کی اہمیت کے اعتراف کے بعد بھی یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ ان خیالات سے

چینیوں کی وہ موجودہ نسل کہاں تک متاثر ہوئی جو برسوں سے جاپان کی مستبد حکومت سے لڑ رہی ہے۔ اگر چین کی بڑی تعداد کالن یونگ کے بیان کئے ہوئے فلسفۂ معاشرت پر عمل ہوتا تو مشکل تھا کہ چین جاپان سی پر شوکت طاقت ور سلطنت کے اقلیم کشایانہ حوصلوں کو اس کامیابی کے ساتھ پست و زبوں کر دیتا۔

سیّد اختر علی تلہری

"غریبی"

یہ فضا یہ رنگ و بو، رعنائی باغِ جہاں — شام کے خنداں مناظر، صبح کے ساحر سماں
یہ شفق کی سرخیاں اور شبنم گوہر فشاں — چاند اور تاروں کا رقصاں عکس بر آبِ رواں

ایک مفلس کے لئے کچھ ہوں مگر رحمت نہیں
حیف ہے آغوشِ فطرت میں کوئی راحت نہیں

یہ نسیم روح پرور یہ شمیم جاں فزا — مسکرا دینا کلی کا جھوم جانا پھول کا
عارضِ گلہائے تر پر بوسۂ بادِ صبا — طائرانِ خوش نوا کے نغمہ ہائے دل رُبا

نعمتیں تو ہیں مگر اے خالقِ عرشِ بریں
ایک مفلس کے لئے کچھ بھی نہیں کچھ بھی نہیں

حُسن کی عشوہ گری رعنائی ناز آفریں — وہ خمار آلود آنکھیں کیفیت جن کی رہیں
مہوشانِ مرمریں اندام و زلفِ عنبریں — رہزنِ ہوش و خرد اور دشمنِ دنیا و دیں

دل کش و دلچسپ و دلبر دل ستاں ہیں تو مگر
کچھ نہیں احسان ان کا مفلسوں کی آنکھ پر

بے نیازی و لطافت عشق کی سرگرمیاں — رتبۂ عالی و عزت کی عجوبہ کاریاں !!
محفلِ تہذیبِ حاضر کی سلیقہ دانیاں — نشۂ عز و شرف کی بیخودی، خود داریاں

یہ سبھی پائے امارت چاٹتی ہیں ہم نشیں!
مفلسوں کے واسطے ان میں سے کوئی بھی نہیں

برکتیں تہذیبِ نو کی، اکتسابِ علم و فن — فلسفہ، عقل و سیاست، حکمت و حبِّ وطن
خدمتِ علم و ادب اور کاوشِ فکرِ سخن — نغمۂ لاہوت جس سے ہیں ہوا سنج و محن

چشم بینا کے لئے نعمت ہیں یہ سب بالیقین
تشنگی افلاس کی لیکن بجھا سکتے نہیں

ہو اجازت تو میں پوچھوں تجھ سے اے میری خدا　　کیا غریبوں کے لئے ہی یہ جہاں بے مدعا؟
کیوں نہیں رحمت کو تیری جوش آتا ہے ذرا　　ذہنیت تیری بھی کچھ سرمایہ دارانہ ہے کیا؟

تیرا یہ مطلب ہے رشتہ زندگی کا توڑ دیں ؟
کیا غریب انساں تری دنیا میں رہنا چھوڑ دیں؟

خلیل صدیقی (بی۔اے)

جذباتِ اثر

جب تک کہ فدا اس پہ دل وجاں نہ کریں ہم　　کس منہ سے دم اس کی محبت کا بھریں ہم
مستانِ مئے عشق ہیں آزاد فنا سے　　ممکن نہیں اے موت! کہ اب تجھ سے ڈریں ہم
رہتی ہے شب و روز یہی ایک کشاکش!　　اظہار محبت کا کریں یا نہ کریں ہم
تو شاد ہمیشہ رہے اے حسنِ خود آرا!　　پروا نہیں کچھ اس کی جئیں یا کہ مریں ہم

مجبور وفا دل ہے، وہ مجبور جفا ہیں !
الزام دھریں بھی تو اثرؔ کس پہ دھریں ہم

اثر صہبائی

"ترے بغیر"

جلد آ کہ رُوحِ عشق ہی بسمل ترے بغیر　　حد سے سوا ہی تشنگیِ دل ترے بغیر

اترا ہوا ہی چاند کا چہرہ ترے بغیر　　اجڑی ہوئی ہی نور کی محفل ترے بغیر

اکھڑی ہوئی ہی سانس نسیم بہار کی　　ڈوبی ہوئی ہی نبضِ عنادل ترے بغیر

رنگ اڑ گیا ہی روئے حیات و ممات کا　　دنیا کی کوئی شے نہیں کامل ترے بغیر

اک عمر سے رُکا ہوا ہی کاروبارِ شوق!　　سونی پڑی ہی درد کی محفل ترے بغیر

موجوں کے رحم پر ہی سفینہ حیات کا　　طوفاں کا حظ، نہ لذّتِ ساحل ترے بغیر

ٹھہرا ہوا ہی اپنی جگہ کاروانِ شوق!　　ذوقِ جرس نہ حسرتِ منزل ترے بغیر

بے رُوح جوشِ وحشت درقصِ جنونِ شوق　　بے کیف نغمہ ہائے سلاسل ترے بغیر

اے لیلیٔ زمانہ و سلمائے روزگار　　سونی پڑی ہی شوق کی محمل ترے بغیر

اے صبحِ نو دمیدہ و اے نو بہارِ ناز　　بے آب و رنگ ہی چمنِ دل ترے بغیر

اے جانِ ہر مسرت و اے رازِ ہر الم　　طے کس طرح سی ہوں یہ مراحل ترے بغیر

اے شبنمِ تسلّی و اے بارشِ کرم　　ٹوٹے رہی ہیں آبلۂ دل ترے بغیر

ہیں یاد چشمِ مست کی بادہ فروشیاں　　اشکوں میں کیوں لہو نہ ہو شامل ترے بغیر

دریائے اضطراب دو عالم ڈبو نہ دے　　شق ہو نہ جائے سینۂ ساحل ترے بغیر

کیا وقت آ پڑا ہی کہ عقدہ حیات کا　　آساں ترے بغیر، نہ مشکل ترے بغیر

آ جلد آ کہ مرگ و حیاتِ سروش کا
تیرے شہود، کچھ نہیں حاصل ترے بغیر

سروش عسکری جیلانی بی اے

نئی کتابیں

انشا:- انشاء اللہ خاں کی شاعری پر مرزا فرحت اللہ بیگ نے نہایت دلچسپ انداز میں "تنقید لکھی ہے "انشا، آسمان [illegible] کا ایک ایسا ستارہ تھے جو ایک افق سے نمودار ہوا اور اپنی روشنی سے سب کی نگاہوں کو خیرہ کر کے دوسرے افق میں غائب ہو گیا" اس کی تفصیل دیکھنی ہو تو اس کتاب کا مطالعہ فرمائیے۔ قیمت صرف بارہ آنے (۱۲/)

نورتن یا ایک ایکٹ کے ڈرامے:- علی عباس حسینی صاحب کے نام سے کون واقف نہیں۔ اب تک ان کے افسانوں کے مجموعے شائع ہوتے ہیں مگر یہ ان کے نو ڈراموں کا مجموعہ ہے اور یہ ڈرامے صحیح معنی میں ان کے نورتن ہیں۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (عـ۸/)

ستالن یا ستالن کی شخصیت کا آج کس کو اعتراف نہیں! اسے موجودہ دور کا "بڑا آدمی" کا خطاب دیا گیا ہے۔ اس کے مفصل حالات اور کارنامے معلوم کرنے ہوں تو اس کتاب کا مطالعہ فرمائیے جسے ملک کے مشہور لیڈر آصف علی صاحب نے اسٹیفن گرہم کی کتاب اسٹالن سے ترجمہ کیا ہے۔ فاضل مترجم کا ایک مبسوط مقدمہ بھی شامل ہے۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے (سے/)

مذہب و تمدن:- یہ مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی کا ایک بصیرت افروز مقالہ ہے جو جامعہ کی مجلس دینیات کی دعوت پر جامعہ میں پڑھا گیا تھا۔ اس میں مذہب اور تمدن کے مسائل پر نہایت عالمانہ بحث کی گئی ہے۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے (عـ۴/)

جدید ایڈیشن

شعلۂ طور۔ قیمت قسم اول [illegible] قسم دوم [illegible] | میدانِ عمل۔ قیمت [illegible]

مناظرِ قدرت (اول) قیمت [illegible]

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ بمبئی نمبر ۳

جامعہ

زیرِ ادارت:۔ نور الحسن ہاشمی ایم، اے

جلد ۲۹ نمبر ۵	بابتہ ماہ نومبر ۱۹۴۳ء	سالانہ چندہ ۵ر فی پرچہ (۸)

فہرستِ مضامین

نئی کتابیں

مکتبے نے ابھی حال میں، بچوں اور بڑوں کی بہت سی نئی کتابیں شائع کی ہیں۔ اُن کی تفصیل سرِ ورق کے اندرونی صفحات پر درج ہی، اگر آپ نے ملاحظہ نہ فرمایا ہو، تو ایک نگاہ ڈال لیجئے، ممکن ہی آپ انھیں پسند فرمائیں۔
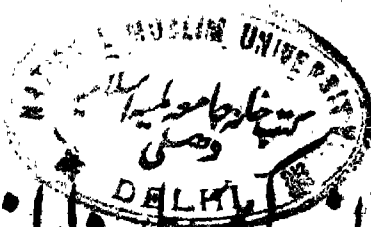
برطانیہ کی سرمایہ دارانہ منصوبہ بندی

جنگ سے پہلے

(ایوانِ اُردو لاہور کے اجلاس میں پڑھا گیا)

برطانیہ ایک اہم صنعتی ملک ہے۔ ۱۹۱۴ء تک یہاں کی حکومت "آزاد تجارت" کے اصولوں پر کاربند تھی اور تجارتی معاملات میں مداخلت نہ کیا کرتی تھی۔ ۱۹۱۸ء تک یہ نظام بہت حد تک باقی رہا۔ ۱۹۱۴ء تک تو بدیشی تجارت سرکاری اقتدار سے بالکل آزاد تھی۔ درآمد اور برآمد کرنے والے صرف کچھ محصول ادا کیا کرتے، اور جن اشیاء کی خرید و فروخت وہ چاہتے اپنی مرضی کے مطابق کرتے۔ تجارت کی طرح سرمایہ داری بھی آزاد تھی۔ برطانیہ کے دولت مند لوگ ہر سال بہت معقول رقم سلطنتِ برطانیہ کے دوسرے حصوں اور غیر ملکوں میں صنعت و حرفت پر لگا دیتے۔ مالیاتی اعتبار سے برطانیہ طلائی معیار کا پابند تھا۔ اسی معیار کی روشنی میں دوسرے اہم ملکوں کے سکوں اور برطانوی سکوں میں نسبت قائم کی جاتی۔ بنک آف انگلینڈ قرضہ دینے کے سلسلہ میں غیر ملکی مبادلہ کی پیروی کرتا۔ اس بارے میں واضح و متعین اصول موجود تھے اور بنک کے قرضہ کا یہ دستور تقریباً خود بخود چلتا رہا۔

غیر ملکی تجارت کی طرح ملکی پیداوار بھی آزاد تھی۔ البتہ چند قانونی پابندیاں موجود تھیں۔ ملازمت کی شرائط جو کارخانوں اور کانوں کے متعلق بنائی گئیں، قوانین کی روشنی میں طے پاتی تھیں۔ اور بعض نیم بیگاری صنعتوں کے لئے کم از کم اجرتیں بھی سرکار نے مقرر کر رکھی تھیں۔ مگر ان معمولی سی پابندیوں کے سوا صنعت اور زراعت بالکل آزاد تھیں۔ کاروباری جتھوں اور اجارہ داریوں کے لئے قانون بنانے کی کبھی کوشش تک نہ کی گئی تھی۔ امریکہ کے برعکس برطانیہ میں "اتحادِ تجارت" کے خلاف کوئی قانون موجود نہ تھا۔ یہ سچ ہے کہ [illegible] سے ۱۹۱۴ء تک اعتدال پسند وزارتوں کے دور میں سماجی بہبود کی طرف کچھ قدم بڑھائے گئے۔ اور مزدوروں

محصول لگاکر غریبوں کی آمدنی بڑھانے کے لئے بہت معمولی حد تک کوشش بھی کی گئی۔ مگر یہ کوشش آگے نہ بڑھ سکی۔ یہ کہنا غالبًا بجا ہوگا کہ برطانیہ ۱۹۱۴ء تک بے نظم معاشیات کا نمونًا ایک مکمل نمونہ تھی اور یہاں کا معاشی نظام کلاسکی اقتصادیوں کے محبوب "قوانین قدرت" کے عین مطابق تھا۔

لیکن یہ آزادی پچھلی جنگ عظیم کا وار نہ سنبھال سکی۔ جنگ کے زمانے میں پیداوار کو جنگی ضروریات کو پورا کرنا تھا۔ حکومت بہت سے پیدا کاروں کی ضرورت مند تھی۔ اور مزدوروں کی بھی حاجت مند تھی۔ چنانچہ زراعت اور صنعت پر اس کا قبضہ ناگزیر تھا۔ سامان جنگ، خوراک، زراعت، اور قومی خدمت کے وزیروں کا مطلوبہ پیداوار پر بہت زیادہ قبضہ لازمی تھا۔ وہ جب چاہتے سامان اور مزدوران کارخانوں میں بھیجنے سے انکار کردیتے جہاں نجی گاہکوں کے لئے چیزیں تیار ہوتی تھیں۔ جوں جوں جنگ بڑھتی جاتی وہ دوسرے محکموں کے ساتھ مل کر بیش از بیش فرمائشیں کرتے جن کی تعمیل پیدا کاروں کے لئے لازمی تھی۔

جہاں کہیں ہوسکا جنگی زمانہ کی وزارتوں نے شخصی تجارت کی روایات پر عمل کرتے ہوئے اپنے نئے اختیارات کا استعمال مختلف کاروباری لوگوں کے ذریعے کیا۔ مجالس عاملہ اور مجالس شوریٰ بہت بڑی تعداد میں بنائی گئیں۔ یہ زیادہ تر کاروباری لوگوں پر مشتمل ہوتی تھیں اور ان کا کام صنعت و زراعت کو جنگی ضروریات کی تکمیل کے لئے تیار کرنا تھا۔ ریاست نے کاروباری جتھوں کی حوصلہ افزائی کی تاکہ لین دین میں آسانیاں پیدا ہوجائیں۔ ہر صنعت کے نمائندے سرمایہ داروں کے ساتھ معاہدے کئے گئے، اور جہانتک ہوسکا انھیں قومی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے کی بے روک آزادی دے دی گئی۔ چنانچہ خاص جنگی محصول ادا کرنے کے بعد بھی ان صنعتی سرمایہ داروں نے گراں بہا منافعے حاصل کئے۔

جنگی حالات میں بدیشی تجارت کی آزادی کا خاتمہ ضروری تھا۔ پیدا کار اب بدیشی منڈیوں کے لئے صرف ان وسائل و ذرائع کو استعمال کرسکتے تھے جن کی خود ریاست کو ضرورت نہ تھی۔ جہازوں سے زیادہ تر جنگی مقاصد کے لئے باربرداری ہوسکتی تھی، اور آبدوزوں کی جنگ نے نجی باربرداری کے لئے گنجائش اور بھی گھٹادی۔ چنانچہ درآمد برآمد دونوں ہی ریاستی کنٹرول کے ماتحت آگئیں۔ رفاہ عامہ کی

بدیشی تجارت بڑی تیزی کے ساتھ کم ہوگئی جن ملکوں کی مشینی اشیاء برطانیہ بھیجتا تھا انھیں اب یا تو دوسرے ملکوں کی طرف توجہ کرنی پڑی یا خود اپنی صنعتوں کو ترقی دینی پڑی۔ یہ امر واضح تھا کہ جنگ کے بعد برطانیہ کو عالم گیر تجارت میں پہلی سی حیثیت خود بخود حاصل نہ ہوسکے گی۔

علاوہ ازیں سرمایہ کی برآمد یک لخت رُک گئی۔ تمام بچت بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ جنگ کی مالی ضرورتوں پر صرف ہوگئی اب برطانیہ دنیا کی سب سے بڑی قرض خواہ نہ رہی تھی بلکہ اب یہ قرضدار ہو رہی تھی۔ اس نے زیادہ تر امریکہ سے ادھار لیا۔ وہاں سے جنگی درآمد کا ایک سیلاب برطانیہ میں امنڈ پڑا۔ اور برطانیہ کی برآمد اس کے سامنے کچھ حقیقت نہ رکھتی تھی۔ جنگ سے پہلے سمندر پار تجارتوں میں جو سرمایہ لگایا گیا تھا وہ اب امریکہ کے پاس بیچنا پڑا، تاکہ سامانِ جنگ و خوراک کی قیمت ادا کی جاسکے۔

طلائی معیار اس عرصہ کے لئے ختم ہوگیا۔ پاؤنڈ کا سونے سے کوئی تعلق نہ رہا۔ پرانے خود چالو" (Automatic) نظام کی جگہ سکہ کا ایک مصنوعی نظام" (Managed Currency) بنانا پڑا۔

جنگی دباؤ کے زیر اثر سب سے پہلے آزاد تجارت کے بعض اصولوں کو ترک کیا گیا۔ سودیشی مصنوعات کی ترقی کے لئے کچھ بدیشی ملکوں پر حفاظتی محصول لگائے گئے۔ مگر اختتامِ جنگ تک حفاظتی محصول کچھ اہمیت حاصل نہ کرسکے کیونکہ درآمد و برآمد کا انحصار جہازوں کی گنجائش باربرداری پر تھا۔

ان طریقوں سے ۱۹۱۸ء تک برطانیہ کا اقتصادی نظام ایک "منصوبی معیشت" بن چکا تھا۔ مزدور فوج میں بھرتی ہوچکے تھے، ان کی بہت تھوڑی تعداد مزدوری کرنے کے لئے باقی رہ گئی تھی، اور اس منصوبی معیشت کا مقصد اس محدود تعداد سے کثیر ترین پیداوار حاصل کرنا تھا۔

امن کے آتے ہی یہ منصوبہ بندی ختم ہوگئی: اس کا انحصار تین امور پر تھا ——— پیداوار کی سب سے بڑی خریدار خود حکومت تھی، جنگی ضروریات کی بنا پر مزدوروں اور سامان میں کمی ہوگئی تھی، اور جہازوں کی باربرداری کی حد بندی کردی گئی تھی۔ جنگ کے ختم ہوتے ہی جنگی سامان کے لئے حکومت کی فرمائشیں یک لخت ختم ہوگئیں، مزدور میدانِ جنگ سے لوٹ آئے اور اب ان کی تعداد ملک میں بڑی تیزی کے ساتھ بڑھ گئی۔ جہازوں کی گنجائشِ باربرداری میں بھی اضافہ ہوگیا اور جرمنی کے تجارتی جہازوں کو

قبضہ کے بعد تو یہ گنجائش اور بھی بڑھ گئی، جنگ نے دنیا کی تجارت کو تباہ کرکے رکھ دیا تھا اب وہ دھیرے دھیرے بحال ہو رہی تھی، لیکن اس سست روی کے مقابلہ میں جہازوں کی گنجائشِ بار برداری میں حیرت انگیز طور پر اضافہ ہو رہا تھا۔

ان بدلے ہوئے حالات میں کاروبار بڑی تیزی سے معمول پر آگیا۔ جنگ کے زمانے میں صنعت و زراعت پر جو پابندیاں سرکار نے لگائی تھیں وہ ہر ممکن تعجیل کے ساتھ اٹھا دی گئیں۔ سوداگر طبقہ اب آزاد تھا اور بعد از جنگ کی بدلی ہوئی اقتصادی مانگوں کو جس طرح چاہتا پورا کرتا۔ ہر کہیں جنگ سے پہلے کے حالات کی طرف لوٹنے کی کوشش کی گئی۔ اس کلیہ کی صرف ایک ہی نمایاں استثنیٰ تھی جو دانستہ طور پر برقرار رکھی گئی تھی ——— دورانِ جنگ میں بعض سودیشی مصنوعات کے "تحفظ" کے لئے جو حفاظتی محصول لگائے گئے تھے انھیں قائم رہنے دیا گیا۔

لیکن "معمول" پر پوری طرح آنے کے لئے کافی وقت کی ضرورت تھی۔ ریاست کو اپنی مرضی کے خلاف بعض تسلط (CONTROL) قائم رکھنے پڑے۔ کوئلہ پر سرکاری تسلط ۱۹۲۱ء میں ختم ہوا، اور اس خاتمہ سے نہایت تلخ اقتصادی کش مکش پیدا ہوگئی۔ طلائی معیار ۱۹۲۵ء تک بحال نہ کیا جا سکا۔

تاہم برطانیہ آزاد تجارت کے پرانے اصولوں پر بتدریج لوٹ آیا۔ بہت تھوڑی چیزوں پر محصول باقی رہے۔ اور جب ۱۹۲۳ء میں بالڈوین نے ہمہ گیر محصول کی خواہش ظاہر کی تو اسے انتخاب میں شکست فاش ہوئی۔ ۱۹۲۵ء میں مسٹر چرچل نے قبل از جنگ کے اسٹرلنگ کی طلائی قیمت کے مطابق طلائی معیار بحال کر دیا اور پاؤنڈ اب پھر ڈالر سے دو بدو ہو سکتا تھا۔ اس طرح برطانیہ کی اقتصادی پالیسی تقریباً ۱۹۱۴ء کی طرف لوٹ آئی۔

لیکن یہ بحال شدہ نظام اب پرانے طریقوں پر گامزن نہیں تھا۔ جنگ میں بعض بدیشی منڈیاں چھن گیئں جو واپس نہ لی جا سکیں۔ جنگ سے پہلے برطانیہ کپڑے کی برآمد کے لئے اہم ترین حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ مگر جنگ نے اس پر ضرب کاری لگائی اور اس کا مداوا نہ ہو سکا۔ ۲۴-۱۹۲۳ء میں کوئلہ کی تجارت بہت بڑھی ہوئی تھی مگر اب صرف اس کے دھندلے سے آثار ہی باقی تھے۔ اور اس کی وجہ کوئی اقتصادی علامت

نہ تھے، بلکہ روہر پر فرانسیسی قبضہ اس کا سبب تھا۔ بعد از جنگ کی سرد بازاری کے بعد برطانیہ میں بیکار مزدوروں کی تعداد کبھی بھی دس لاکھ سے کم نہیں ہوئی اور بعض "پسماندہ علاقے" ہمیشہ ایسے موجود رہے ہیں جو اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہو سکتے۔

۱۹۰۵ء سے لے کر ۱۹۳۱ء تک ان حالات کے لئے ان لوگوں کو مطعون کیا جاتا رہا جنھوں نے غلطی سے قبل از جنگ کی پاؤنڈ اور ڈالر کی مساواتِ مبادلہ کے مطابق طلائی معیار کو بحال کر دیا تھا۔ یہ معلوم کرنا بہت آسان تھا کہ پاؤنڈ کی قیمت زیادہ لگائی گئی ہے۔ اور یہ زیادتی برآمد کرنے والوں کے رستہ میں بری طرح حائل ہو رہی تھی۔ کچھ لوگوں کی رائے یہ تھی کہ طلائی معیار کی طرف لوٹنا ہی غلطی تھی اور ایک مصنوعی "سکہ جاتی معیار" صنعت و تجارت کے لئے زیادہ مفید ثابت ہوتا۔ اور بعضوں کا یہ خیال تھا کہ پاؤنڈ کی طلائی قیمت کم لگائی جانی چاہیئے تھی۔ اسٹرلنگ کی قیمت کی اس زیادتی نے برطانیہ کی مالیاتی پالیسی کو تفریط زر کی پالیسی بنا دیا۔ اور اس کا مدعا اجرتیں اور دوسری لاگتیں گھٹا کر قیمتوں کو کم کرنا تھا۔ مگر لاگتوں کا گھٹانا کچھ آسان نہ تھا۔ حکومت نے بڑی بڑی شرحوں پر قرضے لے رکھے تھے جن کی ادائگی کی تاریخیں نزدیک ہی تھیں، اس کے علاوہ قلتِ زر بھی تھی، ان امور کی بنا پر شرح سود کافی بڑھی رہی۔ سود کی ان بڑی بڑی شرحوں کی موجودگی میں مزدور اس بات پر آسانی سے آمادہ نہ ہوتے تھے کہ قیمتوں کو گھٹانے کا تمام بوجھ ان کے سر ڈال دیا جائے۔

اس تبصرے سے یہ ظاہر ہے کہ عالمگیر کساد بازاری سے پہلے بھی برطانیہ کے حالات کچھ سازگار نہ تھے۔ اور جب ۱۹۲۹ء میں امریکی صرافہ کے متعلق دنیا میں ایک قسم کا ہیجان سا پیدا ہو گیا اور تمام دنیا میں سرد بازاری پھیل گئی تو برطانیہ کے حالات اور بھی خراب ہو گئے۔ یکے بعد دیگرے دنیا کے ہر ملک میں ارزانی پھیل گئی۔ برطانوی برآمد کو سخت دھچکا پہنچا۔ قیمتیں نہایت سرعت کے ساتھ گر گئیں، سامان خوراک اور نئے مالوں کی قیمتیں بھی اس کی زد سے نہ بچ سکیں۔ امریکی ارزانی کی وجہ سے کچی اجناس کی مانگ بہت گھٹ گئی۔ اور سامان خوراک کی پیداوار کچھ ایسے طریقوں پر ہو رہی تھی کہ مانگ کے گھٹنے کے ساتھ ساتھ اس کی پیداوار کا گھٹانا از حد مشکل تھا۔

باقی ملکوں کی اشیا کی درآمد کے لئے برطانیہ ایک بہت بڑی آزاد منڈی کی حیثیت رکھتا تھا۔

۱۹۲۹ء کی کساد بازاری کے بعد دنیا کا ہر ملک اپنی پیداوار کو ہر قیمت پر بیچنے کے لئے تیار تھا اور اس صورت حال کا برطانیہ پر پورا اثر ہوا۔ برطانوی صارفوں کو ـــــــ یا ان لوگوں کو جن کی آمدنی اتنی زیادہ تھی کہ خریداری کر سکتے تھے ـــــــ فوری فائدے ہوئے۔ گذارے کی لاگت بہت گر گئی۔ برطانیہ کی برآمد تو گھٹ گئی مگر درآمد اسی طرح زیادہ تھی۔ ۱۹۳۱ء تک حالات نے ایک اور صورت اختیار کر لی۔ اب برطانیہ کے پاس اتنا زائد سرمایہ نہ تھا کہ درآمد کا حساب چکا سکے۔

اگر یہ صورت عارضی ہوتی تو اتنی زیادہ خطرناک نہ تھی۔ کیونکہ برطانیہ کا کافی سرمایہ دوسرے ملکوں میں لگا ہوا تھا جن کی ادائیگی کا وقت جلد ہی آنے والا تھا، اور اس طرح درآمد کا حساب چکایا جا سکتا تھا مگر سکے جاتی مشکلات کے علاوہ اس وقت وزارت پر مزدور جماعت قابض تھی جسے مالیاتی مفادات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اگر یہ صورت نہ ہوتی تو برطانیہ میں کوئی بھی بحران رونما نہ ہوتا۔ پیدا شدہ حالات نے ایک قسم کی دہشت سی پھیلادی۔ مزدور وزراء نے بنک آف انگلینڈ کی ہنڈیوں کو لینے سے انکار کر دیا، چنانچہ مزدور جماعت کو وزارت سے ہاتھ دھونے پڑے۔ اور اس جماعت کا قائد میکڈانلڈ پھر سے وزیر اعظم بن گیا۔ اب وہ ٹوریوں اور لبرلوں کی مخلوط جماعت کا رہنما تھا اور اس کا مقصد "پاؤنڈ اور ملک کو بچانا" تھا۔

اگلے چند مہینوں میں برطانیہ کی اقتصادی حکمت عملی بالکل ہی بدل گئی۔ درآمد کی قیمتوں کی زیر باری کم کرنے کے اب صرف دو ہی طریقے تھے۔ ایک طریقہ تو یہ تھا کہ حفاظتی محصول لگا کر درآمد کو روکا جائے اور دوسرا حل یہ تھا کہ پاؤنڈ کی طلائی قیمت کم کر دی جائے۔ نئی وزارت نے دونوں طریقوں کو فوراً ہی اپنا لیا برطانیہ آزاد تجارت کا ایک دیرینہ ملک تھا، آنکھ جھپکتے ہی میں یہاں حفاظتی محاصل کا مکمل دستور رائج ہو گیا۔ برطانیہ کا ایک مالیاتی مرکز تھا اور طلائی معیار کا سب سے بڑا علمبردار۔ اب وہاں ایک غیر متعین دستور رائج ہو گیا جس کا مطلب درحقیقت "مصنوعی سکے" کا قیام تھا۔

اب ایک اور سوال پیدا ہو گیا ـــــــ محاصل کا جو دستور جو اشیا میں امتیاز کرے اور جس کا مقصد سودیشی مصنوعات کا تحفظ ہو، اس کے لئے کچھ حد تک اقتصادی نظم کی ضرورت ہے ـــــــ نئے برطانوی محاصل کو عملی صورت دینے کے لئے محاصل درآمد کی ایک مجلس شوریٰ بنائی

گئی۔ اس مجلس نے اتنی قوت حاصل کرلی کہ بعض صنعتوں کے بالمقابل اس نے دوسری صنعتوں کی پرورش کی۔ اسے یہ اختیار دیا گیا کہ فولادی صنعت کے محصولی تحفظ کے مطالبے کے جواب میں یہ نئی تنظیم پر اصرار کرے اور یہ اختیار اس کی طاقت میں لازمی طور پر کافی وسعت کا سبب تھا۔ یہ سچ ہے کہ اس مجلس نے سخت شرائط عائد نہیں کی تھیں، مگر یہ شرائط کم ازکم یہ ضرور ظاہر کرتی تھیں کہ بدیشی مصنوعات کے بالمقابل ریاست جن ملکی صنعتوں کی امداد کررہی ہے ان کے آئین وضوابط میں اسے عمل دخل کا بھی حق ہے۔

برطانیہ کی نئی تجارتی پالیسی کی الجھنیں بہت جلد ظاہر ہونی شروع ہوگئیں۔ نوآبادیوں کی مصنوعات پر اگرچہ برطانیہ نے کوئی محصول عائد نہیں کیا تھا، مگر اس خیال سے ان میں خوف وہراس پھیل گیا کہ یہی محصول کل کو ان پر بھی لگائے جا سکتے ہیں۔ اور انھوں نے یہ مطالبہ شروع کردیا کہ دوسرے ملکوں کے بالمقابل انھیں برطانوی منڈی میں زیادہ جگہ دی جائے۔ اوٹاوا کے مقام پر نوآبادیوں نے برطانیہ کے ساتھ ٹھوس سودے کئے، اور برطانوی مصنوعات پر محصولی مراعات کے عوض جتنی بڑی بڑی مراعات وہ حاصل کرسکتی تھیں انھوں نے حاصل کیں۔ اور برطانوی منڈی پر پہلے سے زیادہ اقتدار حاصل کرلیا۔ اوٹاوا کے معاہدات نے ڈنمارک اور ارجنٹائن کو مخالف کردیا۔ اب برطانیہ کو یہ فیصلہ کرنا تھا کہ اپنی خوراک کا کتنا حصہ اسے خود پیدا کرنا ہے، اور کتنا حصہ برطانوی برآمد کے بدلے میں نوآبادیات سے خریدنا ہے، اور کس قدر غیر ملکوں سے خریدتے رہنا ہے۔

سمندر پار سے سامانِ خوراک کی ارزاں نرخوں پر درآمد ہوتی تھی۔ اس لئے برطانوی کسان ہمیشہ حفاظتی محاصل کے لئے چیخ و پکار کرتے رہے تھے۔ ۱۹۳۱ء کے بحران کے بعد جو محصول عائد کئے گئے تھے ان سے کئی زراعتی درآمدوں کو مستثنیٰ کردیا گیا تھا۔ کیونکہ حکومت کو ڈر تھا کہ لوگوں کی خوراک پر ٹیکس لگانے سے ایک ہیجان پھیل جائے گا اور اگر نوآبادیوں کی پیداوار پر محصول نہ لگایا جائے تو باقی ملکوں کی زراعتی درآمد پر محصول عائد کرنے سے برطانوی کسان کو کچھ زیادہ فائدہ نہ ہوسکتا تھا۔ ۱۹۳۱ء میں تعیشات اور نیم تعیشات کی قسم کے سامانِ خوراک پر محصول ضرور لگایا گیا۔ مگر بڑی بڑی بنیادی اشیاء چھوڑ دی گئیں۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ریاست کسانوں کے لئے کچھ نہیں کررہی تھی۔ عالمگیر سرد بازاری سے پہلے ریاست نے کاشتکاروں کو میٹھے چقندر کی کاشت کے لئے امدادی رقم دی تھی ——— یہ ایک رقم

خیط تھی ۱۱ور دو ساورے سے کھانڈ جس قیمت پر مل سکتی تھی یہ امدادی رقم اس سے زیادہ تھی۔ مزدور وزارت نے ۱۹۳۰ء میں قانونِ گندم اور زراعتی منڈیوں کا قانون بناکر کاشتکاروں کی امداد کی۔ جو خریدار ملکی گیہوں کے معزّزہ "نصاب" سے زیادہ خرچ کرتے، ان کے "حصہ رسدی کی اجازت نامے" خریدنے کے لئے آٹا پیسائی کی مشینوں والوں کو قانونِ گندم کے ماتحت مجبور کیا گیا۔ علاوہ ازیں کسان اب گندم کو بازاری نرخوں سے بہت زیادہ پر بیچنے لگے اور سرکاری امداد کی رقم عوام سے روٹی کی قیمت کے ساتھ وصول کی جانے لگی۔ اس خیال سے کہ کہیں سرکاری امداد کے زیر اثر گیہوں کی کاشت بہت زیادہ نہ بڑھ جائے، سرکاری امداد کی کل رقم مقرر کر دی گئی۔ چنانچہ ہر اتیس سیر کے بعد سرکاری امداد گھٹ جاتی۔

۱۹۳۰ء میں زراعتی منڈیوں کے لئے جو قانون بنایا گیا تھا، اس نے کاشتکاروں کے لئے کسی قسم کی سرکاری امداد یا تحفظ کا بندوبست نہ کیا۔ دراصل یہ قانون بناکر مزدور وزارت نے کاشتکاروں کو امدادی منڈیاں بنانے کی ترغیب دلائی تھی اور انھیں جبری اختیارات دینے کا لالچ بھی دیا۔ ہر قسم کی زراعتی جنس پیدا کرنے والے کسان اپنا ایک مارکیٹنگ بورڈ بنا سکتے تھے اور اس زراعت کے سب کسانوں کے لئے اس بورڈ کی رکنیت لازمی تھی، مگر اس مارکیٹنگ بورڈ کی منظوری وزارتِ زراعت سے لینی ضروری تھی۔ یہ بورڈ پیداوار کی قیمت اور شرائط فروخت کا تعیّن کر سکتا تھا۔

مزدور وزیر زراعت ——— ڈاکٹر ایڈیسن ——— اس قانون کے بعد ایک اور قانون بنانا چاہتا تھا۔ اس کی مرسی تقسیم پیداوار کی لازمی تنظیم کرنے کی تھی تاکہ خریدار جو قیمت ادا کرتا ہے وہ تقریباً ساری کی ساری کسان کی جیب میں پہنچے۔ مگر اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے ہی مزدور وزارت ٹوٹ گئی۔ اور ڈاکٹر ایڈیسن کے جانشین میجر ایلیٹ نے بالکل مختلف طریق کار اختیار کیا۔ عالمگیر کساد بازاری کی بنا پر ہر ملک برطانیہ میں اپنی پیداوار کی کھپت چاہتا تھا۔ اس لئے ارزاں درآمد کا ایک سیلاب برطانیہ میں امڈ پڑا۔ میجر ایلیٹ اس ارزانی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ اور یہی وجہ اس کے جدا گانہ طریق کار اختیار کرنے کی تھی۔ دورانِ تقسیم میں جو نقصان ہوتا تھا اسے کم کرنے کے بجائے میجر ایلیٹ نے ۱۹۳۳ء میں زراعتی منڈیوں کا ایک دوسرا قانون بنایا جس کے ذریعے اس نے زراعتی پیداوار کی درآمد کو ضبط میں

لاناچاہا اور درآمد کی مقدار پر پابندیاں لگادیں۔ اس طرح اس نے درآمد کی حد بندی کرکے برطانوی اناج کی قیمتوں کو بڑھانے کی کوشش کی۔

اس دستور میں ایک خامی بھی تھی۔ خریداروں پر محصول تو کافی عائد کردیا گیا تھا، مگر ملکی کاشتکاروں کو کوئی خاص فائدہ نہ ہوا۔ چونکہ درآمد کی مقدار مقرر کردی گئی تھی اس لئے درآمد کرنے والوں نے قیمتیں بہت زیادہ بڑھادیں اور اگر درآمد پر صرف محصول لگایا جاتا تو قیمتیں اتنی زیادہ کبھی نہ بڑھتیں۔ اب صارف کو ملکی اور بدیشی پیداوار کے لئے کافی سے زیادہ رقم ادا کرنی پڑی تھی۔ سور کے گوشت کی تو خاص طور پر یہی حالت ہوئی ڈنمارک کے سور کا گوشت اعلیٰ قسم کا ہوتا ہے۔ چونکہ اس کی درآمد کی مقدار کی حد مقرر کردی گئی تھی اس لئے اس کی قیمت اتنی زیادہ بڑھ گئی کہ اہل ڈنمارک پہلے سے کم مقدار کے بدلے میں پہلے سے بہت زیادہ رقم وصول کرنے لگے۔ ملک میں سور کے گوشت کی پیداوار بڑھائی گئی، مگر اس سے کوئی خاص فائدہ نہ ہوا کیونکہ بڑھی ہوئی قیمتوں کے سبب لوگوں نے یہ گوشت کھانا کم کردیا۔

اس اثنا میں گائے اور بچھڑے کے گوشت کی درآمد کے سلسلہ میں بھی اہم مشکلات پیدا ہوگئیں برطانوی گوشت کی قیمت اتنی گر گئی، جسے کسان اپنے لئے تباہ کن گرداننے لگے۔ چنانچہ حکومت نے ڈھور ڈنگر پالنے والوں کو کچھ عرصہ کے لئے محاصل میں سے کچھ امداد دی اس سلسلہ میں "طویل میعادی پالیسی" کے لئے غور و فکر کرنے پر کافی وقت لگ گیا۔ حکومت گائے اور بچھڑے کے گوشت کی ہر درآمد پر ایک محصول لگانا چاہتی تھی اس سے نوآبادیات کا گوشت بھی مستثنیٰ نہ تھا۔ اور اس طرح جو کچھ وصول ہوتا وہ مویشی پالنے والوں کو امداد کے طور پر دیا جاتا تھا۔

اس تجویز کی نوآبادیوں اور ارجن ٹائن دونوں نے سخت مخالفت کی۔ نوآبادیاں اپنی پیداوار کی برطانیہ میں آزاد درآمد کا مطالبہ کر رہی تھیں اور ارجن ٹائن کو یہ خدشہ تھا کہ اس طرح تو آہستہ آہستہ ارجن ٹائن کی پیداوار کو برطانیہ میں آنے سے بالکل روکا جا رہا ہے۔ ان پیچیدگیوں کو سلجھانے کی کوشش جاری تھی۔ اس اثنا میں مویشی پالنے والے ملکوں کو بھی امداد ملتی رہی جو کچھ عرصہ کے لئے مقرر کی گئی تھی۔ اور نوآبادیات اور ارجن ٹائن کے ساتھ درآمد کی مقدار پر پابندی لگانے کے لئے عارضی سمجھوتے کرلئے گئے ۱۹۳۶ء کے

آخر میں جاکر کہیں حکومت برطانیہ اپنی بیش میعادی حکمتِ عملی" کا اعلان کرنے کے قابل ہوسکی۔

اس پالیسی کا مطلب محض یہ تھا کہ مویشی پالنے والے ملکیوں کو امداد جاری رہی اور اس امداد کی رقم دساوری گوشت کی درآمد پر محصول لگا کر پوری کی جائے، مگر نوآبادیات سے آئے ہوئے گوشت پر ٹیکس نہ لگایا جائے۔ ارجن ٹائن نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ نوآبادیوں کے ساتھ جس ترجیحی سلوک کا پہلے وعدہ کیا جاچکا تھا ارجن ٹائن اس سے زیادہ محصول ادا کرنے کو تیار نہ تھا۔ چنانچہ نوآبادیوں سے آئی ہوئی چیزوں پر محصول لگانے کی تجویز کو ترک کرنا پڑا۔ حکومت کا یہ فعل کچھ مفید ثابت ہوا۔ گراں بہا ملکی گوشت کی پیداوار کرنے والوں کو جو رقم امداد کے طور پر دی جاتی تھی وہ خریداروں سے وصول کی جاتی تھی اور مذکورہ بالا تجویز کے ترک کرنے سے غریب خریداروں کو کافی حد تک اس زیر باری سے چھٹکارا مل گیا۔

زراعتی منڈیوں کے قوانین شروع شروع میں دودھ پر بھی عائد کئے گئے۔ ڈاکٹروں کا یہ مشورہ تھا کہ دودھ زیادہ پیا جانا چاہیئے، اور غریب طبقوں میں تو اس کا استعمال خاص طور پر بڑھانا چاہیئے۔ بیماریوں کے خطرات کو دور کرنے کی غرض سے اچھے دودھ کی ضرورت مسلمہ تھی برطانوی گوالے دودھ کی منڈی کے قدرتی طور پر اجارہ دار تھے۔ مگر دودھ جس بھاؤ پر بک رہا تھا اس بھاؤ سے دودھ کی ساری پیداوار خریدی نہیں جاسکتی تھی۔ اس لئے جو دودھ بچ رہتا یا تو وہ جما کر ڈبوں میں بیچا جاتا، یا اس سے مکھن اور پنیر بنایا جاتا، اور یہ سستے نرخوں پر بکتا۔

"دودھ کا مارکیٹنگ بورڈ" کی تشکیل سے پہلے بعض علاقوں میں تو سارا دودھ پینے والوں میں بک جاتا، اور بعض دور دراز علاقوں کا دودھ کافی مقدار میں بچ رہتا جو صنعت ساز منڈیوں میں فروخت ہوتا۔ اول الذکر علاقوں کے گوالوں نے مویشیوں کو سائنٹفک طریق پر خوراک دینی شروع کردی تھی اور اس طرح تمام موسموں میں مویشی تقریبًا ایک سا دودھ دیتے، لیکن مؤخر الذکر علاقوں میں صورتِ حال یہ نہ تھی۔

عالمگیر سرد بازاری کے جہاں دوسرے نتائج رونما ہوئے وہیں دودھ سے بنی ہوئی درآمد شدہ اشیاء کی قیمت بھی بہت گر گئی۔ اس لئے برطانیہ میں دودھ سے بنائی جانے والی چیزوں کے لئے "زائد" دودھ کی قیمت فروخت بھی گھٹ گئی۔ اور جو گوالے صرف دودھ سے بنائی جانے والی چیزوں کے لئے

دودھ بیچا کرتے تھے انھیں دوالیہ ہونے کا خطرہ لاحق ہوگیا۔ ان گوالوں کی مدد کی غرض سے دودھ کے مارکٹنگ بورڈ نے سب گوالوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنا دودھ بورڈ کی معرفت مقررہ نرخوں پر بیچیں۔ صرف تپ دق کے مریضوں کے لئے خاص دودھ بیچنے والوں کو مستثنیٰ کیا گیا۔ اب ذمہ داری بورڈ پر عائد ہوتی تھی کہ پینے والوں کی منڈی میں جتنا زیادہ دودھ ہوسکے بیچے اور جو دودھ باقی بچے وہ صنعتیوں کے ہاتھوں بہت سستے نرخوں پر بیچ دے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر گوالوں کو نفع بخش قیمتیں وصول کرنی ہیں تو صنعتیوں کے پاس ارزاں نرخوں پر دودھ بیچنے سے انھیں جتنا گھاٹا ہوتا ہے وہ دودھ پینے والے پورا کریں۔

تجویز یہ تھی کہ دودھ زیادہ پیا جائے۔ اب اگر دودھ پینے والوں سے زیادہ قیمتیں وصول کی جائیں تو یہ امر مطلوبہ مقصد کے منافی تھا۔ اس طرح تو دودھ پینے والوں کی گاہکی کم ہوجاتی، اور اگر دور دراز کے علاقوں کے گوالوں کو معقول قیمتیں ملنی شروع ہوجاتیں تو اس کا لازمی نتیجہ ان علاقوں میں دودھ کی پیداوار بڑھانے کی صورت میں نکلتا۔ اس تجویز سے دودھ کی پیداوار بڑی تیزی سے بڑھ گئی، لیکن دودھ پینے والوں سے گراں نرخ وصول کئے جاتے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صنعتیوں کے پاس سستے نرخوں پر بیش از بیش دودھ فروخت کیا جانے لگا۔

اس لغویت کو دور کرنا لازمی تھا۔ ڈاکٹروں نے بچوں کو تازہ دودھ پلانے پر بہت زیادہ زور دیا، اس لئے مدرسوں میں دودھ پلانے کی اسکیم جاری کی گئی۔ اس اسکیم کے ماتحت سکول کے بچوں کو تعلیمی زمانہ میں دودھ سستے بھاؤ دیا جاتا۔ اس طرح وہ "زائد" دودھ جو صنعتیوں کی منڈی میں پہنچتا تھا وہ مدرسوں میں آنے لگا اور صنعتیوں کی نسبت زیادہ نرخوں پر خریدا جانے لگا۔ مگر اس اسکیم سے مسئلہ کا عشر عشیر بھی حل نہ ہوا اور ۱۹۳۶ء تک غریب پینے والوں کے لئے دودھ کو سستا کرنے کا مسئلہ لاینحل ہی رہا۔

یہ مثالیں صرف اس لئے پیش کی گئی ہیں تاکہ یہ واضح ہوجائے کہ کسی سرمایہ دار نظام میں پیداوار کو بڑھانے کی ہر کوشش جلد ہی لاینحل پیچیدگیاں پیدا کردیتی ہے۔ جس نظام کی بنیاد نفع اندوزی پر ہو وہاں بڑھانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہوتا ہے کہ پیداکاروں کو زیادہ قیمتیں دی جائیں۔ لیکن خریداری صرف اسی وقت زیادہ ہوسکتی ہے جب خریدار کو کم خرچ کرنا پڑے۔ پچھلے چند سالوں میں برطانیہ کی زراعتی پالیسی واضح طور پر یہی تھی

کہ زراعتی پیداوار کی قیمتیں بڑھادی جائیں۔ اس کا مطلب خریدار سے زیادہ قیمت وصول کرنا تھا۔ اور اس طرح زراعتی پیداوار کی خریداری کم ہوگئی۔ دودھ کی طرح جن اشیار کی قدرتی اجارہ داری ملکیوں کے ہاتھ میں تھی یا جن کی درآمد پر پابندیاں عائد تھیں ان کے سوا دوسری کسی چیز کے لئے بھی خریداروں سے زیادہ قیمت وصول نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس لئے زراعتی درآمد پر نت نئے محصول اور ٹیکس لگائے جانے لگے۔ اور درآمد کی مقدار پر بھی نئی نئی پابندیاں عائد کی جانے لگیں۔

ایک دوسرا طریقہ بھی موجود ہے۔ اگر ریاست ٹیکسوں میں سے کچھ رقم امداد کے طور پر دے دے تو پیدا کرنے والے بھی نفع میں رہیں اور خریدار بھی زیادہ زیر بار نہ ہو۔ عالمگیر کسادبازاری سے پہلے میٹھے چقندر کے سلسلے میں یہی طریقہ اختیار کیا گیا تھا مگر سرد بازاری کے بعد ریاست کا رجحان اس طرف رہا، جیسا کہ قانونِ گندم اور دوسری زراعتی تجاویز سے ظاہر ہے، کہ خریدار ہی زیادہ قیمت ادا کرے خواہ اس سے خریداری گھٹ ہی جائے۔ اگر اس پالیسی کے خلاف ایک عام آواز بلند نہیں ہوئی تو اس کی وجہ صرف ایک تھی۔ ارزانی کے زمانے میں درآمد ہونے والی اشیائے خوراک کی قیمت بہت گر گئی تھی۔ اس لئے جب ریاست نے خریداروں پر ٹیکس لگایا تو انھوں نے محسوس تک نہ کیا۔ کیونکہ کسادبازاری سے پہلے جو قیمتیں وہ ادا کرتے تھے، اب ٹیکس ملاکر بھی قیمتیں ان سے زیادہ نہ ہوئی تھیں۔ مگر جب دنیا کی زراعتی اشیار کی قیمتیں بحال ہوگئیں تو بڑی مشکل کا سامنا ہوا۔ اشیائے عالم کی قیمتیں بڑھ رہی تھیں، اس کے ساتھ برطانیہ نے بھی چیزوں کی قیمتیں زیادہ کرنے کی تجویز پر عمل شروع کر رکھا تھا۔ چنانچہ ۱۹۳۳ء کے وسط سے لے کر ۱۹۳۶ء کے آخر تک قیمتوں پر بیس فیصدی اضافہ ہوگیا۔

صنعتی محصول کو دولت مند کارخانہ داروں کے لئے ایک قسم کی معقول امداد سمجھا گیا۔ درآمد کی کمیت پر کوئی پابندی عائد نہ تھی اور نہ قیمتوں میں اضافہ کرنے کے لئے کوئی دوسرا طریقہ اختیار کیا گیا تھا۔ ان حالات میں اسٹرلنگ کی طلائی قیمت کو گھٹتے ہوئے دیکھ کر دولت مند کارخانے داروں نے برآمد زیادہ کردی۔ مگر بعض مصنوعات کی قیمتیں بڑھانے کے لئے خاص اقدام کئے گئے۔ مزدور وزارت نے سنہ ۱۹۳۰ء میں کوئلہ کی کانوں کا قانون بناکر اس مہم کا آغاز کر دیا۔ اس قانون کے ماتحت کانوں کے مالکوں

کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ قیمت فروخت خود مقرر کر سکتے ہیں اور رسد کو بھی گھٹا سکتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اس قانون سے موجودہ حکومت کا منشا کانکنوں کی اجرتوں اور اوقات کار کی بہترین اصلاح تھی۔ مگر اس قانون کا عملی نتیجہ یہ ہوا کہ ملکیت اور طریق کار کی جس نئی تنظیم کا مطالبہ صنعت کر رہی تھی اب اس کے بغیر ہی کانوں کے مالک اپنا کام چلتا رکھ سکتے تھے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس قانون نے کوئلہ کی ملکی صارفوں کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ کوئلہ کی سخت مقابلتی برآمد کی مالی امداد کریں۔ اس قانون کی رُو سے کوئلے کی کانوں کی نئی تنظیم کے لئے ایک کمیشن بنایا گیا۔ لیکن اسے نامکمل اختیارات دئے گئے، چنانچہ نئی تنظیم کی ہر کوشش ناکام رہی۔ مگر اس ناکامی کی تمام تر ذمہ دار وزارت ہی نہ تھی، کیونکہ دارالامرا نے اس قانون میں کچھ ایسی ترمیمیں کر دی تھیں جن سے کمیشن بالکل ناکارہ ہو کر رہ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کوئلے کی کانوں کے مالکوں کی اجارہ داری عوام کی دستبرد سے قانوناً محفوظ ہو گئی ——— آج بھی یہی حالت ہے، اور جب تک موجودہ وزارت قائم ہے، کوئلے کی کانوں کے مالکوں کی اس حیثیت کو کوئی گھٹا نہیں سکتا۔

ایک دوسری صنعت کا بھی حفاظتی محصول کے علاوہ دوسرے خاص طریقوں سے تحفظ کیا گیا ہے یہ صنعت فولاد کی ہے۔ اس صنعت کے لئے حفاظتی محصول کا حربہ خاص طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ فولاد پیدا کرنے والوں سے کہا گیا کہ اگر وہ اپنی صنعت کی نئی تنظیم کرلیں تو انھیں درآمد کے اثرات سے ہر طرح بچا لیا جائے گا۔ مگر انھوں نے ایسا نہ کیا، بلکہ اپنی آواز کو مؤثر بنانے کے لئے ایک طاقت ور جتھا مرتب کر لیا۔ اور اس جتھے کے ذریعے براعظم یورپ کے فولاد پیدا کرنے والوں سے گفت و شنید شروع کر دی۔ براعظم یورپ میں فولاد پیدا کرنے والوں نے ایک بین الاقوامی انجمن قائم کر رکھی تھی۔ یہ انجمن ان میں منڈیوں کا تعین کر دیتی۔ جب فولاد پیدا کرنے والے برطانیوں نے اس سے گفت و شنید شروع کی تو یورپ کے فولاد پیدا کرنے والوں نے فوراً ہی برطانیہ میں فولاد کی درآمد کا سوال اٹھا دیا۔ کیونکہ کچے فولاد کی ارزانی کے سبب سے درآمد بہت کافی ہو رہی تھی۔ چونکہ مذکورہ بالا برطانوی ادارہ پر کچا فولاد پیدا کرنے والوں کا غلبہ تھا، اس لئے اس نے درآمد کا ایک ایسا نصاب پیش کیا جو براعظم کی اس انجمن کے لئے قطعاً ناتسلی بخش تھا۔ اب حکومت فولاد پیدا کرنے والے برطانیوں کے آڑے آئی۔ اور اس نے بدشیوں کو بالکل ناکام کر دینے کے لئے ایک

درآمد پر بہت بھاری محصول لگا دیا۔ حکومت کا یہ قدم موثر ثابت ہوا۔ اگرچہ درآمد کی نصاب بندی کے لئے کوئی قانون نہ بنایا گیا تھا تاہم اس کے بغیر ہی برطانوی اور غیر ملکی سرمایہ داروں نے نجی طور پر آپس میں ایک سمجھوتہ کرلیا جس کی روسے غیر ملکی فولاد کی درآمد پہلے کی نسبت بہت زیادہ گھٹا دی گئی۔ یہ سمجھوتہ کرتے وقت فولاد پر تکمیل عمل کرنے والے کارخانوں کے احتجاج کو بالکل مسترد کردیا گیا۔ اس سمجھوتے نے انھیں سودیشی اور بدیشی نیم مکمل سامان بہت مہنگا خریدنے پر مجبور کردیا۔

اس گفت و شنید کے دوران میں حکومتِ برطانیہ برطانوی برآمد اور خاص کر کوئلے کی برآمد کو زیادہ کرنے کی تجویزیں سوچ رہی تھی۔ اس مقصد کے لئے دوسرے ملکوں سے نئے نئے تجارتی سمجھوتے شروع کردیئے گئے۔ برطانوی منڈی میں ڈنمارک اپنی حاصل کی ہوئی جگہ کھونا نہیں چاہتا تھا، اس لئے اسے برطانوی اشیار کو اپنے ملک میں بہت بڑی جگہ دینی پڑی۔ ناروے، سویڈن اور دوسرے یورپی ممالک اور پھر ارجن ٹائن کے ساتھ بھی تقریباً اسی طرح کے سمجھوتے کئے گئے۔ سکہ جاتی مبادلہ کی تشکیل و توسیع نے اس طریق کار کے ساتھ مل کر ایک اہم نتیجہ رونما کردیا یعنی برطانیہ کی سمندر پار تجارت کو ایک نئے راستے پر ڈال دیا۔

"سکہ جاتی رقبے" کی توسیع تجارتی سمجھوتوں سے زیادہ کارآمد ثابت ہوئی۔ جب ۱۹۳۱ء میں برطانیہ طلائی معیار کھو بیٹھا تو یہ کہا جانے لگا کہ اب لندن دنیا کا مالیاتی مرکز بھی نہ رہے گا۔ امریکہ کو اس سے بھی بڑے بحران کا سامنا تھا، اس لئے ڈالر کی قیمت کے گرنے سے پہلے یا بعد لندن کی جگہ یہ نہ سنبھال سکتا تھا۔ فرانس اور کچھ دوسرے ملک طلائی معیار کو سنبھالے ہوئے تھے، مگر یہ ملک بھی مالی لحاظ سے کچھ زیادہ مضبوط نہ تھے، اور تقلیل زر کی حکمت عملیوں نے تو ان کو اور بھی کمزور کردیا۔ پیرس میں سونا جمع تو ہوسکتا تھا مگر استعمال نہ کیا جاسکتا تھا۔ بعض دوسرے ملک بھی طلائی معیار کھو بیٹھے۔ ان میں اسکنڈے نیویا اور آسٹریلیشیا کے نام نمایاں ہیں۔ اب برطانیہ ایسے سکہ جاتی رقبہ کا مرکز بن گیا جس کے ارکان کو بحران کا مقابلہ کرنے کے لئے توسیع زر کی مکمل آزادی تھی۔

پہلے پہل تو یہ خیال کیا جاتا تھا کہ طلائی معیار کھونے کے بعد پاؤنڈ کا سکہ اپنا بین الاقوامی معیار برطانیہ کی مالیاتی ہیئتِ حاکمہ کے "بندوبست" کے بغیر خود ہی تلاش کرے گا۔ مگر برطانیہ کی حیثیت

سکہ جاتی رقبہ کے مرکز کی تھی اور نئے سکوں کے مستقبل کے متعلق بھی شکوک بڑھتے جا رہے تھے، اس لئے مالیاتی ہئیت حاکمہ کی طرف سے بندوبست کا ہونا ضروری ہو گیا۔ چنانچہ سکہ جاتی اتار چڑھاؤ کو ضبط میں لانے کے لئے بنک آف انگلینڈ کے بجائے حکومت کے ماتحت ایک "قیام مبادلہ فنڈ" کی تشکیل عمل میں آئی۔ غیر ملکی سکوں اور سونے کے سودے کر کے اس فنڈ نے تھوڑے سے عرصہ میں اتنا زر محفوظ کر لیا کہ اب غیر ملکی مبادلہ سے جو سلوک یہ فنڈ چاہتا کر سکتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد امریکہ نے بھی ایسا فنڈ قائم کر لیا، اور پھر ہالینڈ اور فرانس نے بھی اس کی پیروی کی۔ اب برطانیہ کے فنڈ کی مذکورہ قوت میں کمی آ گئی۔ اب غیر ملکی مبادلہ کا بندوبست [illegible] کیا جانے لگا یعنی مختلف ممالک کے فنڈوں کو چلانے والے اداروں نے آپس میں سمجھوتہ کر لیا۔ مگر ان فنڈوں کے اختیارات اتنے وسیع تھے کہ ایک شخصی سٹہ باز کے لئے سکہ جاتی مشغلہ از خطرات نہ رہا۔

یہ حقیقت ہے کہ سکہ جاتی نسبتوں کو بدلنے کے بیش میعادی رجحان کا کوئی بھی قیام مبادلہ فنڈ "طویل عرصہ" تک مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اگر کسی فنڈ کو اس غرض کے لئے استعمال کیا گیا تو آخر کار اسے سونے اور غیر ملکی مبادلہ کے پٹوں سے ہاتھ دھونا پڑا۔ قیام مبادلہ صرف قلیل میعادی رجحانات کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ اگر نسبتوں کو بدلنے کا رجحان بیش میعادی ہو، تو اس رجحان کو بدلنے کے لئے یا تو شرح مبادلہ کو بدلنا ہو گا یا اندرونی مالیاتی حالات کو تبدیل کرنا ہو گا۔ جب قیام مبادلہ کے کئی فنڈ موجود ہوں اور وہ ایک دوسرے کے خلاف استعمال کئے جا سکتے ہیں، تو دوسرا طریق زیادہ تر اختیار کیا جاتا ہے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ برطانیہ نے کچھ تک بین الاقوامی مالیاتی معیار پھر سے حاصل کر لیا ہے اور اب اسے قرضے کی اندرونی پالیسی کو دنیا کے حالات کے مطابق بنانا ہے۔ خوش قسمتی سے اس کا نتیجہ تقلیل زر نہیں ہوا کیونکہ دوسرے ملک بھی عموی طور پر [illegible] کی پالیسی پر کاربند ہیں۔

المختصر ۱۹۳۱ء کے بعد برطانیہ نے اپنی اقتصادی پالیسی میں جو تبدیلیاں کی ہیں انھوں نے اسے کساد بازاری سے پہلے کی بے نظم معیشت سے بہت دور ہٹا دیا ہے۔ اب اس کے پاس ایک مقررہ سکہ ہے [illegible] اس کی بین الاقوامی تجارت بہت زیادہ متعین ہے، اس کی زراعتی پیداوار کے لئے ایک نظام مقرر کی [illegible] پیداوار کے لئے بھی جن میں کوئلہ اور فولاد بھی شامل ہیں۔ ایک دستور مرتب ہو گیا ہے [illegible]

طے پا چکی ہے۔ اس کی رو سے تعمیراتِ عامہ کو ان شخصی تعمیرات کے ساتھ ملا دیا گیا جو شرح سود کی کمی کی وجہ سے بنائی جاتی ہیں۔ بجلی کا انتظام مرکزی برقی بورڈ کے ماتحت آگیا ہے۔ لندنی مسافروں کی آمد و رفت لندنی سفر بورڈ کے ماتحت کر دی گئی ہے کوئلے سے تیل پیدا کرنے کے لئے حکومت نے امداد کی ہے اور لاوارث علاقوں میں تجارتی املاک پیدا ہو گئی ہیں۔

ان تبدیلیوں سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ریاست نے صنعت میں ٹھوس قسم کا دخل حاصل کر لیا ہے، اور اس نے برطانیہ کی اقتصادی زندگی کو آزاد تجارت کی دیرینہ روایات سے بہت جدا کر دیا ہے۔ لیکن ان سب تبدیلیوں نے کوئی حقیقی اقتصادی منصوبہ بندی پیدا نہیں کی۔

اس کی دو وجوہات ہیں۔ اول یہ کہ یہ سب کچھ رفتہ رفتہ، بغیر کسی ترتیب و ربط اور بغیر کسی ظاہری واضح مقصد کے کیا گیا ہے۔ جب کوئی اہم مسئلہ زیادہ الجھ گیا تو حکومت نے مداخلت کی۔ لیکن ابھی تک ایسے بہت سے مسائل بھی ہیں ——— مثلاً کپڑے کی صنعت کی نئی تنظیم ——— جنھیں حاصل کرنے میں حکومت بالکل ناکام رہی ہے۔ اور بہت سے ایسے مسائل بھی ہیں ——— مثلاً لاوارث علاقوں کی بحالی ——— جنھیں حل کرنے کی اس نے بالکل ناکافی و مضحکہ خیز انداز میں کوشش کی ہے۔ اس نے جو کچھ بھی کیا ہے وہ مختلف مفادات کے دباؤ کے ماتحت کیا ہے۔ اس میں صرف ایک استثنیٰ درآمد پر عمومی محصول ہے۔ حکومت برطانیہ کا طریق کار یہی رہا ہے اور اس کے ایک اقدام سے کسی دوسرے مسئلہ پر یا برطانی معیشت پر جو اثر ہوا ہے، اس نے اس پر کبھی غور ہی نہیں کیا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کی تقریباً تمام تدابیر محدود کن تھیں ——— خواہ ان کا مقصد پیداوار اور روزگار کی توسیع ہی بتایا گیا ہو۔ یہ امر اس کی زراعتی تدابیر میں سب سے زیادہ نمایاں ہے، ان تدابیر سے ملکی پیداوار تو بڑھ گئی مگر درآمد غیر متناسب مقدار میں گھٹ گئی۔ کوئلے اور فولاد کی پالیسیوں میں بھی یہی چیز صاف نظر آتی ہے۔ صارفوں کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ حکومت کی تمامتر حکمت عملی یہ رہی ہے کہ رسد کو گھٹا کر پیدا کاروں کے منافعوں کو قائم رکھا جائے۔

یہ اعتراض حکومت کی مالیاتی پالیسی پر عائد نہیں ہوتا۔ ۱۹۳۱ء تک برطانیہ تقلیلِ زرنگی پالیسی پر

سختی سے کاربند تھی، مگر طلائی معیار کے تعطل کے بعد اس کی پالیسی معقول حد تک توسیع زر کی ہو گئی۔ ۱۹۳۳ء میں جو معیشی بحالی رونما ہوئی ہی وہ کسی تجارتی یا پیداواری منصوبہ بندی کا نتیجہ نہیں، بلکہ یہ سب کچھ حکومت کی نئی مالیاتی پالیسی کی رہین منت ہی۔

میں یہ نہیں کہتا کہ حکومت کو کوئی دوسرا رستہ اختیار کرنا چاہیئے تھا۔ جیسا کہ میں پہلے بھی واضح کر چکا ہوں۔ محض زر ہی ایک ایسی شے ہی جس کی رسد کو سرمایہ دار نظام اگر زیادہ کر دے تو اس کا اجزا نقصان دہ ثابت نہیں ہوتا۔ کیونکہ تمام عملی مقاصد کے لئے زر کی پیداوار پر کوئی لاگت نہیں اٹھتی۔ توسیع زر شرح سود کو تو کم کر سکتی ہی، مگر اس طرح اکثر بڑے بڑے قرضوں کا سارا سود بھی ادا کر دیا جاتا ہی۔ کسی بھی دوسری چیز میں یہ بات موجود نہیں۔ ارزانی کے زمانے میں پیدا کرنے والوں کو صرف پیداوار گھٹانے سے فائدہ ہو سکتا ہی۔ اس میں کچھ مستثنیات بھی ہیں، جب کسی شے پر بہت کم لاگت آتی ہو، تو مانگ کے بہت زیادہ لچکدار ہونے کی صورت میں وہ کافی مقدار میں پیدا کی جاتی ہی۔ لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہی اور کساد بازاری کے دور میں تو یہ بہت ہی شاذ ہی۔ اس لئے جو کلیہ اوپر بیان کیا گیا ہی وہ صحیح ہی۔

۱۹۳۱ء کے بعد کا برطانی تجربہ دو چیزیں ظاہر کرتا ہی۔ یہ بتاتا ہی کہ سرمایہ دار نظام میں پیداواری اور تجارتی منصوبہ بندی خریدار کے نقطۂ نگاہ سے لازمی طور پر محدود کن اور تقریباً جانبدارانہ اور بے ربط ہوتی ہی۔ اس کے محدود کن ہونے کی وجہ یہ ہے کہ سرمایہ دار نظام میں جب تک منافع کی امید پھر سے نہ پیدا ہو معیشی بحالی عمل میں نہیں آتی۔ اس کی جانبداری کا سبب یہ ہی کہ یہ مسئلے کے ہر پہلو پر مخصوص مفادات کے نقطۂ نظر سے نگاہ ڈالتی ہی اور ان مفادات کے لئے منافعوں کی صورت نکالنا چاہتی ہی۔

لیکن یہ ظاہر ہی کہ جانبدار اور محدود کن منصوبوں" کا کوئی مجموعہ ایک منظم معیشت پیدا نہیں کر سکتا۔ اور حقیقت تو یہ ہی کہ منصوبے ایک دوسرے کو مدد بھی نہیں پہنچا سکتے، کیونکہ ہر جانبدار تجویز دوسری تجویز سے ٹکر کھاتی ہی۔ منصوبہ بندی کا حقیقی مطلب یہ ہی کہ دستیاب پیداآور ذرائع سے ایک نظم کے ماتحت زیادہ کام لیا جائے جس سے پوری کھپت بڑھ سکے۔ اس کے معنی کم ذرائع کے بجائے زیادہ ذرائع کا استعمال ہی، اور اس کا مقصد عمومی فلاح ہوتا ہی۔ لیکن ۱۹۳۱ء کے بعد برطانیہ نے جو منصوبہ بندی" پیش کی ہی وہ اس کمعلی [illegible]

طور پوری نہیں اترتی۔

مگر سرمایہ دارانہ زاویۂ نگاہ سے اس محدود کن اور سماج دشمن نظام نے برطانوی معیشت کو بحال کر دیا ہو۔ یہ امر واقعہ ہو کہ اس بحالی نے لاوارث علاقوں اور کوئلے اور کپڑے کی بڑی بڑی غیر منظم صنعتوں کے مسائل کو تقریبا چھوا تک نہیں، مگر باقی میدانوں میں کافی بحالی رونما ہوگئی ہو مگر میں تو یہ کہوں گا کہ یہ بحالی بھی عالمگیر قوتوں کا نتیجہ ہو جس کا فائدہ اب برطانوی مصارف اٹھا رہے ہیں اور اس بحالی میں اگر کسی برطانوی عمل کا بھی کچھ ہاتھ ہو تو وہ یہاں کی توسیع زر کی پالیسی ہو جس کے اثرات محدود کن نہیں ہیں۔

تاہم یہ عیاں ہو کہ جہاں تک برطانیہ پہنچ چکی ہو توسیع زر اس سے آگے نہیں جا سکتی۔ شرح سود کم ہونے کی بنا پر مکانوں کی تجارت خوب زوروں پر تھی، مگر ۱۹۳۶ء میں اس کی گرم بازاری ختم ہوگئی اور منافع باز مالکان مکانات نے مکانوں کے جو نمونے نفع بخش سمجھے تھے ان کی مانگ اکثر علاقوں میں بالکل ختم ہوگئی مگر نئی اسلحہ سازی کے زیر اثر دولت آفریں تعمیرات شروع ہوگئیں جس کی وجہ سے عمارت سازی میں کچھ اہم کمی نہ آئی۔ مگر اس تبدیلی کے زیر اثر برطانوی معیشت اپنی صنعت کو قائم رکھنے کے لئے جرمنی کی طرح نئی اسلحہ سازی پر انحصار رکھنے لگی، اگرچہ برطانوی معیشت کا یہ انحصار جرمنی سے بہت کم تھا۔ زراعت میں دوہری مشکل کا سامنا تھا۔ پیداوار صرف قیمت بڑھانے سے زیادہ ہو سکتی تھی اور خریداری صرف قیمت گھٹانے سے بڑھ سکتی تھی۔ منڈیوں کے متعلق مختلف تجاویز پر عمل کیا گیا۔ جب وہ سب کی سب ناکام رہیں، تو یہ مشکل اور نمایاں صورت اختیار کر گئی۔ پسماندہ علاقوں کے بارے میں حکومت بے بس تھی۔ یہاں تو قیمتیں بڑھا کر صنعت کو ترقی دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور کابینہ کے وزیروں کے دماغوں کو اس کے سوا اور کوئی راستہ سوجھتا بھی نہ تھا۔ ایک بڑے پیمانے پر بحالی عمل میں آچکی تھی، لیکن یہ نامکمل بھی تھی اور خطرناک بھی۔ کیونکہ پیداوار کو کچھ اس طرح موڑا جا رہا تھا کہ ایک طرف تو یہ دنیا کے غیر معمولی حالات کے موافق ہو جائے اور دوسری طرف اسلحہ ساز صنعتوں کے لئے بھی مفید ثابت ہو۔ یہ بھی ظاہر تھا کہ اگر اسلحہ ساز صنعتوں کو زیادہ عرصے تک جاری رکھا گیا تو یہ تباہ کن ثابت ہوگا۔ اور اگر انھیں جلدی ہی بند کر دیا گیا تو یہ روزگار و منافع کے لئے بربادی کا باعث ہوگا۔

یہ بھی سچ ہے کہ پیدا کاروں کو ان کی محنت و مشقت کی پوری اجرت ملنی چاہیئے۔ چنانچہ جب حکومت نے دیکھا کہ سستے بھاؤ چیزیں بیچنے سے پیدا کاروں کو بہت ہی کم نفع ہوتا ہے تو حکومت ان کی مصنوعات کو مہنگا کرنے میں حق بجانب تھی۔ اور میں یہ مان چکا ہوں کہ جو حکومت نفع کی ہمہ گیری کی قائل ہو اس کے لئے اور کوئی چارہ کار ہی باقی نہیں رہتا۔ مگر حکومت ایک چیز کر سکتی تھی، جسے کرنے سے عملاً انکار کر دیا۔ یہ چیز تقسیمی لاگتوں کے مسئلہ کو حل کرنا تھا۔ یہی وہ چیز تھی جو منڈیوں کے پہلے قانون کو تکمیلی حیثیت دینے کے لئے ڈاکٹر ایڈیسن کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس کے جانشین میجر ایلیٹ نے اس کے مجوزہ مسودہ قانون کو اپنانے کے بجائے درآمد پر پابندیاں لگانے کی محدود کن حکمت عملی اختیار کی تاکہ ملکی اشیاء کی قیمتیں قائم رہ سکیں۔

یہ سب جانتے ہیں کہ جب کچی اور مشینی چیزوں کی تھوک قیمت میں نمایاں کمی آجائے تو تقسیمی لاگتیں لازمی طور پر زیادہ ہوتی ہیں۔ مگر اشیائے خوراک کے بارے میں ڈاکٹر ایڈیسن کی پالیسی کیوں جاری نہ رکھی گئی؟ اس کا جواب صاف ہے۔ تقسیمی مفادات بھی سرمایہ دار مشین کے کل پرزے ہیں اور آج کل بہت اہمیت حاصل کر چکے ہیں۔ جو حکومت سرمایہ داروں کے منافع بڑھانے کی علمبردار ہو وہ جس طرح کوئلہ کی کانوں کے سرمایہ دار مالکوں اور فولادی کارخانہ داروں کے مفاد پر حملہ نہیں کر سکتی، اسی طرح وہ پرچون اور تھوک تقسیم کرنے والوں کے طریق کار کی لغویت کے باوجود ان پر ضرب لگانے کو آمادہ نہیں ہو سکتی۔ پیدا کاروں اور صارفوں کی قیمتوں کے اختلاف کو کم کرنے کا جب یہ طریقہ ٹھکرا دیا جائے تو ایک ہی راہ باقی رہ جاتی ہے ——— پابندیوں کی! ——— یہی راہ دودھ اور دوسری منڈیوں کے متعلق اختیار کی گئی تھی جب تک سرمایہ داری پابرکاب ہو معیشت کا گھوڑا سرپٹ نہیں دوڑ سکتا یہ صرف ٹھہر ٹھہر کر قدم اٹھا سکتا ہے تاکہ کہیں سوار ہی دھڑام سے زمین پر نہ آرہے۔

اکرام قمر ایم۔اے

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ تقلید ہماری عادت ہو گئی ہے۔ ہر چیز میں دوسروں کی نقل اور پیروی ہی ہمارا طریقہ بن گیا ہے۔ اور واقعہ تو یہ ہے کہ یہ بالکل غلط بھی نہیں، اس لئے کہ ہم ایک دورِ تغیر سے گذر رہے ہیں اور ایسے زمانے میں تمدنی ملاپ کی کوششیں فائدہ ہی پہنچاتی ہیں۔ اور یوں بھی ایک نئے دور میں سماج کی نئی تنظیم کی ضرورت بھی واقع ہوتی ہے تاکہ رسوم و رواج اور وقت کا میل ہو جائے۔ چونکہ بغیر یکسانیت اور ایکے کے سکون و اطمینان غیر یقینی رہتا ہے۔ تقلید کے سلسلے میں ذرا غور کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ ہمارا یہ رہن سہن اور سماجی بندھن تقلید ہی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور قائم رہتا ہے، اور جب اس حقیقت کو مان لیا جائے تو اس میں شبہ کی گنجائش نہیں کہ تقلید کو برا کہنا بڑی حد تک درست نہیں۔

علم سماج کے ماہروں نے سماج کی بناوٹ کا مدار اسی پر بتلایا ہے، نظری اعتبار سے قطع نظر عملی کسوٹی پر اگر اس نظریہ کو جانچا جائے تو اس میں کھوٹ نہیں ملتی اور یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ بغیر تقلید کے انسان کا دنیا دار سماج میں داخل ہونا ناممکن ہے۔ یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ ملک کی جغرافی حالت معاشی کیفیت پر اثر انداز ہوتی ہے اور معاشی ماحول سماج کو متاثر کرتا ہے مثلاً ہندوستان جغرافی اعتبار سے نہایت زرخیز ملک ہے اور یہاں کی زرخیزی نے یہاں کی آبادی کی بڑی اکثریت کو کاشتکار بنا دیا اور زراعت یہاں کا عمومی پیشہ قرار پایا۔ کاشتکار اور کسان کا قسمت پرست ہونا لازمی ہے، وہ اس لئے کہ کاشتکار اپنی بساط بھر محنت و کوشش کے بعد آسمان پر نگاہیں جمائے خدا اور پرمیشور کے کرم اور کرپا کا طلب گار رہتا ہے اور فصل کا حال دریافت کرنے پر اس کے پاس یہی جواب ہوتا ہے کہ "پیش آنی ہے وہی جو اپنی پیشانی میں ہے" اس طرح ایک بڑی اکثریت کی تقدیر پرستی نے ملک کی ذہنی زد پر اثر ڈالا۔ برخلاف اس کے شمالی انگلستان میں کوئلہ اور لوہے کی کانیں ہیں اس لئے وہاں کی اس جغرافی کیفیت کا اثر وہاں کے پیشوں پر پڑا۔ آہنگری یعنی لوہاری اور صنعت بڑھی اور کاریگر جماعت نے بڑی اکثریت پیدا کر لی۔ مزدور کو چونکہ عمل پر اعتبار رہتا ہے اس لئے وہ تقدیر کا اس قدر

قائل نہیں ہوتا جتنا کہ ایک کاشتکار۔ لہٰذا اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جغرافی ماحول کا اثر پیشوں پر پڑتا ہے اور پیشوں کا اثر سماج کی ذہنیت پر۔ یہ اثر پڑنے کا سلسلہ ہی دراصل سماج کی زندگی ہے۔ اور یہ صرف تقلید کی وجہ سے قائم ہے۔ اس لئے تقلید کو کلیۃً برا کہنا اگر بالکل غلط نہیں تو بڑی حد تک صحیح بھی نہیں۔ کیونکہ سماج میں رہن سہن اور فیشن اور روایات کو قائم رکھنے کے لئے یہ نہایت ضروری ہے۔

ہمیں یہ تعلیم ملتی ہے کہ ہم سماج کے اصولوں کی پابندی کے سلسلے میں تقلید کریں۔ مخالفت کی صورت میں تین قسم کی سزائیں دی جاتی ہیں یعنی جسمانی معاشی اور روحانی۔ جسمانی سزا کی واضح مثال مارپیٹ ہے جو عموماً بچوں کے معاملہ میں پیش آتی ہے۔ اس کو ذرا پھیلا کر سمجھنے کے لئے ایک روزمرہ مثال کو ذہن نشین کرنا پڑے گا۔ ہمارے سماج یعنی حالیہ ہندوستانی سماج میں اپنے بڑوں بزرگوں کو آداب سلام کرنا ضروری ہے اگر کوئی بچہ اپنے کسی بزرگ کو سلام نہ کرے تو اس کا دوسرا بزرگ پہلے اس بچہ کو نصیحت کرے گا، سمجھائے گا، اس کا کوئی اثر نہ ہو تو ہدایت دے گا۔ یہ بھی بیکار جائے تو حکم سنائے گا اور اس کی بھی پروا نہ کی تو ڈانٹ ڈپٹ اور جسمانی سزا دے گا تاکہ وہ اس میں سماجی اصول کی تقلید میں تساہلی اور غفلت نہ کرے اور کسی نہ کسی خوف اور ڈر کی وجہ سے اس کی پیروی کرنے لگے۔ سماجی اصول سے لاپروائی کرنے والا کوئی بڑی عمر کا آدمی ہو اور اس کا یہ عمل گھر کی چاردیواری سے نکل کر پنچایت کی مرضی کے خلاف مان لیا جائے تو اس کا حقہ پانی بند کر دیا جاتا ہے۔ اس کو ذات اور پنچایت سے نکال دیا جاتا ہے اور جب وہ اصولوں کو تسلیم کر کے ذات اور پنچایت میں داخلہ چاہے تو ایک خاص رسم کی ادائیگی لازمی ہوتی ہے۔ اس طرح اس پر تاوان کی معاشی سزا عائد کی جاتی ہے۔ روحانی سزا کی مثال ہماری روزانہ زندگی میں غیر موجود نہیں۔ کسی سے ناراض ہو جانا یا کسی جماعت کے کسی فرد سے روٹھ جانا، سماجی مقاطعہ، اسی کی مثالیں ہیں۔ گویا اس طرح انسان بہ جبر و تشدد، تقلید کا سبق سیکھتا ہے۔

تقلید کے متعلق پہلا اصول یہ ہے کہ چھوٹے بڑوں کی تقلید کرتے ہیں۔ یہ صاف ظاہر ہے۔ ایک بچہ اپنے کسی بزرگ کے ہاتھ پر گھڑی دیکھتا ہے تو ضد کرنے لگتا ہے کہ اس کے بھی ہاتھ پر گھڑی ہو۔ اگر نقلی گھڑی اس کے ہاتھ پر لگا دی جائے تو وہ مطمئن ہو جاتا ہے۔ اس سے زیادہ روشن مثال یہ کہ گجرات میں پیدا ہونے والے بچے کا گجراتی جوستانی سے اثر لینا فطری ہے اور بنگال میں تربیت پانے والے بچے کا بنگالی [illegible] اصولوں پر چل پڑنا

ہونا کچھ غیر فطری نہیں۔ بچوں کے کھیلوں پر غور کیا جائے تو ایسے کھیلوں میں جہاں وہ اپنے بڑوں اور بزرگوں کے کام کاج کی نقل اتارنے میں پوری پوری تقلید کرتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً ایک وکیل کا لڑکا اگر اپنے اور ساتھیوں سمیت کھیل شروع کرے تو وہ کھیل وکالت خانہ کے منظر سے شروع ہوگا جہاں کوئی اس کا شریک وکیل رہوگا، کوئی منشی اور چند موکلین کا پارٹ انجام دیں گے۔ رسمی اور قانونی گفتگو میں وہ پوری کوشش سے اپنے باپ کی بول چال اور لین دین کے طریقوں کی نقل اڑائے گا۔ تقلید کا یہی جذبہ اس کے ارادے کی تعمیر کرتا رہتا ہے اور وہ اپنے باپ کے پیشے کو دوسرے پیشوں کے مقابلہ میں بہتر اور فائدہ مند خیال کرتے ہوئے اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے ــــ لڑکیوں کا کھیل گڑا گڑی کی شادی دراصل گھر کے کام کاج یعنی سینے پرونے اور کھانے پکانے وغیرہ کی عملی تربیت ہوتا ہے اور اس کھیل میں سماجی اصولوں کی پابندی پوری طرح کرائی جاتی ہے اور اگر کھیل میں کسی بڑی بوڑھی کی سرپرستی حاصل نہ ہو تو معلومات کی حد تک لڑکیاں خود نقل کرتی ہیں۔ اور جب کسی سے کوئی غلطی ہو جائے تو بحث چھڑ جاتی ہے اور لڑائی اسی پر ہوتی ہے کہ فلاں شادی میں ایسا نہیں ہوا تھا پھر یہاں یہ کیسے ہو سکتا ہے، فلاں خالہ جان یا نانی جان نے ایسا کیا تھا لہٰذا ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ گھر کے ماحول سے نکل کر باہر مدرسہ میں کم عمر طالب علموں کی نظر استاد پر رہتی ہے۔ استاد کے کردار اور اخلاق کا اثر طالب علم پر پڑتا ہے۔ اور یہ اثر محض جذبۂ تقلید کی کمی یا زیادتی سے کم یا زیادہ ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ اسی قسم کی بیسیوں مثالیں واضح کر سکتی ہیں کہ چھوٹے بڑوں کی ادنیٰ طبقے اعلیٰ طبقوں کی اور کم علم والے زیادہ علم رکھنے والوں کی تقلید کرتے ہیں۔ ہر دیہاتی شہر والوں کی تقلید کرنا شان سمجھتا ہے۔ شہر میں رہنے والے، جو اپنے آپ کو زیادہ سماجی اور متمدن سمجھتے ہیں دیہات کے اصول اور رواج کو بُرا نہیں تو کم از کم اچھا بھی خیال نہیں کرتے۔ چنانچہ ہم ایک زمانہ سے دیکھتے آئے ہیں کہ ہمارا کسان کھادی پہنتا ہے اور پیر میں ڈاسن بوٹ کی بجائے چپل اور سلیپر استعمال کرتا ہے لیکن اس وقت تک ہم اسے غریبی اور بے مائگی کی نشانی سمجھ کر اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے جب تک کہ ہندوستان کی عام ناداری افلاس اور ملک کی معاشی ضروریات نے ہمیں اس کا احساس نہ کرایا کہ ملکی صنعت کاری گری کی ہمت بڑھانے اور عام غربت و افلاس کم کرنے کے لئے ان کا استعمال نہ صرف ضروری [illegible] ہے جب بلا تخصیص فرقہ و ملت قومی دردمندوں نے اس خصوص میں قدم اٹھایا تب یہ عام [illegible]

آج ہم میں سے اکثر بڑے فخر و شان سے سادہ لباس استعمال کرتے ہیں یہ اس لئے نہیں کہ ملک کی حقیقی خدمت مقصود ہے بلکہ بالعموم اس لئے کہ حقیقی روشن خیال طبقہ کی تقلید منظور ہے۔

تیسری بات تقلید کے سلسلہ میں یہ بھی کہی جاتی ہے کہ محکوم، حاکمین کی تقلید کرتے ہیں۔ اس بیان کی تصدیق ہماری روزمرہ زندگی اور کسی ملک کی سماجی تاریخ کر سکتی ہے۔ ہندوستان کی تمدنی تاریخ کا طالب علم مغلیہ دور کے لباس اور رہن سہن کے متعلق امداد و شمار کی روشنی میں تحقیق کرے تو یہی نتیجہ پائے گا کہ بلا تفریق مذہب و ملت راجپوت افغان اور مغل وغیرہ شاہی لباس پہننا اسی طرح باعث عزت خیال کرتے تھے جیسا آج ہم میں سے اکثر مغربی دنیا کا لباس کوٹ پتلون پہننا سمجھتے ہیں۔

اس سلسلہ میں آخری بات یہ ہے کہ جس قدر نفس کو مسرت حاصل ہوگی اسی قدر تقلید کا دائرہ وسیع ہوگا۔ ہمارا موجودہ دوغلا تمدن اسی حقیقت کا آئینہ دار ہے:-

انسان پیدائشی طور پر آسانی پسند واقع ہوا ہے، ہر اک کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ آسانی سے اس کا کام نکل جائے افضل اور بزرگ و برتر شخصیتیں ہوتی ہیں جو مشکلات میں سے گزر کر اپنی کامیابی کا راستہ تلاش کرتی ہیں۔ لیکن اکثریت ایسا نہیں کرتی۔ چنانچہ تقلید کے سلسلہ میں بھی زیادہ سے زیادہ آسان اور خوشی بخشنے والے امور کو پیش نظر رکھا جاتا ہے ایسی ہی تقلید کو اندھی تقلید کہتے ہیں۔ ہماری سماج پر مغربی سماج کا گہرا اثر مترتب ہوا ہے چنانچہ آج کل تو ظاہری صورت میں ایک بڑی تعداد آسان اور مسرت بخش مغربی سماج کے اصول اختیار کئے ہوئی ہے۔ لباس کے سلسلہ میں دیکھئے مغربی تعلیم یافتہ حضرات سرکاری اداروں میں بڑی جائداد اور بڑے ماموں اور عوام کی نظروں میں ایک خاص حیثیت کے مالک ہوتے ہیں چونکہ یہ مغربی سماج میں رہ چکے ہوتے ہیں اس لئے ان کا مغربی تمدن سے قلبی اور روحانی تاثرات لینا ضروری نہیں تو کم از کم تعلیمی ضروریات کے لئے مغربی یونیورسٹیوں کے قواعد کی پابندی کی حد تک لازمی ضروری ہے۔ جب ایسے لوگ وہاں سے تعلیم حاصل کر کے یہاں آتے ہیں تو یہاں بھی اسی رہن سہن پر عمل کرنا اگر اپنی شخصی شان کے اظہار کے لئے نہیں تو عہدہ کی شان اور وقار کے لئے ضروری خیال کرتے ہیں۔ ان کے اس طریقہ سے نچلے لوگ اکثر اپنے نفس کے مطالبہ اور قلبی مسرت کے لئے اسی رہن سہن کو اختیار کرنے کے خواہش مند ہوتے ہیں جیسا کہ ان کے افسر اور اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کا طرز ہوتا ہے چونکہ دکھاوا اسپنداو انسانی فطرت کا خاصہ ہے اس لئے ایسا دکھاوے کی ضروریات کی طرف پہلے قدم اٹھایا جاتا ہے ان کی نقل کر کے خوشی حاصل کی جاتی ہے خاص انداز میں بالوں کی تراش جسمانی سجاوٹ، سنگھار کی تنا، ملاقات کی خاص قسم کی بناوٹ کی خواہش اسی طرز زندگی کی آزادی کا خیال وغیرہ ہی جذبۂ تقلید کا بخشا ہوا ہے۔ برخلاف اس کے ایسے امور جن پر عمل کرنے

کی صورت میں جو دقت محسوس ہوتی ہے، اکثر و بیشتر چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً مغربی سماج کی وقت کی پابندی کا خیال، تقلید
کی دھن میں ہاتھ پہ گھڑی تو باندھ لی جاتی ہے، میز کی خوب صورتی اور سجاوٹ کے لئے ایک خوبصورت ٹائم پیس خریدی جاتی ہے،
[illegible] ڈرائنگ کی مکمل زیبائش کی خاطر دیوار گھڑی لگائی جاتی ہے، مگر اس سے فائدہ بہت کم اٹھایا جاتا ہے۔
گھڑیاں خرید کر تقلید کے مسرت بخش جذبہ کی تکمیل تو کر دی گئی مگر فائدہ صفر کے برابر ہی رہا۔ یہی حال اخبار بینی اور مطالعہ کا
بھی ہے۔ کوشش یہ کی جاتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ خوب صورت کتابیں خوب صورت الماریوں میں رہیں لیکن ان کے
مطالعہ کی نوبت بہت کم آتی ہے اور بعض صورتوں میں تو کبھی نہیں آتی۔ گویا قومی دولت کا یہ جز تعیشانی دولت بن کر
قوم کے سرمایہ کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اخبار بینی کے سلسلہ میں بالعموم ریل کے سفر کے دوران میں دیکھا گیا ہے کہ اکثر حضرات
جو تقلید کے اس نمائشی پہلو سے متاثر ہیں اپنے ہم سفر نئے دوستوں پر رعب جمانے کی خاطر کوئی اخبار خرید لیتے
ہیں۔ غرض کہ اس قسم کی بیسیوں مثالیں ہمیں ملتی ہیں —— عورتوں کی آزادی کا خیال مغربی سماج کی ذہنیت
کا عکس ہے جو نقلی حد تک جوں کا توں اتار لیا گیا اور تعلیم یافتہ طبقہ میں عورتوں کی بے پردگی کو عورتوں کی آزادی سمجھ کر
نسوانی آزادی کے اصلی مفہوم پر پردہ ڈالا گیا ہے۔ اس طرح سمجھ کی اس غلطی نے کم تعلیم یافتہ طبقہ میں دو جماعتیں
پیدا کر دی ہیں گویا اس طرح بغیر سمجھے بوجھے مغربی ممالک کے رہن سہن کی نقل ہمارے یہاں سماجی کش مکش
کی موجب بنتی جا رہی ہے۔ اس لئے تقلید کے سلسلہ میں افادہ کا سوال پیدا کیا جانا ضروری ہے۔ اگر کوئی عمل
سنجیدہ غور و فکر کے بعد ہمارے سماج کے حق میں مفید ثابت ہو تو اسے اختیار کیا جائے ورنہ اگر رواج
کے امکانات پیدا ہو گئے ہوں تو انھیں دور کرنا ہمارا فرض ہے۔ یہ ہماری سماجی ذمہ داری ہے۔ اس میں شک
نہیں کہ ہمارے موجودہ سماج میں جس میں قدامت پرستی کے اجزا اب بھی کارفرما ہیں، اصلاحی کوششوں
کی کافی گنجائش موجود ہے لیکن یہ بھی غلط نہیں کہ اگر اصلاحی تغیر کے بجائے اندھی تقلید جاری رہی تو یقین
ہے کہ ہم ادھر کے رہیں گے نہ ادھر کے۔

عاقل اورنگ آبادی۔ ایم اے (عثمانیہ)

سرمایہ داری اور مزدوری کی کش مکش

کا اسلامی حل

سرمایہ دار اور مزدور کی کشمکش کا مسئلہ اب ایک فرسودہ مسئلہ ہوگیا ہے۔ آجر اور مزدور ہر زمانے میں رہے ہیں اور ایک قسم کی بدمزگی ان دونوں میں ہمیشہ سے رہی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اسلام نے اس [illegible] کش مکش کا کوئی حل پیش کیا ہے یا نہیں۔ کچھ قوانین بنائے ہیں یا نہیں۔ یہاں ہی سے بحث ہے۔ جہاں تک ان دونوں میں فضیلت کا تعلق ہے۔ سرمایہ میں یہ طاقت ہے کہ مزدور کو اپنی طرف راغب کرے۔ یا یہ کہنا [illegible] موزوں ہوگا کہ سرمایہ ہی مزدور کو پیدا کرتا ہے۔ اگر سرمایہ نہ ہوتا تو مزدور کے وجود کی کوئی دوسری صورت [illegible]۔

برخلاف اس کے مزدور کیا ہے؟ مزدور ہی سرمایہ کی پیدا کردہ ایک شے لیکن وہ شے اس کی جو [illegible] ہے اور ایسا جزو ہے کہ اس کا الگ کرنا ناممکن ہے اگر مزدور نہ ہو تو سرمایہ نہیں۔ اس کی حیثیت ایک [illegible] ہے۔ مزدور نے سرمایہ کو وہ رتبہ بخشا کہ لوگ اس کو پوجنے لگے۔ اسی کی بدولت اس کی قدر و قیمت جتنی تھی اس سے ہزار گنا زیادہ ہوگئی۔ جو رتبہ اور جو قدر سرمایہ کو مزدور سے حاصل ہوتی وہ مزدور کے علاوہ ہرگز حاصل نہ ہوتی۔ مزدور میں ایک پوشیدہ طاقت بھی ہے جس سے وہ سرمایہ کو برباد کرسکتا ہے اور بجائے اس کے کہ وہ سرمایہ کا غلام ہو وہ اس کو اپنا غلام بنا سکتا ہے۔ سرمایہ بذاتِ خود مزدور کو مزدور نہیں کرسکتا اس لئے ہر صورت میں ہم مزدور کو سرمایہ پر فضیلت دیں گے۔ اور اگر افضل نہیں تو برابری کا دعویٰ ضرور کریں گے لیکن موجودہ خراب زمانہ میں سرمایہ دار مزدوروں پر اسی قدر فضیلت رکھتے ہیں جتنا کہ خدا اپنے بندوں پر (معاذ اللہ)۔

سرمایہ کو اسلام نے بھی بڑی اہمیت دی ہے کیونکہ انسان کی تمام ضروریات [illegible]

[illegible]

تہذیب اور تمدن غرض سب کا منبع یہی ہے۔ دولت کے بغیر انسان کچھ نہیں کر سکتا ہے۔ مذہبی فرائض بھی بخیر و خوبی اسی سے سرانجام ہوتے ہیں۔ مساجد اسی سے تعمیر ہوتی ہیں، حج اسی سے ہوتا ہے، زکوٰۃ اسی سے دی جاتی ہے۔ گنبد خضریٰ کی زیارت اسی کے توسط سے ہوتی ہے تجارت فروغ پاتی ہے آبرو قائم رہتی ہے رزق ملتا ہے۔

"اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا"۔

لوگ غلط سمجھتے ہیں کہ اسلام نے مال کی تمام تر تنقیص کی ہے۔ اس مال کو بُرا کہا ہے جو ناجائز کاموں میں صرف ہو اور یوں تو جا بجا دنیا کی بُرائی بھی کی ہے لیکن یہی "مزرعۃ الآخرت" ہے اور میرے خیال میں اس مزرعہ کے اہم تخموں میں دولت بھی ہے۔ مال بُرا نہیں اس کا استعمال اسے برا کر دیتا ہے اسلام نے بجا طور پر اسے "زینت حیات" "قیام معیشت" اور "فضل و رحمت" کے نام سے موسوم کیا ہے، بے زر ابلے پر ہے اس کے بغیر کوئی کچھ نہیں کر سکتا حضور نبی کریمؐ نے سب سے پہلے مدینہ منورہ آ کر اس کا اہتمام کیا تاکہ افواج تیار ہو سکیں۔ اسلام کا منشا یہی ہے کہ اس دولت سے دنیا اور دنیا والوں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے یہ ایک جگہ نہ ہو اور بیکار پڑی نہ رہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلام نے دولت جمع کرنے کی بھی مخالفت کی ہے۔ اور ہمیشہ اس بات کی ترغیب دی ہے کہ دولت جو ایک مسلمان کماتے ہمیشہ نیک راہ میں صرف ہو اسلام نے یہ ضرور کہا ہے کہ آدمی دولت مند ہو اور روپیہ حاصل کرے لیکن یہ ہرگز نہیں کہا کہ روپیہ کو ناجائز طریقے سے جمع کرے اور سرمایہ دار بنکر لوگوں پر ظلم کرے:-

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ۔

"جو لوگ سرمایہ داری میں پڑ گئے اور سونا چاندی کی انبار جمع کرتے چلے جاتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے دنیا والوں کے کام نہیں آتے انھیں قیامت کے روز شدید ترین عذاب ملیگا بخیلوں اور اللہ کے دئے ہوئے کو چھپانے والوں کا بھی بُرا حشر ہوگا"

دوسری آیۃ یہ ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ۔

"دیکھو مسلمانو! کہیں ایسا نہ ہو کہ تمھاری دولت تم کو خدا کی طرف سے غافل کر دے تم اسی کے ہو رہو اور اس کی راہ میں خرچ کرو" کتنی اعلیٰ تعلیم ہے کمانے خرچ کرنے بچانے اور بڑھانے و قومی مفاد پر خرچ کرنے کی تمام راہیں بتا دی گئیں ہیں۔ کمانے کی ترغیب کو افضل الجہاد اور افضل العبادات بتلایا ہے جمع کرنے کی اور غریبوں کا خون چوسنے کی ترغیب کو نہیں۔ ظاہر ہے کہ جب کمانے میں عبادت کا ثواب ملے گا تو مسلمان اس میں زیادہ سے زیادہ محنت کریں گے۔ ساڑھے ستانوے فیصدی گھر میں بچ رہے گا، اور ڈھائی فیصدی زکوٰۃ اللہ کی راہ میں دینے سے دنیوی آبرو بھی قائم رہے گی اور آخرت کا ثواب بھی ملے گا۔ کلام پاک میں دولت کو اٹھائیس جگہ افضل اکیس جگہ خیر اور بارہ جگہ حسنہ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اس سے خود بھی فائدہ اٹھائے۔ غریب مزدور بھی بھوکوں نہ مرے اور ملک کو بھی فائدہ پہنچے۔ کلام پاک کا بنیادی خیال دولت کے متعلق یہ ہے کہ دولت امتحان ہے، دولت انسانی زندگی کے امتحان اور آزمائش کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اس سے انسان زندگی بنا سکتا ہے اور تباہ بھی کر سکتا ہے۔ اس سے خیر حاصل ہوتا ہے اور شر بھی۔ اس کا غلط خرچ کرنا اور غلط کمانا دونوں بڑی بڑی لڑائیوں اور ریا بھی رشک و حسد کا سبب ہیں۔

سورۂ کہف میں خداوند تعالیٰ نے دو مثالیں بیان فرمائی ہیں۔ پہلی مثال میں یہ ذکر ہے کہ ایک شخص بہت متمول تھا اس کے پاس نہایت عمدہ باغ تھا یہ شکر گذاری تو کیا کرتا تھا لیکن ہمیشہ ادھر ادھر اکڑتا تھا اس کے دوست نے ایک دن اسے بہت سمجھایا کہ دیکھ خدا کی نافرمانی نہ کر کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک دن سارا باغ برباد ہو جائے لیکن دولت مند پر اس نصیحت کا کچھ اثر نہ ہوا کیونکہ وہ اپنے سرمایہ پر نازاں تھا خدا کا حکم ایسا ہوا کہ کچھ عرصے کے بعد آن کی آن میں باغ تباہ ہو گیا۔ دوسری مثال میں دولت دنیا کو زمین کی گھاس اور نباتات سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جب برسات ہو تو ان میں شادابی پیدا ہو جاتی ہے لیکن کچھ دنوں کے بعد یہ سب چیزیں خشک ہو جاتی ہیں اور انھیں ہوا ادھر ادھر اڑائے لئے پھرتی ہے۔ دولت اور سرمایہ دنیا کا آخری انجام یہی ہے مال اور دولت انسان کو صرف امتحان و آزمائش کی خاطر دیئے جاتے ہیں یہ چیزیں حقیقی معنوں میں ہماری [illegible] ایک وقت یہ مال جس کا سمجھا جاتا ہے اسی شخص کا [illegible] بن جاتا ہے

جس کے پاس جو دولت جمع ہو چکی ہو۔ اس لئے کبھی ہاتھ آئے تو انسان اس کے جمع کرنے کے درپے نہ ہو بلکہ اس سے جلد از جلد نیکی کمانا چاہیئے۔

اسی بنا پر کلام پاک میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ وَاَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ

"اپنی دولت اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ نیکی کرو بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کو عزیز رکھتا ہے"

یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ جو قومیں مال اور دولت کی قربانی نہیں کرتیں وہ ہلاک ہو جاتی ہیں اور جو قربانی کرتا ہے اس کا نام خدا کے محبوں میں لکھا جاتا ہے ایک مسلمان سرمایہ دار جو قرآن اور حدیث جانتا ہو کیا اس بات کی کوشش کرے گا کہ غریبوں کا خون چوس کر زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرے اگر وہ ایسا کرے تو اس کے مسلمان ہونے میں شک ہے۔ اسلام نے ہر جگہ اس بات کی تلقین کی ہے کہ مسلمان نیک کام میں روپیہ صرف کرے اور دوسرے مسلمان کے لئے آرام کا باعث ہو۔ اسلام ایسے شخص کو ملعون سمجھتا ہے کہ جو ناجائز طریقوں سے غریبوں کو ستا کر روپیہ جمع کرے۔ جیسا کہ موجودہ دور کے سرمایہ داروں کا عام رویہ ہے۔

ہمیشہ ہر قوم اور ہر ملک کی یہ حالت رہی ہے کہ ملک کا مختصر حصہ دولت مند اور سرمایہ دار ہوتا ہے اور اس ملک کا بڑا حصہ غریب اور مفلس۔ سرمایہ دار دولت کی طاقت سے غریبوں کو ستاتے ہیں مجبور رکھتے ہیں۔ ان سے جفاکشی اور محنت کا کام لیتے ہیں لیکن ان کی اور ان کے اہل و عیال کی ضرورت کے قابل معاوضہ نہیں دیتے۔ ان غریب محنت کرنے والوں کی محنت سے بہت کچھ نفع حاصل کرتے ہیں نا جائز عیش و عشرت میں صرف کرتے ہیں لیکن مزدوروں کا پورا حق المحنت نہیں دیتے۔

دولت مندی فی نفسہ بُری چیز نہیں ہے تمدن اور معاشرت کی ترقی کا ایک جز۔ سرمایہ بھی ہے دولت خدا کا فضل اور سرمایہ داری خدا کی نعمت ہے وہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ سرمایہ کے ساتھ ساتھ کبر و غرور اور ظلم بھی آتا ہے جو دنیا کی بدترین لعنت ہے۔ اور اسی کو اسلام نے منع کیا ہے ہمیشہ اور ہر زمانے میں دولت مندی کے ان تلخ نتائج کو روکنے کی ہر زمانے کے عقلا نے کوشش کی مگر خدا [illegible]

حتیٰ کہ بڑے بڑے مفکر یہ کہنے لگے کہ دنیا غریبوں کے رہنے کی جگہ نہیں یعنی ان مظالم کا سدّباب ناممکن ہو۔ موجودہ مفکرین کی ایک جماعت اس نتیجہ پر پہنچی ہو کہ اصلاح کا طریقہ صرف یہ ہو کہ سرمایہ داری کو ختم کردیا جائے اور اقتصادی مساوات کو قائم کیا جائے۔ مگر میرے نزدیک تقسیم دولت کی یہ مساوات جس قسم کی بھی ہو اسلام کے نقطۂ نظر سے غیر مستقل ناقابل عمل بلکہ مضر ہو اسلام ان تحریکوں کو پسند نہیں کرتا۔

اقتصادی مساوات کی اب تک صرف دو صورتیں ظہور پذیر ہوئی ہیں اول یہ کہ ملک کے جمیع اموال قابل انتفاع میں اباحت مطلقہ ہو یعنی جس شخص کو جس چیز کی حاجت ہو اس کو اس سے کوئی نہ روک سکے۔ لیکن اس صورت کا بارہا تجربہ ہو چکا ہو اباحت مطلقہ کے ساتھ نظم ملک ناممکن ہو۔ اور نظم نہ ہو تو تباہی بھی لازم ہو۔ دوسری شکل یہ ہو کہ ملک کی کوئی قابل انتفاع چیز کسی کی ملک خاص نہ ہو۔ بلکہ سب چیزیں اہل ملک کی مشترک ملکیت ہوں جیسا کہ سوشلزم اور بالشوزم کا مشترک اصول ہو اس صورت میں نظم حکومت ممکن ہو لیکن استقلال ناممکن۔ اس لئے کہ ملک کی ساری دولت اور پوری قوت عملاً ایک حکومتی طبقے کے ہاتھ میں آجائے گی اور ملک کا غریب طبقہ ویسا ہی کمزور اور دوسروں کا محتاج رہیگا بہت ممکن ہو کہ فوری طور پر غربا۔ اور مزدور پیشہ لوگوں کی حالت سنبھل جائے اور ان کو بہت سے مصائب سے نجات حاصل ہو جائے۔ بلکہ بظاہر اقتصادی مساوات قائم ہو بھی جائے تو یہ چیز ایک ملک یا ساری دنیا کے لئے ہرگز مفید ثابت نہیں ہو سکتی بلکہ فطرت انسانی اور منشاء الٰہی کے خلاف ہوگا۔ دنیا کا تمام کام اختلاف مراتب کی وجہ سے چلتا ہو اقتصادی فرق ہی وہ چیز ہو جس کی بدولت انسان بڑے سے بڑے مشکل اور خطرناک کام انجام دیتا ہو۔ اسی فرق کی وجہ سے سخت سے سخت دماغی اور جسمانی جدوجہد پر مجبور ہوتا ہو اور یہی جدوجہد اور مسابقت ہر طرح کی علمی اور صنعتی ترقی کا ذریعہ بنتی ہو۔ اگر فرق مراتب اور یہ اختلافات مٹا دئے جائیں تو علمی کاموں کی تکمیل و تحریک بالکل ناممکن ہو جائے اسلام نے انسان کے فرق مراتب کو جائز رکھا ہو اور سرمایہ داری کو بھی جائز رکھا ہو لیکن اس کے مذموم اثرات کو روکنے کا ایسا مکمل انتظام کردیا ہے جو نہ سوشلزم سے ہو سکتا ہو اور نہ کمیونزم سے۔

جس طرح سائنس فی نفسہٖ مذموم چیز نہیں بلکہ انسان انسانی قوت ... اور صنعت

کی ترقی کا بڑا ذریعہ ہو لیکن جب اس چیز کو انسانی ہلاکت و تباہی کے لئے استعمال کیا جائے تو وہ دنیا کے لئے مصیبت اور قہر الٰہی بن جاتی ہو یہی حال سرمایہ داری کا ہو سرمایہ دار اگر اموال دنیا کو اچھے مصرف میں صرف کریں تو دنیا کو خوشحالی اور نیکی سے معمور کر سکتے ہیں۔ لیکن زیادہ تر یہ ہوتا ہو کہ سرمایہ دار مزدور طبقے کو مزدور ہی رکھنا چاہتا ہو۔ ایک طرف چند افراد کی عیش و عشرت اور کرم نما ظلم ہوتا ہو تو دوسری طرف کثیر تعداد کی غربت، بیکسی اور بیچارگی سود لینا انفرادی سرمایہ داری کا برا نا طریقہ ہو جس کے خلاف قرآن شریف میں بہت کچھ احکامات ہیں لیکن وہ مہاجنی کے متعلق ہیں۔

موجودہ دور میں بڑی بڑی ملوں کے باعث مزدوری اور سرمایہ داری کی کش مکش زیادہ بڑھ گئی ہو۔ اس کا آغاز انگلستان میں "صنعتی انقلاب" کے بعد سے ہوا یہ ایک قدرتی بات ہو کہ جب مشینوں کے ذریعہ کام شروع ہوگیا تو دستکاروں پر آفت نازل ہوگئی اور چھوٹے چھوٹے سرمایہ داروں کو اپنا کام بند کردینا پڑا اور افلاس و غارتگری کی مصیبت سے محفوظ اور پناہ گزیں ہونے کے لئے وہ مشینوں کے کارخانوں میں ایک "مزدور" کی حیثیت سے اپنی محنت کو کم سے کم قیمت پر بیچنے کے لئے تیار ہوگئے اور کارخانہ دار ہونے کی بجائے مالک مشین کے غلام بن کر رہنے کے علاوہ کوئی صورت نظر نہ آئی جب مشینوں کا دور شروع ہوا تو زمینداروں نے کاشت بھی مشینوں کے ذریعہ شروع کردی اور غریب کسانوں کی رہی سہی معاشی سبیل بھی اس طرح تھوڑے ہی عرصہ میں ختم ہوگئی اور اب ان کے لئے غلامانہ مزدوری کے علاوہ اور کوئی چارہ نظر نہ آیا اور پھر بھی ایک بڑی تعداد کی قوت لایموت کے لئے سامان مہیا نہ ہو سکا۔

صنعتی انقلاب کا یہ وہ ابتدائی زمانہ تھا جس میں فیکٹریوں کے متعلق نہ قوانین تھے اور نہ مزدوروں کی ترقی خواہ انجمنیں تھیں لہذا سرمایہ داروں نے من مانی حکومت کی اور اپنی دولت کی زیادتی کے لئے بے پناہ مظالم کئے ان سے چودہ۱۴ سے لے کر سولہ۱۶ سترہ۱۷ گھنٹے تک عموماً کام لیا جاتا تھا اس طرح ضعیف اور کمزور اشخاص بہت جلد موت کی نذر ہوجاتے تھے اور طرفگی یہ کہ بے پناہ محنت کرانے کے بعد ان کو کم سے کم اجرت دی جاتی تھی اور بود و باش کے لئے ایک ایسا کمرہ دیا جاتا تھا جو غلاظت سے پُر ہوتا تھا اور جن میں ایک آدمی بمشکل تمام لیٹ سکتا تھا مشینوں کے اختراع کے بعد سرمایہ داروں کے لئے

دولت اور روپیہ جمع کرنے کی بہت سی راہیں کھل گئیں اور وہ ملیں اور کارخانے قائم کرکے اپنی ہی جیسے بندگ
پر غریب اور مزدور پر خدائی کرنے لگا اس نے مزدوری کے نام سے ان کی جان ومال اور آبرو پر قبضہ کرلیا
اور ان انسانوں کو غلاموں کی طرح نہیں بلکہ حیوانوں کی طرح اپنے مفاد کے واسطے قربان کرنا شروع کردیا۔
زیادتی محنت، حق محنت کی کمی، عام حقوق انسانی سے محرومی کی یہ خراب وخستہ حالت دیکھنا ہو تو بمبئی
کلکتہ دہلی کانپور وغیرہ جیسے تجارتی مقامات میں جاکر دیکھئے ایک طرف سرمایہ دار کارخانوں کے مالکوں
کی فردوس نما کوٹھیاں ہیں اور دوسری طرف نجس اور غلیظ کواٹروں میں شہد کی مکھیوں کی طرح مزدور
آباد ہیں۔

لیکن قانون فطرت کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ انتقام لئے بغیر رہ سکے آخرکار مزدور اور سرمایہ دار
کے نام سے ایک جنگ شروع ہوگئی اور اس جنگ کے شعلوں نے سرمایہ دارانہ نظام کو جلاکر (خواہ وہ
تجربے کے طور پر کیوں نہ ہو) ایک نئے نظام کی بنیاد ڈالی۔

اسلام دین فطرت ہے اس کا نظام کسی انتقام یا ردعمل پر مبنی نہیں۔ بلکہ انسان کی فلاح اور بہبود کے
لئے ایک پیغام ہے اس لئے اس نے اپنے اقتصادی نظام میں ایسے مواقع پر بھی مذموم سرمایہ داری کی
حمایت نہیں کی بلکہ دولت اور محنت میں ایک ایسا توازن قائم رکھا کہ اس کش مکش کے لئے کوئی جگہ باقی
نہ رہی اسلام کو یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ سرمایہ دار مزدور کو کن راہوں سے تباہ کرسکتا ہے اس لئے
اس نے وہ راہیں بند کردیں اور ایسے اخلاقی سبق دئے کہ باہمی امداد کا وہ قانون جو انسان کی
فطرت اور طبیعت میں ودیعت کیا گیا ہے بغیر کسی رکاوٹ کے بخوبی چل سکا۔

عام مزدوروں کی شکایات کوئی نئی نہیں۔ وہی ہیں جو ظالم سرمایہ دار نے بیکس مزدور کو غریب
سمجھ کر ہمیشہ اس کے خلاف روا رکھی ہیں۔

مزدور مفلس ہے نادار ہے بیچارہ اور فاقہ کش ہے اس لئے اس کی حاجت مندی سے فائدہ اٹھاتے
ہوئے اس کی محنت کا صلہ ایک روپیہ ہونے کے باوجود سرمایہ دار اس کو چار آنے پر راضی کرلیتا ہے وہ
کم سے کم اجرت پر زیادہ سے زیادہ کام کرتا ہے۔ اس لئے کہ وہ بھوکا ہے تن اور پیٹ دونوں کے لئے

عاجز ہی سرمایہ دار خوش ہو کہ اس نے جبر نہیں کیا بلکہ مزدور اپنی خوشی سے اس پر آمادہ ہو گیا لیکن اسلام اپنے نظام میں غریب اور صاحب ضرورت کی اس رضامندی کو رضامندی نہیں تسلیم کرتا اور اُجرت کی کمی کی شکایت کو ظلم قرار دے کر اس کو باطل کر دیتا ہے فلسفیٔ اسلام شاہ ولی اللہ دہلوی فرماتے ہیں:-

فَاِنْ کَانَ الْاِسْتِنْمَاءُ فِیْهَا بِمَا لَیْسَ لَہٗ دَخْلٌ فِی التَّعَاوُنِ کَالْمَیْسِرِ اَوْبِمَا هُوَ تَرَاضٍ یُشْبِهُ الْاِقْتِصَابَ کَالرِّبٰو فَاِنَّ الْمُفْلِسَ یَضْطَرُّ اِلَی الْتِزَامِ مَالَا یَقْدِرُ عَلٰی اِیْفَائِہٖ وَلَیْسَ رِضَاہُ رِضًا فِی الْحَقِیْقَۃِ فَلَیْسَ مِنَ الْعُقُوْدِ الْمَرْضِیَّۃِ وَلَا الْاَسْبَابِ الصَّالِحَۃِ وَاِنَّمَا هُوَ بَاطِلٌ وَسُحْتٌ بِاَصْلِ الْحِکْمَۃِ الْمَدَنِیَّۃِ۔

"پس اگر مالی نفع ایسے طریقہ پر حاصل کیا جاوے کہ اس میں عاقدین کے درمیان تعاون اور عملی محنت کو دخل نہ ہو جیسے قمار بازی یا زبردستی کی رضامندی کا اس میں دخل ہو جیسے سودی کاروبار تو ان صورتوں میں بلاشبہ مفلس اپنے افلاس کی وجہ سے خود پر ایسی ذمہ داریاں عائد کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے جن کا پورا کرنا اس کی قدرت سے باہر ہوتا ہے اور اس کی وہ رضامندی حقیقی رضامندی نہیں ہوتی تو اس قسم کے تمام معاملات رضامندی کے معاملات نہیں کہلائے جا سکتے اور نہ ان کو پاک ذرائع آمدنی کہا جا سکتا ہے بلاشبہ یہ معاملات تمدنی حکمتوں کے اعتبار سے قطعاً باطل اور خبیث کمائی ہے"

مزدور کم سے کم قیمت پر زیادہ سے زیادہ کام صرف اپنے افلاس تنگ حالی اور فاقہ کشی کی خاطر منظور کر لیتا ہے اور اپنی بے چارگی سے مجبور ہو کر دس بارہ گھنٹے یا اس سے بھی زیادہ محنت کر کے سرمایہ دار کو خوش کرتا ہے تب جا کر بمشکل چار آنے کا حقدار ہوتا ہے لیکن اسلام نے ہر جگہ اس بات کی مذمت اور برائی کی ہے:-

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ ثَلٰثَۃٌ اَنَا خَصْمُهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَمَنْ کُنْتُ خَصْمَہٗ خَصَمْتُہٗ (الی) وَرَجُلٌ اسْتَاْجَرَ اَجِیْرًا اسْتَوْفٰی مِنْهُ وَلَمْ یُوْفِہٖ۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ تین قسم کے انسان ایسے ہیں کہ جن سے میں قیامت کے دن جھگڑوں گا اور جس سے میں جھگڑوں گا اس کو مغلوب و مقہور ہی کر کے چھوڑوں گا ان میں سے ایک وہ شخص ہے جو مزدور سے پوری طرح کام تو لیتا ہے لیکن اس کے مناسب اس کی اُجرت نہیں دیتا۔"

دوسری جگہ پر آیا ہے:-

وَلِيَسْتَعْمِلْهُمَا فِيمَا يَحْتَسِبَانِهِ وَيُطِيقَانِهِ بِلَا إِضْرَارٍ بِهِمَا۔

"کام لینے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ (آزاد ہو یا غلام) دونوں قسم کے اجیروں سے اس حد تک کام لے کہ وہ اچھی طرح کام انجام دے سکیں اور بقدر طاقت کام لینا چاہیئے اس طرح نہ لے کہ ان کو اتنی محنت کرنی پڑے کہ ان کی صحت وغیرہ کو نقصان پہنچے۔"

مزدور غریب ہوتا ہے اس کی ضرورتیں اس قدر زیادہ ہوتی ہیں کہ وہ جہاں کام دیکھتا ہے فوراً کرنے کو تیار ہو جاتا ہے اور اجرت صرف اس غرض سے طے نہیں کرتا کہ ممکن ہے ظالم سرمایہ دار ناراض ہو کر اس کو کام پر نہ لگائے اور غریب کی اس فوری ضرورت سے سرمایہ دار فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کو جس قدر کم اجرت چاہتا ہے دیتا ہے اسلام نے اس کو بھی ناجائز کہا ہے اور اس کو خیانت سے تعبیر کیا ہے:-

عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَى عَنِ الْاسْتِئْجَارِ الْأَجِيرِ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُ أَجْرَهُ۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمائی ہے کہ مزدور اور اجیر کو اس کی اُجرت طے کئے ہوئے بغیر کام پر لگایا جاوے۔"

مزدور کا حق محنت مقرر کر کے اس کی اُجرت نہ دینا اور دیگر رکاوٹیں پریشان کن تراکیب جبر و ظلم کے طریقے استعمال کرنے کی بھی اسلام نے سخت مخالفت کی ہے سرمایہ دار مزدور کو وقت پر اس معمولی اور حقیر حق محنت سے بھی فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں دیتے ہیں۔ اسلام نے ایسا کرنے کو بد معاملگی اور ظلم قرار دیا ہے اور بہت بڑا گناہ بتلایا ہے اور اپنے یہاں ایک لمحہ کے لئے بھی سرمایہ دار کے ظلم کو در گذر کرنا نہیں چاہا۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ مالداری کے باوجود دوسرے کے ادائے حق میں تاخیر کرنا ظلم ہے"

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مزدور کی مزدوری اس کے پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کردو"

یہ سب اقدام اسلام نے سرمایہ داروں کی زیادتی روکنے کے لئے اٹھائے ہیں لیکن اس کے ساتھ اسلام یہ بھی نہیں چاہتا کہ مزدور کی طرف سے پیش قدمی ہو اور وہ جس کا کام کرے اس کو دق کرے یا اس سے برسرپیکار ہو جس کا نتیجہ سوائے برائی کے اور کچھ برآمد نہ ہوگا۔

عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ خَیْرُ الْکَسْبِ کَسْبُ الْعَامِلِ اِذَا نَصَحَ ـ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہترین کمائی مزدوری کی کمائی ہے بشرطیکہ وہ خیر خواہی اور بھلائی کے ساتھ کام والے کا کام انجام دے۔"

اسلام نے اس طرح گویا آجر اور اجیر دونوں کے لئے ایسے قوانین پیش کئے جس سے دونوں کی کشمکش کے بغیر کام چلتا رہے۔

اسلام میں ایک بڑا کمال اور ہے کہ جو دوسرے مذاہب میں نہیں اس نے اقتصادی مساوات کو ضرور قائم نہیں رکھا لیکن مساوات انسانی پر بہت زور دیا ہے اسلام نے کبھی اس بات کی تعلیم نہیں دی کہ اگر کوئی امیر ہے تو اس کو غریب کے ساتھ کھانا نہ کھانا چاہئے بلکہ اس بات کو بہت بڑی لعنت قرار دیا ہے۔ مساوات اسلام میں اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اس کے بعد اس کا اختتام ہو جاتا ہے۔ مسلمین کی مساوات قیدیوں کے ساتھ دشمنوں کے ساتھ اور دیگر اقوام کے ساتھ اس طریقہ کی تھی کہ اگر اس کا ذکر کیا جاوے تو بذاتِ خود ایک کتاب بن جائے۔ فی زمانہ سرمایہ دار کو شریف اور مزدور کو ذلیل سمجھا جاتا ہے (حالانکہ اصلیت عموماً برعکس ہوتی ہے) اس قسم کی اخلاقی اور سماجی تفریق بھی نفسیاتی طور پر آپس کی کشمکش کو بڑی حد تک ابھارتی ہے۔

عہد جدید کا غریب اور مزدور یہ چاہتا ہے کہ اگر اس کو کوئی موقع ہاتھ آئے تو دولتمند سرمایہ دار کو اس دنیا سے ختم کردے۔ آج کل یہ سرمایہ داری اور مزدوری کی جنگ پورے زور شور کے ساتھ قائم ہے اور دنیا میں

مسائلات اقتصادی کی سعی لاحاصل کی جارہی ہو لیکن یہ دنیا کے نئے خاکے تیار کرنے والے جو نقشہ تیار ہی ہیں وہ انسانی فطرت اور طبیعت کے اس درجہ مخالف ہیں کہ ان کی دائمی کامیابی حد درجہ مشکوک ہو۔"

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اولی نے دنیا کی اس آنے والی مشکل کا اندازہ کر لیا تھا اور اس کے لئے یہ اصول زرین مقرر کر دئے تھے کہ سرمایہ کو چند اشخاص کے ہاتھوں میں جانے سے روکا جائے سود کو حرام قرار دیا۔ متروکہ جائداد صرف ایک ہی شخص کی ملکیت قرار نہیں دی۔ نفع عام کی چیزیں بجائے اس کے کہ چند اشخاص استعمال کریں جماعت کی ملکیت قرار دی۔ قیصریت اور شہنشاہیت کی بجائے جماعت کی حکومت قائم کی۔ زمینداری کا پرانا اصول جس میں کاشتکار غلام کی حیثیت رکھتا تھا تبدیل کر دیا اور اسکی حیثیت اجیر کی رکھی۔ انسانی فطرت کے خلاف یہ نہیں کیا کہ تمام سرمایہ کو لے کر ہر انسان میں برابر تقسیم کر دیا جاوے تاکہ دنیا میں کوئی ننگا بھوکا نہ رہے۔ غریب اور امیر کا امتیاز مٹ جائے بلکہ یہ کیا کہ سرمایہ دار سے جس کے پاس سال کے مصارف کے بعد رقم باقی بچ رہے، حکومت کی طرف سے ایک مقررہ رقم قانونی طور پر اس سے لے لی جائے اور حکومت اس کو قابل اعانت لوگوں کی دستگیری میں صرف کرے یہی وہ راز ہے جو اسلام کو اس کے تمدنی دور میں اقتصادی مشکلات سے محفوظ رکھ سکا۔ خلافت راشدہ کے عہد میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ کی حکومت کا دور وہ زمانہ ہے جب عرب میں دولت افراط کی حد تک پہنچ گئی تھی حضرت ابو ذر غفاری رضہ نے شام میں قرآن پاک کی اس آیت کے مطابق "کہ جو لوگ سونا چاندی گاڑ کر رکھتے ہیں وہ خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے" یہ فتویٰ دیا کہ دولت کا جمع کرنا حرام ہے اور ہر شخص کے پاس جو کچھ اس کی ضرورت سے زیادہ ہو وہ خدا کی راہ میں دے دے۔ اور شام کے دولت مند صحابہ نے اس کی مخالفت کی اور فرمایا کہ ہم خدا کی راہ میں دے کر بچاتے ہیں تو حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کی یہ آواز عام پسند نہ ہو سکی اور نہ عوام میں کوئی فتنہ پیدا کر سکی کیونکہ زکوٰۃ کا قانون پورے نظام کے ساتھ جاری تھا اور عرب کے آرام و آسائش کا یہ حال تھا کہ ایک زمانہ میں کوئی خیرات کا قبول کرنے والا باقی نہیں رہا۔"

اپنے مضمون کے اختتام پر یہ کہنا لازمی سمجھتا ہوں کہ اسلام نے سرمایہ داری اور مزدوری کی کشمکش

سرمایہ دار اور مزدور کی کشیدگی کا جو حل تبلایا ہے وہ بہترین ہے، کسی دوسرے مذہب کے قوانین اس کشیدگی کے متعلق اتنے موزوں اور مناسب نہیں مل سکتے۔ ملوں اور کارخانوں کی جدید ایجادات کے باوجود اس کا اقتصادی قانون جماعتی اور ملکی فلاح اور بہبود کے لئے اب بھی اتنا ہی مفید اور سچا ہے۔ اسلام حکم دیتا ہے کہ اس کے اقتصادی نظام میں سرمایہ کا استعمال مناسب طور پر اسی وقت ہو سکتا ہے جب حکومت ملکی رفاہ عام اور مفاد عامہ کو ملحوظ خاطر رکھ کر اس سے کام لے اور محض تونگر اور دولتمند اصحاب کو ایسے مواقع مہیا نہ ہونے دے کہ وہ غریب مزدوروں کو اپنی مشینوں کے پرزے سمجھ کر اپنے مفاد اور اغراض کا آلۂ کار بنائیں اور اس طرح افلاس اور تنگ دستی فقر و فاقہ عام ہو جائے اور چند مخصوص اشخاص میں دولت جمع ہو۔

سید خورشید احمد

مسلمانوں کے عہد میں کنٹرول سسٹم

جنگ کا اثر حیات انسانی کے ہر شعبہ پر پڑتا ہے۔ لیکن معاشی پہلو تقریباً سب سے زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ پیداوار کے کم ہونے۔ اور اس کے برخلاف خرچ کے بڑھنے اور چیزوں کے ضائع ہونے کا لازمی نتیجہ قیمتوں کا بڑھ جانا ہوتا ہے۔ گذشتہ جنگ عظیم میں اشیاء کا نرخ بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ موجودہ جنگ شروع ہوتے ہی اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی اشیاء کا نرخ بڑھ جائیگا۔ لیکن اس وقت اشیاء کی قیمتیں اس حد تک بڑھ گئی ہیں کہ شروع میں اس کا اندازہ کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ جوں جوں لڑائی بڑھتی گئی۔ اشیاء کی قیمتیں بھی اسی نسبت سے چڑھتی رہیں۔ گورنمنٹ نے اس مہنگائی کو روکنے کے لئے اشیاء کی قیمتوں پر کنٹرول کر دیا۔ لیکن اس کنٹرول نے بجائے صورت حال پر قابو پانے کے عوام کی مصیبتوں میں کسی نہ کسی صورت سے اضافہ کر دیا۔ اور اس طرح یہ کنٹرول سسٹم حقیقتاً بجائے فائدے کے باعثِ نقصان ثابت ہوا۔

ہندوستان کی تاریخ میں سب سے پہلے جس شخص نے مہنگائی کی مصیبت دور کرنے کے لئے یہ عمل پیش کیا۔ وہ علاء الدین تھا۔ اس کے بعد مختلف صورتوں میں یہ سسٹم قائم رہا۔ اور عموماً نہایت کامیاب اور رعایا کے لئے فائدہ مند ثابت ہوتا رہا۔

علاء الدین جس طرح تخت پر بیٹھا اور جس طرح اس نے امراء اور رعایا کو خوش کرنے کے لئے روپیہ کو پانی کی طرح بہایا اس کا لازمی نتیجہ خزانے کا نسبتہً کم ہو جانا تھا۔ ادھر مغلوں کے بار بار حملوں کی وجہ سے ملک کی حفاظت کے لئے ایک بڑی فوج کا رکھنا ضروری تھا۔ روپیہ کم اور ایک زبردست فوج کی ضرورت اس کا حل علاؤ الدین نے یہ چیزوں کی قیمتیں مقرر کر لے اور انھیں مقررہ قیمت پر بکوانے کی شکل میں پیش کیا۔ علاؤ الدین نے مغل فوج کی طرح اپنے سپاہیوں کی بھی تنخواہ کم کر دی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ چیزوں کی قیمتیں بھی مقرر کر دیں۔ تا کہ کم تنخواہ میں آرام سے گزارہ ہو سکے۔ اس طرح قیمتیں مقرر

ہونے سے ایک طرف ملک کو بیرونی حملوں سے نجات مل گئی۔ اور دوسری طرف پبلک خوش حال ہوگئی کیونکہ اب وہ بنیوں سے کے خون چوسنے والی قوم سے بہت حد تک نجات حاصل کر چکی تھی۔

قیمتوں کا مقرر ہونا صرف علاء الدین کے عہد حکومت تک محدود نہ تھا۔ بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ علاء الدین کے بعد اکثر بادشاہوں نے چیزوں کی قیمتیں مقرر کر دی تھیں۔ اور کوئی تاجر اس مقررشدہ قیمت سے زیادہ وصول نہیں کر سکتا تھا۔ اسلام میں ضرورت کی اشیاء خصوصاً غلہ کو اس وجہ سے بچا کر رکھنا کہ بعد میں اس پر زیادہ نفع حاصل کر کے بیچا جائے۔ حرام ہے۔ غیر شعوری طور پر یہ اسلامی اصول "احتکار" مسلمانوں کے نظام معاشیات میں کام کرتا رہا جس کی وجہ سے نہ تجار کو چیزوں کے ذخیرے جمع کرنے کی اجازت تھی۔ اور نہ ہی مقررشدہ قیمت سے زیادہ وصول کرنے کی۔

اب ہم مختلف زمانوں کی مقررشدہ قیمتوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اس مقابلے میں ایک بڑی مشکل یہ پیش آتی ہے کہ مختلف زمانوں کے سکے اور اوزان مختلف ہوتے تھے۔ بہرحال ہم انھیں موجودہ سکوں اور اوزان میں تبدیل کر کے مقابلہ کر سکتے ہیں۔ سب سے پہلے قیمت بحساب فی من لگائی جاتی ہے۔ لیکن اس میں یہ خیال رہے کہ پہلے زمانے میں من چودہ سیر کا ہوتا تھا جس کے یہ معنے ہوئے۔ جیسا کہ اس نقشے سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ چودہ سیر کی قیمت مختلف زمانوں میں موجودہ سکے کے لحاظ سے کیا تھی۔

قیمت بحساب فی من (چودہ سیر)

جنس	علاء الدین		فیروز تغلق		اکبر اعظم		موجودہ
	قیمت	قیمت حال	قیمت	قیمت حال	قیمت	قیمت حال	موجودہ قیمت
	جیتل	آنے	جیتل	آنے	دام	آنے	روپے آنے
گیہوں	۷ ½	۳	۸	۳ ¼	۱۲	۴ ¾	۳ - ۴
جو	۴	۱ ⅔	۴	۱ ⅔	۸	۳ ¼	۲ - ۱۳
شکر	۱۳	۵ ¼	۱۳	۵ ¼	۱۲۸	۳ روپے - ۴ ¼ آنے	۵ - ۱۱
نمک	۲	⅚	—	—	۱۶	۶ ¼	۱ - [illegible]
گھی	۱۶	۶ ⅔	۱۰۰	۲ روپے - ۸ ¼ آنے	۱۰۵	۲ روپے - ۱۰ آنے	۴۲ - ۰

اسی چیز کو ہم ایک اور نقشے سے ظاہر کر سکتے ہیں۔ جو شاید اس سے آسان رہے

وزن بحساب ایک روپیہ چال

جنس	علاء الدین	فیروز تغلق	اکبر اعظم	موجودہ زمانہ
	سیر	سیر	سیر	سیر
گیہوں	۵۶	۴۹	۵۰	۳
جو	۱۳۴ ۱/۴	۱۳۴ ۱/۴	۶۶	۵
شکر	۴۰	۴۰	۴ ۱/۲	۲ ۱/۲
نمک	۲۶۶	———	۳۳	۱۴
گھی	۳۴	۵ ۳/۴	۵ ۱/۳	۵ ۱/۳ چھٹانک

مندرجہ بالا نقشے کو ہم نسبتاً بھی ظاہر کر سکتے ہیں۔ یعنی جو چیز آج کل جس قیمت میں ایک سیر آتی ہے مختلف زمانے میں اسی قیمت میں وہ کتنی آتی تھی۔

جنس	علاء الدین	فیروز تغلق	اکبر اعظم	موجودہ زمانہ
گیہوں	۱۸ ۳/۴	۱۶ ۱/۴	۱۲ ۱/۲	۱
جو	۲۶ ۴/۵	۲۶ ۴/۵	۱۳ ۱/۵	۱
شکر	۱۶	۱۶	۱ ۴/۵	۱
نمک	۱۹	———	۲ ۱/۳	۱
گھی	۱۰۲	۱۸	۱۶	۱

علاؤ الدین اور اکبر کے زمانے میں مویشیوں کی قیمتیں بھی مقرر تھیں۔ علاؤ الدین کے زمانے میں گھوڑوں کی قیمت نسبتاً زیادہ تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ گھوڑوں کی ایک زبردست تعداد فوجیوں کے لئے وقف تھی۔ اور عام پبلک کے لئے گھوڑوں کی قلت تھی جس کا لازمی نتیجہ ان کی قیمتوں کا چڑھا جانا تھا۔

	علاء الدین		اکبر اعظم		موجودہ زمانہ
	قیمت	قیمت حال	قیمت	قیمت حال	موجودہ قیمت
گھوڑا	۸۰ ٹنکا	۱۳۲ ½ روپے	۱۰ اشرفی	۹۰ روپے	۴۰۰ روپے
گائے	۴ "	۶ ⅔ "	۱۰ روپے	۱۰ روپے	۶۰ روپے

موجودہ کنٹرول سسٹم اور اس زمانے کے کنٹرول سسٹم کا سب سے بڑا فرق یہ ہو کہ آج کل صرف ضروریات زندگی اور وہ بھی صرف چند کی قیمتیں مقرر کی گئی ہیں۔ لیکن علاء الدین اور اکبر کے زمانے میں تقریباً ہر چیز کی قیمت مقرر تھی۔ کپڑوں کی قیمت بھی مقرر کر دی گئی تھی۔ مندرجہ بالا نقشوں میں کپڑے کی قیمت صرف اس وجہ سے نہیں دکھائی گئی کہ آج کل کی قیمتوں سے اس کا مقابلہ بوجہ مختلف اقسام کے بہت مشکل ہو۔ بہر حال اور چیزوں کی قیمتوں سے کپڑے کی قیمت کا اندازہ کرنا زیادہ مشکل نہیں ہو۔

آئین اکبری میں نہایت تفصیل کے ساتھ ہر چیز کی قیمت دی ہوئی ہو۔ یہاں صرف چند اور چیزوں کی قیمتیں تحریر کی جاتی ہو تاکہ عام چیزوں کی قیمتوں کا اندازہ آسانی سے ہو سکے۔

نام جنس	قیمت فی من	با قیمت حال	نام جنس	قیمت	با قیمت حال
گندم	۱۲ دام	۴ر ۱۰ پائی	شکر	۹۰ دام	عہ ۴ر
چنا	۸ "	۳ر ۳ "	شکر سفید	۱۲۸ "	ے ۳ر ۳ پائی
جو	۸ "	۳ر ۳ "	شکر سرخ	۵۶ "	عہ ۶ر ۵ "
باجرہ	۶ "	۲ر ۵ "	گھی	۱۰۵ "	عا ۱۰ر
دھان	۱۱۰ "	عا ۱۲ر	تیل	۸۰ "	عہ ر
مونگ	۱۸ "	۷ر ۳ پائی	دودھ	۲۵ "	۱ر
ماش	۱۶ "	۹ر ۳ "	بز (بکری) ایک عدد	۶۴ "	عہ ۳ پائی
نمک	۱۶ "	۴ ۴ "	گوسفند (ایک عدد)	۶۵ "	۴ر

ملک کی خوشحالی کا دار و مدار صرف چیزوں کی قیمتوں کے کم ہونے پر منحصر نہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ

یہ معلوم کرنا بھی ضروری ہو کہ اس زمانے میں پبلک کی عام طور پر کیا آمدنی تھی۔ کیونکہ جب تک آمدنی کا حال معلوم نہ ہو۔ کسی زمانے کی عام خوشحالی کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اگر عوام کے پاس ضروریات زندگی اور سامان آسائش خریدنے کو دام ہی نہ ہوں تو چیزوں کا کم یا زیادہ قیمت پر بکنا کوئی معنے نہیں رکھتا۔ علاؤالدین کے زمانے میں ہر سپاہی کی تنخواہ ۲۳۴ ٹنکا سالانہ (۲۰ روپے ماہوار) مقرر تھی۔ دو گھوڑوں کے خرچ کے لئے ہر سپاہی کو ۷۸ ٹنکا سالانہ اور زیادہ دئے جاتے تھے۔ فیروز شاہ کے زمانے میں عام ارزانی اس قدر تھی کہ کبھی کوئی چیز بھی مقررشدہ قیمت سے زیادہ قیمت پر نہ بکی۔ بلکہ مارکیٹ کا بھاؤ ہی طلب و رسد کے اصول کے مطابق وہی مقرر ہو گیا تھا۔ اور علاؤالدین کے زمانے کی طرح کبھی اس بھاؤ کو بزور منوانے کی نوبت نہیں آئی۔

اکبر کے زمانے میں لوگوں کی عام حالت کا اندازہ مندرجہ ذیل تنخواہوں سے ہو سکتا ہو۔

تنخواہ ماہانہ

افسران	۲۴۰ سے ۳۰۰ دام تک
بندوقچی	۱۱۰ سے ۲۵۰ " "
دربان	۱۰۰ سے ۲۰۰ " "
کہار	۱۲۰ " ۱۶۰ " "
جانوروں کے محافظ	۵ " ۳۰ روپے تک
احدی	۵۰ روپے
معمار	۵ سے ۷ دام تک روزانہ
بڑھئی	۵ سے ۶ " "
سنگتراش	۶ دام فی گز

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہو کہ وہ کونسی وجوہ ہیں۔ جن کی بنا پر علاءالدین وغیرہ کے زمانے میں کنٹرول سسٹم نہایت کامیاب رہا۔ اور حکومت اور رعایا دونوں کے لئے باعث رحمت ثابت ہوا۔ لیکن وہی کنٹرول سسٹم موجودہ زمانے میں ناکامیاب بلکہ موجب پریشانی بنا۔ اور اب کون سے غذائی اشتمال

کئے جائیں کہ جن سے کنٹرول سسٹم کامیابی کے ساتھ چلایا جا سکے۔ اور عوام ضروریات زندگی کی اس قدر زیادہ قیمت دینے کی بلا سے نجات حاصل کر سکیں۔

ہم سب سے پہلے علاء الدین کے کنٹرول سسٹم کو دیکھتے ہیں کہ وہ کس طرح بازار کے بھاؤ کو اپنے قبضے میں رکھتا تھا۔ اس زمانے میں مال گذاری بصورتِ جنس لے جاتی تھی۔ نہ کہ بصورتِ دام۔ سرکاری افسران پیداوار کا ایک خاص حصّہ کسانوں سے بطور مال گذاری کے کھیتوں ہی پر لے لیا کرتے تھے۔ اور باقی اناج اسی جگہ افسرانِ شاہی کی نگرانی میں ملتانی تاجروں کو فروخت کر دیا جاتا تھا۔ ہر کسان کو صرف دس من اناج ہر فصل پر رکھنے کی اجازت ہوتی تھی۔ اس سے زیادہ غلّہ بچانا جرم تھا۔ ملتانی تاجر تمام اناج سرائے عدل میں بقالوں کو فروخت کر دیا کرتے تھے۔ ہر محلّہ کے بقال مقرر تھے۔ اور انھیں صرف اس قدر اناج دیا جاتا تھا کہ اس محلّہ کے رہنے والوں کو ایک دن کی خوراک کے لئے کافی ہوتا۔ حکومت کی طرف سے ہر چیز کی قیمت مقرر تھی۔ اور ملتانی تاجروں اور بقالوں کو اسی نرخ پر اشیاء فروخت کرنی پڑتی تھیں۔ ورنہ وہ سزاؤں کے مستحق ہوتے تھے۔ سزاؤں کے خوف کے علاوہ اور بھی ذرائع تھے جن کی بنا پر انھیں مقررہ قیمت پر چیزیں فروخت کرنی پڑتی تھیں۔ ان کا ذکر ابھی کیا جائے گا۔

مال گذاری سے حاصل شدہ اناج کے لئے شاہی گودام بنوائے گئے تھے۔ ان میں اناج رکھنے کا اس قدر اچھا انتظام تھا کہ محمد تغلق کے زمانے میں ابن بطوطہ نے علاء الدین کے جمع کردہ چاولوں کا استعمال کر کے دیکھا۔ اور رنگ کے علاوہ اسے اُن میں اور کوئی فرق محسوس نہ ہوا۔ بازار کا بھاؤ بڑھ جانے پر بادشاہ ان گوداموں میں سے اناج بازاروں میں بھجوا دیتا تھا۔ اور اس طرح نرخ کو بڑھنے نہ دیتا تھا۔ اس کے علاوہ اس اناج کا ایک بڑا مصرف اسے غرباء میں تقسیم کرنا تھا۔

موجودہ زمانے کی طرح علاؤالدین نے یہ غلطی نہ کی تھی کہ چیزوں کی قیمتیں مقرر کر دیں اور ان کے مہیا کرنے کا کوئی انتظام نہ ہو۔ اس نے قیمت مقرر کرنے کے ساتھ ساتھ چیزوں کو پوری طرح مہیا کرنے کا انتظام بھی کیا۔ اور ان کے پیدا کرنے والے۔ بنانے والے اور فروخت کرنے والوں کو اپنے قبضے میں رکھا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اس نے مندرجہ ذیل طریقے اختیار کئے۔

۱۔ اشیاء کی قیمتیں مقرر کرنا۔
۲۔ ملتانی تاجروں اور بقالوں کے نام دیوانِ ریاست میں درج کرنا اور بغیر اجازت کے کسی چیز کا بیچنا ممنوع قرار دینا۔
۳۔ اناج لانے والے کاروانوں کو مخصوص اجازت نامے دینا۔
۴۔ ملتانی تاجروں کو ریاست کی طرف سے قرض دینا۔
۵۔ کسانوں کو اناج اور روپیہ قرض دینا۔
۶۔ سرائے عدل قائم کرنا جہاں ملتانی تاجر بقالوں کو ان کے محلے کی ضرورت کے مطابق اناج دیا کرتے تھے۔
۷۔ صرف امیروں کبیروں کو قیمتی اشیاء خریدنے کے اجازت نامے دینا۔

ان تمام باتوں کا انتظام کرنے کے لئے ریاست کی طرف سے تین افسر مقرر تھے۔ شحنۂ منڈی، برید منڈی، اور جاسوسانِ منڈی۔ جاسوسانِ منڈی کا عہدہ سب سے اعلیٰ تھا۔ تینوں افسران اپنی اپنی رپورٹیں گاہے گاہے بادشاہ کو پیش کرتے رہا کرتے تھے۔ اگر بادشاہ ان میں کسی قسم کا فرق پاتا تھا تو خود تحقیق کرتا تھا۔ اور رعایا کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دیتا تھا۔

ابھی کہا جا چکا ہے کہ سوداگر مقررشدہ قیمت سے زیادہ چیزیں نہیں فروخت کرتے تھے۔ اس کا ایک سبب تو سزا کا خوف تھا لیکن اس کے علاوہ بڑا سبب یہ تھا کہ اجازت نامہ حاصل کرتے ہوئے انھیں قسم کھانی پڑتی تھی کہ وہ مقررشدہ قیمت پر اشیاء فروخت کریں گے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ زیادہ قیمت وصول کرنے کا نتیجہ اجازت نامے کا لازمی ضبط ہونا ہوگا۔ اس کے علاوہ وہ بادشاہ کے قرض دار بھی ہوتے تھے اور آئندہ قرض لینے کے امیدوار۔ کیونکہ بادشاہ انھیں اناج خریدنے کے لئے روپیہ قرض دیا کرتا تھا جو کہ انھیں بعد میں ادا کرنا پڑتا تھا۔ اتنی بندشوں میں بندھنے کے بعد سوداگروں کے لئے مقررشدہ قیمت سے زیادہ پر فروخت کرنا ناممکن تھا۔ اور وہ تقریباً ہمیشہ ٹھیک قیمت پر چیزیں بیچتے تھے۔

بازار کے اعلیٰ انتظام کے علاوہ وہ اس بات کا بھی خاص خیال رکھتا تھا کہ غلہ پیدا ہونے میں

کمی واقع نہ ہو۔ کیونکہ اس کے بعد بازار کا بھاؤ ٹھیک رکھنا ناممکن ہو جاتا۔ اس چیز کو مدنظر رکھتے ہوئے بیج کے علاوہ کسانوں کو روپیہ بھی قرض دیا جاتا تھا۔ تاکہ کسان زیادہ سے زیادہ اناج پیدا کر سکیں۔ لوگوں اور تاجروں کو کسی چیز کے جمع کرنے کی اجازت ہی نہ تھی۔ اور نہ ہی کسی چیز کے ہندوستان سے باہر جانے کا کوئی سوال تھا۔ اور اس طرح تمام ملک میں ہندوستان کی پیدا یا تیار شدہ چیز نہایت ارزاں تھی۔ اور غریبوں کو ضروریاتِ زندگی حاصل کرنے میں کسی طرح کی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑتا تھا۔

فیروز کے زمانے کے متعلق کہا جا چکا ہے کہ عام ارزانی اس قدر تھی کہ کبھی بھی مقرر شدہ قیمت سے زیادہ پر چیزوں کے بکنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس نے چیزوں کے مقرر شدہ قیمت پر بکنے سے زیادہ اس بات پر زور دیا کہ کسی نہ کسی طرح اناج زیادہ سے زیادہ پیدا کیا جائے۔ نہریں وغیرہ کھدوانے کا یہی مقصد تھا اور ان ترکیب سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ گو اس کے زمانے میں عام چیزوں کا بھاؤ اس قدر سستا تو نہ تھا جس قدر علاؤالدین کے زمانے میں۔ لیکن اگر ہم اس زمانے کی عام خوش حالی کو مدنظر رکھتے ہوئے دونوں زمانوں کا مقابلہ کریں تو زیادہ فرق محسوس نہ ہوگا۔ اسی طرح اکبر اعظم کے زمانے میں بھی چیزیں مقرر شدہ قیمت پر بکتی تھیں۔ گو اس کا انتظام اس قدر اعلیٰ پیمانے پر نہ تھا۔ جتنا علاءالدین کے زمانے میں۔ مگر پھر بھی کبھی عوام کو ضروریات زندگی حاصل کرنے میں مشکلات کا سامنا کرنا نہیں پڑا۔ مالگزاری جنس کی بجائے نقد لی جاتی تھی۔ اور تنخواہیں بھی نقد ہی دی جاتی تھیں۔ مگر دس سیر (موجودہ سوا تین سیر) فی بیگھہ کے حساب سے ہر کسان کو شاہی محاصل خانہ میں دینا پڑتا تھا۔ اور یہ اناج شاہی جانور، غرباء اور مصیبت زدوں کے کام آتا تھا۔ بوقت ضرورت بازار کا بھاؤ ٹھیک رکھنے کی خاطر یہ منڈی میں لے آیا جاتا تھا۔ اور اس طرح بڑھتے ہوئے بھاؤ کو قبضے میں کر لیا جاتا تھا۔ کوتوال شہر کا فرض تھا کہ وہ اس بات کا انتظام کرے کہ چیزیں مقرر شدہ قیمت پر فروخت ہوں۔ اور یہ بھی دیکھے کہ دکان دار شاہی نرخ کے مطابق سودا فروخت کر رہے ہیں اور اس سے زیادہ دام وصول تو نہیں کر رہے ہیں۔ باٹوں کا جانچنا اور اناج کے ذخیروں کا معائنہ کرنا بھی اس کے فرائض میں داخل تھا۔ وہ اس کا بھی ذمہ دار تھا کہ کوئی دوکان دار کسی چیز کا اس قدر ذخیرہ جمع نہ کرے کہ اس سے بازار میں اس کے کم ہونے کا خدشہ ہو جائے۔ اور اگر کوئی چیز بازار میں کم رہ جاتی

تھی تو کوتوال سوداگروں کو مجبور کرتا تھا کہ وہ اس مانگ کو پورا کریں۔ کوتوال کے اس مقصد میں کامیاب ہونے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اسے یہ معلوم رہتا تھا کہ کس سوداگر کے ہاں کونسی چیز کس قدر تعداد یا وزن میں موجود ہے۔

کامیاب لڑائیوں اور فتوحات کی بنا پر عوام و خواص کی حالت بہت اچھی تھی۔ اندرونی امن اور بیرونی بے فکری نے عوام کی معاشی حالت کو بہت بہتر بنا دیا تھا۔ ٹوڈرمل کے نئے انتظام نے نہ صرف کسانوں کو فائدہ پہنچایا تھا بلکہ مجموعی طور پر پیداوار کو بہت بڑھا دیا تھا۔ اس طرح کل رعایا خوش حال تھی۔ اور مالی مشکلات سے دور۔ اورنگ زیب کی وفات تک یہ خوش حالی بڑھتی گئی۔ اور عوام نے ان ڈیڑھ سو سال تک نہایت آرام و اطمینان سے زندگی گزاری۔

مختصر طور پر ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ مسلمانوں کے عہد میں کس طرح اشیاء کو ایک خاص مقررشدہ قیمت پر بکوانے کا انتظام کیا جاتا تھا۔ اور کیوں اور کس طرح وہ اس میں اس قدر کامیاب رہتے تھے۔ مندرجہ بالا وجوہ کے علاوہ چند اور بھی باتیں تھیں جو آج کل کسی نہ کسی وجہ سے مفقود ہیں۔

اس تمام زمانے میں یہ صرف ایک قومی مسئلہ تھا۔ اناج وغیرہ ہندوستان سے باکل باہر نہ جاتا تھا۔ بلکہ ملک کی پیداوار صرف ملک ہی میں صرف ہوتی تھی۔ یہ نہ ہو سکتا تھا کہ ملک کے ایک گوشے میں بھوک سے مرے ہوئے انسانوں کو اٹھانے کے لئے لاریوں کا انتظام کیا جا رہا ہو۔ اور دوسری طرف غلہ کے ساحل تک لے جانے کے لئے گاڑیوں کا۔

کنٹرول کا انتظام مرکزی حکومت کے سپرد تھا نہ کہ صوبہ جاتی حکومتوں کے۔ مرکزی حکومت ایک جگہ سے دوسری جگہ سامانِ خوردنی بھیجنے کی ذمہ دار تھی۔ صوبہ جاتی حکومتوں کو اس بات کا مجاز نہ تھا کہ وہ اپنے صوبے کی پیداوار کو دوسرے صوبوں کے شہریوں کے استعمال کے لئے وہاں بھیجنے پر پابندی عائد کر دیا چاہے دوسرے صوبوں میں اس چیز کی کتنی ہی قلت اور ضرورت کیوں نہ ہو۔

قوم جانتی تھی کہ جو کچھ کیا جا رہا ہے۔ ان کی بھلائی کے لئے کیا جا رہا ہے۔ اس لئے وہ حکومت کے انتظام میں حائل ہونے کی بجائے ہمیشہ معاون و مددگار ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ حکومت بھی فوجیوں کی طرح شہریوں کو بھی انسان سمجھتی تھی۔ یہ نہ ہوتا تھا کہ ہر چیز فوجیوں کے لئے مخصوص کر دی گئی ہو۔ اور شہریوں کی ضروریات تشنہ

کو بالکل فراموش کر دیا گیا۔ غرض قوم اور حکومت میں پوری طرح اتفاق تھا اور اس کا نتیجہ اس اعلیٰ مقصد میں کامیابی تھا۔

تقریباً تمام ضروریات اور آسائش زندگی کی قیمتوں پر کنٹرول تھا۔ اور جس چیز کی قیمت پر کنٹرول ہوتا تھا۔ اس پر پوری طرح کنٹرول ہوتا تھا اور مہیا کرنے کا پورا انتظام اس سے زیادہ مضحکہ خیز اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ گورنمنٹ کے پاس خود تو کوئی چیز نہ ہو۔ اور پھر بنیوں کو مجبور کیا جائے کہ وہ اسے مقررشدہ قیمت پر بیچیں۔ انھیں صرف اس صورت سے مجبور کیا جا سکتا ہے کہ جونہی وہ قیمت بڑھائیں۔ گورنمنٹ اپنے گوداموں میں سے وہ چیز بازار میں بھیجدے۔ اور اس طرح اس چیز کی قدرتاً قیمت کم ہو جائے گی۔ صرف چند گرفتاریوں اور جرمانوں سے اس مقصد میں کامیاب ہونا ناممکن ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ عوام کو بغیر یہ اطمینان دلائے کہ جو کچھ ہو رہا ہے ان کی بھلائی کے لیے ہو رہا ہے۔ ان کا تعاون حاصل کرنا از حد مشکل ہے۔ جس کے بغیر کوئی بھی اسکیم چاہے وہ کس قدر بھی اچھی کیوں نہ ہو۔ کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکتی۔

سید احمد رفیق ایم اے۔ بی ٹی (علیگ)

جامعہ

زیرِ ادارت:- نورالحسن ہاشمی ایم، اے

جلد ۳۹ نمبر ۶ | بابتہ ماہ دسمبر ۱۹۴۲ء | چندہ سالانہ (صر) فی پرچہ ۸ر

فہرست مضامین

ضروری گذارش

جنگ کی وجہ سے کاغذ کے حصول میں جو دقتیں پیدا ہو گئی ہیں اس سے ناظرین جامعہ ناواقف نہیں۔ ان ہی مشکلات کی وجہ سے پیش نظر رسالہ کافی تاخیر سے ناظرین کی خدمت میں پہنچ رہا ہے، شاید آئندہ بھی چند دنوں ہم اسے وقت پر شائع نہ کر سکیں۔ اُمید ہے کہ ناظرین ہماری مجبوریوں کا لحاظ کریں گے اور اس طرح گویا ہماری مشکلات میں ہاتھ بٹائیں گے۔

مینجر "جامعہ" دہلی

علم النفس

انسانی اعمال جن دماغی کیفیات کے مرہونِ منت ہیں وہ اس علم کا موضوع قرار دی گئی ہیں۔ دماغ میں تین قسم کی قوتیں مانی گئی ہیں۔

متفکرہ۔ جذبات۔ ارادہ۔

حِس | اگر ہم کسی درخت کی طرف دیکھ رہے ہوں۔ تو ہماری دیکھنے کی قوت کام کر رہی ہوگی جس کو باصرہ کہتے ہیں۔ دیکھنے میں کون کون سے درجے طے کئے جاتے ہیں۔ اس کے لئے سمجھنا یہ ہے کہ جب ہم کسی راستے پر چلتے ہیں تو ہم گرد و پیش کی بے شمار چیزوں کو دیکھتے ہیں۔ بعد کو سوچتے ہیں تو چند ہی چیزیں دماغ میں محفوظ رہجاتی ہیں باقی چیزیں یا تو بہت کم یاد رہتی ہیں یا بالکل یاد ہی نہیں رہتیں۔ یعنی ایک اس قسم کی چیزیں جن کا نقش ذہنی آئینے میں گہرا بیٹھتا ہے دوسری قسم کی وہ چیزیں جن کا عکس دھندلا اور بعض کا اس سے بھی دھندلا۔

اب اس درخت کے دیکھنے کا عمل جو ہوگا اس میں کئی مدارج ہیں۔ پہلے توجہ دینی پھر انعکاس دماغی۔ تیسری چیز شناخت (   ) اور امتیاز (   ) اس قسم کے ذہنی تجربے میں قوت حافظہ بھی کارفرما رہتی ہے۔ اس عمل کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ذہن میں خارج سے تموج لطیف ترین انداز سے ہوتا ہے۔ ایسے تموجات آنکھ کے پردہ رٹینا (RETINA) عکس جاتے ہیں ان کا مجموعہ ذہن میں ایک ہیئت کذائی اختیار کرتا ہے جس کو ہر ذہن پہچان لیتا ہے۔ جب ذہن بالکل منہمک ہوگا تو اس مجموعہ تصور کا ادراک ہوگا۔ یہ تو مرئیات کا ذکر تھا۔ اب دوسرے ذرائع ادراک قابل توجہ ہیں۔ سننا۔ چھونا۔ سونگھنا۔ چکھنا۔

تشریح الابدان کے تحت میں پروفیسر تین (مشہور طبیب) نے اعضائے جسمانی کے ذریعہ ادراک کے سمجھنے کو آسان تر کر دینے کی کوشش ضرور کی ہے۔ مثلاً سامعہ کا عمل ان کان کے اس پردے کو ہوتا ہے جس کو ہم ٹمپینم (TYMPANUM) کہتے ہیں۔ اس سے ملا ہوا تموجات نا [illegible]

کا اثر دماغ کے ہر حصے پر ان ریشوں کے وسیلے سے ہوتا ہے جو بدن میں دوڑے ہوتے ہیں۔ جیسے ایک تاگا جس کا ایک
سرا ایک کوزے میں اور دوسرا دوسرے کوزے میں سوراخ کر کے باندھ دیا جائے۔ جب ایک پر آواز کا تحرک
ہوگا تو لگاتار تاگے پر دوسرے سرے تک تموج محسوس ہوگا۔

مگر تموجات کا منتشر ہونا اور مجتمع ہو کر ایک شکل قابلِ ادراک اختیار کر لینا پہلے طور پر واضح نہیں ہوتا
اس اجتماع کے لئے وہ قوت جس کو قوت جامعہ ترکیبی کہہ سکتے ہیں سمجھ میں آنی چاہیئے۔ ڈاکٹر
جیمس اور جو اس رائے کے شدید مخالف ہیں انھوں نے تشریحاً ان کو علم النفس میں اہمیت نہیں دی ہے۔ وہ انفرادی
تجربہ جو ہر شخص کے لئے مختص ہے۔ ان کے نزدیک ضروری ہے۔ ادراک یا احساس کلیتہً مبنی ہے۔ مقدار تموج
یا شدتِ احساس پر اور ایک ہی آواز کا دو شخصوں کو ایک ہی گہرائی کے ساتھ مسموع ہونا تموجات
سے نہیں منتہائے آوازِ موسیقی کے کئی درجات تک اختلافِ سمع دو شخصوں میں ہونا ثبوت ہے۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۲۱۶
پروفیسر مین کی مشہور تصنیف احساس و ادراک بعض لوگوں کو چمگادڑ کی آواز کا سنائی نہ دینا بھی بیان
کیا گیا ہے۔ میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ اگر دو گویئے ساتھ ساتھ گا رہے ہوں تو تان لگاتے وقت ایک گویا سمجھے گا
کہ آواز مل گئی گو چڑھاؤ کے آخری نقطے پر فرق ہوگا۔ کوئی ان میں زیادہ فرق پائے گا کوئی کم۔ حالانکہ جسمانی
ریشے یا اعصاب سب میں موجود ہیں۔ رہا التفاتِ ذہنی یا دماغی توجہ سو اس کی
بھی تحلیل کیمیاوی سے اجتماعیتِ محسوسات حل نہیں ہوتی۔ مثلاً کسی چیز کی موٹائی، لمبائی، چوڑائی، رنگ کو الگ
الگ تصور کیا جائے اور ان کو ملایا جائے تو یہ ذہنی طریقے سے کچھ ممکن ہے لیکن خارجی قائم مقام ناپید ہے۔ وہ
قوت جو ان اجزا کو پکڑے ہوئے ہے اپنا بھید کھلنے نہیں دیتی۔ جہاں موٹائی ہے وہاں دوسرے اجزا ضرور موجود
ہوں گے۔

کب الگ اجزاء میں رازِ زندگی پاتے ہیں ہم

تعجب انگیز چیز وہ ہے جو کسی سمت خارجی تاثرات کو اپنے میں سمو کر ذہن مدرک کی طرف براہِ راست سرعت
سے طے کر کے پہنچاتی ہے۔ وہ حیاتی قوت جو تموجات کو کسی شے سے لے کر پہنچتی ہے اور ذہن میں ان کو سلجھا
آتی ہے وہ (DIRECTIVE) حیاتی قوت اعضائے منفذہ تک حسّی کیمیاوی اجزاء سے علیحدہ حیثیت رکھتی ہے

اور بڑی حد تک ایک راز ہے جب ہی تو مابعد الطبیعیات والے اِدھر اُدھر پھرتے ہیں اور اس کو (NOUMENON) یا (SUBSTRATUM) ناقابل ادراک حقیقت باطنہ کہہ کر رہ جاتے ہیں۔ علم النفس اس کا جائزہ نہیں لیتا کہ قوت کہاں سے آتے ہیں۔ بہرحال ہوا آواز کی لہروں کو ہر طرف تقسیم تو کرتی ہے مگر قوت ممیزہ آواز کو اسی نوع مسموعات کے حوالہ ایک لامعلوم ماہیت کی بنا پر کرتی ہے۔ اور دوسری نوع اس سے محروم رہتی ہے۔

چھونا (قوت لامسہ) (وجود یا وزن کا احساس) جب کوئی چیز بدن سے مس ہوگی یا کسی حصے پر اپنا وزن یا جسامت کا اثر ڈالے گی تو وہ جسم کے ذریعہ دماغ میں محسوس ہوگی۔ ہوا اس لئے محسوس ہوتی ہے کہ اس میں وزن ہے۔ ہاتھ کا درد۔ سر کا درد۔ درد کا احساس اس حصۂ جسم پر دماغ کے ذریعہ ہوتا ہے جو درد سے متاثر ہے۔ گو اثر پھیل کر جسم کے ہر حصے میں تقسیم ہو سکتا ہے۔ یہی تقسیم ہونا یا پھیلنا ہے جسم کی سطح کا متاثر ہونا جس سے جذبات کی تسکین یا تہیج لاہم ہو۔ یعنی کبھی آرام اور کبھی تکلیف۔ بہرحال اس جزء سے دماغ تک اسی احساس کا رابطہ حاصل ہوتا ہے۔ دیگر احساسات حسب ذہنیت و رجحان کم و بیش ہو کر اس میں بالواسطہ اضافہ راحت و الم کا باعث ہوتے ہیں کسی غیر معمولی بوجھ کا اٹھانا تماشائیوں کی تفریح کے لئے باوجود دباؤ کے راحت رساں ہے کیونکہ یہ تفریح بازیگر آنکھ سے دیکھتا ہے۔

سونگھنا قوت شامہ۔ خوشبو یا بدبو کا احساس۔ جو اس جسم میں عنصر ہی لطیف سمجھا گیا ہے ناک کے جوا کی ترکیب ملحوظ رکھتے ہوئے ظاہر ہے کہ ایک خاص جھلی دار حصہ جو ناک کے منفعلی حصہ میں ہوتا ہے۔ اندرونی حصے میں خوشبو یا بدبو کو بوسیلہ شناخت و امتیاز محسوس کراتا ہے۔ اور دماغ کے حوالے کر دیتا ہے۔ یہ کیمیاوی ترکیب بھی کتنی دل کش ہے۔

دیر تک قائم رہنے یا برقرار رہنے سے خوشبو یا بدبو اپنی قوت سے دست بردار معلوم ہونے لگتی ہے گویا نتیجۃً یہ اخذ کرنا ممکن ہے کہ دماغ کی طبعی وضع یا تشکیل ایسی ہی ہو جس کا تقاضا ہر آن تبدیلی ہے حالانکہ بڑا ہو خواہش کی سرگرمی کا جو بعض راحت کو مرغوب رکھتی ہے۔

یہ بات بھی واضح ہے کہ ان میں سے کوئی ایک حس دوسرے کے محسوسات سے [illegible] اپنی [illegible] ہوتے [illegible] اپنی خدمت پر خوش [illegible] ہے کہ ایک حس کے [illegible]

دوسرے کے تاثرات سے مخلوط نہیں ہوتے یہ اور بات ہے کہ ایک حس کسی خاص انہماک کی وجہ سے دوسرے احساسات کو کچھ دیر کے لئے کمزور کردے۔ حالانکہ تعاونِ عمل ان میں بھی ہے۔

ذائقہ | بظاہر تالو کی خاص بناوٹ سے یہ ملکہ وجود میں آتا ہے۔ یا محسوس ہوتا ہے یا تالو بلحاظ اس تجربہ کے جو، مشہور پروفیسر ہن نے کیا ہے ثابت کرتا ہے کہ لذت کا تعین ویسا ہی ہے جیسے کسی چلتے ہوئے چشمے کو کپڑے سے ڈھک کر روکنے کی کوشش۔ اس میں لعاب دہن ضرور ہے مگر اس کے اثرات بھی کبھی کڑواہٹ کبھی مٹھاس کی صورت میں محسوس ہوکر نفسیاتی حقیقت یلکلے کا پتہ دیتے ہیں۔ انسان کسی وقت خالی الذہن ہوکر نیا ذائقہ جو فی الجملہ کہنہ ہوگیا ہو دفعتاً پسند کرنے لگتا ہے یا بیماری کی حالت میں ایک خاص چیز اس بنا پر پسند کرتا ہے کہ اس کی متضاد چیز اس کی زبان پر کچھ دن مسلسل رہ چکی ہے ایک واحد شے کا معمول اس کو دوسری مختلف چیزوں کی طرف مائل کرتا ہے کیا عجب ہے کہ یہ سب جذبات کی بنیاد پر ہورہا ہو۔

مفکرہ | توجہ۔ حافظہ۔ متخیلہ

شروع میں مفکرہ کے اُن مبادی کی طرف اشارہ کردیا گیا ہے جن کو شناخت اور امتیاز کہا جاتا ہے حافظہ کا بھی ذکر کیا گیا اور عقل واستقرا کی صلاحیت بھی مفکرہ کے تحت میں ہے۔ ذہن میں پہلے تصور آتا ہے اس کے بعد جو دوسرے تصورات سے اس کو نسبت حاصل ہوتی ہے اس پر منطق کے ذریعہ عمل کیا جاتا ہے علم النفس تو بس ہیئت تصور سے بحث کرتا ہے۔ تصور کے حصول پر ابتدا میں روشنی ڈالی جاچکی ہے۔ لیکن تفصیلات اب بیان ہوں گی۔ جو کچھ ذہن کا موضوع بن سکتا ہے اس کی دو قسمیں کی گئی ہیں۔ داخلی محسوسات اور خارجی موجودات۔ خیالات کا ہمہ وقت ذہن میں موجود رہنا بھی بدیہیات سے ہے۔ کوئی لمحہ ایسا فرض نہیں کیا جاسکتا جو ذہنی تجربات یا باطنی احساسات سے خالی ہو۔ تحت الشعور میں اسی قسم کی تعمیر ہوتی رہتی ہے سونے کی حالت میں مختلف اجزاء خیال سمٹ کر ایک جگہ اکٹھا ہوجاتے ہیں اور باہر سے کوئی نیا تصور داخل نہیں ہوتا۔ خالی الذہن سے مراد صرف اس قبیل کے محسوسات سے خالی ہونا ورنہ کچھ نہ کچھ ذہن میں ضرور ہی واقع ہوا کرتا ہے۔ اسے یوں سمجھئے کہ ذہن مدرک پانی کی سطح کی طرح پھیلا ہوا ہے اس میں تغیر احساس کی چھوٹی لہروں سے مشابہ ہے۔ اس کو ڈاکٹر وارڈ (WARD) نے [illegible] ارتقائی [illegible]

جس میں صورت مختلفہ کا ارتسام ہوتا ہے تشکیلیں بنتی رہتی ہیں۔ اس عمل کو استحضار (CONTINOUN) کے نام سے تعبیر کیا ہے بہرحال دیکھنا یہ ہے کہ ذہنی تجربہ فی نفسہٖ ہے کیا۔

کائنات کے ہر ذرے کو ذہن انسانی میں جگہ دی گئی ہے۔ ہر چیز سمائی ہوئی ہے حیرت سی حیرت ہے۔ بچپن سے لے کر پیری تک بے شمار تصورات دماغ میں بھر جاتے ہیں۔ انسانی دماغ ایک عجائب خانہ معلوم ہوتا ہے۔ جس میں طرح طرح کے جانور اور طیور بولتے ہوئے سنائی دیتے ہیں۔ ہر قسم کی آوازیں گونجتی ہیں۔ دریا، پہاڑ، جنگل۔ انسان غرض ہر قسم کی مخلوق موجود ہے۔ یہ تصورات کیونکر حاصل ہوئے اس کے لئے توجہ ذہنی کا جائزہ لینا ہے۔

یوں تو انسان راستہ چلتے ہر قسم کے محسوسات سے دوچار ہوتا ہے لیکن ایک قسم کا انتخاب ہر وقت دماغ میں کارفرما رہتا ہے۔ اپنے خاص مقصد کی تکمیل کے لئے اس کے متعلق محسوسات کو قبول کرتا ہے۔ اسی وجہ سے مفکرین نفسیات قوت خیال کو جذبات کی دنیا سے الگ نہیں کر سکتے۔ مثلاً ایک معمار تلاش معاش میں نکلتا ہے تو اس کے ذہن میں اینٹ اور گارے کی دنیا ہوتی ہے اور کسی نہ کسی ایسے فرد کا تصور ہوتا ہے جسے مکان بنوانے کی ضرورت ہو۔ راستے میں اگر کوئی خوب صورت پھلواڑی یا چڑیا خانہ وغیرہ ہوگا تو وہ اس کو جاذب نظر نہیں قرار دے گا بشرطیکہ اس کو معاش کی شدید ضرورت لاحق ہو اور اگر دیگر اشیاء جو اس کے پیشہ سے متعلق نہ ہوں اپنے رنگ اور روپ میں اس کے روزانہ تجربات سے انوکھے ہوں تو اس کے احساس میں گہری جگہ پا سکتی ہیں اور تحت الشعوری وجود میں جاگزیں ہو سکتی ہیں۔ لیکن ایسے غرض مند پیشہ ور کا ذہن ان کو قبول کرتے ہوئے بھی اسے ثانوی اہمیت دے گا۔ اور کار منصبی کے سامنے نہ آنے دے گا۔

معلوم ہوا کہ احتیاج اپنے تناسب کمیت کی بنا پر اشیاء عالم کو جاذب توجہ قرار دیتی ہے چنانچہ اس قابلیت انتخاب کے جس کا ذکر اوپر کیا گیا توجہ نہیں تو اور کیا کہیں گے۔ بہت سی چیزیں خود سے بالتحریک خود ہی اپنا اثر آور جہ اور کسی پر ڈال دیتی ہیں جس کو انفعالات ذہنی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے گو مقصد توجہ پر منحصر ہیں جس قدر منفی خارجی یا داخلی توجہات ہوں گے اسی قدر ذہن کا حرکت

قوت انتخاب متاثر ہوسکتا ہے۔

حافظے کے تحت میں متفکرہ کی ایک خاصیت تصاحب (CO-EXISTENCE) اور مطابقت ذہنی (SUB-CONSCIOUS) ہے۔ شکل و رنگ کا تصور ایک ساتھ ہونا تصاحب سے ہوتا ہے یعنی کوئی صورت خیالی میں یہ کسی رنگ کے نہیں لائی جاسکتی۔

مطابقت کی مثال ہے جیسے اگر رنگ اور صورت کا تصور ہوگا تو فوراً بعد نام بھی یاد آئے گا۔ اور اس کی مسکراہٹ یا اور کیفیت دماغ میں آئے گی۔ اس میں بھی مشارکت اور تضاد کے دو عنصر کام کرتے ہیں۔ مگر انسان کو پتہ تک نہیں چلتا کہ بعض تصورات کی کڑی سے کڑی آپس میں کیونکر ملتی چلی گئی۔ مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ ایک چیز کو جو ماہیت میں دوسری چیز سے بظاہر مختلف ہے کسی دور دراز کا رنسبت کے ذریعے سے فوراً ذہن میں مستحضر ہوجاتی ہے اور اسی طرح پھر تیسری چیز کا خیال پھر چوتھی کا اور پانچویں کا۔

ایک موضوع کو دیکھ کر صانع کا خیال اور اس کے آلات کا تصور۔ آلات کی مادی حیثیت اور مقام جہاں سے مادہ دستیاب ہوا اس کے ساتھ ساتھ بے شمار اشیا کا تصور بندھتا چلا جائے گا۔ کہیں کہیں پہلے ہی تصور سے مختلف شخصوں کے لئے مختلف راستے پیدا ہوجایا کرتے ہیں۔ ہر شخص اپنے مفاد کے اعتبار سے زنجیرہ بندی پا سکتا ہے معلوم نہیں کہاں سے کہاں راستے نکلتے چلے جاتے ہیں۔

گو عمل بالا حافظہ سے الگ نہیں ہے تاہم کسی واحد شے کا دماغ میں محفوظ رہنا بھی ایک ممتاز حالت رکھتا ہے۔ جس چیز کو جس حالت میں پہلے محسوس کیا ہو بعینہٖ اسی حالت کے تصور کی تہری تجدید یا دو اشت کہی جائے گی۔ یہ تقلیدی عنصر ہے جو ہر زنجیرہ بندی سے متعلق نہیں ہے۔ وہ اعصابی تموج جو ذہن میں کسی ترشی کھائی جانے والی چیز سے تالو محسوس کرتا ہے وہی چیز پھر بار بار دیکھنے سے ہوتا ہے۔ کسی جانور کا چھڑے بینا یا کبھی کسی کا یہ کہنا کہ اس کا ناخن چلا رہا ہے تاکہ کسی پر چل جائے یہ سب اس وظیفہ کا دہرانا ظاہر کرتا ہے جو پہلے جاری رہا ہو۔ عجب نہیں جو ماہیت اہر کی مماثلت سے لٹک کر پہنچتی ہو۔ حافظہ میں ہر ذائقہ دار چیز کے رنگ و بو سے آگے نہیں بڑھتا بقول لاک (CONCEPT) مرجانے کا حزن سے مدد ہے چونکہ دیکھنے سننے چھونے سونگھنے کی چیزیں کھانے والی چیزوں کی بہ نسبت کم

محسوس ہوتی ہیں۔ اس لئے اوّل الذکر کی ہر قسم میں فرق نمایاں رہتا ہی۔ اور فرق سے پہچان ہوتی ہی اور یاد رہتی ہیں۔ کیونکہ یاد کرائی جاتی ہیں۔ ہر منٹ میں سینکڑوں تصورات دماغ میں آتے ہیں۔ عدالبتہ کیا ہے لہذا مرہ کی یاد تاوقتیکہ سامنے نہ ہو نہایت مشکل سے آتی ہی۔ صبح کو جب ذہن خالی ہو کر کسی [illegible] کا تصور قبول کرتا ہی تو وہ حافظہ کہلاتا ہی۔ پچھلے خیالات تھوڑی دیر کے لئے محو ہو جایا کرتے ہیں۔ فوراً اٹھ کر یہ سوچا کہ فلاں کام کرنا ہی جس میں رومانی جذبہ نہیں بلکہ فائدہ مدنظر ہو۔ رومانیت صرف [illegible] کا جزو اعظم ہی۔

متخیلہ۔ (IMAGINATION) یہ متذکرہ بالا قوتوں سے ملتی جلتی صلاحیت ہی لیکن تخلیقی عنصر بہت زیادہ ہی۔ صفت سے گذر کر ایک مفروض ذات کا تصور اس کا خاصہ ہی۔ اسے توہم کہئے یا کچھ۔ شہد کی مکھی باغ میں اگر جانے نہ پائے تو یہ نتیجہ واقعی نکل سکتا ہی کہ پروانہ جلنے سے بچ جائے گا۔ تسلسل یا تحت ہوتے ہوئے اس میں تخلیق کا پہلو نمایاں ہی۔ ماہرین فنون لطیفہ مثل مانی و بہزاد بجائے [illegible] کے اگر تخیلی قوت پر زیادہ ناز کریں تو زیبا ہی۔ متخیلہ ان دیکھی چیز کو جسمانیت عطا کرتی ہی اور ماضی کی طرف مڑ کر نہیں دیکھتی اسے کسی پیش رو تصور کی احتیاج نہیں ہوتی۔ اور اس کے رگ و پے میں استغنا کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہی۔ ایسے مسلسل خیالات جن میں ذہن جذبات کے ماتحت کچھ ایجاد کر کے اس میں داخل کرے مثلاً چڑیل۔ بھوت وغیرہ کے حرکات کا تصور بھی خاص متخیلہ ہی۔ ان تین قوتوں کے علاوہ اور بھی صلاحیتیں متفکرہ کے ساتھ وابستہ ہیں۔

مثلاً تعقل یا استدلال۔ یہ صلاحیت دماغِ انسانی میں قدرت کی طرف سے ودیعت کی گئی ہی تاکہ [illegible] تحقیق میں اس سے مدد لی جا سکے۔ اس کی نشوونما تعلیم پر مبنی ہی۔ تصور کے مفہوم کی کوئی دلیل و حجت نہیں ہوسکتی ہی اور اس کے بعد تصدیق کا حصول تعقل ہی سے ممکن ہی۔ مثلاً آگ کا مفہوم اس کے دیکھنے یا محسوس کرنے سے جو حاصل ہوتا ہی وہ تصور ہی لیکن اگر یہ کہا جائے کہ آگ دوسری چیزوں کو جلا دیتی ہی۔ اس میں دو قسم کے تصور ہیں آگ اور اس کی نسبت اس ماہیت سے جس کو جلا دینا کہتے ہیں تصدیق ہی۔ اس طرح ایک یا دو تصورات سے [illegible] نتیجہ نکالنا [illegible] تعقل کا کام ہی۔

جس قدر مواد انسان کو کسی تحقیق طلب مسئلہ کے لئے مہیا ہوتا ہی اس میں پہلی دو چیزیں جو رہنمائی کرتی ہیں وہ قوت شناخت و قوت ممیزہ ہیں یعنی کسی استدلال سے وہ چیزیں علیحدہ کرنا جو تحقیق میں سدِ راہ ہوں اور ان کو لینا جو مفید ہو سکیں۔ جو دلیل کے لئے قوت یا ضعف کا باعث ہوں ان کو لینا یا بچنا۔ یہی عقل و تحقیق کا مقصد ہی۔

اس کے بعد بصیرت (INTUITION) اس کے لئے صرف یہ واضح کر دینا ہی کہ جن چیزوں کو حواسِ خمسہ کے ذریعے سے درک نہیں کیا جا سکتا وہ بصیرت سے سمجھی جاتی ہیں۔ انسان اپنے وجود کا علم حاصل کئے ہوئے ہی جو کسی دلیل کا محتاج نہیں۔ میں اپنے وجود کا یقین رکھتا ہوں اور لفظ (میں) سے اپنی تعبیر کرتا ہوں میرا ہاتھ۔ میرا سر۔ میرا مکان۔ یہ اضافتیں ہیں جو ذات "میں" کو گھیرے ہوئے ہیں۔ یہاں جو شے بھی گھیرنے والی ہی وہ ثابت کرتی ہی کہ وجود "میں" اپنے تعین میں ماحول کا محتاج ہی اس لئے وہ مکان کو پہچانتا اور مانتا ہی۔ اس کے ثبوت کے لئے علامۂ طوسی کا وہ فقرہ "خود را بخود دریافتن" کافی ہی۔ زماں و مکان کے تصور کو بھی اکثر عقلا بصیرت کے تحت میں لاتے ہیں۔ ہم اس کی تشریح مناسب مقام پر کریں گے۔ یہاں قوتِ مفکرہ کی بحث کو ختم کر کے جذبات کا موضوع اختیار کرتے ہیں۔[1]

حیدر عباس

---

[1] بقیہ مباحث کتابی صورت میں شائع ہوں گے۔ (جامعہ)

ایک اہم ادبی تحریک

(گذشتہ سے پیوستہ)

نئی شاعری کا موضوع

نئے ادب کے مخالفین اکثر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ نیا ادب ادبِ عالیہ نہیں بلکہ محض پروپاگنڈا لٹریچر ہے۔ ان لوگوں نے غیر شعوری طور پر یہ طے کر لیا ہے کہ پروپاگینڈا لٹریچر لازمی طور پر ایک معیوب شے ہے۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ جس مقصد کے لئے پروپگنڈا کیا جا رہا ہے، اگر وہ بذاتِ خود ایک اچھا مقصد ہے تو اس کی نشر و اشاعت لازمی طور پر معیوب کیونکر قرار دی جا سکتی ہے؟ ایک اچھے مقصد کا پروپگینڈا معیوب بھی ہو سکتا ہے اور حسین بھی۔ اس کے خوب و ناخوب کا فیصلہ خود پروپیگنڈے کی نوعیت کو سامنے رکھ کر کرنا چاہیئے۔ اس کی نوعیت کو دیکھے بغیر پہلے سے یہ فیصلہ کر دینا کہ وہ بہر حال بُرا ہوگا، غیر منطقی اندازِ فکر ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے نیا ادب ایک مقصدی ادب ہے۔ اس کا مقصدِ قریب نیا سماج پیدا کرنا ہے اور مقصدِ آخری ارتقاءِ زندگی ہے۔ جب یہ مقاصد خود بُرے نہیں تو ان کی نشر و اشاعت لازمی طور پر بُری کیوں ہونے لگی؟ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اس نشر و اشاعت کے جو نمونے ہمارے سامنے موجود ہیں وہ بدنما ہوں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ نمونے واقعی کیسے ہیں۔

جدید نثر کی بحث اوپر ہو چکی ہے۔ جہاں تک جدید نظم کا تعلق ہے موضوع کے لحاظ سے اس کو چار قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) انقلابی نظمیں

(۲) نیم انقلابی نیم رومانی نظمیں

(۳) رومانی نظمیں

(۴) جنسی نظمیں

انقلابی نظمیں وہ ہیں جن میں موجودہ سماج کی خرابیاں واضح کی جاتی ہیں اور ساتھ ہی ان کے استیصال

اختیار کیا جائے اور اس کو ایک نظام نو کی تعمیر کے لئے وقف کیا جائے۔ در اصل یہی نظمیں ایسی ہیں جن سے نئے ادب کے مقاصد کے حصول کی توقع کی جا سکتی ہے۔ موضوع، اسلوب، لہجہ سب کے لحاظ سے یہ نظمیں یہ صلاحیت رکھتی ہیں کہ نظام نو کی تعمیر میں معاون ہو سکیں۔ لیکن ایسی نظمیں نئے ادب میں کتنی ہیں؟ میرے خیال میں جوش کے علاوہ کسی اردو شاعر نے قابل لحاظ تعداد میں ایسی نظمیں نہیں لکھیں۔ اور مجھے یہ کہنے میں قطعی تامل نہیں کہ موجودہ زمانے کا انقلابی شاعر جوش ہے اور صرف جوش۔ اس کمی کی وجہ کیا ہے۔ میرے نزدیک اس کے تین سبب ہیں۔ ایک تو یہ کہ انقلابی شاعری کے لئے غیر معمولی قوت اثر اندازی چاہیئے اور یہ بات معمولی خلوص جذبات اور غیر معمولی قدرت اظہار سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ جوش کے کلام میں خلوص جذبات کے متعلق دو رائیں ہو سکتی ہیں۔ (اگرچہ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ کوئی ایسا شخص جس میں خلوص جذبات نہ ہو جوش کی سی پراثر نظمیں کہہ ہی نہیں سکتا) لیکن جوش کی غیر معمولی قدرت اظہار سے کس کو انکار ہو سکتا ہے؟ جوش کی قدرت اظہار کا ایک اہم سبب ان کی واقفیت عروض ہے۔ اگرچہ زمانے کی چال کو دیکھتے ہوئے حضرت جوش بھی قافیے کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جیسا کہ ان کے اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے:

ان کے عمل میں شعر کی روشن ہو کس صورت سے آگ
قافیے کے ہاتھ میں رہتی ہو جن لوگوں کی باگ

لیکن میں ان سے مودبانہ عرض کروں گا کہ وہ اپنی نظم "بلوغ حیات" کو قافیہ کی پابندی سے الگ ہو کر دوبارہ لکھیں، اس شرط پر کہ اثر میں کمی نہ ہونے پائے۔ میرا دعویٰ ہے کہ جوش جیسا قادر الکلام شاعر بھی یہاں ہار مان لے گا! بخلاف جوش کے دوسرے جدید شعراء کے یہاں خلوص جذبات تو عام طور پر پایا جاتا ہے لیکن قدرت اظہار مفقود ہوتی ہے اور اس کا سبب ان شعراء کی عروض سے بے اعتنائی ہے۔ لہذا اگر نئے ادب میں انقلابی نظمیں کم نظر آتی ہیں تو تعجب کی بات نہیں ہے۔ اس کمی کی دوسری وجہ ہندوستان کے سیاسی حالات ہیں۔ تیسرا سبب یہ ہے کہ جنگی اور صنعتی ابتلا کے باعث ۱۹۴۱ء سے ہندوستان کے متوسط طبقہ کی حالت کچھ بہتر ہو چلی ہے جس کا فوری اثر یہ ہوا ہے کہ وہ حالات جو نئے ادب کی تخلیق کا باعث ہوئے تھے کسی قدر کمزور ہو گئے ہیں۔ اور جب پیٹ کو روٹی ملنے لگی تو پھر انقلاب کی کوئی فوری ضرورت باقی نہیں رہ جاتی پھر انقلابی نظمیں کہاں سے آئیں؟

کچھ دنوں سے نئے ادب کی تہہ میں ایک معکوس رَو کارفرما نظر آتی ہے۔ وہ رومانیت ہے۔ اگرچہ نئے ادیب اور شاعر زبان سے اب بھی واقعیت واقعیت پکار رہے ہیں لیکن دراصل ان کے یہاں رومانیت کا گھن لگ چکا ہے۔ ایک حد تک اس کا سبب بھی سنہ ۱۹۴۲ء کے بعد کے معاشی حالات ہیں۔ متوسط طبقہ مدت کے بعد شکم سیر ہوا ہے۔ اور اب وہ "قیلولہ" فرما رہا ہے۔ رومانیت اسی قیلولے کا دوسرا نام ہے۔ نئے ادب کے جو نمونے سنہ ۱۹۴۲ء کے بعد سامنے آئے ہیں ان میں انقلابی نظمیں بہت کم ہیں۔ اور ایسی نظموں کی تعداد روز بروز کم ہوتی جاتی ہے۔ ان کی جگہ اب ایسی نظمیں زیادہ آ رہی ہیں جن میں انقلاب کی ایک مبہم سی آواز تو ضرور ہوتی ہے، لیکن جن کا دل کہتا ہے۔

کنارِ آب و لبِ جوئبار کیا کہنا!

رومانیت بذاتِ خود کوئی بُری چیز نہیں۔ میں خود کبھی کبھی رومانی نظمیں لکھتا ہوں لیکن اس قسم کی شاعری نئے ادب کے مقاصد کے خلاف ہے۔ رومانیت دراصل زندگی سے فرار کا نام ہے اور نیا ادب عین زندگی کی ترجمانی کا۔ اس لئے ان دونوں کا امتزاج خواہ بظاہر کتنا ہی حسین کیوں نہ ہو، دونوں کے حق میں بُرا ہے۔ یعنی جب نئے ادب کے ساتھ رومانیت شامل ہو جاتی ہے تو نتیجہ یہ تو نیا ادب رہتا ہے اور [illegible] رومان۔ دوسری بات یہ ہے کہ رومانیت بےحد نازک چیز ہے۔ وہ ثقیل قسم کی واقعیت جس کو جدید شعراء رومانی شاعری میں بھی ٹھونسنے کے عادی ہیں کسی طرح اس میں موزوں نہیں معلوم ہوتی۔ رومانیت اور واقعیت کے امتزاج کا ایک بدنما سا نمونہ ملاحظہ ہو۔

"تمہیں خبر نہیں بازارِ زندگانی میں تمہارا حسن اک آراستہ دکان ہے جہاں کھڑے ہیں کروڑوں
گاہک نظر جمائے ہوئے ہر ایک سوچ رہا ہے تمہارے دام ہیں کیا۔ میں پوچھتا ہوں تمہیں
کیا یہ ناگوار نہیں؟"

میرا مطلب یہ نہیں کہ واقعیت اور رومانیت کا امتزاج ہو ہی نہیں سکتا۔ مدعا صرف یہ ہے کہ ایسا امتزاج نئے ادب کے مقاصد کے خلاف ہے۔ نئے ادیب اور شاعر اگر تقاضائے بشریت کی بنا پر کبھی کبھی رومانیت سے [illegible] قرار پاتے ہیں تو کوئی [illegible] نہیں [illegible]
[illegible]

جتنا عروضی ہو وہ یا تو فانی بدایونی بن جائے گا یا اختر شیرانی اور یہ دونوں غیر معتدل قسم کے انسان ہیں۔ لیکن حقیقت کو حقیقت اور رومانیت کو رومانیت کی جگہ رہنا چاہیئے۔ نہ تو رومانی شاعری کا شمار نئے ادب میں ہونا چاہیئے اور نہ جدید شاعری میں۔ میرا خیال میراجی کے جدید شاعری کے تصور سے مختلف ہے لیکن میں نے اپنا نقطۂ نظر مدلل ثابت کیا ہے اور میراجی نے نہیں کیا۔ جدید شاعر یہ چاہتا ہے کہ وہ حقیقت کا نقاب ڈال کر سستے قسم کی رومان آفرینی کرے۔ ن۔م راشد کا "آتشدان کے پاس" ایک اجنبی عورت کے برہنہ جسم سے نوجوانانِ وطن کی بے بسی کا انتقام لینا، اسی قسم کی حقیقت نما رومان آفرینی نہیں تو اور کیا ہے؟ اس تجربے میں حقیقت کا عنصر صرف اس تلذذ جنسی تک محدود ہے جو ممکن ہے راشد صاحب کو حاصل ہوا ہو۔ لیکن اس حقیقت کو ان تلخ حقائق سے کیا سروکار جس کی ترجمانی کے نئے ادیب مدعی ہیں۔ نوجوانانِ وطن کی بے بسی کا انتقام لینے کا جو طریقہ راشد صاحب نے اختیار کیا وہ ان کے نزدیک کتنا ہی جمالیاتی اور فنکارانہ کیوں نہ ہو، لیکن نئے سماج کی تخلیق اور ارتقاع زندگی جیسے مقاصد سے ان کو کیا واسطہ؟

خالص رومانی شاعری کی مثالیں جدید شاعری میں نسبتہً کم ہیں۔ تاہم ان کی تعداد ناقابلِ لحاظ نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بے قافیہ نظم لکھنا کم از کم تکنیکی حیثیت سے بہت آسان ہے۔ ایک خاص عمر پر پہنچ کر تقریباً ہر صحت مند اور تعلیم یافتہ نوجوان کے دل میں رومانی خیالات اور جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اور جب ان کے اظہار میں بھی کوئی خاص دشواری نہیں ہوتی تو ہر نوجوان رومانی شاعر بن سکتا ہے۔ چونکہ عرفِ عام میں ہر وہ شاعری جو بحر و قافیہ سے عاری ہو، جدید شاعری ہے، لہذا تمام وہ نظمیں جو بحر و قافیہ کی پابندی کے بغیر لکھی جاتی ہیں (خواہ اپنے موضوع کے لحاظ سے وہ رومانی، نیم رومانی یا کچھ اور ہوں) خود بخود جدید شاعری میں شمار ہوتی ہیں۔ اور جدید شاعری کے لئے جو چیز شرط لازمی ہے (یعنی نئے ادب کے مقاصد پر پورا اترنا) اس کی کوئی پروا نہیں کرتا۔ اس طرح رومانی شاعری نادانستہ طور پر نئے ادب میں شامل ہو گئی ہے۔ مثال کے لئے ملاحظہ ہو شاعر کا وہ کلام جو نئے ادب میں شمار ہوتا ہے، جگن ناتھ آزاد کی نظم "سکوت"، مجیب الرحمن کی نظم "ایک لمحہ" اور اختر الایمان کی نظم "قلوپطرہ"۔ اس قسم کی شاعری نئے ادب کے مقاصد سے کوئی رشتہ نہیں رکھتی۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ نئے ادب میں اس قسم کی نظموں کی موجودگی اسے بھرتے [illegible]

"کو بھی نہیں کھٹکتی بلکہ الٹی مستحسن سمجھی جاتی ہے۔

اسی طرح نئے ادب میں بہت سی ایسی نظمیں بھی شمار کی جاتی ہیں جو بالکل مہمل ہوتی ہیں۔ جدید شاعری میں ان کا شمار اس لئے ہوتا ہے کہ ان میں بحر وقافیہ کی پابندی نہیں ہوتی۔ ورنہ معانی ومطلب کے لحاظ سے وہ کسی قسم کی شاعری میں شمار ہونے کے قابل نہیں ہوتیں۔ میں اس قسم کی نظموں کی کافی مثالیں دے سکتا ہوں۔ لیکن میں اپنے وقت کی قدر کرتا ہوں!!

جدید شاعری بہ لحاظ حسنِ تخیل

حسنِ تخیل کے لحاظ سے جدید شاعری کی تقریباً وہی پوزیشن ہے جو جدید نثر کی ہے یعنی یہاں بھی تخیل تحلیلی وترکیبی کا فقدان نظر آتا ہے۔ رہی تخیل تمثیلی تو وہ بھی داخلیت کے حد سے بڑھتے ہوئے مذاق کے باعث کما حقہٗ ظاہر نہیں ہونے پاتی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جدید شعراء کو عام طور پر اپنے گرد وپیش کی مختلف اشیاء، اور حالات کا مطالعہ کرکے ایک مرکزی تصور پیش کرنا نہیں آتا۔ اور نہ ایک مرکزی تصور کی روشنی میں مختلف اشیاء، اور واقعات کو دیکھنا ہی آتا ہے۔ وہ بالعموم نفس کی داخلی کیفیات کی گتھیوں کو سلجھانے میں اس قدر محو ہوجاتے ہیں کہ ان کو تجزیہ یا ترکیب کی مہلت ہی نہیں ملتی۔ اگر وہ خارجی دنیا کا مطالعہ کرتے بھی ہیں تو دو ایک چیزیں یا واقعات دیکھنے کے بعد انھیں اپنی "نفسیاتی الجھن" یاد آجاتی ہے۔ اور وہ معاً خارجی دنیا سے الگ ہوکر "نفس خراشی" کرنے لگتے ہیں۔ خارجی اشیاء، اور واقعات کا داخلی اور شخصی تصور ایک ادبی خوبی ہے بشرطیکہ ایسا تصور صحیح الدماغ انسانوں کی زبان میں پیش کیا جائے۔ لیکن محض اس خوبی سے نئے ادب کے مقاصد حاصل نہیں ہوسکتے۔ اس قسم کی ادبی خوبیاں صرف اس ادب میں ہونی چاہئیں جس کا مقصد براہِ راست حصول مسرت ہو۔ جس ادب کا مقصد ارتقاعِ زندگی ہو اس کو مخصوص انفرادی تاثرات کی عکاسی سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ اس میں تو ایسے تاثرات کی عکاسی ہونی چاہیئے جو عالمگیر ہوں تاکہ انسانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد ان سے متاثر ہوسکے۔ انجم رومانی کی نظم "ایک گھونٹ"۔ "ریگستان" میں جو مخصوص انفرادی تاثر پیش کیا گیا ہے وہ اول تو مجذوبوں کی زبان میں ہے دوسرے اگر داخلیت پسند ادیب اس کے کچھ حصے سمجھ بھی پاسکیں تو ان کو عالمگیر تاثرات کو کیا سروکار؟

یہ صحیح ہے کہ نئے ادیبوں کی بیشتر تعداد نئے ادب کے تخلیقی حالات سے راہِ راست متاثر ہوتی ہے۔ یعنی ان کی تخییل تمثیل نے ان حالات کا ایک واضح عکس قبول کیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں نئے ادیبوں کے یہاں کم ازکم حُسنِ تخییل کی ایک صورت موجود ہے۔ اس کا نتیجہ قدرتاً یہ ہونا چاہیئے تھا کہ جدید شاعری میں ان حالات کی عکاسی اس انداز سے ہوتی کہ دوسرے بھی ان سے تقریباً اسی طرح متاثر ہو سکتے لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے۔ اس کے تین سبب معلوم ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جدید شاعری میں حُسنِ ادا کی کمی ہے جس کا مفصّل ذکر آگے آئے گا۔ دوسرا سبب وہ داخلیت ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اور تیسرا سبب یہ ہے کہ جدید شاعری میں نادانستہ طور پر کچھ اس قسم کی شاعری بھی شامل ہوگئی ہے جس کو نئے ادب کے مقاصد سے کوئی تعلق نہیں۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ نئے ادیبوں کے یہاں جو کچھ بھی حُسنِ تخییل ہے وہ کماحقہٗ ظاہر نہیں ہونے پاتا۔

جدید شاعری بہ لحاظ حُسنِ ادا اب جدید شاعری کو حُسنِ ادا کے نقطۂ نظر سے دیکھنا ہے۔ وہ مخصوص فنّی قواعد اور نکات جن کے صحیح استعمال سے شاعری میں حسن ادا پیدا ہوتا ہے ٹکنیک کہلاتے ہیں۔ ٹکنیک انگریزی لفظ ہے لیکن دو وجہوں سے آج کل اس لفظ کا استعمال اردو تنقید نگاری میں عام ہو رہا ہے۔ ایک تو یہ کہ انگریزی ادب میں اس لفظ کا مقررہ مفہوم ہے جس کو ادا کرنے کے لئے اردو میں کوئی ایک لفظ نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ اس مفہوم میں کئی تصوّرات شامل ہیں۔ ان کا بہ حیثیتِ مجموعی ذکر کرنے کے لئے جب ہم کو ایک لفظ کی ضرورت پڑتی ہے تو ٹکنیک سے بہتر لفظ نہیں ملتا۔ ٹکنیک کے مفہوم میں کم ازکم حسبِ ذیل تصوّرات شامل ہیں:۔

(۱) وزن، بحر اور قافیہ

(۲) استعمالِ الفاظ اور اسلوب

وزن بحر اور قافیہ شاعری کیا ہے؟ اس سوال کا جواب مختلف تنقید نگاروں نے اپنے مختلف طریقوں سے دیا ہے کہ اگر ان جوابات کو ایک جگہ جمع کیا جائے تو غالباً ایک بھرپور کتاب تیار ہو جائے لیکن [illegible] جیسے ایک ماں کو [illegible] بہترین ترتیب [illegible]

وہ موسیقی ہو۔ موسیقی کو اگر آپ بغور دیکھیں گے تو اس میں دو چیزیں نظر آئیں گی (۱) صوتی تواتر یعنی ایک ہی قسم کی آواز کی مساوی وقفوں کے بعد تکرار اور (۲) صوتی تموّج یعنی آواز کا اتار چڑھاؤ۔ (تیسری چیز یعنی ترنم موسیقی کی ایک خوبی ہو لیکن شرط لازمی نہیں ہو۔ یعنی کلام موزوں وحقیقی کو اگر تحت اللفظ پڑھا جائے تب بھی اُس کا شمار موسیقی میں ہو سکتا ہو لیکن محض ترنم سے کوئی کلام موسیقی میں شمار نہیں ہو سکتا مثلاً اگر کلام پاک کو ترنم کے ساتھ پڑھا جائے تو وہ موسیقی نہیں کہلائے گا) صوتی تواتر اور تموّج کو بخوبی سمجھنے میں ذیل کا نقشہ مدد دے گا۔
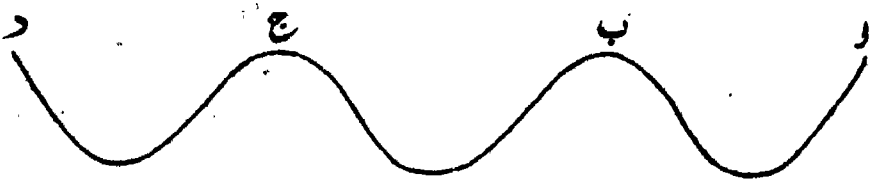
وہ تواتر جو مساوی وقفوں کے بعد واقع ہوتا ہو ا ، ب ، ج ، د کے نقطوں سے ظاہر کیا گیا ہو اور آواز کا اتار چڑھاؤ ان قوسوں سے جو ا اور ب ، ب اور ج ، ج اور د کے درمیان واقع ہیں۔

اب آیئے دیکھیں کہ شعر کے لغت میں اس کے کیا معنی ہوئے۔ شعر کے لغت میں صوتی تواتر کا اگر کچھ مطلب ہو سکتا ہو تو وہ "قافیہ" ہو۔ نقطوں کے درمیان افقی فاصلوں کا اگر کچھ نام ہو سکتا ہو تو وہ "وزن" ہو۔ اور قوسوں کی مخصوص شکلوں کو کیا کہا جا سکتا ہو سوا "بحر" کے؟

اگر آپ کو موسیقی کی تھوڑی سے ذرا بھی مس ہو تو یہ بات آپ سے پوشیدہ نہیں ہوگی کہ کسی سُنے ہوئے نمونۂ موسیقی میں ا اور ب کے درمیان جو افقی فاصلہ ہو، اور قوسوں کی جو مخصوص شکل ہو، ان کو اُس خاص نمونے میں مساوی ہونا چاہیئے۔ پھر جب موسیقی کی یہ خصوصیت ہو تو شعر (جو بغیر موسیقی کے شعر ہوتا ہی نہیں) کیونکر اس خصوصیت سے بے نیاز ہو سکتا ہو؟ اور جب شعر اس خصوصیت سے بے نیاز نہیں ہو سکتا تو وہ وزن، بحر اور قافیہ سے کس طرح بے نیاز ہو سکتا ہو۔

اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ جو شاعری "وزن" بحر اور قافیہ کی پابندیوں سے آزاد ہو وہ شاعری نہیں کہی جا سکتی خواہ اس کا انداز بیان کتنا ہی شاعرانہ کیوں نہ ہو۔ یہاں پر ایک عام غلط فہمی کا ازالہ ضروری [illegible] سے کہ تغزل ایک چیز ہو "ترنم" ایک [illegible]

بعض آوازیں طبعاً سماعت کو خوش آئند معلوم ہوتی ہیں۔ اور بعض ناگوار۔ اور دوسرا ترنم ان کے متناسب استعمال میں ہوتا ہی۔ مترنم الفاظ کا بے ڈھنگا، اوٹ پٹانگ مجموعہ غیر مترنم ہو سکتا ہی۔ اور بظاہر غیر مترنم الفاظ کا باسلیقہ استعمال مترنم ہو سکتا ہی۔ پہلی قسم کا ترنم نثر اور نظم دونوں میں ہو سکتا ہی جس قدر کسی نثر میں اس ترنم کا اثر پایا جائے گا، اسی قدر وہ نثر "شاعرانہ" کہلائے گی۔ لیکن شاعری پھر بھی نہیں کہلائے گی۔ شاعری دوسری ہی قسم کے ترنم سے پیدا ہو سکتی ہی۔ اور یہ دوسری قسم کا ترنم کچھ نہیں ہی سوا موسیقی کے۔ لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ شاعرانہ نثر کی خصوصیت ترنم ہی اور شعر کی خصوصیت موسیقی۔

بعض مغربی نقاد اور فن کار شاعرانہ نثر کو بھی شعر سمجھتے ہیں۔ جس کی وجہ غالباً یہی ہی کہ وہ ترنم اور موسیقی کے فرق کو نہ سمجھنے کے باعث "شعر" کی کوئی جامع و مانع تعریف نہیں کر سکے۔ جب ان کے نزدیک شعر اور شاعرانہ نثر میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہی تو ظاہر ہی کہ وہ اُن خصوصیات کو جو اصول موسیقی کے لحاظ سے مبنائے شعر ہیں، کیوں اہمیت دینے لگے۔ وہ تو ان خصوصیات کو محض پابندیِ بیجا اور قیدِ لایعنی ہی سمجھیں گے۔ یہ انھیں نقادوں اور فن کاروں کے خیالات ہیں جو آج کل نئی شاعری پر اپنا سکہ جمائے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ خیالات غلط ہیں اور اس لئے قابلِ ترک۔

جدید شاعری سب کی سب بے بحر و قافیہ نہیں ہی۔ اس میں بعض نظمیں بحر و قافیہ کی پابندی کے ساتھ لکھی گئی ہیں لیکن چونکہ زیادہ تعداد "آزاد" نظموں کی ہی اس لئے بحیثیت مجموعی جدید شاعری کو آزاد شاعری کہنا غلط نہ ہوگا۔ وزن، بحر اور قافیہ کے موضوع پر جتنے مضامین میری نظر سے گزرے ہیں، ان میں سے چار مضامین مجھے سب سے زیادہ سائنٹفک معلوم ہوئے۔ دو مضامین (علامہ اختر علی تلہری اور عندلیب شادانی کے لکھے ہوئے) وزن، بحر اور قافیہ کی حمایت میں اور دو مضامین (احتشام حسین صاحب اور کلیم الدین احمد کے لکھے ہوئے) آزاد شاعری کے ڈیفنس میں۔ ان چاروں میں اس موضوع پر سنجیدگی اور استدلال کے ساتھ بحث کی گئی ہی۔ آزاد شاعری کا نقطۂ نظر میرے خیال میں احتشام صاحب نے بہترین طریقے پر پیش کیا ہی لیکن پابند شاعری کی حمایت میں علامہ تلہری اور عندلیب صاحب نے جو کچھ فرمایا ہی میری رائے میں وہ کسی قدر تشنہ ہی۔ اور اس کے بارے میں مزید بحث کی گنجائش اور ضرورت ہی [illegible]

کا مضمون میں نے صحیح طور پر سمجھا ہے تو میرے خیال میں وہ شاعری میں (خواہ وہ کسی قسم کی ہو) وزن کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں سمجھتے کہ کسی نظم کے ہر مصرعے میں ارکانِ بحر کی تعداد یکساں ہو اور ہر دوسرے تیسرے یا چوتھے مصرعے میں قافیے کا اعادہ کیا جائے۔ اگر ارکان بحر سے قطع نظر کیا جا سکے، جیسا کہ احتشام صاحب کا خیال ہے، تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بحر کے معنی کیا رہ جائیں گے۔ بحر تو ایک قسم کا پیمانہ ہے جس سے شاعر اپنی نظموں کا وزن ناپتا ہے۔ اور "ارکان" وہ انچ یا سینٹی میٹر ہیں جن سے مل کر یہ پیمانہ بنتا ہے۔ اگر ہر مصرعے میں انچوں یا سینٹی میٹروں کی تعداد بدلی جا سکتی ہے تو پھر پیمانے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ ہے احتشام صاحب کے نظریے کا منطقی نتیجہ۔ لہٰذا میں تو اُن کی تحریر کا یہی مطلب لے سکتا ہوں کہ وہ بحر اور قافیے دونوں کو قطعی غیر ضروری چیزیں سمجھتے ہیں۔

اب آیئے دیکھیں کہ بحر و قافیہ کے مخالفین یا ان کو ضروری نہ سمجھنے والوں کا استدلال کیا ہے اور وہ کہاں تک معقول اور قابلِ قبول ہے۔ ان لوگوں کے استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ۔

(۱) بحر و قافیہ کی قیدیں فطری نہیں ہیں بلکہ انسان کی بنائی ہوئی چیزیں ہیں اور حسبِ ضرورت بدلی یا مٹائی جا سکتی ہیں۔

(۲) یہ قیدیں نئے تصورات کی ترجمانی میں غیر ضروری رکاوٹ پیدا کرتی ہیں، لہٰذا

(۳) ان کو توڑ دینا چاہیئے۔

میں نے جو کچھ شعر کی موسیقی کے سلسلے میں عرض کیا ہے اُس سے یہ ظاہر ہے کہ وزن، بحر اور قافیہ قیدیں نہیں ہیں بلکہ مینارِ شعر ہیں۔ اور انسان کے بنائے ہوئے نہیں ہیں بلکہ فطری ہیں۔ وزن، بحر اور قافیہ کچھ نہیں ہے سوا احساسِ موسیقی کے۔ اور احساسِ موسیقی کو انسان کا "بنایا ہوا" وہی کہہ سکتا ہے جس میں اس احساس کی شدت کے ساتھ کمی ہو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ شعر عبارت ہوتا ہے محض وزن، بحر اور قافیے سے۔ نہیں، شعر میں اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہونا چاہیئے۔ لیکن میں یہ ضرور کہتا ہوں کہ ان تینوں چیزوں کے بغیر شعر شعر نہیں بلکہ الفاظ کا ڈھیر ہوتا ہے۔ ایک پارۂ سنگِ مرمر اور ایک تودۂ خاک میں آخر کیا تو فرق ہوتا ہے کہ اس کے ذرات ایک خاص نظم میں منضبط ہوتے ہیں اور اس کے بے نظم منتشر اور [illegible]

ہوتے ہیں، الفاظ مانند ہیں برادۂ آہن کے اور ایک اچھا شاعر ہی بمنزلۂ مقناطیس کے۔ جس طرح مقناطیس کے قریب آتے ہی آہنی ذرات میں جان سی پڑجاتی ہے اور وہ اس کے گرد ایک خاص نظم کے ساتھ (اہلِ سائنس یہ بات جانتے ہیں) مجتمع ہوجاتے ہیں، بالکل اسی طرح ایک فطری اور قادر الکلام شاعر کی موجودگی میں الفاظ برقی پا ہوجاتے ہیں۔ اور ان کی زبان سے شعر بن کر نکلنے لگتے ہیں۔

جب وزن، بحر اور قافیہ انسان کی بنائی ہوئی چیزیں نہیں بلکہ فطری اور لازمۂ شعر ہیں تو ان کو مٹانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ آپ ان کو مٹانے کی کوشش کریں گے تو خود شاعری مٹ جائے گی۔ البتہ آپ ان میں تبدیلی شوق سے کرسکتے ہیں اگر اس کی ضرورت ہو۔ نئے اوزان مقرر کیجئے۔ جدید اور زیادہ مترنم بحریں دریافت کیجئے۔ اچھوتے اور خوب صورت قافیے تلاش کیجئے۔ کون منع کرتا ہے؟

میں یہ ماننے کے لئے بالکل تیار نہیں کہ وزن، بحر اور قافئے کی پابندی نئے تصورات کی ترجمانی میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ مشاہدہ تو یہ بتاتا ہے کہ اگر شاعر (اقبال اور جوش کی سی نہ سہی) احسان دانش اور اختر انصاری کی سی شاعرانہ قدرت رکھتا ہو تو وہ ہر خیال کو بہترین طریقے سے ادا کرسکتا ہے۔ میں یہ مانتا ہوں کہ خیال کا تسلسل غزل کی سی سخت پابندیوں کو برداشت نہیں کرسکتا۔ لیکن اردو میں غزل کے علاوہ اور اصنافِ سخن بھی تو ہیں۔ کیا ہیئت، مثلث، مخمس، مسدس، وغیرہ مسلسل خیال کو نظم کرنے سے قاصر ہیں؟ اور اگر بالفرض ایسا ہو بھی تو کیا بحر و قافیہ کی پابندی کے ساتھ دوسری اصناف نہیں ایجاد کی جاسکتیں؟ کیا کئی جدید شاعروں نے ایسی اصناف نہیں ایجاد کیں؟ پھر ان شعراء کا تتبع کرنے میں کون سی چیز عارج ہے؟ آخر وہ کونسا خیال ہے جو بحر و قافیہ کی پابندی کے ساتھ بہترین طریقے پر ادا نہیں کیا جاسکتا؟ جب تک اس سوال کا مفصل اور شرح جواب نہ دیا جائے، نئے ادیبوں کے وہ مبہم الزامات جو پابند شاعری پر وارد کئے جاتے ہیں، لائق توجہ نہیں قرار پاسکتے۔

ہاں ایک چیز ایسی ہے جو پابند شاعری میں اتنی خوبصورتی کے ساتھ جلوہ گر نہیں ہوسکتی جتنی کہ آزاد شاعری میں۔ وہ چیز بہاؤ ہے۔ پابند شاعری میں آپ ایک جملے کو زیادہ سے زیادہ دو یا تین مصرعوں پر پھیلا سکتے ہیں۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ کی تمام نظم یا نظم کا بیشتر حصہ ایک ہی جملے پر مشتمل ہو۔ آزاد شاعری

میں یہ بات نہایت آسانی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا "بہاؤ" دراصل صرف اسی کا نام ہے کہ ایک جملے کو مختلف مصرعوں پر پھیلایا جا سکے۔ اگر کوئی ایسا سمجھتا ہے تو یہ اس کی تنگ نظری ہے۔ "بہاؤ" اصل میں خیال کے تسلسل کو کہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ تسلسل خیال کے لئے جملے کی ساخت سے مدد لی جا سکتی ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جملوں کو پھیلائے بغیر تسلسل خیال ادا ہی نہیں کیا جا سکتا۔ تسلسل خیال کا منبع حقیقت میں دماغ ہے نہ کہ گرامر۔ اگر دماغ میں کوئی خیال مستقل اور واضح وجود رکھتا ہے تو طرز بیان میں منطقی تسلسل از خود پیدا ہو جائیگا۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو جملوں کی ساخت سے کوئی کام نہیں نکل سکتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ انداز بیان میں "بہاؤ" ایک اچھی چیز سہی، لیکن یہ کوئی اتنی اہم چیز نہیں کہ شاعری کے حسن کو اس کے اوپر قربان کیا جا سکے۔ شعر کی ہستی کا جواز اس کی اثر انگیزی ہے۔ اگر شعر میں اثر نہ ہو تو نثر اس سے بدرجہا بہتر چیز ہے۔ اب اگر شاعری میں "بہاؤ" پیدا کرنے کی خاطر کوئی شخص اس کی موسیقی پر پانی پھیر دے تو اس نے شعر کیا خاک کہا! اس سے بہتر تو یہ ہوتا کہ وہ اپنا مافی الضمیر نثر میں ادا کرتا۔ کیونکہ اچھی نثر بدنما شاعری کے مقابلے میں اثر انگیزی کی قابلیت زیادہ رکھتی ہے۔

شاعری میں بحر و قافیہ کی پابندی صرف یہی نہیں کہ تصورات کے اظہار میں کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کرتی بلکہ ایک اچھے شاعر کے لئے فی الحقیقت ممد و مفید ثابت ہوتی ہے۔ ان پابندیوں سے کلام میں توانائی اور زور پیدا ہوتا ہے جو شاعری کی اثر انگیزی کے لئے ایک شرط لازمی ہے۔ یہ اصول صرف شاعری ہی میں نہیں بلکہ فطرت کی ہر چیز میں کار فرما نظر آتا ہے۔ جنگل کی خودرو نباتات میں وہ حسن نمو کہاں جو کسی اچھے باغ کے پودوں میں نظر آتا ہے؟ تخمی آم میں وہ بات کیوں نہیں ہوتی جو قلمی میں ہوتی ہے؟ کیا ایک دہقانی اپنے دماغ سے وہی کام لے سکتا ہے جو ایک تعلیم یافتہ آدمی لیتا ہے؟ کیا باغ کا حسن نمو، قلمی آم کی شیرینی اور تعلیم یافتہ آدمی کا دماغ بغیر کسی پابندی کے حاصل ہو سکتا ہے؟

شاعری کی پابندیوں سے دراصل وہی لوگ گھبراتے ہیں جن میں شاعری کی قابلیت نہیں ہوتی۔ ان لوگوں کو میرا دوستانہ مشورہ ہے کہ وہ اس جھگڑے میں نہ پڑیں بلکہ اپنا وقت کسی مفید مشغلے میں صرف کریں۔ شاعری حقیقت میں نثر سے بڑی حد تک مشکل چیز ہے۔ اگر کسی شخص کے دل میں شاعرانہ خیالات جوش کرتے ہیں اور وہ شاعری کی قابلیت نہیں رکھتا تو بہتر ہے کہ وہ شاعرانہ نثر لکھے [illegible] اپنا شاعری کرنے کے وقت اور کاغذ برباد کرنے [illegible]

میں یہ نہیں کہتا کہ سارے جدید شعراء اناپ شناپ لکھتے ہیں۔ نہیں۔ ان میں سے بعض حقیقی شاعرانہ صلاحیتیں رکھتے ہیں لیکن آزاد شاعری کی دُھن میں اپنی دو یعت فطری کو غلط استعمال کرتے ہیں۔ اس سے وہ کام نہیں لیتے جو وہ لے سکتے ہیں۔ مثلاً فیض کو اظہارِ خیال پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے لیکن چونکہ وہ اس قدرت سے وہ فائدہ نہیں اٹھاتے جس کو اٹھانے کا انھیں حق ہے۔ لہٰذا میرے خیال میں وہ کبھی درجۂ اوّل کے شعراء میں بار نہیں پا سکتے۔

استعمالِ الفاظ اور اسلوب

ادب کا ذریعۂ اظہار الفاظ ہیں۔ لہٰذا ادیب یا شاعر کے لئے الفاظ جو اہمیت رکھتے ہیں وہ ظاہر ہے۔ کسی ادیب یا شاعر کے دل میں کتنا ہی پیارا خیال کیوں نہ ہو، اگر اسے الفاظ کے استعمال پر قدرت نہیں ہے تو وہ کبھی اُس خیال کو صحیح اور پُر اثر طریقے پر ادا نہیں کر سکتا۔ خیال کے صحیح اور پُر اثر اظہار کے لئے ادیب یا شاعر میں تین چیزیں ہونی چاہئیں:۔

(۱) موضوع سے پوری واقفیت، خلوص اور ہمدردی

(۲) زبان پر قدرت

(۳) جدّت

یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ جدید شعراء میں دو قسم کے لوگ شامل ہیں ایک وہ جو نئے ادب کے تخلیقی حالات سے براہِ راست متاثر ہوئے ہیں اور اس لئے اس کے مقاصد وغیرہ سے پوری آگاہی خلوص اور ہمدردی رکھتے ہیں۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو نئے ادب کے مقاصد وغیرہ کو مطلق نہیں سمجھتے اور جن کا شمار جدید شعراء میں محض اس لئے ہوتا ہے کہ وہ آزاد شاعری کرتے ہیں۔ یہ بالکل ظاہر ہے کہ دوسری قسم کے شعراء نئے ادب کے بنیادی تصورات کی صحیح اور پُر اثر ترجمانی نہیں کر سکتے خواہ ان کی تخیلات بادی النظر میں کتنی ہی دل کش کیوں نہ ہوں۔ جہاں تک میں دیکھتا ہوں جدید شعراء میں زیادہ تعداد اسی دوسری قسم کے شعراء کی ہے۔

قدرتِ زبان کے متعلق کافی بحث نئے ادب کی نثر کے سلسلے میں ہو چکی ہے جس کے اعادے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ البتہ جدّت کا معاملہ وضاحت طلب ہے۔ ہر زبان میں الفاظ کی تعداد محدود ہوتی ہے لیکن انسانی خیالات لا محدود ہوتے ہیں جن کو ادا کرنے کے لئے موجودہ الفاظ کا ذخیرہ کافی نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں ایک

اچھا ادیب یا شاعر دو ترکیبوں سے کام لیتا ہے۔ کچھ تو پرانے الفاظ کو نئے معنوں میں استعمال کرتا ہے اور کچھ نئے الفاظ خود وضع کرتا ہے۔ دونوں ترکیبوں میں ادیب یا شاعر کی لسانی قابلیت اور اس کی تخیل کی وسعت۔ گہرائی اور بلندی کو بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔ اسی لسانی قابلیت اور وسعتِ تخیل، عمقِ تخیل اور رفعتِ تخیل کے خوبصورت امتزاج کو اصطلاح میں "جدت" کہا جاتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ نئے ادب کے سلسلے میں جدت کی ضرورت ہے یا نہیں۔ اور ہے تو کس قدر۔ نیز یہ کہ نئے ادیبوں کے یہاں یہ خصوصیت فی الحقیقت کس حد تک موجود ہے۔

اردو نظم میں یوں تو بہت سی اصناف ہیں لیکن جو مقبولیت ابتدا سے غزل کو حاصل رہی ہے وہ کسی دوسری صنف کو نصیب نہیں ہوئی۔ لہذا بہ حیثیت مجموعی یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ اردو نظم کی زبان غزل ہے۔ یہ صنف اردو کو فارسی سے ورثہ میں ملی ہے۔ لہذا اس کی ابتدا کی صحیح تاریخ فارسی ادب میں تلاش کرنی چاہیئے نہ کہ اردو میں فارسی ادب کی تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ غزل کی عمر اس وقت کم از کم ایک ہزار سال ہے۔ کسی صنفِ سخن کا اتنے عرصے تک مقبولِ عام رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ چند حقیقی اقدار کی حامل ہے۔ کسی خاص قسم کی اقدار کا اس کثرت سے بیان ہونا جیسے کہ وہ غزل میں بیان ہوئی ہیں اور اس کے باوجود غزل کی تازگی اور دلکشی باقی رہنا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اقدار ابدی ہیں۔ اگر غزل میں اتنا تنوع نہ ہوتا جتنا کہ ہے تو وہ کبھی اپنی دلکشی باقی نہیں رکھ سکتی تھی۔ لیکن یہ تنوع بہ لحاظِ مضامین ہے نہ کہ بہ لحاظ لہجہ۔ غزل کی ایک خاص زبان اور خاص لہجہ ہے جو اصطلاح میں "تغزل" کہلاتا ہے۔ مضمون خواہ ایک سائنسی کلیہ ہو یا ما بعد الطبیعاتی مسئلہ، سماجی نظریہ ہو یا سیاسی تصور، تصوفی تجربہ ہو یا جوگی گیان، مذہبی عقیدت مندی ہو یا فلسفیانہ تشکک، تجزیۂ نفسی ہو یا واردات قلب کی عکاسی، سراپائے حسن ہو یا کیفیاتِ عشق کا اظہار، لیکن۔

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اسی "بادہ و ساغر" کو سلیقے کے ساتھ استعمال کرنے کا نام تغزل ہے۔ بادہ و ساغر، گل و بلبل، قفس و آشیاں باغ و بہار، خورشید و شبنم، برق و خرمن، بت و کلیسا، محمل و لیلیٰ، مجنوں و صحرا وغیرہ غزل کی زبان میں محض [illegible] کی حیثیت نہیں رکھتے۔ ان کی تہ میں روایات اور معانی کا ایک سمندر ہے۔ ان کی بدولت غزل میں ایک [illegible] [illegible] [illegible] اصطلاح میں ایسے الفاظ کو [illegible]

کہتے ہیں۔ جس طرح ریاضی کی علامات کو ایک ریاضی داں ہی سمجھ سکتا ہے۔ اور استعمال کر سکتا ہے، بالکل اسی طرح غزل کی علامات کو سمجھنے اور استعمال کرنے کا وہی شخص اہل ہو سکتا ہے جو تغزل کا مذاق رکھتا ہو۔ اور جس طریقے ریاضی داں کو اختیار ہے کہ "x" "y" کے استعمال میں حسب ضرورت اختراع و ایجاد سے کام لے، بعینہٖ مذاق تغزل رکھنے والے انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ تغزل کی علامات کو اُن کے مروّج معنوں کے علاوہ دوسرے معنوں میں استعمال کرے۔ بعض غزل گو شعراء نے واقعی ایسا کیا بھی ہے اور خوب کیا ہے۔ مثلاً غلام بھیک صاحب نیرنگ کی بعض غزلیں سیاست حاضرہ کا بہترین تبصرہ ہیں۔

لیکن غزل کی زبان اگر ایک طرف قوتِ زبان کے لحاظ سے لامحدود ہے تو دوسری طرف عام فہمی کے لحاظ سے نہایت محدود ہے۔ علامات کا استعمال شاعری کو خوب صورت، جاذب نظر اور "دریا بہ کوزہ اندر" تو بنا سکتا ہے لیکن عام فہم نہیں بنا سکتا۔ کیونکہ علامت بالآخر علامت ہے۔ سیدھی سادی زبان نہیں۔ اور نئے ادب کے تصورات ایسے ہیں جن کو عام فہم ہونا ہی چاہیئے ورنہ مقصد حاصل نہیں ہو سکے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم علامات غزل کے مروّج معنوں کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ اگر ان میں کوئی اختراع کی بھی جائے تو عوام تو کجا خواص کی نگاہ بھی وہاں فوراً نہیں پہنچ سکتی۔ لہٰذا نئے ادب کی ترویج و اشاعت کے لئے غزل کی زبان موزوں نہیں ہے۔

پھر جب اردو نظم کی زبان بہ حیثیت مجموعی غزل کی زبان ہے اور غزل کی زبان نئے ادب کے لئے موزوں نہیں ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے ادب کے اظہار کے لئے کون سی زبان اختیار کی جائے۔ اس کا واحد جواب یہ ہے کہ ایک ایسی زبان اختراع کی جائے جس میں نئے تصورات کو عام فہم اور شاعرانہ انداز میں ادا کرنے کی قابلیت ہو۔ نئے ادب میں جن اسباب کی بناء پر جدت کی ضرورت ہے ان میں سے یہ ایک اہم سبب ہے۔ لیکن یہی سارا سبب نہیں ہے۔ جدت کی ایک اور وجہ کی بناء پر بھی ضروری ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ "نکیلے" اور "دھار" والے الفاظ کثرت استعمال کے باعث کچھ دنوں بعد اپنا نکیلا پن اور تیزی کھو بیٹھتے ہیں۔ مثلاً آنکھوں کے لئے "کٹاری" کا لفظ جب پہلے پہل استعمال کیا گیا ہوگا تو اس میں حد درجہ نکیلا پن اور تیزی رہی ہوگی۔ لیکن کثرت استعمال کے باعث اس میں فرسودگی اور ابتذال آگیا ہے چونکہ ابھی تک اردو نظم کی زبان غزل ہی کی ہے اور غزل کے

الفاظ اور اسالیب کثرتِ استعمال کے باعث فرسودہ، بے نوک پاکند ہو چکے ہیں، اس لئے مارکس اور فرائڈ کے تصورات کی ترجمانی کے لئے ایک نئی زبان کی ضرورت اس وجہ سے بھی ہے۔

نئے ادیبوں میں یہ جدّت کس حد تک موجود ہے؟ جہاں تک منفرد الفاظ اور ترکیب کا تعلق ہے نئے ادیب جدّت کے معاملے میں کافی ترقی یافتہ ہیں۔ گو بعض اوقات یہ جدّتیں مضحکہ انگیز ہوتی ہیں۔ میں یہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ایک اچھا ادیب یا شاعر جدّت کے معاملے میں دو ترکیبوں سے کام لیتا ہے۔ کچھ تو پُرانے الفاظ کو نئے معنوں میں استعمال کرتا ہے اور کچھ نئے الفاظ خود وضع کرتا ہے۔ نئے ادیبوں نے عام طور پر ان دونوں ترکیبوں سے کام لیا ہے۔ لیکن نئے تصورات کی ترجمانی کے لئے صرف الفاظ کی جدّت کافی نہیں ہے بلکہ اسلوب کی جدّت بھی درکار ہے۔ نئے ادب میں اسلوب کی جدّت بھی موجود ہے۔ بلکہ غیر مناسب حد تک موجود ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ جدّت وہی ہے جس کی کہ نئے ادب کے مقاصد کے پیشِ نظر ضرورت تھی۔ یا یہ محض جدّت کی خاطر جدّت ہے۔ نئے ادب کے مقاصد کے پیشِ نظر جدید شاعری کے لئے ایک ایسے اسلوب کی ضرورت ہے جو معقول اور دلچسپ ہو اور زیادہ سے زیادہ انسانوں پر اثر کرنے والا ہو۔ اگر ایسا نہیں ہے تو نئے ادب کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔ خواہ نئے ادیب کتنی ہی موشگافی کریں۔ یہ صحیح ہے کہ جدید شاعری میں غزل کی علامات کا استعمال کم ہوتا ہے جس کا اثر یہ ہونا چاہیئے تھا کہ وہ غزل کی نسبت زیادہ عام فہم اور پُر اثر ہوتی۔ لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ نئی شاعری کو سمجھنے اور اس سے متاثر ہونے والے پڑھے لکھوں میں بھی کم ہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ نئی علامات اور نئے اسالیب ابھی متعین نہیں ہوئے نئے ادب کی عمر کو دیکھتے ہوئے یہ بات غیر متوقع نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ نئی شاعری میں "بہاؤ" پیدا کرنے کا کچھ ایسا فیشن ہو گیا ہے کہ شاعر اوّل تو اپنے کمالِ شناوری کی نمائش ساحل کی بجائے منجدھار سے شروع کرتا ہے اور پھر خود اپنے بہاؤ میں ایسا بہتا ہے کہ اظہارِ کمالِ شناوری تو الگ رہا اسے اپنے سر پیر تک کا ہوش نہیں رہتا۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے بغیر کسی تمہید یا تعارف کے شروع کر دیتا ہے اور پھر دریا کے بہاؤ کی طرح سب کچھ ایک ہی سانس میں سنا ڈالتا ہے۔ ناظر یا سامع کا ذہن مشرقی معانی کے تعاقب میں غیر مساوی مصرعوں کے نشیب و فراز میں گرتا پھاندتا شاعر کا ہمرکاب ہونا چاہتا ہے مگر وہ مشرق ہی کیا جو مل جائے! جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں میں

دراصل بہاؤ" کا مخالف نہیں۔ خیالات کا تسلسل خود اس کا متقاضی ہوتا ہی۔ لیکن جدید شاعری میں عام طور پر جس بہاؤ کا مظاہرہ کیا جاتا ہی وہ حقیقت میں بہاؤ نہیں بلکہ طغیانی ہوتی ہی جس میں جملے کی مبتدا اور خبر، فاعل اور مفعول، فعل اور متعلقاتِ فعل اور ان سب کے ساتھ معانی و مطلب، خس و خاشاک کی طرح بہتے چلے جاتے ہیں!

تیسری بات یہ ہی کہ بعض جدید شعراء اپنے کلام میں بیکار قسم کی تفصیلات لاکر شاعری کو حضرت حسن نظامی کا روزنامچہ بنا دیتے ہیں! (میرا مطلب یہ نہیں کہ خواجہ صاحب کے روزنامچے میں "بیکار" تفصیلات ہوتی ہیں روزنامچہ ہوتا ہی اسی قسم کے واقعات کے لئے ہی۔ جو روزنامچہ نگار کو دن بھر میں پیش آئیں پھر ان میں بیکار یا کارآمد کا سوال کیسے پیدا ہو سکتا ہی) لیکن شاعری تو روزنامچے سے علیحدہ چیز ہی۔ شاعری آرٹ ہی، اور آرٹ کہتے ہیں نقاشی کو، عکاسی کو نہیں۔ آرٹسٹ کا کام یہ نہیں ہی کہ وہ کسی واقعے کی تمام تفصیلات کو من و عن بیان کرے۔ اس کا کام یہ ہی کہ وہ اُن تفصیلات میں سے ایسی تفصیلات کو منتخب کرے جو اس واقعے کی معنویت کے اظہار میں ممد و معاون ہوں۔ جدید شعراء میں سے جو لوگ بیکار قسم کی تفصیلات بھرنے کے عادی ہیں وہ شاید یہ سمجھتے ہیں کہ ایسا کرنے سے "مقامی رنگ" کے اظہار میں مدد ملتی ہی۔ لیکن ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ایک اوسط درجے کے پڑھے لکھے آدمی کا دماغ چند ہلکے اشاروں کی مدد سے "مقامی رنگ" خود بخود پیدا کر لیتا ہی۔ اور بیکار تفصیلات سے صرف یہی نہیں کہ "مقامی رنگ" بدنما ہو جاتا ہی بلکہ اکثر اوقات مطلب بھی خبط ہو جاتا ہی۔ جدید شاعری میں اس عیب کے نمائندۂ خاص حضرت مخمور جالندھری ہیں۔ اور ان کے مقلدوں کی تعداد بفضلہٖ بہت کافی ہی!

جدید شاعری اور اثر انگیزی

اب یہ دیکھنا ہی کہ جدید شاعری میں ناظرین یا سامعین کو متاثر کرنے کی قابلیت کہاں تک ہی۔ شاعری میں اثر انگیزی کی قابلیت زیادہ تر دو چیزوں سے پیدا ہوتی ہی (۱) حُسن اور (۲) جذبات۔ حُسن کے متعلق مفصل بحث حُسنِ موضوع، حُسنِ تخیل اور حُسنِ ادا کے سلسلے میں ہو چکی ہی۔ اس بحث کا خلاصہ یہ ہی کہ جدید شاعری (بلکہ آزاد شاعری) تکنیکی حیثیت سے بہت ناقص چیز ہی اس لئے اس کا اثر وہ نہیں ہوتا جو ادب کے مقاصد کے پیشِ نظر ہونا چاہیئے تھا۔ اب یہ دیکھنا ہی کہ

جذباتی حیثیت سے جدید شاعری کا کیا پایہ ہے۔

جدید شعراء تقریباً سب کے سب نوجوان ہیں اور نوجوانوں کے کلام میں جذباتیت کی کمی کی شکایت کسی کو نہیں ہوسکتی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا جدید شاعری میں صحیح قسم کی جذباتیت ہوتی ہے۔ صحیح قسم کی جذباتیت وہ ہے جو سامعین یا ناظرین کے دلوں میں وہی کیفیات اجاگر کرے جن کو شاعر پیدا کرنا چاہتا تھا۔ جدید شاعر اپنے مخاطبوں کے دلوں میں جو کیفیات پیدا کرنی چاہتا ہے وہ مختصر الفاظ میں یہ ہیں کہ مخاطب موجودہ سماج سے متنفر ہوجائے اور ایک بہتر سماج کی تعمیر پر مائل ہو۔ لیکن جو کیفیات عملاً مترتب ہوتی ہیں وہ ان سے بہت مختلف ہیں۔ جدید نظمیں سُن کر یا پڑھ کر سامعین یا ناظرین کو عام طور پر یہ احساس ہوتا ہے کہ شاعر کو اپنی محبوبہ سے ملنے کی آرزو ۱۰۶ درجے پر ہے، یا اس سے ملاقات کا وقت مقرر ہوچکا ہے اور گھنٹوں اور منٹوں کے پہاڑ کاٹے نہیں کٹتے۔ یا چونکہ محبوبہ سے شادی طبقاتی امتیازات کی وجہ سے واقعاتی دنیا میں نہیں ہوسکتی اس لئے شاعر اس کے ساتھ عالمِ تصور میں شادی کرنی چاہتا ہے، یا شاعر اپنی محبوبہ کو میدانِ جنگ میں چلے جانے کی گیدڑ بھبکی دکھاتا ہے، یا اس کو حیات و ممات کا فلسفہ سمجھانے کی کوشش کرتا ہے، یا پھر

"دائرے بنتے چلے جاتے ہیں تاحدِ نظر"

کا وِرد کرتا ہے۔ ان سب موضوعات میں جذبات کی عکاسی کی کافی گنجائش ہے لیکن اس قسم کے جذبات کو نئے سماج کی تخلیق سے کیا مطلب؟ جدید شاعری کی جذباتیت تو کچھ اس قسم کی ہونی چاہیئے کہ مخاطب کو یہ احساس ہوجائے کہ جملہ معاشرتی عوارض کی جڑ موجودہ سماج ہے۔ جدید شاعری کی جذباتیت جس قدر قوی ہوگی اسی قدر یہ احساس بھی قوی ہوگا۔ لیکن جذباتیت کے معنی ہیجان آفرینی کے نہیں ہیں۔ مخاطب میں کسی خاص قسم کا جذبہ بیدار کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ اندازِ بیان "ہسٹریائی" ہو۔ بلکہ اندازِ بیان ایسا ہونا چاہیئے جو نادرباً "دل" میں ارتعاش پیدا کرسکے۔ لیکن جدید شعراء کے یہاں جب کبھی جذباتیت ہوتی ہے تو ہسٹریائی شکل میں۔

نئے ادب کا مستقبل

میرے اس مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ:-

(۱) نیا ادب وقت کی پیداوار ہے۔ لہذا یہ ایک حقیقی ادب ہے۔

(۲) نئے ادب کا مقصد آخری ارتفاعِ زندگی ہے۔

(۳) چونکہ یہ ایک بہت بلند مقصد ہے اس لئے اس کا حصول آسان نہیں۔

(۴) چونکہ نئے ادب کے مقصد کا حصول مشکل اور دیر طلب ہے۔ اس لئے اس کو محض ایک "ہنگامی" ادب نہیں سمجھنا چاہیئے۔

(۵) لیکن بہرحال نئے ادب کا موضوع محدود ہے۔ اس میں وہ وسعت نہیں جو ابدی موضوعات میں ہوتی ہے۔

(۶) جب نئے ادب کا موضوع فی نفسہٖ محدود ہے تو اس کی کامیاب عکاسی کے لئے اس کی حدود پر کڑی نگاہ رکھنی ضروری ہے۔ اگر اس موضوع میں ابدی موضوعات کی آمیزش کی گئی تو خود نئے ادب کے حق میں مضر ہوگی۔

(۷) اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ابدی موضوعات کے اسلوبِ اظہار میں جدت کی ضرورت نہیں۔ ان میں جدت کی ضرورت مسلّم لیکن اس جدت کو نئے ادب سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیئے اگر نئے ادیب بھی ابدی موضوعات میں شریک ہونا چاہتے ہیں تو ہوں۔ لیکن اپنی ان نگارشات کو نئے ادب میں شمار نہ کریں۔

نئے ادب کے مستقبل کے متعلق دو متضاد رائیں ہیں جو لوگ اس کے مخالف ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ نئے ادب کی حیثیت برساتی گھاس کی سی ہے یعنی یہ محض ایک وقتی چیز ہے جو مغربی اثر سے پیدا ہوگئی ہے۔ اور اس اثر کے کم ہوتے ہی فنا ہو جائے گی۔ جو اس کے حامی ہیں ان کا دعویٰ یہ ہے کہ تمام دنیا کا مستقبل کا ادب نیا ادب ہی ہے۔ یعنی وہ اس کے موضوع کو ایک ابدی موضوع سمجھتے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ کچھ عرصہ ہوا اختر انصاری اپنی ادبی ڈائری میں سبط حسن پر اس لئے خفا ہو چکے ہیں کہ انھوں نے نئے ادب کو ایک ہنگامی موضوع کہہ دیا تھا۔ میری رائے ان دونوں راویوں کے درمیان ہے۔ یعنی میں نئے ادب کو نہ تو برساتی گھاس سمجھتا ہوں اور نہ یہ اعتقاد رکھتا ہوں کہ اب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نیا ادب دنیا بھر کا واحد ادب ہو جائے گا۔ نئے ادب کا حقیقت کی بنیادوں پر استادہ ہونا خود اس کی زندگی کا ضامن ہے لیکن ابدی زندگی کا ضامن نہیں ہے اور اس کی وجہ جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے یہ ہے کہ اس ادب کا موضوع بالآخر محدود ہے اور ابدی موضوعات کا ہم پلہ

نہیں۔ لیکن کسی ادب کا محض زندہ رہنا کافی نہیں۔ زندگی اگر پُرجوش اور قوی اور با اثر نہیں تو بیکار ہے۔ نئے ادب کی زندگی میں جوش، قوت اور اثر جب ہی ہو سکتا ہے جب کہ نئے ادیب اور شاعر اس کے مقاصد پر کڑی نگاہ رکھیں۔ وہ جب تک ایسا نہیں کرتے ، ارتقائے زندگی کا تصور ——————

ایں خیال است و محال است و جنوں!

سید باقر حسین

سویٹ روس کی خارجی پالیسی

(گذشتہ سے پیوستہ)

سویٹ روس اور ایران | ۲۵ر اگست ۱۹۴۱ء کے دن سویٹ اور انگریزی فوجوں نے ایران میں مداخلت کی۔ رضا شاہ پہلوی کو تخت سے دست بردار ہونا پڑا اور ان کے ولی عہد تخت نشین ہوئے۔ بین الاقوامی سیاست کو جذبات سے پرکھنے والے سویٹ اور برطانوی مداخلت پر چیں بہ جبیں ہوئے اور بعض بعض سیاسی جماعتوں نے قرار دادیں منظور کرکے اپنے غم و غصہ کا اظہار بھی کیا۔ سویٹ روس کی طرف سے دلوں کی صفائی جو آہستہ آہستہ سرخ فوج کے کارناموں کی وجہ سے ہو رہی تھی ایک بار پھر رک گئی اور قدیمی کدورت پھر عود کر آئی۔ ایران ایک آزاد ملک ہے۔ وہاں سویٹ مداخلت کے کیا معنی؟ روس کے دشمنوں اور خاص کر فاشی نواز حلقوں میں اس بات پر گھما گھمی پڑ گئی اور روس کے خلاف عوام میں بدظنی پھیلانے کا موقعہ پھر ہاتھ آگیا۔ روس کی نام نہاد ملوکیت پرست پالیسی اچھا خاصا مباحث کا موضوع بن گیا۔

لیکن جذبات سے ذرا ہٹ کر واقعات کچھ اور ہی کہانی سناتے ہیں۔ جو لوگ ہر ملک میں فاشزم کے خطرہ کو ممکن سمجھتے ہیں اور اس خوفناک نظریے کو ختم کرنا چاہتے ہیں ایران میں برطانوی سویٹ مداخلت پر چیں بہ جبیں نہیں ہوتے۔ اگر فاشزم کی طاقت توڑنے کے لئے فاشی دشمن فوجیں کسی آزاد ملک میں بھی مداخلت کریں تو ہرگز بے جا نہیں ہے۔ خاص کر ایسے آزاد ملک میں جو اپنی غفلت اور کوتاہ بینی کی بدولت عنقریب فاشی چنگل میں پھنسنے والا ہو۔ ہاں مداخلت کرنے والی فوجوں یا حکومتوں کی نیت نیک ہونا لازمی ہے۔ سو برطانوی سویٹ اعلان صاف صاف کہتا ہے کہ برطانوی اور سویٹ فوجیں صلح ہوتے ہی واپس بلالی جائیں گی۔ برطانوی سویٹ ایرانی معاہدے کے مطابق برطانیہ اور روس نے وعدہ کیا کہ وہ ایرانیوں کی آزادی اور ان کے ملک کو دشمن حملہ آوروں سے بچائیں گے اور ایران کے اندرونی سیاسی اور اقتصادی معاملات میں بالکل دخل نہ دیں گے۔ انھوں نے یہ بھی وعدہ کیا کہ جنگ کے اختتام پر صلح کی گفت و شنید میں ایران برابر کا ساتھی ہوگا۔ ایران کی مجلس عامہ نے اس

معاہدے کو بہ اتفاق رائے منظور کر لیا۔ ۵۰ ممبروں میں صرف ۲۰ ممبر اس کے خلاف تھے۔ مداخلت کے دس روز بعد ۲۷ اگست سنہ ۴۱ء کو فلسطین کے ایک عربی اخبار "فلسطین" نے لکھا "ایران میں اتحادی مداخلت ایک حلیفانہ اور بروقت عمل ہے۔ اتحادیوں کا منشاء ہرگز ایران کی آزادی پر ڈاکہ ڈالنا نہیں ہے۔"

آخر برطانوی سوویٹ مداخلت کی ضرورت ہی کیا پیش آئی؟ چونکہ ہم روس کی خارجی پالیسی سے بحث کر رہے ہیں اس لئے اس واقعہ کو محض روس اور ایران کے نقطۂ نگاہ سے دیکھیں گے۔ برطانیہ کا مسئلہ ہماری بحث سے خارج ہے۔ یہ ہمیں معلوم ہے کہ جرمن فوجیں دو ماہ تک روس میں قہر آور جنگ کے بعد بھی روس میں نہ تو دوسرے ملکوں جیسی پھوٹ ڈال سکیں اور نہ گھریلو اور فوجی محاذ کو کمزور کر سکیں۔ چونکہ روس ایک عرصے سے ہٹلر کے ارادوں کو بھانپ چکا تھا۔ اس لئے اس نے دفاعی تدبیروں میں حتی الامکان کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اپنی مغربی سرحد پر زبردست مورچہ بندیاں کیں اور سرنگ، بارود، اور جدید دفاعی طریقوں سے اپنے ملک کو بچاؤ کے لئے تیار کیا۔ روس کی شمالی یعنی فن لینڈ کی سرحد پر گذشتہ سال ہی نبرد آزمائی کے بعد روسی قلعہ بندیاں مضبوط کی گئی تھیں۔ لٹویا، اسٹونیا، اور لتھوانیہ کا روس میں شامل ہونا بھی دفاعی تدبیروں کی وجہ سے عمل پذیر ہوا۔ لیکن جنوب میں روسی ایران سرحد اب تک کمزور تھی۔ نہ تو وہاں قلعہ بندیاں ہی ہوئی تھیں اور نہ سوویٹ حکومت نے یہ مناسب سمجھا کہ ایران کی سرحد مضبوط کی جائے کیونکہ سنہ ۲۱ء کے روسی ایرانی معاہدہ کے بموجب روس کو یہ حق حاصل تھا کہ اپنے ملک پر ایران کی طرف سے حملہ کی صورت میں وہ ایران میں داخل ہو جائے۔ اس معاہدے کی دفعہ ۶ یہ تھی "اگر کسی وقت بھی کوئی ملک سوویٹ یونین پر حملہ کرنے کے لئے ایران کو اڈا بنانے کی کوشش کرے اور ایرانی حکومت سوویٹ حکومت کے تنبہ کرنے کے باوجود اس خطرے کو دفع نہ کر سکے تو اس حالت میں سوویٹ یونین کو اختیار ہوگا کہ اپنے بچاؤ اور ایرانی عوام کے مفاد کے خیال سے اپنی فوجیں بھیج کر ایران پر وقتی طور پر قبضہ کر لے۔ جس وقت یہ خطرہ دفع ہو جائے گا سوویٹ حکومت فوراً اپنی فوجیں ایران سے ہٹا لے گی۔"

اب یہ دیکھنا ہے کہ آیا ایران کی طرف سے روس پر حملہ کا خطرہ تھا۔ واقعات یہ بتلاتے ہیں کہ اس خطرے کا نہ صرف امکان تھا بلکہ ایران کو اڈا بنانے کے لئے نازی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ دو ہزار سے زائد جرمن

ہٹلر کے حکم کے انتظار میں تھے۔ ایک عرصے سے ان کا اقتدار ایران میں بڑھ رہا تھا اور وہ ملک کی اہم صنعتوں، فیکٹریوں، ہوائی اڈّوں، اور ریل و رسائل کے وسیلوں پر قابض ہو چکے تھے۔ برلن سے اشارہ پاتے ہی وہ توڑ پھوڑ شروع کر دیتے اور ادھر جرمن فوجیں ہوائی جہازوں کے ذریعہ ایران کے اہم شہروں پر اتار دی جاتیں۔ جب ملک کے ہوائی اڈّے اور صنعتیں جرمن جاسوسوں کے حملوں کا نشانہ بن جاتے تو ایران کے لئے سوا اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ ہٹلر اور نازیوں کی اطاعت قبول کر لے۔ اس صورت میں جرمنی بآسانی روس اور ایران کی کمزور سرحد سے فائدہ اٹھاتا اور جنوب سے کاکیشیا پر حملہ کر دیتا۔ اس کے علاوہ ایران کا تیل جرمنی کے ہاتھ لگتا۔ ایشیا اور یورپ کے تیل کی پیداوار کا چوتھائی حصہ صرف ایران میں ہے۔ ایران پر قبضہ کے یہ معنی ہوتے کہ ایران اور عراق کے ۴۵ کروڑ من، باکو کے ۴۵ کروڑ من اور بحرین کے ۲۰ کروڑ من تیل کی سالانہ پیداوار جرمنی کے قبضے میں آجاتی۔ چونکہ آج کل کی جنگ میں تیل کی بہت اہمیت ہے اس لئے اتحادی کبھی یہ گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ جذباتی پاسداری کا خیال کرتے ہوئے ایران میں مداخلت نہ کریں اور دنیا کو فاشی چنگل میں گرفتار کرا دیں۔

جرمنی کی ایک زمانے سے ایران پر نگاہ تھی۔ گذشتہ جنگ عظیم میں قیصر ولیم کی خواہش تھی کہ ترکی افواج ایران پر قبضہ کر لیں۔ ۱۹۱۴ء سے کئی سال قبل سے ہی وہ ایران میں اپنا اقتدار قائم کر رہا تھا۔ طہران میں ایک کالج کی بنیاد ڈالی گئی تھی۔ جس کے معلم سب ہی جرمن تھے۔ نائب قونسل کا ایک دفتر بوشہر میں کھولا گیا تھا۔ جرمن کمپنی وانک خاوس کی یہ کوشش تھی کہ ملوّل کے موتیوں کی کھاڑی، ابوموسیٰ کے سرخ نمک کی کانیں اور خرم شہر کے قریب کا دریائی علاقہ ایران سے ہتھیا لے۔ ۱۹۲۵ء میں قیصر ولیم نے اپنے ایک خاص جاسوس واسموس کو ایران بھیجا۔ واسموس اپنے ارادوں میں زیادہ کامیاب تو نہ ہو سکا ہاں اس نے ملک میں شورش ضرور پھیلا دی۔ ہٹلر کے طاقت میں آنے کے بعد نازی ارادوں میں ایران کو خاص اہمیت دی گئی۔ ہٹلر نے ۱۹۳۳ء میں کہا "مشرق میں ہمارا قبضہ کاکیشیا اور ایران تک ضرور ہونا چاہیئے"۔ (ہٹلر اسپیکس از روشنگ) ڈرینگ ناخ آسٹن (مشرق میں پھیلاؤ) کا حوصلہ جو بسمارک کی ایجاد تھی۔ ہٹلر کے بھی خوابوں کی تعبیر بن گیا۔

جنوب بلقانی ریاستوں کے ہٹلر نے ایران میں بھی تجارتی معاہدوں کے ذریعہ سیاسی اقتدار بڑھانے کی کوشش کی۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۸ء کے درمیان ایران کی درآمد اور برآمد بہت بڑھی۔ صرف ایک سال میں یہ تجارت

دوسرے برسوں کے مقابلے میں چالیس فیصدی زائد ہوگئی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ جرمنی نے کھری تیل جولی بھی بڑھانا شروع کیا۔ برلن میں ایک سوسائٹی اورینٹل ویرین کے نام سے قائم کی گئی جس کا کام محض یہ تھا کہ ایران اور دوسرے مشرق قریب کے ممالک کے جرنلسٹ، طلباء اور سوداگروں کی خاطر مدارات کرے اور انھیں اپنی طرف توڑے۔ گذشتہ چند برسوں میں تمام مشرق قریب کے ملکوں میں جرمنی نے پروپگنڈا پمفلٹ جرائد اور کتابیں تقسیم کیے۔ ایک خوشنما پرچہ "ایران لبستان" کا کل خرچ برلن برداشت کرتا تھا۔ اس کے ایڈیٹر شیخ سیف آزاد نے اپنے جرمن مالکوں کو خوش کرنے کے لیے یہ مشہور کیا کہ طہران کے باب المنار کی پچہ کاری میں جرمن جھنڈے "سواستیکہ" کے نشانات موجود ہیں۔ اس معلومات پر سیف آزاد کو جرمنی کے پروپگنڈا وزیر ڈاکٹر گوئبلس نے مبارک باد پیش کی۔

جب یورپ پر جنگ کے بادل چھانے لگے تو جرمن جاسوسوں کی سرگرمیوں میں بھی اضافہ ہوگیا۔ وہ ایک عرصہ سے چالیں چل رہی تھے۔ ان کے سرغنہ ڈاکٹر فرٹز گرویا (ایک نومسلم) بیرن فان اوپن ہیم (ایک صحرا نورد محقق) بیرن فان ہننگ (عربوں کے نام نہاد دوست) اور روڈالف روزر (قاہرہ کا سوداگر اور کبھی شام کا جرمن قونسل) مشرق قریب کے ممالک میں "سوائیکی شیوخ" کے نام سے ایک جماعت ترتیب دے رہی تھے۔ بیرن فان اوپن ہیم کو عرب قبیلوں کی تحقیق اور چھان بین کا جو شوق سوار ہوا تو وہ جھٹ اپنے چالیس ہم مشرب جرمن لے کر عراق پہنچے۔ اور لطف یہ کہ اپنی تحقیق کا مرکز اس قبیلے کو بنایا جو کرکک جیف آئل کے کنوؤں کے قریب آباد تھا۔ یہ جرمن جاسوس چاہتے تھے کہ تیل کے ان کنوؤں کو اہل قبیلہ کی مدد سے بے کار کر دیا جائے۔ شریف عبدالحمید بن عون جس نے شاہ ابن سعود اور ان کی حکومت کے خلاف دسمبر ۱۹۳۸ء میں سازش کی تھی ۱۹۳۹ء کی گرمیوں میں برلن میں نازی جماعت کا مہمان تھا۔ بغداد میں راشد علی کی ناکام بغاوت کے صرف دو ہی روز بعد سے جرمن جاسوس سیاحوں کے بھیس میں ایران میں آنے لگے۔ انھوں نے طہران کو اپنا مرکز بنا لیا۔ طہران ایران کے دارالخلافہ طہران نے ۲۲۰ میل شمال مغرب میں اور روس کی سرحد سے صرف ۔۔ میل کے فاصلے پر ہے۔ روسیوں نے ایران کو کاکیشیا سے ملانے کے لیے جو ریلوے لائن بنائی تھی اس کا یہ آخری اسٹیشن ہے۔ یہ ریلوے ایران کو آذربائجان کے تیل کے کنوؤں کو

حاصل ہو۔

اوپر کی تشریح سے یہ واضح ہوتا ہو کہ نازی جرمنی روس پر حملہ کرنے کے لئے ایران کو ایک فوجی اڈا بنانا چاہتا تھا۔ روس اسے کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ یہ صحیح ہو کہ روسی فوجیں جرمنی کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہی تھیں لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں ہوسکتے کہ روس کو چاروں طرف سے گھیر لینے کے بعد بھی اس کی فوجیں اسی کامیابی سے دشمن کا مقابلہ کر سکتی تھیں۔ ایران کی طرف سے جرمنی بہ آسانی کاکیشیا پر حملہ کرکے باکو کے تیل کے کنوؤں کو روس کے خلاف استعمال کر سکتا تھا۔ انقلاب کے بعد سے جب عوام طاقت میں آئے روس ہمیشہ اسلامی ممالک سے رواداری اور ہمدردی کا مظاہرہ کرتا رہا۔ زار کے زمانے کی ملوکیت پرست پالیسی کو لینن نے ۱۹۱۹ء ہی میں ختم کر دیا تھا۔ چنانچہ ایران پر روسی مداخلت ملوکیت پرست پالیسی کے ماتحت نہیں ہوئی۔ اس کے علاوہ روس نے شروع جنوری ہی میں ایرانی حکومت کو نازی جاسوسوں اور نازی خطرے سے آگاہ کر دیا تھا اور اگست تک کئی بار یہ مطالبہ بھی پیش کیا کہ وہ نازی جاسوسوں کو ایران سے نکال دے۔ کوتاہ بیں ایرانی حکومت سویٹ حکومت کے بار بار آگاہ کرنے کے باوجود غفلت میں رہی۔ ہم اس سلسلے میں روس کے وزیر خارجہ مولوتوف کے اس نوٹ کے اہم اقتباسات نقل کرتے ہیں جو اس نے روسی مداخلت کے وقت ایرانی سفیر مسٹر محمد سعید کو دیا تھا:۔

"سویٹ حکومت نے ایرانی عوام کی بہبودی کا خیال کرتے ہوئے ہمیشہ ایرانی حکومت سے رواداری کا مظاہرہ کیا ہو۔ اس کے ثبوت میں ۱۴ جون اور ۲۶ جون ۱۹۱۹ء کے معاہدے پیش کئے جاسکتے ہیں۔ ان معاہدوں اور صلح ناموں نے نہایت ہی واضح طور پر اس کا اظہار کیا ہو کہ سویٹ حکومت ایران کی آزادی، خود مختاریت اور ملکی حدود کو تسلیم کرتی ہو۔ اس اصول کے ماتحت سویٹ حکومت نے زار روس کے تمام ایسے معاہدوں اور صلح ناموں کو منسوخ کر دیا جو ایران کی آزادی اور خود مختاریت پر حد بندی عاید کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے ایران کے اندرونی معاملات اور مال گذاری میں دخل دینا بھی بند کر دیا۔ زار کے زمانے میں روسیوں کو جو کچھ بھی حقوق ایران میں ملے تھے ان سے دست برداری حاصل کر لی۔ مثال کے طور پر سویٹ حکومت نے بغیر کسی معاوضہ کے تمام وہ کاروبار جو روسیوں نے زار کے زمانے میں ایران میں

کو دل رکھا تھا ایرانی حکومت کے حوالے کردیا چنانچہ مشہد اور طہران کے درمیان کی ٹیلیگراف لائن اور دیگر چھوٹی ٹیلیگراف لائنیں (جن کی تفصیل نوٹ کے آخر میں درج ہے) تمام سڑکیں جو روسیوں نے ایران میں ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء کے عرصے میں بنائیں، ریلوے لائنیں مع برانچ لائنوں، عمارتوں، اوزار اور دیگر اشیا کے (جن کی تفصیل نوٹ کے آخر میں درج ہے) ایران کا محکمہ ڈاک و تار، اور روسی بینک مع تمام املاک منقولہ و غیر منقولہ کے ایرانیوں کو واپس کردیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سوویٹ حکومت کو ایرانی عوام کی بہبودی کا خیال تھا۔

"۱۹۲۱ء میں سوویٹ حکومت نے وہ تمام سیاسی اور اقتصادی عہدنامے منسوخ کر دئے جو زار کی حکومت اور ایرانی حکومت کے مابین ہوئے تھے کیونکہ ان میں ایرانی خود مختاری پر پابندیاں لگائی گئی تھیں سوویٹ حکومت نے ایران میں روسی قونسل کے عدالتی اختیارات ختم کردئے، اور یہ تسلیم کرلیا کہ ایرانی عدالتوں کو ایران میں رہنے والے روسی شہریوں پر پورا پورا قانونی اختیار ہوگا۔ ایران کے تمام وہ حصے جن پر زار نے قبضہ کر رکھا تھا ایران کو واپس کردئے گئے۔ علاوہ بریں سوویٹ حکومت نے ارزیرم سے ارومیہ جھیل تک کی ریلوے لائن اور اس جھیل کا جہازرانی کا سامان، دخانی جہاز، کشتیاں، اسٹور وغیرہ بھی ایرانیوں کو دے دئے۔

"سوویٹ حکومت کے اس ہمدردانہ رویہ کا ثبوت ۱۹۲۶ء ۱۹۲۸ء اور ۱۹۲۵ء کے صلح ناموں ۱۹۳۰ء کے تجارتی معاہدہ، اور دوسرے عہدناموں میں موجود ہے۔ انھیں کی بدولت ایران نے صنعت و حرفت میں ترقی کی۔ ابھی حال میں سوویٹ حکومت نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ایران کے لئے ضروری اشیاء اور صنعتی مال فراہم کرے گا۔ ایران کے جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے جو نئے مسائل دونوں حکومتوں کے لئے رونما ہوگئے ہیں ان سے دونوں ۱۹۲۱ء ہی میں واقف تھے۔ انھیں اس کا بھی خوف تھا کہ یہ نئے مسائل کہیں ان کے دوستانہ تعلقات میں کشیدگی نہ پیدا کردیں۔ ایران کے اس جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے یہ شبہ تھا کہ ممکن ہے سوویٹ یونین کی دشمن طاقتیں کسی وقت ایران کو روس پر حملے کا اڈا بنالیں۔ چنانچہ ۱۹۲۱ء کے معاہدے کی دفعہ ۶ میں حسب ذیل شرط دونوں نے منظور کرلی تھی "اگر کسی وقت بھی کوئی ملک سوویٹ یونین پر حملہ کرنے کے لئے ایران کو اڈا بنانے کی کوشش کرے اور

ایرانی حکومت سویٹ حکومت کے قبضہ کرنے کے باوجود اس خطرے کو دفع کر سکے تو اس حالت میں سویٹ یونین کو اختیار ہوگا کہ اپنے بچاؤ اور ایرانی عوام کے مفاد کے خیال سے اپنی فوجیں بھیج کر ایران پر وقتی طور پر قبضہ کرے۔ جس وقت یہ خطرہ دفع ہو جائے گا سویٹ حکومت فوراً اپنی فوجیں ایران سے ہٹا لے گی" چنانچہ ایرانی حکومت کی رضامندی سے سویٹ یونین نے ایران کے وقتی قبضہ کا حق اس شرط پر حاصل کر لیا تھا کہ خطرہ دفع ہوتے ہی سویٹ فوجیں واپس ہو جائیں گی۔

اس دن سے اب تک سویٹ حکومت نے اس کی ضرورت محسوس نہ کی کہ ۱۹۲۱ء کے معاہدے کی دفعہ ۶ کا نفاذ کیا جائے۔ سویٹ یونین پر جارحانہ نازی حملے کے بعد سے یہ محسوس کیا گیا سویٹ یونین اور خود ایرانی عوام کے خلاف ایران میں نازی سازشیں ہو رہی ہیں۔ جرمن جاسوس اس کوشش میں ہیں کہ ایرانیوں کی آزادی سلب کر لی جائے اور ایران کو سویٹ یونین پر حملہ کرنے کا اڈا بنایا جائے۔ پبلک اداروں اور حکومت کے پچاس سے بھی زائد دفاتر میں ان جاسوسوں کا دخل ہو چکا ہے۔ ان کے نام، ان کے عہدوں، اور ان کی سرگرمیوں سے ہم خوب واقف ہیں۔ ان کے سرغنہ ولہم سپیر، گوسٹف بوہر، اور ہنرنچ کلنگر ہیں (جاسوسوں کے ناموں کی فہرست نوٹ کے آخر میں درج ہے) مشہور نازی ایجنٹ مختلف کارخانوں، ہوٹلوں، ریلوے، اور رسل و رسائل کے عملے میں شامل ہو گئے ہیں۔ عراق سے جو نازی ایجنٹ ابھی حال میں ایران پہنچے ہیں ان میں رالی نووچ، ڈمارٹ، میسٹر اور برودک خاص طور پر قابل ذکر ہیں (سب کے نام نوٹ کے آخر میں درج ہیں) طہران میں جرمن سفارت سرحد کے نازی ایجنٹوں کو تیار کر رہا ہے کہ وہ سویٹ یونین میں توڑ پھوڑ کی تحریک شروع کریں۔ شمالی ایران کے ان سرحدی ایجنٹوں کے پاس سامان حرب کے کئی اسٹور اور تقریباً ایک ہزار پانچ سو من بارودی سامان ہے۔ طہران کے قریب دو جاریں یہ باقاعدہ فوجی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ نازی جاسوسوں کے ۵۰ ادارے ایران کے فوجی کاروبار اور محکموں میں انجینیر اور ٹیکنیکل ماہرین کے بھیس میں موجود ہیں۔ شہرۂ آفاق نازی جاسوس آئرگل بھی ان میں شامل ہے۔ ایران میں جرمن کمپنی سیمنس کا ڈائرکٹر مشرق قریب کے نازی جاسوسی ادارے کا سرغنہ ہے۔ یہ جاسوس ایرانی حکومت کی ذرا بھی پروا نہیں کرتے۔ شکاریوں اور سیاحوں کے بھیس میں یہ لوگ روسی سرحد پر جمع ہو رہے ہیں۔ ان حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ نازی خطرہ روز بروز

بڑھتا جارہا ہے اور سوویٹ حکومت اپنا فرض سمجھتی ہے کہ اس خطرے کو دفع کرے۔

"سوویٹ یونین پر نازی حملہ کے بعد سے سوویٹ حکومت ایرانی حکومت کو تین بار نازی جاسوسوں کی سرگرمیوں سے آگاہ کر چکی ہے۔ ۲۶ جون کو سوویٹ حکومت اور حکومت برطانیہ نے ایرانی حکومت کو تبلایا کہ ایسے کاغذات ان کے ہاتھ لگے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ جرمن جاسوس ایرانی حکومت کے تختے کو الٹ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ۱۹ جولائی کو سوویٹ حکومت نے نازی جاسوسوں کی تفصیلی روداد بھی اور لکھا کہ یہ سرگرمیاں ایرانی سوویٹ اور ہمسایہ ملکوں کے عوام کے لئے مضرت رساں ہیں۔ حکومت برطانیہ نے بھی اس پر زور دیا کہ ان جاسوسوں کو ایران کی سرحد سے باہر کر دیا جائے۔ ۱۶ اگست کو تیسری بار پھر سوویٹ اور برطانوی حکومتوں نے ایرانی حکومت کو جرمن جاسوسوں کے ارادوں سے آگاہ کیا اور یہ مطالبہ پیش کیا کہ یہ لوگ ایران سے باہر نکال دئے جائیں۔ پس سوویٹ حکومت نے ایران کو تین بار متنبہ کیا کہ دونوں ملکوں کے عوام کا مفاد خطرے میں ہے۔ لیکن ایرانی حکومت نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔ اس سے جرمن جاسوسوں کی حرکتوں میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔

"ایسی حالت میں مجبوراً سوویٹ حکومت نے ۱۹۲۱ء کے معاہدے کی دفعہ ۶ کا نفاذ کرتے ہوئے اپنی فوجیں ایران کے وقتی قبضہ کے لئے روانہ کر دیں۔ یہ مداخلت ہرگز ایرانی عوام کے خلاف نہیں ہے۔ ایرانی عوام کی آزادی اور خودمختاری کو اس سے ذرا بھی خطرہ نہ ہونا چاہیئے۔ یہ مداخلت صرف ان نازی جاسوسوں کو ختم کرنے کے لئے کی گئی ہے جو ایرانی، سوویٹ، اور ہمسایہ ملکوں کے عوام کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ جونہی یہ خطرہ مٹ جائے گا سوویٹ فوجیں ایران سے ہٹالی جائیں گی۔"

علی امام ایم اے

کیمیائے ہستی

(ایرانِ نو کی ادبیاتِ جدیدہ کا ایک افسانہ ——— از سعید نفیسی)

چند مہینے ہوئے، یاد نہیں طہران کے کون سے رسالے نے مقابلے کے لئے اس موضوع کا اعلان کیا تھا۔

"خوش نصیبی کیا ہے؟"

محمد خدایار کو بھی شہر کے مشہور انشاپردازوں کے ساتھ دعوت دی گئی تھی۔ خدایار لکھنا چاہتا تھا اجابتِ دعوت اور شرکتِ مقابلے کے لئے نہیں۔ بلکہ اس لئے کہ یہ مضمون لکھنے کے قابل ہے۔ دو تین دن تک روزانہ کچھ نہ کچھ لکھا لیکن ہر مرتبہ اپنا لکھا ہوا پسند نہ آیا اور چاک کر دیا۔ آخر اس کے نام سے اس موضوع پر کچھ شائع نہ ہوا لیکن اس روز سے آج تک اس موضوع نے خدایار کے ذہن و فکر سے مفارقت نہیں کی، اور سچ یہ ہے کہ یہ بات ہے بھی بہت ضروری۔ کون ہے جس کو یہ فکر نہ ہو کہ خوش قسمتی کیا چیز ہے۔ کون ہے جو خوش بختی حاصل کرنا نہ چاہتا ہو۔ ہر شخص جب یاس و حرماں میں گرفتار اور اندوہ و غم میں مبتلا ہوتا ہے، کس قدر جستجو کرتا ہے کہ خوش بختی کا راز معلوم کرے۔ یہ سراغ لگائے کہ یہ اکسیرِ موہوم، یہ آبحیاتِ نایاب، یہ کیمیائے ہستی کیا شے ہے۔

لیکن کوئی ہے جو دنیا میں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتا ہے۔ جن لوگوں کو تم سب سے زیادہ خوش بخت جانتے ہو اور ان کی شادمانی و کامرانی پر رشک کرتے ہو، اگر ان کو قریب سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ وہ لوگ اپنے آپ کو خوش قسمت نہیں سمجھتے۔ انسان کے حرص خیال کے دامن سے زیادہ وسیع ذخیرِ تمنا ہی کوئی شے نہیں۔

تمام دنیا کی خوش نصیبیاں اور نیک بختیاں کسی شخص میں جمع ہو جائیں، پھر بھی وہ ایک موہوم مسرت، ایک خیالی کامرانی کا آرزومند و متلاشی نظر آئے گا۔ ہر شخص اس چیز کے حاصل کرنے کو خوش بختی سمجھتا ہے جو اس کے پاس نہیں ہے۔ جو شخص سب کچھ رکھتا ہے وہ بھی کسی فرضی چیز کے لئے سرگرداں رہتا ہے اور اسی کے حاصل کرنے کو باعثِ مسرت و سعادت سمجھتا ہے۔

جب کثرتِ تعبیر اور اس سے پریشانیٔ خواب کا یہ عالم ہو تو خوش بختی کی تعریف کیونکر متعین کی جا سکتی ہے۔

) کس طرح ممکن ہو کہ لوگوں کے موہومات و مفروضات کو عبارت و بیان کا پابند کیا جائے۔ ہر شخص اپنی خواہش، اپنے احتیاجات اپنے منافع و اغراض، اپنے احساسات و خیالات کے مطابق خوش بختی کی تعریف و تعبیر کرتا ہو۔ ہر شخص ایک معنی تراشتا ہو اور سب کے نزدیک خوش بختی کا ایک ہی مفہوم ہو ——— یعنی آرزوئے موہوم کو حاصل کرنا۔

جس روز سے طہران کے اس رسالے نے سوال کیا تھا کہ خوش بختی کیا چیز ہو۔ آج تک کوئی دن نہ گذرا تھا کہ خدایار نے بار بار اپنے دل سے یہی سوال نہ کیا ہو۔ آخر آج ایک ناگوار اتفاق نے خدایار کے لئے اس عقدہ کو حل کر دیا۔ آج کا دن اس کی زندگی کا تلخ ترین دن تھا اور ساتھ ہی شیریں ترین بھی۔

تلخ و شیریں؟ تم پوچھوگے یہ عجیب تباین و تضاد محمد خدایار نے کہاں سے پیدا کر لیا؟ تم سوال کروگے کہ تلخی و شیرینی کیونکر یکجا ہو سکتی ہیں؟ کیا خدایار قوتِ ذائقہ نہیں رکھتا؟ پھر دو کلمۂ متغائر۔ دو لفظ متباین، دو چیزیں ضد یکدگر اس نے کیونکر ملا لیں؟

لیکن صبر سے کام لو عجلت نہ کرو۔ شاید یہ چند سطریں ثابت کردیں کہ کیونکر ممکن ہو کہ ایک ہی دن سب سے تلخ بھی ہو اور سب سے بڑھ کر شیریں بھی۔

آج صبح کو ایک قرض خواہ کے شور و فریاد نے محمد خدایار کو ہر روز سے جلد بیدار کر دیا تھا۔ ایک خاص قسم کا غرور ہی جو دوسروں میں ہو لیکن خدایار میں نہیں ہو۔ وہ مخصوص تکبر یہ ہو کہ ہر مفلس و تہیدست اپنے آپ کو متمول و تونگر ظاہر کیا کرتا ہو بجز خدایار کے۔ خدایار جب مالدار تھا تو سب کو اس کا علم تھا، اور جب تنگدست ہو گیا تو لوگوں کے سامنے اس بات کے اقرار میں اس نے کبھی پس و پیش نہیں کیا۔ آج اس کو اپنی تنگدستی سے کوئی شرمندگی نہیں ہو۔ چار پانچ مہینے سے تہیدستی کے آلام و افکار برداشت کر رہا ہو لیکن کبھی کسی کے سامنے زبان پر نہیں لایا۔ لیکن اگر اس نے خود بخود لوگوں سے اپنی تنگدستی کا اظہار نہیں کیا تو یہ غرور کی راہ سے نہ تھا، بلکہ اس لئے تھا کہ وہ لوگوں کو فریب دینا نہ چاہتا تھا۔ اس کو منظور نہ تھا کہ خود اس کے سوا کوئی دوسرا شخص اس کی تہیدستی کو کشادگی و فراخی سے تبدیل کرے۔

جو شے وابستہ قضا و قدر اور شعبدۂ حوادث ہو، اس کے حاصل کرنے کے لئے دوسروں کا احسان کیوں اٹھایا جائے کیوں کسی کا احسان مند بنا جائے۔ اور بقول خدایار کی نظر میں تونگری و تہیدستی میں فرق ہی کیا ہو۔

کیا تنگدستی اس کی عقل کو گھٹا سکتی ہے، اس کے علم میں خلل پیدا کر سکتی ہے، اس کی فطرت و طبیعت میں سے کچھ کم کر سکتی ہے؟

بلکہ اس کے برعکس! محمد خدایار کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کی زندگی جس قدر تنگدستی میں گذری ہے، اس کی روح میں بالیدگی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ وہ جس قدر ان داعیات حیات اور عوامل زندگانی سے بے نیاز رہتا ہے، اسی قدر اس کو یقین ہوتا جاتا ہے کہ یہ ثروتِ سفلہ پرور اور تجملِ دوں نواز نہ صرف بے سود و لایعنی ہیں۔ بلکہ انسان کے لطائف دماغ اور نغماتِ قلب کے بھی سخت دشمن ہیں۔

یہ زندگی کیا ہے؟ فقط زندہ رہنا اور اپنے زندہ رہنے کے آثار کو آشکار و نمایاں کرنا۔ کیا تمہارا تجمل و ثروت آثار زندگانی ہے، یا خود تم اور تمہاری ہستی؟ کیا تمہارے اندوختہ مال و متاع سے تمہاری زندگانی عبارت ہے یا تمہارے ذہن و فکر، روح و قلب، سرشت و فطرت سے؟ کیا تنگدستی محمد خدایار کے آثار ہستی کو مٹا سکتی ہے؟ نہیں! افلاس و تہیدستی کا تغلب و تصرف کتنا ہی زبردست کیوں نہ ہو، یہ ممکن نہیں کہ خدایار کے خزانۂ دل و دماغ تک اس کی دسترس ہو سکے۔

بہر حال آج قرض خواہ نے ہمارے دوست محمد یار کے دروازے پر بڑا ہنگامہ برپا کیا۔ اور ابھی وہ واپس ہو کر گلی سے نہ نکلا ہوگا کہ عدالت کا قرق امین آ وارد ہوا۔ کہتے ہیں کہ "دزد از خانۂ مفلس خجل آید بیروں" آج معلوم ہوا کہ عدالت کا کارندہ بھی مشہور ادیبوں کے مکان سے ناامید واپس جاتا ہے۔ امین عدالت چلا گیا۔ شاید کل پھر آئے اور اس مرتبہ خدایار کو اپنے ساتھ لے جائے۔ لیکن خدایار کو تم سے اس بات کے کہنے میں کوئی باک نہیں کہ آج قرق امین آیا تھا۔ اس پردہ دری سے اس کی عزت و شرف میں کیا کمی آتی ہے؟

لیکن باوجود اس فلسفہ کے، خدایار کو اس امر سے انکار نہیں کہ قرض خواہ کا مطالبہ اور امین عدالت کا ورود نہایت تلخ تھا۔ اس تلخ بادام سے زیادہ تلخ جو اتفاقاً شیرینی میں نکل آتا ہے اور منہ کا مزہ خراب کر دیتا ہے۔ اس کونین کے عرق سے زیادہ تلخ جو بیمار بچے کو زبردستی پلایا جاتا ہے۔ اس غصے سے زیادہ تلخ جو ماں اپنے بے گناہ بچے پر اتارتی ہے۔

جس وقت خدایار گھر سے نکلا پیشانی پر بل پڑے ہوئے تھے جیب میں کوڑی بھی نہ تھی چہرہ افسردہ تھا

جو شخص دیکھتا تھا سمجھتا تھا کہ آج صبح ہی صبح کوئی کڑوی دوا پی کر نکلا ہے۔ خدایار ان تلخیوں کو رفع کرنے کے لئے صرف ایک ہی شخص کا سراغ جانتا تھا۔ وہیں جارہا تھا۔

ابراہیم مصور و مجسمہ ساز ایسا ماہر فن ہے کہ تودۂ گل میں اپنی انگلیوں سے جان ڈال دیتا ہے، اور اپنے موقلم سے رشحات رنگ سے مناظر کو روح افزائی بخش دیتا ہے۔

ابراہیم کے کارخانے کے دروازے پر خدایار نے آہستہ سے دستک دی۔ دروازہ کھلا۔ اور ابراہیم نے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ خدایار کی پذیرائی کی۔

ایک اور بزرگ و محترم ہستی بھی وہاں تھی۔ ایسی ہستی جس کے گھر میں صرف ایک بوریا اور ایک جام سفال دنیا کے جاہ و تجمل کی نیابت کا حق ادا کرتا ہے، جس کے متعلق ہر شخص کو علم ہے کہ ابھی دو مہینے ہوئے اس نے ایک امیر کبیر کی تین سو اشرفیوں کی تھیلی شکریہ کے ساتھ واپس کر دی تھی۔

محسن شاعری و موسیقی میں وہ پایہ رکھتا ہے کہ ایران کے فنون لطیفہ بیکار بیجان رہتے اگر محسن کی مسیحائی ابرنیاں نہ بن جاتی۔ وہ بھی وہاں تھا۔ خدایار کے آتے ہی دونوں نے آج کی تلخی کا اثر خدایار کے چہرے پر محسوس کر لیا۔ خدایار نے وہ سب حال ان سے بھی بیان کر دیا جو میں تم کو سنا چکا ہوں۔ اور اس کو مطلق جواب نہ آیا۔ ابراہیم محسن کا مجسمہ بنانے میں مشغول تھا۔ آج کا کام ابھی ختم کیا تھا۔ محسن نے پے در پے انگڑائیاں لے کر کرسی سے تکیہ لگا لیا اور خدایار کی تقریر سننے لگا۔ جب وہ کہہ چکا اور چند لمحے سکوت رہا تو محسن اٹھا، خدایار کا ہاتھ پکڑ کر دبایا اور بولا۔ "یہ سب کچھ سہی، لیکن میری نظر میں تمہاری عزت و عظمت پھر بھی وہی ہے جو تھی۔" یہ کہہ کر دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔

خدایار اپنے میزبان کے ساتھ تنہا رہ گیا۔ اس کا یہ میزبان بھی اس سے زیادہ خوش حال نہیں ہے اور یہ خود اسی کا قصور ہے کیونکہ شہر کے اہل ثروت لوگوں کی تصویریں نہیں بناتا اور اجرت نہیں لیتا۔ آخر اپنی شوخیٔ نقاشی اور اپنے احباب کی تصویر کشی میں یہ تمام رنگ کیوں برباد کرتا ہے۔ اس کا قصور بھی خدایار سے کم نہیں ہے۔

محسن کے جاتے ہی ابراہیم اٹھا۔ کارخانے کے ایک گوشے سے ایک شکستہ سا فریم لایا۔ اس پر ایک کپڑا تنا تھا۔ پھر ایک بے رنگ و روغن تپائی اس کے پاس رکھی، رنگ اور موقلم نکالے، ایک پرانی کرسی لا کر سامنے

بچھائی اور محمد خدایار سے کہا: "بیٹھو۔"

یہ کلمہ ایسے تحکمانہ لہجے سے کہا کہ خدایار سے انکار نہ بن پڑا۔ اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ ابراہیم نے فریم کو بائیں ہاتھ سے مضبوط پکڑ لیا اور موقلم سے کبھی یہ رنگ کبھی وہ رنگ کپڑے پر پھیلانے شروع کر دئے۔ خدایار بے حس و حرکت بیٹھا تھا اور ابراہیم بار بار اس کے چہرے پر نظر جماتا تھا۔ آثار بشرہ اور احساسات قلب کو پڑھتا تھا اور پھر اپنی پردے کی طرف متوجہ ہو جاتا تھا۔ شاید دو گھنٹے گذر گئے۔ نہ ابراہیم نے کوئی بات کی نہ خدایار کو جرأت ہوئی۔ ڈرتا تھا کہ ابراہیم کا سلسلۂ خیالات قطع نہ ہو جائے۔

لیکن اس عرصے میں خدایار برابر سوچتا رہا کہ خوش بختی کیا چیز ہے۔

یکایک اس کے کمرے میں، ابراہیم کے کام کرنے کے دوران میں یہ موضوع مشکل یہ عقدۂ لاینحل جو برسوں سے پریشان کر رہا تھا، جس کے متعلق رسالے کی دعوت پر باوجود کاوش پیہم کے کچھ نہ لکھ سکا تھا، اس وقت خود بخود بغیر مقدمہ و تمہید کے حل ہو گیا۔

آج تین گھنٹے ہوتے محمد خدایار کو معلوم ہو گیا کہ خوش نصیبی کیا شے ہے۔

اس کی سمجھ میں آ گیا کہ مسرت و سعادت یہ نہیں ہے کہ قرض خواہ تمہارے دروازے پر نہ آئے۔ خوش بختی سے یہ امر مانع نہیں ہے کہ امین عدالت گھر کے سامان کی قرقی کرنے آئے اور گھر میں کچھ نہ پائے، دوسرے روز آئے اور گرفتار کرے جائے۔

خدایار کو یقین ہو گیا کہ خوش قسمتی آرزوئے موہوم کے برآنے کا نام نہیں ہے، خوش بختی اس شے کا حاصل کرنا نہیں ہے جس سے تم محروم ہو بلکہ وہ شے ہے جو تمہارے پاس موجود ہے، اس کا مالک ہونا سعادت و خوش نصیبی ہے۔
خدایار کو اور کچھ معلوم نہیں کہ وہ کیا شے ہے۔ اس سے نہ پوچھو بلکہ اس شلو اعظم سے پوچھو جو انتہائی تنگدستی کے باوجود دولت مندوں کا کیسۂ زر واپس کر دیتا ہے، اور محمد خدایار کو باوجود اس کی رسوائی کے قابل عزت و عظمت سمجھتا ہے۔ اس نقاش و مصور سے پوچھو جو لوگوں کی تصویریں بقیمت بھی نہیں تیار کرتا اور خدایار کی تصویر بے اجرت بناتا ہے۔　　(ترجمہ)

حامد حسن قادری

جذباتِ اثرؔ

دل کے سوا وہ اور کہیں جاگزیں نہیں
مشکل یہ آپڑی ہے کہ دل کو یقیں نہیں

ہے کتنی دل فریب محبت کی داستاں
ہر چند اس میں ربط کہیں ہے کہیں نہیں

سنتے ہیں آسماں کے تارے زمیں کے پھول
تو خشمگیں نہیں تو کوئی خشمگیں نہیں

بالائے آسماں ہے نہ زیرِ زمیں ہے
تیرے بغیر روح کو راحت کہیں نہیں

اندوہِ زندگی کا مداوا ہے جامِ عشق
مے نوش دل فسردہ و اندوہگیں نہیں

ساغر نگاہِ ساقی و میکش نگاہِ شوق
اس میکدے میں ذکرِ غم و ساتگیں نہیں

ہر گام پہ ہجومِ بلا ہے مگر اثرؔ!
رہرو وہی ہے خوب جو ہمت سے جبیں نہیں

اثرؔ صہبائی

تنقید و تبصرہ

دنیائے عرب:۔ از پروفیسر ایچ آر گب، مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کلکتہ، بمبئی، مدراس، مترجمہ محمد حمید الدین صاحب، سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۴۲، قیمت ۴ر کاغذ، کتابت، طباعت بہت اچھی مطبوعہ ۱۹۴۲ء

آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے چند مختصر لیکن پر معلومات رسائل حال ہی میں شائع کئے ہیں ان میں سے ایک زیر نظر رسالہ "دنیائے عرب" ہے۔ اس میں مصنف نے ان تمام مختلف عربوں کو پیش نظر رکھا ہے جو عمان سے مراکو تک پھیلے ہوئے ہیں۔ مغرب کے اثر اور عربوں میں قومی تحریک کے احیاء کا خاص طور سے ذکر کیا ہے۔ یہ معلومات بہت سرسری ہیں۔ البتہ فرنگیوں کے لئے یہ رسالہ خاصا ہے جن کے لئے اتنی معلومات بھی بہت ہیں۔

ہیگل کا فلسفہ:۔ از عزیز ہندی صاحب، ملنے کا پتہ۔ اقبال اکیڈیمی، ظفر منزل، تاج پورہ لاہور، سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۳۰، قیمت ۲ر کاغذ، کتابت، طباعت اچھی۔ مطبوعہ ۱۹۴۳ء۔

عزیز ہندی صاحب نے یہ مختصر لیکن پر مغز رسالہ مکالمے کی صورت میں لکھا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ہیگل کے فلسفہ کو بہت آسانی سے سمجھا دیا ہے۔ دقیق مقامات پر بھی آسانی سے گذر گئے ہیں۔ اگر موصوف اس قسم کے اور رسالے بھی تیار کر دیں تو طلباء کے لئے خصوصاً بہت مفید ہوں گے اور عام لوگ بھی ان سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔

ہیڈ ماسٹر:۔ از ظہور الحق صاحب قریشی، ملنے کا پتہ فیروز اینڈ سنز پبلشرز، سرکلر روڈ، لاہور۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۲۴۲، قیمت ۸ر مطبوعہ ۱۹۴۳ء، کاغذ، کتابت، طباعت اچھی۔

ہیڈ ماسٹروں کے لئے خصوصاً اور عام مدرسین کے لئے عموماً یہ کتاب بہت مفید ثابت ہوگی ظہور الحق صاحب نے تعلیمی نقطۂ نظر سے ایک ہیڈ ماسٹر کے تمام فرائض، اسکول کے تمام انتظامات، اس کی سیرت سازی اور اس کی اہم شخصیت کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ اپنے ذاتی تجربات کا بھی نچوڑ اور مختلف مستند

کتابوں سے بھی مدد لی ہے۔ (ان کا بھی اعتراف کرنا چاہیئے تھا) امید ہے کہ مدرسین کے حلقے میں یہ بڑی مددگار کتاب بھی جائے گی۔

سرودِ شباب: ساز اختر حمید صاحب، ملنے کا پتہ۔ اشرف منزل علی گڈھ، سائز ۲۰×۲۶/۱۶ صفحات اسّی (۸۰)، قیمت ۸ر کاغذ عمدہ، کتابت طباعت اچھی، مطبوعہ ۱۹۴۲ء

اختر حمید صاحب نے اپنے مختلف تاثرات بہت مختصر نظموں کی شکل میں پیش کئے ہیں جن میں سے اکثر اپنی جگہ پر لطیف ہونے کے علاوہ پرسوز بھی ہیں۔ ان مختصر تاثرات کو مکمل نظم نہیں کہا جا سکتا بلکہ ہلکے پرمعنی اشارے ہیں جو چند اشعار میں شاعر لطافت کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ امید ہے کہ اختر صاحب اس تاثر نگاری میں آئندہ اور ملکہ حاصل کریں گے۔

نکہت:۔ از قیسی رامپوری صاحب، ملنے کا پتہ۔ کتب خانۂ علم و ادب دہلی۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۲۴۰، قیمت ۱۲؍، کاغذ، کتابت طباعت اچھی۔

قیسی صاحب کی یہ ناول بھی ان کی دیگر ناولوں کی طرح پلاٹ خالی رکھتی ہے جو پیچیدہ اور رومانوی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بہت سے لوگوں کی زندگیاں پُرپیچ ہوتی ہیں لیکن حقیقت کا دھوکا ان پر ضرور ہوتا ہے۔ اور کوئی بھی قصہ ہو جب تک وہ حقیقت نما نہیں ہوتا، یا اس پر حقیقت کا دھوکا نہیں ہوتا انھیں فرضی یا محض خیالی ہی کہا جاتا ہے۔ قیسی صاحب کی یہ ناول بھی اسی قسم کی فرضی ذہنی رومانویت سے پُر ہے۔ زبان البتہ قیسی صاحب خوب لکھتے ہیں دلچسپی کو قائم رکھنے کا بھی گُر معلوم ہے لیکن کاش وہ دنیائے آب و گل سے اتنے فاصلے پر نہ ہوتے کہ ان کے تحریر کردہ واقعات کو تقریباً ناممکن الوقوع یا محض من گھڑت کہا جاتا۔ بہرحال اپنی دلچسپی اور آسان قسم کی ذہنی رومانیت کی وجہ سے امید کی جاتی ہے کہ اس کی قدر عوام میں ضرور ہوگی۔

ص۔ ع

جنگ اور اقدیہ:۔ از ڈاکٹر انور اقبال صاحب قریشی، ناشر ادارۂ ادب جدید، شاہراہ عثمانی حیدرآباد دکن، سائز ۲۰×۲۴/۸ صفحات قیمت ۱۵ر کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔

ادارۂ ادب جدید نے مسائل حاضرہ پر چند سنجیدہ اور کارآمد رسالے شائع کئے ہیں۔ زیر نظر کتاب

بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہو۔ جنگ کے زمانے میں غذا کا مسئلہ بہت اہم ہوتا ہو اور ہندوستان میں تو چند در چند وجوہ کی بنا پر اس کو خاص طور پر اہمیت حاصل ہو، اس لئے امید ہو کہ یہ مختصر کتاب ملک کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہے گی۔

ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ مصنف نے اپنی رایوں کے اظہار میں نہایت جرأت، صاف گوئی اور بے باکی سے کام لیا ہو۔ "موجودہ غذائی ابتری کے حقیقی اسباب" کے عنوان کے ماتحت ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"اگر موجودہ غذائی ابتری کے متعلق میری صاف اور ایماندارانہ رائے پوچھی جائے تو میں اس کا بوجھ زیادہ تر حکومت ہند کے کندھوں پر ڈالوں گا ان کی متذبذب غیر فیصلہ کن اور بدلتی ہوئی پالیسی ہی اس حالت کی ذمہ دار ہو جس میں آج ہم مبتلا ہیں۔" (صفحہ ۱۱)

نگرانی قیمت (کنٹرول) اور چور بازاروں کو بند کرنے میں حکومت کو ناکامی کیوں ہوئی؟ پر بحث کرتے ہوئے موصوف نے ایک جگہ بہت ہی دلچسپ مگر حیرت انگیز بات لکھی ہو۔ فرماتے ہیں:۔

"صورت حال کی یہ ستم ظریفی بھی ملاحظہ فرمایئے کہ ان چور بازاروں کے گاہک خود حکومت ہند کے اکثر ملازمین تھے، جو یہاں سے گیہوں اور آٹا خریدتے تھے، یہ بات اور بھی عجیب معلوم ہوگی اگر میں بیان کروں کہ خود حکومت بالواسطہ طریق سے ان چور بازاروں کی گاہک تھی۔" (صفحہ ۲)

ہندوستان کے حالات کا انگلستان کے حالات سے مقابلہ کر کے لکھتے ہیں:۔

"۱۹۴۲ء تک انگلستان میں باوجود شدید قسم کی راشن بندی کے وہاں روٹی کی راشن بندی نہیں ہوئی تھی اور انگلستان پر دشمن کے شدید حملوں اور سمندر میں آمدورفت کی تباہ کاریوں کے باوجود اہل انگلستان کو ان کی مقررہ رسد برابر اور مسلسل مل رہی تھی اور ہندوستان میں ایک ایماندار صارف کو کھلے بازار سے ایک تولہ تک گیہوں بھی دستیاب نہ ہو سکتا تھا۔" (صفحہ ۳۶)

موصوف کے نزدیک غذا کی موجودہ مشکلات اور دقتیں غلے کی کمی کی وجہ سے نہیں ہیں، بلکہ حکومت کی غفلت اور عدم تدبر کا نتیجہ ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ مجموعی طور پر ملک میں غلے کی کافی رسد موجود ہو لیکن نقل و حمل کی دشواریاں

کی وجہ سے اس کی تقسیم نہایت ہی غیر مساویانہ طریق پر عمل میں آرہی ہے، یہ بھی امر واقعہ ہے کہ ملک میں ریل کے ڈبوں کی بہت کمی ہے اور ریلوں کی بڑھتی ہوئی فوجی ضروریات کو بھی پورا کرتا ہے، لیکن میری ذاتی رائے یہ ہے کہ موجودہ صورت حال ریل کے ڈبوں کی کمی کی وجہ سے اتنی زیادہ بری نہیں ہوئی جتنی کہ مختلف قسم کی بے انتظامیوں کی وجہ سے جن میں ڈبوں کے استعمال کی بدانتظامی سب سے زیادہ ہے" (صفحہ ۴۶)

بنگال میں جو صورت حال پیش آئی، اس کی بڑی وجہ، موصوف کے نزدیک یہی ہے، اور اس کے علاوہ دوسری وجہ یہ ہے کہ ملک کے حالات کا جائزہ لینے والے ایسے لوگ ہیں جو ہندوستان کے حالات کو صحیح طور پر سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، خود فاضل مصنف کے الفاظ ملاحظہ ہوں :-

"ایسے ماہرین جو بیرون ملک سے درآمد کئے جاتے ہیں، جو ہندوستان جیسے وسیع ملک کا چند ہفتوں میں برق رفتاری سے دورہ کرتے ہیں، اور نہ ملک کی زبان جانتے ہیں اور نہ ہی ملک کے معاشی بالخصوص معاشرتی حالات سے واقف ہوتے ہیں، وہ ذاتی طور پر خواہ کتنے ہی قابل کیوں نہ ہوں میری رائے میں ان کی سفارشات کی وقعت اس کاغذ کے ٹکڑے کے برابر بھی نہیں ہوتی جس پر کہ وہ سفارشات لکھی گئی ہوں" (صفحہ ۵۱)

جنگ اور روپیہ :- از امتیاز حسین خاں صاحب بی اے (جامعہ)، بی کام (لندن)، ناشر ادارۂ ادب جدید حیدرآباد دکن۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۹۶ صفحات۔ قیمت ۱۲ر کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔

جنگ کا اثر زندگی کے ہر شعبے پر پڑتا ہے اور اگر کوئی حکومت غیر معمولی تدبر اور بہت زیادہ احتیاط سے کام نہ لے تو نظام زر کے توازن کو قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے اور نہایت ہولناک مصائب کی آماجگاہ بن جاتا ہے، زیر تبصرہ کتاب میں انہی مسائل پر بحث کی گئی ہے اور بتلایا گیا ہے کہ روپیہ کی گردش اور جنگی ضروریات سے ملک کو کن خطرات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی دکھلایا گیا ہے کہ موجودہ جنگ کے اثرات ہندوستان کی زرعی معیشت خصوصاً نظام زر پر کس قدر پڑ رہے ہیں اور حکومت وقت اس سلسلے میں اپنی ذمہ داریوں کو کہاں تک پورا کر سکی ہے۔ اگرچہ چند مباحث خالص معاشی ہیں اور اصطلاحات کا ذکر [illegible] لیکن پھر بھی بہت صاف طرز تحریر اور تعبیرات آسان ہیں، ہم سمجھتے ہیں کہ [illegible] [illegible] وقت کے لوگ استفادہ کر سکتے ہیں۔

ع۔ ل

اظہارِ تشکر

اکتوبر ۳۹ء سے رسالہ جامعہ کی خدمت میرے سپرد کی گئی تھی اور مجھے اپنے شوق اور ولولے سے امید تھی کہ ان اسکیموں کے پیش نظر جو اس وقت میرے سامنے تھیں رسالے کو بہتر بنایا جاسکے گا لیکن بدقسمتی سے یہی چار سال کا عرصہ ایسی ابتلا کا دور تھا کہ مجبوراً میں رسالے کی اس قدر اور اس طرح خدمت نہ کر سکا جیسی کہ اول اول پیش نظر تھی۔ اب میرے سپرد دوسری خدمات ہو گئی ہیں۔

لیکن یہ امر باعث صد اطمینان و مسرت ہے کہ رسالہ مجھ سے بہت بہتر ہاتھوں میں جا رہا ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ رسالہ انشاء اللہ اب بہت بہتر ہو سکے گا اور ان بلندیوں پر پہنچ جائے گا جن پر میں نہ لے جا سکا۔

آخر میں مجھے مکتبے کے شرکاء کا شکریہ ادا کرنا ہے جنھوں نے اس عرصے میں ہر وقت ہر طرح اور ہر قسم کے تعاون سے میری ہمت افزائی کی خصوصاً جناب مہتمم صاحب مکتبہ جن کے مفید عملی مشورے مجھے ہر وقت حاصل رہے اور جن کی ہمدردی اور وسیع نظری ہر قسم کی گتھیاں سلجھاتی رہی۔

ساتھ ہی میں اپنے ان احباب اور ارباب قلم کا بے حد ممنون ہوں جو میری درخواست پر اکثر گراں بہا مضامین سے رسالے کو مستفید ہونے کا موقع دیتے رہے اور از راہ کرم وقتاً فوقتاً اصلاح و مشورے سے [illegible] عہدہ برآ ہونے میں میری اعانت فرماتے رہے۔

محمد حسن ہاشمی